تفسیر نعیمی

حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر: نعیمی کتب خانہ گجرات
مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات۔ پاکستان۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پنجتن پاک

قرآنی پنجتن پاک

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم

○ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ○ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ○ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ ○ حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ

آسمانی پنجتن پاک

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم

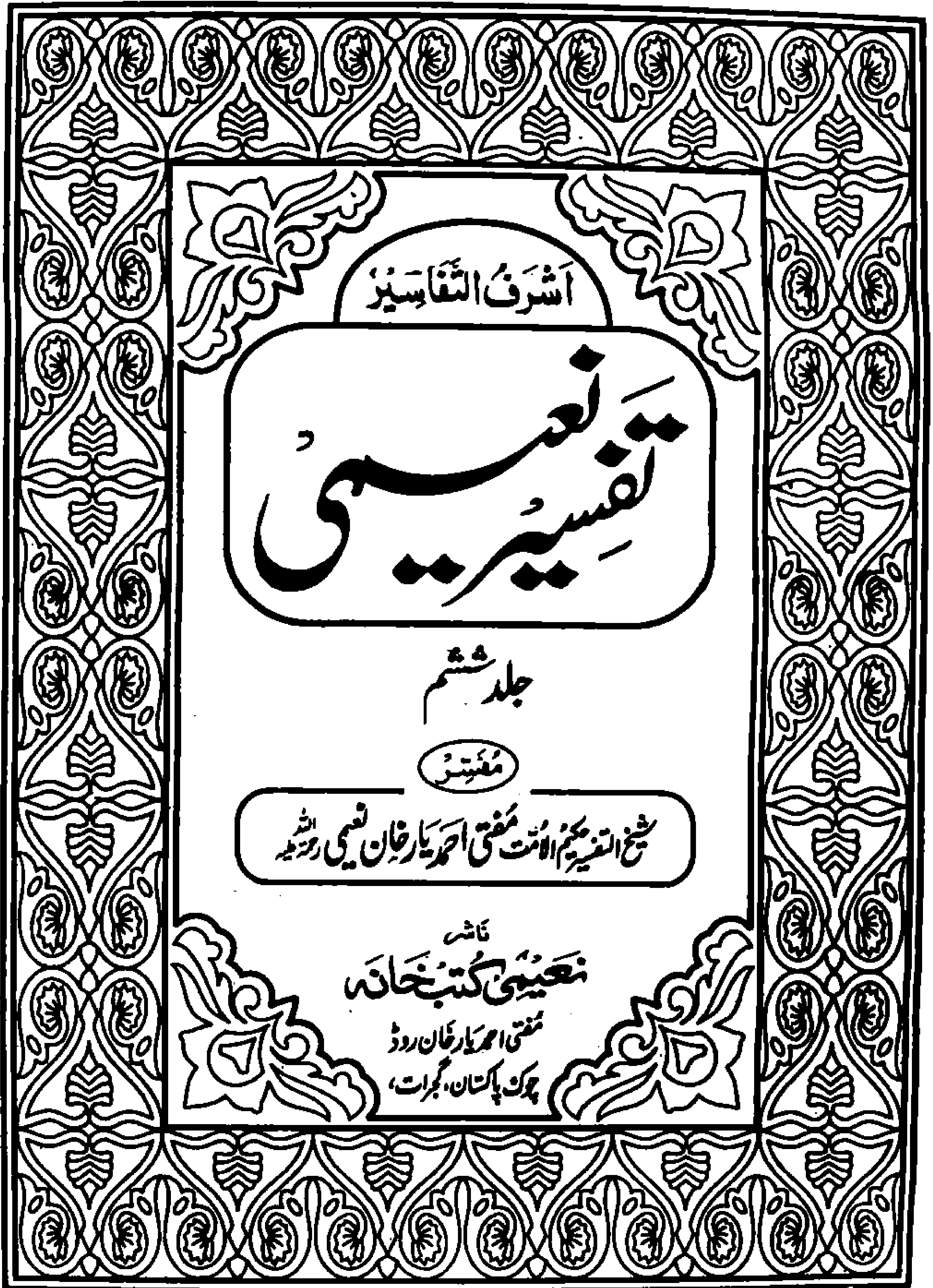
○ حضرت جبرائیل علیہ السلام ○ حضرت میکائیل علیہ السلام ○ حضرت اسرافیل علیہ السلام ○ حضرت عزرائیل علیہ السلام

نسبی پنجتن پاک

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم

○ حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ ○ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ○ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ○ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ

[illegible]


اَشرفُ التفاسیر
تفسیرِ نعیمی
جلد ششم
مُفسّر
شیخ التفسیر حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ
ناشر
نعیمی کُتب خانہ
مفتی احمد یار خان روڈ
چوک پاکستان، گجرات،

کتاب	تفسیر نعیمی پارہ ششم
مصنف	حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمتہ اللہ علیہ
ناشر	نعیمی کتب خانہ مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات
تعداد	گیارہ سو
سال اشاعت	2006ء
ہدیہ	

تقسیم کار

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ فون: 7221953-7220479

فیکس نمبر:۔ 042-7238010

فہرست مضامین تفسیر نعیمی جلد ششم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ

ناپسند کرتا ہے اللہ ظاہر کرنا بری بات کا لیکن وہ جو ظلم کیا جاوے

اللہ پسند نہیں کرتا بری بات کا اعلان مگر مظلوم سے

وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا

اور ہے اللہ سننے والا جاننے والا۔ اگر ظاہر کرو تم بھلائی کو یا چھپاؤ تم اسے یا معافی

اور اللہ سنتا جانتا ہے۔ اگر تم کوئی بھلائی علانیہ کرو یا چھپ کر یا کسی کی برائی سے

عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا ﴿۱۴۹﴾

دو تم برائی سے پس تحقیق اللہ ہے معاف فرمانے والا قدرت رکھنے والا

درگزر کرو تو بے شک اللہ ہے معاف کرنے والا قدرت والا ہے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح کا تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**۔ پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی پردہ دری فرمائی تھی۔ اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ چونکہ منافقین ظالم ہیں، مسلمان اور اسلام مظلوم ہیں۔ ظالم کی پردہ دری کرنا اچھا ہے تاکہ دوسرے اس کے ظلم سے بچیں اس لئے اس ستار عیوب نے ان بدنصیبوں کی پردہ دری کی۔ **دوسرا تعلق**۔ پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ جو منافق توبہ کر کے اپنے آپ کو درست کر لیں تو وہ مومنوں، مخلصوں کے ساتھ ہی ہوں گے تو شبہ ہو سکتا تھا کہ پھر بھی یہ مخلص بن جانے والے منافقین مسلمانوں کے طعن سے نہ بچیں گے اپنے گزشتہ کرتوتوں کی وجہ سے۔ اب اس آیت میں اس شبہ کو زائل کیا جا رہا کہ نہیں اب جو مسلمان ان کے گزشتہ نفاق پر طعن کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو گا۔ **تیسرا تعلق**۔ پچھلی آیت کریمہ میں ارشاد ہوا تھا کہ اگر تم مومن شاکر بن جاؤ تو ہم تم کو عذاب کیوں دیں؟ اب مومن شاکر بننے کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے۔ بری باتوں کا اعلان نہ کرنا، نیکیاں چھپ کر بھی کرنا اور علانیہ بھی کرنا۔ صرف دعویٰ ایمان، دعویٰ شکر کافی نہیں۔

شان نزول

یہ آیت کریمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی کہ ایک بار ایک شخص آپ کی شان میں زبان درازی کر رہا تھا، آپ نے بہت صبر فرمایا مگر وہ باز نہ آیا تب آپ نے بھی اسے جواب دیا اس پر حضور ﷺ نے فرمایا [illegible] ایک فرشتہ تمہاری [illegible] ہا تھا جب تم نے خود جواب دیا تو

وہ فرشتہ چلا گیا۔ تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (خزائن، کبیر، خازن) جس میں حضور ﷺ کی تائید فرمائی گئی اور حضرت ابوبکر کی تسلی و تشفی۔ تو حضرت صدیق کا یہ جواب دینا ناجائز نہ تھا کہ وہ مظلوم تھے اور محبوب ﷺ کا یہ ارشاد بیان افضیلت کے لئے ہے۔ غرضیکہ بدلہ لینا جائز اور درگزر کرنا بہت ہی بہتر ہے۔

دوسری روایت۔ ایک شخص کسی کے ہاں مہمان گیا، اس نے اس مہمان کی کوئی تواضع اور خاطر نہ کی اس نے لوگوں سے اس کی بے مروتی کج خلقی کی شکایت کی۔ اس کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جس میں اس مہمان کی حمایت کی گئی کہ اس کی شکایت بالکل بجا اور درست ہے کہ وہ مظلوم ہے (خازن، روح البیان) خیال رہے کہ شریعت میں جو عزیز، دوست، واقف آدمی ملنے آوے مہمان ہو کر اس کی مہمانی تین روز تک اس کا حق ہے اور کسی کا حق مارنا ظلم ہے اسی لئے **اِلَّا مَنْ ظُلِمَ** بالکل درست ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ جو اجنبی شخص اپنے یا کسی کے کام کے لئے ہمارے پاس آئے، وہ مہمان نہیں، اس کی خاطر مدارت اس کا حق نہیں اگر خاطر کر دے تو صاحب خانہ کی مہربانی ہے۔ حق اور ہے مہربانی اور۔

تفسیر **لَا یُحِبُّ اللّٰہُ** قوی تر یہ ہے کہ یہ جملہ نفی محض نہیں بلکہ نفی عدولی ہے۔ یعنی اس کے معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ تا کہ مطلب یہ ہو کہ نہ تو پسند فرماتا ہے اور نہ ناپسند۔ نہ تو اس سے راضی ہے نہ ناراض۔ بلکہ اس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔ اور اس سے ناراض ہے پھر جس درجے کا یہ جرم ہوگا اسی درجہ کی ناراضگی، **یُحِبُّ** بنا ہے **حُبٌّ** سے بمعنی چاہنا پسند کرنا، محبت کرنا۔ حب اور وُد کے معنی قریباً ایک ہی ہیں مگر اکثر ود بمعنی تمنا و آرزو کرنا بھی آتا ہے جیسے **رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ** (الحجر: ٢) اور کبھی اس پسندیدگی پر بھی بولا جاتا ہے جس کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش بھی ہو رب فرماتا ہے: **وَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ کَمَا کَفَرُوْا فَتَکُوْنُوْنَ سَوَآءً** (النساء: ٨٩) کفار کوشش کرتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ تو وہ اور تم برابر ہو جاؤ مگر حب میں یہ قیود نہیں۔ **اَلْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ** جہر مقابل ہے خفا کا جس کے معنی ہیں ظہور و اعلان۔ اس لئے بلند آواز والے کو **جھیر الصوت** کہتے ہیں۔ یہاں جہر سے مراد مطلقاً اعلان ہے۔ خواہ آواز سے ہو یا تحریر سے یعنی زبانی و قلمی ہر اعلان کو شامل ہے۔ سوء سے مراد وہ برائی ہے جس کا اظہار غمگین کرے اسی لئے ستر کو سوءۃ کہتے ہیں کہ اس کا کھلنا شرم کا باعث ہے **لِیُرِیَھُمَا سَوْاٰتِھِمَا** (اعراف: ٢٧) یہاں دوسرے کی چھپی ہوئی برائیاں مراد ہیں نہ کہ اپنی برائی جیسا کہ **اِلَّا مَنْ ظُلِمَ** سے معلوم ہو رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس سے مطلق چھپی ہوئی برائیاں مراد ہوں خواہ اپنی ہوں یا کسی اور کی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کی چھپی برائی کے اعلان کر دینے کو سخت ناپسند فرماتا ہے گویا اس میں ازالہ حیثیت عرفی کا قانون بیان فرمایا گیا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ ہر چھپی بات کا اعلان ناپسند کرتا ہے۔ **مِنَ الْقَوْلِ** میں من بیانیہ ہے اور یہ سوء کا بیان ہے۔ قول سے مراد مطلقاً بات ہے خواہ ایک کلمہ ہو یا پورا کلام۔ اس میں غیبت، کسی کے خفیہ عیبوں کا ظاہر کرنا، بددعا کرنا سب داخل ہے۔ **اِلَّا مَنْ ظُلِمَ** یہ عبارت گزشتہ کلام سے استثناء ہے۔ اگر من سے مراد جہر پوشیدہ ہو تو استثناء متصل ہے ورنہ استثناء منفصل۔ من عام ہے جو ہر مظلوم کو شامل ہے مرد ہو یا عورت، عالم ہو یا جاہل **ظُلِمَ** بنا

ہے ظلمت سے جس کے لغوی معنی ہیں اندھیرا۔ اصطلاح میں کسی کے حق مارنے کو یا دوسرے کی ملک میں بغیر اجازت تصرف کرنے کو ظلم کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ آخرت میں اندھیریوں کا باعث ہے۔ حدیث پاک میں ہے الظلم ظلمات یوم القیمۃ۔ ظلم سے مراد مطلقاً ظلم وستم ہے۔ خواہ جانی ہو یا مالی یا ایمانی یا عزت کا ظلم۔ اس وسعت کو خیال میں رکھا جائے، اس سے بہت سے مسائل مستنبط ہوں گے۔ خیال رہے کہ ظالم کے عیب کھولنا شرعاً جائز ہے۔ خواہ شخصی ظالم ہو یا قومی ظالم یا وطنی ظالم ہو یا دینی ظالم۔ اللہ تعالیٰ نے ولید ابن مغیرہ کے دس عیب کھولے، حتیٰ کہ اسے زنیم یعنی ولد الزنا فرمایا کہ وہ حضور پر زیادتیاں کرتا تھا یعنی شخصی ظالم تھا۔ یونہی کفار۔ ابولہب وغیرہ کے عیوب ظاہر کیے۔ کیونکہ وہ ملکی وقومی ودینی ظالم تھے۔ اسی طرح اگر آئندہ ظلم کا اندیشہ ہو تو کسی کو کسی کے عیب پر مطلع کر دینا جائز ہے، بدمعاملہ آدمی کی بدمعاملگی بتا دینا۔ حاکم یا بادشاہ کو خفیہ غداری کی خبر دینا وغیرہ سب کچھ جائز ہے اِلَّا مَنْ ظُلِمَ میں بہت وسعت ہے۔ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا اس جملہ کی تفسیریں بار ہا بیان ہو چکی ہیں کہ کَانَ صفات الٰہیہ میں دوام کے لئے ہوتا ہے یعنی تھا اور ہے اور رہے گا سمیع علیم دونوں رب تعالیٰ کی صفات ہیں۔ بمقابلہ سمیع کے علیم میں زیادہ وسعت ہے کہ سمع کا تعلق صرف آواز و کلام سے ہے مگر علم کا تعلق تمام معلومات سے ہے۔ جیسے قدرت سے علم وسیع ہے کہ قدرت تو ہر ممکن کے متعلق ہے مگر علم واجب ممکن، اور ممتنع سب کے متعلق ہے۔ مقدورات الٰہیہ، مسموعات الٰہیہ، معلومات الٰہیہ سب غیر متناہی ہیں مگر معلومات ان سب سے زیادہ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری باتوں وغیرہ کو سننے والا ہے۔ تمہارے دلوں کے ارادوں وغیرہ کو جانتا ہے۔ جب وہ تمہارے عیوب جانتے ہوئے تمہارے عیب چھپاتا ہے تو تم کو بھی بندوں کی عیب پوشی کرنی چاہیے کہ یہ سنت الٰہیہ ہے یا اگر تم نے لوگوں کی پردہ دری کی تو رب تعالیٰ تمہاری پردہ دری کرے گا کیونکہ وہ سمیع وعلیم ہے۔ تم دوسروں کی پردہ پوشی کرو تا کہ تمہارے عیب چھپے رہیں یا یہ فرمان خوف وامید دونوں کو شامل ہے۔ اے گناہ گارو! اللہ سے ڈرو، وہ سمیع وعلیم ہے اور اے نیک کارو! اللہ سے امید رکھو کہ وہ سمیع وعلیم ہے۔ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ۔ تُبْدُوْا بنا ہے ابداءٌ سے بمعنی ظاہر کرنا جس کا مخالف ہے اخفاءٌ۔ خیال رہے کہ بَدْوٌ مجرد اور باب افعال میں ظہور کا معنی دیتا ہے مگر باب افتعال میں آ کر شروع کر دینے یا شروع ہو جانے معنی دیتا ہے، ابتدا کے معنی ہیں شروع کرنا کیونکہ چیز شروع ہو کر ظاہر ہو جاتی ہے۔ نیکی ظاہر کرنے کی تین صورتیں ہیں علانیہ لوگوں کے سامنے نیکی کرنا۔ خفیہ کی ہوئی نیکی کو زبان یا قلم سے بیان کر دینا۔ علامات سے نیکی ظاہر کر دینا یہ تینوں صورتیں نیکی ظاہر کرنے کی ہیں۔ ان تینوں سے خالی ہونا اخفاء (چھپانا) ہے۔ علماء کے ہاں ہر وہ جائز کام ہے جو رضائے الٰہی کی نیت سے کیا جائے۔ ریا کے لئے نماز پڑھنا خیر یعنی نیکی نہیں۔ اور ادائے سنت کی نیت سے کھانا پینا اور سونا خیر ہے۔ صوفیا کے ہاں خیر وہ ہے جس سے اللہ رسول راضی ہو جائیں۔ شر یا سوء وہ ہے جس سے وہ ناراض ہوں۔ منافقوں کا کلمہ پڑھنا سوء تھا اور حضرت ابوامیہ ضمری کا ایک موقعہ پر کفر کہہ دینا خیر تھا۔ خیر سے ہر چھوٹی بڑی بھلائی مراد ہے یعنی اے صحابیو! یا اے مسلمانو! یا اے انسانو! یا اے تمام جن وانس وفرشتو! تم جو بھلائی ظاہر واعلانیہ کرو یا چھپا کر مگر تیسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ ہر

خیر وشر کو جانتا ہے مگر یہاں صرف خیر کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ یہاں امید دلانا مقصود ہے اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ لفظ تَعْفُوْا بنا ہے عَفْوٌ سے بمعنی مٹ جانا۔ معافی کو عفواس لئے کہتے ہیں کہ اس سے گناہ یا حق مٹ جاتا ہے۔ عفو کے معنی بڑھنے بڑھانے کے بھی ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: حَتّٰی عَفَوْا وَّ قَالُوْا (اعراف:۹۵) حضور فرماتے ہیں قصوا الشوارب واعفو اللحی (الحدیث) قصور بخش دینے کو معافی اس لئے بھی کہتے ہیں کہ اس سے آپس کی محبت بڑھتی ہے یا معافی دینے والے کے اللہ کے ہاں درجات بڑھتے ہیں یا لوگوں میں عزت بڑھتی ہے۔ سوء سے مراد وہ ظلم یا زیادتی ہے جو دوسرا تمہارے ساتھ کرے۔ سوء کے لفظی معنی ہیں ناگواری اس لئے ستر کو سوءۃ کہتے ہیں کہ اس کا کھل جانا ناگوار ہوتا ہے..... ہر ناگوار چیز سوء ہے خواہ جانی یا بدنی یا مالی یا زبانی کسی کو گالی دینا، بہتان لگانا، غیبت کرنا، کسی کا مال مار لینا، قرضہ ادا نہ کرنا یہ سب سوء ہیں ان سے درگزر تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ میں داخل ہے۔ یہ جملہ صرف معاملات کے لئے ہے، پہلا جملہ عبادات و معاملات سب کو شامل تھا۔ ان دو جملوں میں تمام عبادات و معاملات شامل ہیں فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا۔ یہ جملہ گزشتہ شرط کی جزا نہیں بلکہ علت جزا ہے اور ف تعلیلیہ اس کی جزا پوشیدہ ہے تُوْجَرُوْنَ اَجْرًا جَزِیْلًا۔ یعنی اے لوگو! اگر تم کوئی بھلائی علانیہ یا خفیہ کرو یا ظالم کو معافی دو تو تم کو بہت بڑا ثواب ملے گا۔ کیونکہ رب تعالیٰ معافی دینے والا بھی ہے، قدرت والا بھی۔ گویا پچھلی آیت میں مظلوم کو ظالم سے بدلہ لینے کی اجازت دی گئی اور اس آیت میں معافی دینے کی رغبت دی گئی کہ معافی دینا صفات الٰہیہ سے ہے۔ تم اخلاق خداوندی اختیار کرو۔ دیکھو ہم قادر مطلق ہیں اس کے باوجود معافی دینا ہماری عادت کریمہ ہے یا یوں کہو کہ پہلے عدل کی اجازت دی گئی تھی، اب فضل کی رغبت دی جا رہی ہے۔ ظالم سے بدلہ لینا عدل ہے معاف کر دینا فضل یا یوں کہو کہ پچھلی آیت میں برائی کے اعلان پر پابندی لگائی گئی تھی، اب نیکی کی کھلی اجازت دی جا رہی ہے۔ یہاں بھی کَانَ دوام اور ہمیشگی کے لئے ہے۔ عفو وہ جو معافی دینے کا عادی ہو کہ ہمیشہ معافی دے۔ ہر معافی مانگنے والے کو معافی دے۔ ہر گناہ کی معافی دے، ہر طرح کی معافی دے، رب تعالیٰ شرک سے لے کر معمولی گناہ تک کو معاف فرماتا ہے۔ اور اس نے معافی کے لئے بہت ذریعے مقرر فرما دیئے ہیں۔ منہ سے معافی مانگو تو معاف، مسجد کے راستے میں ہر قدم پر ایک گناہ معاف، مسلمان بھائی سے خوش ہو کر ملو تو گناہ معاف، مصافحہ میں ہاتھ ملاؤ تو گناہ معاف، حج کر لو تو سارے گناہ معاف، ماں باپ یا عالم دین کا چہرہ محبت سے دیکھو تو گناہ معاف۔ غرضیکہ ہر طرح معافی ہے۔ یہ ہے عفو کے معنی۔ قدیر اور قادر میں فرق ہم پہلے پارے میں بیان کر چکے ہیں۔ یوں ہی علیم و عالم، نصیر و ناصر کے فرق کا وہاں ہی مطالعہ کرو۔

خلاصہ تفسیر

یہ آیتیں عبادات و معاملات اور معاملات میں عدل و رحم کی بہت جامع ہیں۔ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ یہ سخت ناپسند کرتا ہے کہ کوئی شخص کسی کی نسبت بری یا ہتک آمیز بات کی شہرت دے، ہاں جو مالی، جانی، ایمانی مظلوم ہے تو مظلوم کو یہ حق ہے کہ ظالم کو علانیہ بددعا دے یا اس کا ظلم اور اس کے عیوب ظاہر کر دے یا کسی حاکم سے شکایت کر دے کہ اب ظالم وہ شخص ہے، یہ تو بدلہ لینے والا ہے۔ مگر اس بدلہ میں شرط یہ ہے کہ سچ کہے۔ جھوٹا الزام نہ لگائے اور

بدلہ لینا ہے تو برابر لے زیادتی نہ کرے۔ یہ خیال رکھو کہ اللہ تعالیٰ ظالم و مظلوم دونوں کے حال و قال کو سنتا بھی ہے، جانتا بھی ہے اور زیادتی کرنے والے کو سخت سزا دے گا۔ اور اے مسلمانو! تم جو قولی، عملی، فعلی کسی قسم کی کوئی نیکی علانیہ یا خفیہ کرو گے یا تم اپنے ظالم کو معافی دو گے کہ باوجود قدرت کے اس سے بدلہ نہ لو تو تمہارے یہ نیک اعمال ضائع نہیں جائیں گے، تم کو ان کی جزا ضرور ملے گی، کیونکہ تم اس صورت میں سنت الٰہیہ پر عمل کرو گے تو رب تعالیٰ علیم بھی ہے قدیر بھی۔ سب کے تمام برے بھلے اعمال جانتا ہے۔ سزا دینے پر قادر ہے مگر اس کے باوجود عفو ہے یعنی معاف فرمانا اس کی عادت کریمہ ہے غرضیکہ یہاں مظلوم کو ظالم سے بدلہ لینے کی اجازت ہے مگر معافی دینے، درگزر کرنے کی ترغیب ہے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** گناہ بہر حال برا ہے۔ خواہ خفیہ ہو یا علانیہ۔ مگر علانیہ گناہ کرنا بہت برا کہ اس میں گناہ بھی اور اعلان بھی۔ **دوسرا فائدہ** جو گناہ خفیہ ہو گیا ہو اس کا اعلان کرنا بھی گناہ ہے۔ یہ دونوں فائدے **اَلْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ** کے عموم سے حاصل ہوئے۔ **تیسرا فائدہ** چھپے گناہ کی توبہ اعلانیہ کرنا بھی یہ گناہ ہے کہ اس میں اپنے گناہ کا اعلان ہے۔ چھپے گناہ کی توبہ بھی خفیہ طور پر کر لو۔ یہ فائدہ بھی **اَلْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ** سے حاصل ہوا۔ جب رب تعالیٰ ہمارے عیب چھپائے تو ہم کیوں ظاہر کریں؟ **چوتھا فائدہ** گالیاں بکنا، غیبت کرنا، چغلی کھانا، جھوٹ بولنا تمام حرام ہیں، ان سے بچنا لازم ہے۔ کہ یہ بھی سوء بالقول ہیں۔ اچھی باتیں کرو تا کہ لوگ تم سے اچھی عادات حاصل کریں۔ بری باتیں نہ کرو تا کہ تمہارے بچے بیویاں، تمہارے ماتحت لوگ تمہاری صحبت میں برے نہ بنیں۔ اس ایک جملہ نے اخلاقیات کا سبق دیا۔ **پانچواں فائدہ** مظلوم ظالم کی شکایت حاکم سے بھی کر سکتا ہے اور لوگوں سے بھی جیسا کہ **اِلَّا مَنْ ظُلِمَ** سے معلوم ہوا۔ یہ غیبت نہیں بلکہ دفع ظلم ہے۔ **چھٹا فائدہ** چوروں، بدمعاشوں ملک و قوم کے خفیہ غداروں کی شکایت حکومت سے کرنا، ان کی مخبری کرنا بالکل جائز ہے یہ بھی **اِلَّا مَنْ ظُلِمَ** سے معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ قومی و ملکی ظالم ہیں۔ جب شخصی ظالم کی شکایت درست ہے تو یہ بدترین ظالم ہیں ان کی شکایت بھی درست ہے۔ **ساتواں فائدہ** راویان حدیث کے واقعی عیوب بیان کر دینا جائز ہے نہ یہ غیبت ہے نہ چغلی کہ یہ لوگ مذہبی ظالم ہیں کہ ان کی جھوٹی یا گھڑی ہوئی حدیثیں شائع ہو کر دین میں فساد کا باعث ہوں گی۔ **آٹھواں فائدہ** یونہی بے دینوں، بے ایمانوں کی بے دینی لوگوں پر ظاہر کر دینا تا کہ لوگ ان سے بچ کر اپنا ایمان سلامت رکھ سکیں بالکل جائز ہے کہ یہ لوگ بھی دینی ظالم ہیں اور دین و قوم مظلوم ہیں۔ ان کے عیوب بتانا قوم و ملک و دین کو بربادی سے بچانا ہے۔ **نواں فائدہ** اگر کوئی مسلمان کسی ظالم سے رشتہ یا معاملہ کرنا چاہے اور ہو اس سے بے خبر تو اسے خبردار کر دینا جائز ہے کہ یہ غیبت نہیں بلکہ بھائی مسلمان کو ظلم سے بچانا ہے۔ یونہی اگر کوئی شخص یا کوئی جماعت کسی کے خلاف سازش کر رہی ہو تو اس شخص کو اسی سازش کی خبر کر دینا جائز ہے کہ یہ بھی دفع ظلم ہے اور **اِلَّا مَنْ ظُلِمَ** میں داخل ہے۔ **دسواں فائدہ** اپنے ذاتی ظالم کو معافی دے دینا بہت ہی اچھی بات ہے جیسا کہ **اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ** سے معلوم ہوا مگر قومی و دینی ظالم کو ہرگز معافی نہ دی جائے۔ حضور ﷺ

نے ان کفار مکہ کو معافی دے دی جو حضور کے جانی دشمن تھے مگر چوروں، ڈاکوؤں کو معافی نہ دی۔ اخلاق اور چیز ہے ملکی انتظام کچھ اور۔ **گیارھواں فائدہ** بعض نیکیاں علانیہ کرنی چاہئیں بعض خفیہ۔ نماز جمعہ وعیدین علانیہ پڑھو نماز تہجد خفیہ، زکوٰۃ و چندہ علانیہ دو نفلی صدقات خفیہ جیسا کہ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ سے معلوم ہوا۔ **بارھواں فائدہ** معمولی نیکی حقیر سمجھ کر چھوڑ نہ دو جو کچھ بن پڑے کرلو کہ کبھی ایک گھونٹ پانی جان بچالیتا ہے۔ یہ فائدہ خَيْرًا کی تنکیر سے حاصل ہوا۔

تیرھواں فائدہ جیسے رب تعالیٰ کی ذات واجب، ازلی، ابدی، قدیم ہے ویسے ہی اس کی صفات واجب، ازلی، قدیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے عفو بھی ہے قدیر بھی۔ یہ فائدہ کَانَ استمراریہ سے حاصل ہوا۔ اگرچہ اس کا گناہ گاروں کو معافی دینا یہ فعل حادث ہے کہ جب گناہگاروں نے گناہ کیے تب اس نے معافی دی مگر عفو کی شان قدیم ہے جیسے اس کی صفت رزاقیت قدیم اگرچہ بندوں کو رزق دینا یہ فعل جب ظاہر ہوا جب کہ مرزوق پیدا ہوئے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ برائی کے اعلان سے محبت نہیں کرتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلانیہ برائی جائز ہے مستحب نہیں کیونکہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ نہ تو محبت کرے نہ نفرت و ناراضی فرمائے وہ جائز ہوتی ہے اور جس چیز کو پسند کرے وہ بہتر اور قابل ثواب ہے اور جس چیز سے ناراض ہو وہ ممنوع ہوتی ہے۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر سے معلوم ہوگیا کہ یہاں لَا یُحِبُّ اللّٰهُ کے معنی ہیں اللہ ناپسند کرتا ہے، ناراض ہے یعنی یہ سب محض نہیں سب عدولی ہے اور جو چیز رب تعالیٰ کو ناپسند ہے وہ یقیناً بری اور لائق سزا ہے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اعلانیہ برائی کو ناپسند کرتا ہے معلوم ہوا کہ خفیہ برائی کو ناپسند نہیں کرتا حالانکہ یہ ہر حال برائی ہے۔ علانیہ ہو یا خفیہ تو کیا اسلام نے چھپ کر گناہوں کی اجازت دے دی ہے؟ (آریہ)

جواب: اس آیت کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ کسی دوسرے کی برائی ظاہر کرنا رب کو ناپسند ہے کہ یہ غیبت ہے مگر مظلوم ظالم کا ظلم بیان کرسکتا ہے کہ یہ غیبت نہیں بلکہ اپنا بدلہ لینا ہے جس کی صورتیں تفسیر میں عرض کردی گئیں۔ دوسرا یہ کہ رب تعالیٰ اعلانیہ برائی کو بہت ہی ناپسند کرتا ہے کہ اس میں گناہ بھی ہے اور اعلان گناہ بھی بخلاف خفیہ گناہ کے کہ اس میں ایک ہی گناہ ہے لہٰذا وہ اعلانیہ گناہ سے ہلکا ہے۔

تیسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات معافی اور قدرت وغیرہ ہمارے اعمال کرنے پر موقوف ہیں کہ جب ہم کوئی برائی کرلیں تب وہ عفو و قدیر ہو کیونکہ یہاں عفو و قدیر کو جزا کے طور پر ارشاد فرمایا حالانکہ صفات الٰہیہ واجب و قدیم ہیں؟ **جواب:** ابھی تفسیر میں عرض کیا گیا کہ یہاں فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا جزا نہیں بلکہ علت جزا ہے اس کی ف جزائیہ نہیں تعلیلیہ ہے مطلب یہ ہے کہ اے بندو! تم جو کچھ بھی بھلائی کرو گے تم کو ثواب و اجر ضرور ملے گا کیونکہ رب تعالیٰ عَفُوًّا قَدِيْرًا ہے۔ جو معافی دے وہ سنت الٰہیہ پر عامل ہے اسے ثواب کیوں نہ ملے

چوتھا اعتراض: یہاں پہلی آیت سمیع وعلیم پر ختم فرمائی گئی ہے اور دوسری آیت کو عفو و قدرت پر اس میں کیا حکمت ہے، اس

کے برعکس کیوں نہ ہوا؟ **جواب:** اس لئے کہ پہلی آیت میں ایک جائز چیز کا ذکر فرمایا جس کا جواز بھی محدود ہے اور چند شرطوں سے مشروط ہے۔ یعنی مظلوم کو ظالم کی برائیاں ظاہر کر دینے کی اجازت ہے بشرطیکہ جھوٹا الزام نہ لگائے اور زیادتی نہ کرے وہاں سمیع و علیم فرمانا مناسب تھا کہ اے مظلومو! اس اجازت پر عمل کرتے وقت خیال رکھنا کہ ہم تمہاری باتوں کو سنتے، تمہاری نیتوں کو جانتے ہیں۔ زیادتی کرو گے پکڑے جاؤ گے۔ مگر دوسری آیت میں بھلائی کا ذکر ہے کھلی چھپی نیکیاں کرنا، ظالم کو معافی دینا لہٰذا یہاں رب تعالیٰ کی معافی و قدرت کا ذکر موزوں تھا۔ جیسا مضمون ویسا ہی رب تعالیٰ کی صفات کا ذکر۔

پانچواں اعتراض: تم نے عفو کے معنی کیے ہمیشہ معافی دینے والا، ہر طرح معافی دینے والا، ہر جرم کی معافی دینے والا حالانکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ (النساء: ۴۸) اللہ تعالیٰ شرک و کفر کو نہ بخشے گا تو وہ ہر جرم کو معافی دینے والا نہ ہوا۔ **جواب:** دنیا میں اللہ تعالیٰ توبہ سے شرک و کفر بھی بخش دیتا ہے۔ عموماً اہل عرب مشرک و کافر ہی تھے۔ مسلمان ہو کر توبہ کر کے مومن متقی صحابہ بنے۔ ہاں جو کفر و شرک پر مر جائے اسے نہ بخشے گا اور اس نہ بخشنے میں بندے کا اپنا قصور ہے کہ اس نے توبہ کا وقت نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ رازق ہے مگر جو گندم بے وقت بوئے اسے دانہ نہیں ملتا کیونکہ اس نے وقت نکال دیا، اس میں قصور بندے کا ہے نہ کہ حق تعالیٰ کی رزاقیت ناقص۔

تفسیر صوفیانہ

انسانی اعضاء میں زبان بہت ہی اہم عضو ہے کہ اس کا ایک ہی لفظ مقبول بنا دیتا ہے اور ایک لفظ مردود بھی کر دیتا ہے۔ جان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

یصاب الفتی من عثرة بلسانه   ولیس یصاب المرء من عثرة الرجل
معثرته فی القول یذهب راسه   وعثرة بالرجل تبرا علی مهل

یعنی انسان پاؤں کی لغزش سے نہیں مرتا زبان کی لغزش سے برباد ہو جاتا ہے کیونکہ پاؤں کی لغزش بیمار کر دیتی ہے جس کے بعد صحت کی امید ہے مگر زبان کی لغزش سر اڑا دیتی ہے۔ مثنوی شریف میں ہے۔

ایں زباں چوں سنگ وہم آہن وشست   آنچہ بجہد از زبان چوں آتش است
سنگ و آہن رامزن برہم گزاف   گہ زروئے نقل و گہ از روئے لاف
زانکہ تاریک است وہر سو پنبہ زار   درمیان پنبہ چوں باشد شرار
عالمی را یک سخن ویراں کند   روبہائے مردہ را شیران کند

یعنی تیری زبان پتھر و لوہا ہے جس سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں اور تیری عزت و آبرو دین و ایمان و جان و مال روئی کے کھیت ہیں روئی کے ڈھیروں کے نیچے آگ کا ہونا سخت خطرناک ہے اس لئے تو زبان سنبھال کر رکھ زبان کی ایک بات دنیا کو تباہ کر سکتی ہے اور مری لومڑی کو شیر بنا سکتی ہے۔ اس لئے یہاں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ بری بات کا اعلان ناپسند کرتا ہے کہ اس سے دین و ایمان کی کھیتی میں آگ لگ سکتی ہے۔ اسرار الٰہیہ عوام پر ظاہر کر دینا سخت خطرناک ہے۔ ہاں جو مغلوب الحال ہو کر بے

اختیار طور پر انا الحق یا سبحانی ما اعظم شانی کہہ بیٹھے تو معذور ہے۔ بشرطیکہ یہ زبان فانی سے نہ کہے زبان باقی سے کہے۔ اے میرے مقرب بندو! تم جو کھلی چھپی نیکی کرو گے اور جو اپنے مریدین اور معتقدین کو معافیاں دو گے وہ قابل اجر ہیں۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ جب رب تعالیٰ بندوں کو کسی کی پردہ دری کی اجازت نہیں دیتا تو ہم گنہگاروں کی پردہ دری خود کیوں فرمائے گا؟ وہ غیور ہے اس کی غیرت کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنی یا کسی اور کی پردہ دری نہ کرے۔ رب تعالیٰ ستار ہے اس کے محبوب ﷺ پردہ پوش۔ امید ہے کہ انشاء اللہ ہم عیبیوں کے عیب چھپے رہیں گے۔ شعر

جو یہاں عیب کسی کے نہیں کھلنے دیتے کب وہ چاہیں گے مری حشر میں رسوائی ہو

خیال رہے کہ ہمارے تمام اعضاء سے گناہ بھی ہوتے ہیں نیکیاں بھی۔ مگر زبان کے گناہ زیادہ خطرناک ہیں۔ اور زبان کی نیکیاں بہت فائدہ مند کہ ایک لفظ سے مقبول مردود بن جاتے ہیں اور مردود مقبول۔ ایک بات سے ابلیس مردود ہو گیا اور ایک ہی بات سے فرعونی جادوگر مقبول انسان۔ زبان مظہر کمال پروردگار ہے، اس کے بولے ہوئے لفظوں میں عجیب تاثیریں ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ
بے شک وہ لوگ جو انکار کرتے ہیں اللہ کا اور اس کے رسول کا اور ارادہ کرتے ہیں یہ کہ
وہ جو اللہ اور رسولوں کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ
یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ
فرق کریں درمیان اللہ اور رسولوں اس کے اور کہتے ہیں کہ ایمان لاتے ہیں ہم بعض پر اور کفر کرتے ہیں ہم
اللہ اور اس کے رسولوں کو جدا کر دیں اور کہتے ہیں ہم کسی پر ایمان لائے اور کسی کے
بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓىِٕكَ
بعض کا اور ارادہ کرتے ہیں یہ کہ بنائیں درمیان اس کے راستہ یہ لوگ
منکر ہوئے اور چاہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے بیچ کوئی راہ نکالیں یہ ہی ٹھیک
هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ﴿۱۵۱﴾
وہ کافر ہیں پکے اور تیار کیا ہے ہم نے واسطے کافروں کے عذاب اہانت والا
ٹھیک کافر اور ہم نے کافروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں چھپے کافروں یعنی منافقین کی تردید تھی، اب ان آیات میں کھلے کافروں یعنی یہود و نصاریٰ کی تردید فرمائی

جا رہی ہے تا کہ مسلمان منافقوں کے عیوب سے بھی بچے رہیں اور یہود و نصاریٰ کے عیوب سے بھی پرہیز کریں۔

دوسرا تعلق: گزشتہ آیت میں بری باتوں کے اعلان کی ممانعت فرمائی گئی اب یہاں ان بری باتوں کے اعلان کی برائی بیان ہو رہی ہے جو کفر کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ گویا پہلے بری باتوں کا اجمالی ذکر تھا اب ان کی کچھ تفصیل ہو رہی ہے۔

تیسرا تعلق: پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ ہم تمہاری ہر چھوٹی بڑی نیکی سے خبردار ہیں، جزاء خیر دیں گے۔ اب جزائے خیر ملنے کی شرط بیان ہو رہی ہے یعنی ایمان کامل ہونا اور ہر کفر سے بچنا کیونکہ کفر کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی قبول نہیں۔

چوتھا تعلق: گزشتہ آیات میں ان منافقین کا ذکر تھا جو ایک اعتبار سے کافر تھے، ایک اعتبار سے مومن۔ یعنی زبان سے مومن دل سے کافر۔ اب ان اہل کتاب کفار کا ذکر ہے جو بعض نبیوں کے مومن تھے بعض نبیوں کے کافر۔

شان نزول

یہ آیت کریمہ یہود و عیسائیوں یا دونوں کے متعلق نازل ہوئی کہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام اور توریت کو مانا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور محمد مصطفےٰ ﷺ کا بھی انکار کیا اور انجیل شریف و قرآن مجید کا بھی انکار کیا۔ اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام و انجیل شریف کو مانا اور حضور ﷺ اور قرآن مجید کا انکار کیا۔ ان دونوں جماعتوں کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خازن وخزائن)

تفسیر

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ کسی مضمون کی اہمیت دکھانے یا اس کے منکرین کا شک دور کرنے کے لئے اِنَّ یا قَدْ سے مضمون کی تاکید کی جاتی ہے۔ یہاں نہایت اہم مضمون بیان ہو رہا ہے کہ ایک نبی انکار سارے رسولوں کا انکار ہے بلکہ رب تعالیٰ کا بھی انکار ہے نیز اس مضمون کے انکاری بہت لوگ تھے کہ عیسائی یہودی حضرات انبیاء کا انکار کرتے تھے پھر اپنے آپ کو ایماندار کہتے تھے۔ ان دو وجہوں سے یہاں اِنَّ ارشاد ہوا الَّذِیْنَ سے کبھی صحابہ کرام مراد ہوتے ہیں جیسے اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (الحجرات: ۳) کہیں سارے متقی مسلمان جیسے اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى (انبیاء: ۱۰۱) کبھی سارے انسان کبھی سارے جن و انس، کبھی سارے جن و انس و فرشتے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہاں سارے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ یَكْفُرُوْنَ کفر سے بنا ہے۔ جس کا معنی ہے چھپانا یا انکار کرنا۔ اگر اس کا مقابلہ شکر سے ہو تو چھپانے کے معنی میں ہوتا ہے جیسے وَاشْكُرُوْا لِیْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ (بقرہ: ۱۵۲) اور اگر اس کا مقابلہ ایمان سے ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں انکار کرنا۔ یہاں اس معنی میں ہے کیونکہ آگے اس کے مقابل ایمان آرہا ہے اگرچہ یہود و نصاریٰ نہ اللہ کے انکاری تھے نہ سارے رسولوں کے بلکہ چند رسولوں کو نہ مانتے تھے۔ مگر چونکہ ایک نبی کا انکار سارے رسولوں بلکہ رب تعالیٰ کا انکار ہے اس لئے بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ فرمایا لہٰذا آیت بالکل واضح ہے۔ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ یہ جملہ مذکورہ کفر کی وجہ بیان فرما رہا ہے۔ کسی چیز کو پسند کرنا، کسی چیز کی تمنا کرنا، کسی چیز کے حاصل کرنے کا ارادہ کرنا۔ ان تینوں میں بہت فرق ہے۔ ارادہ کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو محض ارادہ کرنا۔ دوسرے ارادہ کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ یہاں یہ ہی صورت مراد ہے۔ یُرِیْدُوْنَ حال استمراری ہے۔ یعنی وہ لوگ یہود و نصاریٰ چاہتے اور کوشش کرتے

ہیں اور چاہتے وکوشش کرتے رہیں گے۔ قیامت تک ان کی جانی، مالی، بدنی کوشش رہے گی۔ آج بھی عیسائیوں کے ہسپتال کالج وغیرہ اسی طرح مسلمانوں کو مالی مدد دینا صرف اسی لئے ہے۔ یُرِیْدُوْنَ فرما کر اشارۃً یہ بھی فرمایا کہ وہ یہود و نصاریٰ یہ ارادے وکوشش کرتے ہی رہیں گے مگر ایسا کر نہ سکیں گے، تمہارا چاند ہمیشہ ترقی میں ہی رہے گا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (الصف: ۸) خیال رہے کہ یہاں ارادہ سے وہ ارادہ مراد ہے جو کام کے ساتھ ہوتا ہے۔ کام سے پہلے والا ارادہ مراد نہیں۔ یُّفَرِّقُوْا بنا ہے تفریق سے جس کے معنی ہیں جدا کرنا یا جدا سمجھنا۔ جدائی و علیحدگی بہت قسم کی ہیں۔ جسمانی جدائی، مکانی، زمانی، جنانی، رتبہ کی جدائی، ایمانی جدائی، عداوت کی جدائی، یہاں ماننے اطاعت کرنے ادب واحترام محبت کرنے ذکر کرنے میں جدائی مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ماننے، اس کی اطاعت کرنے، اس کا ادب و تعظیم کرنے، اس کی محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور حضور ﷺ کو نہ مانتے ہیں اور نہ اطاعت کرتے ہیں نہ ان کا ادب واحترام کرتے ہیں نہ ان سے محبت کرتے ہیں یا عداوت ونفرت والی جدائی مراد ہے، یعنی محبت میں اللہ ورسول میں جدائی کرتے ہیں کہ رب سے محبت کرتے ہیں رسول سے عداوت۔ رتبہ کی جدائی مراد نہیں۔ اس فرق کا مقابل ہے جمع یا وصل یعنی کفار اللہ تعالیٰ اور اس کے سچے رسولوں میں ایمانی جدائی کرنے کو پسند کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور بعض رسولوں پر ایمان لاتے ہیں بعض رسولوں کا انکار کرتے ہیں یا اللہ اور رسولوں میں فصل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے حضور ﷺ کا انکار کیا بلکہ ان میں سے قوم سامرہ نے یوشع علیہ السلام کے بعد سارے نبیوں کا انکار کیا۔ عیسائیوں نے ہمارے حضور ﷺ کا انکار کیا۔ تفسیر ابن کثیر میں فرمایا کہ مجوسی بھی ایک نبی پر ایمان لائے جس کا نام زرادشت ہے۔ باقی انبیاء کرام کا انکار کر گئے۔ یہ سارے بے دین ہیں۔ رسل جمع ہے رسول کی بمعنی فرماں رساں اور فیضان رساں۔ کبھی نبی کے ہم معنی ہوتا ہے کبھی نبی سے خاص۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں اور رسول صرف تین سو تیرہ اور مرسل صرف چار یہاں نبی کے ہم معنی ہیں۔ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ یہ جملہ مذکورہ تفریق کا بیان ہے اور قول سے مراد دلی قول یعنی عقیدہ ہے۔ بعض سے مراد مطلقاً بعض ہے جو ایک کو بھی شامل ہے اور ایک کم کل کو بھی۔ کیونکہ عیسائی صرف ہمارے حضور ﷺ کے انکاری تھے۔ یہودی حضرت سلیمان، ہمارے حضور ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکاری مجوسی سوا ایک نبی کے سارے پیغمبروں کے انکاری۔ یہ کلمہ ان سب کو شامل ہے۔ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا۔ ارادہ کے وہی دو معنی ہیں جو ابھی بیان ہوئے۔ اتخاذ سے مراد ہے اپنی طرف سے بنانا۔ ذٰلِکَ سے اشارہ کفر و اسلام کی طرف ہے۔ سبیل سے مراد ہے راہِ خدا یا راہِ ہدایت یعنی مشرکین تو سارے نبیوں کے انکاری۔ مومنین سارے نبیوں کے اقراری۔ یہ لوگ ان دونوں جماعتوں کے درمیان کہ بعض کے انکاری بعض کے اقراری۔ یہ ہے کہ ان کا نہ ادھر ہونا نہ ادھر ہونا۔ بلکہ بیچ میں لٹکا ہوا۔ ادھر ہونا چاہتے ہیں کہ اس کفر و ایمان کے بیچ ایک راہ نکالیں جو ان دونوں سے الگ ہو۔ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ اُولٰٓىِٕكَ سے انہی بے دینوں کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ یہ لوگ رحمت سے بہت دور تھے اس لئے اشارہ

اُولٰٓئِكَ اشارہ بعید ارشاد ہوا۔ هُمُ حصر کے لئے ہے۔ یہ حصر اضافی مومنوں کے لحاظ سے ہے یا ان مردودوں کے ایمان کی نفی کے لئے۔ کافروں سے مراد ہے پورے کافر جن میں ایمان کا شائبہ بھی نہ ہو۔ کیونکہ ایمان و کفر کے درمیان کوئی دین نہیں۔ حق مقابل باطل کا نہیں بلکہ مقابل نقصان یا کمی کا ہے یا مقابل شک و تردد کا۔ یعنی یہ یہود و نصاریٰ پورے نرے کافر ہیں بعض نبیوں کو مان لینے سے ان کے کفر میں کمی نہیں آ گئی۔ جیسے تمام نبیوں کا، اللہ تعالیٰ کا منکر خالص اور نرا کافر ہے ایسے ہی یہ بھی یا یہ لوگ یقیناً کافر ہیں۔ مسلمانو تم ان کے کفر میں تردد و شک نہ کرنا۔ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا۔ یہ ان کے کفر کا انجام ہے۔ اَعْتَدْنَا بنا ہے اعداد سے جس کا مادہ ہے عدد۔ بمعنی تیار و مہیا کر رکھنا۔ کافرین سے مراد یا سارے کافر ہیں یا خاص یہ یہود و نصاریٰ۔ دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ کیونکہ بعض کفار کو دوزخ میں ذلیل نہ کیا جائے گا۔ مہین بنا ہے اہانت سے۔ جس کا مادہ ہے ھون۔ بمعنی ذلت و خواری۔ یعنی ہم نے ان بدنصیب کفار کے لئے دوزخ کا وہ عذاب تیار کر رکھا ہے جو سخت تکلف دہ ہونے کے ساتھ انہیں ذلیل و خوار اور رسوا کرنے والا بھی ہے۔ یہاں عذاب سے آخرت کا عذاب مراد ہے جو بعد قیامت شروع ہوگا۔ دنیاوی اور برزخی تکالیف تو اس کا پیش خیمہ ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید ہماری تعلیم کے لئے بھیجا مگر تعلیم کے لئے دو چار طریقے اختیار فرمائے۔ صراحۃً حکم یا ممانعت۔ جیسے نماز پڑھو، زکوٰۃ دو یا زنا کے قریب نہ جاؤ، نیکیوں کی جزا گناہوں کی سزا کا ذکر جیسے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن: ۴۶) نیک لوگوں کے اعمال، اقوال کا تذکرہ کرنا تاکہ ہم بھی ان کی تقلید کریں۔ بروں کے حالات، اعمال اور اقوال کا ذکر کرنا تاکہ ہم ان سے بچیں۔ یہاں اس آیت میں چوتھی قسم کی تعلیم ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ کے قول و فعل کا ذکر تاکہ ہم ان سے الگ رہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا: اے مسلمان! یقین کرلو کہ یہ یہود و نصاریٰ وغیرہ جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بھی انکاری ہیں اور سارے نبیوں کے بھی انکاری۔ کیونکہ وہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے سارے نبیوں کا انکار کرتے ہیں وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں میں جدائی کر دیں کہ اللہ تعالیٰ کو تو ماننے، جاننے، اطاعت کرنے کا مستحق سمجھیں مگر اس کے رسولوں کو مستحق نہ جانیں۔ وہ اس کے مدعی ہیں کہ ہم بعض رسولوں پر تو ایمان اختیار کرتے ہیں اور بعض کے مراتب و درجات و نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا ارادہ یہ ہے کہ نہ تو مومنوں کی طرح اللہ تعالیٰ اور سب رسولوں پر ایمان ہی لائیں اور نہ مشرکین و دہریوں وغیرہم کفار کی طرح سب کا انکار ہی کریں۔ وہ ایمان اور کفر کے درمیان ایک اور راہ نکالنا چاہتے ہیں حالانکہ ایمان و کفر کے درمیان کوئی اور راہ نہیں ہے۔ دو ہی راستے ہیں ایمان یا کفر، جان رکھو کہ ایسے لوگ پکے کافر ہیں جن میں ایمان کا شائبہ بھی نہیں۔ ہم نے ایسے تمام کافروں کے لئے آخرت میں وہ عذاب تیار کر رکھا ہے جو دائمی بھی ہوگا اور سخت تکلیف دہ بھی اور ساتھ ہی ان کے لئے بہت رسوائی، خواری اور ذلت کا باعث بھی۔ تم ان چیزوں میں کچھ بھی تردد نہ کرو۔ خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ اور تمام رسولوں میں فرق مراتب کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ رب ہے باقی سب اس کے بندے۔ یونہی حضرات بعض انبیاء کرام کے درجے یکساں

نہیں۔ بعض بعض سے افضل ہیں۔ مگر ایمان، ادب واحترام اور اطاعت میں بالکل فرق نہیں کر سکتے، ان چیزوں میں فرق کرنا کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ حق ہے اس کے سارے رسول حق ہیں۔ سب کا ادب واحترام ضروری ہے۔ رب تعالیٰ کی بے ادبی اور کسی نبی کی بے ادبی کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (توبہ: ۶۶) اور فرماتا ہے۔ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (الحجرات: ۲) یونہی تمام نبیوں کو اپنے اپنے وقت میں سچا ومطاع ماننا لازم ہے۔ اگرچہ اب منسوخ احکام پر عمل نہ ہوگا۔ ان تینوں چیزوں میں اللہ ورسول میں اور تمام رسولوں میں فرق نہ کرنا ضروری ہے۔ نبی کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح داخل فی الدین ہے۔ رب کے حکم کو غلط کہا تو کافر ہوا۔ حضور کے حکم کو غلط کہا تو کافر ہوا۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** ایک نبی کا انکار تمام نبیوں بلکہ خود رب تعالیٰ کا انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ماننے اس پر ایمان لانے کا صرف یہ ہی ذریعہ ہے کہ اس کے سب رسولوں پر ایمان لایا جائے جیسا کہ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ سے معلوم ہوا۔ کیونکہ یہود ونصاریٰ نہ تو سب رسولوں کے منکر تھے نہ اللہ تعالیٰ کے انکاری بلکہ بعض رسولوں خصوصاً ہمارے حضور ﷺ کے منکر تھے تو ان کے لئے فرمایا گیا يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ۔ **دوسرا فائدہ:** ایمان کی جان ہے اللہ ورسول کو ملانا۔ اور کفر کی حقیقت ہے اللہ ورسول میں فرق کر دینا جیسا کہ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ سے معلوم ہوا۔ بعض لوگ ہم اہلسنّت سے کہتے ہیں کہ تم اللہ رسول کو ملا دیتے ہو۔ بے شک ہم اللہ رسول کو ملاتے ہیں اور ملانے ہی کا نام ایمان ہے۔ جیسا کہ انشاء اللہ تفسیر صوفیانہ میں عرض کیا جائے گا۔ **تیسرا فائدہ:** جیسے کہ کسی معین خاص نبی کا انکار کفر ہے۔ ایسے ہی ابہاماً بعض نبیوں کا انکار بھی کفر ہے۔ تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری جیسا کہ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** کفر واسلام کے درمیان کوئی واسطہ نہیں یعنی ایسا کوئی مذہب نہیں جو نہ کفر ہو نہ اسلام بلکہ یا کفر ہوگا یا ایمان۔ یہ ہی اہلسنّت کا مذہب ہے یہ فائدہ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا سے حاصل ہوا۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ فسق وہ درجہ ہے جو کفر واسلام کے درمیان ہے فاسق نہ مومن ہے نہ کافر۔ یہ آیت ان کی تردید کر رہی ہے۔ **پانچواں فائدہ:** اسلام۔ ایمان یونہی کفر میں کمی بیشی مقداری نہیں ہو سکتی جو مومن ہے وہ پورا مومن ہے، جو کافر ہے وہ پورا کافر۔ آدھا۔ تہائی اور چوتھائی مومن کوئی نہیں جیسا کہ اَلْكٰفِرُوْنَ حَقًّا سے معلوم ہوا۔ ہاں کیفیت ایمان یونہی کیفیت کفر میں کمی بیشی ہو سکتی ہے کہ بعض لوگ کامل مومن ہوں بعض کامل کافر۔ اعلیٰ حضرت نے کیا خوب فرمایا۔ شعر

ہوں مسلماں گرچہ ناقص ہی سہی اے کاملو! ماہیت پانی کی یم سے نم میں ہرگز کم نہیں

قطرہ اور دریا پورا پانی ہیں آدھا پانی کوئی نہیں۔ ماہیت کلی متواطی ہے مشکک نہیں۔ **چھٹا فائدہ:** قرآن مجید کی ایک آیت کے منکر اور سارے قرآن کے منکر پورے کافر ہیں۔ یوں ہی ایک نبی کا انکار اور سارے نبیوں کا انکاری یکساں کافر ہے۔ یہ فائدہ بھی اَلْكٰفِرُوْنَ حَقًّا سے معلوم ہوا۔ نماز میں اگر ایک رکن رہ جائے یا سارے رکن رہ جائیں نماز بیکار ہے۔ **ساتواں فائدہ:** اگرچہ ایمان کے ارکان بہت ہیں۔ توحید، رسالت، جنت، دوزخ، فرشتوں وغیرہ کا ماننا، مگر جس پر مدار ایمان ہے

وہ صرف نبوت ہے۔ اس لئے نبوت بدلنے سے دین بدل جاتا ہے۔ دیکھو عیسائیت، یہودیت، اسلام الگ الگ دین ہیں مگر ان سب میں توحید، ملائکہ، دوزخ، جنت وغیرہ تمام عقائد میں اتفاق ہے۔ صرف نبوت میں فرق ہے کہ ان لوگوں کے نبی اور ہیں ہمارے نبی اور۔ توحید وغیرہ گویا جنس ہے نبوت فصل۔ نوعین جنس میں متفق ہوتی ہے، فصلوں کے اختلاف کی وجہ سے بدلی جاتی ہیں۔ یہ فائدہ بھی اَلْكٰفِرُوْنَ حَقًّا سے حاصل ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** گناہ گار مسلمانوں کو اگر چہ آخرت میں عذاب ہو جاوے گا مگر انہیں اللہ تعالیٰ رسوا وذلیل نہ کرے گا۔ خواری و رسوائی صرف کفار کی ہوگی جیسا کہ عَذَابًا مُّهِيْنًا سے معلوم ہوا۔ **نواں فائدہ:** سارے کافروں کو خواری کا عذاب ہوگا اگر چہ بعض کا عذاب زیادہ تکلیف دہ ہو بعض کا ہلکا۔ یہ فائدہ لِلْكٰفِرِيْنَ کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔ **دسواں فائدہ:** دوزخ اور وہاں کے تمام عذاب پیدا ہو چکے ہیں اگر چہ ان میں داخلہ بعد قیامت ہوگا۔ یہ فائدہ اَعْتَدْنَا ماضی فرمانے سے حاصل ہوا۔ **گیارھواں فائدہ:** دوزخ کے عذاب ان کے مستحقین کے نامزد ہو چکے ہیں۔ جن کا ظہور بعد قیامت ہوگا یہ بھی اَعْتَدْنَا سے معلوم ہوا۔ **بارھواں فائدہ:** جیسے ایمان کے لئے ساری کتابوں اور قرآن کی ساری آیتوں، اللہ کے سارے نبیوں کو ماننا ضروری ہے کہ ان میں سے ایک کا انکار کفر ہے۔ یونہی ایمان کے لئے حضور کے سارے صحابہ، سارے اہل بیت کو ماننا ضروری ہے کہ ان میں سے ایک کا انکار کفر ہے۔ حضرت علی کو نبی سے بڑھا دینا، باقی صحابہ کو گالیاں دینا وہی یہودیانہ طریقہ ہے کہ بعض نبیوں کو وہ خدا کا بیٹا کہتے تھے اور بعض کے دشمن تھے الحمدللہ اہلسنّت کا بیڑا پار ہے کہ وہ صحابہ و اہل بیت کے دل و جان سے غلام ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا کفر ہے تو کیا ہم رسولوں کو خدا مان لیں؟ خدا کو رب اور خالق مانا جاتا ہے، رسولوں کو بندہ اور مخلوق یہ بھی تو فرق ہو گیا۔ تو چاہیے کہ یہ بھی کفر ہو؟ **جواب:** اس کا جواب انشاء اللہ تفسیر صوفیانہ میں آتا ہے۔ وہاں مطالعہ فرماؤ۔

دوسرا اعتراض: هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا نحوی ترکیب سے حصر کا فائدہ دے رہا ہے۔ یعنی صرف یہود و نصاریٰ ہی پکے کافر ہیں۔ تو کیا ان دونوں فرقوں کے سوا باقی تمام کفار و مشرکین کچے کافر ہیں یا مومن ہیں حصر کے کیا معنی؟ **جواب:** آپ نے یہاں حصر کے معنی الٹے کر دیئے ہیں اس کے معنی ہیں کہ یہ لوگ پکے کافر ہی ہیں، یہ مومن ہرگز نہیں وہ کفر میں منحصر ہیں کفر ان میں منحصر نہیں جیسے اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (کہف: ۱۱۰) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف میں ہی بشر ہوں بلکہ معنی یہ ہیں کہ میں صرف بشر ہی ہوں۔ نہ خدا ہوں نہ خدا کا شریک۔

تیسرا اعتراض: یہاں اَلْكٰفِرُوْنَ حَقًّا کیوں فرمایا۔ کافر جھوٹے اور کفر نرا جھوٹ اور باطل ہے، وہ حق بالکل نہیں؟ **جواب:** یہاں حق باطل کے مقابلہ میں نہیں بلکہ حق بمعنی یقیناً ہے یا بمعنی کامل مشکوک اور ناقص کا مقابل یعنی یہ لوگ یقیناً کافر ہیں یا پورے کافر ہیں لہٰذا آیت واضح ہے (تفسیر کبیر)۔

چوتھا اعتراض: جب عیسائی یہودی پکے کافر ہیں تو ان کی عورتوں سے مسلمان مردوں کا نکاح کیوں جائز ہے اور ان

کا ذبیحہ کیوں حلال ہے۔ دوسرے کفار کی طرح یہ دونوں حرام ہونے چاہیے تھے۔ **جواب:** ان احکام میں حضرات انبیاء کرام کی عظمت و محبوبیت کا اظہار ہے کہ جو اپنے کو ان کا امتی کہے اور اپنے کو ان سے نسبت دے اگرچہ یہ نسبت جھوٹی سی ہو۔ تب بھی اس نسبت کا فائدہ اسے پہنچے گا کہ اس کے احکام دوسرے کفار سے ہلکے ہوں گے۔ جب ان نبیوں سے جھوٹی سی نسبت نے اتنا فائدہ دے دیا تو جس کو حضور سے سچی نسبت ہو جائے۔ سوچ لو کہ اسے کیسے فائدے ہوں گے؟ خیال رہے کہ عیسائی یہودی عورتوں سے نکاح جائز ہے سنت نہیں کہ حضور ﷺ اور خلفائے راشدین نے کبھی کسی اہل کتاب عورت سے نکاح نہ کیا اور اس جواز کی بھی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مذہبی عیسائی ہوں صرف قومی عیسائی نہ رہ گئے ہوں جیسے آج کل کے عام انگریز جو مذہبا دہریے ہیں آسمان کے منکر بلکہ اللہ تعالیٰ کے انکاری ہیں۔ لہٰذا موجودہ میموں سے مسلمانوں کا نکاح حرام ہے۔ دوسرا یہ کہ مسلمان میں کھینچ لینے کی قوت ہو۔ خود یا اپنے بچوں کے ادھر کھچ جانے کا اندیشہ نہ ہو یعنی خود یا اس عورت سے پیدا شدہ بچے عیسائی نہ بن جائیں بلکہ ہو سکے تو وہ عیسائی مسلمان کی صحبت سے مسلمان ہو جائے، مسلمان موجودہ جو ویسے عیسائیت کی طرف مائل ہیں انہیں اہل کتاب عورتوں سے نکاح حرام ہے کہ یا تو وہ خود عیسائی ہو جائیں گے یا ان کی اولاد اس کافرہ کی صحبت سے عیسائی ہوگی۔

پانچواں اعتراض: یہود و عیسائی نہ تو سارے نبیوں کا انکار کرتے تھے نہ خدا تعالیٰ کا لہٰذا ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ رب تعالیٰ اور تمام رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔ خلاف واقعہ ہے یوں فرمانا چاہیے تھا کہ ان پر تمام نبیوں اور حق تعالیٰ کا انکار لازم آتا ہے۔ لزوم کفر اور چیز ہے التزام کفر کچھ اور غرضیکہ انکار کو ان کی طرف منسوب کرنا جھوٹ ہے اور قرآن مجید جھوٹ سے پاک ہے۔ **جواب:** لزوم کفر اور التزام کفر میں فرق وہاں ہوتا ہے جب التزام کفر پوشیدہ چیز ہو جس کے ثابت کرنے کے لئے مقدمات و دلائل کی ضرورت پڑے لیکن اگر التزام کفر بالکل ظاہر ظہور سمجھ میں آتا ہو دلیل کی ضرورت نہ پڑے تو لزوم و التزام ایک ہی ہو جاتا ہے۔ یہاں دوسری قسم کا لزوم ہے جس سے التزام ظاہر ظہور معلوم ہو رہا ہے (تفسیر کبیر) یہ قاعدہ بہت ضروری بھی ہے۔ باریک بھی۔ بہت خیال میں رہنا چاہیے۔ واقعی یہود و نصاریٰ سارے نبیوں کا اپنی زبان سے انکار نہیں کرتے مگر بعض نبیوں کا انکار سارے نبیوں کا انکار بالکل ظاہر ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام فرماویں محمد رسول برحق ہیں۔ عیسائی کہیں غلط ہے، محمد مصطفےٰ حق نہیں یہ ظاہر ظہور جناب عیسیٰ علیہ السلام کا انکار ہے۔

چھٹا اعتراض: آپ کے بیان سے معلوم ہوا کہ ایمان و کفر میں زیادتی کمی نہیں ہر مومن پورا مومن ہے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا ایمان نبی کے ایمان کے برابر ہے؟ **جواب:** اس کا جواب ابھی گزر گیا ہے کہ ایمان کے درجات مختلف ہیں مگر یہ درجے مقدار کے لحاظ سے نہیں کیفیت کے لحاظ سے ہیں معمولی مسلمان بھی آدھا یا پاؤ مومن نہیں پورا ہی مومن ہے اگرچہ کیفیت یقین میں فرق ہے۔ نبی کا ایمان بہت اعلیٰ ہے۔ دیکھو! ابراہیم علیہ السلام نے مردہ زندہ ہوتے دیکھنے کی خواہش کی تو رب نے فرمایا: کیا تم اس پر ایمان نہیں لائے عرض کیا بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (بقرہ: ۲۶۰) ہاں ایمان تو لا چکا ہوں مگر

دل کا اطمینان چاہتا ہوں۔ کیا مطلب ہے یہ ہی کہ علم الیقین کا اطمینان تو مجھے حاصل ہے حق الیقین کا اطمینان چاہتا ہوں اس علم الیقین اور حق الیقین میں مقداری زیادتی کی نہیں کیفیت میں زیادتی کی ہے۔

ساتواں اعتراض: لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا میں الکافرین کو مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا تو کیا سوا ان یہود و نصاریٰ کے کسی اور کافر کو ذلت کا عذاب نہ ہوگا۔ ذلت کا عذاب تو ہر کافر کو ہوگا۔ پھر یہ حصر کیونکہ درست ہوا؟ **جواب:** اس کے دو جواب تفسیر میں عرض کر دیئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ الکافرین میں الف لام استغراقی ہو تو معنی یہ ہوئے کہ سارے کافروں کو ذلت کا عذاب ہوگا۔ دوسرا یہ کہ الف لام عہدی ہو یعنی ان کافروں یہود و نصاریٰ کو ہی ان دونوں قوموں کو بہت ذلت کا عذاب ہوگا تب عذاباً کی اور مُهِيْنًا کی تنوین تعظیمی ہوگی۔ یعنی ان دونوں قوموں کو بہت بڑا ذلت کا عذاب ہوگا کیونکہ یہ جانتے پہچانتے ہوئے کافر ہوئے۔ جاہل کے گناہ سے عالم کا گناہ سخت تر ہے۔ ان پوپ پادریوں کو حضور انور کی حقانیت، توریت و انجیل سے معلوم ہو چکی تھی پھر محض عناد سے انکاری تھے۔ جہلا مشرکین بے خبری سے منکر تھے تو یقیناً ان کا عذاب سخت تر ہونا چاہیے۔

آٹھواں اعتراض: تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ ماننے، ادب و احترام کرنے اور اطاعت کرنے میں اللہ و رسول میں فرق کرنا کفر ہے۔ اللہ و رسول دونوں کی اطاعت یکساں چاہیے حالانکہ اللہ کے احکام فرض ہیں اور حضور کے احکام سنت فرق تو موجود ہے۔ **جواب:** نہ تو اللہ تعالیٰ کے تمام احکام فرض ہیں نہ حضور کے سارے احکام سنت، جن کا قطعی حکم ہے وہ فرض ہے خواہ اللہ نے دیا ہو یا حضور نے۔ دیکھو نماز فرض ہے حکم الٰہی ہے مگر پانچ نمازیں فرض ہیں۔ ہر نماز میں اتنی رکعتیں فرض ہیں۔ یہ حکم رسول ہے۔ زکوٰۃ بحکم الٰہی فرض ہے اور زکوٰۃ کی مقدار بحکم رسول فرض ہے۔ سور بہ حکم الٰہی حرام ہے۔ کتا گدھا، بلا یہ بحکم رسول حرام ہیں۔ ہاں غیر قطعی احکام جائز یا مستحب ہیں خواہ رب تعالیٰ کے ہوں یا حضور کے۔ دیکھو قرض کا لکھ لینا حکم قرآنی ہے مگر صرف مستحب ہے کیونکہ وہ حکم قطعی نہیں۔ یونہی احرام سے کھل کر شکار کرنا حکم قرآنی ہے۔ مگر صرف جائز ہے۔ یونہی غلام کو مکاتب کر دینا صرف مستحب ہے کیونکہ یہ احکام قطعی نہیں اگرچہ حکم قرآنی ہے۔ بہر حال اللہ و رسول کی اطاعت یکساں ہے۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (مائدہ: ۹۲) بلکہ اگر کسی کو حضور خلاف قرآن حکم دیں تو اس کے لئے وہ ہی لازم ہے۔ دیکھو ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ۔

تفسیر صوفیانہ

از آدم علیہ السلام تا ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی پیغمبر نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت نہیں دی۔ سب نے ایمان کی دعوت دی، چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فارس و روم کے بادشاہوں کو جو تبلیغی دعوت نامے لکھے۔ ان میں یہ ہی فرمایا: اَسْلِمْ تَسْلِمْ اسلام قبول کرو سلامت رہو گے، وَحِّدْ تَسْلِمْ نہ فرمایا کہ توحیدی بنو، سلامت رہو گے۔ دوسری کفریات کی طرح خالی توحید بھی دوزخ کا راستہ ہے۔ ابلیس صرف توحید کی وجہ سے دوزخی بنا وہ مشرک نہیں ہے۔ جنت کا راستہ ایمان اور صرف ایمان ہے۔ توحید کی حقیقت ہے اپنی عقل کے ذریعے رب تعالیٰ کی وحدانیت

ماننا۔ نبی سے بے نیاز ہوکر۔ ایمان کی حقیقت ہے کہ رب تعالیٰ کی ذات وصفات کو پیغمبر کی معرفت جاننا۔ گویا نبی کے آئینہ میں رب کو نبوت کے شیشہ میں الوہیت رب تعالیٰ کو دیکھنا ایمان ہے۔ توحید کفر ہے ایمان ہدایت۔ اسی لئے قرآن کریم نے کسی جگہ توحید کا حکم نہ دیا، ایمان کا حکم دیا۔ ہم کو موحد کہہ کر نہ پکارا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر پکارا۔ ہمارا نام موحد نہ رکھا بلکہ مومن ومسلم رکھا۔ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (حج:۷۸) بلکہ قرآن مجید میں توحید کا مصدر اس کی مشتقات ماضی، مضارع، امر، اسم فاعل، اسم مفعول وارد نہ ہوئے۔ ایمان اور اس کے ماضی مضارع وغیرہ آمَنَ، یُؤْمِنُ، مُؤْمِنَات، اٰمَنُوْا وغیرہ سب کچھ مذکور ہوئے۔ نہ حضور ﷺ نے توحید کی دعوت دی بلکہ ایمان کی دعوت دی۔ پھر ایمان کا ڈھانچہ اور ہے اور روح ایمان کچھ اور۔ الوہیت، نبوت، قیامت وغیرہ کو مان لینا ایمان کا ڈھانچہ ہے۔ روح ایمان وہ ہے جو یہاں بیان ہوئی یعنی اللہ ورسول کو ملانا ان میں فرق نہ کرنا روح ایمان ہے اور ان میں جدائی روح کفر دیکھو! یہاں اللہ ورسول میں فرق کرنے والے کو الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا فرمایا گیا۔ پھر اللہ رسول کو ملانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ کو رسول یا رسول کو خدا مان لیا جائے کہ یہ عین شرک ہے بلکہ نبوت کو الوہیت کے ساتھ ایسے ملانا ضروری ہے جیسے لیمپ کے نور کے ساتھ چمنی کا رنگ ہوتا ہے کہ جہاں لیمپ کا نور وہاں چمنی کا رنگ یا جیسے نوٹ کے کاغذ کے ساتھ سرکاری تحریر ومہر کہ اگر یہ تحریر مٹا دی جائے تو نوٹ کی کوئی قیمت نہیں۔ یا قرآن کے کاغذ کے ساتھ نقوش قرآنیہ کا اتصال کہ اس وصل کی وجہ سے نقوش وکاغذ بلکہ اس کی جلد سب کا یکساں احترام ہوگا۔ جنبی نہ قرآن کے نقوش کو چھو سکتا ہے نہ کاغذ نہ اس کی جلد۔ احترام میں سب برابر ہیں۔ رب تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کے دو جز کیے ہیں۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ یہ توحید ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ یہ ہے نبوت۔ مگر پہلے جز میں اپنا نام یعنی اللہ آخر میں رکھا اور دوسرے جز میں حضور کا نام اول رکھا تاکہ ان دونوں ناموں میں لفظوں کا فرق بھی نہ ہو کوئی لفظ رب ومحبوب کے درمیان حائل نہ ہو۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

ضَمَّ الْاِلٰهُ اسْمَ النَّبِيِّ بِاسْمِهٖ　　　اِذْ قَالَ فِي الْخَمْسِ الْمُؤَذِّنُ اَشْهَدُ

اگر نجات کے لئے توحید کافی ہوتی تو قبر میں تیسرا سوال نبوت کا نہ ہوتا۔ لفظ توحید صوفیاء کی اصلاح میں استعمال ہوتا ہے مگر وہاں توحید سے مراد وحدت الوجود یا وحدت الشہود ہوتی ہے۔ وہ توحید نہیں جو ایمان کے مقابل ہے۔ اس توحید کا بیان یہ ہے۔

جہاں آئینہ حسن شاہد ما است　　　فَشَاهَدَ وَجْهَهٗ فِیْ کُلِّ ذَرَّاتٍ

دیگر

پناہ بلندی و پستی توئی　　　ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

دیگر

خود بن کے خلیل آپ کو آتش میں گرایا　　　اور خود ہی اس آگ کو گلزار بنایا

یوسف تمہی یعقوب تمہی تم ہی زلیخا موسیٰ تمہیں عیسیٰ تمہیں اور تمہیں ہو یحیٰ

مصرعہ: خودکوزہ وخودکوزہ گروخودگل کوزہ: غرضیکہ نجات کا مدار ایمان ہے اور ایمان کا مدار اللہ رسول کو ملانے پر ہے اسی لئے اسلام کے تمام فرائض میں سنتیں ایسی ملی ہوئی ہیں جیسے پانی کھانے سے کہ کوئی عبادت سنتوں سے خالی نہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد سب کو دیکھو۔ اس کی تفصیل ہم پہلے پارے میں عرض کر چکے ہیں۔

خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو قوموں کو نام لے کر کافر فرمایا ایک اللہ رسول میں فرق کرنے والوں کو جو یہاں مذکور ہے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا دوسرے صحابہ کرام کے دشمنوں کو۔ کہ فرمایا لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (فتح:۲۹)۔ شعر

میں اپنی حیاتی پہ قربان جاواں احد نال احمد ملیندے گزر گئی

خیال رہے کہ اگرچہ ایمان کے ارکان توحید، نبوت، قیامت فرشتوں وغیرہ کو ماننا ہے مگر دین وایمان کا مدار نبوت پر ہی ہے۔ نبوت میں سب ارکان خود بخود آ جاتے ہیں نبوت ہی کے بدلنے سے دین بدلتے ہیں۔ نصرانیت، یہودیت، اسلام اور تمام آسمانی دین توحید وغیرہ میں متفق ہیں صرف نبوت میں مختلف کہ یہودی موسیٰ علیہ السلام کی امت ہیں۔ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کی امت۔ ہم حضور ﷺ کی امت تو ان دینوں کو الگ الگ دین مانا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دین وملت صرف نبوت سے ملتے ہیں۔ نبوت اصل دین ہے۔ ابوجہل بھی کعبہ معظمہ کا طواف کرتا تھا اور حضرت ابوبکر صدیق بھی اسی کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ کعبہ ایک تھا مگر یہ دونوں ایک طرح کے نہ ہوئے کیونکہ ابوجہل براہ راست کعبہ پہنچتا تھا کافر رہا۔ حضرت صدیق اکبر حضور ﷺ کی معرفت کعبہ میں جاتے تھے۔ مؤمن، صحابی، حاجی سب کچھ بن گئے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے نمائندہ ہو کر مکہ معظمہ گئے۔ کفار مکہ نے کہا آپ کے لئے کعبہ حاضر ہے۔ آپ عمرہ کریں، زمزم پی لیں، صفا مروہ دوڑ لیں۔ ہم حضور ﷺ کو اس سال عمرہ نہ کرنے دیں گے۔ عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کہا میں حضور کے بغیر کعبہ کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا چہ جائیکہ طواف وسعی کروں۔ طواف وہی ہے جو کعبہ ایمان کے ساتھ کعبہ اجسام کا طواف ہو۔ شعر

سجدہ کرنا ہے تو یوں کر کہ ہو سجدے میں جھکا
سر خدا کے واسطے دل مصطفیٰ کے واسطے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ
اور وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ اور رسولوں پر اس کے اور نہ جدائی کی درمیان
اور وہ جو اللہ اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی پر ایمان
اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ
کسی کے ان میں سے یہ ہی لوگ ہیں کہ عنقریب دے گا انہیں ثواب ان کے اور

میں فرق نہ کیا انہیں عنقریب اللہ ان کے ثواب دے گا۔ اور

كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٥٢﴾

ہے اللہ بخشنے والا مہربان

اللہ بخشنے والا مہربان ہے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں کفار اور ان کی وجہ کفر کا تفصیلی بیان تھا اب مومنوں اور ایمان کا تفصیلی بیان ہے تا کہ لوگ گزشتہ عیوب سے بچیں اور یہ صفات اختیار کریں۔ مہربان طبیب بیمار کو پرہیز کی چیزیں بھی بتاتا ہے کہ فلاں فلاں چیز نہ کھانا اور کھانے کی غذائیں دوائیں بھی بتاتا ہے کہ علاج کی تکمیل ان دو چیزوں سے ہی ہوتی ہے۔ چونکہ علاج میں پرہیز پہلے ہے دوا بعد میں۔ لہٰذا یہاں کفر پہلے بیان ہوا۔ ایمان اب بیان ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کفار پر اظہار غضب تھا اب ان پر اظہار کرم ہے کہ اگر یہ لوگ ایسے عقیدے اختیار کرلیں تو ہم ان کے سب گناہ بخش دیں گے۔ **تیسرا تعلق:** آیت سے اشارۃً معلوم ہوا تھا کہ کافروں کی کوئی نیکی قبول نہیں اب ارشاد ہو رہا ہے کہ مؤمنوں کی تمام نیکیاں قبول ہیں کیونکہ ایمان شرط قبول ہے جو کافروں کو نصیب نہیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ مسلمانوں کو نصیب ہے۔

تفسیر

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: یہاں الَّذِيْنَ سے مراد سارے انسان ہیں جو ایمان لے آئیں اس "الَّذِيْنَ" میں جن و فرشتے داخل نہیں کیونکہ یہاں مومنوں سے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا جا رہا ہے اور اجر و ثواب نہ جنات کے لئے ہے نہ فرشتوں کے لئے، جنت صرف مؤمن انسانوں کے لئے ہے چنانچہ سورۂ احقاف میں ارشاد باری جنات کے متعلق ہے يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (احقاف: ۳۱) معلوم ہوا کہ جنات کو ایمان قبول کرنے کا بدلہ صرف یہ ملے گا کہ ان کے گناہوں کی معافی ہو جائے گی اور دردناک عذاب سے نجات۔ چونکہ اللہ رسول پر ایمان کے ضمن میں تمام ایمانیات پر ایمان لانا بھی شامل ہے اس لئے صرف اس کا ذکر فرمایا گیا۔ ان کا ذکر نہ ہوا۔ گویا یہ ایمان کا اجمالی ذکر ہے۔ رسل جمع فرما کر بتایا گیا کہ تمام نبیوں پر اجمالی ایمان کافی ہے۔ ایمان سارے رسولوں پر چاہیے اطاعت اس رسول کی جس کی امت میں ہو۔ چنانچہ قوم موسیٰ پر موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت فرض تھی۔ قوم عیسیٰ پر عیسیٰ علیہ السلام کی اطاعت فرض رہی اور اب ہمیشہ کے لئے حضور محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت فرض ہے۔ حتیٰ کہ خود موسیٰ علیہ السلام کی حیات شریف میں خضر علیہ السلام پر ان کی اطاعت فرض نہ ہوئی۔ آپ نے موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہی میں وہ کام کیے جو توریت شریف کے خلاف تھے کیونکہ حضرت خضر اسرائیلی نہ تھے۔ خیال رہے کہ نبوت کے منسوخ ہو جانے سے اس نبی کی اطاعت ختم ہو جاتی ہے، ان پر ایمان لانا اسی طرح واجب ہے۔ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا

بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اگرچہ یہ مضمون اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ میں آ گیا تھا مگر اس کی اہمیت دکھانے کے لئے اسے علیحدہ بیان فرمایا گیا۔ منہم کا مرجع اللہ تعالیٰ اور رسل سب ہی ہیں اس کی تفسیر وہ آیت ہے جو ابھی گزر گئی وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ (النساء: ١٥٠) یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں میں فرق نہ کریں۔ سب کو یکساں طور پر مانیں۔ اللہ تعالیٰ کو رب العالمین جانیں۔ رسولوں کو رب و مربوب خالق و مخلوق کے درمیان وسیلہ عظمیٰ سمجھیں۔ مدار ایمان اللہ اور رسولوں کو ملانا ہے غرض کہ اس جملہ میں تین چیزوں کا ذکر ہوا۔ اللہ پر ایمان لانا۔ اس کے ساتھ ہی اجمالاً تمام رسولوں پر ایمان لانا۔ تیسرا اللہ تعالیٰ اور کسی رسول میں فرق نہ کرنا۔ سب کو ماننا سب کا ادب کرنا۔ خیال رہے کہ ماننا تین قسم کا ہے ڈر سے ماننا، لالچ سے ماننا، محبت سے ماننا۔ ایمان نام ہے محبت سے ماننے کا۔ ہر نبی سے محبت ایمان کی جان ہے۔ ماننے، محبت کرنے اور ادب کرنے میں نبیوں میں فرق نہ کرے اُولٰٓئِكَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ، اُولٰٓئِكَ سے اشارہ الذین مذکورہ کی طرف ہے۔ سَوْفَ فرما کر اشارۃً فرمایا کہ اجر کی جگہ دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے اور آخرت بہت قریب ہے حکومتیں اپنے نوکروں سے زیادہ وقت کام کراتی ہیں، تھوڑی مدت پنشن دیتی ہیں۔ چنانچہ بڑھاپے میں ریٹائر کرتی ہیں مگر رب تعالیٰ ہم سے بہت تھوڑی مدت تیس چالیس سال کام لیتا ہے۔ برزخ کے ہزاروں سال آرام دیتا ہے۔ پھر بعد قیامت ابدالاباد تک انعام دے گا اس لئے سَوْفَ ارشاد ہوا۔ اُجُوْرَ سے مراد یا تو تمام نیکیوں کے ثواب ہیں یا ایک ایک نیکی کے بہت بہت سے ثواب یا ایمان کے بہت ثواب کہ ایمان بھی تو ایک عمل ہے بلکہ دوسرے اعمال کی جڑ ہے۔ ایک ایمان پر بہت سے ثوابوں کی امید ہے۔ دنیاوی حکومتیں اپنے نوکروں سے بہت سے کام کروا کر ایک تنخواہ دیتی ہیں مگر حکومت ربانی میں ایک ایک کام پر بیسیوں اجرتیں عطا ہوتی ہیں۔ ایک نماز میں وضو، مسجد میں آنے کا انتظار، نماز، سب کا ثواب علیحدہ علیحدہ ایسے ہی ایک ایمان میں لاکھوں ثواب۔ ہر نبی پر ایمان لانے کا الگ ثواب۔ سوا لاکھ ثواب تو یہ ہی ہو گئے۔ ہر فرشتے پر اجمالی ایمان لانے کا الگ ثواب۔ رب تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان لانے کا الگ ثواب۔ فرشتوں پر ایمان لانے کا الگ ثواب۔ جنت، دوزخ، قیامت پر ایمان لانے کے الگ ثوابات۔ صفات الٰہیہ تو بے شمار ہیں۔ فرشتے لاتعداد۔ تو انشاء اللہ ایمان کے ثوابات بے شمار ہوں گے۔ یہ ہیں ''اُجُوْرَهُمْ'' کے معنی وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا پہلے جملہ میں مؤمنوں کو ثواب دینے کا وعدہ تھا۔ اس جملہ میں ان کے گناہوں کے معافی کا بھی وعدہ ہے اور اجر کے علاوہ اور انعام و اکرام فرمانے کی امید ہے۔ كَانَ دوام و استمرار کے لئے ہے غفور کے معنی ہیں بخشنے والا رحیم کے معنی ہیں اعمال کے اجر سے کچھ زیادہ عطا فرمانے والا بعض نیکیوں کا ثواب ایک کا ایک لاکھ ہے۔ ایک ثواب تو اصل نیکی کا اجر اور ننانوے ہزار نو سو ننانوے عطیہ شاہانہ رحم خسروانہ کے طور سے یا جنت میں بعض نعمتیں بطور اجر عطا فرمانے والا جیسے وہاں کے حور و قصور اور بعض نعمتیں محض اپنے کرم سے دینے والا۔ جیسے اپنا دیدار اور حضور ﷺ سے قرب وغیرہ یا آخرت میں نیکیوں کا ثواب عطا فرمانے والا اور دنیا میں نیک کاموں کو بطور کرم و رحم نعمتیں، برکتیں، عزتیں، راحتیں عطا فرمانے والا۔ غرض کہ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا کی تین تفسیریں ہیں اور ہر تفسیر بہت ہی جامع۔ اس مختصری آیت میں ایمان اور اجزاء

ایمان کا بہت مکمل بیان ہے۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ میں ہمارے متعلق تین اعمال کا ذکر ہے اور تین جزاؤں کا مِنْهُمْ تک تین عمل ہیں۔ اور اُولٰٓئِكَ سے آخر تک تین جزائیں، عطائیں، کرم نوازیاں مذکور ہیں۔ مگر طریقہ بیان نہایت ہی نفیس ہے کہ عطاء اجر کے لئے تو صراحۃً وعدہ فرمایا سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اور معافی گناہ عطاء انعام کے لئے اپنی دو صفتوں کا ذکر فرمایا کہ ہم غفور بھی ہیں بخشنے کے عادی اور ہم رحیم بھی عمل سے زیادہ عطا فرمانے والے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: اے لوگو! تم اللہ و رسول میں فرق و جدائی سمجھنے والوں کا انجام تو سن چکے اب خوش نصیب مؤمنوں کا انجام و درجات بھی سنو۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے۔ از آدم علیہ السلام تا حضور محمد مصطفےٰ ﷺ مگر اس طرح ایمان لائے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں میں جدائی نہ کی۔ سب کو ایمان میں ملا دیا خواہ ان رسولوں کے نام و تعداد و حالات معلوم ہوں یا نہ ہوں یہ ہی وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنہیں عنقریب آخرت میں ان کے نیک اعمال کے ثواب بھی ملیں گے۔ یا خود ایمان پر بہت سے ثواب ملیں گے۔ یا ایک ایک نیکی کے بہت بہت ثواب ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا بھی ہے مہربان رحیم و کریم بھی لہٰذا ان کے سارے گناہ بخش دے گا اور انہیں اعمال کے ثواب کے علاوہ دنیا و آخرت میں اپنے کرم سے بہت کچھ اور بھی عطاء فرمائے گا اس کی عطاء ان کے وہم و گمان سے وراء ہوگی۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ایمان کی اصل اللہ تعالیٰ اور اس کے سارے نبیوں کو ماننا ہے کہ باقی ارکان ایمان قیامت وغیرہ کو مان لینا سب کچھ اس میں داخل ہے۔ یہ فائدہ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ سے حاصل ہوا۔ جو کوئی کسی رکن ایمان کا انکار کر دے وہ اللہ رسول پر صحیح طور سے ایمان نہ لایا کہ ان کے فرمان کو غلط سمجھا۔ **دوسرا فائدہ:** سارے نبیوں پر ایمان لانا انہیں برحق سمجھنا ضروری ہے۔ اگر چہ اب اطاعت صرف حضور ہی کی ہے۔ یہ فائدہ "وَ رُسُلِهٖ" جمع کثرت فرمانے سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** ایمان کی جان ہے اللہ رسول کو ملانا، ان میں فرق نہ کرنا۔ دیکھو! رب تعالیٰ نے یہاں ایمان کے ساتھ خصوصیت سے اس کا ذکر فرمایا کہ۔ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ۔ **چوتھا فائدہ:** اللہ رسول کے لئے ایک ضمیر استعمال کرنا شرعاً جائز ہے۔ دیکھو بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ میں ھم ضمیر اللہ تعالیٰ اور رسولوں سب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اسی طرح اللہ رسول کے لئے ایک صیغہ کا استعمال جائز ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (توبہ: ۷۴) انہیں اللہ رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا اور فرماتا ہے: مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (توبہ: ۵۹) جو انہیں اللہ رسول نے اپنے فضل سے دیا اور فرماتا ہے وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ (توبہ: ۹۴) تمہارے اعمال اللہ رسول دیکھیں گے اور فرماتا ہے: وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (توبہ: ۶۲) اللہ رسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ اسے راضی کریں اور فرماتا ہے: اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ (احزاب: ۳۷) جس پر اللہ نے اور تم نے انعام کیا۔ دیکھو! ان آیات میں۔ اَغْنٰى سَيَرَى، اَنْعَمَ وغیرہ صیغے ایک ایک ہیں

مگر ان کا فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔ لہٰذا یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو اللہ رسول نے ایمان دیا۔ اللہ رسول کے فضل وکرم سے ہم دین ودنیا کی نعمتیں پاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ **پانچواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ صرف ایمان پر بھی بہت سی قسم کے ثواب عطا فرمائے گا جیسا کہ ''اُجُوْرَھُمْ'' کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** ایمان کے ساتھ نیکیاں کرنا ثواب کا ذریعہ ہیں کافر کو نیکی کا ثواب نہیں جیسا کہ ''اُجُوْرَھُمْ'' کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** ایمان لانے کے بعد زمانہ کفر کی نیکیوں کا بھی ثواب مل جاتا ہے۔ کفر کے گناہ مٹ جاتے ہیں، نیکیاں قبول ہو جاتی ہیں جیسا کہ اُجُوْرَھُمْ کی تیسری تفسیر سے معلوم ہوا۔

آٹھواں فائدہ: ایمان لانے پر زمانہ کفر کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ حقوق اللہ ادا کرنے ہوں گے جیسا کہ غَفُوْرًا سے معلوم ہوا۔ **نواں فائدہ:** بندۂ مومن کو صرف اعمال کی جزا ہی نہ ملے گی بلکہ بہت سے انعام واکرام بھی عطا ہوں گے جیسا کہ رَّحِیْمًا کی تفسیر سے معلوم ہوا وہ انعام واکرام بندے کے فہم سے وراء ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ صرف اللہ تعالیٰ اور رسولوں کو مان لینا ان میں فرق نہ کرنا ایمان کے لئے کافی ہے۔ تو کیا فرشتوں، جنت، دوزخ، قیامت، آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری نہیں؟ **جواب:** اس کا جواب پہلے معلوم ہو چکا کہ ان ہستیوں پر ایمان لانا اصلی ہے ان کو مان لینے سے ان بقیہ چیزوں کا مان لینا خود بخود لازم آ گیا۔ جو ان چیزوں کو نہ مانے وہ درحقیقت اللہ رسول کو صحیح طور پر مانتا ہی نہیں۔ سو کے عدد میں ساری اکائیاں دہائیاں آ جاتی ہیں۔ اللہ رسول پر ایمان لانے میں سارے ایمانیات پر ایمان آ جاتا ہے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسولوں میں فرق نہ کرنا چاہیے مگر دوسری جگہ ارشاد ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (بقرہ: ۲۵۳) تم ہی کہتے ہو کہ گروہ انبیاء میں سب سے افضل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہم یہ ہی تو تفریق ہے لہٰذا آیات میں تعارض ہے۔ **جواب:** حضرات انبیاء کرام کے مراتب میں ترتیب ہے۔ نبوت میں تفریق کرنا کفر ہے کہ ان میں کسی ایک کی نبوت کا انکار کفر ہے۔ یا کسی نبی کو اصلی نبی کسی کو عارضی، ظلی نبی ماننا کفر ہے۔ نفس نبوت میں تمام انبیائے کرام برابر ہیں سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کی مکمل بحث تیسرے پارے میں لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ: ۲۸۵) کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

تیسرا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ رسول کے لئے ایک ضمیر لانا جائز ہے۔ مگر حدیث شریف میں ہے کہ کسی خطیب نے اپنے خطبے میں یوں پڑھ دیا وَمَنْ یَّعْصِهِمَا یعنی هُمَا ضمیر اللہ رسول کے لئے ایک ہی استعمال فرمائی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ناراض ہوئے اور فرمایا ''بِئْسَ الْخَطِیْبُ اَنْتَ تو بہت ہی برا خطیب ہے''۔ لہٰذا آیت اور حدیث میں تعارض ہے۔ **جواب:** اس کے جواب نوصری شرح مسلم شریف میں بہت دیئے ہیں ایک یہ کہ سرکار عالی کا یہ فرمان تعلیم استحباب کے لئے ہے یعنی بہتر یہ ہے کہ اللہ رسول کے لئے الگ الگ ضمیریں لائی جائیں۔ جائز یہ بھی ہے کہ ایک ہی ضمیر لائی

جائے دیکھو ایک شخص نے حضور کو سید کہا تو فرمایا ''اَلسَّيِّدُ هُوَ اللّٰهُ سید تو اللہ تعالیٰ ہی ہے'' یہاں ماسوا اللہ کو سید کہنا پسند نہ فرمایا۔ دوسرے موقعہ پر حضرت سعد بن معاذ کے لئے فرمایا ''قُوْمُوْا اِلٰى سَيِّدِكُمْ اپنے سید کے لئے کھڑے ہو جاؤ'' یا ارشاد فرمایا اپنے غلام کو عبدی نہ کہے۔ حالانکہ قرآن کریم فرما رہا ہے: مِنْ عِبَادِكُمْ (النور: ۳۲) یا فرمایا انگور کو کرم نہ کہو کرم تو اللہ تعالیٰ ہے یہ تمام ممانعتیں خلاف اولیٰ کے لئے ہیں اور قرآن کریم کی آیات بیان جواز کے لئے۔

چوتھا اعتراض: یہاں اُجُوْرَهُمْ کیوں جمع فرمایا ایمان ایک عمل ہے تو اس کا ثواب بھی ایک ہی چاہیے۔

جواب: اس جمع فرمانے میں تین حکمتیں معلوم ہوتی ہیں (۱) اجور کو جمع فرمانا ھم ضمیر کے جمع کے لحاظ سے ہے۔ یعنی مومن کو اس کے ایمان کا ایک ثواب ہے تو بہت سے مؤمنوں کے اجر سے بہت سے یا ہر مومن کو ایمان کی برکت سے سارے نیک اعمال کا ثواب ملے گا۔ لہٰذا اجور فرمایا (۲) صرف ایک ایمان کے لاکھوں اجر ملیں گے۔ اللہ کو ماننے کا علیحدہ اجر، رسول کو ماننے کا علیحدہ اجر، اسی طرح ہر ایمانی چیز پر ایمان لانے کا علیحدہ اجر پھر مؤمن ہونے کا علیحدہ اجر، مؤمن رہنے کا الگ ثواب، مؤمن مرنے کا الگ ثواب، خدا تعالیٰ ایمان پر خاتمہ نصیب کرے پھر ثواب ہی ثواب ہیں پھر دنیا میں ایمان کا ثواب علیحدہ، مرتے وقت قبر میں علیحدہ، حشر میں علیحدہ، بعد حشر جنت میں دائمی ثواب وہ ان سب سے جداگانہ۔ غرض کہ اجور فرمانا بالکل درست ہے۔ اس ثواب کی نوعیتیں اور افراد سب کے سب ہی بہت ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت بھی ہے اسی صفت قدرت کا ظہور کافر و منافق کے لئے قہاریت و جباریت منتقمی کی شکل میں ہوتا ہے اور مخلص مومن کے حق میں اس قدرت کا ظہور غفاریت، ستاریت، عنایت و کرم کی شکل میں ہوتا ہے بلا تشبیہ یوں سمجھو کہ بجلی کا پاور ایک ہے مگر ہیٹر سے کنکشن ہو جائے تو گرم ہے اور اگر کولر سے کنکشن ہو جائے تو نہایت سرد۔ پنکھے سے تعلق ہو جائے تو ہوا دیتا ہے۔ استری سے تعلق ہو جائے تو کچھ اور ہی رنگ دکھاتا ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ و رسولوں پر ایمان اختیار کیا۔ ان کے لئے قدرت خداوندی عطا اجر مغفرت رحمت کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ خیال رہے کہ آخرت میں ایمان کا حساب پہلے ہے، اعمال کا حساب بعد میں۔ قبر میں صرف ایمان کا حساب ہے اور حشر میں اعمال کا حساب۔ حشر، قبر سے صدہا برس کے بعد ہے۔ امام غزالی نے اپنی کتاب ''احسن القصص'' میں لکھا کہ زمانہ قحط میں یوسف علیہ السلام نے مصر کے آس پاس چوکیاں مقرر فرمائی تھیں جن پر باہر سے آنے والوں کی تحقیقات کی جاتی تھی کیونکہ چوطرف سے مخلوق غلہ حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ آتی تھی، ہر آنے والے سے چار سوالات ہوتے تھے۔ تم کہاں سے آئے ہو؟ یہاں مصر میں کیوں آئے ہو اور کب تک رہو گے؟ گندم کی قیمت کے لئے کیا لائے ہو؟ جب برادران یوسف علیہ السلام آئے اور اس راستہ کی چوکی پر پہنچے جو کنعان سے آتا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان چوکی والوں سے فرمایا کہ ان مسافروں سے یہ سوال نہ کرنا کہ تم کیا لائے ہو یہ سوال ہم ان سے خود کر لیں گے۔ مقصد یہ تھا کہ بھائیوں کی پردہ پوشی ہو ان کی متاع کسی پر ظاہر نہ ہو۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ قبر آخرت کی پہلی چوکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

اپنے محبوب کی امت کی پردہ پوشی فرماتے ہوئے قبر کے فرشتوں کو صرف ایمان کے سوالات کرنے کی تو اجازت دی، اعمال کا حساب لینے کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ قبر میں نمازوں، روزوں وغیرہ اعمال کا حساب نہیں ہوتا۔ صرف ایمان کا حساب ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ اپنے محبوب کی امت کے اعمال کا حساب قیامت میں ہم خود لے لیں گے۔ پھر قیامت میں بھی اس امت کا ایسا حساب ہوگا کہ ہر ایک کی نیکیاں نامۂ اعمال کے ظاہر کی جانب ہوں گی جسے دوسرے لوگ بھی پڑھیں گے اور برائی اندرونی جانب جسے صرف وہ شخص پڑھ سکے گا دوسروں کی خبر نہ ہوگی۔ یہ ہے اس کی شان ستاری۔ بہر حال مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے ایمان کی بہت حفاظت کرے۔ اسی لئے قرآن مجید میں اس کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی صفت غافر بھی ہے غفار بھی ہے اور غفور بھی۔ غافر بخشنے والا۔ غفار بہت بخشنے والا۔ غفور جس کی عادت ہو بخشنا اور بہت بخشنا۔ بہت طرح بخشنا۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے بخشش کے ہزار ہا ذریعہ بنا دیئے ہیں جن میں چند ذریعہ بہت مشہور ہیں (۱) ایمان لانا جس سے زمانہ کفر کے سارے گناہ بخشے جاتے ہیں (۲) توبہ کرنا، حج و جہاد (۳) بڑے گناہوں سے بچنا کہ یہ ذریعہ ہے چھوٹے گناہوں کی بخشش کا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ (النساء:۳۱) (۴) گناہ کرنے کے موقعہ پر خوف خدا سے گناہ سے بچ جانا فرماتا ہے: وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن:۴۶) (۵) آخری رات میں بعد نماز تہجد اپنے گناہوں پر رونا۔ یہ سب گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہیں۔ اور شان غفوری کے مظہر اور بغیر عمل کچھ دینا یہ رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو اعمال صالحہ کا اجر بھی دے گا اور بہت کچھ بغیر عمل بھی عطاء فرمائے گا۔ یہ عطیہ دو طرح کا ہے۔ قانون سے دینا اور بغیر قانون عطاء فرمانا۔ دنیا میں صدقات جاریہ، اولاد، شاگرد، مرید، متبعین کی نیکی سے اسے بھی دینا۔ نیز مسلمانوں کی دعاؤں، ایصال ثواب وغیرہ کے ذریعہ عطا فرمانا قانونی رحمت ہے۔ اس لئے رب تعالیٰ مؤمنوں کو ثواب بعد قیامت دے گا۔ جیسے دنیاوی حکومتیں پنشن فنڈ کی رقم ریٹائر ہونے کے بعد دیتی ہیں۔ لنگا دراز ادھار اس لئے کیا کہ قیامت تک مسلمانوں کو ثواب پہنچتے رہیں۔ جب یہ بند ہو جائیں تب بدلہ دیا جائے۔ اور ان ثوابوں کا بند ہونا قریب قیامت ہوگا جب مسلمان ختم ہو جائیں گے۔ غرضیکہ یہ رحمت والے عطیے قانونی ہیں اور جنت میں تمام نعمتیں، اعمال کی جزا مگر دیدار الٰہی صرف رحمت والا عطیہ کہ یہ کسی عمل کی جزا نہیں۔ مگر یہ عطیہ قانون کے تحت نہ ہوگا۔ بہر حال رحیم کے معنی میں بھی بڑی وسعت ہے۔ اسی لئے یہاں عطاء اجر، مغفرت، رحمت تینوں چیزوں کا ذکر ہوا۔

یَسْــٴَـلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ
سوال کرتے ہیں آپ سے کتاب والے یہ کہ اتاریں آپ اوپر ان کے ایک کتاب طرف سے
اے محبوب اہل کتاب تم سے سوال کرتے ہیں کہ ان پر آسمان سے ایک کتاب
السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ

آسمان کے پس بے شک سوال کیا تھا انہوں نے موسیٰ سے بہت بڑا اس سے پس وہ بولے کر دکھا دو ہمیں اللہ

اتار دو تو وہ موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کر چکے بولے ہمیں اللہ کو علانیہ

جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ

ظاہر ظہور پس پکڑ لیا انہیں کڑک نے بوجہ ظلم ان کے پھر بنا لیا انہوں نے بچھڑا

دکھا دو تو انہیں کڑک نے آلیا ان کے گناہوں پر پھر بچھڑا لے بیٹھے

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾

پیچھے اس کے کہ آئیں ان کے پاس کھلی نشانیاں پھر معافی دیدی ہم نے اس سے اور دی ہم نے موسیٰ کو دلیل کھلی ہوئی

بعد اس کے کہ روشن آیتیں ان کے پاس آچکیں تو ہم نے یہ معاف فرما دیا اور ہم نے موسیٰ کو روشن غلبہ دیا

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کا ایک عیب بیان فرمایا گیا تھا یعنی سارے نبیوں پر ایمان نہ لانا، بعض پر ایمان لانا بعض کا انکار کرنا۔ اب ان میں یہود کا دوسرا عیب بیان ہو رہا ہے۔ یعنی جن نبیوں پر ایمان لانا ان سے بھی لڑنا جھگڑنا گویا ان کے ایک کفر کے بعد دوسرا کفر ارشاد ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کے کفر کی جڑ کا ذکر تھا یعنی تمام نبیوں پر ایمان نہ لانا۔ اب اس جڑ کی بعض شاخوں کا ذکر ہے۔ یعنی کفر کے لئے بہانے بنانا کہ کتاب الٰہی آہستگی سے کیوں اتر رہی ہے، یک دم کیوں نہ اتری لہٰذا ہم اسے نہیں مانتے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مؤمنوں کے اصل ایمان کا ذکر تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں میں فرق نہیں کرتے۔ اب اشارۃً انہیں اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا جا رہا ہے۔ یعنی نبی کے ہر فرمان پر سر جھکا دینا ان سے کج بحثی، ضد، عناد نہ کرنا۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم و مغفرت کا ذکر تھا اب اس کا ثبوت دیا جا رہا ہے کہ ہم نے ایسے سرکش یہود کو جنہوں نے بچھڑا پرستی وغیرہ جرم کیے تھے، ان کے توبہ کرنے پر ان کی بخشش فرما دی۔ لہٰذا اب بھی جو مجرم توبہ کرے ہماری رحمت اسے آغوش میں لینے کو تیار ہے۔ گویا آئندہ مغفرت کا ثبوت گزشتہ مغفرت سے دیا جا رہا ہے۔

شان نزول

یہود کے چوٹی کے پوپ و پادریوں نے جن میں کعب ابن اشرف اور فخاص بن عازورا بھی داخل تھے۔ ایک بار حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو ہمارے پاس ایسی کتاب لایئے جو توریت کی طرح یک دم اترے ہم ایسے قرآن پر ایمان نہیں لاتے جو آہستہ آہستہ اتر رہا ہے۔ اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر بیضاوی، خازن، تفسیر کبیر، خزائن العرفان، تفسیر نور العرفان، روح البیان وغیرہ)

بعض یہود نے حضور انور ﷺ سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو ہم میں سے فلاں فلاں امیروں، سرداروں کے نام

اللہ کے خاص خطوط لائیے جن میں لکھا ہوا ے فلاں سردار محمد ﷺ ہمارے رسول ہیں انہیں مان لو اور یہ خطوط خود جبرائیل ہمارے پاس لائیں۔ تب ہم آپ کو سچا نبی مان لیں گے، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خازن، روح البیان، کبیر وغیرہ)۔ ان کے یہ مطالبے محض عناداً تھے۔

تفسیر

یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ، یَسْـَٔلُ بنا ہے سوالٌ یا سائلٌ سے جس کے معنی پوچھنا بھی ہیں اور مطالبہ کرنا اور مانگنا بھی یہاں دوسرا معنی مراد ہیں۔ یَسْـَٔلُ مضارع ہے یا بمعنی حال یا بمعنی استمراری حالت یعنی مطالبہ کرتے ہیں یا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ حضور ﷺ سے ہی یہ مطالبہ ہوا تھا اس لئے ''کاف'' خطاب فرما کر حضور سے ارشاد ہوا۔ اور چونکہ حضور سے مطالبہ در پردہ رب تعالیٰ سے مطالبہ ہے۔ اس لئے یہاں ان کے مطالبہ کا جواب خود رب تعالیٰ نے دیا۔ اہل کتاب سے مراد یا تو عام یہود ہیں یا ان کے خاص پادری کہ اہل کتاب کے معنی ہیں آسمانی کتاب کو ماننے والے یا آسمانی کتاب کو جاننے والے۔ ماننے والے تو سارے یہود ہیں، جاننے والے صرف ان کے پادری۔ اگرچہ یہ مطالبہ کرنے والے ایک دو آدمی ہی تھے۔ مگر چونکہ یہ لوگ اپنی ساری قوم کے نمائندے تھے اس لئے تمام اہل کتاب کو سائل قرار دے دیا گیا۔ امام کی قرأۃ سب کی قرأۃ ہے۔ نمائندوں کا مطالبہ ساری قوم کا مطالبہ ہے اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ یہ عبارت یَسْـَٔلُكَ کا دوسرا مفعول ہے اس کا پہلا مفعول کاف خطاب ہے تُنَزِّلَ بنا ہے تنزیل سے جس کے معنی ہیں آہستگی سے اتارنا مگر یہاں یا مطلقاً اتارنے کے معنی میں ہے۔ یا ایک دم اتارنے کے معنی میں یعنی بمعنی انزال یا تو تنزل کے معنی ہیں۔ آپ اتروا دیں۔ کہ رب تعالیٰ سے دعا کریں یہ کتاب آجائے جیسے آپ دعا سے بارش وغیرہ اتروا دیتے ہیں۔ ایسے ہی ایسی کتاب اتروادیں۔ تب تو یہ سوال واضح ہے یا معنی ہیں کہ آپ اتار دیں تب مقصد یہ ہے کہ آپ بقول خود اللہ کے محبوب ہیں کہ آپ کا کام رب کا کام ہے اور رب کا کام آپ کا کام ہے اسی قائدے سے ہم کہتے ہیں کہ آپ خود اتار دیں۔ اس یگانگت کی تحقیق بارہا کی جا چکی ہے۔ کہ قرآن مجید میں بہت جگہ خدائی کام بندوں کے کام قرار دیئے گئے ہیں اور بندوں کے کام رب کے کام۔ علیہم کا مرجع وہ ہی اہل کتاب ہیں جن کا ذکر ابھی ہوا چونکہ وہ معنیً جمع تھا اس لئے یہ ضمیر جمع لائی گئی۔ یہاں ان لوگوں پر کتاب اتارنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ کتاب براہ راست ہم پر اترے، آپ پر نہ اترے۔ جیسا کہ شان نزول کی دوسری روایت سے معلوم ہوا ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم میں سے ہر ایک پر الگ الگ ربانی تحریریں آئیں جن میں لکھا ہو کہ محمد مصطفٰے سچے رسول ہیں۔ دوسرا یہ کہ آپ کی معرفت سے ہم پر ایک دم کتاب اترے۔ اس طرح کہ قرآن کریم آہستگی سے نازل نہ ہو بلکہ توریت کی طرح سارے کا سارا یکدم آجائے۔ یا قرآن مجید کے علاوہ کوئی اور کتاب آپ پر یک دم اترے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ لہٰذا کتابًا میں بھی تین احتمال ہو سکتے ہیں یا بمعنی خط ہے یا بمعنی قرآن مجید یا بمعنی دیگر کتاب اور تُنَزِّلَ میں بھی تین احتمال۔ خیال رہے کہ یہود نے یہ نہ کہا کہ آپ خدا سے دعا کریں کہ وہ کتاب یک دم اتارے بلکہ عرض کیا کہ آپ اتاریں یا تو اس لئے کہ یہود قرآن کریم کو آسمانی کتاب مانتے ہی نہ تھے۔ حضور ﷺ کی بنائی

ہوئی کہتے تھے۔ اس صورت میں ان کا یہ کہنا کہ آپ اتاریں طعنہ کے طور پر ہے یا اس لئے کہ وہ اگر چہ زبانی طور پر قرآن مجید کے نزول کے منکر تھے مگر ان کے دل جانتے تھے کہ قرآن کریم آسمان سے نازل ہو رہا ہے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ بہت سی آیات حضور ﷺ کی مرضی کے مطابق اترتی ہیں جیسے فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا (بقرہ: ۱۴۴) لہٰذا انہوں نے مطالبہ کیا کہ آپ یک دم نزول قرآن کی خواہش کریں۔ تا کہ رب تعالیٰ آپ کی مرضی کے مطابق یک دم ہی اتار دے اس صورت میں اتارنے کو آپ کی طرف نسبت کرنا مجاز ہے۔ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ۔ فَقَدْ کی ف یا تو جزائیہ ہے اور یہ جملہ ایک پوشیدہ شرط کی جزا ہے۔ یعنی اگر آپ ان کے مطالبہ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں تو یہ لوگ تو موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کر چکے ہیں (روح البیان) یا ف تعلیلیہ ہے اور یہ جملہ پوشیدہ جملہ کی علت یعنی اے محبوب! آپ ان کے اس بیہودہ سوال پر غمگین نہ ہوں کیونکہ یہ لوگ تو موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کر چکے ہیں اگر چہ موسیٰ علیہ السلام سے یہ مطالبہ ان یہود مدینہ نے نہ کیا تھا بلکہ ان کے ستر نقیبوں نے کیا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس وقت پہاڑ پر تھے جب رب نے ان سے کلام کیا۔ مگر چونکہ یہ یہود مدینہ انہی کی اولاد سے تھے ان کے اعمال پر راضی تھے اس لئے یہ مطالبہ ان کی طرف منسوب فرمایا گیا۔ اکبر سے مراد یا تو زیادہ حیرت ناک ہے یا زیادہ عجیب یا بڑا گناہ یا بڑا مشکل کیونکہ دنیا میں ان آنکھوں سے رب تعالیٰ کا دیدار ناممکن ہے اور اس کا مطالبہ کرنا بطور عناد کے ہو تو گناہ جیسا کہ آئندہ عرض کیا جائے گا۔ ذٰلِكَ سے اشارہ اس مذکورہ مطالبہ کی طرف ہے۔ چونکہ یہ مطالبہ عقل سے بہت دور تھا اس لئے ذٰلِكَ اشارہ بعید فرمایا گیا۔ یعنی یہ لوگ اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام سے وہ مطالبہ کر چکے ہیں جو اس مطالبہ سے کہیں بڑا حیرت ناک، کہیں بڑا دشوار، کہیں بڑا گناہ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَقَالُوْا کی ف تفسیریہ ہے اور یہ جملہ اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ کی تفسیر ہے۔ قَالُوْا کے فاعل کی وہی تحقیق ہے جو ابھی عرض کی گئی ہے کہ بظاہر یہود مدینہ ہیں درحقیقت ان کے اسلاف یعنی ۷۰ اصحاب موسیٰ اَرِنَا میں خطاب موسیٰ علیہ السلام سے ہے اس کی تحقیق وہی ہے جو ابھی اس تُنَزِّلَ میں کی گئی ''نا'' اس ''اَرِ'' کا پہلا مفعول ہے۔ لفظ اللہ دوسرا مفعول ہے جَهْرَةً لفظ اللہ کا حال ہے۔ لفظ جہر بلند آواز کے لئے وضع ہوا ہے جس کا مخالف ہے اخفاء۔ رب فرماتا ہے: يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا يَخْفٰى (اعلیٰ: ۷) مگر اب ہر ظاہری چیز پر استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں ظاہری دیدار مراد ہے جو ان آنکھوں سے ہو۔ بلا تردد و بلا شبہ یعنی اے موسیٰ! علیہ السلام آپ ہمیں رب تعالیٰ کی ذات ظاہر ظہور دکھا دیجئے جس میں ہم کو کوئی تردد نہ رہے۔ خیال رہے کہ جَهْرَةً کہہ کر ان لوگوں نے دو مطالبے کر دیئے ایک یہ کہ دیدار الٰہی خواب یا خیال یا کشف سے نہ ہو بلکہ ان آنکھوں سے جو بیداری میں کھلی رہتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ آنکھوں والا دیدار ہر ایک کو الگ الگ نہ ہو بلکہ ہم ستر آدمی بیک وقت دیکھیں۔ یاد رکھو کہ لفظ ''ار'' قرآن کریم میں دکھانے کے لئے بھی ارشاد ہوتا ہے اور سمجھانے کے لئے خواب و خیال کے لئے بھی جیسے اَرِنَا مَنَاسِكَنَا (بقرہ: ۱۲۸) یعنی ہم وار کان حج سمجھا دے اور اِنِّیْۤ اَرٰى فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ (الصافات: ۱۰۲) رب تعالیٰ کا دیدار خواب یا خیال کی آنکھوں میں ممکن ہی نہیں بلکہ واقع ہے مگر ان آنکھوں سے اسی دنیا میں رہ کر دیدار ناممکن ہے۔ جَهْرَةً

نے یہ مسئلہ بالکل حل فرما دیا کہ انہوں نے وہ ناممکن دیدار رب سے مانگا۔ **فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ** ف۔ تعقیب بلا تراخی کے لئے ہے۔ یعنی یہ مطالبہ کرتے ہی فوراً ان پر یہ عذاب آ گیا۔ صاعقہ بنا ہے صعق سے بمعنی بیہوشی رب تعالیٰ فرماتا ہے **فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ** (زمر: ۶۸) صاعقہ کے معنی بیہوش کرنے والی یا ہلاک کرنے والی چیز اس سے مراد وہ غیبی آسمانی عذاب ہے جو ان مطالبہ کرنے والوں پر آیا اور انہیں ہلاک کر گیا۔ یا کوئی اور عذاب آسمانی۔ (مدارک، بیضاوی، روح البیان وغیرہ) **بِظُلْمِهِمْ** کی ب سببیہ ہے ظلم سے مراد ہے ان کا اپنی جان پر ظلم کرنا یعنی اپنے نبی پر ناجائز سوال کرنا یا ناممکن چیز کی دعا کرنا یا اپنے نبی کا اعتبار نہ کرنا۔ خیال رہے کہ ان اسرائیلیوں کا یہ مطالبہ شوق دیدار الٰہی میں نہ تھا بلکہ اپنے نبی پر بے اعتمادی کی بنا پر تھا کہ ہم کو تمہارا اعتبار نہیں۔ رب تعالیٰ ہم سے خود براہِ راست کلام کرے، احکام سنائے یہ کفر ہے اس لئے اس مطالبہ کو ظلم فرمایا گیا۔ یعنی یہ مطالبہ کرتے ہی ان پر غیبی آسمانی عذاب آ گیا جس نے انہیں ہلاک کر دیا۔ یہ واقعہ سورۂ بقرہ شریف میں گزر چکا ہے **ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ** یہ بنی اسرائیل کے دوسرے جرم کا ذکر ہے یعنی ان کا بچھڑا پرستی چونکہ یہ واقعہ کچھ بعد میں ہوا اس لئے ثُمَّ فرمایا گیا۔ **عِجْلَ** سے مراد وہی بچھڑا ہے جو سامری نے فرعونی سونے سے بنایا تھا۔ **اتَّخَذُوا** کا دوسرا مفعول پوشیدہ ہے "اِلٰهًا" **الْبَیِّنٰتُ** جمع ہے بَیِّنَۃٌ کی بمعنی روشن دلیل اس لئے گواہی کو بینہ کہا جاتا ہے۔ یہاں بینات سے مراد عصا موسوی، ید بیضا، دریا کا چیرنا وغیرہ معجزات ہیں نہ کہ آیات توریت کیونکہ ابھی تک توریت نہ آئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام توریت لینے ہی تو گئے تھے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا کر ادھر اسرائیلیوں نے یہ ستم ڈھا دیا کہ بچھڑا پرستی شروع کر دی۔ یہ واقعہ بھی سورۂ بقرہ میں گزر چکا **فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ** ف تعقیبیہ ہے۔ عفو کے معنی ہے مٹانا۔ چونکہ معافی سے گناہ مٹ جاتا ہے اس لئے اسے عفو کہہ دیتے ہیں۔ **ذٰلِكَ** سے اشارہ بچھڑا پرستی کی طرف ہے۔ یعنی اس قدر بڑے جرم کے بعد بھی ہم نے ان کو معافی دے دی کہ انہیں جڑ سے نہ اکھیڑ دیا۔ بالکل نیست و نابود نہ کر دیا۔ اگرچہ ان کا یہ گناہ اس ہی قابل تھا کہ انہیں بالکل فنا کر دیا جاتا اس توجیہ سے آیت پر کوئی اعتراض نہیں **وَ اٰتَیْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا** یہ ان اسرائیلیوں کی انتہائی سرکشی کا ذکر ہے۔ سلطان سے مراد ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے ظاہر و باہر معجزات جو ان کی سچائی پر دلالت کریں یعنی باوجودیکہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے معجزات ظاہرہ عطا فرمائے مگر یہ ایسے سرکش لوگ ہیں کہ انہوں نے ان کی مخالفت ہی کی۔ آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ سارا قرآن یک دم لایئے اور موسیٰ علیہ السلام ساری توریت یک دم لائے تو ان سے مطالبہ کرتے تھے کہ ہمیں رب کو ظاہر ظہور دکھایئے ان کے یہ تمام مطالبے محض عناد سے ہیں۔ تحقیق حق کے لئے نہیں۔

خلاصہ تفسیر

گزشتہ تفسیر سے پتہ لگ گیا کہ اس آیت کریمہ کی تین تفسیریں ہیں۔ ایک یہ کہ اے محبوب ﷺ یہود مدینہ محض عناد کے طور پر آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ پورا قرآن ایک دم اتار کر لا دیں تب ہم ایمان لائیں گے۔ ہم ایسے قرآن کو نہیں مانتے جو آہستہ آہستہ اترے دوسری یہ کہ یہود مدینہ مطالبہ کرتے

ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خدائی خط آسمان سے اتاریں جس میں لکھا ہو کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں تب ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔ تیسری یہ کہ قرآن مجید کے علاوہ اور کوئی کتاب آپ آسمان سے اتاریں جو یک دم اترے۔ اے محبوب! آپ ان کی ایسی بیہودہ باتوں سے ملول نہ ہوں۔ انہوں نے تو اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وہ مطالبہ کیا جو اس مطالبہ سے کہیں زیادہ حیرت ناک، کہیں زیادہ شرارتی تھا۔ ان سے تو انہوں نے یہ کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم کو اللہ کی ذات کھلم کھلا دیجئے جو ہمارے سامنے آ کر ہم کو آپ کی نبوت کی خبر دے۔ ہم آپ کی بات نہ مانیں گے۔ اس مطالبے کی سزا انہیں یہ دی گئی کہ انہیں غیبی عذاب یا غیبی آگ یا غیبی کڑک نے ہلاک کر دیا۔ پھر اس کے بعد انہی یہودیوں نے یہ غضب کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے کھلے معجزات دیکھنے کے باوجود بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ مگر ہم ایسے رحیم و کریم ہیں کہ اس جرم کی بھی انہیں معافی دے دی۔ وہ اس عبادت پر بالکل ہلاک کر دینے کی مستحق تھے مگر ہم نے انہیں ہلاک نہ کیا۔ وہ گناہ پر گناہ، جرم پر جرم کرتے رہے ہم معافی پر معافی دیتے رہے۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کھلا غلبہ عنایت کیا کھلے معجزے دیئے مگر یہ لوگ بغاوت اور مطالبہ ہی کرتے رہے۔ جب ان کا معاملہ اپنے نبی کے ساتھ یہ رہا تو اگر آپ سے یہ لوگ ایسے بیہودہ مطالبے کریں تو ان سے کیا بعید ہے لہٰذا آپ اس سے بالکل ملول و غمگین نہ ہوں۔ اگر بارش سے شورہ زمین سرسبز نہ ہو تو بارش کا قصور نہیں۔ شعر

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ   خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

خیال رہے کہ سلطان کے لغوی معنی ہیں غلبہ، اب غلبہ خواہ دلائل سے ہو یا معجزات سے یا قوت و طاقت سے یا یوں ہی قدرتی طور سے رعب اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں کو عطا فرمایا خود فرماتا ہے۔ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ (مجادلہ: ۲۱) مگر موسیٰ علیہ السلام کو تو بیمثل غلبہ دیا کہ فرعون نے آپ کی ولادت سے پہلے اسرائیلیوں کے اسی ہزار بچے ذبح کرا دیئے تاکہ آپ دنیا میں نہ رہیں۔ مگر آپ دنیا میں رہے بلکہ خود فرعون کی گود میں رہے۔ وہاں پرورش پائی پھر مدائن سے آنے پر تمام فرعونیوں سے مقابلہ کیا۔ جادوگر مقابلہ میں آئے مگر غالب آپ ہی رہے۔ یا مراد ہے قدرتی رعب۔ رب تعالیٰ نے یہ بھی موسیٰ علیہ السلام کو علی وجہ الکمال بخشا تھا۔ دیکھو! اسرائیلی ہارون علیہ السلام کے کہنے پر بت پرستی سے باز نہ آئے مگر آپ کو دیکھتے ہی سہم گئے آپ نے جو کہا اس پر عمل کیا اور آپ کے سامنے توبہ کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ ہے آپ کا رعب خداداد، یہ ہے سلطان مبین۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدہ حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ہدایت محض رب تعالیٰ کے فضل و کرم سے ملتی ہے اس کا فضل شامل حال نہ ہو تو علم، عقل، اچھی صحبت، مقدس مقام پر رہنا، نبی کی اولاد ہونا سب بیکار ہے۔ دیکھو یہ اہل کتاب موسیٰ علیہ السلام کی اولاد تھے، توریت کے بڑے عالم تھے، مدینہ شریف میں رہتے تھے، حضور ﷺ کی خدمت میں آتے جاتے تھے مگر رہے کافر و بے دین، ہمیشہ حجت بازیاں ہی کرتے رہے کیونکہ اللہ کا فضل و کرم ان کے شامل حال نہ تھا یہ فائدہ یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ سے حاصل ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** بحث مباحثہ فضول مطالبے دل میں سختی پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اطاعت کا جذبہ عطا فرمائے مؤمنین صحابہ نے زیادہ حجتیں نہ کیں یہ فائدہ بھی

یَسْئَلُکَ سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** جب رب تعالیٰ کسی کا دین لیتا ہے تو عقل بھی چھین لیتا ہے۔ دیکھوان بے دین یہودیوں نے اتنا نہ جانا کہ سچے نبی کی سچی کتاب پر ایمان لانا چاہیے۔ خواہ کتاب یک دم آئے یا آہستہ۔ ہے تو کتاب الٰہی۔ ان عاقلوں نے بچوں کی سی ضد کی کہ اگر سارا قرآن یک دم آئے تب تو ہم ایمان لائیں گے ورنہ نہیں یا اگر ہمارے سب کے پاس رب تعالیٰ کے خطوط آ جائیں تب تو ہم ایمان لائیں گے ورنہ نہیں۔ کبھی کہتے کہ اگر میکائیل علیہ السلام یہ قرآن لاتے تو ہم مان لیتے چونکہ حضرت جبرائیل لاتے ہیں اس لئے ہم نہیں مانتے وغیرہ وغیرہ یہ سب ضدیں بے عقل بچوں کی سی ہیں جو یہ عاقل کرتے تھے۔ **چوتھا فائدہ:** حضور کا منکر یہودی یا عیسائی درحقیقت اپنے نبی کو بھی نہیں مانتا دیکھو رب تعالیٰ ان ضدی یہود کو خاموش فرمانے کے لئے ان کی وہ ضدیں بیان فرمائیں جو وہ اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام سے کر چکے تھے اس سے یہ ہی بتانا مقصود ہے کہ تم اپنے نبی کو بھی نہیں مانتے ان سے بھی ضد ہی کرتے رہے اگر ان محبوب کو نہ مانو تو تم سے کیا بعید ہے؟

پانچواں فائدہ: باپ دادوں کے اعمال کا اولاد پر اور اولاد کے اعمال کا باپ دادوں پر اثر پڑتا ہے جب کہ وہ ان اعمال سے راضی ہوں۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام سے دیدار الٰہی کا مطالبہ ان یہود مدینہ نے نہ کیا تھا بلکہ ان کے بڑے پرانے باپ دادوں نے کیا تھا مگر یہود مدینہ کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ کیونکہ یہ ان کے نقش قدم پر تھے۔ **چھٹا فائدہ:** اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نبیوں سے مانگ سکتے ہیں یہ شرک یا کفر نہیں۔ دیکھو یہود نے دیدار الٰہی موسیٰ علیہ السلام سے مانگا اور قرآن کریم کا یک دم نزول حضور ﷺ سے مانگا۔ رب تعالیٰ نے ان دونوں سوالوں کو شرک قرار نہ دیا۔ یہ نہ فرمایا کہ انہوں نے یہ نعمتیں براہ راست ہم سے کیوں نہ مانگیں لہٰذا یہ مشرک ہو گئے بلکہ دوسرے طریقے سے انہیں روکا گیا۔ حضرت ربیعہ ابن کعب نے حضور سے جنت مانگی، ایمان و عرفان مانگا۔ جب فرعونیوں پر خون، جوں، مینڈک وغیرہ کے عذاب آتے تھے تو وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام سے عرض کرتے تھے۔ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (اعراف: ۱۳۴) اے موسیٰ! اگر آپ نے ہم سے یہ عذاب دفع فرما دیا تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے" دیکھو موسیٰ علیہ السلام سے عذاب دفع کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ رب تعالیٰ ان کے قول کو شرک قرار نہ دیتا تھا بلکہ ان سے عذاب دفع فرما دیتا تھا۔ فرماتا ہے فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ (الزخرف: ۵۰) لہٰذا ہم بھی حضور سے ایمان، توفیق، دولت، اولاد، مانگ سکتے ہیں یہ چیزیں جنت سے بڑھ کر نہیں اس لئے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو امیروں، حاکموں، حکیموں سے ہر وقت چندہ دوا وغیرہ مانگتے ہیں لیکن حضور سے کچھ مانگنے کو شرک کہتے ہیں۔ شعر

محمد از تو می خواہم خدارا خدایا از تو عشق مصطفیٰ را

ساتواں فائدہ: عادۃً ناممکن چیز کی دعا کرنا ممنوع ہے جس پر عذاب الٰہی آ سکتا ہے۔ دیکھو اسرائیلیوں نے اس جہان میں رہ کر دیدار الٰہی کا مطالبہ کیا یہ عادتاً ناممکن چیز تھی۔ لہٰذا ان پر عذاب الٰہی آ گیا اور ان کے اس مطالبہ کو ظلم فرمایا گیا۔

آٹھواں فائدہ: اللہ تعالیٰ کی رحمت تمام مخلوق کے گناہوں سے زیادہ ہے دیکھو رب تعالیٰ نے ایسے بڑے مجرمین کو بھی

بار ہا معافیاں دیں۔ شعر

گنہ رضا کا حساب کیا وہ اگرچہ لاکھوں سے ہیں سوا
مگر اے عفو تیرے عفو کا تو حساب ہے نہ شمار ہے

نواں فائدہ: حضور ﷺ کے صحابہ تمام نبیوں کے صحابہ سے افضل ہیں۔ دیکھو یہ اسرائیلی برسوں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہے مگر پھر بھی موسیٰ علیہ السلام پر اکڑتے رہے اور صرف چالیس دن کے لئے موسیٰ علیہ السلام باہر گئے حالانکہ ہارون علیہ السلام کو ان میں چھوڑ گئے تھے مگر یہ لوگ رب تعالیٰ کی ذات وصفات کو بھول گئے، بچھڑے کے پجاری بن گئے۔ حضور کے صحابہ نے نہ کبھی حضور کے حکم سے سرتابی کی نہ کبھی بدعقیدگی، بدعملی میں گرفتار ہوئے حالانکہ ان میں بعض وہ لوگ تھے جو فتح مکہ میں یا اس کے بعد ایمان لائے۔ جب حضور کی وفات بہت قریب تھی۔ بعض نے صرف ایک آن حضور کی زیارت کی۔ رب تعالیٰ نے اعلان فرمادیا وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (النساء:۹۵) یونہی حضور کی امت تمام امتوں سے افضل ہے کہ یہ سب لوگ کبھی گمراہ نہ ہوں گے۔ **دسواں فائدہ:** نیت بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں دیکھو بنی اسرائیل نے دیدار الٰہی کا مطالبہ اس لئے کیا کہ انہیں موسیٰ علیہ السلام پر اعتماد نہ تھا۔ وہ سزا کے مستحق ہوئے مگر موسیٰ علیہ السلام نے دیدار الٰہی کی تمنا شوق و عشق میں کی ان کی محبوبیت اور زیادہ ہوگئی۔ چیز ایک ہے مگر نیت میں فرق کی بنا پر احکام جداگانہ۔ **گیارھواں فائدہ:** بڑے سے بڑا مجرم بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت و بخشش سے ناامید نہ ہو اس کا کرم بندے کے گناہوں سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ فائدہ فَعَفَوْنَا سے حاصل ہوا۔ دیکھو بنی اسرائیل کے ناجائز مطالبے بلکہ بچھڑا پرستی بھی معاف ہوگئے۔ **بارھواں فائدہ:** رعب یعنی لوگوں کے دلوں میں کسی کی ہیبت بیٹھ جانا رب تعالیٰ کا خاص کرم ہے یہ فائدہ ''سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا'' سے حاصل ہوا دیکھو بنی اسرائیل ہارون علیہ السلام کی تبلیغ پر بچھڑا پرستی سے باز نہ آئے مگر موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر ہی گھبرا گئے اور آپ کے فرمان پر فوراً توبہ کر بیٹھے۔ یہ تھا رعب موسوی جسے یہاں سلطان مبین یعنی کھلا غلبہ فرمایا گیا۔ شعر

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

اعتراضات

پہلا اعتراض: اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا یہ مطالبہ پورا کیوں نہ فرمایا جب کفار کے مطالبہ پر چاند چیر دیا گیا۔ کنکر پتھروں سے کلمہ پڑھوا دیا گیا تو یہ مطالبہ بھی پورا کر دیا جاتا کہ ان لوگوں پر غیبی خط آ جاتے جنہیں پڑھ کر یہ لوگ مسلمان ہو جاتے یہ چیز ناممکن تو نہ تھی بلکہ ان مذکورہ معجزات سے زیادہ آسان تھی۔ **جواب:** اس لئے کہ وہ لوگ یہ مطالبہ محض عناد سے کر رہے تھے۔ وہ یہ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لاتے اور اگر منہ مانگا معجزہ دیکھ کر ایمان نہ لایا جائے تو عذاب الٰہی آ جاتا ہے جیسا کہ مائدہ والوں کا انجام ہوا اور حضور ﷺ کی تشریف آوری سے دنیا میں عذاب غیبی بند ہو چکے تھے لہٰذا ان کا یہ مطالبہ پورا نہ کیا گیا۔

دوسرا اعتراض: دیدار الٰہی کے مطالبہ کو اس مطالبہ سے زیادہ بڑا (اکبر) کیوں فرمایا گیا کہ فرمایا فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰى

اَکۡبَرَ مِنۡ ذٰلِکَ۔ **جواب:** اس لئے کہ دنیا میں ان آنکھوں سے دیدار الٰہی اگرچہ محال عقلی نہیں مگر محال عادی ضرور ہے اور ساری کتاب اللہ کا ایک دم آنا یا لوگوں کے پاس غیبی خطوط آنا بالکل محال نہیں بلکہ ان کا وقوع ہوا ہے اور ہو سکتا ہے لہٰذا وہ مطالبہ اس سے سخت تر ہے، بعید تر ہے۔

تیسرا اعتراض: بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے دیدار الٰہی کا مطالبہ کیا تو عذاب الٰہی کے مستحق ہو گئے مگر خود موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے یہ ہی دعا کی تو محبوب رہے اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** اس کا جواب فوائد میں گزر چکا کہ ان دونوں سوالوں کی وجہ میں فرق تھا۔ ان اسرائیلیوں نے موسیٰ علیہ السلام پر بے اعتمادی کی وجہ سے یہ سوال کیا کہ بولے لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً (البقرہ:۵۵) اس بے اعتمادی کی وجہ سے وہ معتوب یا معذب ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شوق دیدار الٰہی میں یہ عرض کیا تھا لہٰذا وہ محبوب رہے۔ دیکھو قابیل نے اپنے نبی باپ کو ستایا وہ عذاب کا مستحق ہوا اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے نبی باپ یعقوب علیہ السلام کو دکھ پہنچایا مگر یہ لوگ آخر مقرب ہو گئے کیونکہ قابیل کی یہ حرکت ایک عورت کے عشق میں تھی اور ان کا یہ کام حضرت یعقوب علیہ السلام کا محبوب بننے کے لئے تھا یَخۡلُ لَکُمۡ وَجۡہُ اَبِیۡکُمۡ (یوسف:۹) اس لئے یہ فرق ہوئے۔

چوتھا اعتراض: یہاں فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کی بچھڑا پرستی کا جرم معاف کر دیا گیا مگر سورہ بقرہ میں گزرا کہ انہیں قتل کر دیا گیا۔ فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ (بقرہ:۵۴) دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔ **جواب:** سارے بچھڑا پرست قتل نہ کیے گئے کچھ قتل کیے گئے کچھ کو معاف کر دیا گیا۔ جو قتل کیے گئے انہیں بعد قتل معاف فرما دینا بھی معافی ہے اگر رب تعالیٰ دنیا میں ہم کو سزا دے کر آخرت کے عذاب سے بچا لے تو یہ بھی اس کی معافی ہے۔ یا اس معافی کا مطلب یہ ہے کہ تمام قوم اسرائیل ہلاک نہ کر دی گئی وہ اس جرم کی وجہ سے اس کے مستحق ہو چکے تھے۔

پانچواں اعتراض: دنیا میں دیدار الٰہی ممکن ہے یا ناممکن۔ اگر ممکن ہے تو اس کے مطالبہ کی وجہ سے ان اسرائیلیوں پر عذاب کیوں آ گیا۔ اور وہ ہلاک کیوں کر دیئے گئے اور اگر ناممکن ہے جس کی دعا ناجائز ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے یہ خواہش کیوں کی۔ حضرات انبیاء کرام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ **جواب:** دنیا میں دیدار الٰہی ممکن بالذات ہے ناممکن بالغیر ہے ناممکن بالذات کی دعا کرنا ممنوع ہے۔ جیسے آج کوئی کہے خدایا مجھے نبی بنا دے یا مجھے فرشتہ بنا دے یا مجھے خدا بنا دے۔ نعوذ باللہ ایسی دعائیں مانگنے والا سخت گناہ گار ہے اور ناممکن بالغیر کی دعا مانگنا۔ کبھی جائز ہے کبھی ناجائز چونکہ بنی اسرائیل کا یہ مطالبہ شوق دیدار سے نہ تھا بلکہ عناداً تھا لہٰذا سزا کے مستحق ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ تمنا شوق دیدار سے تھی۔ لہٰذا وہ محبوب رہے جیسے کوئی آج ہی جنت میں پہنچ جانے کی دعا کرے شوق و عشق کی بنا پر ہے تو گناہ نہیں ورنہ گناہ ہے۔

چھٹا اعتراض: یہاں بچھڑا پرستی کے ساتھ یہ کیوں فرمایا گیا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنٰتُ کیا بغیر روشن آیات دیکھے بت پرستی جائز ہے بت پرستی بہر حال شرک ہے خواہ روشن آیات دیکھنے کے بعد ہو یا اس کے بغیر۔ **جواب:** یہ ذکر ان کی

زیادتی جرم بیان فرمانے کے لئے ہے۔ بے خبر آدمی کا گناہ ایک گناہ ہے اور خبردار کا گناہ ڈبل گناہ ہے۔ نیز جس پر اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام زیادہ ہوں اس کا گناہ کرنا سخت سزا کا باعث ہے۔ بنی اسرائیل پر رب تعالیٰ نے خصوصی انعام بہت فرمائے تھے۔

تفسیر صوفیانہ

ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی حیثیت کے لائق سوال کرے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ کا مطالبہ کرنے والا محروم رہتا ہے نیز لایعنی اور غیر مفید سوالات کرنے والے کا انجام شامت ہے۔ سوالات میں الجھے ہوئے، دلائل میں پھنسے ہوئے لوگ اکثر ایمان سے محروم رہتے ہیں۔ اگر توفیق خداوندی دستگیری نہ کرے تو انسان نبی بلکہ فرشتوں بلکہ خدا کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتا۔ اور اگر توفیق الٰہی شامل حال ہو تو نبی کو سن کر ہی ایمان لے آتا ہے۔ دیکھو یہود مدینہ کی دستگیری توفیق خیر نے نہ کی تو وہ واہیات مطالبے ہی کرتے رہے کبھی کہتے کہ حضرت جبرائیل قرآن لاتے ہیں اس لئے ہم اسے نہیں مانتے۔ اگر حضرت میکائیل لاتے تو ہم مان لیتے کبھی کہتے کہ قرآن ایک دم نہیں اترا اس لئے ہم نہیں مانتے اگر ایک دم اترتا تو ہم مان لیتے۔ اگر ان بدنصیبوں کے تمام مطالبے پورے کر بھی دیئے جاتے تب بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ حضرت ابوبکر صدیق سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بُعِثْتُ مجھے نبی بنایا گیا تو آپ نے فوراً "فرمایا صَدَقْتَ آپ سچے ہیں" نہ کوئی مطالبہ کیا نہ کچھ پس وپیش فرمایا۔ حضرت اویس قرنی نے صرف سن کر سب کچھ مان لیا۔ آخر کیوں اس لئے کہ توفیق شامل حال تھی۔ یہ آیت کریمہ ہم لوگوں کے لئے باعث عبرت ہے۔ (روح البیان) علمائے یہود بڑے بدنصیب تھے کہ انہیں رہبر بنایا گیا تھا مگر وہ رہزن بن گئے۔ شعر

راہ زن راہ بر نہیں ہوتے   رہبرو تم میں راہزنی کیوں ہے

اللہ تعالیٰ توفیق خیر دے۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ

اور اٹھالیا ہم نے اوپر ان کے طور کو ان کا وعدہ لینے کے لئے اور کہا ہم نے ان سے کہ داخل ہو تم اس دروازے میں

پھر ہم نے ان پر طور کو اونچا کیا ان سے عہد لینے کو اور ان سے فرمایا کہ دروازے میں سجدہ

سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

سجدہ کرتے اور ہم نے ان سے کہا کہ ہفتہ کے بارے میں حد سے نہ بڑھو اور لیا ہم نے ان سے وعدہ مضبوط

کرتے داخل ہو اور ان سے فرمایا کہ ہفتہ میں حد سے نہ بڑھو اور لیا ہم نے ان سے گاڑھا عہد لیا

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی سرکشیوں کا ذکر تھا۔ اب ان کی نافرمانیوں کا تذکرہ ہے۔ گویا اصل کا ذکر فرمانے کے بعد شاخوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ سرکشی اصل ہے اور نافرمانی اس کی شاخ۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کے ان جرموں

کا ذکر تھا جو توریت شریف آنے سے پہلے انہوں نے کیے، دیدار الٰہی کا مطالبہ، بچھڑا پرستی۔ اب ان کے ان جرموں کا ذکر ہے جو نزول توریت کے بعد انہوں نے کیے تاکہ معلوم ہو کہ ان کی سرکشی نہ نبی اللہ کی صحبت سے کم ہوئی نہ کتاب اللہ کے نزول سے۔ چونکہ نبی کی ہدایت کتاب کی ہدایت سے اعلیٰ ہے۔ اس لئے اعلیٰ کے بعد ادنیٰ کا ذکر فرمایا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کے جرموں کے بعد حق تعالیٰ کی معافیوں کا ذکر تھا۔ اب رب تعالیٰ کی معافیوں کے بعد ان کے جرموں کا ذکر ہے تاکہ پتہ چلے کہ ادھر سے عطائیں رہیں مگر ان کی طرف سے خطائیں۔ شعر

مجھ خطا کار پر عطا پہ عطا — اے مرے مہرباں ترے صدقے

تفسیر

وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے وہ تین جرم بیان فرمائے جو مختلف زمانوں میں ان سے صادر ہوئے پہلا جرم وسرکشی وہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں انہوں نے کیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام توریت لے کر ان کے پاس تشریف لائے تو یہود بولے **سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا** (النساء:٤٦) ہم نے احکام الٰہیہ سن تو لئے مگر کریں گے نافرمانی۔ تو رب تعالیٰ نے ان پر طور اکھاڑ شامیانہ یا بادل کی طرح لاکھڑا کر دیا کہ یا تو مانو ورنہ گرتا ہے تم پر اس کا ذکر اسی جملہ میں ہے۔ رفع کے معنی ہیں طور اکھیڑ کر اس قوم پر اٹھا دینا۔ اگرچہ یہ کام فرشتوں کا تھا مگر چونکہ رب تعالیٰ کے حکم سے تھا یا چونکہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں۔ ان کا کام گویا رب تعالیٰ ہی کا کام ہے اس لئے اسے رب نے اپنی طرف نسبت دے کر فرمایا **وَ رَفَعْنَا** ہم نے اٹھا دیا، اونچا کر دیا۔ **فَوْقَهُمْ** فرما کر یہ بتایا کہ یہاں رفع مجازاً کسی اور معنی میں نہیں بلکہ حقیقتاً اٹھایا گیا۔ اور ان کے اوپر لایا گیا گویا فوق نے رفع کے معنی مقرر فرما دیئے ھم کا مرجع وہ تمام یہود ہیں جنہوں نے احکام توریت ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ طور وہ ہی مشہور پہاڑ ہے جو وادی مقدس طویٰ میں واقع ہے۔ جس پر موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی یہاں ہی توریت دی گئی، یہاں ہی موسیٰ علیہ السلام رب تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ یہ گنہگار طور کے قریب تک تو پہنچا مگر اس پر جا نہ سکا۔ دمشق سے قریب ہے دمشق کی حاضری میں نے دی ہے۔ **بِمِيْثَاقِهِمْ** میں ب سببیہ ہے۔ وعدہ، عہد اور میثاق کے فرق ہم پہلے پارہ میں اس آیت کے تحت بیان کر چکے ہیں **وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ** الخ (آل عمران:٨١) یہاں میثاق سے مراد یا دین موسوی پر قائم رہنے کا وعدہ ہے یا یہ وعدہ ہے کہ اگر ہم دین سے پھر جائیں تو سخت عذاب کے مستحق ہوں گے یا توریت کو ماننے اس پر عمل کرنے کا عہد و پیمان ہے۔ تیسرے معنی بہت موزوں و مناسب ہیں۔ (کبیر وغیرہ) چونکہ توریت کے احکام بہت سخت تھے اور آئے یک دم لہٰذا وہ اس کے ماننے سے انکاری ہو گئے۔ تب یہ واقعہ پیش آیا۔ **وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا** یہ یہود کا دوسرا جرم ہے۔ یہ واقعہ کب ہوا؟ اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہی ہوا۔ جب یہ لوگ میدان تیہ میں قید تھے۔ اس زمانہ میں انہیں شہر اریحا میں جا کر توبہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس صورت میں ''الباب'' سے مراد اریحا شہر کا دروازہ ہے اور سجداً سے مراد ہے۔ باادب جھکے ہوئے داخل ہونا یا نوافل پڑھ کر داخل ہونا۔ باادب یہ سجدہ توبہ کے لئے تھا داخلہ

کے وقت تھا ادب کے لئے۔ دوسرا یہ کہ یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات شریف کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا جب یہ لوگ تیہ کی قید ختم کر چکے۔ تب انہیں بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ اس صورت میں باب سے مراد شہر بیت المقدس کا دروازہ ہے۔ اور یہ سجدہ سجدۂ شکر ہے جس میں ادب شہر ملحوظ ہے۔ اس کی پوری بحث ہم پہلے پارہ میں کر چکے ہیں۔ بہر حال یہاں الباب سے مراد اریحا شہر کا دروازہ ہے۔ یا بیت المقدس کا دروازہ اور سجدہ سے توبہ کا سجدہ مراد ہے یا سجدۂ شکر۔ لیکن قوی یہ ہے کہ یہ سجدۂ توبہ تھا۔ کیونکہ قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا: اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ (بقرہ: ۵۸) یعنی سجدہ کرتے داخل ہو اور کہو معافی معافی۔ اگر سجدہ شکر ہوتا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہلوایا جاتا۔ حِطَّةٌ کہلوانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سجدہ توبہ کا تھا۔ ہر موقعہ کے لئے ذکر الٰہی علیحدہ ہے وَ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِی السَّبْتِ یہ یہود کے تیسرے جرم کا ذکر ہے۔ لَا تَعْدُوْا بنا ہے عدوٌ سے بمعنی حد سے بڑھ جانا۔ اسی لئے دشمن کو عدو کہا جاتا ہے۔ بروزن فعول تھا واؤ کا واؤ میں ادغام کر دیا گیا۔ بمعنی حد سے آگے بڑھ جانے والا۔ سبت سے مراد ہفتہ کا دن ہے۔ یہود پر لازم تھا کہ ہفتہ کے دن نہ کوئی دنیاوی کاروبار کریں نہ مچھلی کا شکار یہ دن خالص عبادت الٰہی کے لئے وقف رکھیں۔ مگر یہود نے حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں مچھلی کا شکار کیا جس پر عذاب الٰہی آ گیا۔ اس کا ذکر بھی پہلے گزر چکا اور انشاء اللہ سورۂ اعراف میں بھی آئے گا۔ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا۔ اس میثاق سے یا تو وہ ہی میثاق مراد ہے جو ابھی مذکور ہوا کہ طور سروں پر مسلط ہے اور ان سے یہ عہد لیا جا رہا ہے۔ یا ان لوگوں سے کہا گیا تھا کہ اگر تم نے اس وعدے کی خلاف ورزی کی تو تم کو ایسا سخت عذاب دیا جائے گا جو کسی کو نہ دیا گیا ہو۔ غرض میثاق غلیظ سے نہایت مضبوط وعدہ مراد ہے خواہ یہ ہی ہو جو یہاں مذکور ہے یا اور دوسرا عہد۔

خیال رھے کہ یہ عہد میثاق اگرچہ بواسطہ موسیٰ علیہ السلام و یوشع علیہ السلام و داؤد علیہ السلام ہوئے مگر چونکہ رب تعالیٰ کے حکم سے تھا یا چونکہ رب تعالیٰ کے محبوبوں سے عہد رب تعالیٰ سے عہد ہے اس لئے اَخَذْنَا میں عہد لینے کو رب تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت فرمایا۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ یہود جو آج بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں اور قرآن کریم پر ایمان لانے کے لئے اگر مگر کر کے اینچ پینچ کر رہے ہیں کہ اگر قرآن یک دم آ جاتا تو ہم ایمان لے آتے۔ ان کی اپنی سیاہ کاریوں کا یہ عالم ہے کہ جب ان کے نبی موسیٰ علیہ السلام جن کے بہت سے معجزات دیکھ چکے تھے اور جن کے امتی ہونے کا یہ دعویٰ کرتے تھے جب وہ توریت لائے تو یہ لوگ توریت کے ماننے سے ہی انکار کر گئے تھے اور بولے کہ ہم نے سب کچھ احکام تو سن لئے مگر مانیں گے نہیں۔ آخر کار ہم نے پورا طور پہاڑ اکھیڑ کر ان کے سروں پر لا کھڑا کیا اور فرمایا کہ توریت کو مانو ورنہ تم پر گرتا ہے تب خوف کے مارے ان کے ماننے کا وعدہ کیا۔ توریت تو ایک دم ہی آئی تھی۔ ان کی اپنی کتاب تھی۔ ان کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر آئی تھی۔ پوچھئے اس کا انکار کیوں کیا۔ کیا پھر موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جب انہیں میدان تیہ کی قید سے رہائی ملی اور یوشع علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ مگر اس طرح کہ اسی شہر کا

احترام کرتے ہوئے سجدہ کناں داخل ہو یا اس طرح کہ با ادب جھکے ہوئے داخل ہو جاؤ یا اس طرح کہ نفل پڑھ کر داخل ہو مگر یہ چوتڑوں کے بل گھسٹتے ہوئے وہاں گئے اور بجائے معافی مانگنے کے گندم مانگتے گئے یہ ایسے ڈھیٹ ہیں کہ پناہ خدا۔ پھر ہم نے ان سے مضبوط عہد لیا تھا کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار نہ کرو مگر یہ نہ مانے اور داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں وہ حیلہ بہانہ بنا کر مچھلی کا شکار کرتے رہے۔ آخر عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ ایسے بدعہد لوگ اگر آپ پر ایمان نہ لائیں تو آپ غم نہ کریں۔ ان کا ایمان قبول نہ کرنا ان کی اپنی ضد کی وجہ سے ہے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جیسے حضور ﷺ تمام نبیوں کے سردار ہیں ایسے ہی حضور کی امت تمام امتوں کی سردار ہے۔ اس سرداری کی بہت وجہیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ امت بہت ہی اطاعت شعار وفادار ہے۔ اسلام کے سارے احکام اس امت نے نہایت خندہ پیشانی سے قبول کر لئے۔ دیکھو یہود نے توریت شریف قبول تو کی مگر جب کہ پہاڑ سر پر لا کھڑا کیا گیا۔ تفسیر صاوی میں ہے کہ جب ان پر طور پہاڑ لایا گیا تو یہ سجدے میں گر گئے اور زبان سے بولے قبول کر لیا مگر سجدہ اس طرح کیا کہ پیشانی کا ایک حصہ زمین پر تھا اور آنکھیں پہاڑ پر لگی ہوئیں۔ اب تک یہود کا سجدہ ایسا ہی ہوتا ہے (صاوی) گویا اب بھی دل سے نہ مانا صرف زبان سے ماننے کا اقرار کر لیا۔ حضرات صحابہ نے قرآنی احکام مان کر عمل کر کے دکھا دیئے۔ خیال رہے توریت کے آنے کا دن یہود کے لئے مصیبت و آفت کا دن تھا مگر قرآن مجید کے آنے کا دن بلکہ اس کی آمد کا مہینہ مسلمانوں کی عید کا دن عید کا مہینہ ہے۔ چنانچہ ماہ رمضان اور شب قدر مسلمانوں کی خوشی کے دن ہیں۔ کہ اب چودہ سو برس کے بعد بھی مسلمان قرآن کے نزول کے مہینہ میں شکریہ کی عبادت کرتے ہیں، خوشیاں مناتے ہیں یوں ہی صاحب قرآن ﷺ کی تشریف آوری کا مہینہ، دن، تاریخ مسلمانوں کی عیدوں کے دن ہیں یہ ہے۔ فرق قوم موسوی اور قوم محمدی میں۔ **دوسرا فائدہ:** قرآن کریم کا آہستہ آہستہ ۲۳ سال میں اترنا اللہ کی خاص رحمت ہے۔ دیکھو توریت کے سارے احکام یک دم آنے سے یہود گھبرا گئے۔ مسلمانوں کو سارے احکام آہستگی سے منوا دیئے گئے۔ **تیسرا فائدہ:** جب بندہ کو رب تعالیٰ سے بہت قرب ہو جاتا ہے تو بندے کے کام کو رب تعالیٰ اپنا کام قرار دیتا ہے۔ فرماتا ہے: میں نے کیا اور رب تعالیٰ کے کاموں کو بندہ کہتا ہے میں کرتا ہوں، یہ شرک نہیں یگانگت کا نتیجہ ہے۔ طور پہاڑ کو بنی اسرائیل پر فرشتوں نے اٹھایا مگر رب نے فرمایا ''رَفَعْنَا'' ہم نے اٹھایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ باذن الٰہی میں مردے زندہ کرتا ہوں۔ اندھوں، کوڑھوں کو شفا دیتا ہوں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے جناب مریم سے فرمایا کہ میں تجھ کو ستھرا بیٹا دیتا ہوں۔ **چوتھا فائدہ:** ڈر اور خوف کا ایمان اور بعض وعدے معتبر ہیں۔ اگر کوئی شخص خوف سے ایمان لے آئے تو اب اسے مرتد ہو جانے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ دیکھو یہود کا وہ عہد و میثاق شرعاً معتبر ہوا جو انہوں نے خوف جان کی بنا پر کیا تھا۔ **پانچواں فائدہ:** کسی کو جبراً مسلمان بنانا جائز نہیں لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ: ۲۵۶) مگر مسلمان کو جبراً برائیوں سے روکنا اس سے جبراً عمل کرانا جائز ہے۔ دیکھو بنی

اسرائیل سے جبراً توریت منوائی گئی یہ فائدہ وَرَفَعْنَا الخ سے حاصل ہوا۔ شامی میں ہے کہ سلطان اسلام، ماہ رمضان کی بے حرمتی کر کے اعلانیہ دن میں کھانے پینے والے مسلمان کو قتل کر سکتا ہے۔ یہ ہے تقویٰ پر مجبور کرنا۔ **چھٹا فائدہ:** اصحاب موسیٰ علیہ السلام سے اصحاب محمد ﷺ افضل ہیں۔ دیکھو رب تعالیٰ نے اصحاب موسیٰ علیہ السلام کے ان حالات کا ذکر کیا مگر جب آیت کریمہ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (بقرہ: ۲۸۴) نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ دلی خطرات قبضہ سے باہر ہیں۔ اگر ان پر پکڑ ہوئی تو نجات کیسے ہوگی؟ حضور انور نے فرمایا کہ کیا تم اصحاب موسیٰ ہو کہ کہتے ہو'' سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا'' (النساء: ۴۶) رب تعالیٰ نے ان کی حمایت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (بقرہ: ۲۸۵) یعنی ان کے ایمان و وفاداری اطاعت شعاری کی گواہی دی اور اپنے قانون میں یوں ترمیم فرمادی لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا الخ (بقرہ: ۲۸۶) غرض کہ جیسا فرق حبیب وکلیم میں ہے ایسا ہی فرق ان کے اصحاب میں ہے۔ **ساتواں فائدہ:** بزرگوں کے شہر کی تعظیم کرنا بہت اچھی بات ہے۔ دیکھو بستی اریحا میں حضرات انبیاء کرام کے مزارات تھے رب تعالیٰ نے اس شہر کی تعظیم اس طرح کرائی کہ یہود کو وہاں سجدہ کرتے ہوئے جانے کا حکم دیا۔ اسی طرح مقدس مقامات کا ادب ضروری ہے۔ رب تعالیٰ نے طویٰ جنگل میں موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اتارنے کا حکم دیا کہ فرمایا: فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (طٰہٰ: ۱۲) اب بھی باہر سے مکہ معظمہ جانے والوں کو حکم ہے کہ احرام باندھ کر داخل ہوں کیوں شہر مکہ کا ادب کرنے کے لئے۔ امام مالک مدینہ منورہ کی سرزمین میں کبھی گھوڑے پر سوار نہ ہوئے۔ کیوں تعظیم مدینہ کے لئے بعض حضرات بزرگوں کی قبر کی طرف پیٹھ نہیں کرتے، قرآن کریم کی طرف پیٹھ یا پاؤں نہیں کرتے، کعبہ معظمہ کی طرف پاؤں پھیلانا شرعاً منع ہے۔ کیوں ان چیزوں کے ادب کے لئے یہ سب کچھ درست ہے اس کا ماخذ یہ آیت بھی ہو سکتی ہے کہ ارشاد ہوا: اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا بلکہ ایک ہی شہر میں مسجد کا اتنا ادب ہے کہ وہاں بے غسل آدمی نہ جائے۔ پہلے داہنا پاؤں داخل کرے اور نکلتے وقت پہلے بایاں پاؤں نکالے۔ بدبو کی چیز مسجد میں نہ لائے۔ یہ سب ادب کے لئے ہے۔ **آٹھواں فائدہ:** بزرگوں کے مزارات کے پاس عبادات زیادہ قبول ہوتی ہیں۔ دیکھو بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ مقام تیہ میں نہیں بلکہ مقام اریحا یا بیت المقدس میں جا کر توبہ یا شکر کرو تب قبول ہوگا۔ ہم کو رب تعالیٰ نے حکم دیا۔ کہ توبہ کرنے کے لئے بارگاہ مصطفوی میں حاضر ہو کر توبہ کرو۔ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ (النساء: ۶۴) جیسے بعض جگہ کی آب و ہوا پھل پھول کے لئے بہت فائدہ مند ہے۔ ایسے ہی مقربین کے قرب کی آب و ہوا عبادات کے لئے بہت فائدہ مند ہے۔ اس سے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ **نواں فائدہ:** مسلمان کسی شہر کو فتح کرنے پر فخر نہ کریں بلکہ رب تعالیٰ کا شکر کریں اور فتح کو اپنی بہادری کا نتیجہ نہ جانیں۔ رب تعالیٰ کا کرم سمجھیں۔ یہ فائدہ سُجَّدًا کی دوسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ کہ یہ سجدہ سجدۂ شکر تھا۔ مجاہد و غازی جہاد میں تین باتوں کا خیال رکھیں۔ (۱) جہاد صرف خدمت اسلام کی نیت سے کریں، ملک گیری غنیمت کے لئے نہ کریں (۲) دوران جنگ کبھی مال حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں اللہ فتح دے تو سب کچھ ہمارا ہے (۳) کبھی

اپنی جماعت یا قوت پر بھروسہ نہ کریں، اللہ کے کرم پر بھروسہ کریں۔ بعد فتح تکبر نہ کریں، سجدۂ شکر کریں انشاءاللہ فتح پائیں گے۔ اللہ کا ذکر کرتے رہیں، جم کرلڑیں رب کرم کرے گا۔ **دسواں فائدہ:** یہود پر ہفتہ کا سارا دن عبادات کے لئے خالی رکھنا ضروری تھا۔ کوئی یہودی اس دن میں کوئی دنیاوی کاروبار نہیں کرسکتا تھا جیسا کہ لَا تَعْدُوْا فِی السَّبْتِ سے معلوم ہوا۔ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ خاص کرم فرمایا کہ جمعہ کے دن صرف ان لوگوں پر کاروبار حرام فرمایا جن پر جمعہ کی نماز فرض ہے۔ وہ بھی اذان اول سے ادائے جمعہ تک یعنی گھنٹہ سوا گھنٹہ اور وہ ہی کاروبار حرام کیے جو تیاری نماز میں رکاوٹ بنیں۔ یہ تمام کرم اس کریم بندہ نواز مدنی محبوب ﷺ کے صدقہ سے ہیں جن کے امتی ہونے کا ہم سب کو شرف حاصل ہے۔

گیارھواں فائدہ: ضدی، ہٹ دھرم کو ہدایت بہت مشکل سے ملتی ہے۔ وہ ہمیشہ کیوں اور کیسے کے جال میں ہی پھنسا رہتا ہے۔ دیکھو حضور ﷺ کے ہم زمانہ ہم ملک یہودی تو ضدوں میں ہی پھنسے رہے مگر حضرات صحابہ کرام حضور کی اطاعت کر کے ملائکہ سے افضل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اطاعت کی توفیق دے، کج بحثی سے بچائے۔ اس واقعہ میں ہم سب کو سبق ہے۔

بارھواں فائدہ: جو اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جائے، اسے قتل کر دیا جائے۔ اگر قتل کی دھمکی سے وہ اسلام میں پھر آ جائے تو جائز ہے۔ دیکھو یہ بنی اسرائیل پہلے مؤمن ہو چکے تھے پھر توریت کا انکار کر کے مرتد ہوئے جس پر پہاڑ اکھیڑ کر سروں پر مسلط کر کے ان سے توریت کا اقرار کرایا تب انہیں معافی دی گئی۔ پھر جب یہ لوگ بچھڑا پوج کر مرتد ہوئے تو انہیں قتل کرایا گیا فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (بقرہ: ۵۴) جو کہتے ہیں کہ قتل مرتد قرآن مجید سے ثابت نہیں وہ ان آیات سے عبرت پکڑیں۔ قتل مرتد والی احادیث کی ان آیات سے تائید ہوتی ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: کافروں کو جبراً مسلمان بنانا کسی سے جبراً اقرار کرانا جائز نہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (بقرہ: ۲۵۶) تو بنی اسرائیل پر پہاڑ مسلط کر کے دھمکا ڈرا کر توریت کیوں منوائی گئی اور اطاعت کا اقرار کیوں کروایا گیا؟ یہ عمل اس قانون کے خلاف ہے۔ **جواب:** بنی اسرائیل مومن و مسلم تو پہلے ہی ہو چکے تھے اب توریت کا انکار کر کے مرتد ہونا چاہتے تھے، اس ارتداد کی انہیں اجازت نہ دی گئی۔ اب بھی کسی مسلمان کو مرتد نہ ہونے دیا جائے گا۔ اگر ہو گیا تو قتل کیا جائے گا۔ نیز مسلمان کو نیک اعمال کرنے، گناہوں سے بچنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ دس برس کے بچوں کو مار مار کر نماز پڑھاؤ۔ زانی کو رجم، شرابی کو اسی کوڑے، چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاتی ہے تاکہ اس ڈر سے وہ ان جرموں سے بچیں۔ یہود توریت پر عمل کرنے سے انکاری تھے لہٰذا یہ جبر بالکل درست ہے۔

دوسرا اعتراض: جس سجدہ کا اس آیت میں ذکر ہے یا تو سجدۂ شکر تھا۔ یا سجدۂ توبہ کوئی سا سجدہ بھی یہ سجدہ مقام تیہ میں بھی ادا ہو سکتا تھا۔ ان پر یہ پابندی کیوں لگائی گئی کہ اریحا یا بیت المقدس میں سجدہ کرتے جاؤ۔ رب تعالیٰ کی رحمت اور اس کا عفو و کرم تو ہر جگہ ہے پھر یہ قید کیوں؟ **جواب:** جیسے ریل گاڑی گزرتی ہے ساری لائن سے مگر ملتی ہے اسٹیشن پر۔ بجلی کا پاور

موجود ہے سارے تار میں مگر روشنی کے لئے بلب، ہوا کے لئے برقی پنکھے، گرمی کے لئے ہیٹر کے پاس جانا ضروری ہے کہ پاور کا فیض ملتا ہے ان مقامات سے اسی طرح اللہ کی رحمت اس کا عفو و کرم ہے تو ہر جگہ مگر ملتی ہے نیک مقبول بندوں کے پاس یا ان کے مزارات کے پاس یہ مقامات رحمت الٰہی کے اسٹیشن ہیں۔ خود فرماتا ہے: اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (اعراف:۵۶) یا تو خود محسن بنو کسی محسن کے قریب جاؤ تو رحمت الٰہی پاؤ گے۔ ہم مسلمانوں کا بزرگوں کے آستانوں پر حاضر ہونا اسی لئے ہے فرماتا ہے: اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ (نمل:۶۲) یا تم خود بے قرار بنو ورنہ بے قرار دل والوں کے پاس جاؤ تو دعا قبول ہوگی۔ شعر

چراغ زندہ می خواہی در شب زندہ داراں زن
کہ بیداریء بخت از بخت بیداراں شود حاصل

تیسرا اعتراض: سجدہ کرتے ہوئے شہر میں داخل ہونا ممکن نہیں کیونکہ سجدہ چہرے سے ہوتا ہے اور چلنا داخل ہونا پاؤں سے۔ پھر یہود سے یہ کیوں فرمایا گیا کہ دروازۂ شہر میں سجدہ کرتے داخل ہو۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا ہے کہ یا تو سجدہ سے مراد ہے جھکنا۔ رکوع کرنا یعنی ادب سے سر جھکائے ہوئے شہر میں داخل ہو۔ جیسے آج احرام باندھے ہوئے مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں یا مراد یہ ہے کہ نفل پڑھ کر شہر میں داخل ہو۔ یا دروازہ شہر میں داخل ہو کر نفل پڑھو۔ جیسے آج نفل پڑھ کر روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھا جاتا ہے اور مسجد میں جا کر تحیۃ المسجد نفل پڑھتے ہیں۔

چوتھا اعتراض: بنی اسرائیل کو ہر گناہ پر اریحا یا بیت المقدس کیوں نہ بھیجا گیا۔ اس گناہ میں کیا خصوصیت تھی کہ اس کی توبہ کے لئے دوسرے شہر بھیجا گیا۔ رب تعالیٰ نے یہاں ہی معافی کیوں نہ دے دی؟ **جواب:** معمولی گناہ اور معمولی ناراضی کی معافی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ مجرم خود ہی معافی لے لیتا ہے مگر بڑا جرم بخشوانے کے لئے کسی ایسی ذات کو بیچ میں ڈالنا پڑتا ہے جس کی بات حاکم مانتا ہو۔ رب تعالیٰ زوجین کی سخت نااتفاقی کے متعلق فرماتا ہے: فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا (النساء:۳۵) حضرت آدم کی خطا جب تین سو سال کی گریہ زاری سے معاف نہ ہوئی تو حضور کا وسیلہ پکڑا معافی ہوگئی۔ ہم کو فرماتا ہے وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ (النساء:۶۴) مگر ایسے وقت وسیلہ ایسی ذات کو بنایا جائے جو رب سے واصل ہو۔ ہم میں شامل ہو۔ فرشتے رب سے واصل تو ہیں مگر ہم میں شامل نہیں۔ لہٰذا ان کا توسل نہیں۔ کفار اور گناہ گار آدمی ہم میں شامل تو ہیں مگر رب سے واصل نہیں ان کا توسل بھی نہیں۔ حضرات انبیاء اولیاء وہ ہیں جو ادھر اللہ سے واصل ادھر دنیا میں شامل ان کا توسل درست ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل کی خطا سخت تھی اس لئے انہیں نبیوں کے شہر میں بھیجا گیا کہ یہ توبہ کریں وہ اپنی قبروں سے آمین کہیں ان کا کام بن جائے۔ شعر

بھیکا وہ نرکوڑ ہیں جو جانیں گرکو اور
رب روٹھے گر میل دے گر روٹھے نہیں ٹھور

پانچواں اعتراض: جن اسرائیلیوں نے ہفتہ کے دن شکار کرلیا وہ بندر بنا کر ہلاک کر دیئے گئے۔ جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اب بھی یہود و نصاریٰ اپنے محترم دنوں میں شکار کرتے ہیں۔ عذاب کیوں نہیں آتا؟ **جواب:** جن گناہوں پر پچھلے زمانوں میں عذاب آئے وہ تمام گناہ مع زیادتی موجود ہیں۔ مگر دنیاوی عذاب آنا بند ہو گئے۔ قوم شعیب کم تولنے پر، قوم لوط بدکاری پر، ایلہ والے ہفتہ کے دن شکار پر ہلاک ہوئے۔ یہ تمام گناہ اب بھی ہیں مگر عذاب نہیں آتا جبکہ خدا تعالیٰ وہ ہی ہے۔ قدرت وہ ہی ہے۔ ہماری بدکاریاں وہ ہی ہیں۔ مگر نبی وہ نہیں۔ اب نبی رحمت والے حضور محمد رسول اللہ ﷺ کی سلطنت کا دور دورہ ہے اس لئے قانون الٰہی بدل گیا۔ رب نے فرمایا: **وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ** ط (انفال: ۳۳)

تفسیر صوفیانہ

یہود مدینہ کے پاس قال بہت تھا وہ حال سے خالی تھے۔ اسی لئے وہ حضور ﷺ کے فیوض و برکات سے محروم رہے۔ ایسی بارگاہ عالی میں رہ کر ایمان بھی نہ لے سکے۔ جو حال والے تھے انہوں نے اس سرکار سے ایمان، عرفان، ایقان، غذا، شہادت بلکہ صحابیت حاصل کر لی۔ دلائل مثل لالٹین کی روشنی کے ہیں۔ لالٹین وغیرہ سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جس کے پاس آنکھ کی روشنی ہو، اندھے کے لئے یہ خارجی روشنی بیکار ہے۔ یونہی جس کے دل میں توفیق خداوندی کی روشنی نہ ہو وہ معجزات و دلائل سے کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ رب تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے محبوب ﷺ کو تسکین دی ہے کہ یہود کا آپ سے یہ ہدایت نہ پانا اس لئے نہیں کہ شمع جمال محمدی میں روشنی کی کمی ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ان کو توفیق خداوندی کی روشنی نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ لوگ جو مطالبے آپ سے کر رہے ہیں اور جن چیزوں کو اپنے ایمان کے لئے آڑ بنا رہے ہیں وہ چیزیں اپنے پیغمبر میں دیکھ چکے تھے، پا چکے تھے، مگر ان سے اور قسم کی کج بحثی کی۔ یہ لوگ جن کے امتی ہونے کے مدعی ہیں جب ان سے نہ ٹلے تو اگر آپ سے کج بحثی کریں تو ان سے کیا بعید ہے؟ ہم لوگوں کو چاہیے کہ یہود کے اس عناد و فساد سے سبق لیں۔ اگر ہم نے بھی قیل و قال کا دروازہ کھول لیا تو حال سے محروم رہیں گے۔ رب تعالیٰ توفیق خیر نصیب کرے کہ اس سے راہ ملتی ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ
تو ان کے توڑنے کی وجہ سے اپنے عہد کو اور ان کے انکار کی وجہ سے اللہ کی آیتوں کا اور ان کے قتل کرنے کی وجہ
تو ان کی کسی بد عہدیوں کے سبب ہم نے ان پر لعنت کی اور اس لئے کہ آیات الٰہی کے منکر ہوئے اور انبیاء
الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ
سے نبیوں کو بغیر حق کے اور ان کے کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں بلکہ مہر لگا دی
کو ناحق شہید کرتے اور ان کے کہنے پر کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان

اللّٰہُ عَلَیۡہَا بِکُفۡرِہِمۡ فَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۱۵۵﴾
اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے پس نہ ایمان لائیں گے مگر تھوڑے
کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑے
وَّ بِکُفۡرِہِمۡ وَ قَوۡلِہِمۡ عَلٰی مَرۡیَمَ بُہۡتَانًا عَظِیۡمًا ﴿۱۵۶﴾
اور ان کے کفر کی وجہ سے اور ان کے کہنے کی وجہ سے اوپر مریم کے بہتان بڑا
اور اس لئے کہ انہوں نے کفر کیا اور مریم پر بہتان اٹھایا بڑا
وَّ قَوۡلِہِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِیۡحَ عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ
اور ان کے کہنے کی وجہ سے کہ بیشک ہم نے قتل کر دیا مسیح عیسیٰ بیٹے مریم کو
اور ان کے اس کہنے پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم
رَسُوۡلَ اللّٰہِ ۚ وَ مَا قَتَلُوۡہُ وَ مَا صَلَبُوۡہُ وَ لٰکِنۡ شُبِّہَ لَہُمۡ ؕ
اللہ کے رسول کو حالانکہ نہ انہوں نے انہیں قتل کیا اور نہ سولی دی انہوں نے اور لیکن شبہ میں ڈالا گیا ان کو
اللہ کے رسول کو شہید کیا اور ہے یہ کہ نہ انہوں نے اسے قتل کیا اور نہ اسے سولی دی بلکہ ان کیلئے ان کی شبیہ کا ایک بنا دیا گیا
وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ ؕ
اور بیشک وہ لوگ جو جھگڑے بیچ ان کے بیچ شک کے ہیں ان سے
اور وہ جو اس کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں ضرور اس کی طرف سے شبہ میں پڑے ہوئے ہیں
مَا لَہُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوۡہُ یَقِیۡنًۢا ﴿۱۵۷﴾
نہیں ہے انہیں اس کا علم سوائے پیروی کرنے گمان کے اور نہیں قتل کیا انہیں یقیناً
انہیں اس کی کچھ بھی خبر نہیں مگر یہی گمان کی پیروی اور بے شک انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا
بَلۡ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ﴿۱۵۸﴾
بلکہ ان کو اٹھا لیا اللہ نے طرف اپنے اور ہے اللہ غالب حکمت والا
بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے

تعلقات

ان آیات کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کا اللہ تعالیٰ سے پختہ وعدہ کرنے کا ذکر تھا۔ اب اس پختہ عہد کے توڑ دینے کا ذکر ہے یعنی انہوں نے عہد تو کرلیا مگر پورا نہ کیا بلکہ توڑ دیا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی اس سرکشی کا ذکر تھا جو عہد کرتے وقت انہوں نے کی یعنی خوشی سے عہد نہ کرنا بلکہ پہاڑ گرنے اور اپنے دب کر مر جانے کے خوف سے عہد کرنا۔ اب ان کی اس سرکشی کا ذکر ہے جو اس عہد کے بعد ظاہر ہوئی یعنی اسے پورا نہ کرنا، اسے توڑ دینا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کی اس سرکشی کا ذکر تھا جو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کرتے تھے۔ دیدار الٰہی کا مطالبہ، بچھڑے کی پوجا وغیرہ۔ اب ان کی اس سرکشی کا ذکر ہے جو انہوں نے دوسرے نبیوں سے کی۔ انبیاء کرام کو قتل کر دینا اور عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ کو بہت ستانا تاکہ معلوم ہو کہ یہ لوگ عادی مجرم ہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ان کے مجرم ہونے کا ذکر تھا۔ اب ان کے ڈھیٹ ہونے کا ذکر ہے کہ یہ لوگ مجرم بھی ہیں اور ڈھیٹ بھی کہ کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف و پردے ہیں یعنی جرموں پر بجائے شرمندہ ہونے کے ناز کرتے ہیں۔ جو ایسا ڈھیٹ مجرم ہو اس کی ہدایت کی کیا امید ہے؟ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی سرکشیوں اور حضور ﷺ کی مخالفتوں کا ذکر تھا اب اشارۃً غیبی خبر دی جارہی ہے کہ یہ لوگ اپنی تدبیروں میں ناکام رہیں گے۔ یہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی تدبیر میں ناکام رہے دوسرے نبیوں کی مخالفت میں خائب و خاسر رہے تو اے محبوب! آپ کی مخالفت میں بھی یہ سب اسی طرح ناکام و نامراد رہیں گے۔

تفسیر

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: ف تعقیب بلا تراخی کے لئے ہے چونکہ یہود نے گزشتہ عہد کرتے ہی اس کی مخالفت شروع کردی تھی۔ اس لئے ف ارشاد ہوا۔ ب جارہ سببیہ ہے مَا زائدہ نقض کے معنی ہیں توڑنا، وعدہ کی بالکل پابندی نہ کرنا، اس کی پوری مخالفت کرنا نقض عہد کہلاتا ہے۔ اس کا مقابل ہے ایفائے عہد یعنی وعدہ پورا کرنا، ھم کا مرجع وہ ہی یہود مدینہ ہیں جن کا ذکر پہلے سے ہورہا ہے کہ اگرچہ وعدہ شکنی کرنے والے ان کے باپ دادے تھے مگر چونکہ یہ لوگ ان کی حرکتوں سے راضی تھے اس لئے یہ جرم ان کی طرف منسوب فرمایا گیا۔ میثاق سے وہی عہد مراد ہے جو کوہِ طور مسلط فرما کر ان سے لیا گیا۔ یعنی احکام توریت پر عمل کرنا۔ اس میں گفتگو ہے کہ **فَبِمَا** جار مجرور کس کے متعلق ہے؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ آئندہ جو ارشاد ہو رہا ہے: **حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ** (النساء:۱۶۰) اس کے متعلق ہے مگر زیادہ قوی یہ ہے کہ "لعنا یا سخطنا" پوشیدہ فعل کے متعلق ہے (تفسیر کبیر وغیرہ) عہد توڑنے سے مراد توریت شریف پر عمل کرنے کا عہد توڑنا ہے۔ ان یہود نے وعدہ خلافی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے ہی شروع کردی تھی پھر برابر کرتے ہی رہے۔ عقیدے، عبادات، معاملات سارے احکام میں خلاف ورزی کی حتیٰ کہ قارون نے زکوٰۃ سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ اس حکم کو ہی غلط کہا، موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا منکر ہوگیا، نمازیں چھوڑ دیں حتیٰ کہ یہود نے آگے چل کر حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مان لیا۔ خیال رہے کہ کفر کرنا۔ علامات کفر اختیار کرنا یعنی وہ عمل کرنا جو نشان کفر ہیں یوں ہی گناہ کو جائز سمجھ کر کرنا یہ ہے نقض عہد۔ جس سے

انسان دین سے نکل کر بے دین ہو جاتا ہے۔ گناہ بدعملی ہے نقض عہد نہیں۔ لہٰذا ان کی بدعملیوں کو عہد توڑنا کہنا بالکل درست ہے۔ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ یہ عبارت نَقْضِهِمْ پر معطوف ہے۔ کفر سے مراد انکار کرنا ہے۔ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ سے مراد قرآن کریم کی آیتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ہیں۔ جس کے موجودہ یہودی منکر تھے۔ اور ہو سکتا ہے کہ آیات سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور توریت کی آیات ہوں کہ اگرچہ وہ لوگ ان کے مان لینے کے دعویدار تھے مگر چونکہ عمل خلاف تھا اس لئے انہیں منکر قرار دیا گیا نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار سارے رسولوں، ساری کتابوں، سارے رسولوں کے معجزات کا انکار ہے (تفسیر صاوی) غرض کہ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ میں چار احتمال ہیں اور کفر میں دو احتمال۔ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ آیات قرآنیہ یا معجزات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو کفر سے مراد اعتقادی و اقراری کفر ہے کہ یہود ان دونوں کے منکر تھے کھلے ہوئے۔ اور اگر آیات اللہ سے مراد آیات توریت ہیں یا موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں تو ''كُفْرِهِمْ'' سے مراد عملی کفر کہ زبان سے ان دونوں کے اقراری تھے۔ عملاً انکاری۔ اب بھی عیسائی انجیل کے زبانی اقراری ہیں عملاً انکاری یہ ہی حال ہندوؤں کا ہے کہ عملاً وہ وید کو چھوڑ چکے ہیں۔ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ یہ عبارت ''كُفْرِهِمْ'' پر معطوف ہے۔ اور یہود کے لعنتی ہونے کی تیسری وجہ۔ قتل سے مراد تلوار وغیرہ سے شہید کرنا ہے ھم کا مرجع وہ ہی موجودہ یہود ہیں۔ انبیاء سے مراد وہ نبی ہیں جنہیں یہود نے قتل کیا تھا یہ بہت بڑی جماعت تھی۔ ان میں حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام بھی ہیں۔ بِغَيْرِ حَقٍّ سے مراد خود ان قاتل یہودیوں کے خیال میں بھی ناحق ہوتا ہے کہ یہود خود بھی کہتے تھے کہ ہم نے ان حضرات کو بلاوجہ قتل کیا۔ محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر۔ کیونکہ قتل کی وجہ صرف تین ہو سکتی ہیں۔ مرتد ہو جانا، کسی کو قتل کر دینا، زنا یا بغاوت۔ ان حضرات انبیاء سے یہ کوئی جرم صادر نہ ہوا تھا۔ لہٰذا ان کا قتل ناحق ہی تھا۔ وَ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ یہ عبارت قَتْلِهِمُ پر معطوف ہے۔ اور یہود کے پھٹکارے جانے کی چوتھی وجہ۔ غُلْفٌ یا تو غلاف کی جمع ہے بمعنی بستہ و جزدان یا اغلف کی جمع ہے بمعنی بستہ میں بندھا ہوا۔ لہٰذا اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے دل رحمت الٰہی کے پردوں و بستوں میں محفوظ ہیں۔ اس حفاظت کی وجہ سے آپ کی تبلیغ ہمارے دلوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس کی تفسیر وہ آیت ہے وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ (فصلت: ۵) یعنی وہ اپنے کافر رہنے، اسلام قبول نہ کرنے پر فخر کرتے تھے اور اسے رحمت خداوندی سمجھتے تھے۔ دوسرا یہ کہ ہمارے دل علوم الٰہیہ کے غلاف معرفت ربانی کے برتن ہیں۔ جن میں علم و معرفت بھرے ہوئے ہیں۔ ہم کو آپ کے اسلام کی ضرورت نہیں ہم تو خود علم و ایمان کا سرچشمہ ہیں (روح البیان و کبیر وغیرہ) یعنی وہ اپنے کو علم و عرفان کا مرکز سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے نیاز سمجھتے تھے۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ اس عبارت میں ان کی اس بکواس کی تردید ہے۔ ''بَلْ'' پچھلے مضمون کی نفی کرنے اگلے مضمون کو ثابت کرنے کے لئے آتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے دلوں پر حفاظتی رحمت کے پردے ہیں۔ رب نے فرمایا: نہیں بلکہ ان پر لعنتی مہریں ہیں۔ طبع اور ختم کے معنی چھاپ دینا۔ مہر لگا دینا۔ اس کی تحقیق پہلے پارے میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (بقرہ: ۷) کی تفسیر میں کی جا چکی ہے کہ آنکھ کے لئے ''غشاوہ'' یعنی پردہ مناسب ہے۔ کہ آنکھ صرف سامنے کو دیکھتی ہے اور پردہ بھی ایک سمت کے لئے آڑ بنتا

ہے۔مگر کان و دل کے لئے مہر فرمانا مناسب ہے کہ کان ہر طرف کی آواز سنتے ہیں اور دل ہر طرف کی چیز میں غور کرتے ہیں۔ ان کے لئے مہر فرمانا مناسب ہے کہ مہر لگ جانے سے ہر طرف کی روک ہو جاتی ہے۔جیسے پارسل کے تھیلے پر مہر۔ختم اور طبع دونوں ہم معنی ہیں۔بمعنی مہر لیکن کبھی ان میں اس طرح فرق کیا جاتا ہے کہ ختم تو ہر مہر کو کہا جاتا ہے خواہ وہ ٹوٹ سکے یا نہ۔جیسے لاکھ پر مہر مگر طبع وہ مہر ہے جو نہ اکھڑ سکے نہ ٹوٹ سکے نہ اڑ سکے یعنی چھاپہ شدہ۔مہر لہٰذا طبع خاص ہے ختم عام۔پھر دل پر مہر لگنا دو قسم کا ہے۔زمانی اور آنی گناہ اور بدعملیوں کی وجہ سے بہت زمانہ میں دل سیاہ ہوتا ہے۔مگر اللہ والوں کی بے ادبی کی وجہ سے آن کی آن میں دل سیاہ ہو کر مہر لگ جاتی ہے۔ابلیس کے دل پر آن کی آن میں مہر لگ گئی صرف آدم علیہ السلام کی بے ادبی سے جیسے سیاہی آنی بھی ہوتی ہے زمانی بھی یوں ہی دل کی صفائی آنی بھی ہوتی ہے زمانی بھی۔نیک اعمال سے صفائی زمانی ہوتی ہے اور نگاہِ ولی سے صفائی آن میں فرعونی جادوگروں کی دلی صفائی آن میں ہوگئی۔اس لئے صحبت اولیاء ایک آن کی سو برس کی عبادت سے افضل ہے۔مگر صوفیاء کے ہاں صحبت وہ ہے جو عقیدت کے ساتھ ہو۔بغیر عقیدت صرف پاس بیٹھ جانا صحبت نہیں۔صدیق اکبر صحابی ہوئے مگر ابوجہل کافر ہی رہا۔کہ جناب صدیق کو عقیدت میسر تھی۔کسی کے گھر دوست بن کر جاؤ خاطر تواضع ہوگی۔چور بن کر جاؤ جیل ملے گی۔بغیر عقیدت اولیاء اللہ کے پاس جانے والا چور ہے، عقیدت سے جانے والا دوست ہے۔یہاں طبع اللہ میں طبع سے مراد آنی مہر ہے۔جو حضور ﷺ کی گستاخی کی وجہ سے ہوئی۔اس لئے فرمایا گیا ''بِكُفْرِهِمْ'' یہاں مہر فرمادینے کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف خلق کی نسبت ہے کہ کاسب مہر وہ یہود ہیں اور خالق مہر رب تعالیٰ اس لئے ارشاد ہوا ''بِكُفْرِهِمْ'' یعنی ان کے کفر میں مشغول رہنے کی وجہ سے رب نے ان کے دلوں پر مہر لگادی جس سے وہ ناقابل ایمان ہو گئے۔جیسے گلے پر چھری پھیر دینے کی وجہ سے رب تعالیٰ موت فرمادیتا ہے۔ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا یہ عبارت طَبَعَ اللّٰهُ کے نتیجہ کا بیان ہے۔''قَلِيْلًا'' یا تو ''لَا يُؤْمِنُوْنَ'' کے فاعل ھُمْ سے استثناء ہے تو استثناء منقطع ہے کیونکہ جو تھوڑے یہودی ایمان لائے ان کے دل پر مہر نہ ہوئی تھی۔یا ایمان سے مستثنیٰ متصل ہے۔اور ''قَلِيْلًا'' سے مراد تھوڑی چیزوں پر ایمان ہے یا تھوڑی مدت تک ایمان۔لہٰذا اس جملہ کی تین تفسیریں ہیں۔یعنی یہ یہود ایمان نہیں لائیں گے مگر ان میں سے تھوڑے آدمی جیسے ان میں سے حضرت عبداللہ ابن سلام اور اس کے ساتھی کیونکہ ان کے دلوں پر مہر نہ ہوئی تھی یا یہ یہود ایمان نہیں لائیں گے مگر نبیوں کی تھوڑی آیات اور تھوڑی ایمانیات پر ایسا ایمان معتبر نہیں یا یہود ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑی مدت کہ کچھ روز یہ لوگ مومن رہے پھر زمانہ موسوی کے بعد ہی ایمان سے پھر گئے۔پہلے معنی زیادہ موزوں ہیں۔اعلیٰ حضرت قدس کا ترجمہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا یہ عبارت ''بِكُفْرِهِمْ'' پر معطوف ہے اور اس کفر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنا ہے اور پہلے ''کفرہم'' میں موسیٰ علیہ السلام اور دیگر نبیوں کا انکار مراد تھا لہٰذا عبارت میں تکرار نہیں ھم کا مرجع وہ ہی یہود ہیں ''قَوْلِهِمْ یا تو کفرھم'' کی تفسیر ہے یا علیحدہ کفر۔بہتان سے مراد زنا کا بہتان ہے۔چونکہ یہود نے حضرت مریم کی کرامات، عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھنے کے باوجود

انہیں بہتان لگایا یا بڑی ہستی کو بہتان لگایا۔ اس لئے اسے بہتان عظیم فرمایا۔ خیال رہے کہ بہتان بنا ہے بھتٌ سے بمعنی حیرانی فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ (بقرہ: ۲۵۸) بہتان کسی کو ایسا عیب لگانا جس سے وہ حیران رہ جائے۔ اس جملہ میں یہود کا پانچواں اور چھٹا عیب بیان ہوا جس کی وجہ سے وہ لعنتی ہوئے۔ خیال رہے کہ اس عبارت میں چار طرح جناب مریم کی عظمت ظاہر ہوئی۔ ایک تو قَوْلِهِمْ فرما کر یہود نے یہ بہتان صرف زبانی قول سے لگایا۔ ورنہ نہ تو ان کے دل اسے صحیح مانتے ہیں نہ سننے والے۔ کیونکہ حضرت مسیح کی بچپن کی گواہی اور جناب مریم کی اگلی پچھلی پاکیزہ زندگی اس کی تردید کرتی ہے۔ دوسرا مریم فرما کر کہ باپ نے جب انہیں بیت المقدس کی خادمہ بنایا تو وہ بری کیسے ہوسکتی ہیں؟ تیسرا اسے بہتان فرما کر کہ یہ ایسا جھوٹ تھا جسے سن کر حیران ہوجائیں۔ چوتھا اسے عظیم فرما کر جناب مریم کو بہتان لگا کر صغیرہ گناہ یا کبیرہ گناہ نہ کیا بلکہ گناہ عظیم کیا۔ کفر گناہ کبیرہ ہے مگر بزرگوں کو تہمت لگانا گناہ عظیم ہے۔ وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ یہ عبارت وَ قَوْلِهِمْ پر معطوف ہے جو ابھی ذکر ہوا ھم کا مرجع وہ ہی یہود ہیں۔ اس میں ان کے ساتویں جرم کا ذکر ہے جس کی وجہ سے وہ لعنت کے مستحق ہوئے۔ اس عبارت میں فرمایا گیا کہ یہ جرم بھی کرتے ہیں اور جرم پر فخر بھی اور جھوٹ بھی۔ قتل سے مراد مطلقاً مار ڈالنا، جان نکال دینا نہ کہ دھاردار آلہ سے قتل کیونکہ یہود قتل عیسیٰ کے قائل نہ تھے، انہیں سولی دینے کے قائل تھے۔ مسیح کے معنی پہلے بیان ہوچکے ہیں یا تو مسیح بنا ہے چھو کر زندہ یا اچھا کر دینے والے۔ پیغمبر یا سیاحت سے بنا بمعنی عالم میں سیر کرنے والے کہیں اپنا گھر نہ بنانے والے پیغمبر۔ اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کو ولدیت کے ساتھ بیان نہ کیا، سب کا صرف نام لیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مع ولدیت کے بیان فرمایا اور نسبت فرمایا ماں کی طرف کیونکہ آپ بغیر باپ پیدا ہوئے تھے۔ نیز یہود کا عیسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ کہنا یا تو دل لگی یا مذاق کے طور پر تھا۔ یعنی جو رسول اللہ بنتے تھے ہم نے انہیں قتل کر دیا جیسے فرعون نے کہا تھا اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (شعرا: ۲۷) یا کفار قریش حضور سے کہتے تھے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ (حجر: ۶) یا عیسائیوں سے خطاب تھا کہ تم جن کو رسول اللہ مانتے ہو ہم نے انہیں قتل کر ڈالا۔ خیال رہے کہ بعض عقیدے کفر ہیں، بعض قول کفر ہیں اور بعض عمل کفر جو اعمال علامت انکار ہیں وہ کفر ہیں۔ جیسے نبی کی اہانت ان کا قتل یا قتل کا ارادہ یا قرآن کی توہین نیز کفر کا اقرار کفر ہے گناہ کا اظہار گناہ۔ اس جملہ میں یہود کے دو کفر بیان ہوئے ایک تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ دوسرا اس پر فخر کرنا، اس کا اعلان کرنا یہ دونوں جرم لعنت کے باعث ہوئے۔ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ یہ عبارت یہود کے اس دعویٰ کی تردید ہے جو ابھی مذکور ہوا کہ وہ دعویدار تھے کہ ہم نے جناب مسیح کو جان سے مار دیا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: نہ تو انہیں قتل کیا نہ انہیں سولی دی۔ خیال رہے کہ صَلَبُوْهُ بنا ہے صلب سے بمعنی سخت و مضبوط لکڑی چونکہ اس زمانہ میں سولی کا طریقہ یہ تھا کہ انگریزی کی T ٹی کی شکل کی مضبوط لکڑی پر مصلوب کو لٹکا دیا جاتا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھونک دی جاتی تھیں کہ وہ اس طرح سوکھ سوکھ کر مر جاتا تھا۔ اس لئے سولی دینے کو تصلیب کہتے تھے اور سولی گاہ کو صلیب کہتے تھے۔ تین دن یا کم و بیش میت اس طرح صلیب پر لٹکی رہتی تھی۔ کبھی جلد ہلاک کرنے کے لئے مصلوب

کے پاؤں کاٹ دیئے جاتے تھے۔ عیسائی انگریز حرف T ٹی کی شکل کو اب بھی پوجتے ہیں یہ سمجھ کر کہ حضرت مسیح کی سولی گاہ ہے۔ ہم فقیر نے بیت المقدس میں اس سولی گھر کو دیکھا ہے جو مسجد عمر کے بالکل سامنے ہے وہاں جناب مسیح کی مصنوعی قبر بھی بنی ہے اور غسل کا تختہ پتھر کا بھی رکھا ہے۔ خیال رہے کہ اس جملہ میں حضرت مسیح کو قتل کرنے کی بھی نفی ہے اور ان کو سولی پر چڑھا دینے کی بھی نفی ہے لہٰذا مرزائیوں کا یہ عقیدہ کہ آپ کو سولی پر لٹکایا گیا مگر جان نہ نکلی بے ہوش ہو گئے اس آیت کریمہ کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کریم فرما رہا ہے ''وَمَاصَلَبُوْهُ'' یہود نے انہیں صولی نہ چڑھایا۔ یہ کہتے ہیں کہ سولی چڑھا تو دیا مگر وہاں جان نہ نکلی جان نکلنے کی نفی ''مَاقَتَلُوْهُ'' میں ہوئی اور سولی چڑھانے کی نفی ''مَاصَلَبُوْهُ'' میں جیسے پھانسی دینا اور ہے، پھانسی پر جان نکلنا کچھ اور۔ پھانسی کی نفی سے پھانسی پر چڑھانے کی مطلق نفی ہو جاتی ہے۔ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔ لٰکِنْ حرف استدراک ہے جیسے وہم دور کرنے کے لئے بولتے ہیں۔ ''شُبِّهَ'' باب تفعیل کا ماضی مطلق مجہول ہے جس کا مصدر ہے تشبیہ اور تشبیہ کے معنی ہیں کسی کو کسی کا شبیہ یا ہمشکل بنا دینا یا کسی کو شبہ و دھوکہ میں ڈال دینا۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں مگر پہلا معنی زیادہ قوی۔ دونوں صورتوں میں لَهُمْ شُبِّهَ کا نائب فاعل ہے۔ جیسے ''خیل الیه'' میں الیہ نائب فاعل ہے خیل کا اور جیسے ''لُبِسَ عَلَيْهِ'' میں لفظ علیہ نائب فاعل ہے لُبِسَ کا یعنی ان یہود کے لئے جناب عیسیٰ کا ہم شکل بنا دیا گیا (روح البیان وغیرہ) یا ان یہود کو شبہ و دھوکہ میں ڈال دیا گیا اس طرح کہ جو منافق آپ کو قتل یا قید کرنے آپ کے پاس آیا اسے جناب عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا ...... جس کا نام ططیانوس یا یودس ذکریا یوتا تھا یا آپ کے ایک حواری سرجس کو اس کی اپنی خواہش پر آپ کا ہم شکل کر دیا اور اسے سولی دے دی گئی (تفسیر ابن کثیر) یہ واقعہ جمعہ کو بعد نماز عصر ہوا (ابن کثیر) جس بادشاہ نے سولی دلوائی اس کا نام داؤد تھا۔ یہ چیزیں خیال رکھو وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ یہاں الَّذِيْنَ سے مراد وہ ہی یہودی ہیں جو حضرت مسیح کے قتل کے دعویدار تھے۔ اختلاف سے مراد ان کا یہ جھگڑا ہے کہ آیا حضرت مسیح قتل و مصلوب ہوئے یا کوئی دوسرا شخص۔ بعض کہتے تھے کہ یہ حضرت مسیح ہی ہیں کیونکہ ان کا چہرہ مسیح جیسا ہے۔ بعض کہتے تھے کہ یہ مصلوب کوئی اور آدمی ہے۔ کیونکہ اس کے باقی اعضاء مسیح جیسے نہیں، نیز اگر حضرت مسیح مصلوب ہوئے تو ہمارا آدمی ططیانوس کہاں گیا۔ غرض کہ وہ فیصلہ نہ کر سکے کہ مصلوب کون ہے یا اس سے مراد عیسائیوں کا اختلاف کہ ان کے بعض کہتے ہیں کہ ناسوت عیسیٰ قتل ہوا نہ کہ لاہوت عیسیٰ اور بعض کہتے ہیں ناسوت و لاہوت دونوں قتل ہوئے ناسوت سے مراد ان کی بشریت ہے اور لاہوت سے مراد ان کی الوہیت ہے (تفسیر روح البیان) یا بعض عیسائیوں نے کہا کہ ہم نے انہیں زندہ آسمان پر جاتے دیکھا ہے۔ بعض بولے کہ ہم نے انہیں صلیب پر لٹکے دیکھا۔ غرض کہ آپس میں دھول جوتا ہی رہا۔ خیال رہے کہ اسلام کے سوا کسی دین میں یقین نہیں اسلام اور صرف اسلام میں ہی یقین ہے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ ہی معین نہیں کہ خدا تعالیٰ ایک ہے یا چند۔ اگر چند ہیں تو کتنے؟ کوئی دو مانتا ہے کوئی چھ کوئی تین سو ساٹھ۔ پھر یہ یقین نہیں کہ وید کتنے ہیں؟ ایک یا دو یا تین یا چار پھر اس میں جھگڑا ہے کہ یہ وید آئے کس پر؟ کوئی ہندو کہتا ہے چار انسانوں پر آئے، کوئی کہتا ہے آگ، پانی، مٹی، ہوا پر اترے۔ عیسائیوں کا حال ان سے بھی بدتر ہے۔

وہاں بھی یہ یقین نہیں کہ خدا ایک ہے یا تین اور عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں یا ان کے بیٹے یا اس کا حلول پھر یہ معین نہیں کہ انجیلیں کل کتنی ہیں اور ہر انجیل میں آیات کتنی ہیں؟ دیکھوان کا پرانا عہد نامہ اور نیا عہد نامہ اور انجیل بر بناس میں جھگڑا ہے۔ یہ ہی جھگڑے یہود میں پڑے ہوئے ہیں۔ الحمد للہ اسلام کا خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک، کعبہ ایک، رمضان ایک، نماز ایک۔ غرض کہ یقین اسلام میں ہی میسر ہے۔ عیسائیوں کا اتفاق صرف نمائشی اور قومی ہے ورنہ وہ تو مرے بعد بھی متفق نہیں ہوتے۔ دیکھو ولایتی گورے عیسائیوں کا قبرستان الگ ہوتا ہے، دیسی کالے عیسائیوں کا قبرستان الگ، پھر ہندوستانیوں میں صاحب بہادروں کا قبرستان علیحدہ، چوہڑے چمار عیسائیوں کا قبرستان علیحدہ۔ جو قوم مرے بعد بھی ایک نہ ہو سکے وہ زندگی میں ایک کیسے ہوگی؟ اور جن کی جڑیں الگ ہیں ان کی شاخیں ایک کیسے ہوں؟ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ یہاں بھی لَهُمْ سے مراد وہ آپس میں جھگڑنے والے یہود ہیں یا عیسائی۔ علم سے مراد علم یقینی ہے یا علم واقعی اور ظن سے مراد جہالت مرکبہ ہے یا اٹکل پچو وہم وخیال یعنی انہیں اس کا کوئی یقین نہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول نہ ہوئے۔ وہ بھی یقین نہیں رکھتے۔ صرف اندازاً کہتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ وہ ہی مقتول ومصلوب ہوئے وہ بھی تردد کے ساتھ کہتے ہیں یقین ان کو بھی نہیں یہ ہی حال عیسائیوں کا ہے۔ مرزائیوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اس کے متعلق اٹکل پچو باتیں کہتے ہیں۔ آیات قرآنی میں حضرت مسیح کے زندہ اٹھائے جانے کا پرزور رد کر رہے۔ اس کی ایسی تاویلیں تحریفیں کرتے ہیں کہ ابلیس بھی پناہ مانگے۔ دیکھوان کی تفسیر ''بیان القرآن'' مصنفہ محمد علی لاہوری قادیانی۔ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا یہ اصل واقعہ کا بیان ہے۔ قتل سے مراد مطلقاً مار ڈالنا ہے خواہ دھاردار آلہ سے ہو یا پھانسی سولی وغیرہ دے کر يَقِيْنًا یا تو نفی قتل کے متعلق ہے یا قَتَلُوْهُ کے فاعل ھم سے حال یعنی یقیناً انہیں قتل نہ کیا یا ان لوگوں نے یقین کرتے ہوئے قتل نہ کیا بلکہ شک وتردد کے ساتھ ہی قتل کیا، وہ قتل کے وقت بھی تردد کرتے رہے کہ ہم جناب عیسیٰ کو قتل کر رہے ہیں یا کسی اور کو غرض کہ يَقِيْنًا میں چار احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہود نے حضرت عیسیٰ کو یقین کی بناء پر سولی نہیں دی محض ظن وگمان پر حالانکہ سولی پھانسی یقین کر کے دی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ انہیں یقین کر کے سولی نہیں دی۔ تیسرا یہ کہ یہ بات یقینی ہے کہ انہیں سولی نہیں دی۔ چوتھا یہ کہ میں یقین سے کہتا ہوں کہ انہیں سولی نہیں دی۔ چوتھے معنی باطل ہیں کیونکہ رب تعالیٰ کے علم کو یقین نہیں کہا جاتا۔ پہلے تین درست ہیں۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ بل گزشتہ مضمون کی نفی اور اگلے مضمون کے ثبوت کے لئے آتا ہے رفع کے معنی اٹھانا، بلند کرنا، چڑھانا ہیں۔ اٹھانا کبھی جسمانی ہوتا ہے کبھی رتبہ ومرتبہ کا مگر اس کے بعد الیٰ یا علیٰ آئے تو اس سے جسمانی اٹھانا مراد ہوتا ہے۔ یونہی جب اٹھانے کا مفعول کوئی جسم ہو تو اس سے بلندی مکانی مراد ہوتی ہے۔ پہلے کی مثال وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف: ۱۰۰) یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر اٹھا لیا۔ دوسرے کی مثال وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ (بقرہ: ۱۲۷) جب کہ ابراہیم واسمٰعیل بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے چونکہ یہاں رفع کے بعد الیٰ ہے لہٰذا اس سے جسمانی بلندی مراد ہے ہ کا مرجع رب تعالیٰ ہے اور اپنی طرف اٹھا لینے سے مراد ایسے مقام پر اٹھا لینا ہے جہاں کسی انسان کی بادشاہت

نہ ہو یعنی آسمان پر دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ہجرت کے متعلق فرمایا: اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (صافات: ۹۹) اپنے رب کے پاس جانے والا ہوں یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھالیا۔ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا چونکہ اس اٹھانے پر بہت سے عقلی اعتراضات ہو سکتے تھے۔ جسم انسانی بغیر سیڑھی آسمان پر کیسے چڑھ گیا؟ زمہریر اور آگ کے طبقہ میں کیسے محفوظ رہا؟ آسمان پر ہوا وغذا نہیں تو وہاں زندگی کیسی؟ ان تمام خرافات کے لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ غالب بھی ہے جو چاہے کرے۔ وہ بغیر آلہ آسمان پر پہنچا بھی سکتا ہے اور بغیر ہوا وغذا زندہ بھی رکھ سکتا ہے۔ جیسے مرغی کے بچے کو انڈے میں زندہ رکھتا ہے۔ اور حکمت والا بھی ہے کہ اس اٹھانے میں اس کی لاکھوں حکمتیں ہیں۔ لہٰذا بغیر چون و چرا یہ سب کچھ مان لو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے کا پورا واقعہ مع اعتراضات و جوابات ہم تیسرے پارہ میں بیان کر چکے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کریمہ میں بنی اسرائیل کے سات جرم بیان فرمائے (۱) توریت پر عمل کے عہد کو توڑ دینا (۲) موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور آیات توریت کا انکار (۳) حضرات انبیاء کرام کو ناحق قتل کرنا (۴) فخریہ کہنا کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں (۵) عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنا (۶) حضرت مریم کو بہتان لگانا۔ (۷) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا دعویٰ جن میں سے دو جرم عملی ہیں، عہد توڑنا۔ حضرات انبیاء کا قتل کرنا اور باقی پانچ جرم قولی ہیں۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات شریف پر بہت سے اسلامی عقائد موقوف ہیں جیسے آپ کا سینکڑوں برس بغیر کھائے پئے آسمان پر زندہ رہنا۔ قرب قیامت دنیا میں آنا، دین اسلام کی خدمت کرنا، حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ روضہ انور میں دفن ہونا اور وفات مسیح عیسائیت کی جان ہے۔ یعنی مسئلہ کفارہ کہ ان کی سولی عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ہوگی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے گناہ گار عیسائیوں کو چھوڑ دیا اور ان کے عوض بے گناہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دے دی۔ اس لئے رب العالمین نے عیسیٰ علیہ السلام کی حیات پر قرآن کریم میں بہت زور دیا ہے۔ دوسرے نبیوں کی حیات و وفات پر زور نہیں دیا اور ان جرموں کے بیان کا مقصد حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسکین دینا ہے۔ کہ ان بنی اسرائیل کی ضد و عناد سے مغموم نہ ہوں یہ تو پہلے بھی ایسے ایسے جرم کر چکے ہیں اور پھٹکار بارہا کھا چکے ہیں۔ ان پر یہ پھٹکاریں اس لئے پڑیں کہ انہوں نے طور کے گرنے کے خوف سے جو مضبوط وعدہ کیا تھا اسے توڑ دیا اور توریت پر عمل نہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات توریت کی آیات دیکھیں اور انکار کیا۔ محض نفسانی خواہش سے حضرات انبیاء کرام کو ناحق شہید کیا۔ چنانچہ حضرت یحییٰ و زکریا علیہما السلام بھی انہیں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ پھر یہی کہتے رہے اور کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر تو حفاظت و رحمت کے غلاف چڑھے ہیں۔ جیسے غلاف والی کتاب گرد و غبار سے محفوظ رہتی ہے ایسے ہی ہمارے دل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ کا اثر لینے سے محفوظ ہیں۔ اے محبوب! ان کی بکواس غلط ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر و گناہوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ ایمان سے محروم رہیں گے۔ ہاں! ان میں سے کچھ تھوڑے ہی لوگ وہ ہوں گے جنہیں ایمان نصیب ہوگا نیز انہی بدنصیبوں نے حضرت مریم کی کرامات، عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے جو بوقت پیدائش ان سے ظاہر ہوئے، سب کچھ دیکھ کر بھی اس کنواری

بتول طیبہ طاہرہ کو زنا کی تہمت لگائی۔ حالانکہ وہ کرامات پکار رہی تھیں کہ وہ صدیقہ پاک ہیں، طیبہ طاہرہ ہیں پھر انہوں نے جناب مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کی کوشش کی اور مشہور کر دیا کہ ہم نے ان کو سولی دے دی مگر یہ جھوٹے ہیں۔ انہوں نے نہ تو ان جناب کو قتل کیا نہ انہیں سولی دی بلکہ انہیں رب تعالیٰ کی طرف سے شبہ میں ڈال دیا گیا کہ جو ان جناب کو قتل کرنے یا پکڑوانے آیا تھا اسے ان کا ہم شکل کر دیا گیا انہوں نے اسے قتل یا سولی کر دیا پھر ان میں خود آپس میں پھوٹ پڑ گئی کہ بعض تو کہنے لگے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی ہے۔ دیکھو ان کا چہرہ وہی ہے اور بعض بولے کہ نہیں یہ تو کسی اور شخص کو سولی دے دی، دیکھو اس کے پاؤں عیسیٰ علیہ السلام کے سے نہیں ہیں۔ اور اگر عیسیٰ علیہ السلام یہی ہیں تو بتاؤ ہمارا ططیانوس کہاں گیا جو انہیں پکڑوانے کے لئے ان کے پاس حجرہ میں گیا تھا۔ بہر حال انہیں علم یقینی نہیں یقین یا وحی سے ہوتا ہے یا اپنے دیکھ لینے سے یا خبر متواتر سے۔ ان یہودیوں، عیسائیوں کے پاس وفات حضرت مسیح کے متعلق نہ وحی الٰہی ہے نہ چشم دید حالات نہ خبر متواتر۔ ان کی موجودہ انجیلوں کے مصنفین لوقا، متی، یوحنا وغیرہ بھی اس سولی کے واقعہ پر موجود نہ تھے۔ محض سنی سنائی باتوں پر ان کے مذہب کی بنیاد ہے۔ صرف انکل پچو اپنے وہم و گمان سے ہی قتل عیسیٰ کا دعویٰ کر رہے ہیں یہ لوگ انہیں قتل نہ کر سکے انہیں تو اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور سے آسمان پر اپنی طرف اٹھا لیا کہ ططیانوس کے دیکھتے دیکھتے حجرے کی چھت کے ذریعے آسمان پر تشریف لے گئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ رب تعالیٰ غالب بھی ہے کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ان سب نے حضرت مسیح کو قتل و سولی کرنا چاہا۔ رب نے انہیں بچانا چاہا۔ جو رب نے چاہا وہ ہوا، جو ان سب نے چاہا وہ نہ ہوا اور رب تعالیٰ حکمت والا بھی ہے۔ حضرت مسیح کو عجیب طرح پیدا کرنا، عجیب طرح آسمان پر اٹھانا، عجیب طرح انہیں بچانا اور انہیں آسمان پر رکھنا اس میں صدہا حکمتیں ہیں۔

ضروری نوٹ: ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے کا مفصل واقعہ تیسرے پارے کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں اس لئے یہاں بیان نہیں کرتے۔ اسی واقعہ کے متعلق آج دنیا میں چار عقیدے ہیں۔ اکثر یہودی کہتے ہیں کہ ان کو سولی دے کر شہید کر دیا گیا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ وہ جناب سولی پر لٹکے تو ضرور وہاں آپ کی جان بھی نکل گئی۔ سات روز زمین میں دفن رہے پھر زندہ کر کے آسمان پر اٹھائے گئے اور اب وہ آسمان پر زندہ ہیں۔ قرب قیامت اتریں گے۔ مرزائی قادیانی کہتے ہیں کہ وہ سولی پر لٹکے مگر آپ وہاں فوت نہ ہوئے، بے ہوش ہو گئے پھر وہاں سے نجات پا کر چھپ کر کشمیر آ گئے اور کفار کی سلطنت میں رہے اور نہایت گم نامی کی حالت میں وہیں فوت ہوئے اور کشمیر میں ہی آپ کا مزار ہے۔ اسلام و قرآن و حدیث کا فرمان ہے کہ آپ کو سولی دی ہی نہ گئی۔ رب تعالیٰ نے انہیں غیبی طریقہ سے اٹھا لیا ایک شخص کو ان کا ہم شکل کر دیا گیا، اسے سولی دیا گیا۔ آپ آسمان پر محفوظ ہیں اور قرب قیامت زمین پر تشریف لائیں گے، دین اسلام کی شاندار خدمات انجام دیں گے۔ اس کی مکمل تحقیق مع سوالات و جوابات تیسرے پارہ سورۂ آل عمران میں گزر چکی اس آیت کریمہ کی محمد علی لاہوری قادیانی نے ایسی غلط تفسیر کی ہے جس سے آیت مسخ ہو کر رہ گئی وہ تفسیر نہیں کھلی تحریف ہے۔ اس کا ذکر ہم ان شاء اللہ اعتراضات و جوابات میں

ابھی کریں گے۔ یہ بھی خیال رہے کہ حضور ﷺ مرکز ہدایت ہیں کسی کو آپ کا حسن دیکھ کر ایمان ملا کسی کو آپ کے اخلاق دیکھ کر کسی کو آپ کی سخاوت دیکھ کر کسی کو آپ کی شجاعت دیکھ کر جیسے داتا کے گھر کے بہت دروازے ہوں کسی فقیر کو کسی دروازہ سے بھیک ملتی ہے کسی کو کسی دروازہ سے۔ حضرت عبداللہ ابن سلام حسن مصطفیٰ دیکھ کر ایمان لائے۔ جیسا کہ ان کے واقعات میں آتا ہے۔ ہم لوگ ان کا نام سن کر ہی ایمان لائے ان کا نام بھی ہادی ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ کفر و ایمان کا مدار نبوت پر ہے کہ نبی کا ماننا ایمان ہے نبی کا نہ ماننا کفر ہے اسی لئے ''بِکُفْرِهِمْ'' دوجگہ ارشاد ہوا۔ ایک جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انکار کو کفر کہا، دوسری جگہ عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کو کفر قرار دیا۔

فائدے

ان آیات کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کفار کے عیوب ظاہر کرنا، انہیں بدنام کرنا بالکل جائز ہے کہ اس میں کفر کا زور توڑنا اور کفر سے نفرت دلانا ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یہود کے وہ سات عیوب شائع کر دیئے جنہیں لوگ بھول چکے تھے تاکہ ان کفار سے لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو۔ کفار سے نفرت کا نتیجہ کفر سے نفرت ہے۔ **دوسرا فائدہ:** زندہ مردہ کافروں کی غیبت کرنا بھی جائز ہے۔ غیبت مسلمانوں کی حرام ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ان آیات میں یہودیوں کے عیوب بیان کیے جنہیں مرے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔

تیسرا فائدہ: اپنے باپ دادوں کے عیوب اولاد کے عیوب ہیں جب کہ وہ ان کے عیوب سے راضی ہوں یا ان کے دین پر ہوں۔ دیکھو ان آیات میں رب تعالیٰ نے مدینہ منور کے یہودیوں کی طرف وہ عیوب منسوب فرمائے جو ان کے باپ داداؤں نے کیے۔ یعنی نبیوں کا قتل وغیرہ۔ **چوتھا فائدہ:** پیغمبروں کا انکار تمام کفروں سے بدتر کفر ہے بلکہ کفروں کی جڑ ہے کہ اس سے بہت کفر پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھو ان آیات میں دوجگہ یہود کے کفر کا ذکر فرمایا۔ **پانچواں فائدہ:** کفر اور بعض بدکاریاں، بدعملیاں دل پر مہر لگ جانے کا ذریعہ ہیں۔ جیسا کہ ''بِکُفْرِهِمْ'' کی ب سے معلوم ہوا اور دل پر مہر لگ جانا آئندہ ہدایت نہ نصیب ہونے کا ذریعہ ہے۔ اس آیت کریمہ سے وہ آیت صاف ہوگئی خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (بقرہ: ۷) **چھٹا فائدہ:** قرآن کریم کے سوا آج کوئی آسمانی کتاب قابل عمل نہیں۔ اور مسلمانوں کے سوا کوئی قوم سکھ، ہندو، پارسی، یہودی، عیسائی اپنی کتابوں پر عامل نہیں جیسا کہ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا۔ جناب مسیح کی تعلیم ہے اگر تم کسی عورت کو بدنظری سے دیکھو تو آنکھ نکال دو، اگر تم سے کوئی شخص تمہاری پگڑی چھینے تو اسے چوغا بھی دے دو کل کے لئے کھانا جمع نہ کرو، تمہاری روزی آسمانوں پر جمع ہے۔ بتاؤ کون عیسائی اس پر عامل ہے؟ اگر یہ لوگ اس پر عامل ہوتے تو تباہ کن ہتھیار نہ بناتے۔ یہ بات صرف مسلمانوں میں ہے کہ پورے آیات محکمات پر بفضلہ تعالیٰ عامل ہیں۔ اس کے لئے ہماری کتاب انجیل اور قرآن کا مطالعہ کرو۔ **ساتواں فائدہ:** پاک دامن بی بی کو زنا کی تہمت لگانا بدترین گناہ ہے خصوصاً جب کہ وہ بی بی خاص رتبہ والی ہو۔ اس سے عذاب الٰہی آجاتا ہے۔ دیکھو یہود پر لعنت و پھٹکار کی وجہ یہ بھی بیان ہوئی کہ وہ جناب مریم بتول کو بہتان لگاتے ہیں۔ لہٰذا آج جو بھی ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بہتان لگائے وہ یہود کی طرح لعنتی اور

پھٹکارا ہوا ہے۔ خیال رہے کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی و عصمت حضرت مریم کی عصمت سے زیادہ اہم ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے حضرت مریم کی عصمت کی گواہی جناب عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں گویائی بخش کر دی۔ مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عصمت و عفت کی گواہی براہ راست خود دی کہ آپ کی عصمت کے لئے سورۂ نور کی قریبا اٹھارہ آیات اتاریں۔ جب حضرت مریم کو بہتان لگانا لعنت کا باعث ہوا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بہتان لگانا ہزار ہا لعنتوں کا سبب ہے۔ رب نے یہود کی اس حرکت کو بہتان عظیم فرمایا۔ **آٹھواں فائدہ:** جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا قائل ہو وہ بحکم قرآن جھوٹا ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یہاں یہودیوں کو بھی جھوٹا کہا ہے جو ان کے قتل یا سولی کے قائل تھے اور عیسائیوں کو بھی جھوٹا کہا ہے جو اس کی تائید کرتے تھے۔ آج مرزائی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سولی پر لٹک جانے اور بعد میں پھر فوت ہو جانے کے قائل ہیں۔ وہ بھی عیسائیوں کی طرح جھوٹے ہیں۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور قرب قیامت تک زندہ رہیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سولی پر لٹک جانے کا عقیدہ بھی اس آیت کے خلاف ہے کیونکہ رب فرماتا ہے: **مَا صَلَبُوْهُ** (النساء: ۱۵۸) سولی پر لٹکا دینا بھی سولی دینے میں ہی داخل ہے۔

ضروری نوٹ: موجودہ زمانے کے غیر مقلد جو اپنے کو اہل حدیث کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تمام اسلامی عقیدوں کے انکاری ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اہل حدیث کی مشہور کتاب ''عیون زمزم فی میلاد عیسیٰ ابن مریم'' میں غیر مقلدوں کے پیشوا حافظ عنایت اللہ نے لکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر والد پیدا نہ ہوئے، انہوں نے بچپن میں کوئی کلام نہیں کیا۔ حضرت مریم کے پاس جناب جبرئیل نہیں آئے بلکہ **رُوْحَنَا** (مریم: ۱۷) سے مراد مریم کے خاوند یوسف نجار ہے، وہ جناب مریم کے پاس پہنچا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب تک تو ہم قادیانیوں کو روتے تھے مگر اب اہل حدیث (غیر مقلدین) کو کیا کہیں جو مرزائیوں سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے۔ تمام اہل حدیث (غیر مقلدین) حافظ عنایت اللہ کو بدستور اپنا پیشوا مانتے ہیں اس کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، اس کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں۔ دیوبندی حضرات بھی اس کا بدستور احترام کرتے ہیں۔ **نواں فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ اپنے جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ ان کی موت ابھی واقع نہیں ہوئی۔ یہ فائدہ **بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ** سے حاصل ہوا۔ کہ جب رفع کے بعد کسی جسم کا ذکر ہو یا اس کے ساتھ الیٰ ہو تو جسمانی اٹھانا مراد ہوتا ہے۔ یہاں دونوں چیزیں موجود ہیں کہ رفع کا مفعول ہ ضمیر ہے اور بعد میں الیٰ بھی ہے۔ **دسواں فائدہ:** عقائد میں گمان یا ظن کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اس میں علم یقینی چاہیے جیسا کہ ''**اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ**'' سے معلوم ہوا۔ **گیارھواں فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بغیر باپ کے صرف ماں سے ہے جیسے کہ عیسیٰ ابن مریم فرمانے سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم نے سوا آپ کے کسی پیغمبر کا ان کی ولدیت کے ساتھ ذکر نہیں فرمایا نیز آپ کو ماں کی طرف نسبت فرمایا نہ کہ باپ کی طرف حالانکہ اولاد کو باپ کی طرف نسبت دینے کا حکم قرآن کریم میں ہے۔ رب فرماتا ہے **اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ** (احزاب: ۵) معلوم ہوا کہ آپ کا باپ ہے ہی نہیں۔ **بارھواں فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام

نبی بھی ہیں رسول بھی اور مرسل بھی۔ جو آپ کے ان اوصاف کا انکار کرے وہ کافر ہے جیسا کہ یہاں رَسُوْلَ اللّٰهِ فرمانے سے معلوم ہوا۔ نبوت، رسالت، مرسلیت کا فرق ہم بارہا بیان کر چکے ہیں۔ **تیرھواں فائدہ:** جسے خدا بچائے اسے کوئی مار نہیں سکتا اور جسے خدا مارے اسے کوئی بچا نہیں سکتا۔ دیکھو سارے یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہلاک کرنا چاہا۔ رب نے بچانا چاہا رب کا چاہا ہوا، ان کا چاہا نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کفار سے مکڑی کے جالے، کبوتری کے انڈے کے ذریعے بچالیا۔ فرعون، قارون، شداد کو ان کے قلعے نہ بچا سکے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی گود میں بچالیا۔ ابو جندل کو کفار مکہ کے شر سے مکہ میں رکھ کر بچالیا اس لئے بندے کو رب تعالیٰ پر توکل چاہیے۔ آج بمباری کے موقع پر اونچے محل بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ اصحاب فیل کو ابابیل سے کوئی طاقت نہ بچا سکی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ میں یہود کے کفر کا ذکر دو جگہ کیوں فرمایا ایک ''وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ'' دوسرا ''وَ بِكُفْرِهِمْ'' یہ تو محض تکرار ہے۔ **جواب:** پہلے کفر سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار ہے یا توریت شریف کی آیتوں کا انکار، دوسرے کفر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار مراد ہے لہٰذا تکرار نہیں۔

دوسرا اعتراض: جب اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دلوں پر مہر کردی جس سے وہ ایمان لا سکتے ہی نہیں تو پھر وہ سزا کے مستحق کیوں ہوئے؟ وہ تو کافر ہے اس مہر کی وجہ سے جو رب نے ان کے دلوں پر لگادی۔ **جواب:** وہ اس کے مجرم ہیں کہ انہوں نے کفر و گناہ کر کے اپنے دلوں پر مہر لگوالی مہر لگنے کے اسباب انہوں نے جمع کیے جیسے ہم کسی کو تلوار ماریں اور رب تعالیٰ اسے موت دے تو موت تو رب نے دی مگر اسباب موت ہم نے جمع کیے۔ لہٰذا ہم مجرم ہیں ایسے ہی یہاں ہے۔

تیسرا اعتراض: جب یہود کے دلوں پر مہر لگ چکی جس سے وہ ایمان کے قابل نہ رہے۔ تو ان سے بعض لوگ ایمان کیوں لے آئے اور '' اِلَّا قَلِيْلًا '' فرمانا کیسے درست ہوا؟ **جواب:** تفسیر میں گزر گیا کہ ایمان لانے والے وہ یہود تھے جن کے دلوں پر مہر نہ لگی تھی۔ جیسے عبد اللہ ابن سلام اور ان کے ساتھی رضی اللہ عنہم اور یہ استثنیٰ منقطع ہے، متصل نہیں لہٰذا کوئی اعتراض نہیں۔

چوتھا اعتراض: اس آیت کریمہ سے عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر زندہ اٹھایا جانا ہرگز ثابت نہیں ہوتا اور نہ کسی اور کا آپ کے ہم شکل ہو کر سولی دیا جانا ثابت ہوا کیونکہ آیت کریمہ کے معنی یہ ہیں کہ یہود نہ تو حضرت عیسیٰ کو قتل کر سکے نہ انہیں سولی دے سکے۔ سولی پر آپ کی جان نہ نکل سکی بلکہ آپ موت میں دوسرے لوگوں کے مشابہ کیے گئے کہ ان کی موت دوسروں کی طرح طبعی طور پر واقع ہوئی۔ رفع کے معنی آسمان پر اٹھانا نہیں بلکہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کے درجات بلند کرنا ہے۔ جیسے رب فرماتا ہے وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (بقرہ: ۲۵۳) یعنی اللہ نے ان کے درجے بلند فرمائے کہ انہیں رسول بنایا (مرزائی، قادیانی) یہ تفسیر محمد علی لاہوری قادیانی نے اپنی تفسیر ''بیان القرآن'' میں کی ہے اور اس پر بہت ناز کیا ہے۔ **جواب:** یہ اس

آیت کی تفسیر نہیں بلکہ کھلی تحریف ہے۔ کیونکہ شُبِّهَ لَهُمْ کے یہ معنی کرنا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو موت میں ان کی طرح کر دیا کہ وہ طبعی موت سے فوت ہوئے محض تحریف ہے یہ آیت اس معنی میں نہیں آتی۔ نیز جب کہ عیسیٰ علیہ السلام کی سولی پر لٹک کر جان نہ نکلنا بھی ان کا معجزہ ہے پھر آپ کی موت دوسروں کی طرح کب رہی؟ دوسرے لوگ سولی پر لٹک کر ہی مر جاتے ہیں۔ لہٰذا آیت کے یہ معنی تمہارے بیان کیے ہوئے مطلب کے بھی خلاف ہیں۔ نیز جب رفع کا مفعول کوئی جسم ہو تو وہاں جسمانی اٹھانا مراد ہوتا ہے نہ کہ بلندی درجات۔ چنانچہ فرماتا ہے وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف: ۱۰۰) اور فرماتا ہے وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ (بقرہ: ۱۲۷) ان دونوں آیتوں میں جسمانی اٹھانا مراد ہے۔ کیونکہ یہاں رفع کا مفعول والدین ہیں دوسری آیت میں کعبہ کی دیواریں یہاں بھی رفع کا مفعول حضرت عیسیٰ ہیں۔ نیز اِلَیْهِ فرمانے سے معلوم ہوا کہ یہ بلندی درجات نہ تھی بلکہ جسمانی اٹھانے سے تھی کیونکہ اگر رفع کے بعد الیٰ یا علیٰ ہو تو یقیناً مکانی بلندی مراد ہوتی ہے۔ گویا یہاں دو قرینوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ مکانی بلندی مراد ہے۔ ایک یہ کہ رفع کا مفعول جسم ہے دوسرا یہ کہ رفع کے بعد الی فرمایا گیا ہے تمہاری پیش کردہ آیت وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (بقرہ: ۲۵۳) میں رفع کا مفعول درجات ہیں لہٰذا وہاں بلندی مکانی مراد نہیں۔ نیز تمہاری یہ تفسیر تمام صحابہ کرام، مفسرین، محدثین و اجماع امت کے خلاف ہے اس لئے بھی باطل محض ہے۔

نوٹ: عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے کے متعلق مرزائیوں کے اور بہت سے اعتراضات ہیں جو ہم نے تیسرے پارہ میں مع جوابات بیان کیے۔

پانچواں اعتراض: کسی انسان کا دوسرے کے ہم شکل ہو جانا قانون قدرت کے خلاف ہے۔ نیز بلا قصور کسی کو جناب عیسیٰ کے ہم شکل کر کے سولی دلوا دینا ظلم ہے۔ رب تعالیٰ ان دونوں عیبوں سے پاک ہے (مرزائی) **جواب:** اس کے تفصیلی جواب تیسرے پارے میں گزر گئے، وہاں مطالعہ کرو۔ رب تعالیٰ قانون کا پابند نہیں۔ وہ قادر مطلق بھی ہے۔ بہت جگہ ہم شکل اور تبدیلی شکل ہوتی رہتی ہے۔ ططیانوس منافق تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کا چھپا دشمن یہ دو جرم اس سزا کے لائق تھے۔ رب تعالیٰ نے بچھڑا پرستی پر ہزارہا اسرائیلیوں کو قتل کرا دیا۔ نیز یہاں رفعت سے بلندی درجات مراد لینا قرآن کریم کی روش کے خلاف ہے۔ کیونکہ فرمایا گیا "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ" یعنی انہوں نے جناب مسیح کو قتل یا سولی نہ کیا بلکہ انہیں اللہ نے اٹھالیا۔ اگر بلندی درجات مراد ہوتی تو بل نہ فرمایا جاتا کہ خدا کی راہ میں ظلماً قتل یا سولی ہو جانا شہادت ہے اور شہادت سے بلندی درجات ہوتی ہے نہ کہ شہادت کے مقابل اپنی طبعی موت پر فوت ہونے سے پھر بَلْ بالکل لغو و بیکار ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ تفسیر و تاویل محض باطل اور قرآن کریم کے خلاف ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ پر لاکھوں احسانات ایسے فرمائے جن میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ اسے آخری امت بنایا کہ اس امت کے بعد نہ کوئی نبی ہے نہ کوئی کتاب جس کی وجہ سے ہمارے عیوب چھپے رہے۔ اگر ہمارے بعد کوئی اور نبی یا کتاب ہوتی تو ہمارے عیوب بھی ایسے کھل جاتے جیسے یہود و نصاریٰ

کے بڑے پرانے عیوب کھلے چھپے تمام کے تمام قرآن و حدیث کے ذریعہ شائع کر دیئے گئے۔ دیکھو ان آیات میں صدیوں پہلے گزرے ہوئے یہود کے کیسے کیسے عیب کھلے۔ حضرات صوفیاء فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تیس سال کی عمر شریف میں اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تینتیس سال کی عمر میں آسمان پر تشریف لے گئے۔ کل تین سال تبلیغ نبوت فرمائی پھر قریب قیامت تشریف لاکر اسلام کی تبلیغ فرمائیں گے اور امت محمدیہ کے آخری ولی عامہ ہوں گے۔ یعنی آپ بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں اور امت اسلامیہ کے آخری ولی، امام مہدی اور اصحاب کہف آپ کے خدام ہوں گے، نکاح کریں گے صاحب اولاد ہوں گے۔ امام سیوطی نے تفسیر درمنثور میں سورۂ کہف کی تفسیر میں فرمایا کہ چار نبی زندہ ہیں۔ دو آسمان میں حضرت ادریس و عیسیٰ دو زمینوں میں حضرت خضر و الیاس علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ جناب خضر کا مرکزی مقام پانی ہے، حضرت الیاس کا مرکزی مقام خشکی ہے، حضور ﷺ روح اول ہیں اور حضرت مسیح عقل اول۔ اسی اولیت میں شرکت کی وجہ سے حضور ﷺ کو بھی معراج آسمانی ہوئی اور جناب مسیح کو بھی عروج آسمان دیا گیا۔ اگرچہ دونوں معراجوں کی حکمتوں میں فرق ہے اور اس وجہ سے حضرت مسیح کو خاتمیت میں حضور ﷺ کے ساتھ خصوصی نسبت ہے (روح البیان) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فلکی انسان بنایا اور زمینی و آسمانی مخلوق میں سے قرار دیا، انہیں فرشتوں کی طرح کھانے پینے پہننے سے بے نیاز کر دیا۔ اب وہ فرشتوں کی طرح عرشی ہیں۔ (عرائس البیان)

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ج
اور نہیں ہے کوئی کتاب والوں سے مگر وہ ضرور ان پر ایمان لے آوے گا ان کی وفات سے پہلے
کوئی کتابی ایسا نہیں جو اسکی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لائے
وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا ج ﴿۱۵۹﴾
اور دن قیامت کے ہوں گے وہ ان پر گواہ
اور قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر زندہ تشریف لے جانے کا ذکر تھا اور اس وقت پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ ہوا۔ اب آپ کے آسمان سے واپس تشریف لانے کا ذکر ہے اور اس وقت اہل کتاب کے جو حالات ہوں گے اس کا تذکرہ ہے۔ چونکہ آپ کا آسمان پر جانا بھی عجیب تھا۔ اور اب وہاں سے آنا بھی عجیب ہوگا۔ لہٰذا ایک عجیب واقعہ کے بعد دوسرے عجیب واقعہ کا ذکر ہوا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس اختلاف و شبہ کا ذکر ہوا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اب تک ان میں ہے اب اس اختلاف کی انتہاء کا ذکر ہے کہ قرب قیامت جب وہ جناب زمین پر

تشریف لائیں گے تو ان کے متعلق لوگوں کے سارے اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ گویا اختلاف کی ابتداء کا ذکر پہلے ہوا اس اختلاف کی انتہاء کا ذکر اب ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہود و نصاریٰ کے کفریہ عقائد کا ذکر ہوا کہ یہ دونوں فرقے ان کے متعلق غلط عقیدے رکھ کر کافر ہوئے۔ اب ان دونوں فرقوں کے اس کفر کی انتہا کا ذکر ہے کہ ان کے یہ کفریہ عقیدے اس وقت تک ہیں جب تک کہ وہ جناب پردۂ غیب میں ہیں۔ ان کے اس عالم مشاہدہ میں آتے ہی یہ تمام عقیدے باطلہ ختم ہو جائیں گے۔ اور یہود و نصاریٰ دونوں ان جناب کی عبدیت و نبوت پر ایمان لائیں گے۔ شعر

کفر و اسلام کے جھگڑے ترے چھپنے سے بڑھے
تو اگر پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے

تفسیر

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: چونکہ یہ کلام نیا ہے اس لئے اس کے شروع میں واوٴ ابتدائیہ آیا۔ اِنْ نافیہ ہے۔ ''ما'' زائدہ قرآن مجید میں کبھی کتاب بمعنی خط و تحریر آتا ہے جیسے بلقیس نے کہا تھا اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ (نمل:۲۹) کبھی بمعنی قرآن مجید جیسے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚ فِيْهِ ۚ (بقرہ:۲) مگر اہل کتاب میں کتاب سے توریت، انجیل، زبور مراد ہوتی ہے۔ یہاں وہی مراد ہے اگر چہ یہود و نصاریٰ بھی عقیدوں میں مشرک و کافر ہیں مگر چونکہ اپنے کو نبیوں کی طرف منسوب کرتے ہیں خواہ غلط نسبت ہی سہی اس لئے انہیں مشرکین یا کفار نہیں کہا جاتا۔ اہل کتاب کہا جاتا ہے۔ ان کے احکام بھی مشرکین و کفار کے احکام سے نرم ہیں۔ کہ ان کا ذبیحہ حلال، ان کی عورتوں سے مسلمانوں کا نکاح درست ہے۔ یہاں اہل کتاب سے مراد سارے یہود و نصاریٰ ہیں یعنی توریت، انجیل کے ماننے والے اس سے صرف عیسائی یا علماء اہل کتاب مراد لینا سخت غلطی ہے جیسا کہ مرزائیوں سے سرزد ہوئی جس کا ذکر ان شاء اللہ اعتراض و جواب میں آئے گا **اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ** ۔ اِلَّا حرف استثناء ہے جس کا مستثنیٰ منہ پوشیدہ ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اِلَّا بمعنی لٰكِنَّ ہو یعنی اہل کتاب کسی حالت میں نہ ہوں گے سوا اس حال کے کہ ایمان لے آئیں گے۔ غرض کہ انہیں بجز عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح ایمان کے چارہ کار نہ ہوگا۔ ''لَيُؤْمِنَنَّ'' میں ایمان سے مراد صحیح ایمان ہے جو اسلام کی تعلیم کے مطابق ہے ورنہ عیسائی تو آج بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں یہ ایمان محض کفر ہے ''بِهٖ'' کے متعلق مفسرین کے تین قول ہیں ایک یہ کہ ہ کا مرجع رب تعالیٰ ہے دوسرا یہ کہ اس کا مرجع حضور محمد مصطفےٰ ﷺ ہیں (تفسیر خازن، سراج منیر، درمنثور وغیرہ) تیسرا یہ کہ اس کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں (عام تفاسیر) مگر پہلی دو تفسیریں نہایت ہی ضعیف ہیں۔ تیسری تفسیر نہایت قوی کیونکہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کا ذکر ہو رہا ہے نہ کہ خداوند تعالیٰ کا نہ حضور ﷺ کا لہٰذا صحیح یہ ہی ہے کہ بِهٖ کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں ''قَبْلَ مَوْتِهٖ'' قَبْلَ ظرف ہے لَيُؤْمِنَنَّ کا موت سے مراد ہے وفات اور ہ کے متعلق دو قول ہیں ایک یہ کہ اس کا مرجع اہل کتاب ہیں۔ معنی یہ ہیں نہیں ہے کوئی اہل کتاب مگر وہ اپنی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے گا۔ یعنی اپنے مرنے سے پہلے غرغرہ کی حالت میں پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح ایمان لاتا ہے پھر اس کی جان نکلتی ہے حتی کہ اگر کتابی قتل کیا جائے، دریا میں ڈوبے، جل جائے، اسے شیر کھا جائے کسی طرح مرے پہلے وہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتا ہے۔ اس طرح کہ

یہودی تو اس جناب کو سچا نبی مان لیتا ہے اور عیسائی ان کی عبدیت یعنی اللہ کا بندہ ہونے کا اقرار کر لیتا ہے پھر اس کی جان نکلتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کی ایک تفسیر یہ ہی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہٖ ضمیر کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام اور موت سے مراد آپ کی وہ وفات شریف ہے جو قرب قیامت آپ کے زمین پر تشریف لانے یہاں سات سال یا چالیس سال رہنے کے بعد آئے گی اور اس عبارت کے معنی یہ ہیں۔ کہ ان جناب کے زمین پر تشریف لانے پر اس وقت جتنے کتابی ہوں گے یہودی ہوں یا عیسائی وہ آپ کی زندگی شریف میں آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس وقت دنیا میں سوا اسلام کے اور کوئی دین نہ ہوگا۔ پہلی تفسیر بہت ضعیف ہے دوسری تفسیر نہایت ہی قوی ہے چند وجہ سے۔ **پہلی:** یہ کہ اکثر مفسرین کا یہ ہی قول ہے، عام مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ دیکھو تفسیر ابن کثیر، تفسیر کبیر، تفسیر جلالین، صاوی، جمل، خازن، بیضاوی، مدارک، خزائن العرفان وغیرہ۔ **دوسری:** یہ کہ احادیث متواترہ سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرب قیامت تشریف لائیں گے چنانچہ امام بخاری نے بخاری شریف میں باب باندھا عیسیٰ ابن مریم کا نزول، اس میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کی کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: عنقریب عیسیٰ ابن مریم تم میں منصف حاکم بن کر اتریں گے، صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو دنیا سے فنا کر دیں گے (یعنی کسی کو عیسائی، یہودی رہنے کی اور سور کھانے کی اجازت نہ دیں گے) جزیہ کا مسئلہ ختم فرما دیں گے (یعنی اس وقت اسلام یا قتل ہوگا کسی کو کافر رہنے کی اجازت نہ ہوگی) دنیا میں مال بہا بہا پھرے گا۔ تمام لوگ متقی مومن ہوں گے۔ حتیٰ کہ لوگوں کی نظر میں ایک سجدہ دنیا بھر کی نعمتوں سے زیادہ پیارا ہوگا۔ پھر آپ نے یہ ہی آیت تلاوت کی وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ یہ حدیث مسلم نے حسن حلوانی سے روایت کی۔ نیز یہ حدیث بہت سے محدثین نے نقل فرمائی۔ **تیسری:** یہ کہ مسلمانوں کا اجماع اس پر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرب قیامت دنیا میں تشریف لائیں گے۔ اس وقت سارے عالم میں صرف مسلمان رہیں گے کیونکہ تمام دنیا والے ایمان لے آئیں گے۔ یہ تفسیر اجماع امت کے مطابق ہے۔ **چوتھی:** یہ کہ مرتے وقت غرغرہ کی حالت کا ایمان شرعاً معتبر نہیں۔ اگر اہل کتاب اپنے مرتے وقت ایمان لے بھی آئیں تو قبول نہیں پھر اس غیر معقول ایمان کا ذکر بے فائدہ ہی ہے۔ **پانچواں:** یہ کہ پہلی تفسیر آیت کریمہ کے مقصد کے بھی خلاف ہے اور اس موقعہ کے بھی خلاف کیونکہ یہاں یہود کے اس قول کی تردید ہو رہی ہے کہ ہم نے جناب مسیح کو سولی دے دی اور ان کی موت واقع ہو چکی۔ رب نے فرمایا کہ یہ غلط ہے وہ زندہ ہیں پھر دنیا میں تشریف لائیں گے اگرچہ ابھی یہود نہ مانیں مگر جب وہ آئیں گے تو انہیں ماننا پڑ جائے گا۔ کہ آپ کی موت واقع نہ ہوئی تھی، ہم غلطی پر تھے۔ مقصد تو یہ ہے اگر آیت کے معنی یہ ہوں کہ یہودی، عیسائی اپنے مرنے سے پہلے اس پر ایمان لے آتے ہیں تو اس آیت کو اس مقام سے مناسبت کیا ہوئی اور اس میں یہود کی تردید کیسے ہوئی؟ **چھٹی:** یہ کہ اس آیت کے آخر میں ارشاد ہے یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا عیسیٰ علیہ السلام ان اہل کتاب کے خلاف گواہی دیں گے۔ یہ جملہ اس تفسیر کے بالکل خلاف ہے اور بے تعلق ہو جائے گا۔ بہر حال دوسری تفسیر ہی قوی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے تمام اہل کتاب آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ یہ واقعہ قرب قیامت ہوگا وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ

عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا اس عبارت میں جناب مسیح کے دوسرے کمال کا ذکر فرمایا گیا۔ يَكُوْنُ کا اسم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ضمیر ہے۔ ''عَلَيْهِمْ'' میں هِمْ کی ضمیر یا تو سارے اہل کتاب کی طرف لوٹتی ہے عیسائیوں یا یہودی یا ان یہودیوں کی طرف ہے جنہوں نے آپ پر ظلم وستم کیے آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی اور ان عیسائیوں کی طرف جنہوں نے ہر وقت آپ سے بے وفائی کی۔ شہید سے مراد خلاف گواہی دینے والا گواہ ہے کیونکہ عَلٰی ضرر کے لئے ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت میں رب تعالیٰ کے سامنے تمام یہودیوں یا عیسائیوں یا ان ظالم و بے وفا یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف گواہی دیں گے مقصد یہ ہے کہ ان ظالموں بے وفاؤں نے یہ حرکتیں کر کے جناب عیسیٰ علیہ السلام کا تو کچھ نہ بگاڑا وہ تو اللہ کی حفاظت میں زندہ ہیں پھر زمین پر آئیں گے۔ خود اپنا ہی بگاڑ لیا کہ اپنے خلاف ایک نبی کی گواہی بنالی۔ مگر پہلی تفسیر بہت ہی قوی ہے کہ سارے اہل کتاب بنی اسرائیل کے خلاف گواہی دیں گے۔ کیونکہ یہاں آیت کریمہ میں کسی جماعت کسی واقعہ کی قید نہیں۔ ''عَلَيْهِمْ'' مطلق ارشاد ہوا ہے۔ تو آپ ہر اسرائیلی کی ہر حال کی گواہی دیں گے۔ خیال رہے کہ قیامت میں ہر نبی اپنی امت کے موافق یا مخالف گواہی دیں گے مگر ہمارے نبی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سارے نبیوں کے حق میں بھی گواہی دیں گے اور اپنی امت کے حق میں بھی اور امت کی گواہی پر بھی گواہی دیں گے۔ دیگر انبیائے کرام کی گواہیوں اور آپ کی گواہی میں اتنے فرق ہوں گے۔ رب فرماتا ہے: مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا (النساء:۴۱) یہاں جناب مسیح کی گواہی کا ذکر ہے۔ قیامت کا دن حضرات انبیاء خصوصاً عیسیٰ علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادائے گواہی کا دن ہوگا۔ اور دنیا کا زمانہ ان کے گواہ بننے کا زمانہ ہے۔ گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ گواہ بنتے وقت واردات پر موجود ہو اور گواہی دیتے وقت حاکم کی کچہری میں موجود ہو۔ معلوم ہوا کہ آپ تا روز قیامت تمام اسرائیلیوں کے ہر حال کا مشاہدہ فرما رہے ہیں ورنہ گواہی کیسی؟ شاہد عام ہے شہید خاص۔ عموماً شاہد اسے کہا جاتا ہے جو صرف واردات کی گواہی دے اور شہید وہ ہوتا ہے جو واردات، مدعی کے حالات، اس کی ہر بات کی گواہی دے۔ شاہد سے شہید بہت خاص ہے۔ جناب مسیح تمام یہود و نصاریٰ کے ہر حال کے گواہ ہوں گے۔ ان کے خلاف ہر طرح کی گواہی دیں گے۔ آپ چوتھے آسمان پر رہتے ہوئے زمین کے ہر اسرائیلی کے ہر حال سے خبردار ہیں۔ آپ اپنی نظر کے متعلق فرماتے ہیں۔ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ (آل عمران:۴۹)

خلاصہ تفسیر

ہماری تفسیر سے معلوم ہو چکا کہ اس آیت کی بہت تفسیریں ہیں جن میں سے ایک تفسیر قوی ہے باقی ضعیف۔ ہم خلاصہ میں وہی ایک تفسیر عرض کرتے ہیں جو نہایت قوی ہے۔ اے محبوب! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ بیان کیا وہ حق ہے کہ انہیں قتل یا سولی نہ کیا جا سکا، وہ بغیر موت آئے اسی طرح صحیح و سالم آسمان پر اٹھا لئے گئے اگرچہ ابھی اہل کتاب یہ بات نہ مانیں مگر عنقریب وہ وقت آ رہا ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں صحیح سالم تشریف لائیں گے۔ ان کے آنے پر ان کی وفات سے پہلے پہلے تمام عیسائی، یہودی ان جناب پر ویسا ہی ایمان لے آئیں گے جیسا کہ ان کے متعلق قرآن کریم نے خبر دی ہے اور جیسا کہ ان پر مسلمانوں کا ایمان ہے کہ یہودی ان کی نبوت

کا اقرار کرلیں گے، اور عیسائی ان کی بندگی کا اعتراف کرلیں گے اور ان میں سے کوئی شخص ان کے قتل یا سولی ہو چکنے کا عقیدہ نہ رکھ سکے گا۔ دنیا دیکھ لے گی کہ اسلام نے جو فرمایا تھا وہ حق تھا اور ان اہل کتاب کے خیالات محض باطل تھے یہ تو دنیا کے حالات تھے۔ آخرت میں قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام ظالم یہودیوں اور بے وفا عیسائیوں کے خلاف بارگاہ الٰہی میں گواہی دیں گے۔ جس گواہی سے یہ لوگ دوزخ میں جھونکے جائیں گے۔ غرض کہ عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف کاروائیاں کرنے والوں نے جناب عیسیٰ کا تو کچھ نہ بگاڑا، اپنا ہی نقصان کرلیا کہ اپنے خلاف اتنے بڑے پیغمبر کو گواہ بنالیا۔

نزول مسیح کی اہم حدیث

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ دنیا میں تشریف لانے کے متعلق آیات قرآنیہ بھی ہیں اور احادیث تو بے شمار ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک حدیث بیان کرتے ہیں جو ابن کثیر نے مسند امام احمد سے باسناد صحیح بروایت ابو ہریرہ نقل فرمائی۔ فرمایا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ سارے نبی علاتی بھائی ہیں کہ دین تمام کا ایک ہے۔ فروعات (امہات) الگ الگ۔ ہم عیسیٰ ابن مریم سے بہت ہی قریب ہیں کہ ہمارے ان کے درمیان کوئی نبی نہیں۔ وہ قرب قیامت آسمان سے اتریں گے۔ جب تم انہیں دیکھو تو اس حلیہ سے پہچاننا کہ وہ درمیانہ قد ہیں، سرخ وسفید رنگ ہے، وہ دو کپڑے قطری پہنے ہوں گے۔ بغیر پانی استعمال کیے ان کے سر شریف سے قطرے ٹپکا کریں گے، وہ تشریف لاکر صلیب کو توڑ دیں گے، سوروں کو ختم فرمادیں گے، جزیہ کا حکم ختم فرمادیں گے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں گے، ان کے زمانہ میں اسلام کے سوا تمام دین ختم ہوجائیں گے، دجال کو آپ ہلاک کریں گے، دنیا میں امن وامان کا دور دورہ ہوگا، حتی کہ شیر و اونٹ، چیتا اور گائے، بکری اور بھیڑیا ایک ساتھ چریں گے، بچے سانپوں سے کھیلیں گے، چالیس سال زمین میں رہیں گے پھر وفات پا جائیں گے، مسلمان ان پر نماز پڑھیں گے۔ بعض روایت میں ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ روضۂ انور میں دفن ہوں گے۔ اس حدیث کو ابوداؤد، بخاری شریف، مسلم شریف وغیرہ کتب حدیث میں مختلف راویوں اور مختلف الفاظ سے نقل فرمایا۔ یہ حدیث معنیً متواتر ہے۔

لطیفہ: مرزا غلام احمد قادیانی نے ان تمام حدیثوں کے متعلق کہا کہ ان میں میری آمد کی خبر دی گئی ہے۔ کیونکہ جناب عیسیٰ علیہ السلام تو وفات پا چکے جس مسیح کی پیش گوئی کی گئی ہے وہ میں ہوں۔ مسلمان غور کرلیں کہ حضور ﷺ نے جناب مسیح کی جو صفات بیان فرمائیں ان میں سے ایک صفت بھی قادیانی صاحب میں نہیں ہے۔ ان کا نام عیسیٰ ابن مریم، مرزا کا نام غلام احمد ابن چراغ بی بی، ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام دین ختم ہوجائیں گے مرزا جی کے زمانہ میں تمام کفریات موجود اور عیسائیت کو بہت فروغ، ان کے زمانہ میں مال پانی کی طرح بہے گا مرزا جی کے زمانہ میں لوگوں کی غریبی کا یہ حال کہ خود مرزا کا اور اس کی اولاد کا گزارہ جائز ناجائز چندوں اور بہشتی مقبروں کی قبروں کی تجارت پر، ان کے زمانہ میں دنیا میں امن وامان مکمل ہوگا مرزا جی کے زمانہ میں چوری، ڈکیتی، قتل وغارت خدا کی پناہ، ان کی وفات شریف مدینہ منورہ میں دفن روضۂ رسول ﷺ

میں مرزا کی موت لاہور کے ایک پاخانہ میں دفن قادیان میں۔ خود فیصلہ کرلو کہ کیا مرزا جی وہ ہی مسیح موعود ہیں جن کی تشریف آوری کی خبر حضور انور نے دی ہے۔ نعوذ باللہ۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک — کجا عیسیٰ کجا دجال ناپاک

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات نہیں ہوئی، آپ زندہ ہیں کیونکہ آپ کی وفات سے پہلے سارے اہل کتاب کا آپ پر ایمان لانا ضروری ہے اور ابھی سارے اہل کتاب آپ پر ایمان لائے نہیں تو ابھی وفات کیسی؟ سارے یہودی آپ کی نبوت کے انکاری ہیں اور سارے عیسائی آپ کو خدا یا خدا کا بیٹا کہہ رہے ہیں۔ یہ فائدہ مَوْتِهٖ کی دوسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرب قیامت زمین پر تشریف لائیں گے۔ آپ کی یہ آمد حق ہے، علامات قیامت سے ہے۔ یہ فائدہ بھی مَوْتِهٖ کی دوسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ قرآن کریم دوسری جگہ فرماتا ہے: وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (زخرف: ۶۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی نشانی ہیں وہ آیت اس آیت کی تفسیر ہے۔ **تیسرا فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد پر تمام کفار مسلمان ہو جائیں گے۔ دنیا میں اسلام کے سوا کوئی دین نہ رہے گا۔ یہ فائدہ لَيُؤْمِنَنَّ سے حاصل ہوا۔ کہ جب حضرت مسیح کسی کتابی کو اپنے دین پر رہنے کی اجازت نہ دیں گے۔ تو دوسرے کفار و مشرکین کو کیسے کافر رہنے دیں گے۔ اس کے متعلق ہم احادیث پیش کر چکے ہیں۔ **چوتھا فائدہ:** حضرات انبیاء کرام اپنی امت کے عقائد و اعمال سب پر مطلع ہوتے ہیں۔ اعمال کھلے ہوں یا چھپے نبی کی نگاہ سے غائب نہیں کیونکہ یہ حضرات ان کے گواہ ہیں اور گواہی کامل وہی ہے جو دیکھ کر ہو ان کی گواہی کامل ہوگی ناقص نہ ہوگی یہ فائدہ شَهِيْدًا کی تنوین تعظیمی سے حاصل ہوا۔ جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (آل عمران: ۴۹) تم جو کچھ اپنی کوٹھریوں میں کھاتے بچاتے ہو میں اس کی خبر تم کو دیتا ہوں یہ تو تمام انبیاء کا علم ہے۔ ہمارے حضور ﷺ اولین و آخرین کے اعمال و عقائد کا مشاہدہ فرما رہے ہیں کیونکہ ان سب کے گواہ ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا (النساء: ۴۱) اس کی مکمل بحث ہماری کتاب ''جاء الحق'' حصہ اول اور ''شان حبیب الرحمان'' میں مطالعہ کرو۔ حضور تمام اولین و آخرین کے اعمال و عقائد کا مشاہدہ فرما رہے ہیں مقدمہ کی تحقیقات کرنا گواہی وغیرہ لینا حاکم کے بے علم ہونے کی دلیل نہیں۔ دیکھو رب تعالیٰ قیامت میں اپنے تمام بندوں کا فیصلہ مقدمہ فرما کر کرے گا۔ اور اس مقدمہ میں نبیوں، ولیوں، فرشتوں بلکہ ہمارے اعضاء کی گواہی لے گا حالانکہ وہ علیم و خبیر ہے۔ تاکہ کوئی شخص اس کریم کے فیصلہ پر اعتراض نہ کر سکے۔ لہٰذا حضور ﷺ کا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی تہمت کی تحقیقات کرانا یا دیگر مقدمات میں گواہی وغیرہ لینا آپ کی بے علمی کی دلیل نہیں۔ **چھٹا فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت میں صرف عیسائیوں کے ہی گواہ نہ ہوں گے بلکہ یہود کے خلاف گواہی دیں گے جیسا کہ اہل کتاب کے عموم سے معلوم ہوا۔ کیوں کہ آپ بنی اسرائیل کے نبی ہیں اور بنی اسرائیل میں یہودی ہیں اور عیسائی بھی۔

خود فرماتے ہیں: وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (آل عمران: ۴۹) تو سارے بنی اسرائیل آپ کی امت دعوت ہیں اور ہر نبی اپنی امت دعوت پر گواہ ہے۔ مرزائی اس کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ آپ صرف عیسائیوں کے خلاف گواہ ہیں۔ مگر ان کا یہ قول اس آیت کریمہ کے خلاف ہے۔ **ساتواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام کو ایسا قوی حافظہ بخشا ہے کہ ہزار ہا سال گزر جانے بلکہ وفات پا جانے کے باوجود کوئی چیز نہیں بھولتے۔ اگر یہ حضرات بھول جانے والے ہوتے تو قیامت میں رب تعالیٰ کے سامنے گواہی کیسے دیتے بخلاف ہم لوگوں کے کہ ہم دنیا میں پرانی باتیں بھول جاتے ہیں آخرت کا پوچھنا کیا؟ اسی لئے ہمارے کاموں کی تحریریں کتابوں کی شکل میں قیامت میں ہم کو دی جائیں گی۔ اور کہا جائے گا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ (الاسراء: ۱۴) اپنا نامۂ اعمال پڑھ۔ ان حضرات کی گواہیاں کتابیں دیکھ کر نہ ہوں گی۔ خود ان کی اپنی یاد پر ہوں گی اور ان کی اپنی یاد ایسی معتبر ہوگی کہ رب تعالیٰ کا فیصلہ ان کی ان گواہیوں پر ہوگا۔ اندازہ لگالو کہ ہمارے حضور ﷺ کا اپنا حافظہ کیسا ہے کہ سارے عالم کے ہر کھلے چھپے حال کے گواہ ہیں۔ وہ بھولنا جانتے ہی نہیں اگر وہ بھول جائیں تو ہم گنہگاروں کا ٹھکانہ نہ لگے۔ ہم سب کے بیڑے انہیں کی یاد پر پار لگیں گے۔ ﷺ۔ جس رب نے انہیں اتنا بڑا ذمہ دار گواہ بنایا۔ انہیں اس کے لائق قوت حافظہ بخشی۔ **آٹھواں فائدہ:** حضرات انبیاء کرام قیامت میں ہر شخص کو پہچانیں گے، ہر شخص کی صفات، اس کی ذات، اس کے حالات کو جانتے ہوں گے کیونکہ اس پہچان کے بغیر گواہی ناممکن ہے۔ اب غور کرلو کہ حضور سید عالم ﷺ کی پہچان کس شان کی ہوگی؟ حضور تو از آدم تا قیامت ہر انسان کو پہچانتے ہیں کیونکہ سب کے گواہ ہیں۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ حضور اپنی امت کو صرف آثار وضو سے پہچانیں گے کیونکہ بہت مسلمان فرضیت نماز سے پہلے فوت ہوئے جیسے معراج سے پہلے فوت ہو جانے والے صحابہ اور بہت مسلمان ایمان لاتے ہی مر جاتے ہیں، بہت لوگ اپنی شامت نفس سے نماز پڑھتے ہی نہیں۔ اگر حضور کی پہچان صرف وضو سے ہوتی تو ان لوگوں کی شفاعت کی کیا صورت ہوتی؟ لہٰذا حدیث پاک میں عام پہچان کا ذکر ہے، حضور کو خصوصی پہچان بھی عطا ہوئی۔ شعر

وہ لیں گے چھانٹ اپنے نام لیواؤں کو محشر میں
غضب کی بھیڑ میں ان کی میں اس پہچان کے صدقے

اعتراضات

چونکہ یہ آیت کریمہ اور ہماری پیش کردہ احادیث مرزائیوں کے مذہب کا خاتمہ کر دیتی ہیں کہ اگر جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نزول ثابت ہو جائے تو مرزا جی کی نبوت ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے مرزائی اس آیت و احادیث کو بگاڑنے ان کی تحریفیں کرنے میں بہت زور لگاتے ہیں۔ ہم ان کے اعتراضات مع جوابات اسی تفسیر کے تیسرے پارے سورۂ آل عمران میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں ان کی چند تحریفیں مع جوابات عرض کرتے ہیں، رب تعالیٰ قبول فرمائے۔ مولوی محمد علی لاہوری اپنی تفسیر ''بیان القرآن'' میں لکھتے ہیں۔

پہلا اعتراض: قَبْلَ مَوْتِهٖ میں ہ کا مرجع اہل کتاب ہیں، جناب عیسیٰ علیہ السلام نہیں ورنہ صرف وہ ہی یہودی ایمان

پائیں گے جو اس زمانہ میں موجود ہوں باقی تمام یہودی اس سے محروم رہیں گے۔ لہٰذا آیت کے یہ معنی ہیں کہ ہر کتابی اپنی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے گا (بیان القرآن) **جواب:** تمہارے اس معنیٰ پر کہ سارے اہل کتاب اپنی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے۔ سارے ہی اہل کتاب ایمان سے محروم ہو گئے کیونکہ موت کے وقت غرغرہ کی حالت میں ایمان لانے کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں اور نہ اس ایمان کے ذریعہ سے نجات ہے نجات اس ایمان کے ذریعہ ملتی ہے جو زندگی میں لایا جائے۔ اس وقت کا ایمان مفید ہے غرغرہ کا ایمان غیر مفید۔ فرعون ڈوبتے وقت ایمان لایا مگر بے سود۔ اس سے فرمایا دیا گیا: آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ (یونس:۹۱) کیا اب ایمان لاتا ہے اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا۔ بہر حال یہ ہی تفسیر قوی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی آمد پر سارے اہل کتاب جو اس وقت موجود ہوں گے ایمان لے آئیں گے اور یہ واقعہ قرب قیامت ہوگا۔ کیونکہ دوسری آیت کریمہ اس تفسیر کی تائید کر رہی ہے۔ وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (زخرف:۶۱) نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی یہ ہی تفسیر فرمائی جیسا کہ ہم خلاصہ تفسیر میں عرض کر چکے۔ قرآن کی وہ ہی تفسیر قوی ہے جو خود قرآن کریم اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں۔

دوسرا اعتراض: تمہاری یہ تفسیر قرآن مجید کی دوسری آیت کے خلاف ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (آل عمران:۵۵) اے عیسیٰ! میں تمہارے متبعین کو قیامت تک کافروں پر فوقیت دوں گا۔ جس سے معلوم ہوا کہ کفار قیامت تک رہیں گے جن پر موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین غالب رہیں گے اگر قرب قیامت کفر رہے ہی نہیں اسلام ہی اسلام ہو جائے تو یہ فوقیت کیسی۔ لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام کی آمد قرب قیامت اور کفر کا دنیا سے مٹ جانا بالکل غلط ہے (قادیانی) **جواب:** تمہاری پیش کردہ آیت میں کفار پر مومنوں کی برتری کا ذکر ہے کفار کے تا قیامت رہنے کا ذکر نہیں۔ کفار کا رہنا اور چیز ہے اور ان پر مومنوں کی برتری دوسری چیز۔ مرے ہوئے کفار کی بدنامی ان کی ذلت و رسوائی مومنوں کی عزت یہ ان پر برتری ہے۔ آج ہم کو ابوجہل و ابولہب پر برتری حاصل ہے حالانکہ وہ لوگ جہنم میں پہنچ چکے ہیں بلکہ حضرت صدیق و فاروق کو ان کفار پر اب تک بلکہ تا قیامت برتری حاصل رہے گی حالانکہ نہ وہ صحابہ کرام اب دنیا میں ہیں نہ وہ کفار۔ شعر

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بہ عدل
گرچہ بسے گزشت کہ نوشیروان نماند
قارون ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت
نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گزاشت

لہٰذا ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ دنیا میں کفار نہ رہیں گے مگر کفار کی ذلت و خواری مومنوں کی عزت ہمیشہ رہے گی۔

تیسرا اعتراض: اگر قرب قیامت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو نبی ہوں گے یا نبوت سے معزول ہو چکے ہوں گے۔ اگر

نبی ہوں گے تو حضور آخری نبی نہ رہے اور اگر نبوت سے معزول ہو کر آئیں گے تو یہ ان کی شان کے خلاف ہے۔ **جواب:** اس اعتراض کا جواب ہم تیسرے پارہ میں بہت تفصیل سے دے چکے ہیں کہ آخری نبی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ بنے۔ پہلے تمام نبیوں کا وفات پا جانا آخریت کے لئے ضروری نہیں۔ آخری بیٹا وہ ہے جس کے بعد کوئی بیٹا نہ ہو یہ ضروری نہیں کہ گزشتہ بیٹے مر جائیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت اللہ کے نبی ہوں گے، حضور ﷺ کے امتی، نبی کا قرب الٰہی کبھی منسوخ نہیں ہوتا۔ دنیا میں ان کی حکومت منسوخ ہو جاتی ہے، کوئی حاکم دوسری کچہری میں گواہ بن کر پیش ہو تو اپنے وقت اور اپنی جگہ کا وہ حاکم ہے یہاں اس کچہری میں گواہ۔

تیسرا اعتراض: اگر عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں آکر جزیہ کا حکم منسوخ فرما دیں گے اور کسی کو سور کھانے کی اجازت نہ دیں گے، کفار کو مذہبی آزادی نہ دیں گے تو لازم آیا کہ آپ قرآن مجید کے احکام کو منسوخ فرما دیں گے کیونکہ جزیہ کا حکم قرآنی فیصلہ ہے حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (توبہ:۲۹) اور لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ:۲۵۶) آپ قرآن مجید کے ناسخ ہوں گے۔ **جواب:** آپ ان احکام قرآنیہ کے ناسخ نہ ہوں گے بلکہ اس ناسخ کے مظہر ہوں گے۔ خود سرکار ﷺ نے خبر دے دی ہے کہ یہ دونوں حکم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد پر ختم ہو جائیں گے جیسے ماہ رمضان عید کا چاند نظر آنے پر ختم ہو جاتا ہے یا روزہ سورج ڈوبنے پر ختم ہو جاتا ہے انہیں چاند یا غروب آفتاب نے ختم نہیں کیا بلکہ خود قرآن نے ختم فرمایا یا چاند اس کا مظہر ہے۔ نزول مسیح کے متعلق اور اعتراضات و جوابات تفسیر نعیمی پارہ سوم میں ملاحظہ فرماؤ۔ ہم وہاں مکمل بحث کر چکے ہیں۔

چوتھا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے خلاف گواہی دیں گے۔ دوسری آیت میں ہے کہ جب رب تعالیٰ پوچھے گا کہ تمہاری امتوں نے تمہیں کیا جواب دیئے تو عرض کریں گے "لَا عِلْمَ لَنَا ہم کو علم نہیں"۔ ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان نبیوں کی امتیں تبلیغ کا انکار کریں گی۔ وہ حضرات دعویٰ کریں گے۔ کون سی آیت ہے آیا وہ گواہ ہیں یا مدعی یا بے خبر۔ **جواب:** یہ تین حالات قیامت میں تین مختلف وقتوں میں ہوں گے۔ ایک وقت میں مدعی دوسرے وقت گواہ ایک وقت میں معذرت کا اظہار کہ مولا تو ہی جانے انہوں نے ہم سے کیا کہا۔ لہٰذا تینوں آیتیں درست ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

ایمان کا مدار انبیاء کو جاننے، پہچاننے اور ماننے پر ہے۔ مگر ان حضرات کی جان پہچان اور ماننا وہ چاہیے کہ حضور ﷺ کے ذریعہ سے ہو۔ آپ کے ذریعہ کے بغیر ان حضرات کی جان پہچان ایمان نہیں۔ اب جیسے معرفت الٰہی کا ذریعہ حضور ﷺ ہیں یونہی حضرات انبیائے کرام کی معرفت صرف حضور ﷺ ہیں دیکھو رب تعالیٰ نے یہودیوں، عیسائیوں کے متعلق فرمایا کہ یہ لوگ قرب قیامت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے ان کی وفات سے پہلے حالانکہ اب بھی عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کے جاننے پہچاننے اور ماننے کے مدعی ہیں۔ ان کی یہ جان پہچان ایمان نہیں کیوں کہ حضور ﷺ کی معرفت سے نہیں۔ جیسے حضور فرما دیں ویسے ہی انہیں ماننا ایمان ہے کہ وہ اللہ کے بندے، اللہ کے کلمہ، اللہ کی روح، اللہ کے نبی ہیں اور یہ کہ ان کی نبوت اب منسوخ ہو چکی اور یہ کہ وہ آسمان پر زندہ ہیں اور یہ کہ وہ قرب

قیامت دنیا میں تشریف لائیں گے اور یہ کہ وہ ایسے کام کریں گے جو ابھی مذکور ہوئے۔ جو شخص ان باتوں سے کسی بات کا انکار کرے وہ جناب مسیح کا مومن نہیں غرض کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات حضرات انبیائے کرام کی دلیل ہیں قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (النساء: ۱۷۴) ان تمام حضرات کو اس دلیل سے مانو اور حضور انور کو دل سے مانو۔ ان حضرات کا علم استدلالی ہو اور حضور کا علم طبعی ہو۔ ﷺ۔ بڑے شہر میں کسی غیر مشہور آدمی کو خط لکھو تو پتہ میں کسی کی معرفت سے لکھو تب پہنچے گا فلاں کو مل کر فلاں کو ملے یونہی اب حضور سے مل کر ان حضرات سے ملو۔ اگر حضور کے توسل کے بغیر ان حضرات کو جانا، پہچانا اور مانا تو انجام یہ ہوگا کہ یہ تو ان کے ماننے کا دعویٰ کرتا رہے گا اور وہ حضرات اس کے خلاف قیامت میں گواہی دیں گے۔ گویا یہ جان پہچان وبال جان بن جائے گی۔ یہ معنی ہیں اس کے کہ حضرت عیسیٰ قیامت کے دن ان عیسائیوں، یہودیوں کے خلاف گواہ ہوں گے اگر حضرات انبیاء کرام کی گواہی اپنے حق میں بنانی ہے تو حضور ﷺ کی پناہ میں آ جاؤ جسے جو کچھ مانو حضور کے فرمانے سے مانو۔ خیال رہے کہ عقل مند وہ ہے جو وقت پر کام کرے وقت نکل جانے پر کام کرنا بیکار ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واپسی پر ایمان لانے کا وہ درجہ نہ ہوگا جو اب ایمان لانے کا درجہ ہے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ

تو بوجہ ظلم کے طرف سے ان لوگوں کے جو یہودی ہوئے حرام کر دیں ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو

تو یہودیوں کے بڑے ظلم کے سبب ہم نے وہ بعض ستھری چیزیں کہ ان کے لئے حلال تھیں ان پر حرام

اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّ

حلال کی گئیں تھیں واسطے ان کے اور بوجہ روکنے ان کے راستہ سے اللہ کے بہت سوں کو

فرما دیں اور اس لئے کہ انہوں نے بہتوں کو اللہ کی راہ سے روکا

اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ

اور بوجہ لینے ان کے سود کو حالانکہ بیشک منع کئے گئے وہ لوگ اس سے اور بوجہ کھانے ان کے

اور اس لئے کہ وہ سود لیتے حالانکہ وہ اس سے منع کئے گئے تھے اور لوگوں کا

اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ

مال لوگوں کے بذریعہ ناجائز کے اور تیار کیا ہم نے واسطے کافروں کے

مال ناحق کھا جاتے اور ان میں سے جو کافر ہوئے ہم نے

مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾

ان میں سے عذاب دردناک

ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں رب تعالیٰ نے یہود کے بدترین جرموں کا ذکر فرمایا تھا، اب انہی مجرم یہودیوں کی دنیاوی اور اخروی سزاؤں کا ذکر فرما رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کے ان ظلموں کا ذکر فرمایا گیا جن کا تعلق حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام سے ہے۔ انہیں تنگ کرنا سولی دینے کی کوشش کرنا بلکہ اپنی دانست میں انہیں سولی دینا۔ اب یہود کے ان ظلموں کا ذکر ہے جن کا تعلق تمام لوگوں سے ہے جیسے لوگوں کے مال سود اور دیگر ناجائز طریقوں سے لے لینا۔ چونکہ نبی پر ظلم عوام پر ظلم کرنے سے بدتر ہے اس لئے پہلے بدتر کا ذکر فرمایا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں، یہود کے خود راہ حق سے رکنے کا ذکر تھا اب اوروں کو راہِ حق سے روکنے کا ذکر ہے گویا لازم جرم کے بعد متعدی گناہ کا ذکر ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی بدعقیدگیوں کا ذکر تھا اب ان کی بدعملیوں اور بدمعاملہ کا ذکر ہے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اہل کتاب یہود و عیسائیوں کے خلاف گواہی دیں گے اور قیامت میں ان کے جرموں کے گواہ ہوں گے۔ اب انہی اہل کتاب کے ان جرموں کا ذکر ہے جن کے متعلق آپ کی گواہی ہوگی تاکہ معلوم ہو کہ حضرت مسیح تمام یہود کے سارے اگلے پچھلے جرموں کے گواہ ہیں۔ وہ جناب چہارم آسمان پر رہتے ہوئے ان کے عیوب ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

تفسیر

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا: یہاں ف تعقیبیہ ہے اور ب سببیہ کیوں کہ یہ سزائیں جو اس آیت میں مذکور ہیں یہود کے جرموں کے بعد اور ان کے جرموں کی وجہ سے دی گئیں لہٰذا یہاں ف اور ب دونوں ارشاد ہوئیں۔ ظلم کے لغوی معنی ہیں اندھیرا۔ اسی سے ہے ظلمت اس کا مقابل ہے نور۔ اصطلاح میں کسی کا حق مارنے کو ظلم کہتے ہیں کیونکہ یہ آخرت میں اندھیرے کا سبب ہے۔ پھر ہر گناہ کو ظلم کہنے لگے کہ مجرم گناہ کر کے اپنے نفس کا حق مارتا ہے کہ اسے دوزخ کا مستحق قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ ظلم، کفر، شرک، گناہ کبیرہ، گناہ صغیرہ اور غلطی وخطا کے لئے فرمایا گیا۔ جب ظلم کی نسبت حضرات انبیائے کرام کی طرف ہو تو بمعنی لغزش، خطا ہوتا ہے جیسے رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا (اعراف: ۲۳) حضرت آدم علیہ السلام کی دعا میں اور اِنِّيۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ (انبیاء: ۸۷) حضرت یونس علیہ السلام کی دعا میں مذکور ہے۔ یہ بمعنی لغزش ہے۔ جب ہم جیسوں کے لئے استعمال ہو تو بمعنی گناہ ہوگا اور جب کفار کے لئے استعمال ہو تو بمعنی کفر و شرک و بدکاری ہوگا۔ یہاں اسی آخیری معنی میں ہے کیونکہ کفار یہود کے لئے ارشاد ہوا ہے۔ چنانچہ یہود کے ظلم سے مراد ان کے وہ کفریات ہیں جو ان سے بارہا سرزد ہوئے جیسے ان کا موسیٰ علیہ السلام سے کہنا کہ مشرکین کی طرح ہمارے لئے بھی بہت سے معبود بنایئے یا ان کا

کہنا کہ ہم کو ظاہر ظہور خدا دکھایئے یا ان کی بچھڑے کی پرستش کرنا یا ہر وقت موسیٰ علیہ السلام کو تنگ کرنا وغیرہ۔ مِنۡ ابتدائیہ ہے ان لوگوں کو الیہود نہ فرمایا بلکہ ’’اَلَّذِیۡنَ هَادُوۡا‘‘ فرمایا تا کہ ان کی پوری بے عزتی ہو۔ یعنی جو پہلے توبہ ورجوع کر چکے تھے یا جو یہودا کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے عزت والے تھے اس کے باوجود وہ ظالم ہوئے یہ ظلم و نافرمانی ان کی حیثیت کے بالکل خلاف تھی حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ لفظ حَرَّمۡنَا تحریم کا ماضی مطلق ہے یہاں باب تفعیل یا آہستگی کے لئے ہے یا مبالغہ کے لئے یعنی ہم نے آہستہ آہستہ ان پر حلال چیزیں حرام کیں کہ وہ جرم کرتے رہے، ہم ان کے ہر جرم پر کوئی حلال چیز حرام کرتے رہے (جمل) یا مبالغہ کے لئے ہے یعنی ہم نے یہود پر حلال چیزیں اچھی طرح حرام کر دیں کہ انہیں قطعاً حرام کر دیا ان کے استعمال کرنے پر عذاب کا مستحق قرار دیا۔ طَیِّبٰتٍ جمع ہے طیبۃ کی جس کے معنی حلال چیز بھی ہے اور لذیذ و مزیدار بھی اور پاک ستھرے بھی یہاں تیسرے معنی زیادہ موزوں ہیں۔ دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ اُحِلَّتۡ بنا ہے حلال سے مقابل حرام کا حلال کے لغوی معنی ہیں کھل جانا۔ اسی لئے احرام سے فارغ ہو جانے والے کو حلال کہتے ہیں کہ وہ حرام کی پابندیوں سے کھل جاتا ہے جائز چیز کو حلال اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حرام کی ممانعت سے کھلی ہوتی ہے۔ یعنی ان یہود کے پے در پے جرموں کی وجہ سے ان پر وہ پاکیزہ ستھری لذیذ چیزیں ہم نے حرام کر دیں جو پہلے ان پر حلال تھیں خیال رہے کہ یہود پر چیزوں کی حرمت تین طرح آئی ایک اس طرح کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے پر اونٹ کا گوشت، دودھ حرام فرما لیا تو ان کی نقل میں یہود نے بھی حرام کر لیا جس کا ذکر چوتھے پارے میں اس آیت کی تفسیر میں گزر گیا۔ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِهٖ (آل عمران: ۹۳) دوسری اس طرح کہ یہود کے پوپ پادری ترک دنیا کے طور پر اپنے پر پاکیزہ چیزیں حرام کر لیتے تھے جیسے کہ آج عیسائی راہب یا ہندو سادھوں کا حال ہے۔ اس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے وَرَهۡبَانِیَّةَ ۨابۡتَدَعُوۡهَا مَا کَتَبۡنٰهَا عَلَیۡهِمۡ (حدید: ۲۷) تیسری اس طرح کہ خود رب تعالیٰ نے ان پر مختلف زمانوں میں مختلف چیزیں حرام فرما دیں۔ ان کی سرکشی کی وجہ سے جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے وَعَلَی الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا کُلَّ ذِیۡ ظُفُرٍ (انعام: ۱۴۶) یہاں تیسری قسم کی حرمت مراد ہے کیونکہ پہلی دو حرمتیں تو ان کی اپنی طرف سے تھیں یہ حرمت رب کی طرف سے تھی اور سزا تھی رہی یہ تفصیل کہ وہ طیبات ان پر کب تک حلال رہیں اور کون سی طیب چیز کب اور کس جرم پر حرام کی گئی اس کی تفصیل بہت مشکل ہے۔ اس لئے مفسرین نے اس تفصیل کا ذکر نہیں کیا۔ حتیٰ کہ امام فخر الدین رازی نے بھی (تفسیر خازن) اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرمت مکمل طور پر توریت میں نہ تھی کہ وہ جرم کرتے رہتے اور توریت شریف میں حرمت کی آیات آتی رہتیں کیونکہ ساری توریت یک دم آئی ہے۔ نیز آئندہ جرموں پر توریت میں یہ چیزیں حرام کر دی جاتیں یہ بھی ناممکن ہے کہ رب تعالیٰ بغیر جرم یا جرم سے پہلے سزا نہیں دیتا لہٰذا یہ ہی ظاہر ہے کہ مختلف نبیوں کے زمانہ میں ان پر مختلف چیزیں حرام ہوئیں کچھ توریت شریف میں اور کچھ زبور وغیرہ میں۔ اس آیت کو امام واحدی نے مشکل ترین آیت قرار دیا ہے (خازن) یاد رکھو کہ خبیث اور بری چیزوں کا حرام کر دینا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور اچھی چیزوں کا حرام فرما دینا اللہ کا عذاب۔ اسلام میں کچھ چیزوں کا حرام فرمانا

رحمت الٰہی ہے اور بنی اسرائیل پر یہ حرمت عذاب الٰہی تھی وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا یہ عبارت یہود کے ظلم کی کچھ تفصیل ہے۔ واؤ عاطفہ ہے اور عطف تفسیر کے لئے ہے اس میں ان کے تین جرموں کا ذکر ہے۔ پہلا جرم یہ ہے اور دوسرے دو آگے ہیں۔ چونکہ دین سے منہ موڑ نا لوگوں کو روکنا بدترین جرم ہے اس لئے اسے پہلے بیان فرمایا اور لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھانا اس کے بعد ہے۔ اس لئے اس کا ذکر بعد میں فرمایا یہاں ب سببیہ ہے یہ عبارت فَبِظُلْمٍ کا بیان ہے۔ ب سببیہ کا اعادہ فرمایا گیا ہے۔ صد کا معنی روکنا بھی ہے اور خود رک جانا بھی یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ سبیل اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا دین ہے جو حضرات انبیائے کرام کے ذریعہ دنیا میں آیا جسے اختیار کر کے بندہ رب تعالیٰ کا قرب اختیار کرتا ہے اس لئے دین کو اللہ کا راستہ کہا جاتا ہے یعنی اس تک پہنچنے کا ذریعہ یا دینی نیک اعمال یا حضور ﷺ کا دامن پاک کہ یہ تمام چیزیں خدا رسی کا وسیلہ ہیں۔ کفار لوگوں کو اللہ سے نہیں روکتے، اللہ کو تو مانتے ہیں البتہ اللہ کی سبیل سے یعنی رسول اللہ سے روکتے ہیں۔ ہماری اور کفار کی تمام جنگیں نبوت کے مسئلہ پر ہیں الوہیت اور توحید تو قریباً تمام کفار مانتے تھے۔ اگر صد بمعنی روکنا ہے تو كَثِيْرًا اس کا مفعول بہ ہے۔ اور اگر بمعنی رک جانا ہے تو كَثِيْرًا مفعول مطلق یعنی صَدًّا كَثِيْرًا (مدارک) یعنی ان یہود کے بہت لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے یا ان یہود کے اللہ کی راہ سے بہت زیادہ رک جانے کی وجہ سے۔ خیال رہے کہ مشرکین عرب بھی اسلام سے رکتے تھے مگر بے خبری کی وجہ سے کیونکہ ان کے پاس کتاب اللہ نبی کی تعلیم نہ تھی۔ مگر یہود مدینہ آیات الٰہیہ تعلیم نبی پر خبردار ہونے کے باوجود اسلام اور بانی اسلام ﷺ سے رکتے تھے۔ اس لئے ان کا رکنا کثیر تھا۔ مشرکین مکہ کا رکنا قلیل نیز مشرکین عرب لوگوں کو تلوار کے ذریعہ حضور سے روکتے تھے۔ مگر یہود مدینہ علم، وعظ، قلم کے ذریعے روکتے تھے اور تلوار کی روک سے علم کی روک زیادہ ہے۔ اس لئے ان کی روک زیادہ تھی ان وجوہ سے ان کی رکاوٹ کو کثیر فرمایا گیا وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء:۱۶۱) یہ ان یہود کا دوسرا جرم ہے یعنی سود خواری۔ چونکہ سود دینے سے سود لینا زیادہ بڑا جرم ہے اس لئے یہاں لینے کا ذکر فرمایا اور چونکہ سود لینا بہر حال حرام ہے خواہ اسے کھانے یا پہننے یا کسی اور طرح استعمال کرے یا اسے جمع کر کے رکھ لے یا کسی کو دیدے یا خیرات کر دے یا کسی نیک کام میں لگا دے بہر حال حرام ہے اس لئے لینا فرمایا گیا۔ صرف کھانے پینے کا ذکر نہ فرمایا "قَدْ نُهُوْا" فرما کر بتایا گیا کہ یہود پر سود لینا پہلے سے حرام تھا توریت تو زمانہ موسوی میں آئی مگر سود کی حرمت پہلے سے تھی۔ ملت ابراہیمی میں حرام تھا یا یہ مطلب ہے کہ توریت میں یہ لوگ سود سے منع کیے گئے تھے مگر انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی مختلف حیلوں بہانوں سے بلکہ کھلم کھلا سود لیا۔ پہلے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ شراب سود وغیرہ بعض دینوں میں حلال رہے مگر سود وہ چیز ہے جو کسی دین میں کبھی حلال نہ ہوا۔ نُهُوْا ماضی مطلق جس سے مطلقاً ممانعت معلوم ہوتی ہے۔ یہ نہی تحریم کی ہے وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ یہ عبارت "اَخْذِهِمُ" پر معطوف ہے۔ اس میں تعمیم بعد تخصیص ہے۔ یعنی خصوصیت سے سود خوری کا ذکر فرما کر عموماً دوسری حرام خواریوں کا ذکر فرمایا چونکہ مال کا بڑا نفع ہے۔ کھانا دوسرا نفع اس کے بعد اس لئے کھانے کا ذکر فرمایا ورنہ حرام آمدنی کا کھانا بھی حرام ہے۔ پہننا برتنا بھی حرام۔ جیسے رب تعالیٰ

فرماتا ہے: لَا تَاۡكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضۡعَافًا (آل عمران: ۱۳۰) جمع فرما کر اشارہ فرمایا کہ یہ ایسے حریص ہیں کہ لوگوں کا ہر قسم کا مال خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ پھر خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی غرض جیسا بھی مال ہو کسی طرح ہاتھ لگ جائے یہ کھا جانے ہضم کر جانے میں تامل نہیں کرتے بِالۡبَاطِلِ میں ب سببیہ ہے یا ذریعہ کی باطل سے مراد ہر ناجائز طریقہ ہے جس سے مال حاصل کیا جاوے جیسے رشوت یا ناجائز پیشوں کے ذریعہ مال کمانا جیسے ناچ، گانا، جوا، تاش، کم تول کر مال دینا، ملاوٹ کر کے مال بیچنا، ناچ کر گا کر پیسہ کمانا۔ غرض کہ جن کاموں کو حرام کیا گیا ہے ان سے حاصل کیا ہوا پیسہ حرام ہے۔ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا اس جملہ کی تفسیر ابھی کچھ آیات میں پہلے گزر گئی۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ یہ عبارت حَرَّمۡنَا پر معطوف ہے اور اس میں ان کے اخروی عذاب کا ذکر ہے یعنی دنیا میں تو ہم نے ان پر وہ عذاب کیا جو ابھی مذکور ہوا اور آخرت میں یہ عذاب ہے۔ لِلۡكٰفِرِيۡنَ سے مراد کفر میں جمے رہنے والے کفر پر مرنے والے یا وہ جن کے کفر پر ارادہ الٰہی ہو چکا ہے کہ وہ عند اللہ کافروں کی فہرست میں آ گئے اس لئے مِنۡ تبعیضیہ ارشاد ہوا۔ ورنہ یہود سارے ہی کافر ہیں۔ عذاب کے معنی اور عذاب۔ عقاب کا فرق اور عذاب الیم وغیر الیم میں فرق بارہا بیان ہو چکا۔ یعنی ان یہود میں سے کافر مرنے والوں کے لیے ہم نے بہت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے جو ان کے نامزد ہو چکا ہے۔ رہے وہ یہود جو ابھی تو یہودی ہیں لیکن آگے چل کر ایمان قبول کر لیں گے اور ان کا خاتمہ ایمان پر ہوگا اس لئے ان کے لئے مغفرت، قبولیت اور رحمت کے دروازے کھلے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں یہود کے چار خصوصی جرموں کا ذکر فرمایا۔ بڑا ظلم کرنا، لوگوں کو راہ ہدایت سے روکنا، سود لینا، لوگوں کے مال ناجائز طور پر کھانا اور ان چار جرموں پر دو سزاؤں کا تذکرہ کیا ایک دنیاوی عذاب یعنی طیب و لذیذ چیزوں کا ان پر حرام فرما دینا۔ دوسرا اخروی یعنی دردناک عذاب جہنم کا ان کے لئے تیار ہونا۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم یہود کے گزشتہ مذکورہ سخت ظلم کی وجہ سے کہ انہوں نے توریت کے عہد توڑے۔ موسیٰ علیہ السلام سے چند معبود بنانے کا مطالبہ کیا۔ حق تعالیٰ کا دیدار بے حجاب مانگا وغیرہ ہم نے ان پر بہت سی پاکیزہ ستھری چیزیں حرام فرما دیں جن کا ذکر سورۂ انعام شریف میں آ رہا ہے جو کہ پہلے ان پر حلال تھیں کچھ تو توریت شریف میں ہی حرام فرما دیں اور کچھ بعد دوسرے انبیائے کرام کے زمانوں میں ان پر یہ دنیاوی عذاب اس لئے آیا کہ وہ خود اللہ کی راہ اللہ کے دین سے بہت پھر رکتے تھے۔ یا بہت لوگوں کو اللہ کی راہ۔ نبیوں پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ کسی کو شبہات میں مبتلا کر کے کسی کو روپیہ پیسہ کا لالچ دے کر کسی کو اور ذریعوں سے غرض کہ بہت لوگوں کو بہت طریقوں سے روکتے تھے اور سود لیتے تھے حالانکہ سود سے ان کو سخت منع کیا گیا تھا توریت کے نزول سے پہلے بھی اور خود توریت میں بھی مگر وہ اس ممانعت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے بعض تو کھلم کھلا صراحۃً سود خوار ہو گئے تھے۔ اور بعض یہودی حیلے بہانہ کر کے اسے جائز کرنے کی جرأت کرتے اور لیتے تھے اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے جوئے، رشوت حرام طریقوں سے کھا جاتے تھے۔ ان چار وجہوں سے اس دنیا میں تو یہ عذاب آیا کہ ان پر حلال طیب چیزیں حرام کر دی گئیں اور آخرت میں ان کا یہ حال ہوگا کہ ان میں

جو کافر ہو کر مرے گا اس کے لئے سخت دردناک عذاب ہم نے تیار کر رکھا ہے۔ جو انہیں مرتے وقت مرنے کے بعد اور قیامت میں اور بعد قیامت دیا جاوے گا اس لئے بہتر ہے کہ اب بھی توبہ کر لیں تو ان کے لئے دروازۂ رحمت کھلا ہوا ہے۔ ہمارے محبوب کا دامن بڑا وسیع ہے۔

ضروری نوٹ: ہم سود کی مکمل بحث کہ سود کسے کہتے ہیں، سود کتنی قسم کا ہے اور سود کے احکام کیا ہیں تیسرا پارہ سورۂ بقرہ میں کر چکے ہیں۔

خیال رهے: کہ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی بدعقیدگیوں اور بدمعاملگیوں کا ذکر تو فرمایا مگر ان کی عبادات کی خرابیوں کا ذکر نہ کیا کیونکہ بمقابلہ عبادات کے معاملات بہت اہم ہیں۔ عبادات سے صرف اپنے کو نفع ہوتا ہے مگر معاملات کے احکام ہر مسلم و کافر پر جاری ہوتے ہیں۔ اسلامی حکومت کسی کافر کو سود لینے، رشوت خواری، کم تولنے مال میں ملاوٹ کر کے تجارت کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اسی اہمیت کی بنا پر یہاں خصوصیت سے معاملات کا ذکر ہوا۔ یاد رکھو کہ مال حاصل ہونے کے چند ذریعہ ہیں جن سے مال حلال ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ حرام۔ وراثت، تجارت، اجارہ یعنی کرایہ، مزدوری، ملازمت، ہبہ خواہ ہدیہ ہو یا نذر یا عطیہ یہ اسباب ہیں مال حلال کے۔ اس کے علاوہ سب حرام۔ پھر تجارت و اجارہ میں تفصیل ہے۔ حلال تجارتوں کے ذریعہ حاصل شدہ مال حلال ہے۔ حرام تجارت، حرام پیشوں کے ذریعے حاصل شدہ مال حرام ہے یہ ایک کلمہ **بِالْبَاطِلِ** ہزارہا مسائل کا سرچشمہ ہے۔

فائدے

اسی آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** پچھلے زمانہ میں عذاب الٰہی اس طرح بھی آتا تھا کہ ان پر شرعی احکام سخت کر دیئے جاتے تھے۔ طیب و حلال چیزیں حرام کر دی جاتی تھیں۔ ہمارے دین میں اس عذاب سے امان ہے۔ دین محمدی بہت آسان ہے۔ جیسے حضور کی تشریف آوری سے اور دنیاوی عذاب آنا بند ہو گئے۔ جیسے آسمان سے پتھر برسنا، صورتیں مسخ ہونا ایسے ہی یہ عذاب بھی بند ہو گیا۔ **دوسرا فائدہ:** تمام حرام کمائیوں میں سود بدترین حرام ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے اس کا ذکر پہلے فرمایا دوسری ناجائز آمدنیوں کا ذکر بعد میں۔ نیز سود بھی ناجائز کمائیوں میں داخل تھا مگر اسے خصوصیت سے علیحدہ بیان فرمایا۔ **تیسرا فائدہ:** سود لینا حرام مطلق ہے۔ خواہ اسے کھائے یا پہنے یا اور طرح استعمال کرے یا اسے جمع کر کے رکھے یا خیرات کر دے یہ فائدہ **اَخْذِهِمُ** سے حاصل ہوا کہ یہاں اَكْلِهِمْ نہ فرمایا۔ **چوتھا فائدہ:** سود دینے سے سود لینا زیادہ برا اور سخت تر جرم ہے یہ فائدہ بھی **اَخْذِهِمُ** سے حاصل ہوا کہ سود دینے والا تو ایک جرم کرتا ہے۔ سود دینے کا مگر سود لینے والا دو جرم کرتا ہے۔ سود لینا اور سود کا استعمال کرنا۔ دیکھو اسرائیلی یہودی سود دیتے بھی تھے اور لیتے بھی تھے مگر عذاب الٰہی کے اسباب میں سود لینے کا ذکر ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** سود اسلام سے پہلے اور دینوں میں بھی حرام تھا اس کی حرمت صرف اسلام ہی میں نہیں ہے۔ بلکہ تمام دینوں میں بھی تھی یہ فائدہ قَدْ نُهُوْا سے حاصل ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** رشوت، جوا، چوری، ناچ گانے وغیرہ کے پیشے اسلام سے پہلے

دوسرے دینوں میں بھی حرام تھے اور ان سے حاصل کیا مال حرام تھا۔ اسلام میں بھی یہ سب کچھ حرام ہے۔ اس کی تفصیل تیسرے پارہ میں گزر چکی یہ سب باطل میں داخل ہے۔ **ساتواں فائدہ:** سود یا ناجائز و حرام کمائیوں سے حاصل کیا ہوا مال اس کمانے والے کی ملک نہیں بنتا بلکہ وہ مال اصل مالکوں کا ہی رہتا ہے۔ یہ فائدہ اَمْوَالَ النَّاسِ فرمانے سے حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ نے ان مالوں کو لوگوں کا مال فرمایا۔ خود کمانے والے کا مال نہ فرمایا۔ اس سے بہت سے مسائل حل ہوں گے۔ حتی کہ ان مالوں میں میراث بھی جاری نہ ہوگی۔ اگر وارثوں کو اس حرام مال کی خبر ہو اور مالکوں کا پتہ ہو تو انہیں واپس کر دیں کہ یہ ''اَمْوَالَ النَّاسِ'' ہیں۔ **آٹھواں فائدہ:** ناجائز ذریعوں سے حاصل کیا ہوا مال کسی طرح استعمال نہ کرے مگر اس کا کھانا سخت حرام ہے یہ فائدہ اَكْلِهِمُ فرمانے سے حاصل ہوا کہ حرام غذا سے جو خون گوشت پوست بنے گا اسے آگ دوزخ جلد جلا دے گی۔ خراب پٹرول موٹر کے پرزے خراب کر دیتا ہے۔ **نواں فائدہ:** انسان کے جزا و سزا کے لئے خاتمہ کا اعتبار ہے۔ جو کافر مرے عذاب کا مستحق ہے خواہ زندگی میں مؤمن رہا ہو اور جو مؤمن مرے وہ رحمت کا مستحق ہے اگرچہ زندگی میں کافر رہا ہو جیسا ''لِلْكٰفِرِيْنَ'' کی تفسیر سے معلوم ہوا۔ **دسواں فائدہ:** اگرچہ گناہ گار مسلمانوں کو بھی عذاب ہو سکتا ہے مگر ''عَذَابًا اَلِيْمًا'' صرف کافر مرنے والوں کے لئے ہے جیسا کہ لِلْكٰفِرِيْنَ کے مقدم کرنے سے معلوم ہوا۔ **گیارھواں فائدہ:** تمام یہود کافر نہ رہے بلکہ ان میں سے کچھ مسلمان بھی ہو گئے۔ جو مسلمان ہو گئے وہ بخش دیئے گئے اور مذکورہ عذابوں سے بچ گئے۔ یہ فائدہ مِنْهُمْ کے مِن تبعیضیہ سے حاصل ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہود نافرمانیاں کرتے رہے اور ان پر طیب چیزیں حرام ہوتی رہیں مگر یہ تو جب ہو سکتا تھا جب کہ توریت شریف قرآن مجید کی طرح تھوڑی تھوڑی اور مختلف واقعات پر اترتی۔ جب ساری توریت یک دم اتری تو یہ کیسے درست ہوا کہ ان لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے چیزیں حرام ہوتی رہیں۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا۔ کہ یہود نزول توریت سے پہلے ہی بڑے ظالم، جھگڑالو اور ضدی تھے۔ ان کی ان حرکتوں کی وجہ سے توریت کے احکام سخت آئے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اور آپ کے بعد انہوں نے بری حرکتیں کیں تو بعد والے نبیوں اور بعد والی کتابوں کے ذریعہ ان پر سختی بڑھتی گئی، طیب چیزیں حرام ہوتی گئیں۔ چیزوں کی حرمت صرف توریت سے ہی نہ ہوئی بلکہ بعد میں دوسری کتابوں سے ہوتی رہیں۔

دوسرا اعتراض: حلال چیزوں کو حرام کر دینا تو کوئی عذاب نہیں۔ عذاب وہ ہے جو تکلیف دے چند چیزیں نہ کھانے میں کیا تکلیف ہوگی؟ (آریہ) **جواب:** اس کی تکلیف کسی اس بیچارے سے پوچھو جو بیماری کی وجہ سے بہت سی مزیدار چیزوں سے محروم ہو گیا۔ وہ بیچارہ سخت پرہیز کی وجہ سے زندگی سے تنگ آ جاتا ہے خصوصاً جب کہ سب گھر والے اعلیٰ غذائیں کھاتے ہوں اور یہ مونگ کی دال پر گزارہ کرتا ہو۔

تیسرا اعتراض: ناجائز کمائیوں میں سود بھی شامل تھا پھر اس کا ذکر علیحدہ کیوں ہوا؟ **جواب:** اس لئے کہ یہ بدترین

جرم ہے اسی لئے حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ سود لینا ایسا جرم ہے جیسے کعبہ معظمہ میں اپنی ماں سے زنا کرنا۔ نعوذ باللہ۔

لطیفہ: فتاویٰ رشیدیہ میں مولانا رشید احمد صاحب فرماتے ہیں کہ منی آرڈر بھیجنا ممنوع ہے ربو یعنی سود ہے تو ان کے اسی فتویٰ سے ہر منی آرڈر بھیجنے والا سود خوار ہے اور اتنا بڑا مجرم ہے جتنا بڑا مجرم اپنی ماں سے زنا کرنے والا ہے۔ اب غور کرنا چاہیے کہ آج کل منی آرڈر سے کون بچ سکتا ہے؟ اس فتوے نے سارے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اللہ تعالیٰ عالم کی عقل خراب نہ کرے۔

چوتھا اعتراض: اس کی کیا وجہ ہے کہ سود کے لئے اخذ یعنی لینا ارشاد ہوا اور حرام کمائیوں کے لئے اکل یعنی کھانا فرمایا گیا حالانکہ یہ دونوں ہی حرام ہیں۔ **جواب:** یہ بھی سود کی حرمت کی سختی ظاہر فرمانے کے لئے ہے اس کی تفصیل ابھی تفسیر میں عرض کردی گئی ہے۔

پانچواں اعتراض: لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے یہودی کافر نہیں بلکہ بعض کافر ہیں انہی کے لئے دردناک عذاب ہے حالانکہ سارے یہودی کافر ہیں پھر یہ فرمانا کیسے درست ہوا؟ **جواب:** اس کا جواب بھی تفسیر میں گزر گیا کہ یہاں کافرین سے مراد کافر رہنے والے اور کافر مرنے والے ہیں اور واقعی ایسے کافر سارے یہود نہ تھے۔ بعض تھے کیونکہ ان میں سے بہت سے یہود مسلمان ہو گئے تھے۔

چھٹا اعتراض: مسلمان ہونے والے یہودیوں کا کیا حکم ہے انہوں نے زمانہ کفر میں جو سود لیا ناجائز ذریعوں سے مال کھائے، کیا اسلام لانے کی برکت سے وہ بھی معاف ہو گئے۔ اگر معاف ہو گئے تو اس سے لوگ گناہوں پر حقوق مار لینے پر دلیر ہو جائیں گے، اگر معاف نہ ہوئے تو لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ کا کیا مطلب؟ **جواب:** ان جیسے جرموں کا حکم یہ ہے کہ اسلام کی برکات سے ان کے گناہ تو معاف ہو گئے مگر حق عبد باقی رہے وہ ادا کرنا ہوں گے۔ اگر کوئی شخص زمانہ کفر میں قتل یا چوری کرے پھر مسلمان ہو جاوے تو اسلام کی برکت سے ان کاموں کے گناہ معاف ہو گئے مگر حق عبد کی وجہ سے قصاص اور ہاتھ کا کٹنا ضرور ہوگا۔ گناہ اور حق میں فرق ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے گناہوں، بدکاریوں کی دو سزائیں بیان فرمائیں ایک دنیاوی سزا یعنی حلال وطیب چیزوں کا حرام فرما دینا۔ دوسری سزا اخروی یعنی دردناک عذاب یہود کے لئے ارشاد ہوا: حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اور ہم گنہگاروں کے لئے فرمایا: وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ (اعراف: ۱۵۷) اور فرمایا: كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا (مائدہ: ۸۸) یعنی رب تعالیٰ نے ہم کو اس حرمت کی سزا سے محفوظ رکھا۔ اس کرم نوازی سے امید بندھی کہ انشاء اللہ رب تعالیٰ ہم کو آخرت کے دردناک عذاب سے بچائے گا۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے ان دونوں عذابوں کو اس آیت میں جمع فرمایا ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ممنوعات کا ارتکاب تحریم مباحات کا موجب ہے اور مباحات میں زیادتی واسراف محرومی مناجات کا باعث ہے۔ ہر مباح کھا لینا جو نفس چاہے وہ کام کر لینا برا ہے بلکہ کبھی نفس کو

مارنا بھی چاہیے تاکہ نفس ہم پر غالب نہ آوے۔ شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا۔

مرو درپے ہرچہ دل خواہدت کہ تمکین تن نور جاں کاہدت

(روح البیان)

جو شخص ہر چیز بغیر تحقیق کھالے وہ کتے سے بدتر ہے کہ کتا جو کچھ کھاتا ہے دیکھ کر، سونگھ کر کھاتا ہے۔ یہ نادان بغیر دیکھے سونگھے ہی کھالیتا ہے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ

لیکن مضبوطی والے بیچ علم کے ان میں سے اور ایمان رکھنے والے ایمان لاتے ہیں

ہاں جو ان میں علم کے پکے اور ایمان والے ہیں وہ ایمان لاتے ہیں

بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ

ساتھ اس کے جو اتارا گیا طرف آپ کے اور اس پر جو اتارا گیا پہلے سے آپ کے اور قائم رکھنے والے نماز کے

اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا اور نماز قائم رکھنے والے

وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

اور دینے والے زکوٰۃ کے اور ایمان رکھنے والے ساتھ اللہ اور دن آخر کے

اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور قیامت پر ایمان لانے والے

اُولٰٓىٕكَ سَنُؤْتِیْهِمْ اَجْرًا عَظِیْمًا ۠ (۱۶۲)

یہ لوگ ہیں کہ عنقریب دیں گے ہم ان کو ثواب بڑا

ایسوں کو عنقریب ہم بڑا ثواب دیں گے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں جاہل و کافر یہود کا ذکر تھا اب اس آیت میں مؤمنین صالحین یہود کا تذکرہ ہے۔ کیونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کفار یہود کی بدکاریوں کی کچھ تفصیل تھی۔ اب مومن یہود کی خوش عقیدگی اور نیک کاریوں کا تفصیلی ذکر ہے تاکہ قرآن پڑھنے والے ان اعمال سے بچیں۔ اور ان عقائد و اعمال کو اختیار کریں۔ کامل علاج یہ ہے کہ مریض کو کھانے والی غذائیں دوائیں بھی بتائی جائیں اور بچنے والی مضر چیزوں پر بھی مطلع کیا جاوے پرہیز کرنے کے لئے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب کا ذکر تھا اب اس کے ثواب کا ذکر ہے گویا رب تعالیٰ کی

جباری قہاری کا ذکر پہلے ہوا اس کی ستاری، غفاری، کرم نوازیوں کا ذکر اب ہو رہا ہے۔ ایمان کے گویا دو بازو ہیں خوف و امید پیدا کرنے کے بعد امید بندھائی جا رہی ہے چونکہ امید پر خوف مقدم ہے اس لئے خوف کا ذکر پہلے ہوا، امید کا ذکر بعد میں۔ خیال رہے کہ قرآن کریم کبھی تو صراحتہً احکام جاری فرماتا ہے کبھی اشارۃً۔ اس قسم کی آیات اشارۃً احکام کی ہیں کہ دوسری قوموں کی سزا و جزا کا ذکر فرمایا۔ ہم سے عمل کرانے کے لئے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت کے آخر میں فرمایا گیا تھا کہ ان بنی اسرائیل میں جو کافر ہیں ان کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے جس سے معلوم ہوا تھا کہ سب اسرائیلی کافر نہیں۔ ان میں بعض مومن بھی ہیں اب اسی اجمال کی تفصیل ہو رہی ہے کہ کافر اسرائیلیوں کے لئے وہ عذاب ہے اور مومن اسرائیلیوں کے لئے یہ اجر و ثواب ہیں گویا یہ آیت کریمہ گزشتہ آیت کی تفصیل ہے۔

تفسیر

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ۔ لٰكِنِ حرف استدراک ہے۔ جس سے کسی وہم کو دور کیا جا سکتا ہے چونکہ پہلی عبارت سے شبہ ہو سکتا تھا کہ سارے یہود کا یہی حال ہوگا کہ وہ بدعقیدہ بدعمل عذاب الٰہی کے مستحق ہوں گے اس وہم کو دفع کرنے کے لئے یہاں لٰكِنِ ارشاد ہوا۔ ''اَلرّٰسِخُوْنَ'' بنا ہے رسوخ سے جس کے معنی ہیں ثابت ہونا، پھیل جانا۔ اسی لئے اس درخت کو راسخ کہا جاتا ہے جس کی جڑیں زمین میں پھیلی ہوں اور وہ مضبوطی سے زمین پر کھڑا ہو۔ علم میں راسخ وہ شخص ہے۔ جس کے دل و دماغ اعضاء ظاہری میں علم سما گیا ہو کہ نور علم اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا ہو اس کی تحقیق تیسرے پارے میں ہو چکی ہے۔ علم سے مراد یا تو توریت شریف کا علم ہے یا علم دین مِنْهُمْ کا مرجع وہ یہود ہیں جن کا ذکر ابھی ہو چکا۔ علمائے راسخین کون لوگ ہیں اس میں بہت گفتگو ہے۔ قوی قول یہ ہے کہ راسخ عالم وہ ہے۔ جس کے عقیدے درست ہوں، اعمال صحیح ہوں، دل میں اللہ کا خوف رسول کی محبت ہو، علم دین مکمل ہو، قواعد سے مسائل نکالنے کی قوت ہو۔ جس میں یہ پانچ چھ صفات ہوں وہ علماء راسخین ہیں۔ اَلرّٰسِخُوْنَ، مبتدا ہے اور یُؤْمِنُوْنَ اس کی خبر وَالْمُؤْمِنُوْنَ یہ اَلرّٰسِخُوْنَ پر معطوف ہے۔ مومنین سے مراد یا تو وہ عام یہودی ہیں جو حضور پر ایمان لے آئے اس صورت میں رب تعالیٰ نے خوش نصیب یہود کی دو قسمیں فرما دیں۔ علمائے راسخین اور عام مومنین چونکہ عام مومنین سے علماء افضل ہیں کہ وہ مومن بھی ہیں اور مومن گر بھی اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے پہلے فرمایا، بعد میں دوسرے مومنین کا۔ جب علماء و عوام کے ایمانوں میں فرق ہے تو نبی اور امت میں بھی فرق ہونا لازمی ہے یا اس سے مہاجرین و انصار مراد ہیں۔ اس صورت میں اشارہ اس طرف ہے کہ نئے مسلمان اور پرانے مسلمان نفس ایمان میں برابر ہیں۔ کوئی پرانا مسلمان کسی نو مسلم کو نظر حقارت سے نہ دیکھے اگر پرانے مسلمانوں کے پاس نیک اعمال کے ذخیرے ہیں تو ان نو مسلموں کو گناہوں کی معافی ایسی مل چکی ہے کہ گویا آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ یا عام اہل ایمان خواہ مومنین یہود ہوں یا مہاجرین و انصار وغیرہ۔ اس صورت میں اشارہ ادھر ہے کہ تا قیامت مسلمان ایمان و اسلام میں برابر ہیں۔ اگرچہ حضرات صحابہ، اولیاء اللہ، علماء اسلام کی ریل کے فسٹ کلاس کے مسافر ہیں اور ہم جیسے عوام تھرڈ کلاس کے مسافر ہیں لیکن اللہ کرے حضور سے کڑی ملی رہے تو منزل مقصود پر سب پہنچیں گے۔ قطرہ اور

دریا پانی ہونے میں برابر ہیں تیسرا قول قوی تر ہے **یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ** یہ عبارت **الرّٰسِخُوْنَ** اور **الْمُؤْمِنُوْنَ** کی خبر ہے۔ یہاں ایمان سے مراد تصدیق قلبی ہے ما سے مراد قرآن و حدیث اور حضور کے سارے معجزات ہیں۔ کیوں کہ یہ سب رب تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ پر اتارے ہوئے ہیں **یُؤْمِنُوْنَ** کے معنی ہیں ایمان لاتے ہیں یا ایمان رکھتے ہیں یا ایمان پر قائم رہتے ہیں **وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ** واؤ عاطفہ ہے اور **مَآ** پہلے **مَآ** پر معطوف ہے اور اس **مَآ** سے مراد گزشتہ انبیائے کرام کی کتابیں صحیفے اور ان کے معجزات و کمالات سب ہی ہیں۔ کیوں کہ یہ سب کچھ رب تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ چونکہ سارے نبی حضور ﷺ سے پہلے ہی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں اس لئے صرف ''**مِنْ قَبْلِكَ**'' ارشاد ہوا اس کے بعد ''مِنْ بَعْدِکَ'' نہ فرمایا گیا۔ جو کوئی حضور کے بعد نبی مانے وہ کافر ہے چونکہ قرآن کریم پر تفصیلی ایمان بھی ہے عمل بھی۔ مگر پچھلی کتب پر صرف اجمالی ایمان ہے، ان پر عمل نہیں اس لئے قرآن مجید اور حضور ﷺ کے فرمانوں کے لئے **مَآ اُنْزِلَ** علیحدہ ارشاد ہوا۔ اور دوسری کتب کے لئے ''**مَآ اُنْزِلَ**'' علیحدہ فرمایا گیا۔ نفس ایمان میں سب برابر ہیں مگر تفصیلی ایمان اور عمل اور نوعیت قبول میں فرق ہے۔ اور چونکہ حضور پر ایمان لانا ان تمام باتوں کے ماننے پر مقدم ہے۔ تمام کتب، تمام نبیوں، تمام ایمانیات کو حضور کی معرفت ماننے کا نام ایمان ہے اس لئے **بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ** پہلے فرمایا گیا اور باقی ایمانی چیزوں کا ذکر بعد میں۔ حضور ﷺ تمام ایمانیات کا دروازہ ہیں۔ دروازہ سے داخل ہو تو گھر کی نعمتیں پاؤ گے **وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ** اس عبارت کی ترکیب میں مفسرین نے بہت گفتگو کی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ ''**بِمَآ اُنْزِلَ**'' کے ما پر معطوف ہے اور حالت جری میں ہے اور **مُقِیْمِیْنَ** سے مراد یا گزشتہ انبیاء کرام ہیں کہ ہر نبی کے دین میں نمازیں تھیں۔ اگرچہ تعداد اور نوعیت میں فرق رہا یا اس سے مراد فرشتے ہیں کیونکہ تمام فرشتے نماز الٰہی ادا کرتے ہیں۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس پر بھی ایمان لاتے جو آپ پر اترا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اترا اور گزشتہ انبیائے کرام پر یا فرشتوں پر بھی ایمان لاتے ہیں جو نمازیں قائم فرمانے والے ہیں اس صورت میں یہ جملہ بھی ایمان ہی کی تفصیل ہے۔ دوسرا یہ کہ عبارت حالت نصبی میں ہے **اَمْدَحُ** فعل پوشیدہ کا مفعول۔ اس صورت میں یہ عبارت جملہ معترضہ ہوگی (خازن، کبیر وغیرہ) اس کے متعلق اور قول بھی ہیں جو قوی نہیں۔

خیال رھے: کہ **مُقِیْمِیْنَ** سے مراد یا تو وہ **رَاسِخُوْنَ** اور **مُؤْمِنُوْنَ** ہیں جن کا ذکر ابھی ہوا اور یہ ان کی صفت ہے یا ان کے علاوہ دوسرے لوگ ہیں۔ پہلے معنی زیادہ موزوں ہیں (خازن) مالک ابن دینار کی قرأت میں **وَالْمُقِیْمُوْنَ** ہے (تفسیر مدارک) مصحف ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں بھی یہ ہی ہے (مدارک) **وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ** یہ عبارت مومنوں پر معطوف ہے اور ان حضرات کے دوسرے عمل کا ذکر ہے یعنی فرض صدقہ زکوٰۃ ہمیشہ دینے والے۔ زکوٰۃ کے معنی اس کی صورتیں پہلے پارے کی تفسیر میں عرض کیے گئے۔ علماء یہود کبھی زکوٰۃ نہ دیتے تھے، وہ سمجھے بیٹھے تھے کہ زکوٰۃ و صدقات کے احکام ہمارے لئے ہیں ہی نہیں وہ تو عوام یہود کے لئے ہیں۔ یہ علماء عوام یہود سے رشوتیں لے کر اور ناجائز آمدنیوں سے بہت بڑے مال دار تھے۔ جیسے آج ہندوؤں میں برہمن جو کہتے ہیں کہ رب نے چار قومیں پیدا کی ہیں۔ برہمن، چھتری، ویش، شودر۔ برہمن دان یعنی

صدقات لینے کے لئے پیدا ہوئے۔ چھتری جنگ کرنے ملک گیری کے لئے۔ ویش تجارت کے لئے۔ شودر یعنی اچھوت ہم سب کی خدمت کے لئے یہ ہی ان کے خیال تھے۔ اس لئے خصوصیت سے زکوٰۃ دینے کا ذکر فرمایا گیا۔ یعنی ان کے علماء ربانی وہ ہیں جو زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یہ عبارت پہلے وَالْمُؤْمِنُوْنَ پر معطوف ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اور آخری دن پر ایمان، نبیوں، کتابوں پر ایمان لانا اللہ تعالیٰ کے لئے ہی تو ہے۔ وہ ہی اصل مقصود ہے۔ باقی اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اور چونکہ اللہ و قیامت پر ایمان وہ ہی قبول و معتبر ہے جو نبی اور کتاب الٰہی کے ذریعہ سے ہو۔ اس لئے نبوت و کتاب پر ایمان لانے کا ذکر پہلے فرمایا گیا۔ اور ایمان باللہ کا ذکر بعد میں۔ یوم آخر سے مراد قیامت میں اٹھنا۔ وہاں کا حساب و کتاب، جنت و دوزخ وغیرہ سب ہی ہیں حتی کہ شفاعت وغیرہ کا عقیدہ بھی اسی میں داخل ہے۔ قیامت کا ماننے والا حقیقتاً وہ ہی ہے جو ان سب باتوں کو مانے اُولٰٓئِکَ سَنُؤْتِیْہِمْ اَجْرًا عَظِیْمًا، اُولٰٓئِکَ سے اشارہ اس جماعت مؤمنین کی طرف ہے جن کے اوصاف ابھی مذکور ہوئے۔ چونکہ یہ حضرات بڑی شان والے ہیں اس لئے ''اُولٰٓئِکَ'' بعید کا اشارہ فرمایا گیا۔ چونکہ ایمان و اعمال کا ثواب دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں عطا ہوگا۔ لہٰذا ''سین'' استقبال کے لئے لایا گیا۔ اجر سے مراد ایمان و اعمال تمام کا ثواب ہے۔ عظیم فرما کر بتایا گیا کہ انہیں ایسا ثواب ملے گا جو ان کے خیال و گمان سے وراء ہے یعنی ان لوگوں کو عنقریب ہم بہت ہی بڑا ثواب دیں گے جو بیان میں نہیں آسکتا۔ دنیا والوں کی اجرت اور رب تعالیٰ کے اجر میں کئی طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ دنیا والے اجرت اور کام ساتھ رکھتے ہیں کام کیے جاؤ تنخواہ ماہ بماہ یا مزدوری روزانہ لیے جاؤ۔ مگر رب تعالیٰ جب اجر دے گا تو کام نہ لے گا۔ قبر میں ہی کہہ دیا جائے گا کہ سو جا دولہا کی طرح یہاں سونے سے مراد آرام کرنا ہے نہ کہ یہ سونا غفلت والا۔ ورنہ یہ تو عذاب ہو جاتا۔ دوسرے دنیا کی تنخواہیں تھوڑی ہوتی ہیں جن سے بمشکل گزارہ، رب کے اجر بہت زیادہ ہیں، محدود عمل کا لامحدود ثواب۔ تیسرے دنیا میں کام سینکڑوں کرا کر تنخواہ ایک دی جاتی ہے، رب تعالیٰ ایک کام کے بہت سے اجر دے گا۔ نماز کو لے لو، کہ اسی میں وضو کرنے، مسجد جانے، جماعت کا انتظار کرنے وغیرہ کے ثواب الگ الگ ہیں اس لئے اس کو اجر عظیم فرمایا گیا۔

خلاصہ تفسیر

جیسے اللہ تعالیٰ نے گناہ گار و بدکار یہودیوں کے بہت سے عیوب بیان فرما کر ان کے عذاب کا ذکر فرمایا تھا ویسے ہی نیک کار پرہیز گار یہود کے بہت سے صفات کا ذکر فرما کر ان کے ثواب کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ فرمایا: اہل کتاب میں سے پختہ علم والے اور کامل ایمان والے ان تمام پر بھی ایمان رکھتے یا ایمان لاتے ہیں جو آپ پر اترا اور ان سب پر بھی جو آپ سے پہلے اور انبیاء کرام پر اترا جو کسی کا انکار نہیں کرتے۔ نمازیں قائم کرنے والے ہیں، زکوٰۃ ادا کرنے والے اور اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن اور اس کے حالات پر ایمان لانے والے ہیں۔ ایسے لوگ ہمارے محبوب بندے ہیں، ہم عنقریب ان کو اتنا بڑا ثواب دیں گے جو ان کے خیال و گمان سے باہر ہے۔ آپ پر ایمان لانے کا علیحدہ ثواب، ان نبیوں پر ایمان لانے کا علیحدہ ثواب پھر اللہ تعالیٰ اور قیامت پر آپ کی معرفت ایمان لانے کا علیحدہ ثواب، نمازیں

قائم کرنے، زکوٰۃ دینے کا علیحدہ ثواب، پھر نمازوں میں وضو کرنے، جماعت سے نماز ادا کرنے کا علیحدہ، زکوٰۃ دینے میں صدقہ کا علیحدہ ثواب، مسکین وفقیر کی حاجت روائی کا علیحدہ ثواب۔ غرض کہ اتنے ثواب دیں گے جو ان کے خیال میں نہیں آسکتے دنیاوی امراء اپنے نوکروں سے بہت کام کرا کے ایک اجرت دیتے ہیں۔ مگر رب تعالیٰ ایک عمل کی بہت سی اجرتیں دیتا ہے۔ اجرت بھی ایسی جو لینے والے مزدور کی شان کے لائق نہیں بلکہ اس دینے والے کریم کی شان کے شایان ہے۔

خیال رہے: کہ مفسرین نے اس آیت کی نحوی ترکیب کو بہت مشکل قرار دیا ہے۔ کیونکہ **الرّٰسِخُوْنَ، وَالْمُؤْمِنُوْنَ الْمُؤْتُوْنَ** تو رفعی حالت میں ہیں مگر **وَالْمُقِيْمِيْنَ** حالت نصبی یا جری میں ہے اس کی وجہ کیا ہے ہم بحوالہ تفسیر خازن و کبیر اس کی دو وجہ بیان کر چکے۔ یہ بھی خیال رہے کہ ان جیسی آیات میں جن میں بعض اہل کتاب کی تعریف فرمائی گئی ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن سلام اور ان کے ساتھی مراد ہوتے ہیں کہ وہ یہود کے بڑے عالم حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کی اولاد تھے۔ پھر حضور ﷺ کے جلیل القدر صحابی ہوئے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** علم اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے خصوصاً جب کہ علم دین ہو۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے یہاں علم کا ذکر تمام چیزوں سے پہلے فرمایا۔ ایمان، نماز، زکوٰۃ وغیرہ کا ذکر بعد میں کیا۔ ایمان بھی علم ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جاننا پہلے ہے ماننا بعد میں اور ماننے کا نام ایمان ہے۔ اگر علم کے ساتھ اللہ کا فضل بھی ہو تو معمولی علم بھی ہدایت دے دیتا ہے۔ اگر فضل ربانی شامل حال نہ ہو تو بڑے سے بڑا علم بھی ہدایت نہیں دیتا۔ فرعونی جادوگر علم جادو کے ذریعہ سے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ وہ سمجھ گئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا جادو نہیں معجزہ ہے اور علمائے یہود علم توریت کے باوجود کافر رہے۔ کہ جادوگروں پر فضل تھا یہ فضل سے خالی تھے۔ **دوسرا فائدہ:** علمائے راسخین دوسرے علماء سے افضل ہیں دیکھو یہاں رب تعالیٰ نے راسخین فی العلم کا ذکر فرمایا۔ صرف زبان کا علم کبھی مضر ہوتا ہے مگر جو علم دل و دماغ اعضاء میں سرایت کر جائے وہ مفید ہی ہوتا ہے۔ فرشتے راسخین تھے۔ ابلیس کو علم تھا مگر رسوخ فی العلم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ رسوخ فی العلم عطا فرماوے۔ علمائے راسخین کی تعریف ہم تیسرے پارہ میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ **تیسرا فائدہ:** حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ایمان صرف اس کا نام ہے کہ حضور کی معرفت اور حضور کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ، فرشتوں، نبیوں، قیامت وغیرہ کو مانا جاوے۔ جو کوئی حضور کا انکار کر کے ان تمام کو مان لے وہ مؤمن نہیں۔ دیکھو یہود اللہ تعالیٰ، فرشتوں، نبیوں قیامت وغیرہ سب کو مانتے تھے مگر قرآن کریم نے مؤمن صرف ان کو فرمایا جو حضور پر ایمان لائے۔ باقی تمام کو کافر قرار دیا۔ اب ایمان حضور کی ذات میں منحصر ہے۔ **چوتھا فائدہ:** اگرچہ حضور ﷺ ظہور میں پیچھے ہیں مگر اب ایمان میں سب نبیوں سے پہلے۔ دیکھو رب نے پہلے فرمایا: **بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ** پھر بعد میں فرمایا **وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ**۔ **پانچواں فائدہ:** صرف قرآن کو مان لینے سے ایمان نہیں ملتا۔ حضور ﷺ کے تمام فرمان، تمام احکام، تمام معجزات وغیرہ کو ماننے سے ایمان ملتا ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے بِالْقُرْاٰنِ نہ فرمایا بلکہ

بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فرمایا۔ اس سے منکرین حدیث عبرت پکڑیں بلکہ قرآن مجید پر بھی اس لئے ایمان ہے کہ وہ حضور ﷺ پر نازل ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** حضور ﷺ آخری نبی ہیں قرآن مجید آخری کتاب ہے نہ حضور کے بعد کوئی نبی ہے نہ قرآن مجید کے بعد کوئی کتاب دیکھو۔ یہاں ''مِنۡ قَبۡلِكَ'' کا ذکر تو ہے مگر ''مِنۡ بَعۡدِکَ'' کا ذکر نہیں۔ **آٹھواں فائدہ:** تمام اعمال پر ایمان مقدم ہے بغیر ایمان کوئی عمل مفید نہیں۔ دیکھو رب نے نماز و زکوٰۃ کا ذکر ایمان کے بعد کیا۔ اعمال جڑ ہے۔ ایمان شاخیں اور نماز بمقابلہ زکوٰۃ زیادہ اہم ہے کہ پہلے نماز قائم کرنے کا ذکر ہوا پھر زکوٰۃ کا۔ نماز کی اہمیت اور نماز پڑھنے اور نماز قائم کرنے کا فرق ہم پہلے پارے میں بیان کر چکے ہیں۔ **نواں فائدہ:** نجات کے لئے ایمان ضروری ہے نہ کہ صرف توحید اس لئے رب تعالیٰ نے قرآن مجید میں کسی توحید کا حکم نہیں دیا ایمان کا حکم دیا بلکہ سارے قرآن میں توحید کا نام تک نہ لیا۔ توحید نبوت سے مل کر ایمان بنتی ہے بغیر نبوت طعنان ہے۔ **دسواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ مؤمن متقی کو ایمان تقویٰ بلکہ ایمان کے ہر رکن اور تقویٰ کے ہر عمل کا بہت بڑا ثواب عطا فرمائے گا جو بندوں کے وہم و گمان سے دور ہے۔ دیکھو رب نے دنیا کی نعمتوں کو قلیل فرمایا اور ان کے ثواب کو عظیم کہا۔ **گیارھواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ کوئی مسلمان حضور ﷺ سے بے نیاز نہ ہو ہر وقت ان کا حاجت مند رہے۔ دیکھو اسلام کا پہلا رکن نماز ہے مگر نہ تو اس کی تفصیل قرآن کریم میں ہے نہ زکوٰۃ کی ان دونوں حکموں کو اس قدر مجمل رکھا کہ سبحان اللہ تا کہ اس پہلے مسئلہ میں ہی لوگ حضور کے حاجت مند ہوں۔

خیال رھے: کہ جیسے ہم جسمانی زندگی میں بعض رزق ہر وقت استعمال کرتے ہیں جیسے ہوا، بعض رزق ہر گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد جیسے پانی بعض رزقوں کی ضرورت دن میں دو تین بار ہوتی ہے جیسے غذا بعض چیزیں ہم سال بعد استعمال کرتے ہیں جیسے موسمی پھل بعض چیزیں عمر میں ایک ہی بار استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح روحانی زندگی کے لئے بعض عبادات ہر وقت کی جاتی ہیں جیسے عقائد کی درستگی حتیٰ کہ کلمہ پڑھ کر سوتے ہیں کلمہ پر ہی مرتے اور دفن ہو جاتے ہیں اور کلمہ کا ہی سوال قبر میں ہوتا ہے۔ نماز دن میں پانچ بار زکوٰۃ، روزہ سال میں ایک بار۔ حج، عمر میں ایک بار اور جہاد کبھی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ اسی لئے یہاں نماز کے لئے اَلۡمُقِیۡمِیۡنَ ارشاد ہوا اور زکوٰۃ کے لئے اَلۡمُؤۡتُوۡنَ فرمایا گیا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: راسخین فی العلم میں منھم کی قید کیوں لگائی گئی یعنی یہود میں سے مضبوط عالم۔ کیا دوسرے عالموں کو ثواب نہیں ملتا۔ **جواب:** اس لئے کہ جو عالم یہود مسلمان ہو جاوے اسے ڈبل ثواب ملتا ہے اول اپنے رسول پر ایمان لانے کا پھر حضور ﷺ پر ایمان لانے کا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے یہاں یہ قید زیادتی ثواب کے لئے ہے نہ کہ اصل ثواب کے لئے۔

دوسرا اعتراض: یہاں ایمان بالکتاب کو پہلے بیان فرمایا اور اللہ تعالیٰ و قیامت پر ایمان کا ذکر بعد میں ہوا حالانکہ اللہ و قیامت پر ایمان پہلے ہے۔ نبی و کتاب پر ایمان بعد میں پھر ترتیب ذکری الٹی کیوں ہے؟ **جواب:** اس کی حکمتیں ہم تفسیر

میں عرض کر چکے کہ یا تو ایمان باللہ کی اہمیت فرمانے کے لئے اس کا ذکر خصوصیت سے بعد میں کر دیا گیا ورنہ کتاب اللہ پر ایمان لانے کے لئے اللہ پر ایمان لانا بھی داخل ہے۔ یا اس لئے کہ ایمان باللہ وہ ہی معتبر ہے جو نبی کی معرفت سے حاصل ہو۔ نماز پر وضو مقدم ہے۔

تیسرا اعتراض: تمہاری ایک تفسیر سے معلوم ہوا کہ **وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ** اَمْدَحُ فعل کا مفعول ہے اور یہ جملہ معترضہ ہے حالانکہ ایک جملہ کے اجزاء کے درمیان ایسی عبارت نہیں آتی۔ یہاں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان یہ جملہ آ رہا ہے یہ ترکیب نحوی کے خلاف ہے۔ **جواب:** اس کا نہایت نفیس جواب تفسیر خازن نے دیا ہے کہ یہ قاعدہ غلط ہے ایک جملہ کے اجزاء کے درمیان میں بھی ایسا جملہ معترضہ آ سکتا ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے دو شعر پیش کیے۔

لَا یَبْعُدَنَّ قَوْمِی الَّذِیْنَ هُمْ سَمُّ الْعَدَاةِ وَاٰفَةُ الْجَزَرِ

اَلنَّازِلِیْنَ بِکُلِّ مُعْتَرِکٍ وَالطَّیِّبُوْنَ مَعَاقِدِ الْاُزُرِ

دیکھو اَلنَّازِلِیْنَ مفعول ہے اُذْکُرْ فعل پوشیدہ کا اور یہ جملہ **سَمُّ الْعَدَاةِ** اور **طَیِّبُوْنَ** کے درمیان ہے جو کہ معطوف علیہ و معطوف ہیں۔ تفسیر کبیر نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا ہے کہ **الرّٰسِخُوْنَ** مبتدا ہے اور **یُؤْمِنُوْنَ** اس کی خبر لہٰذا جملہ پورا ہو چکا اور یہ جملہ معترضہ کلام پورا ہو چکنے کے بعد ہے لہٰذا اس پر کوئی اعتراض نہیں اور **وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ** سے دوسرا جملہ ہے۔ جس میں **اَلْمُؤْتُوْنَ** مبتدا ہے۔ اور **اُولٰٓئِکَ سَنُؤْتِیْهِمْ** الخ اس کی خبر بہر حال آیت پر کوئی اعتراض نہیں۔ **چوتھا اعتراض:** عربی میں **اُولٰٓئِکَ** دور والی چیز کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے۔ رب تعالیٰ سب سے قریب اس سے کوئی چیز دور نہیں پھر دور کا اشارہ کیوں ارشاد ہوا؟ **جواب:** یہاں اشارہ بعید مکانی دوری کے لئے نہیں بلکہ رتبہ و درجہ کے لئے دوری کے لئے ہے۔ وہ بھی مخاطبین کے لحاظ سے۔ یعنی وہ شاندار جماعت جن کے مراتب و درجات تمہارے وہم و گمان سے وراء ہیں ان کی یہ شان ہے۔ یہ حضرات اگرچہ جسماً ہمارے ساتھ رہتے ہیں مگر ان کے درجے و مراتب ہم سے بہت بلند و بالا ہیں۔ اس دوری کا ظہور جنت میں ہوگا کہ اعلیٰ درجہ والے اعلیٰ علیین میں جب سیر کو نکلا کریں گے تو دوسرے جنتی ان کو ایسے دیکھیں گے جیسے آج زمین والے ثریا تارے کو دیکھتے ہیں **اُولٰٓئِکَ** کا ظہور وہاں ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ

علماء تین قسم کے ہیں۔ احکام الٰہی کے علماء۔ ذات و صفات الٰہی کے علماء۔ ذات و صفات و احکام الٰہی ان سب کے علماء۔ تیسری قسم کے علماء وہ ہی راسخین و عاملین ہیں۔ اکابر علماء انہی کو کہا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ علماء کے پاس بیٹھو، حکماء کے ساتھ رہو اور کبراء کی موافقت و اتباع کرو۔ اس حدیث میں انہی تین قسموں کی طرف اشارہ ہے۔ اس آیت کریمہ میں راسخین سے مراد یہ ہی تیسری قسم کے علماء ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا وغیرہ اعمال صالحہ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ حضرات عالمین بھی ہیں عاملین بھی (تفسیر کبیر) چونکہ نماز سارے اعمال میں افضل ہے کہ یہ انسان کو ایسا سیدھا کر دیتی ہے جیسے ٹیڑھے بانس کو معمولی آگ نیز یہ بدنی عبادت ہے اسی لئے اسے

پہلے بیان فرمایا۔ اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ بدن مال سے افضل ہے اس لئے زکوٰۃ کا ذکر بعد میں فرمایا (روح البیان) علمائے راسخین علمائے ربانیین ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی زبان الٰہی ہے، دل عرش ہے اور روح ملکوتی ہے جن کی ہر سانس قرآن وسنت کے ترازو میں تل کر نکلتی ہے، جن کے بیان درحقیقت عیاں ہوتے ہیں ان کے نفوس نعمت الٰہی ہیں (عرائس البیان) جن کا ایک قدم علم میں دوسرا قدم عمل میں مضبوط، ایسے علماء عالمین بہت بڑے اجر وثواب کے مستحق ہیں۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّـۧنَ

یقیناً ہم نے وحی کی طرف آپ کے جس طرح کہ وحی کی ہم نے طرف نوح کے اور نبیوں کے

بے شک اے محبوب ہم نے وحی تمہاری طرف وحی بھیجی جیسے نوح اور اس کے بعد کے

مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ

بعد ان کے اور وحی کی ہم نے طرف ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق

پیغمبروں کو بھیجی اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق

وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ

اور یعقوب اور اولاد ان کے اور طرف عیسیٰ کے اور ایوب کے اور یونس کے اور ہارون کے

اور یعقوب اور ان کے بیٹوں اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون

وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿١٦٣﴾

اور سلیمان کے اور عطا کی ہم نے داؤد کو زبور

اور سلیمان کو وحی کی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کا یہ مطالبہ ذکر ہوا کہ آپ سارا قرآن مجید یک دم لائیں ورنہ ہم ایمان نہ لائیں گے۔ پھر ارشاد ہوا کہ ان کا یہ مطالبہ محض عناد کے طور پر ہے اس عناد کے ثبوت میں ان کے چند واقعات اور مطالبات ذکر فرمائے کہ انہوں نے فلاں فلاں وقت فلاں نبی سے یہ مطالبے کیے تھے۔ اب اس آیت میں ان کے اس مطالبہ کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کہ ان بارہ حضرات کو یہود نبی مانتے ہیں حالانکہ ان میں سے کسی کو آسمانی کتاب یک دم نہ ملی، کسی نبی کو تو کتاب ملی ہی نہیں اور کسی کو ملی مگر آہستگی سے۔ بتاؤ جب وہ حضرات نبی ہیں حالانکہ انہیں یک دم کتاب نہ ملی تو ان محبوب ﷺ سے تم یہ مطالبہ کیوں کرتے ہو؟ خلاصہ یہ ہے کہ اولاً یہود کا مطالبہ بیان ہوا پھر ان کے مطالبے کی نوعیت کہ یہ مطالبہ محض عناداً ہے۔ پھر اس کا ثبوت اب اس مطالبہ کا

جواب غرض کہ نہایت نفیس ترتیب ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا کہ مؤمن اہل کتاب سارے نبیوں اور ان کی کتابوں، صحیفوں، احکام پر ایمان لاتے ہیں اب اس آیت میں ان نبیوں کتابوں کی کچھ تفصیل بیان ہو رہی ہے گویا پچھلی آیت میں اجمال تھا اس آیت میں تفصیل ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مؤمن کی شان یہ بیان کی گئی تھی کہ مومن وہ ہے جو آپ پر اور تمام نبیوں پر یکساں ایمان لائے کہ کسی نبی میں نفس ایمان میں فرق نہ کرے۔ اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ وحی الٰہی تمام نبیوں پر یکساں آئی، کوئی نبی بغیر وحی نہ ہوئے۔ جب وحی و نبوت میں سب حضرات یکساں ہیں تو چاہیے کہ ان پر ایمان بھی یکساں لایا جائے۔ گویا پہلے ایک حکم تھا۔ اب اس حکم کی وجہ بیان ہو رہی ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں اشارۃً اللہ تعالیٰ اور تمام نبیوں پر ایمان لانے کا حکم تھا اب فرمایا جا رہا ہے کہ ہم وحی دینے والے یہ حضرات وحی لینے والے۔ مؤمن وہ جو وحی دینے والے رب کو بھی مانے اور وحی لینے والے سارے نبیوں کو بھی۔ گویا پچھلی آیت میں ایمان کا حکم تھا اب وجہ ایمان اور ذریعہ ایمان کا ذکر ہے۔ کہ جو ہم کو اس طرح مانے کہ ہم آسمان و زمین وغیرہ کے خالق، مالک، رازق ہیں۔ نبوت کی معرفت نہ مانے وہ موحد ہے مگر مؤمن نہیں۔ مؤمن وہ ہے جو ہم کو اس طرح مانے کہ ہم نبیوں پر وحی بھیجنے والے ہیں اور حضرات انبیاء وحی کے منتہیٰ۔

شان نزول

حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ علمائے یہود میں سے دو راہبوں نے جن کا نام سکین اور عدی بن زید تھا۔ حضور ﷺ کی بارگاہ عالی میں عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے جناب موسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی بشر کو نبوت نہ دی نہ وحی بھیجی۔ آپ بھی تو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہی ہیں تو آپ نبی کیسے ہو گئے؟ ان کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خازن، تفسیر صاوی وغیرہ)

تفسیر

اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ، چونکہ حضور ﷺ کی نبوت کے یہود، عیسائی، مشرکین اور بہت سے کفار انکاری تھے اس لئے رب تعالیٰ نے آپ پر وحی آنے کو اِنَّاۤ تحقیق سے شروع فرمایا۔ نیز حضور کی نبوت بہت ہی اہم ہے کہ اب حضور ہی کی نبوت پر ایمان کا دار و مدار ہے۔ اس اہمیت کو ظاہر فرمانے کے لئے اِنَّاۤ ارشاد ہوا بہر حال اِنَّاۤ یا تو منکرین کے انکار کی وجہ سے ہے یا مضمون کی اہمیت کے اظہار کے لئے ہے۔ **اَوْحَیْنَاۤ** بنا ہے **وَحْیٌ** سے **وَحْیٌ** کے لغوی معنی ہیں خفیہ اطلاع جس میں اشارہ، الہام وغیرہ سب داخل ہیں۔ رب فرماتا ہے: **فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا** (مریم:۱۱) یہاں وحی بمعنی اشارہ ہے اور فرماتا ہے: **وَ اِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ** (مائدہ:۱۱۱) اور فرمایا ہے: **وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ** (نحل:۶۸) اور فرماتا ہے: **وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى** (قصص:۷) ان تمام آیتوں میں وحی سے مراد دل میں ڈالنا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں جو پیغام الٰہی بذریعہ فرشتہ کسی بندے پر نازل ہو وہ وحی ہے بشرطیکہ وہ بندہ تبلیغ پر مامور ہو لہٰذا حضرت جبرئیل علیہ السلام کا جناب مریم سے کلام فرمانا شرعی وحی نہیں۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام سے رب تعالیٰ نے جو طور پر بلا واسطہ کلام فرمایا اسے کلام الٰہی کہا وحی الٰہی نہ کہا۔ فرمایا: **وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِیْمًا** (النساء:۱۶۴) کیونکہ وہ بغیر

واسطہ فرشتہ تھا لہٰذا وحی حدہ ہوا یہ ذکر وحی جلی کا ہے۔ وحی خفی بہت عام ہے حتیٰ کہ پیغمبر کی خواب ان کا الہام بلکہ ہمارے حضور کا ہر کلام وحی ہے۔ وحی خفی معراج کی رات قاب قوسین کے موقعہ پر جو بے حجابانہ بغیر واسطہ کلام اپنے محبوب سے فرمایا اسے وحی کہا فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِہٖ مَاۤ اَوْحٰی (نجم: ۱۰) یہاں صیغہ جمع متکلم فرمانے میں بھی وحی الٰہی کی اہمیت کا اظہار ہے جیسے اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (قدر: ۱) وحی کی پوری تحقیق اور وحی کے اقسام جلی وخفی وغیرہ پہلے پارہ میں بیان ہو چکے۔ اِلَیْکَ سے معلوم ہوا کہ وحی کی ابتداء رب تعالیٰ سے ہوتی ہے اور انتہا نبی پر نہ تو حضرت جبرئیل وحی کے منتہیٰ ہیں اور نہ ہم امت والے۔ اس انتہا سے شریعت وطریقت کے بڑے نفیس مسائل حل ہو سکتے ہیں کَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِہٖ نوح علیہ السلام کا نام شریف یشکر تھا اور لقب نوح کیونکہ آپ خوف خدا سے بہت نوحہ یعنی گریہ وزاری کرتے تھے۔ آپ کے تاریخی حالات پہلے پارے میں بیان ہو چکے۔ چونکہ نوح علیہ السلام پہلے صاحب شریعت نبی ہیں اور مشرکین کو کفار کو پہلے ڈرانے والے پیغمبر ہیں آپ ہی پہلے نبی ہیں جن کی بددعا سے کفار پر عذاب آیا آپ دوسرے ابوالبشر ہیں کہ تمام مابعد کے لوگ آپ کی اولاد ہیں آپ کی عمر پندرہ سو سال اور تبلیغ قریباً ایک ہزار سال ہوئی یعنی ساڑھے نو سو برس مگر نہ آپ کے بال سفید ہوئے نہ کوئی دانت گرا، آپ نے ہی اپنی قوم کی تکالیف پر بہت ہی صبر فرمایا کہ دن ورات خفیہ واعلانیہ تبلیغ فرماتے تھے، کبھی آپ قوم کی ایذا سے بیہوش ہو جاتے تو ہوش آتے ہی پھر تبلیغ فرماتے۔ قیامت میں حضور ﷺ کے بعد آپ ہی کی قبر پہلے کھلے گی وغیرہ ان وجوہ سے آپ کا ذکر پہلے کیا گیا۔ آپ پہلے اولوالعزم رسول ہیں علیہ الصلوٰۃ والسلام (خازن، روح کبیر، صاوی وغیرہ) آپ کی اتنی دراز عمر اور اتنی عمر میں دانت نہ گرنا، بال سفید نہ ہونا، کسی قسم کا ضعف نہ آنا آپ کا جسمانی معجزہ ہے (سراج منیر) آپ سے پہلے حضرت آدم، شیث، ادریس علیہم السلام نبی گزرے وَّالنَّبِیّٖنَ میں تمام انبیاء کرام کا اجمالی ذکر فرما دیا گیا۔ مِنْۢ بَعْدِہٖ اس لئے فرمایا کہ احکام شرعیہ کی وحی آپ سے شروع ہوئی اور آپ کے بعد والے رسولوں کو ہوئی یہ مطلب نہیں کہ آپ سے پہلے نبیوں پر وحی نہ آتی تھی کیونکہ وحی نبوت کے لئے ضروری ہے۔ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ اگرچہ یہ حضرات بھی وَّالنَّبِیّٖنَ میں داخل تھے مگر چونکہ جماعت انبیاء میں یہ حضرات خصوصی صفات اور بہت شانوں کے مالک ہیں اس لئے ان کے نام پاک خصوصیت سے لئے گئے۔ حضرت ابراہیم ابوالانبیاء ہیں کہ سوا سات نبیوں کے تمام نبی آپ کی اولاد میں ہیں۔ حضرت آدم، شیث، ادریس، نوح، صالح، ہود، لوط علیہم السلام تو آپ کی اولاد میں نہیں باقی سب آپ کی اولاد ہیں۔ کعبہ، منیٰ، صفا مروہ آپ کی ہی یادگاریں ہیں۔ اسلام میں آپ کی سنتوں کو باقی رکھا گیا۔ تمام دینوں میں آپ کا ادب واحترام ہے۔ ابراہیم کے معنی ہے مہربان باپ (اب رحیم) اسمٰعیل علیہ السلام آپ کے بڑے فرزند ہیں، آپ حضور انور ﷺ کے جد امجد ہیں، آپ کے دم سے مکہ معظمہ بلکہ عرب آباد ہوا۔ اسمٰعیل کے معنی ہیں اِسْمَعْ یَا اِیْل اے خدا میری سن لے! چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے برسوں آپ کی ولادت کی دعائیں کی تھیں اور ہر دعا کے بعد عرض کرتے اسمع یا ایل اس لئے آپ کا نام اسمٰعیل ہوا۔ اسحاق علیہ السلام تمام بنی اسرائیلی نبیوں کے جد امجد ہیں، یعقوب علیہ السلام کے والد

ماجد ہیں۔ یعقوب کے لفظی معنی ہیں۔ عقب میں آنے والا یعنی پچھلا بیٹا۔ حضرت عیص اور آپ جوڑواں پیدا ہوئے۔ آگے عیص اور پیچھے یعقوب علیہ السلام اس لئے آپ کا نام یعقوب رکھا گیا۔ اسباط جمع ہے سبط کی بمعنی اولاد۔ قرآنی اصطلاح میں یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کو اسباط کہا جاتا ہے جن میں یوسف علیہ السلام بھی داخل ہیں۔ ان تمام ناموں کی تحقیقات، ان بزرگوں کے حالات زندگی ہم پہلے پارہ میں تفصیل سے عرض کر چکے ہیں وہاں مطالعہ فرماؤ۔ اس میں بحث ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے نبی ہوئے یا صرف یوسف علیہ السلام یہ تحقیق بھی پہلے پارہ میں کی جا چکی ہے۔ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام جناب یونس و ہارون وغیرہم انبیاء سے پیچھے ہیں مگر چونکہ بڑی شان والے صاحب کتاب، صاحب معجزات، روح اللہ، کلمۃ اللہ ہیں اسی لئے آپ کا نام شریف ان بزرگوں سے پہلے لیا گیا نیز یہاں ذکر ترتیب وجودی کے لحاظ سے نہیں۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان تمام انبیاء کرام کے مزارات پر حاضری دی ہے۔ ان بزرگوں کے جائے وفات جائے دفن وغیرہ کی اگر تفصیل دیکھنی ہو تو ہمارا سفر نامہ ''قبلتین'' کا مطالعہ کرو۔ ان بزرگوں کے ناموں کی تحقیق، تاریخی حالات، نسب نامے وغیرہ پہلے پارہ میں عرض ہو چکے۔ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد ماجد ہیں، آپ کی خوش الحانی آپ کا معجزہ تھی، جب آپ زبور شریف کی تلاوت کرتے تو آپ کے پیچھے علماء ان کے پیچھے عام لوگ ان کے پیچھے جنات ان کے پیچھے پرندے چرندے...... جانور جمع ہو جاتے۔ پرندے آپ پر سایہ کر لیتے تھے (روح البیان، خازن، وغیرہ) زبور بروزن مفعول بمعنی اسم مفعول ہے۔ جیسے رسول، رکوب اور حلوب یہ زبر بمعنی کتابت سے بنا ہے۔ یعنی لکھی ہوئی کتاب اس میں ڈیڑھ سو سورتیں تھیں جن میں احکام شرعیہ بہت تھوڑے تھے۔ حکمت وعظ حمد الٰہی وغیرہ زیادہ تھیں۔ ان بزرگوں کے زمانوں کی ترتیب یہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام پھر حضرت اسحٰق پھر حضرت یعقوب پھر حضرت یوسف پھر شعیب ابن نویب پھر ہود ابن عبداللہ پھر صالح ابن آصف پھر حضرت موسیٰ و ہارون ابن عمران پھر ایوب پھر خضر پھر داؤد ابن الینا پھر سلیمان ابن داؤد پھر یونس ابن متی پھر الیاس پھر ذوالکفل علیہم السلام (صاوی) تفسیر صاوی نے فرمایا کہ عرب میں کل پانچ نبی تشریف لائے۔ ہود و صالح، اسمٰعیل، شعیب، محمد مصطفےٰ ﷺ اجمعین۔ شاید عرب سے مراد زمین عرب ہو ورنہ حضرت صالح علیہ السلام کے زمانہ میں عرب آباد ہی نہ ہوا تھا۔ عرب تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ سے آباد ہوا۔ واللہ اعلم اور عرب میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ہمارے حضور تک کوئی نبی نہ تشریف لائے۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ جو یہود آپ کی نبوت پر اس لئے اعتراض کرتے ہیں کہ آپ پر قرآن کریم یک دم کیوں نہ آیا یا جو کہتے ہیں کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں وہ بڑے جھوٹے ہیں۔ ہم نے آپ پر ویسی ہی وحی فرمائی ہے جیسے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد والے نبیوں پر وحی فرمائی تھی۔ چنانچہ ہم نے۔ حضرت ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب ان کی اولاد عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون، سلیمان علیہم السلام پر وحی کی تھی۔ کہ ان میں سے اکثر

انبیاء کرام کے پاس کتاب تھی ہی نہیں نہ یک دم آئی نہ آہستہ۔ داؤد علیہ السلام کو زبور دی مگر آہستہ پھر یہ لوگ ان سب کو نبی کیوں مانتے ہیں، اگر نبوت کے لئے کتاب الٰہی یک دم اترنا شرط ہے تو ان حضرات کی نبوت کیسے ثابت کریں گے؟

خیال رھے: کہ الوہیت، نبوت، ولایت ان سب کا ماننا اسلام میں ضروری ہے مگر ان تینوں میں نبوت پر زیادہ زور ہے۔ اللہ تعالیٰ نبوت کو ہر قسم کے شبہات سے صاف فرماتا ہے۔ اس لئے نبی پر معجزات ظاہر ہوتے ہیں کہ نبوت سے شبہ دور ہو۔ مدعی الوہیت کے ہاتھ پر عجائب اور کرشمے ظاہر ہو سکتے ہیں۔ مگر مدعی نبوت یعنی جھوٹے نبی کے ہاتھ پر کوئی کرشمہ جو نبوت کی تائید کرے ہرگز ظاہر نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ جادوگر دعویٰ نبوت کر کے جادو سے عجائب نہیں دکھا سکتا۔ دجال دعویٰ الوہیت کرے گا اور بہت عجائب دکھائے گا کیوں کہ الوہیت کبھی مشتبہ نہیں ہو سکتی بندے کا کھانا پینا، سونا جاگنا بندگی کی دلیل ہے لیکن نبی بندے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی دعویٰ نبوت کر کے جادو سے نبوت ثابت کرے تو نبوت مشتبہ ہو جاوے گی۔ اس لئے یہاں اِنَّآ حرف تحقیق فرمایا گیا۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ہر نبی پر وحی الٰہی ہونا ضروری ہے کوئی نبی بغیر وحی نہیں ہو سکتے جیسا کہ اَوْحَیْنَآ کے بعد النَّبِیّٖنَ فرمانے سے معلوم ہوا۔ ہاں ہر نبی کے لئے کتاب آسمانی ہونا ضروری نہیں۔ دیکھو حضرات انبیاء کرام ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں مگر کتابیں کل چار ہیں اور صحیفے ایک سو دس۔ **دوسرا فائدہ:** گروہ انبیاء میں حضرت نوح علیہ السلام بڑی شان والے نبی ہیں۔ آپ کے خصوصی فضائل ابھی تفسیر میں بیان کیے گئے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ان کے نام سے اس سلسلہ کو شروع فرمایا۔ **تیسرا فائدہ:** بعض علماء نے یوسف علیہ السلام کے سارے بھائیوں کو نبی مانا ہے وہ اس آیت سے دلیل لیتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے اسباط کو سلسلہ انبیاء میں ذکر فرمایا ہے اور ان پر وحی فرمانے کا تذکرہ کیا اور اسباط یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا لقب ہے۔ جو علماء ان کی نبوت کے انکاری ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ان صاحبوں کی اولاد میں نبی گزرے ہیں۔ اسباط سے مراد بارہ قبیلے اور بارہ خاندان ہیں۔ تفسیر صاوی نے فرمایا کہ ترجیح اسے ہے کہ وہ حضرات نبی ہیں مگر صاحب شریعت نبی نہیں واللہ اعلم۔ یوسف علیہ السلام نے ان صاحبوں کو خواب میں تاروں کی شکل میں دیکھا تھا۔ تارے نبی کے صحابی ہوتے ہیں۔ حضور فرماتے ہیں اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ۔ **چوتھا فائدہ:** یہ بارہ حضرات انبیاء عظیم الشان نبی ہیں مگر رب تعالیٰ نے خصوصیت سے ان کا ذکر علیحدہ فرمایا اگرچہ النَّبِیّٖنَ میں یہ بھی داخل تھے۔ علیحدہ ذکر فرمانا ان کی عظمت و شان کی دلیل ہے۔ **پانچواں فائدہ:** حضرت سلیمان علیہ السلام نبی ہیں کہ رب تعالیٰ نے انہیں سلسلہ انبیاء میں بیان فرمایا اور ان پر وحی نازل ہوئی جو کوئی ان کی نبوت کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ **چھٹا فائدہ:** حضرت داؤد علیہ السلام پر زبور شریف یک دم نہ آئی بلکہ آہستگی سے آئی جیسا کہ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا سے معلوم ہوا کیونکہ یہود کو عطاء زبور سے الزام دیا جا رہا ہے کہ اگر تم حضور ﷺ کی نبوت کا اس لئے انکار کرتے ہو کہ آپ پر قرآن مجید آہستگی سے اترتا ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق کیا کہو گے؟ ان پر بھی زبور

شریف آہستہ آئی تھی۔ **ساتواں فائدہ:** علم تاریخ اچھا علم ہے۔ خصوصاً حضرات انبیاء کرام کی تاریخ تو بہت ہی اعلیٰ ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ان حضرات کے تاریخی حالات سے یہود کو الزام دیا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب نوح علیہ السلام سے پہلے بھی چند نبی گزرے جیسے آدم علیہ السلام، شیث علیہ السلام، ادریس علیہ السلام تو یہاں رب تعالیٰ نے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد والے نبیوں کا ہی ذکر کیوں فرمایا کیا پہلے والے نبی نہیں؟ **جواب:** اس لئے کہ ان حضرات کی وحی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی سے بہت مناسبت ہے کہ احکام شرعیہ اور تبلیغ اسلام کی وحی ان سے پہلے نہ تھی حضرت نوح سے شروع ہوئی۔ آپ سے پہلے ذکر الٰہی اور عبادت کی ہی وحی تھی اس تشبیہ کی وجہ سے خصوصیت سے بعد والوں کا ذکر فرمایا جیسا کہ لفظ **کَمَآ** سے ظاہر ہے۔

دوسرا اعتراض: اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیوں نہیں۔ آپ بھی تو بڑے صاحب شان نبی ہیں۔
جواب: اس لئے کہ یہود آپ کی ذات کو لے کر تو حضور کی نبوت کا انکار کرتے تھے کہ توریت تو یکدم آئی اور قرآن مجید آہستہ آہستہ آیا۔ اگر آپ نبی ہیں تو توریت کی طرح آپ پر قرآن کریم یک دم کیوں نہ آیا لہٰذا جواب کے موقع پر آپ کا نام شریف اور آپ کا تذکرہ مناسب نہ تھا۔

تیسرا اعتراض: حضرات انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں کہ ان سے گناہ ہو سکتے ہی نہیں۔ پھر یوسف علیہ السلام کے بھائی نبی کیسے ہو سکتے ہیں، انہوں نے تو بڑے بڑے گناہ کیے اپنے والد کو جو نبی تھے رلانا، ان کو جھوٹی خبر دینا کہ بھیڑیا کھا گیا، اپنے بھائی یوسف علیہ السلام کو سخت ستانا، انہیں دھوکہ سے فروخت کر کے ان کی قیمت کھانا وغیرہ۔ **جواب:** جو علماء ان کو نبی مانتے ہیں ان کے نزدیک حضرات انبیاء نبوت کی عطا کے بعد معصوم ہوتے ہیں۔ ان حضرات سے یہ گناہ عطاء نبوت سے پہلے ہوئے تھے۔ جن کے نزدیک نبی ہر وقت معصوم ہوتے ہیں نبوت سے پہلے بھی بعد میں بھی وہ ان حضرات کو نبی نہیں مانتے۔

خیال رہے: کہ ان حضرات کی نبوت میں اختلاف ہے۔ باقی یہ حضرات سب کے نزدیک ولی اور صحابی نبی ہیں۔ ان کی معافی ہو چکی نیز یوسف علیہ السلام نے ان کو تاروں کی شکل میں خواب میں دیکھا۔ تارے ہادی بھی ہوتے ہیں اور نور بھی لہٰذا کوئی شخص ان حضرات کو برائی سے یاد نہ کرے۔ اپنی فکر کرو۔ وہ حضرات اللہ کے پیارے ہیں، خبر نہیں کہ ہمارا انجام کیا ہوگا؟ ان حضرات کی اولاد میں نبی ہوئے ہیں اسی لئے **اَوْحَیْنَآ** کے سلسلہ میں **وَالْاَسْبَاطِ** فرمایا گیا بہر حال ان کا احترام ضروری ہے۔ حضرت سارہ و ہاجرہ رضی اللہ عنہما کے لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے ہم سارہ کو برا نہیں کہہ سکتے۔ ان بزرگوں کے جھگڑوں میں رب تعالیٰ کی لاکھوں حکمتیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرام کے اختلافات کی بنا پر ان کی بے ادبی نہیں کر سکتے۔ وہ سب حضرات امت کے ہادی، آسمان نبوت کے ستارے ہیں۔

چوتھا اعتراض: اس آیت کریمہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام جناب ایوب و یونس حتی کہ حضرت ہارون علیہ السلام سے بھی پہلے کیوں لیا گیا آپ تو ان سب سے پیچھے ہیں۔ ہارون علیہ السلام سے تو بہت ہی بعد میں ہیں۔ **جواب:**

اس لئے کہ یہود حضرت عیسیٰ کے بڑے دشمن تھے حتیٰ کہ آپ کے نسب شریف پر بھی طعن کرتے تھے اس لئے رب تعالیٰ نے ان کا نام ان پاک بزرگوں سے پہلے لیا تا کہ ان یہود کی تردید خوب ہو (روح البیان)

پانچواں اعتراض: جب یہود جناب عیسیٰ وسلیمان علیہما السلام کو نبی مانتے ہی نہ تھے تو ان کو ان دونوں بزرگوں کی ذات سے الزام کیسے دیا جا سکتا ہے۔ ان کے نام اسی سلسلہ میں کیوں ارشاد ہوئے؟ **جواب:** حضور ﷺ پر یہ اعتراض یہودیوں اور عیسائیوں دونوں نے کیا تھا۔ عیسائی ان دونوں بزرگوں کو نبی مانتے تھے۔ ان دونوں حضرات کا ذکر ان عیسائیوں کے الزام کے لئے مفید ہے۔ چونکہ یہود اس اعتراض میں پیش پیش تھے، عیسائی ان کی تائید کرتے تھے اسی لئے یہود کی طرف اعتراض منسوب کیا جاتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کا امتحان لیتا ہے اور امتحان میں ان کی تسلی وتشفی کا بھی انتظام فرماتا ہے۔ حضور ﷺ پر یہود کا اعتراض رب تعالیٰ کا امتحان ہے اور ان بزرگوں یعنی انبیائے کرام کے تذکرے، حضور کی تسکین خاطر کا انتظام وہاں نشتر کے ساتھ مرہم بھی ہوتا ہے۔ اللہ کے مقبولین ذکر اللہ ہیں اور ذکر اللہ سے دلوں کا چین ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد: ۲۸) حضور ﷺ تا قیامت دلوں کا چین ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

ان کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آ گئے ہیں سب غم بھلا دیئے ہیں

جیسے عالم جسمانیت میں رب تعالیٰ کے بعض عطیے یکساں ہیں اور بعض فرق سے ہیں۔ دیکھو ظاہری و باطنی اعضاء تمام انسانوں کو یکساں ملے۔ ہر فقیر وسلطان کو دو ہاتھ دو پاؤں ایک دل ایک جگر عطا ہوئے مگر شکل وشباہت، رنگ، بولی میں فرق ہے۔ بولی جداگانہ ہے نیز بیرونی عطیے بعض یکساں ہے بعض میں فرق ہے۔ ہوا، سورج کی روشنی، زمین، پانی یہ عام نعمتیں ہیں مگر دولت، علم، سلطنت وغیرہ خاص نعمتیں ہیں جو کسی کسی کو ملتی ہیں۔ یونہی، نبوت، وحی، تبلیغ یہ وہ عام نعمت ہیں جو ہر نبی کو عطا ہوئی۔ کوئی نبی ان صفات سے خالی نہیں۔ مگر صحیفہ، کتاب، کلیم اللہ ہونا، روح اللہ ہونا وغیرہ یہ خصوصی نعمتیں ہیں جو گروہِ انبیاء میں کسی کسی کو ملیں۔ تو خصوصی نعمت کو ہر نبی میں تلاش کرنا جہالت ہے کہ فلاں نبی پر کتاب نہ آئی یا آہستہ آئی لہٰذا ہم انہیں نہیں مانتے۔ نری جہالت ہے اور عام نعمت میں خصوصیت پیدا کرنا بھی کفر ہے کہ فلاں نبی اصل نبی ہے اور فلاں بروزی یا عارضی نبی یہ کفر ہے۔ نفس نبوت میں سب نبی برابر ان میں کوئی فرق نہیں۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ: ۲۸۵) اور خصوصی صفات میں وہ حضرات مختلف ہیں۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (بقرہ: ۲۵۳) یونہی اللہ نفس ولایت، ایمان، تقویٰ میں سب یکساں ہیں۔ سب اللہ کے مقبول و پیارے ہیں مگر درجات ولایت میں مختلف۔ کوئی جلالی ہے کوئی جمالی کوئی تارک الدنیا ہے کوئی دنیا میں مشغول کوئی سالک کوئی مجذوب جو تمام اولیا اللہ کو یکساں دیکھنا چاہے وہ جاہل ہے۔ حضرات اولیاء مظہر

انبیاء اور حضرات انبیاء مظہر صفات کبریا۔ رب کی صفات مختلف تو حضرات انبیاء کے جلوے مختلف ہیں۔ انہی کے لحاظ سے حضرات اولیاء کے حالات میں فرق ہے۔ یہود مدینہ حضرات انبیاء میں ایک رنگ دیکھنا چاہتے تھے اسی لئے محروم رہے اسی کا اس آیت میں ذکر ہے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا

اور پیغمبروں کو بے شک قصے بیان کئے ہم نے ان کے اوپر تمہارے پہلے سے اور پیغمبروں کو

اور رسولوں کو جن کا ذکر آگے ہم تم سے فرما چکے اور ان رسولوں کو

لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ﴿۱۶۴﴾

کہ نہ قصے بیان کئے ہم نے ان کے اوپر تمہارے اور کلام فرمایا اللہ نے موسیٰ سے پورا کلام

جن کا ذکر تم سے نہ فرمایا اور اللہ نے موسیٰ سے حقیقتاً کلام فرمایا

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ

رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اس لئے کہ نہ ہو واسطے لوگوں کے

رسول خوشخبری دیتے اور ڈر سناتے کہ رسولوں کے بعد اللہ کے یہاں لوگوں

عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

اوپر اللہ کے کوئی دلیل بعد پیغمبروں کے اور ہے اللہ غالب حکمت والا

کو کوئی عذر نہ رہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: پچھلی آیت میں کچھ نبیوں کی فہرست بیان فرما کر فرمایا گیا۔ کہ ہم نے ان سب کو وحی تو دی مگر ان سب کو کتاب یک دم نہ دی جس سے معلوم ہوا کہ نبوت کے لئے نہ یہ ضروری ہے کہ نبی صاحب کتاب ہو نہ یہ ضروری کہ ان پر کتاب الٰہی یک دم آوے۔ اب بتایا جارہا ہے کہ اے محبوب ﷺ ان انبیائے کرام کے علاوہ اور بہت سے نبی ہیں جن کی تفصیل بیان نہ ہوئی۔ وہ سب نبی تھے مگر صاحب کتاب نہ تھے۔ گویا پچھلی آیت میں حضرات انبیاء کی کچھ تفصیل تھی اب تمام حضرات انبیاء کا اجمالی ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق**: پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر توریت یک دم اتری مگر سارے نبیوں پر یک دم کتاب نہ آئی ہر نبی میں یہ وصف ڈھونڈنا غلطی ہے۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے رب تعالیٰ نے بلا واسطہ کلام فرمایا اور نبیوں کو یہ صفت کلیم اللہ ہونے کی نہ ملی جو کوئی ہر نبی میں صفت کلیم الٰہی ڈھونڈے وہ احمق ہے۔ گویا پچھلی آیت میں

کتاب ملنے کا ذکر تھا اب کلام الٰہی بلا واسطہ ہونے کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ ہر نبی کے لئے وحی لازم ہے کتاب لازم نہیں۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ ہر نبی کے لئے بشیر و نذیر ہونا ضروری ہے کہ نبوت کا مقصد بشارت اور نذارت ہے۔ وہ تو ہمارے محبوب میں موجود ہیں کہ حضور تمام جہان کے لئے بشیر و نذیر ہیں لہٰذا یہ سچے رسول ہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ ہم نے نہ تو ہر نبی کو کتاب دی نہ یک دم دی بلکہ بعض کو کتاب دی بعض کو نہ دی اور جن کو کتاب دی ان میں سے کسی کو یک دم دی کسی کو آہستہ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ ہم عزیز یعنی ہر چیز پر قادر تو ہیں مگر حکیم بھی ہیں، ہمارا ہر کام حکمت سے ہوتا ہے۔ بعض کو کتاب نہ دینا بعض کو دینا پھر کسی کو یک دم کتاب عطا فرمانا، کسی کو آہستگی سے، اس میں ہماری حکمت ہے۔ گویا پہلے رب تعالیٰ کے کاموں کا ذکر تھا اب حکمتوں کا۔

شانِ نزول

جب پچھلی آیت ''اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ الخ'' (النساء: ۱۶۸) نازل ہوئی تو یہود مدینہ بولے کہ اس آیت میں اور نبیوں کا ذکر تو ہوا مگر موسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں۔ اسی پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خصوصی ذکر فرمایا گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ بہت سے نبیوں کا ذکر آپ سے نہ کیا گیا تو کسی آیت میں کسی نبی کا ذکر نہ ہونا اعتراض کے قابل نہیں۔ (تفسیر خازن، تفسیر صاوی وغیرہ)

تفسیر

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ، واو یا تو عاطفہ ہے اور رُسُلًا اس فعل کی وجہ سے منسوب ہے جو گزشتہ آیت کے اَوْحَيْنَآ سے معلوم ہوا یعنی اَرْسَلْنَا اور یہ آیت پچھلی آیت پر معطوف ہے۔ اس صورت میں رُسُلٌ موصوف ہے اور قَدْ قَصَصْنٰهُمْ اس کی صفت یعنی ہم نے بہت سے رسول ایسے بھیجے جن کے قصے آپ کو سنا دیئے اور بہت سے رسول ایسے بھیجے جن کے قصے آپ کو نہیں سنائے اور یا واو ابتداعیہ ہے اور رُسُلًا ایک پوشیدہ ''قَصَصْنَا'' سے منصوب ہے۔ جس کی تفسیر اگلا قَصَصْنَا کر رہا ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ مستقل ہے، کسی پر معطوف نہیں۔ یہاں رسول سے مراد نبی ہیں۔ ہم نبی، رسول اور مرسل کا فرق بارہا بیان کر چکے ہیں۔ قَصَصْنَا مراد ہے ان کے حالات زندگی مع ان کے ناموں کے بیان فرمانا جیسے حضرت موسیٰ و عیسیٰ و ابراہیم علیہم السلام وغیرہم، یا ان کے حالات بیان فرمانا بغیر نام لیے جیسے حضرت شمویل، حضرت عزیر علیہما السلام۔

خیال رہے: کہ بعض انبیاء کرام وہ ہیں جن کے نام بھی قرآن مجید میں آئے اور حالات زندگی بھی، بعض وہ ہیں جن کے نہ تو نام قرآن مجید میں آئے نہ حالات زندگی اور بعض وہ ہیں جن کے صرف نام قرآن مجید میں ہیں۔ حالات زندگی کا بالکل ذکر نہیں جیسے حضرت یسع علیہ السلام۔ بعض وہ ہیں جن کے حالات قرآن مجید میں مذکور ہیں، نام نہیں جیسے حضرت حزقیل و شمویل علیہما السلام۔ یہاں نام لینے نہ لینے کا ذکر نہیں، حالات بیان کرنے نہ کرنے کا ذکر ہے۔ مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے اس صورت سے پہلے یا آج کے دن سے پہلے (بیضاوی) وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ یہ عبارت پہلے رُسُلًا پر معطوف ہے۔ اس کی ترکیب میں وہ ہی دو احتمال ہیں جو ابھی ہم نے بیان کیے لَّمْ نَقْصُصْهُمْ سے مراد قرآن کریم میں قصہ و حالات زندگی بیان نہ

کرتا ہے۔ خواہ اس طرح کہ ان کے نام بھی نہ ہوں، قصہ بھی نہ ہو جیسے حضرت دانیال علیہ السلام یا نام تو ہو مگر قصہ نہ ہو جیسے حضرت یسع علیہ السلام۔ **خیال رھے:** کہ اس جملہ میں قرآن میں قصہ بیان فرمانے کی نفی ہے، حضور ﷺ کے علم کی نفی نہیں۔ حضور کو تو تمام نبیوں کا تفصیلی علم دیا گیا۔ سارے نبیوں نے حضور کے پیچھے شب معراج نماز ادا کی۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہاں قرآن مجید میں صراحتہً قصہ بیان کرنے کی نفی ہے، مطلقاً بیان کرنے کی نفی نہیں۔ حضور پر صرف قرآن مجید کی ہی وحی نہیں ہوئی اس کے علاوہ اور بہت وحی ہیں۔ پھر بعض وہ بھی ہیں جن میں حضرت جبرائیل کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ؕ (نجم) دیکھو معراج میں قاب قوسین کے وقت نہ جبرئیل تھے نہ کوئی اور فرشتہ مگر وحی ہوئی۔ بہرحال اس جملہ شریف میں نہ تو حضور کے علم کی نفی ہے۔ نہ مطلقاً قصہ بیان کرنے کی نفی بلکہ قرآن مجید میں قصہ بیان فرمانے کی نفی ہے۔ وہ بھی صراحتہً اجمالی قصے سب کے قرآن کریم میں موجود ہیں۔ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ اسی جملہ شریف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصی صفت کا ذکر ہوا كَلَّمَ بنا ہے تَكْلِيْم سے جس کا مادہ کلمٌ ہے۔ تکلیم سے مراد ہے بغیر واسطہ فرشتہ اللہ کا کلام فرمانا اس طرح کہ رب فرمائے اور موسیٰ علیہ السلام سنیں۔ كَلَّمَ کے معنی ہوئے بار بار کلام فرمایا اور بہت کلام فرمایا۔ حتی کہ تمام نبیوں کی نبوت کی ابتدا وحی سے ہوئی اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی ابتداء کلام سے ہوئی فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰى (طٰہٰ: ۱۱) لفظ اللّٰهُ كَلَّمَ کا فاعل ہے اور مُوْسٰى مفعول بہ تَكْلِيْمًا فرما کر اس مقصد کی تاکید فرما دی تاکہ کوئی شخص اس کے معنی میں اینچ پینچ ہیر پھیر نہ کر سکے۔ **خیال رھے:** کہ معتزلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ کلام الٰہی قدیم ہے، بے آواز ہے، بغیر جہت کے ہے اسی لئے یہ کان اسے نہیں سن سکتے کیونکہ یہ کان آواز اور جہت کے محتاج ہیں۔ وہ لفظ اللہ کو نصب پڑھتے ہیں اور یہ معنی یہ کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے کلام کیا یعنی اپنے دکھ درد سنائے۔ مگر یہ تفسیر نہیں تحریف ہے (تفسیر کبیر)۔ اس زمانہ میں قادیانی فرقہ اس معجزہ کا منکر ہے۔ چنانچہ محمد علی لاہوری قادیانی نے اپنی تفسیر "بیان القرآن" میں لکھا ہے کہ یہ کلام بلاواسطہ نہ تھا بلکہ بواسطہ جبرائیل تھا جیسے عام وحی ہوتی ہے۔ مگر ان عقل مندوں نے اتنا غور نہ کیا کہ پھر حضرت موسیٰ ہی کی کیا خصوصیت ہے ہر آدمی اللہ تعالیٰ سے عرض و معروض کر سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں سے خطاب فرمایا پھر خصوصیت سے موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیوں ہوا؟ **نیز:** پھر تو ہر شخص کلیم اللہ ہو گیا پھر صرف موسیٰ علیہ السلام کا لقب کلیم اللہ کیوں ہو؟ یہ بھی خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اپنی ہم کلامی بخشی مگر موسیٰ علیہ السلام سے کلام حجابانہ ہوا اور ہمارے حضور سے کلام بے حجابانہ ہوا۔ یعنی حضور کو معراج میں اپنا دیدار بھی دیا اور کلام بھی فرمایا جیسا کہ سورۂ نجم شریف میں آئے گا۔ رب تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمانا حق ہے، اس پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ کیفیت کلام کی ہم کو خبر نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کلام قدیم سنا ہر رونگٹے سے سنا۔ ہر طرف سے سنا، بغیر آواز سنا۔ کلام قدیم تھا، سننا حادث تھا۔ جیسے کوئی سورج سے روشنی لے لے تو سورج کی روشنی پہلے سے ہی ہے۔ اس کا روشنی لینا اب ہے یوں ہی حضور کا رب کو دیکھنا اس پر ایمان ہے مگر دیکھنے کی نوعیت ہمارے خیال سے

ورا ہے۔ شعر

فرق اتنا ہے کلام طور اور معراج میں
ان سے پردہ تھا خدا کا آپ سے پردہ نہ تھا

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ یہاں رُسُلًا یا تو پہلے رُسُل کا بدل ہے یا اَوْحَیْنَا اِلَیْهِمْ پوشیدہ فعل سے منصوب ہے۔ اس لئے کہ حال ہے یا اَرْسَلْنَا فعل پوشیدہ کا مفعول بہ (تفسیر کبیر) مُبَشِّرِیْنَ اور مُنْذِرِیْنَ کا رُسُلًا کا حال پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بشارت بنا ہے بشرۃ سے بمعنی ظاہری کھال۔ اصطلاح میں بشارت وہ خوشخبری ہے جس سے سننے والے کا چہرہ کھل جائے۔ ظاہری کھال پر اس کا اثر ظاہر ہو جائے۔ اگر بشارت تصدیق کے ساتھ آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں آئندہ نبی کی آمد کی خوشخبری دینا اور اگر نذارت کے ساتھ آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ اطاعت الٰہی پر رحمت الٰہی کی خوشخبری دینا اور نذارت کے معنی ہوتے ہیں رب تعالیٰ کی نافرمانی پر عذاب الٰہی سے ڈرانا۔ چونکہ یہاں نذارت کے ساتھ اس کا ذکر ہے لہٰذا ثواب کی خوشخبری دینا مراد ہے۔ **خیال رہے**: کہ آدم علیہ السلام کسی نبی کے مصدق نہیں بلکہ تمام کے مبشر ہیں۔ کیوں کہ سارے نبی آپ کے بعد ہی ہیں، تمام نبیوں کے مصدق ہی ہیں کیونکہ کوئی نبی آپ کے بعد نہیں۔ سب حضور سے پہلے ہی ہیں اور دوسرے انبیاء مصدق بھی تھے اور آئندہ نبیوں کے مبشر بھی۔ لیکن رحمت الٰہی کی بشارت اور عذاب الٰہی سے ڈرانا سارے نبیوں کا عمل ہے۔ ہر نبی بشیر بھی ہیں، نذیر بھی اسی لئے قرآن کریم میں ہمارے حضور کو بشیراً و نذیراً فرمایا گیا۔ جیسے تمام نبیوں کے لئے وحی لازم ہے ایسے ہی بشارت ونذارت لازم ہے۔ حضرات انبیاء کی رسالت ان کی بشارت ونذارت پر مقدم ہے کہ وہ حضرات پہلے رسول بنتے ہیں پھر بشیر و نذیر۔ اس لئے رسالت کا ذکر پہلے ہوا۔ بشارت ونذارت کا ذکر بعد میں۔ یہ بھی یاد رہے کہ علماء واولیاء بھی بشارتیں دیتے اور ڈراتے ہیں مگر یہ لوگ اس کام کے لئے مبعوث و مامور نہیں ہوتے۔ حضرات انبیائے کرام اس کے لئے مبعوث بھی ہیں مامور بھی۔ لہٰذا عالم وولی نبی نہیں گویا ہر نبی بشیر ونذیر ہے مگر ہر بشیر ونذیر نبی نہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ بشارت زیادہ ہے اور ہمیشہ نذارت یعنی ڈرانا کم ہے اور کبھی کبھی اس لئے مبشر ہیں۔ پہلے ارشاد ہوا مُنْذِرِیْنَ بعد میں اور مُبَشِّرِ ہیں۔ تفعیل سے فرمایا گیا۔ مُنْذِرِیْنَ باب افعال سے غرض کہ اس ترتیب بیانی میں بہت حکمتیں ہیں کیونکہ بشارت میں رب کی رحمت کی امید دلانا ہے اور نذارت میں اس کے عذاب سے ڈرانا۔ چونکہ رب کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے اس لئے بشارت نذارت پر غالب لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ اس عبارت میں انبیاء کرام کے بھیجنے کی حکمت کا ذکر ہے لِلنَّاسِ سے مراد یا تو سارے لوگ ہیں یا کفار پہلے معنی زیادہ ظاہر ہیں۔ عَلَی اللّٰهِ میں عَلٰی مقابلہ کے لئے نہیں اللہ تعالیٰ سے مقابلہ کون کرسکتا ہے بلکہ بمعنی عِنْدَ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ یا اس کی عدالت میں حُجَّةٌ سے مراد معذرت وعذر خواہی ہے، مناظرہ یا غلبہ مراد نہیں۔ کون ہے جو اس احکم الحاکمین سے مناظرہ یا اس پر غلبہ کر سکے۔ بَعْدَ الرُّسُلِ میں یا ارسال پوشیدہ ہے یا تبلیغ یا بشارت ونذارت پوشیدہ الرُّسُل سے سارے نبی مراد ہیں جن کا

ذکر ابھی اجمالاً ہو چکا یعنی ہم نے حضرات انبیائے کرام اس لئے دنیا میں بھیجے کہ ان کی تبلیغ وارسال کے بعد لوگ کل قیامت میں بارگاہِ الٰہی میں یہ عذر نہ کر سکیں کہ مولیٰ اگر ہمارے پاس نبی تشریف لاتے تو ہم پرہیزگار ہو جاتے۔ عادل حاکم کے مجرم کو سزا دینے، اس کے خلاف مقدمہ کا فیصلہ کرنے کی دو شرطیں ہوتی ہیں۔ ایک تو جرم کا ثبوت گواہی وغیرہ سے دوسرے اس کی معذرتوں کی تردید۔ اللہ تعالیٰ قیامت میں مجرموں کے جرموں کا ثبوت، فرشتوں، نامۂ اعمال، زمین و آسمان بلکہ مجرم کے اعضا کی گواہیوں سے دے گا۔ معذرت کی دفع کے لئے حضرات انبیاء کرام کی بعثت ہے۔ اس کا یہاں ذکر ہے **وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا**۔ اس جملہ میں حضرات انبیاء کرام کے مختلف رنگوں میں آنے کی حکمت کا ذکر ہے۔ كَانَ دوام و استمرار کے لئے ہے عزیز بنا ہے عزت سے بمعنی غلبہ حکیم بنا ہے حکمت سے بمعنی مصلحت یعنی ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ غالب ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ اگر چاہتا تو صرف ایک نبی بھیجتا اگر چاہتا تو تمام نبی یکساں بھیجتا مگر وہ حکیم بھی ہے، اس کے مختلف رسولوں کو مختلف شان والا بنا کر بھیجنے میں اس کی لاکھوں حکمتیں ہیں۔ قدرت اور ہے، قانون کچھ اور۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم حضرات انبیاء کرام صرف اتنے ہی نہیں جن کا ذکر ابھی اس آیت میں کیا گیا۔ ان کی تعداد و شمار بہت زیادہ ہے۔ جن میں سے ہم نے بعض کے قصے قرآن مجید میں آپ کو پہلے ہی سنا دیئے ہیں اور بعض کے قصے و حالات زندگی آپ کو قرآن مجید میں نہ سنائے۔ ان تمام کی شان یکساں نہیں۔ بعض پر کتاب آئی بعض پر صحیفے اترے، بعض پر نہ کتاب اتری نہ صحیفے حتیٰ کہ اس جماعت انبیاء میں موسیٰ علیہ السلام وہ شاندار نبی ہیں کہ ان پر وحی بذریعہ فرشتہ ہی نہ آئی بلکہ بارہا رب تعالیٰ نے ان سے بلاواسطہ فرشتہ خوب کلام فرمایا کہ رب نے ان سے کلام کیا۔ انہوں نے بلاواسطہ فرشتہ سنا۔ یہ کلیم اللہی کی صفت ان کے سوا کسی پیغمبر کو نہ دی گئی۔ اب تمام انبیاء کرام کے صفات یکساں ہونے کا مطالبہ کرنا حماقت ہے۔ ان تمام رسولوں کو اسی لئے بھیجا گیا تا کہ وہ حضرات مطیعون کو ثواب کی خوش خبریاں دیں۔ نافرمانوں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں۔ ان حضرات کے بھیجنے میں حکمت یہ ہے کہ اب کوئی شخص قیامت میں بارگاہِ الٰہی میں یہ معذرت نہیں کر سکتا کہ خدا میں تیرے احکام سے بے خبر رہا۔ اس لئے کافر و نافرمان ہوا۔ اگر تو رسول بھیج دیتا تو میں مطیع و فرمانبردار بن جاتا۔ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ غالب بھی ہے جو چاہے کرے مگر حکیم بھی ہے کہ اس کے ہر کام میں مصلحتیں ہوتی ہیں تو ہزارہا انبیاء کرام کو ہدایت خلق کے لئے بھیجنا اور ان کو مختلف شانوں کا مالک کرنا اس میں بہت حکمتیں ہیں۔ تفسیر خازن نے بروایت طبری بہت سی اسنادوں سے بروایت کعب احبار روایت کی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے تمام زبانوں میں کلام فرمایا۔ بجز آپ کی اپنی زبان شریف کے، موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا میرے مولیٰ! میں ان زبانوں کو نہیں سمجھتا۔ تب رب نے آپ کی زبان میں کلام کیا، موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا الٰہی! کیا تیرا کلام یہ ہی ہے؟ رب تعالیٰ نے فرمایا: یہ تو میرے کلام کی جھلک ہے، اگر تم میرا کلام جیسا کہ ہے ویسے ہی پورا پورا سنو تو تم کچھ نہ رہو۔

روایت: تفسیر ابن کثیر نے متعدد اسنادوں سے بروایت حضرت ابوذر روایت کی، فرماتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

عرض کی کہ کل نبی کتنے ہیں؟ فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار، میں نے عرض کیا کہ ان میں رسول کتنے ہیں؟ فرمایا: تین سو تیرہ، میں نے عرض کیا پہلے نبی کون ہیں؟ فرمایا: آدم علیہ السلام۔ اسی روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل کے پہلے نبی موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان کے آخری نبی عیسیٰ علیہ السلام اور تمام نبیوں میں پہلے نبی آدم علیہ السلام ہیں۔ آخری نبی میں۔ اسی حدیث میں ہے کہ میں نے پوچھا کل کتابیں اور صحیفے کتنے آئے؟ فرمایا: ایک سو چار۔ یعنی سو صحیفے چار کتابیں۔ شیث علیہ السلام پر پچاس خنوخ یعنی ادریس علیہ السلام پر تیس، ابراہیم علیہ السلام پر دس، موسیٰ علیہ السلام پر دس صحیفے (تفسیر ابن کثیر)۔ خیال رہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جسمانی غذائیں اس کی حالت کے مطابق عطا فرمائیں۔ اولاً گھٹی پھر ماں کا دودھ پھر نرم غذائیں پھر مستقل غذا روٹی چاول وغیرہ۔ یوں ہی رب نے انسان کی روحانی غذائیں ان کی حالت کے مطابق عطا فرمائیں۔ یعنی نبوتیں پہلے ہر بستی میں نبی ہوتے تھے، ہر وقت ہوتے تھے۔ اب ایک حضور سب کے نبی ہیں۔ چراغ ہر گھر میں پہنچ کر روشنی دیتے ہیں، تارے دور سے نظر تو آتے ہیں مگر ہم کو روشنی نہیں دیتے۔ مگر سورج ایک جگہ رہ کر ہر جگہ روشن شعاعیں دیتا ہے۔ یونہی اور نبی چراغ تھے جو بستیوں میں پہنچ کر فیض دیتے تھے، ہمارے نبی سورج ہیں کہ مدینہ میں رہ کر اپنی شعاعیں نورانی اور روشنی دے رہے ہیں۔ سورج، چاند، تاروں چراغوں کو بجھاتا ہے مگر ذروں کو چمکاتا ہے۔ حضور نے نبوتیں منسوخ فرمادیں، ولایتوں کو چمکا دیا۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** قرآن مجید میں تمام انبیائے کرام کے تفصیلی قصے مذکور نہیں جیسا کہ لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ سے معلوم ہوا بلکہ تمام انبیائے کرام کے نام بھی صراحۃً مذکور نہیں۔ صرف چند حضرات کے نام مذکور ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** حضرات انبیائے کرام کی تعداد مقرر نہ کرنی چاہیے بلکہ سارے نبیوں پر ایمان لانا چاہیے جتنے بھی ہوں کیونکہ قرآن کریم نے یہاں ان کا ذکر شریف اجمالاً ہی فرمایا اور تعداد انبیاء کی کوئی دلیل قطعی نہیں۔ **تیسرا فائدہ:** موسیٰ علیہ السلام بہت شان والے پیغمبر ہیں کہ رب تعالیٰ نے ان کا ذکر خصوصیت سے علیحدہ فرمایا۔ **چوتھا فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بلاواسطہ فرشتہ کلام فرمایا اور بار ہا فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کا کلام حقیقۃً سنا جیسا کہ كَلَّمَ اللّٰهُ سے معلوم ہوا۔ اسی لئے آپ کا لقب کلیم اللہ ہے جو اس کلام کا انکار کرے وہ گمراہ ہے کہ اس آیت کا منکر ہے جیسے معتزلہ اور ہمارے زمانہ کے لاہوری قادیانی، مرزائی۔ **مسئلہ:** بندے سے رب تعالیٰ کے کلام فرمانے کی بہت صورتیں ہیں۔ خواب میں کلام کرنا، الہام کے ذریعے کلام کرنا۔ یہ صورتیں بہت سے بندوں کو نصیب ہو جاتی ہیں۔ بواسطہ فرشتہ بغیر طریقہ وحی کلام کرنا یہ خاص خاص بندوں کو میسر ہوا ہے جیسے جناب مریم اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ۔ بذریعہ فرشتہ وحی کلام کرنا یہ تمام انبیاء کرام کو عطا ہوتا ہے مگر بیداری میں بحالت ہوش اس زمین پر بغیر واسطہ فرشتہ کلام فرمانا یہ صرف موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوا، آپ کے سوا کسی کو یہ نعمت نہ ملی۔ ہمارے حضور سے بلاواسطہ کلام ہوا۔ دیدار کے ساتھ مگر وہ زمین پر نہ تھا، وہ دنیا ہی دوسری تھی۔ **پانچواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیائے کرام کو خصوصی شانیں علیحدہ علیحدہ بخشی ہیں۔ وہ شخص جو تمام نبیوں میں یکساں صفات ڈھونڈے وہ گمراہ ہے۔

دیکھو بغیر والد پیدا ہونا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصی صفت ہے۔ اور بغیر ماں، باپ پیدا ہونا حضرت آدم علیہ السلام کی خصوصی صفت ہے۔ جو کہے کہ نبی وہ چاہیے جو بغیر باپ پیدا ہو وہ بے دین ہے۔ **چھٹا فائدہ:** سارے نبی بشیر و نذیر ہوئے یعنی مطیعوں کو ثواب کی بشارت دینے والے اور نافرمانوں کو عذاب سے ڈرانے والے۔ یہ فائدہ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ سے حاصل ہوا۔ جیسے ہر نبی کے لئے وحی لازم ہے ایسے ہی ان کے لئے بشارت و نذارت ضروری ہے۔ **ساتواں فائدہ:** حضرات انبیائے کرام بشارت پہلے کرتے ہیں احکام بعد میں دیتے ہیں۔ کیونکہ انسان کا دل اعمال کا کارخانہ ہے جہاں اعمال بنتے ہیں اور انسان کا دماغ اعمال کی دوکان ہے جہاں سے اعمال ملتے ہیں۔ اور اعضاء ظاہری وہ جگہ ہے جہاں اعمال استعمال ہوتے ہیں۔ اگر دل میں دنیا سے رغبت، دنیاداروں سے خوف ہو تو یہ دل کفر و معاصی کا کارخانہ بن جاتا ہے اور اگر دل میں خوف خدا عشق مصطفیٰ ہو تو یہ ہی دل، ایمان، تقویٰ، نیک اعمال کا کارخانہ بن جاتا ہے۔ جیسے نور آنے پر تاریکی غائب ہو جاتی ہے ایسے ہی خوف خدا آنے پر دل سے خوف دنیا، محبت دنیا جاتی رہتی ہے۔ جس دل میں رب سے خوف و امید ہو تو بندہ وہ کام کر لیتا ہے جو فرشتوں سے نہ ہو سکیں اور جب اس دل میں محبت دنیا بھر جاتی ہے تو وہ کام کرتا ہے کہ شیطان بھی گھبرا جاوے اس لئے حضرات انبیاء آخرت کی بشارت و نذارت پہلے کرتے ہیں تاکہ دل سے دنیا کی محبت نکل کر آخرت کی محبت پیدا ہو جاوے اور دل نیک اعمال کا کارخانہ بن جاوے۔ جب دل میں برے اعمال بنیں گے ہی نہیں تو اعضاء کو برے اعمال ملیں گے کہاں سے؟ حضرت عثمان سے فرمایا جو چاہو کرو جنت تمہاری ہو گی۔ کیونکہ اس لئے کہ ان کے کارخانہ دل میں برائیوں کے بننے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ چیز بنتی ہے کارخانہ میں، ملتی ہے دوکان سے، استعمال ہوتی ہیں گھروں میں۔ جب کارخانہ چیز بنانا ہی چھوڑ دے تو گھروں میں استعمال کہاں سے ہو؟ جب دل میں برے اعمال بنیں ہی نہیں تو دماغ میں اور اعضا؟ میں کہاں سے آئیں۔ حضرات انبیاء بشارت و نذارت کے ذریعہ امت کے دلوں کو برے اعمال بنانے کے قابل نہیں رکھتے۔ **آٹھواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے مگر قیامت میں اس کے فیصلے، دلائل، علامات، بحث و تمحیص کے بعد ہوں گے۔ بندے کے عذر و معذرت سب کچھ ختم کر کے فیصلے ہوں گے تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ مجھ پر زیادتی ہوئی یہ فائدہ "لِئَلَّا يَكُوْنَ" سے حاصل ہوا۔ **نواں فائدہ:** مسلمان کا ایمان رب تعالیٰ کی قدرت پر بھی چاہیے اور قانون پر بھی قدرت ہے کہ ہر کام خود ہی کر دے بغیر وسیلہ، مگر قانون یہ ہے کہ ہر کام وسیلوں اور ذریعوں سے ہو جیسے رب تعالیٰ پر ایمان ضروری ہے ایسے ہی وسیلوں پر ایمان بھی لازم ہے۔ رب کی عبادت، کرو ماں باپ کی اطاعت کرو کہ رب تعالیٰ ہمارا خالق ہے اور ماں باپ ذریعہ خلق۔ یہ فائدہ عَزِيْزًا حَكِيْمًا سے حاصل ہوا۔ **دسواں فائدہ:** دنیاء انسانیت میں کوئی وقت ایسا نہ گزرا جب کہ کسی نبی کی نبوت نہ ہو، زمانہ یا جگہ نبی سے خالی ہو سکتی ہے نبوت سے خالی نہیں ہو سکتی۔ پہلے انسان نبی ہوئے تاکہ دنیا نبوت سے خالی نہ ہو یہ فائدہ بھی "لِئَلَّا يَكُوْنَ" سے حاصل ہوا۔ خیال رہے کہ زمانہ نبی اور ہے زمانہ نبوت کچھ اور۔ آج حضور کا زمانہ حیات ظاہری نہیں۔ اسی لئے لوگ اب صحابی نہیں بنتے مگر آپ کی نبوت کا زمانہ ہے اسی لئے تمام شرعی احکام

جاری ہیں۔ **گیارھواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ پیغمبر بھیجے بغیر کسی قوم پر عذاب نہیں بھیجتا۔ یہ فائدہ '' لِئَلَّا یَكُوْنَ '' سے حاصل ہوا۔ **بارھواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت نبی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے، محض عقل سے نہیں ورنہ بغیر نبی بھیجے بھی عذاب ہونا چاہیے تھا۔ یہ کہا جاسکتا تھا کہ تم نے ہم کو اپنی عقل سے کیوں نہ پہچان لیا؟

اعتراضات

پہلا اعتراض: اللہ تعالیٰ نے سارے نبیوں کے قصے قرآن مجید میں کیوں بیان نہ فرمائے، کتاب کامل ہے تو یہ کام بھی کامل ہی ہونا چاہیے تھا؟ **جواب:** اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ کا اظہار ہے کہ جن نبیوں کو حضور نے چمکا دیا وہ چمک گئے جن کا ذکر نہ فرمایا ان کے نام ونشان دنیا سے غائب ہو گئے۔ آج حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے نام وکام اس لئے مشہور ہیں کہ انہیں حضور نے مشہور فرما دیا۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کامل کتاب نہیں اور اس میں ہر چیز کا بیان نہیں۔ دیکھو بہت سے پیغمبروں کا اس میں ذکر نہیں دوسری جگہ قرآن کریم فرماتا ہے **وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ** (نحل: ۸۹) لہٰذا آیات میں تعارض موجود ہے۔ **جواب:** یہاں تفصیلی صریحی قصے بیان فرمانے کا ذکر ہے، مطلقاً بیان کا ذکر نہیں۔ قرآن کریم میں ہر چیز کی صریحی تفصیل نہیں۔ بیان اور تفصیل اور صریحی تفصیل میں بڑا فرق ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم کامل نہیں، آپ کو تو سارے انبیاء کرام کی بھی خبر نہیں کہ کتنے ہیں جیسا کہ **لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ** سے معلوم ہوا (دیوبندی) **جواب:** اس آیت کریمہ میں حضور کے علم کی نفی بلکہ قصے بیان کرنے کی نفی ہے۔ علم کے متعلق فرماتا ہے **وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ** (النساء: ۱۱۳) پھر قرآن مجید میں صریحی تفصیلی قصے بیان فرمانے کی نفی ہے مطلقاً قصے کی نفی نہیں۔ دوسری جگہ فرماتا ہے: **وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ** (ہود: ۱۲۰) جس سے معلوم ہوا کہ سارے نبیوں کے قصے رب نے حضور سے بیان فرمائے یعنی قرآن میں تو بعض کے قصے ہیں اور دوسری وحی میں سب کے قصے بیان فرمائے گئے۔ **چوتھا اعتراض:** اگر موسیٰ علیہ السلام سے رب تعالیٰ نے بلا واسطہ فرشتہ کلام فرمایا تو ان کا درجہ حضور سے بڑھ گیا کہ حضور سے کلام ہمیشہ بواسطہ ہی ہوا (مرزائی) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ اس قسم کے خصوصی فضائل دیگر نبیوں کو حاصل ہیں۔ مگر مطلقاً فضیلت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی عطا ہوئی۔ صفت کلیم اللہ ہی خصوصی فضیلت ہے اگر اس قسم کے سوال کیے گئے پھر تو کہا جاسکے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر والد پیدا ہوئے، چوتھے آسمان پر بلا کر رکھے گئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نبیوں کے والد، حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر یعنی تمام انسانوں کے والد ہیں یہ صفات ہمارے حضور میں نہیں تو وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے افضل ہیں۔ نعوذ باللہ۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں کے فضائل ودرجات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع فرما دیئے ہیں اور بہت کچھ زیادہ عطا فرمائے مگر دوسرے رنگ دوسری نوعیت سے، اگر حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر ہیں کہ تمام انسان ان سے پیدا ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوالخلق ہیں کہ سارا عالم حضور کے نور سے بنا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ فرما کر کلمہ پڑھاتے ہیں تو ہمارے حضور نے کنکروں پتھروں سے کلمہ پڑھوالیا۔ اگر موسیٰ علیہ السلام سے رب تعالیٰ نے کلام

فرمایا تو ہمارے حضور سے معراج میں بے حجابانہ کلام فرمایا وغیرہ وغیرہ۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حضرات انبیاء دنیا میں نہ آتے تو لوگ قیامت کے دن عذر کر سکتے تھے تو جو لوگ بچپن میں یا دیوانگی میں فوت ہو گئے یا جنہیں کسی نبی کی تعلیم نہ پہنچی وہ بھی تو یہی عذر کر سکتے ہیں کہ نبی اگرچہ دنیا میں آئے مگر ہم تک ان کی تعلیم نہ پہنچی۔ **جواب:** ایسے لوگوں کو عذاب ہوگا ہی نہیں پھر معذرت کیسی، بچے، دیوانہ جنتی ہیں۔ اور فترت والے لوگوں کی نجات کے لئے عقیدہ توحید کافی ہے، کسی گناہ کی ان پر پکڑ نہیں۔ لہٰذا عذر و معذرت کی ضرورت ہی کیا ہوگی۔

تفسیر صوفیانہ

حضرات انبیاء کرام مظہر صفات الٰہیہ ہیں۔ ہر نبی کسی خاص صفت کا مظہر ہے اور حضور ﷺ مظہر ذات الٰہی ہیں۔ چونکہ صفات الٰہیہ مختلف ہیں اسی لئے حالات انبیاء اور ان کی شانیں جداگانہ ہیں۔ جو کوئی ہر نبی میں ایک ہی صفت ڈھونڈے وہ بے وقوف ہے۔ دیکھو یہود نے حضور ﷺ میں موسوی صفات کا مطالبہ کیا کہ قرآن مجید یک دم آئے۔ توریت کی طرح تو ان کے نہایت شافی جوابات دیئے گئے۔ یونہی حضرات اولیاء اللہ مظہر صفات انبیاء ہیں اور حضور غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ مظہر صفات محمدیہ ہیں ﷺ۔ اسی لئے حضرات اولیاء کے رنگ جداگانہ ہیں کوئی ولی جلالی ہے کوئی جمالی، کوئی تارک الدنیا کوئی سلطان جو شخص ہر ولی میں یکساں صفات تلاش کرے وہ احمق ہے، ان حضرات کے فیوض سے محروم رہے گا۔ جیسے ہر نبی میں وحی، بشارت، نذارت مشترک ہے، باقی صفات جداگانہ۔ اسی طرح ہر ولی میں ایمان، عشق رسول، اتباع سنت، حضور ﷺ کی غلامی مشترک ہے، جو ان چیزوں سے خالی ہے وہ ولی نہیں غالی ہے۔ جب تک انسان کے ہوش و حواس درست ہیں اتباع رسول اس پر لازم ہے۔ ولی میں کرامات تلاش نہ کرو، اتباع رسول تلاش کرو کہ یہی نجات کا ذریعہ ہے۔ دیکھو عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام بالکل تارک الدنیا ہیں حتیٰ کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہیں اپنے لئے گھر بھی نہ بنایا۔ ایک وقت کھا کر دوسرے وقت کے لئے نہ بچایا۔ فرماتے تھے کہ جب رب نے مجھے دوپہر کا کھانا دیا ہے وہ مجھے رات کا کھانا بھی دے گا اور حضرت سلیمان علیہ السلام تمام دنیا کے بادشاہ، تخت و تاج کے مالک مگر یہ دونوں حضرات نبی ہیں، اللہ کے پیارے ہیں۔ جو ان دونوں میں یکساں شان ڈھونڈے وہ بے وقوف ہیں۔ ہاں دونوں بشیر، نذیر، مبلغ اور صاحب وحی ہیں۔ ایسے ہی حضرت ادہم اور ابراہیم ابن ادہم تارک الدنیا فقیر ہوئے۔ غوث پاک امیر کبیر مگر یہ دونوں اللہ کے ولی مقبول ہیں۔ ہاں ایمان، عرفان، اطاعت خدا و رسول اور عشق رسول دونوں بلکہ تمام اولیاء اللہ میں مشترک ہیں۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ کلام بہت قسم کا ہے اور ہر قسم کے کلام کے لئے لوگ بھی علیحدہ ہیں اور جگہ بھی علیحدہ۔ دشمنی سے کلام اور قسم کا ہوتا ہے جس کی جگہ میدان جنگ ہے، دوستوں سے کلام اور قسم کا ہوتا ہے جس کی جگہ ملاقات کی مجلس ہے، عوام سے کلام اور قسم کا ہوتا ہے جس کی جگہ عام مقامات ہیں، بال بچوں سے کلام اور قسم کا ہے جس کی جگہ گھر ہے، صاحب اسرار سے کلام اور قسم کا ہوتا ہے جس کی جگہ مخصوص کوٹھڑی، صاحب اسرار دوست سے کلام اور قسم کا ہوتا ہے جس کی جگہ اسرار کی جگہ۔ موسیٰ علیہ السلام سے کلام دوستانہ تھا جس کی جگہ کوہ طور ہے اور حضور سے کلام محبوبانہ، راز دارانہ ہے جس کی جگہ عرش سے وراء ہے۔

دوستانہ کلام والے کا لقب کلیم اللہ ہے اور راز دارانہ کلام والے کا لقب حبیب اللہ ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے جو کلام فرمایا حضور کو بتا دیا پڑھو سورہ طٰہٰ شریف کا پہلا رکوع مگر جو محبوب سے کلام ہوا وہ کسی کو نہ بتایا گیا فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی (النجم:۱۰) فرما دیا گیا۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ

مگر اللہ گواہی دیتا ہے اس کی جو اتارا اس نے طرف آپ کی اتارا اسے ساتھ علم اپنے کے

لیکن اے محبوب اللہ اس کا گواہ ہے جو اس نے تمہاری طرف اتارا وہ اس نے اپنے علم سے اتارا

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ؕ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ

اور فرشتے گواہی دیتے ہیں اور کافی ہے اللہ گواہ بیشک

اور فرشتے گواہ ہیں اور اللہ کی گواہی کافی ہے وہ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ

وہ لوگ جو کافر ہوئے اور روکا انہوں نے راستہ سے اللہ کے بے شک گمراہ ہوئے وہ

جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا بیشک وہ دور کی گمراہی میں

بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ

گمراہی دور والی بے شک وہ لوگ جو کافر ہوئے اور ظالم ہوئے نہیں ہے کہ اللہ

پڑے جنہوں نے کفر کیا اور حد سے بڑھے اللہ انہیں ہرگز نہیں

لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۙ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ

بخشے ان کو اور نہ یہ کہ ہدایت دے ان کو مگر جہنم کا راستہ کے

بخشے گا اور نہ انہیں کوئی راہ دکھائے مگر راستہ کی دوزخ کے

خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

ہمیشہ رہیں گے اس میں اور ہے یہ اللہ پر آسان

کہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ اللہ کو آسان ہے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کے ان بہانوں کا ذکر فرمایا گیا تھا جن کی بنا پر وہ حضور کی نبوت کا انکار کرتے تھے اور آپ کی حقانیت کی گواہی نہ دیتے تھے۔ اب حضور ﷺ کو تسکین دی جارہی ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کی گواہی نہ دیں تو آپ غم نہ کریں کیوں کہ ہم اور ہمارے فرشتے آپ کی صفات کی گواہی دے رہے ہیں۔ گویا پہلے ظلمانی کفار کے گواہی نہ دینے کا ذکر تھا اور اب اپنی اور اپنی نورانی مخلوق کی گواہی دینے کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت سے دھوکہ ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ تمام نبیوں کے برابر ہیں۔ کیونکہ سب پر وحی یکساں ہے۔ اب اس وہم کو دور کیا جارہا ہے کہ آپ کی شان سب سے اعلیٰ و بالا ہے کہ سارے نبی تو رب تعالیٰ کے گواہ تھے مگر تمہاری شان یہ ہے کہ تم ہمارے گواہ ہو اور ہم اور ہمارے فرشتے تمہارے دائمی گواہ ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں نزول قرآن کا ذکر تھا، اب شان قرآن کا ذکر ہے، یہ علوم الٰہیہ کا حامل ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ و تمام فرشتوں کی گواہی ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کے کافر ہونے کا ذکر تھا اب ان کے کافر گر ہونے کا ذکر ہے۔ کہ ان کا کفر لازم نہیں متعدی ہے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کی نافرمانیوں، سرکشیوں کا ذکر تھا اب ان کی سزا کا ذکر ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نہ بخشے گا، وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

شان نزول

حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک بار یہود کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ اے یہودیو! تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ وہ بولے ہم آپ کو اللہ کا رسول نہ تو جانتے ہیں نہ مانتے ہیں۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی لٰکِنِ اللّٰہُ الخ (تفسیر مدارک وخازن) ایک بار مشرکین عرب نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا کہ ہم نے آپ کے متعلق یہود سے پوچھا ہے وہ کوئی بھی آپ کی نبوت کی گواہی نہیں دیتے نہ ان کی کتابوں میں آپ کا ذکر ہے۔ تب ان کے جواب میں یہ آیت کریمہ آئی (خازن) تفسیر مدارک میں فرمایا کہ جب آیت کریمہ اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ الخ نازل ہوئی تب یہود مدینہ نے کہا یہ غلط ہے آپ پر کوئی وحی کوئی کتاب نہ آئی تب یہ آیت آئی۔

تفسیر

لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْھَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْکَ، عربی زبان میں لکن شروع مضمون میں کبھی نہیں آتا بلکہ گزشتہ مضمون پر جو وہم کیا جاوے اس کے رفع کے لئے آتا ہے اس لئے یہاں پہلے کچھ مضمون ضرور ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہود کا فرآپ کی گواہی نہ دیں تو نہ دیں لیکن اللہ تو گواہی دیتا ہے اگر چہ لکن جزم سے دونوں جملوں فعلیہ اور اسمیہ پر آسکتا ہے مگر یہاں جملہ اسمیہ پر آیا تاکہ ہمیشگی معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس کی گواہی دیتا رہتا ہے اور دیتا رہے گا۔ گواہی تین طرح کی ہوتی ہے۔ زبانی گواہی قلبی گواہی علامات سے گواہی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی نبوت وغیرہ کی گواہی تینوں طرح کی دی۔ حضور انور پر معجزات ظاہر فرمانا آپ کی نبوت کی علامات یقینیہ قائم کر دینا بھی رب تعالیٰ کی گواہی ہے اور توریت و انجیل و قرآن میں آپ کی نبوت کا اعلان فرمانا بھی رب کی گواہی ہے۔ ب تعدیہ کی ہے جو مشہود بہ پر داخل ہوئی اور مَآ اَنْزَلَ سے مراد

یا تو قرآن کریم کی آیات ہیں یا قرآن اور احادیث وغیرہ تمام جلی وخفی وحی۔ دوسرے معنی زیادہ ظاہر ہیں۔ انزل علیك وانزل الیك کے نہایت نفیس فرق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ علیک فرمانے میں بتایا جاتا ہے کہ انزال کا مقصود آپ ہیں اور الیک میں فرمایا جاتا ہے قرآن وغیرہ کا مبدا ہم ہیں اور منتہی اے محبوب! تم ہو وغیرہ۔ **خیال رہے**: کہ اللہ تعالیٰ شاہد یعنی گواہ ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشہود لہ ہیں جن کے حق میں گواہی دی جا رہی ہے۔ قرآن کریم وغیرہ مشہود بہ جس کی گواہی ہے اور کفار مشہود علیہ یعنی اللہ تعالیٰ آپ کے موافق قرآن کریم کی حقانیت کی گواہی دیتا ہے۔ کفار کے مقابلہ میں معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کی ذات وصفات کے گواہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور حضور کی ذات وصفات کا گواہ خود رب تعالیٰ ہے۔ لہٰذا گواہی توحید سنت رسول اللہ ہے اور گواہی رسالت سنت الٰہیہ۔ **اَنۡزَلَهٗ بِعِلۡمِهٖ** یہ جملہ پہلے جملہ **یَشۡهَدُ** الخ کی تفسیر ہے ہ کا مرجع **بِمَاۤ اَنۡزَلَ** کا **مَا** ہے **بِعِلۡمِهٖ** میں ب یا تلبیس کی ہے یا مصاحبت کی یا صلہ کی۔ لہٰذا اس جملہ کے تین معنی ہوئے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علوم غیبیہ اس قرآن میں ودیعت رکھ کر اسے آپ پر اتارا۔ دوسرے یہ کہ قرآن کو آپ پر جان کر اتارا کہ تم کو ہی اسی قرآن جیسی کتاب کے لائق پایا۔ کتاب بے مثال ہے تو اے محبوب! تم بھی بے مثال ہو۔ اس قرآن کے لائق ہو تیسرے یہ کہ قرآن میں وہ احکام اتارے جو اپنے بندے کے لائق ومناسب تھے۔ یعنی اپنے علم کے موافق اسے اتارا (تفسیر خازن) پہلے دو معنی نہایت نفیس ولذیذ ہیں۔ تیسرے معنی تو ہر آسمانی کتب میں پائے جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے ہر زمانہ میں اس وقت کے لائق احکام اتارے۔ خیال رہے کہ جانوروں کو زبان ملی، الفاظ نہ ملے۔ انہیں آواز ملی، کلام نہ ملا مگر انسان کو زبان بھی ملی کلام بھی ملا، آواز ملی الفاظ بھی ملے پھر بعض الفاظ کفر لئے منہ سے نکلتے ہیں، بعض ایمان لئے ہوئے، بعض محبت بھرے ہوتے ہیں، بعض عداوت بھرے، بعض علم سے بھرپور۔ کالج کا پرنسپل اپنے نوکروں سے بھی کلام کرتا ہے، بال بچوں سے بھی اور کالج کے طلباء سے بھی مگر طلباء ایک سال میں ایم اے پاس کر لیتے ہیں، پرنسپل کے بچے اور اس کے نوکر عمر بھر پرنسپل کا کلام سنتے ہیں کچھ نہیں بنتے۔ یہ مثال ہے۔ توریت وانجیل بھی رب کا کلام ہی تھے اور قرآن بھی رب کا کلام ہی ہے۔ مگر توریت وانجیل کے کلام میں احکام تھے۔ قرآن کلام الٰہی ہے، احکام بھی ہے، عرفان بھی محبت وکرم بھی ہے۔ رب تعالیٰ کا خصوصی علم بھی ہے اس لئے ارشاد ہوا: **اَنۡزَلَهٗ بِعِلۡمِهٖ** رب نے قرآن اتارا اپنے علم کے ساتھ اپنا علم لیے ہوئے۔ اس قرآن نے حضور کو **مَا كَانَ وَمَا يَكُوۡنُ** کا عالم بنا دیا **وَالۡمَلٰٓئِكَةُ يَشۡهَدُوۡنَ** یہ جملہ **يَشۡهَدُ** الخ پر معطوف ہے۔ ملائکہ سے مراد سارے فرشتے ہیں مقربین ہوں یا مدبرات امر۔ یہاں بھی **يَشۡهَدُوۡنَ** دوام واستمرار کے لئے ہے۔ اور فرشتوں کی گواہی سے مراد ان کا یہ کلمہ پڑھنا ہے۔ **اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ** لہٰذا **يَشۡهَدُوۡنَ** کا مفعول بہ وہی **مَاۤ اَنۡزَلَ اِلَيۡكَ** ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا مفعول بہ اللہ کی گواہی ہو۔ یعنی میری گواہی پر فرشتے گواہ ہیں۔ اے محبوب! تمہارا گواہ میں ہوں اور میری گواہی کے گواہ سارے فرشتے۔ **خیال رہے**: کہ فرشتوں کی یہ کلمہ خوانی انسان کی پیدائش سے کہیں پہلے کی ہے۔ کیوں کہ فرشتے انسانوں سے لاکھوں سال پہلے پیدا ہو چکے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی گواہی اور فرشتوں کی گواہی میں بہت فرق ہے،

دونوں گواہیوں کی نوعیتوں میں بھی فرق ہے، مقصد میں بھی فرق اس لئے رب تعالیٰ کے لئے یَشْھَدُ الگ کیا گیا، فرشتوں کے لئے یَشْھَدُوْنَ الگ لایا گیا جیسے اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (الزمر: ۳۰) میں حضور کے لئے میت الگ ارشاد ہوا لوگوں کے "میتون" الگ کہ حضور کی موت بمعنی خروج روح عن البدن ہے اور دوسروں کی موت بمعنی ترک روح البدن ایسے ہی یہاں ہے وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اس عبارت میں ربانی گواہی کی اہمیت کا بیان ہے بِاللّٰهِ کی ب زائدہ ہے اور اللہُ کَفٰی کا فاعل ہے۔ شَهِيْدًا لفظ اللہ کا حال مؤکدہ ہے یا تمیز یعنی اللہ کی گواہی کافی ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کافی گواہ ہے۔ اگر دنیا میں کوئی بھی تمہاری نبوت کی گواہی نہ دے تو نہ دے ہم جو اس کے گواہ ہیں۔ شہید اور شاہد یونہی علیم اور عالم کا فرق بارہا بیان ہو چکا ہے کہ شاہد وہ جو گواہی دے، شہید وہ کہ گواہی دینا اس کی عادت کریمہ ہو یا شاہد وہ جو زبان سے گواہی دے، شہید وہ جو اپنے قول، فعل، عمل وغیرہ سے ہر طرح گواہی دے۔ اس لئے راہِ خدا میں قتل ہونے والے کو شہید کہتے ہیں کہ اس کے خون کا ہر قطرہ بھی توحید و رسالت کی گواہی دیتا ہے یا شاہد وہ جو ایک وقت یا ایک جگہ ایک آدھ آدمی کے سامنے گواہی دے، شہید وہ جو ہر جگہ ہر وقت ایک کے سامنے گواہی دے یونہی شاہد وہ جو ایک بات کی گواہی دے شہید وہ جو ہر بات ہر چیز کی گواہی دے۔ مدعی کی ذات صفات اس کے حالات دعویٰ وغیرہ جیسے سب کی گواہی۔ ہمارے حضور اللہ کی ذات و صفات، افعال وغیرہ سب کے گواہ ہیں۔ یونہی اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کا صرف شاہد نہیں بلکہ شہید ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اب تک تو حضور ﷺ کی بے نیازی کا ذکر ہوا کہ آپ اور آپ کی نبوت ان لوگوں کی گواہی پر موقوف نہیں۔ اب ان کفار کی نیازمندی محتاجی کا بیان ہے کہ خود ان کی اپنی نجات آپ کی نبوت کی گواہی پر موقوف ہے۔ چونکہ کفار اپنے کفر کو ذریعہ نجات اور ہدایت سمجھتے تھے۔ نیز کفر کا مضمون بہت اہم کہ مؤمن کو ایمان کے ساتھ کفریات سیکھنا بھی ضروری ہے تاکہ ان سے بچے۔ اس لئے اس جملہ کو اِنَّ سے شروع فرمایا گیا۔ الَّذِيْنَ سے سارے کافر انسان مراد ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سارے کافر جن و انس مراد ہوں۔ "كَفَرُوْا" کے معنی ہیں مرتے وقت تک کافر رہے۔ یا وہ جو علم الٰہی میں کافر ہوئے۔ وہ لوگ مراد نہیں جو ایک بار کفر کرے پھر مؤمن ہو کر مرے کیونکہ اس نے اپنے دامن سے کفر کا داغ ایمان کے پانی توبہ کے صابن سے دھو دیا وہ مؤمنوں میں آ گیا۔ چونکہ اپنا کفر کرنا پہلے ہوتا ہے۔ دوسروں کو کافر بنانا بعد میں اس لئے كَفَرُوْا کے بعد "صَدُّوْا" کا ذکر ہوا۔ صَدُّوْا بنا ہے صدّ سے بمعنے روک، آڑ، صَدُّوْا کا مفعول بہ پوشیدہ ہے۔ الناس یا الخلق روکنا عام ہے۔ زبان سے روکنا، قلم سے روکنا، مال سے روکنا، جتھے کے ذریعے روکنا، طاقت و قوت سے روکنا، سَبِيْلِ اللّٰهِ سے مراد دین اسلام ہے یا حضور کی اطاعت ہے۔ یا خود رسول اللہ ﷺ ہیں کہ حضور ہی اللہ تک پہنچانے والے ہیں۔ یہ جملہ بہت صورتوں کو شامل ہے۔ حضور سے پہلے اللہ کے راستے بہت تھے۔ بیک وقت بہت نبی ہوتے تھے، ہر نبی اللہ کا راستہ تھا۔ حضور کی تشریف آوری کے بعد تمام راستے بند ہو گئے۔ اب صرف حضور ہی اللہ کا راستہ ہیں۔ حضور سے روکنا یہ کہنا کہ سیدھے اللہ کے پاس جاؤ، حضور کے پاس نہ جاؤ، یہ اللہ کے راستے سے روکنا ہے۔ اس کی تفسیر وہ آیات ہیں رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ

صُدُوْدًا (النساء:۶۱) اور وہ آیت وَرَاَیْتَهُمْ یَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (منافقون:۵) اور وہ آیت وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ (النساء:۶۴) غرضیکہ حضور سے روکنا یا دوسروں کو روکنا بے دینی ہے۔ اللہ تک پہنچو مگر حضور کے راستے سے حضور کی معرفت پہنچو قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا یہ عبارت اَلَّذِیْنَ کی خبر بمعنی جزاء ہے۔ ضلال کے معانی اور اس کے اقسام سورۃ فاتحہ کی تفسیر وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے تحت بیان ہو چکے۔ دور کی گمراہی وہ گمراہی ہے جو ہدایت سے بہت دور موجود ہو۔ جہاں پہنچ کر یا تو انسان ہدایت تک آ سکے ہی نہیں۔ یا بمشکل تمام آئے جس کا کفر عنادی ہو وہ ہدایت نہیں پا سکتا اور جس کا کفر شبہ و شک کی وجہ سے ہو وہ بآسانی ہدایت پا لیتا ہے۔ ابو جہل نے حضرت عمر کو حضور کو شہید کرنے بھیجا۔ اس وقت یہ دونوں اسلام سے دور تھے۔ ابو جہل قتل کرانے والا تھا، حضرت عمر قتل کرنا چاہتے تھے مگر ابو جہل کا کفر عنادی تھا وہ مؤمن نہ بنا۔ حضرت عمر دھوکہ میں تھے ذرا سے اشارے پر ایمان لے آئے۔ یہ ہیں ضلال بعید کے معنی یعنی جو کفار خود بھی کافر ہوں اور دوسروں کو بھی کافر رکھیں، ہدایت پر نہ آنے دیں وہ ایسے دور کی گمراہی میں پڑ چکے ہیں کہ اب ان کے ایمان کی امید نہیں کیونکہ یہ کافر بھی ہیں اور کافر گر بھی۔ اب تک ان کے دنیاوی عذاب و سزا کا ذکر ہوا۔ اب ان کی اخروی سزا کا ذکر ہے کہ فرمایا گیا اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا ابھی ابھی اِنَّ اور اَلَّذِیْنَ اور اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا کی تحقیق ہو چکی۔ ظلم کے معنی ہیں کسی کا حق مارنا، اس کا مفعول پوشیدہ ہے۔ یعنی جو کافر ہوئے اور انہوں نے اپنی جان پر ظلم کیا، بدکاریاں، بے ایمانیاں کر کے یا لوگوں پر ظلم کیا کہ انہیں اسلام کی طرف سے اندھیرے میں رکھا، اسلام پر ظلم کیا کہ اس کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں شک ڈلے۔ لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ اس طرز سے بیان فرمانا بہت ہی مبالغہ کے لئے ہے۔ اگر "لَا یَغْفِرُ اللّٰهُ" فرما دیا جاتا تو یہ مبالغہ حاصل نہ ہوتا۔ لِیَغْفِرَ سے مراد یا تو آخرت میں گناہ کی معافی ہے یا ان کے عیو[ب] چھپانا ہے یا انہیں دنیا میں ذلت، قتل، قید، جزیہ مقرر ہونے سے بچانا ہے۔ (خازن) یعنی اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کے گناہ معاف نہ فرمائے گا، ان کے عیوب نہ چھپائے گا بلکہ انہیں رسوا کرے گا یا انہیں دنیا میں ذلت و خواری سے نہ بچائے گا یا انہیں دوسری قوموں کی ماتحتی ان کی قید وغیرہ سے نہ بچائے گا۔ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ طَرِیْقًا اِلَّا طَرِیْقَ جَهَنَّمَ یہ ان کی دوسری سزا کا ذکر ہے۔ اس کا تعلق یا آخرت سے ہے یا دنیا سے۔ ہدایت کے معنی اس کے اقسام اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (فاتحہ:۶) [کی تفس]یر میں عرض ہو چکے۔ اگر یہ سزا اخروی کا ذکر ہے تو طریق جہنم سے مراد دوزخ میں پہنچنے کا راستہ ہے۔ مؤمن ک[و ق]یامت میں جنت کا راستہ معلوم ہو گا اور کافر کو دوزخ کا راستہ۔ یہ دونوں اپنے اپنے ٹھکانوں پر کسی رہبری کے بغیر ایسے پہنچ جائیں گے جیسے کہ یہ ہمیشہ کے واقف ہیں۔ البتہ دوزخیوں کو فرشتے دھکیلتے لے جائیں گے اظہار ذلت کے لئے نہ کہ رہبری کے طور پر اور اگر دنیاوی سزا کا ذکر ہے تو طریق جہنم سے مراد وہ عقائد و اعمال ہیں جو دوزخ میں پہنچنے کا ذریعہ ہوں یعنی اللہ تعالیٰ ایسے کافروں ظالموں کو دنیا و آخرت میں دو[ز]خ کے راستے کی رہنمائی فرمائے گا۔ جہنم اصل میں جاہ نم تھا بمعنی گہرا کنواں۔ چونکہ دوزخ بہت گہرا ہے اس لئے اسے جہنم کہا جاتا ہے۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا یہ ان کے انجام کا ذکر ہے۔ خلود کے معنی ہیں دراز مدت تک رہنا۔ اگر اس کے بعد اَبَدًا بھی آ جاوے تو بمعنی ہمیشگی کے ہوتا

ہے۔ اگر ابدًا نہ ہوتو بمعنی بہت عرصہ تک رہنا۔ یعنی یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ تک رہیں گے، نہ وہاں مریں نہ وہاں سے نکلیں وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرًا۔ ذٰلِکَ سے اشارہ ان دونوں سزاؤں کی طرف اشارہ ہے نہ بخشنا اور دوزخ کی راہ دکھانا یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے سخت سے سخت سزا دینا اور بڑے سے بڑا رحم کرنا نہایت ہی آسان ہے، اسے کوئی روک نہیں سکتا وہ جو چاہے کرے۔

خلاصہ تفسیر ان آیات میں تین باتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔ (۱) حضور ﷺ کا تمام جہان سے مستغنی ہونا اور بے نیاز ہونا (۲) تمام جہان کا حضور کا نیاز مند ہونا (۳) حضور کی فرمانبرداری سے سرتابی کرنے والے کا دین و دنیا میں ناکام و نامراد ہونا اور سخت سزا پانا۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ اے محبوب! ﷺ یہ یہود و کفار آپ کی نبوت کا انکار کرنے کے لئے بہت طرح کے حیلے بہانے بناتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہر طرح کی ہمیشہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے آپ پر جو نازل فرمایا قرآن یا حدیث یا آپ کی صفات وافعال حمیدہ سب اپنے علم سے نازل فرمایا (اس کے تین مطلب ابھی تفسیر میں عرض کیے گئے) اور اس پر یا اللہ تعالیٰ کی اس گواہی پر سارے فرشتے مقربین ہوں یا مدبرات امر گواہی دیتے ہیں کہ ان کا وظیفہ ہے، یہ پڑھتے رہنا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

خیال رہے: کہ فرشتوں کی یہ کلمہ خوانی ایمان لانے کے لئے نہیں، وہ تو پیدائشی مؤمن ہیں بلکہ حضور کا احترام ظاہر کرنے اور برکت حاصل کرنے، اپنا قرب الٰہی بڑھانے کے لئے ہے۔ جیسے ہم لوگ مؤمن ہو کر کلمہ طیبہ کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ کلمہ پڑھ کر سوتے ہیں، کلمہ پڑھ کر مرتے ہیں۔ کیوں برکت کے لئے اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی گواہی ہے۔ اس گواہی کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی کی گواہی کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو کہ تین کام وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ بھی کرتا ہے، فرشتے بھی انسان بھی بلکہ اور مخلوق بھی۔ حضور پر درود شریف، حضور کی نبوت کی گواہی اور حضور کی حمد و ثناء اس لئے حضور کا نام محمد ہے، ﷺ۔ جب آپ کی عظمت و عزت کا یہ حال ہے تو اگر یہ مٹھی بھر کفار آپ کو نہیں مانتے تو نہ مانیں اس سے آپ کا نقصان نہیں انہی کا نقصان ہے۔ ایک نہیں بلکہ بہت سے نقصان ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کا یہ حال ہو کہ خود بھی کافر رہیں، دوسروں کو بھی اسلام سے روکیں یہ کہہ کر کہ یہ وہ رسول نہیں ہیں جن کی بشارت توریت میں ہے۔ علم، روپیہ، قوت، حیلوں غرض کہ کسی طرح روکیں وہ ایسی گمراہی میں گرفتار ہو گئے جو ہدایت سے بہت دور ہے، جہاں سے ہدایت کی طرف آنا بہت مشکل یا ناممکن ہے۔ یقین فرماؤ کہ جو کافر بھی رہے اور ظالم بھی کہ اپنے نفس پر لوگوں پر کفر و گناہ کر کے یا کفر و گناہ کرا کے ظلم کرے اللہ تعالیٰ ان کے گناہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اور انہیں دنیا و آخرت میں سوا دوزخ کی راہ کے کوئی راستہ نہ دکھائے گا کہ دنیا میں انہیں ایمانیات کی توفیق نہ ملے گی، آخرت میں جنت کا راستہ نظر نہ آئے گا، وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، نہ وہاں سے رہائی پائیں نہ انہیں موت آوے۔ ایسی کڑی سزا دینا رب تعالیٰ پر نہایت آسان ہے۔ اے محبوب! آپ غور فرمالیں کہ اس انکار میں ان کا اپنا نقصان ہے یا آپ کا لہٰذا آپ ان کی حرکتوں پر ہرگز ملول نہ ہوں۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جیسے رب تعالیٰ اپنی الوہیت میں خلق سے بے نیاز ہے کہ اگر کوئی بھی اس کی عبادت نہ کرے تو اس کا کوئی نقصان نہیں۔ یونہی حضور ﷺ اپنی نبوت میں خلق سے بے نیاز ہیں کہ اگر کوئی بھی حضور کی اطاعت نہ کرے تو آپ کا کچھ نقصان نہیں۔ **دوسرا فائدہ:** تمام لوگوں کے گواہ انسان مگر حضور ﷺ کا گواہ خالق انس والجان ہے جیسا کہ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ سے معلوم ہوا۔ حضور کی تو وہ شان ہے کہ حضرت یوسف و مریم کو تہمت لگی تو ان بزرگوں کی گواہی دو بچوں نے دی مگر محبوب کی زوجہ طیبہ طاہرہ مسلمانوں کی سچی ماں جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو تہمت لگی تو خود رب تعالیٰ نے گواہی دی۔ یہ ہے لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ کا ظہور۔ **تیسرا فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے حضور کی صرف ایک بار گواہی نہ دی بلکہ برابر دیتا رہا اور قیامت تک دیتا رہے گا۔ تمام آسمانی کتابوں میں حضور کا اعلان سارے نبیوں کے ذریعہ حضور کی شہرت بلکہ میثاق کے دن سارے نبیوں سے حضور پر ایمان لانے کا عہد وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ (آل عمران:۸۱) پھر ولادت پاک سے پہلے اور ولادت پاک کے وقت تمام عالم میں حضور کی تشریف آوری کی دھوم دھام اور عجائبات کا ظہور پھر ہزاروں معجزوں کا آپ کے ہاتھ پر ظاہر ہونا پھر تا قیامت قرآن کی بقا، حضور کا عام چرچہ، حضور کی محبوبیت، حضور کے دین میں اولیاء اللہ، علماء کی کثرت یہ سب چیزیں رب تعالیٰ کی گواہیاں ہیں۔ یہ ہے اللّٰهُ يَشْهَدُ کا ظہور۔ **چوتھا فائدہ:** حضور پر صرف قرآن مجید نہیں اترا بلکہ اس کے علاوہ اور بہت کچھ اترا حتی کہ حضور کے صفات، احوال، افعال، اعمال سب رب تعالیٰ کی طرف سے اتارے ہوئے ہیں۔ اور رب تعالیٰ ان سب کی حقانیت کا گواہ ہے جیسا کہ مَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ کے عموم سے معلوم ہوا اس لئے حضور کے کسی فعل شریف پر اعتراض کرنا کفر ہے۔ کہ وہ رب تعالیٰ پر اعتراض ہے۔ دیکھو حضور انور نے بی بی زینب سے نکاح کیا، کفار و منافقین نے اعتراض کیا تو رب نے فرمایا: زَوَّجْنٰكَهَا (احزاب:۳۷) اے محبوب! یہ نکاح تمہارا ہم نے کرایا۔ یہ ہے اللہ کی شہادت ہمارے کام نفسانی، شیطانی، رحمانی ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ حضور کے سارے کام رحمانی ہیں۔ ﷺ۔ **پانچواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو اپنے خاص علوم غیبیہ عطا فرمائے کہ یہ قرآن وہ سارے علوم لے کر حضور پر اترا جیسا کہ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا اس کی تفسیر وہ آیت ہے۔ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل:۸۹) **چھٹا فائدہ:** جیسے قرآن مجید بے مثال کتاب ہے ایسے ہی اس کے لینے والے محبوب بے مثال و بے نظیر نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بے مثال کتاب بے مثال نبی پر اتاری۔ یہ فائدہ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ کی دوسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ حضور کی مثل اور کوئی تو کیا دیکھے خود اللہ تعالیٰ نے اپنی خدائی میں ان کا مثل نہ دیکھا۔

مصرع:۔ خدا نے خدائی میں تجھ سا نہ پایا۔

کوئی لایا زبور انجیل کوئی توریت کتاب کسی کو ملی
پر تیرے سوا میرے پیارے نبی قرآن کا لانا کیا جانے

ساتواں فائدہ: حضور کی امت تمام امتوں سے زیادہ افضل ہے۔ رب تعالیٰ نے اعلیٰ احکام اسی امت کو بخشے، اعلیٰ دین اسی امت کو دیا۔ یہ فائدہ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ کی تیسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** فرشتے بھی ہمارے حضور کا کلمہ پڑھتے ہیں بلکہ قیامت میں سارے نبی ہمارے نبی کا کلمہ پڑھیں گے۔ معراج میں سارے رسول ہمارے رسول کے پیچھے ہمارے رسول کی نماز پڑھ گئے یہ فائدہ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ کی پہلی تفسیر سے حاصل ہوا۔ **نواں فائدہ:** تمام فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ ہمارے حضور پر درود بھی پڑھتے ہیں اور ہمارے حضور کا کلمہ بھی پڑھتے ہیں مگر اسی سجدے سے یہ کلمہ و درود بہت بڑھ کر ہے کہ وہ سجدہ ایک دفعہ ہوا مگر درود و کلمہ ہمیشہ پڑھا جا رہا ہے۔ اسی لئے فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ (حجر: ۳۰) میں ماضی فرمایا گیا۔ اور يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ اور يَشْهَدُوْنَ مضارع استمراری ارشاد ہوا کہ دونوں جگہ مضارع ایک مبتدا کی خبر بن کر آیا جیسا کہ علم نحو و بلاغت جاننے والوں پر پوشیدہ نہیں يضرب زيد اور زيد يضرب میں فرق ہے۔ **دسواں فائدہ:** حضور ﷺ رب تعالیٰ کی ذات و صفات کے مظہر ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ایک صفت غنا بھی ہے۔ یعنی مخلوق سے بے نیازی۔ اللہ نے اپنے حبیب کو بھی مخلوق سے بے نیاز بنایا ہے، صرف اپنا نیاز مند رکھا۔ حضور کا دین، حضور کا قرآن، حضور کی عزت و عظمت کا رب تعالیٰ حافظ و ناصر ہے۔ یہ فائدہ وَكَفٰى بِاللّٰهِ سے حاصل ہوا۔ **گیارھواں فائدہ:** کافر سے کافر گر زیادہ برا ہے اس کا عذاب بھی زیادہ جیسا کہ وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے معلوم ہوا۔ اسی طرح مؤمن سے مؤمن گر زیادہ افضل ہے۔ اس سے علماء سوء اور علمائے دین کا حال معلوم ہوا۔ **بارھواں فائدہ:** جس کا خاتمہ ایمان پر ہو جاوے ان شاء اللہ اس کی مغفرت ضروری ہو گی اگرچہ کتنا ہی گناہ گار ہو۔ خواہ کچھ سزا پا کر یا ویسے ہی۔ مغفرت نہ ہونا کفار کے لئے ہے جیسا کہ لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ سے معلوم ہوا۔ **تیرھواں فائدہ:** مؤمن کے لئے دوزخ میں ہمیشگی نہیں ہمیشگی صرف کفار کے لئے ہے جیسا کہ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: گواہی کے لئے ضروری ہے کہ گواہ دیکھنے میں آئے، اس کی بات سننے میں آئے، حاکم کی کچہری ہو۔ ان چیزوں کے بغیر گواہی ممکن نہیں تو اللّٰهُ يَشْهَدُ فرمانا کیسے درست ہوا؟ **جواب:** گواہی تین طرح کی ہوتی ہے۔ مقدمہ جتانے کے لئے، ماننے کے لئے، اظہار کے لئے، منوانے کے لئے، گواہ کا موجود محسوس ہونا۔ پہلی قسم کی گواہی میں ضروری ہے۔ دوسری تیسری قسم کی گواہیوں میں یہ بات ضروری نہیں۔ ہم کہتے ہیں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یہ گواہی ایمان کے اظہار کے لئے ہے۔ اور رب تعالیٰ کی یہ گواہی منوانے کے لئے ہے جیسے یونیورسٹی کا سرٹیفکیٹ قابلیت کی گواہی ہے۔ حکام کے بازوؤں پر تمغہ وغیرہ حکومت کی طرف سے عہدے کی گواہی ہے۔ یہ گواہیاں منوانے کے لئے ہیں۔

دوسرا اعتراض: فرشتوں کی گواہی جس کا یہاں ذکر ہے وہ ہم کو محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ تو اس سے کیا فائدہ؟

جواب: جب اللہ تعالیٰ نے ان کی گواہی کی خبر قرآن مجید میں دے دی تو وہ گواہی ہم کو یقین سے معلوم ہو گئی۔ محسوسیت کے

لئے یہ کافی ہے۔ اسی لئے ہمارے ایمان کی پختگی ہوتی ہے اوران فرشتوں کوثواب وقرب حاصل ہوتا ہے۔

تیسرا اعتراض: اسی آیت سے معلوم ہوا کہ جو کافر بھی ہو ظالم بھی اللہ اسے نہ بخشے گا تو چاہیے کہ جو صرف کافر ہو ظالم نہ ہوا سے بخش دیا جائے۔ حالانکہ صرف کافر کی بخشش نہیں۔ **جواب:** ہر کافر ظالم ہے کفر خود ظلم ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان: ۱۳) جو کافر بھی ہو کافر گر اور گمراہ کن بھی وہ تو ڈبل ظالم کہ اپنے پر بھی ظلم کرتا ہے اور جن کو بہکائے ... اس پر بھی علماء یہود تو اپنے دین، اپنی کتاب، اپنی قوم پر بھی ظلم کرتے تھے جیسا کہ ابھی تفسیر میں عرض کیا گیا۔

چوتھا اعتراض: اس آیت میں فرمایا گیا کہ کفار کو رب تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ جب وہ ہی ہدایت نہیں دیتا تو ان بہکنے والوں کا کیا قصور ہے، جسے خدا گمراہ کردے اسے ہدایت کوئی نہیں دے سکتا۔ **جواب:** ان لوگوں نے کفر وظلم کر کے خود اپنے ہدایت کے راستے بند کر لیے اس کے وہ مجرم ہوئے غرض کہ گمراہی کے کاسب یہ ہیں اور خالق رب تعالیٰ، اس کا خلق ان کے کسب سے ہے۔ جیسے قتل پر موت رب کی طرف سے وارد ہو جاتی ہے تو قاتل کسب قتل کی وجہ سے مجرم ہے۔ اس کی پوری تحقیق تیسرے پارے میں کی جا چکی ہے۔ اور اگر ہدایت نہ دینے کے یہ معنی کیے جاویں کہ آخرت میں انہیں جنت کے راستے کی ہدایت نہ دے گا تب تو کوئی اعتراض نہیں۔ لا یھدی مضارع ہے جس میں حال واستقبال دونوں معنی کا احتمال ہے۔

تفسیر صوفیانہ

گواہ کی عظمت سے دعویٰ اور مدعی کی عظمت ظاہر ہوتی ہے جب حضور ﷺ کی نبوت اور قرآن کریم کی حقانیت کا گواہ اللہ تعالیٰ اور اس کے سارے فرشتے ہیں تو معلوم کرلو کہ حضور ﷺ اور آپ کی نبوت آپ کا دین آپ کا قرآن کیسے عظمت والے ہوں گے؟ خوش نصیب ہے وہ مسلمان جو توحید ورسالت کی، دین وایمان وقرآن کی، حقانیت کی گواہی دے کر اس گواہی میں حصہ لے۔ حضور وہ عید کا چاند ہیں جن میں خالق اور فرشتوں جن وانس کی نظریں جمع ہیں۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ جس پر عالم ارواح میں نور کا چھینٹا نہ پڑا وہ نار میں ہمیشہ رہے گا کیونکہ نار سے نکالنے والا وہ نور ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں علم، مال، عمر، اعمال، عقل زہر ہیں۔ اگر عشق کا تریاق ساتھ نہ ہو تو ہلاک کرنے والے ہیں۔ دیکھو علمائے یہود کے پاس سب کچھ ہے۔ وہ عالم، عاقل، مال دار سب کچھ تھے مگر وہ کفر وطغیان بنا۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں اعلیٰ نعمت دل کی نرمی ہے اور اس کے تمام عذابوں میں سخت تر عذاب دل کی سختی ہے۔ لوہا بغیر نرم ہوئے ہتھیار نہیں بنتا۔ سونا بغیر نرم ہوئے زیور نہیں بنتا۔ زمین بغیر نرم ہوئے قابل کاشت نہیں ہوتی۔ آٹا بغیر نرم ہوئے گوندھے روٹی، پراٹھا، شیر مال نہیں بنتا یوں ہی دل بغیر نرم ہوئے مومن عارف کامل نہیں بنتا۔ لوہے یا سونے کو یہ آگ نرم کرتی ہے۔ آٹے کو پانی نرم کرتا ہے زمین کو ہل نرم کرتا ہے دل کو عشق کی آگ۔ آنکھوں کے آنسوؤں کا پانی اور کامل مرد کی نگاہ کا ہل نرم کرتا ہے جب دل نرم ہو جاتا ہے تو اس میں ایسے باغ لگتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ یہود مدینہ کے پاس دل تھا مگر دل میں نرمی نہ تھی تو حضور انور ﷺ کے پاس رہ کر بھی کچھ نہ بنے۔ حضرت اویس قرنی کے پاس دل بھی تھا، دل میں نرمی بھی تھی وہ دور رہ کر بھی سب کچھ بن گئے۔ شعر

ذرہ عشق نبی از حق طلب سوز صدیق و علی از حق طلب

کپاس میں بنولے رہیں تو کپڑا نہیں بنتا۔ عالم میں خودی رہے تو عارف نہیں بنتا۔ یہ آیت کریمہ تا قیامت انسانوں کے لئے عبرت ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ

اے انسانو! بے شک آئے تم سب کے پاس یہ رسول ساتھ حق کے طرف سے

اے لوگو! تمہارے پاس یہ رسول حق کے ساتھ تمہارے رب کی طرف سے

رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ

رب تمہارے پس ایمان لے آؤ واسطے بھلائی اپنی کے اور اگر انکار کرو گے تو بیشک اللہ کا ہے

تشریف لائے ہیں تو ایمان لاؤ اپنے بھلے کو اور اگر تم کفر کرو تو بیشک اللہ کا ہے

مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۷۰﴾

وہ جو بیچ آسمانوں اور زمین کے ہے اور ہے اللہ علم والا حکمت والا

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کے اعتراضات کے نہایت نفیس جوابات دیئے گئے۔ اب انہیں ایمان لانے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ گویا اعتراضات دفع فرمانے کے بعد تبلیغ اسلام ہو رہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں قرآن کریم کے فضائل بیان ہوئے کہ اس کا گواہ اللہ تعالیٰ بھی ہے اور فرشتے بھی۔ اب صاحب قرآن ﷺ کے فضائل بیان ہو رہے ہیں۔ گویا کتاب کی شان سنا کر صاحب کتاب ﷺ کی شان سنائی جا رہی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ ہم نے قرآن مجید اپنے علم سے اتارا، جان کر اتارا کہ یہ کس ذات پر اترنا چاہیے۔ اب اسی اجمال کی تفسیر بیان ہو رہی ہے کہ ان رسول اللہ ﷺ پر جو ایسی شانوں کے مالک ہیں تاکہ معلوم ہو کہ اس قرآن کے لئے آپ ہی موزوں و مناسب ہیں۔ گویا پہلے اجمال تھا اب تفصیل ہے یا پہلے دعویٰ تھا اب دلیل کا بیان ہے۔ **خیال رہے:** کہ حضور ﷺ کو رب تعالیٰ نے لاکھوں عظمتیں ذاتی، بلاواسطہ بخشیں اور لاکھوں عظمتیں بالواسطہ عطا فرمائیں۔ ان بالواسطہ عظمتوں میں سے وہ عظمتیں بھی ہیں جو بذریعہ قرآن مجید آپ کو عطا ہوئیں۔ قرآن کریم کی وہ شان ہے کہ جو فرشتہ قرآن لایا وہ تمام فرشتوں کا سردار یعنی جبرائیل، جس جگہ سے قرآن آیا وہ دوسری جگہ سے افضل یعنی لوح محفوظ جس مہینہ میں اور جس رات میں قرآن آیا وہ تمام راتوں سے افضل وہ

مہینہ تمام مہینوں سے افضل یعنی شب قدر اور ماہ رمضان اور جس سرزمین میں قرآن آیا وہ تمام زمینوں سے یعنی زمین حجاز خصوصاً مکہ معظمہ و مدینہ منورہ۔ جس زبان میں قرآن آیا وہ زبان تمام زبانوں سے افضل یعنی عربی بلکہ جس کاغذ پر قرآن لکھا گیا وہ تمام کاغذوں سے افضل جس جلد و جزدان میں قرآن باندھا جائے وہ تمام جلدوں اور جزدانوں سے افضل جس نبی پر قرآن آیا وہ نبی تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل لہٰذا افضل کتاب کے ذکر کے بعد افضل رسولوں کا ذکر بہت موزوں ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا کہ ہم کفار کو نہ تو بخشیں گے نہ ہدایت دیں گے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ ہاں اگر وہ اس محبوب کا دامن تھام لیں، ان پر ایمان لے آویں تو ہم بخش بھی دیں گے، ہدایت بھی دیں گے۔ گویا عذاب کی وجہ کا ذکر پہلے ہوا، چھٹکارے کا ذکر اب ہے۔ مہلک بیماری کا ذکر پہلے تھا، شفاء کا ذکر اب ہے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ کی راہ سے روکنے والے پوپ پادریوں کی برائیوں کا ذکر ہوا اب اس راستہ کی طرف بلانے والے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل کا بیان ہے۔ گویا آڑ کا ذکر پہلے ہوا۔ اس آڑ کو پھاڑنے والی ذات کا ذکر اب ہے۔

تفسیر

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ: جس کے مطلب کی بات کہی جاوے اس کو پکارا جاتا ہے۔ طبیب بیماروں سے کہتا ہے: اے بیمارو! یہ دوا بڑی مفید ہے۔ کوئی عالم کسی کتاب کا اعلان کرتا ہے تو کہتا ہے۔ اے طالب علمو! یہ کتاب بڑی شان دار ہے۔ چونکہ رب تعالیٰ اس آیت کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلاد پاک کا اعلان فرمارہا ہے اور آپ کی ولادت پاک تو سارے جہاں سارے انسانوں کے لئے مفید ہے لہٰذا کسی خاص جماعت کو نہیں پکارا بلکہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ کہہ کر سارے لوگوں کو پکارا۔ یہ ندا حضور کی نبوت عامہ کی دلیل ہے۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری مخلوق جن وانس، فرشتوں وغیرہم کے نبی ہیں مگر چونکہ انسان اصل مقصود ہیں دیگر مخلوق تابع اسی لئے صرف انسانوں کو پکارا۔ **خیال رہے:** کہ اس النَّاسُ میں صرف اس زمانہ کے انسانوں سے ہی خطاب نہیں بلکہ قیامت تک کے سارے انسانوں سے خطاب ہے۔ کیونکہ حضور پر ایمان لانا سارے انسانوں پر لازم ہے جیسے اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وغیرہ احکام میں تاقیامت مسلمانوں سے خطاب ہے۔ جن مفسرین نے النَّاسُ کے معنی اہل مکہ کیے وہ ان کی اپنی رائے ہے، قرآن کریم میں یہ قید نہیں۔ اگر صرف مکہ والوں سے خطاب ہو تو چاہیے کہ صرف انہیں پر ایمان لانا ضروری ہو۔ اوروں پر نہ ہو اسی لئے تفسیر جلالین کے حاشیہ صاوی شریف میں اس قول کی تردید کر دی کہ یہ اعلان سب کو عام ہے۔ حاشیہ جمل نے بھی یہ ہی فرمایا۔ بہر حال النَّاسُ میں سارے انسان مراد ہیں حتیٰ کہ حضرت خضر و الیاس علیہما السلام جو زمین پر اس وقت موجود تھے وہ بھی اسی خطاب میں داخل ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو اس آیت کے نزول پر تو زمین پر نہ تھے مگر آخر زمانہ میں زمین پر آئیں گے وہ بھی اسی خطاب میں داخل ہیں۔ اصحاب کہف جو سور ہے ہیں وہ بھی اسی خطاب میں داخل ہیں۔ خضر و الیاس زمین پر رہ کر حضور پر ایمان لے آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر رہتے ہوئے حضور پر ایمان لائے۔ اصحاب کہف کے ایمان کا ظہور قریب قیامت ہوگا جب وہ حضرات بیدار ہوں گے۔ بعض عشاق کہتے ہیں کہ اس النَّاسُ میں گزشتہ لوگ بھی داخل ہیں حتیٰ کہ وفات یافتہ انبیاء کرام بھی حضور پر ایمان لے آئے اس لئے معراج

کی رات سب نے حضور کے پیچھے نماز پڑھی غرض کہ النَّاسُ میں بہت عموم ہے۔ قَدْ جَآءَ کُمْ چونکہ جناب آمنہ کے لخت جگر اور حضرت عبداللہ کے نور نظر اور ہاشمی قریشی مطلبی کی تشریف آوری تو سب نے مانی مگر بہ شان رسالت تشریف آوری کفار نے نہ مانی۔ وہ اس کے منکر تھے لہٰذا یہاں تو قَدْ فرمایا گیا اور سورۃ توبہ کے آخر میں لَقَدْ فرمایا یعنی یہ سب نے مانا کہ محمد ابن عبداللہ آئے۔ عربی قریشی ہاشمی آئے بشر آئے مگر کفار نے یہ نہ مانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اس لئے ان کی تردید میں قَدْ ارشاد ہوا۔ ہمارے دنیا میں آنے کو خلق یا ولادت کہا جاتا ہے مگر حضور کی تشریف آوری کو رب تعالیٰ نے جاء، بَعث، اَرْسَلَ کے الفاظ سے بیان فرمایا یہاں فرمایا قَدْ جَآءَ کُمُ الرَّسُوْلُ دوسری جگہ فرمایا اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا (آل عمران: ۱۶۴) ایک جگہ فرمایا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا (الاحزاب: ۴۵) کیونکہ ہم دنیا میں آنے سے پہلے کچھ نہ تھے۔ جو کچھ بنے یہاں آکر بنے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ بن کر یہاں آئے۔ ہم یہاں بننے کو آئے وہ سب کچھ بن کر دوسروں کو بنانے آئے۔ دیکھو عیسیٰ علیہ السلام نے پیدا ہوتے ہی فرمایا: میں اللہ کا بندہ ہوں، میں صاحب کتاب نبی ہوں، مجھے رب نے نماز، زکوٰۃ اور ماں کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا۔ وغیرہ۔ اس وجہ سے یہاں جَآءَ فرمایا گیا۔ نیز ہم یہاں اپنے کام کے لئے آئے کہ یہاں اعمال کما کر اپنی آخرت سنبھال لیں مگر حضور رب کے کام کے لئے آئے کہ اس کی مخلوق کی اصلاح کریں۔ کالج میں طلباء بھی جاتے ہیں پروفیسر بھی مگر طلباء اپنا کام کرنے یعنی سیکھنے جاتے ہیں اور پروفیسر حکومت کا کام کرنے طلباء کو سکھانے جاتے ہیں۔ کالج ایک ہے، وہاں جانے والوں کی نوعیت میں فرق ہے پھر دوسرے لوگ ایک گھر یا ایک خاندان یا ایک ملک کے لئے آتے ہیں۔ حضور سارے جہان کے لئے آئے کہ اس کی مخلوق کی اصلاح کریں نیز اور سب ایک خاص وقت کے لئے آتے ہیں مر کر چلے جاتے ہیں۔ حضور ہمیشہ کے لئے تشریف لائے وہ ایسے آئے کہ بعد وفات بھی نہ گئے اس لئے جَآءَ کُمْ فرمایا گیا۔ یعنی اے قیامت تک کے انسانو! وہ تم سب کے پاس آئے، تمہارے دلوں میں آئے، تمہارے دماغوں میں آئے، ایمانوں میں آئے، جانوں میں آئے اور ایسے آئے کہ آکر تمہارے پاس سے نہ گئے۔ **خیال رہے**: کہ حضور انور کی پیدائش اور ولادت عرب میں ہے، رہائش مکہ مدینہ میں ہے مگر تشریف آوری سارے جہان میں جیسے سورج رہتا ہے آسمان پر مگر چمکتا ہے سارے جہان پر کہ سارے جہان کا نظام اس سے وابستہ ہے۔ دن، رات، مہینے، برس، عمریں، موسم، فصلیں سب اس سے وابستہ ہیں۔ ایسے ہی نظام کائنات عرش و فرش کا نظم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دم سے وابستہ ہے۔ ایک ہندو شاعر امرناتھ قیس نے کیا خوب کہا۔ شعر

خلق میں سب سے تو بڑا تجھ سے بڑی خدا کی ذات
قائم ہے تیری ذات سے سارا نظام کائنات

اس لئے رب تعالیٰ نے جہاں کہیں حضور کے متعلق "جَاءَ یا اَرْسَلَ یا بَعَثَ" فرمایا وہاں یا فرمایا هُمْ پھر جیسے حضور کی ولادت، سکونت اور بعثت میں فرق ہے کہ ولادت مکہ میں، سکونت مدینہ میں، بعثت سارے عالم میں یوں ہی موت میں فرق ہے کہ ہماری موت کے معنی ہیں مرجانا یعنی مر کر چلا جانا۔ حضور کی موت میں جانے کے معنی نہیں وہاں صرف مرنا ہے، مرجانا نہیں۔

حضور کو موت آئی مگر آپ بعد موت یہاں سے گئے نہیں۔ یعنی ہم کو موت بھی ہے۔ فوت بھی، حضور کو موت ہے فوت نہیں۔ سورج غروب ہو کر بھی جاتا نہیں بلکہ اسی عالم میں رہتا ہے۔ اس کی رفتار سے رات کے اوقات بنتے ہیں کہ اتنا نیچا ہو تو وقت مغرب ہوگا۔ جب اتنے درجے نیچے ہو جائے تو وقت عشاء ہوگا۔ اتنا نیچا ہونے پر تہائی رات گزرے گی۔ تہجد کا وقت مستحب ہو گا وغیرہ پھر غروب تاروں چاند کو چمکا تا ہے۔ دن میں ذروں کو چمکا تا ہے۔ حضور زندہ ہوں تو صحابی بنائیں، بعد وفات ولی بناتے ہیں۔ سبحان اللہ سورج طلوع ہو کر دن کے اوقات بتا تا ہے، غروب ہو کر رات کے اوقات بتا تا ہے۔ یوں ہی حضور بعد وفات عالم میں فیض دے رہے ہیں۔ نماز میں قرآن، کلمہ، حضور کو سلام، حضور سے التجائیں، بعینہ ویسے ہی باقی ہیں۔ اس لئے قرآن کریم میں حضور کے لئے جَاءَ تو آیا ذَهَبَ مِنَ الدُّنْيَا نہ آیا الرَّسُوْلُ۔ رسول، نبی، مرسل کے معانی اور ان میں فرق ہم اپنے رسالہ (اسلام کی چار اصطلاحوں) میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لو کہ رسول کے معنی ہیں پیغام رساں اور فیضان رساں۔ حضرت جبرائیل نے بی بی مریم سے کہا تھا: اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم: ۱۹) میں تمہارے رب کا رسول ہوں آیا ہوں تا کہ تم کو ستھرا بیٹا دوں۔ دیکھو رسالت کے ساتھ بیٹا دینے کا ذکر ہوا۔ معلوم ہوا کہ رسول صرف پیغام رساں کو نہیں کہتے۔ رسول وہ ہے جو پیغام رساں بھی ہو اور فیضان رساں بھی۔ بے اختیار پیغام و فیضان دینا، رسالت جبریل ہے۔ اور با اختیار مختار ہو کر پیغام و فیضان دینا رسالت محمدی ہے۔ اس کے لئے ہماری کتاب سلطنت مصطفٰے کا مطالعہ کرو۔ غرض کہ رسول کو اللہ تعالیٰ سے نسبت ہے لینے کی، مخلوق سے نسبت ہے دینے کی۔ رب سے لیتے ہیں مخلوق کو دیتے ہیں۔ ان کا دست سوال رب کی طرف ہے اور دست عطا و نوال مخلوق کی طرف ہے۔ شعر

برتو او پاشد تو برما تا ابد یہ سلسلہ ہو

یا رسول اللہ ہمیشہ وہ تم پر برسائے جائے تم ہم پر برسائے جاؤ۔ اس لئے انہیں رسول اللہ بھی کہا جاتا ہے اور ''رسولنا'' بھی چنانچہ قرآن مجید میں کہیں فرمایا رسولکم کہیں فرمایا رسولنا یہاں الرَّسُوْلُ میں الف لام یا عہدی ہے۔ یا عوضی مضاف الیہ کی عوض۔ اگر عوضی ہے تو اس کا مضاف الیہ یا اللہ تعالیٰ ہے یا مخلوق یعنی وہ شاندار رسول آئے۔ یا اللہ کے رسول آئے یا تم سب کے رسول آئے۔ چونکہ حضور کی رسالت میں کوئی قید نہیں اس لئے یہاں بغیر قید الرَّسُوْلُ فرمایا گیا بِالْحَقِّ ب یا تعدیہ ہے یا تلبیس کی۔ حق مقابل ہے باطل کا جیسے صدق مقابل ہے کذب کا، صدق و کذب صرف کلام پر بولا جاتا ہے مگر حق و باطل کلام، کام، عقیدہ، دین، ملت سب پر بولا جاتا ہے۔ نیز صدق وہ جو واقعہ کے مطابق ہو۔ اور حق وہ کہ واقعہ اس کے مطابق ہو کہ جیسا کہہ دیا جاوے ویسا ہی واقعہ ہو جاوے۔ یعنی ہمارے رسول حق کو لائے یا حق سے موصوف ہو کر آئے۔ پہلی صورت میں حق سے قرآن مجید، یا اسلام یا احکام اسلام یا عرفان وغیرہ مراد ہے۔ دوسری صورت میں حق ہے حضور کے اقوال، احوال، افعال سب کچھ مراد ہیں۔ یعنی وہ رسول تشریف لائے جن کا سونا، جاگنا، کھانا، پینا، بولنا، خاموش رہنا غرض کہ ان کی ہر ادا حق ہے

(از تفسیر خازن و تفسیر صاوی روح جمل وغیرہ)

اور ہوسکتا ہے کہ مُتَکَلِّمًا کے متعلق ہو یعنی حق بولنے والے تشریف لائے جن کا ہر کلام حق ہے، جن کی زبان کا دہان حق کی کان ہے (جمل) **خیال رہے:** کہ حق کے تین معنی ہیں۔ حقیقی یعنی لائق، درست وصحیح ثابت یعنی نا قابل زوال۔ یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں۔ اور ب میں دو احتمال ہیں لہٰذا بِالْحَقِّ کی چھ تفسیریں ہوئیں (۱) ہمارے محبوب لائق قبول یا لائق اتباع صفات وافعال واحکام سے موصوف ہوکر آئے (۲) ہمارے محبوب درست وصحیح صفات وافعال سے موصوف آئے ان کا کوئی وصف وفعل نادرست نہیں (۳) ہمارے محبوب نا قابل زوال صفات افعال وکلام سے موصوف ہوکر آئے کہ تا قیامت ان کے صفات، افعال، احکام، فرمان باقی رہیں گے، زمانہ انہیں فنا نہ کرسکے گا (۴) ہمارے محبوب لائق عمل کتاب، لائق عمل دین لے کر آئے (۵) ہمارے محبوب صحیح ودرست دین، صحیح کتاب، صحیح احکام لے کر آئے (۶) ہمارے رسول نا قابل نسخ نا قابل زوال کتاب واحکام دین لائے کہ تمام کتب تمام دین منسوخ ہوگئے ان کا دین کبھی منسوخ نہیں۔ مِنْ رَّبِّكُمْ میں من ابتدائیہ ہے یہ عبارت یا تو بِالْحَقِّ کا حال ہے کائنًا کے متعلق ہوکر یا جَآءَكُمْ کے متعلق یعنی وہ حق جو یہ رسول لے کر آئے تمہارے رب کی طرف سے ہے یا یہ رسول تمہارے رب کے پاس سے تمہارے پاس آئے۔ اگرچہ ساری مخلوق رب تعالیٰ کی ہی طرف سے آئی ہے مگر وہ سب اپنا اپنا کام کرنے آئے اور یہ محبوب رب تعالیٰ کا کام کرنے تشریف لائے۔ نیز یہ محبوب خلقت کے لئے رب تعالیٰ کا تحفہ، رب اعلیٰ کی نعمت بن کر آئے اس لئے مِنْ رَّبِّكُمْ ارشاد ہوا۔ **خیال رہے:** کہ یہ عبارت گویا جَآءَكُمْ کی دلیل ہے۔ یعنی چونکہ حق تعالیٰ عالم کا رب ہے۔ رب وہ جو ظاہر کی پرورش بھی کرے باطن کی پرورش بھی کرے...... جب اس نے جسم کی پرورش کے لئے لاکھوں نعمتیں غذائیں، دوائیں، پھل فروٹ، ہوا، دھوپ، پانی وغیرہ پیدا فرمائے تو کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ روحانیت میں انسان کی پرورش نہ فرماتا اس لئے رب تعالیٰ نے اس رسول کو بھیجا جو روحانیت کے مربی ہیں چونکہ وہ رب ہے لہٰذا اس نے یہ رسول بھیجے چونکہ وہ سب کا رب ہے تو یہ رسول بھی سب کے رسول ہیں چونکہ وہ ہمیشہ تک رب ہے اس لئے اس نے ہمیشہ کے لئے یہ رسول بھیجے کہ نہ آپ کے زمانہ میں کوئی رسول آیا نہ آپ کے بعد لہٰذا یہ عبارت بہت خوبیوں کی جامع ہے۔ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ف جزائیہ ہے اور یہ جملہ پوشیدہ شرط کی جزا یعنی جب کہ یہ رسول تشریف لا چکے تو اب تم سارے ایمان لے آؤ اس فَاٰمِنُوْا میں تا قیامت انسانوں سے خطاب ہے۔ خیال رہے کہ ہر عبادت کا کوئی وقت ہے اور وقت کی ابتدا و انتہا ہے۔ ایمان کا وقت انسان کی ساری زندگی ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی ایمان لانا فرض ہوتا ہے اور مرتے وقت تک فرض رہتا ہے۔ غرغرہ کی حالت آئی اور ایمان کا وقت گیا تو غرغرہ کی حالت کا ایمان معتبر نہیں مگر چاہیے کہ ایمان جلد قبول کرے کیا خبر موت کب آئے اس لئے ف ارشاد ہوا۔ خَيْرًا یا تو اقصدوا پوشیدہ کا مفعول ہے۔ تب تو یہ دو جملے ہیں۔ یعنی ایمان لاؤ جو تمہارے واسطے خیر ہو، اخلاص والا ہو، نفاق والا ایمان نہ ہو کہ یہ نقصان دہ ہے یا كَانَ پوشیدہ کی خبر ہے یعنی وہ ایمان لانا تمہارے لئے خیر ہے وَاِنْ تَكْفُرُوْا، تَكْفُرُوْا كُفْر سے بنا ہے۔ کفر شکر کے مقابل ہو تو بمعنیٰ ناشکری ہوتا ہے۔ اگر ایمان کے مقابل ہو تو بمعنیٰ بے ایمانی ہوتا ہے کبھی بمعنیٰ انکار آتا ہے۔ یہاں چونکہ ایمان کے مقابل لہٰذا بمعنیٰ بے ایمانی ہے۔ کفر کی صدہا

قسمیں ہیں جن چیزوں کو مان کر ایمان ملتا ہے ان میں سے کسی چیز کا انکار کفر ہے فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہاں ف جزائیہ نہیں تعلیلیہ ہے جو پوشیدہ جزا کی علت بیان کر رہی ہے۔ لِلّٰہِ میں لام ملکیت عبدیت خلقت ہے نہ کہ نفع۔ مَا سے مراد تمام ماسوی اللہ ہے۔ خواہ عقل والی چیز ہو یا بے عقل آسمان بہت ہیں۔ زمین صرف ایک یعنی اگر تم سب لوگ کافر ہو جاؤ تو رب تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں اسی کی مملوک، اس کی مخلوق، اس کی عابد ہیں۔ تم کفر کرو گے تو اس کی سلطنت میں فرق نہ پڑے گا، تمہارا اپنا ہی نقصان ہے وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ كَانَ دوام واستمرار یعنی ہمیشگی کے لئے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے علم والا بھی ہے، حکمت والا بھی۔ حضور کو سب سے آخر میں بھیجنا اور آپ کو تمام جہان کا دائمی نبی کر دینا اس میں اس کی حکمتیں ہیں لہٰذا اس پر یہ اعتراض نہیں کہ پچھلے رسول اس صفت کے کیوں نہ ہوئے۔ یا کفار کو دنیا میں مہلت دینا آخرت میں عذاب دینا اس میں صدہا راز ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے تمام اولین وآخرین اور تمام جہان کے انسانو! تم سب کے پاس ہمیشہ کے لئے یہ آخری رسول، سب کے رسول، رسولوں کے رسول، شاندار رسول تشریف لے آئے۔ بسے عرب مگر آئے تمہارے ایمانوں جانوں میں پھر حق کے ساتھ موصوف ہو کر تشریف لائے جن کی ہر ادا برحق ہے۔ آئے تمہارے رب کے پاس سے اس کا کام کرتے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں ان کا زمانہ نصیب ہوا۔ پچھلے ان کے امتی ہونے کی تمنا کرتے چلے گئے۔ اب جب کہ تم نے ان کا زمانہ پالیا تو دیر نہ لگاؤ فوراً ان پر ایمان لے آؤ۔ اپنی بھلائی چاہو برائی نہ چاہو۔ یہ خیال رکھو کہ اگر تم سارے کے سارے کافر بن جاؤ تو ان کا اور رب تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ تمہارے کفر سے ان کی نبوت رب کی ملکیت میں کمی نہ آجاوے گی کیونکہ تمام آسمانوں زمین کی چیزیں اس کی مملوک، مخلوق وعابد ہیں، وہ سب کا معبود ہے، وہ مالک بھی ہے، علم والا بھی ہے، حکمت والا بھی۔ جو جسے دیا جان کر دیا، حکمت سے دیا، اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ یا اے مسلمانو! تمہارے یہ رسول وہی چیز لائے جو تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ اگر یہ رسول وہ حق تم کو لا کر نہ دیتے تو تمہیں کسی طرح عقل یا علم کے ذریعہ نہ ملتا صرف اس کے ہاتھوں تمہیں ملا یعنی قرآن، ایمان، عرفان وغیرہ۔ خیال رہے کہ جیسے کنویں، تالاب، چشموں، نہروں کا پانی بھی رب کا ہے مگر اسے ہم اپنی محنت سے حاصل کر لیتے ہیں۔ کنواں کھود کر، نہر دریا سے چیر کر اس لئے ہم ان پانیوں کے مالک ہوتے ہیں، انہیں فروخت کر سکتے ہیں مگر بارش کا پانی بلا واسطہ رب کا عطیہ ہے جو بادلوں کے ذریعہ ملتا ہے اس میں ہمارے عمل کو دخل نہیں نہ ہم اس کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بعض حق وہ ہیں جسے ہم عقل سے معلوم کر لیتے ہیں۔ جیسے سچ کی اچھائی، جھوٹ کی برائی عدل کی خوبی، ظلم کے نقصانات مگر قرآن، ایمان، نماز، عرفان وغیرہ ایسی حق چیزیں ہیں جو حضور ﷺ ہی کے ذریعہ ملی ہیں۔ ان میں ہماری عقل وعلم کو دخل نہیں۔ لہٰذا یہ حق بھی ہیں اور مِنْ رَّبِّكُمْ بھی ہیں۔ یہ چیزیں بارش ہیں اور حضور ان کے بادل۔ پھر خیال رہے کہ بادل اور بارش دو طرح کی ہوتی ہے۔ خصوصی بارش اور عالمگیر بارش۔ پچھلے نبی خصوصی بادل تھے جو خاص قوموں پر برسے ہمارے حضور عالمگیر رحمت کا بادل ہیں اور قرآن عالمگیر بارش اس لئے ارشاد ہوا مِنْ رَّبِّكُمْ۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ**: حضور ﷺ کا میلاد شریف بیان کرنا سنت الٰہیہ ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اپنے محبوب کا میلاد پاک بیان کیا اور بہت سی آیات میں آپ کا میلاد شریف مذکور ہے۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ (توبہ:۱۲۸) لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ الخ (آل عمران:۱۶۴) وغیرہ نیز قرآن مجید نے بیان فرمایا کہ حضرات انبیاء کرام بھی اپنی قوم کے سامنے حضور ﷺ کا میلاد شریف پڑھتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ (الصف:۶) غرض کہ میلاد پاک سنت الٰہیہ بھی ہے سنت انبیاء کرام بھی۔ **دوسرا فائدہ**: حضور ﷺ ساری خدائی کے دائمی رسول ہیں۔ کسی خاص قوم، خاص ملک، خاص وقت کے لئے نبی نہیں جیسا کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اور فَاٰمِنُوْا سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ**: حضور ﷺ رب کی طرف سے سب کچھ سیکھ کر سب کچھ بن کر دنیا میں تشریف لائے۔ ہم یہاں بننے آئے حضور بنانے آئے جیسا کہ قَدْ جَآءَكُمْ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ**: حضور ﷺ کی ولادت مکہ معظمہ میں ہوئی، سکونت مدینہ منورہ میں ہوئی مگر آپ کی تشریف آوری، جلوہ گری ہر مؤمن کے سینہ میں ہوئی۔ جیسے سورج رہتا ہے چوتھے آسمان پر مگر طلوع کرتا ہے سارے جہان پر جیسا کہ جَآءَكُمْ کی كُمْ ضمیر سے معلوم ہوا۔ عربی میں کہا جاتا ہے جِئْتُكَ اردو میں کہتے ہیں تمہارے پاس آیا جب کہ اس کے پاس پہنچ جاوے۔ حضور ﷺ کے لئے فرمایا گیا قَدْ جَآءَكُمْ وہ نبی تم سب کے پاس آئے۔ اس لئے ہر نمازی التحیات میں حضور کو سلام کرتا ہے۔ دور والے کو یا تو سلام لکھا جاتا ہے یا کہلوایا جاتا ہے اس کو سلام کیا نہیں جاتا۔ سلام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سامنے والا قریب ہو، سنتا ہو۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (احزاب:۶) یہ نبی مسلمانوں سے ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔ **پانچواں فائدہ**: حضور ﷺ خود بھی حق ہیں اور حضور کی ساری ادائیں حق ہیں حتیٰ کہ حضور کا نسیان و بھول بھی حق ہے۔ کہ اس سے ہزارہا مسائل ہوتے ہیں جیسے کہ بِالْحَقِّ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ**: اب حضور کو مانے بغیر کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا ہے اگرچہ سارے نبیوں کو مانتا ہو۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ان اہل کتاب کو ایمان لانے کا حکم دیا جو توحید، قیامت، حضرات انبیاء کرام کو مانتے تھے۔ حضور کے انکاری تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ ماننا ایمان نہیں۔ حضور کو ماننا ایمان ہے۔ **ساتواں فائدہ**: اب ہر انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ حضور پر ایمان لے آئے۔ حضور کو مانے بغیر خود انسان اور اس کے سارے کام شر ہیں خیر نہیں جیسا کہ ”خَيْرًا لَّكُمْ“ سے معلوم ہوا۔ **آٹھواں فائدہ**: اگر سارے انسان کافر ہو جائیں تو نقصان صرف ان کا ہے نہ کہ رب تعالیٰ کا نقصان ہے۔ نہ حضور ﷺ کا۔ رب تعالیٰ الوہیت میں اور حضور نبوت میں جہان سے بے نیاز ہیں جیسا کہ وَاِنْ تَكْفُرُوْا الخ سے معلوم ہوا۔ **نواں فائدہ**: حضور ﷺ بعد وفات بھی ہمارے پاس سے گئے نہیں۔ آپ کی تجلی ہر مومن کے دل و جگر جان و ایمان میں ویسے ہی ہے۔ قرآن کریم نے ان کا آنا تو بیان کیا مگر چلا جانا بیان نہ فرمایا۔ سورج غروب ہو کر ہمارے پاس سے جاتا نہیں، اس کی نورانیت چاند تاروں کے ذریعہ ہم کو ملتی

ہے اور اس کے اثرات سب موجود رہتے ہیں۔ قرآن کریم نے جگہ جگہ حضور کی آمد کا ذکر فرمایا۔ روانگی اور چلے جانے کا ذکر نہیں فرمایا۔ موت اور ہے اور دنیا سے چلا جانا کچھ اور۔ حضور کی وفات کے بعد کلمہ وہی رہا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد مصطفیٰ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ بعد وفات بھی رسول ہیں، نبی ہیں، شفیع المذنبین ہیں۔ **دسواں فائدہ:** ہم دنیا میں اپنے کام کے لئے آئے حضور ﷺ رب کے کام کے لئے ہمارے پاس آئے۔ حضور کے آنے میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ یونہی ہم اپنی ذمہ داری پر آئے، حضور رب تعالیٰ کی ذمہ داری پر تشریف لائے۔ جہاز میں مسافر بھی سوار ہوتے ہیں اور کپتان بھی۔ مگر دونوں کی سواریوں میں بڑا فرق ہے کہ مسافر پار لگنے کو سوار ہوتے ہیں، کپتان پار لگانے کو اسی لئے مسافر کرایہ دے کر بیٹھتے ہیں، کپتان تنخواہ لے کر سوار ہوتا ہے۔ اسلام کے جہاز میں ہم بھی سوار ہیں، حضور بھی۔ مگر ہم پار لگنے کو سوار ہیں، حضور پار لگانے کو سوار ہیں۔ یہ فائدہ بھی جَآءَکُمْ سے حاصل ہوا۔ اسی طرح ہمارے اور حضور کے اعمال میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ہمارے لئے نیک اعمال باعث فخر ہیں۔ اور نیک اعمال کے لئے حضور کا کر لینا فخر ہم کو فخر ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں اور نماز وقرآن کو فخر ہے کہ ہم کو حضور ﷺ نے پڑھا۔ **گیارھواں فائدہ:** تبلیغ اسلام کے لئے دو کام کرنے چاہئیں۔ حضور کے فضائل اسلام کے فوائد کا بیان۔ دیکھو یہاں رب تعالیٰ نے پہلے حضور کے چھ سات فضائل بیان فرمائے پھر حکم دیا "فَاٰمِنُوْا" پھر اسلام کے فوائد بیان کیے فرمایا خَیۡرًا لَّکُمْ کہ ایمان لانا تمہارے لئے دین دنیا میں خیر ہے۔ کیونکہ کسی چیز کی رغبت دو طرح ہی دی جاتی ہے۔ یا اس چیز کے فوائد بتا کر یا چیز والے کے فضائل سنا کر۔ حضور کی عظمت اگر دلنشین ہو جاوے تو قرآن، نماز، اسلام بلکہ رحمٰن کی عظمت دل میں قائم ہوگی۔ جن دلوں میں حضور کی عظمت نہیں، ان میں نہ قرآن کی عظمت ہے نہ کعبہ کی نہ خدا کی۔ ہم نے نجدیوں کو قرآن شریف پر پاؤں رکھتے اور کعبہ معظمہ کی طرف پاؤں پھیلا کر بیٹھتے دیکھا ہے اس لئے حضور ﷺ نے پہلے تبلیغ میں جو کوہ صفا پر کی پہلے اپنی پہچان کرائی۔ کہ فرمایا: کَیۡفَ اَنَا فِیۡکُمْ۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر حضور ﷺ ساری خدائی کے نبی ہیں تو یہاں صرف انسانوں سے خطاب کیوں ہے اور صرف انہی کو ایمان کا حکم کیوں ہے؟ **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر میں گزر گیا کہ حضور ساری خدائی کے نبی ہیں۔ رب فرماتا ہے۔ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًا (فرقان:۱) اور فرماتا ہے: وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (انبیاء:۱۰۷) مگر چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور نبوت سے اصل مقصود ہے اس لئے صرف اس کا ذکر ہوا۔ جیسے اللہ رب العالمین ہے مگر اس نے سورۃ ناس میں فرمایا مَلِکِ النَّاسِ۔ اِلٰہِ النَّاسِ جب انسان پر ہی حضور کی اطاعت واجب ہوگئی تو دوسری مخلوق پر بھی واجب ہوگئی نیز تمام مخلوق میں بڑے گناہ انسان ہی کرتا ہے۔ انسان نے دعویٰ خدائی کیا، انسان نے رب کے لئے بیوی اولاد مانی، انسان ہی بت پرستی کرتا ہے۔ جانور تک یہ حرکتیں نہیں کرتے۔ رب کی مرضی یہ تھی کہ اس مجرم جماعت کو ایک ایسی نعمت دی جائے جس سے وہ ملائکہ کا مخدوم بن جائے اور اشرف المخلوق ہونا اسے سج جائے لیکن اس کریم نے عشق مصطفوی کی امانت اس کو بخشی جیسے رب نے بھینس کو دودھ، شہد کی مکھی کو شہد، ہرن کو مشک،

سیپ کو موتی بخشا جس سے یہ چیزیں قابل قدر ہو گئیں۔ انسان کی عزت وقدر حضور کی برکت سے ہوئی اس لئے فرمایا: قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ۔

دوسرا اعتراض: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک نبی عرب میں رہ کر ہر جگہ ہر مؤمن کے پاس موجود ہو۔ ایک چیز کا بیک وقت ہر جگہ ہونا عقلاً ناممکن ہے لہٰذا جَآءَكُمْ کیونکر درست ہوا۔ **جواب:** مادی چیزوں پر نوری چیزوں کو قیاس کرنا درست نہیں۔ نور بیک وقت ہزار جگہ ہو سکتا ہے۔ ہمارا نور نظر جب آسمان کی سیر کرتا ہوتا ہے تو آنکھوں میں بھی ہوتا ہے۔ سورج آسمان پر رہ کر زمین کے ہر ذرہ میں تجلی فگن ہوتا ہے۔ حضور نے مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر ہاتھ بڑھایا تو جنت کے خوشہ میں پہنچ گیا (دیکھو باب صلوٰۃ الکسوف، بخاری) ہر مردہ کو قبر میں حضور کا دیدار کرا کر آپ کے متعلق سوال ہوتا ہے۔ لہٰذا جَآءَكُمْ فرمانا بالکل درست ہے۔

تیسرا اعتراض: اگر حضور انور ہر مسلمان کے پاس موجود ہیں تو کوئی مسلمان نماز میں امام نہیں بن سکتا کیونکہ حضور کی موجودگی میں کسی کو امامت کا حق نہیں۔ **جواب:** امامت کے لئے تین شرطیں ہیں۔ امام کا موجود ہونا، امام کا محسوس ہونا تاکہ مقتدی اس کی پیروی کرے، اس کے قیام پر قیام کرے، رکوع، سجود پر رکوع سجود کریں اور امام کا اپنی فرض نماز ادا نہ کر چکنا۔ جو امام فرض پڑھ چکا وہ امامت نہیں کر سکتا۔ حضور ﷺ ہر مؤمن کے پاس موجود تو ہیں مگر ہم کو محسوس نہیں نیز سرکار اپنے فرائض ادا فرما چکے ہیں لہٰذا یہ سوال محض لغو ہے۔

چوتھا اعتراض: اگر حضور کی ہر ادا حق ہے تو آپ کی نمازیں قضا بھی ہوئی ہیں کیا وہ بھی حق ہے۔ **جواب:** بے شک وہ بھی حق ہیں۔ ہماری غلطیاں بھول وغیرہ نفسانی وشیطانی بھی ہوتی ہیں مگر ان کی خطائیں رحمانی ہی ہوتی ہیں۔ جن سے ہزار ہا مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ آدم علیہ السلام کی ایک خطا یعنی گندم کھانے پر سارے عالم کا ظہور ہوا۔

پانچواں اعتراض: اللّٰہ تعالیٰ نے حضور کو بے شمار صفتیں عطا فرمائیں ہیں مگر یہاں بھی اور کلمہ طیبہ میں رسول کیوں فرمایا گیا، نبی بشیر ونذیر کیوں نہ ارشاد ہوا؟ **جواب:** دنیا آخرت کا اور عالم شہادت عالم غیب کا نمونہ ہے۔ دنیوی سلطنتوں میں تین قسم کے محکمے ہوتے ہیں۔ داخلی محکمے جن کا تعلق اندرونی ملک سے ہوتا ہے جس کا افسر اعلیٰ وزیر داخلہ ہوتا ہے۔ اور خارجی محکمے جن کا تعلق بیرون ملک سے ہوتا ہے جن کا افسر اعلیٰ وزیر خارجہ ہوتا ہے اور تیسرا محکمہ ان دونوں محکموں کو ملانے والا ہے جسے محکمہ مواصلات کہتے ہیں جس کے ذریعے ان دونوں محکموں کے تعلقات بلکہ خود بادشاہ کے رعایا کے ساتھ تعلقات قائم رہتے ہیں۔ جیسے آج کل ریڈیو، اور بی بی سی، تار ڈاک کے محکمے۔ اگر یہ محکمے نہ ہوں تو سلطان رعایا سے بے تعلق ہو جاوے، ممالک کٹ جاویں۔ رب تعالیٰ کا ملک عالم غیب بھی ہیں، عالم شہادت بھی اور رسالت ونبوت کا محکمہ گویا مواصلات ہے۔ رسول کا تعلق ان دونوں عالموں سے ہے بلکہ خود رب تعالیٰ جسے جو دیتا ہے رسول کی معرفت دیتا ہے۔ قرآن، کلمہ، عبادات، معاملات رب نے مخلوق کو حضور ہی کی معرفت دیئے اور مخلوق کی دعائیں تو یہ عرض ومعروض بارگاہِ الٰہی میں حضور ہی کی معرفت

پیش ہوتی ہیں۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ (النساء: ۶۴) حضور خالق و مخلوق اور عالم غیب وشہادت کے درمیان برزخ کبریٰ ہیں اس لئے رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو حضور کے علم، حضور کی عطا، حضور کے وسیلے کا انکار کرے وہ حضور کی نبوت ورسالت کا انکار کرتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیبی نور ہیں جو عالم اجسام کی طرف بھیجے گئے ہیں جس میں اس نور کے قبول کرنے کی قابلیت ہے وہ منور ہو جاتا ہے، جو اس کا نا اہل ہو وہ تاریکی میں ہی رہتا ہے۔ ہر شخص کے نفس کی باگ کسی کے ہاتھ میں رہتی ہے تو بہتر ہے کہ ہماری باگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست اقدس میں ہو۔ اس لئے فرمایا کہ اے لوگو! ایمان لے آؤ، اپنا بھلا چاہو۔ ہر شخص دنیا کے کنویں میں ہے اس پر واجب ہے کہ اوپر کو ترقی کرلے یہ ترقی حضور کے ذریعے سے ہو سکتی ہے اور حضور سے نسبت آپ کی اطاعت اور محبت ہی سے حاصل ہوتی ہے (روح البیان)۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہدایت کا مرکز، رحمت کا خزانہ ہیں۔ کسی کو حضور کی صورت دیکھ کر ایمان ملا، کسی کو سیرت دیکھ کر، کسی کو سخاوت دیکھ کر، کسی کو شجاعت دیکھ کر، کسی کو فقط نام سن کر۔ خزانہ ایک ہے دروازے علیحدہ علیحدہ ''فَاٰمِنُوْا'' میں ہر بھکاری کو حکم ہے کہ ان سے ایمان لو خواہ کچھ دیکھ کر لو۔ دروازے پر آجاؤ خالی نہ جاؤ گے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم میں تشریف لانا ایسا ہے جیسے جسم میں جان کا آنا۔ کہ جان جسم کے رگ وریشہ میں رہتی ہے مگر آنکھوں سے چھپی ہے۔ ذات مخفی ہے فیض ہر آن ظاہر ہے۔ خیال رہے کہ بعض چیزیں گندگی میں جا کر خود گندی ہو جاتی ہیں جیسے تھوڑا پانی اور عام چیزیں مگر بعض چیزیں وہ ہیں کہ اگر وہ گندگی میں پہنچ جاویں یا گندی چیز ان میں آجاوے تو یہ خود گندی نہ ہوں مگر اس گندگی کو پاک کر دیں۔ جیسے سورج کی کرنیں یا بہتا ہوا پانی یا سمندر۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ نورانی سمندر ہیں جو گندوں میں تشریف لائے، انہوں نے ہمارا اثر نہ لیا۔ ہم گندوں کو پاک فرما دیا۔ خود رب تعالیٰ نے فرمایا: وَيُزَكِّيهِمْ (آل عمران: ۱۶۴) ہمارے محبوب ان سب کو پاک فرماتے ہیں۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى

اے کتاب والو! نہ زیادتی کرو بیچ دین اپنے کے اور نہ کہو اوپر

اے کتاب والو! اپنے دین میں زیادتی نہ کرو اور اللہ پر

اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ

اللہ کے مگر حق بات۔ بجز اس کے نہیں کہ مسیح عیسیٰ بیٹے مریم کے

نہ کہو مگر سچ مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا

رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْیَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ٘ فَاٰمِنُوْا

رسول ہیں اللہ کے اور کلمہ ہیں اس اللہ کا کہ ڈالا اس کو طرف مریم کے اور جان ہیں طرف سے اس کے پس ایمان لاؤ

اللہ کا رسول ہی ہے اور اس کا ایک کلمہ کہ مریم کی طرف بھیجا اور اس کے یہاں کی ایک روح تو اللہ

بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا

ساتھ اللہ کے اور پیغمبروں اس کے اور تین نہ کہو باز آ جاؤ چاہو بھلائی اپنی بجز اس کے نہیں کہ

اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تین نہ کہو باز رہو اپنے بھلے کو اللہ تو

اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى

اللہ معبود ہے ایک پاکی ہے واسطے اس کے یہ کہ ہو واسطے اس کے بچہ اس کی ہیں وہ چیزیں

ایک ہی ہے خدا ہے پاکی ہے اسے اس سے کہ اس کے کوئی بچہ ہو اسی کا مال ہے

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ ع

جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور کافی ہے اللہ کام بنانے والا

جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کافی کارساز

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے کئی طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں یہودیوں کو تبلیغ اسلام فرمائی گئی تھی۔ اب اس آیت کریمہ میں عیسائیوں کو دعوت اسلام دی جا رہی ہے۔ یہ دونوں قومیں عرب میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان کے ایمان لے آنے سے دوسروں کے ایمان لے آنے کی قوی امید تھی۔ اس لئے خصوصیت سے قرآن مجید نے انہیں تبلیغ فرمائی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بے ادبی کرنے کی تردید کی گئی۔ اب ان کی شان میں حد سے بڑھنے کی تردید کی جا رہی ہے یعنی تفریط سے پہلے روکا گیا تھا افراط سے اب روکا جا رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں لوگوں کو ایمان کا حکم دیا گیا اب ایمان لانے کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے کہ کسی نبی کو اللہ یا اللہ کا بیٹا نہ کہا جائے۔ ہر نبی کو اللہ کا بندہ اور رسول مانا جاوے۔ نبی کو نہ ماننا اور نبی کو خدا ماننا دونوں یکساں کفر ہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ایمان کا خصوصی حکم دیا گیا تھا کہ سب لوگوں کو پکار کر فرمایا گیا تھا: فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ (النساء: ۱۷۰) اب ایمان کا خصوصی حکم دیا جا رہا ہے اہل کتاب کو۔

شان نزول

بعض علماء نے فرمایا کہ یہ آیت کریمہ عیسائیوں کی تردید میں نازل ہوئی جو جناب عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں افراط کر کے غلو کرتے تھے، بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کا نزول عیسائیوں یہودیوں دونوں کے متعلق ہے کہ عیسائی تو افراط کر کے غلو کرتے ہیں۔ اور یہودی آپ کی شان میں تفریط دکی کر کے غلو کرتے تھے۔ لہٰذا اس آیت ... (تفسیر ...)

تفسیر یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ، یہاں بھی تا قیامت اہل کتاب سے خطاب ہے، کسی وقت میں ہوں کسی جگہ ہوں۔ یہاں ان کو پکارنا غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ہے کہ یہود ونصاریٰ دونوں اگر عیسیٰ علیہ السلام کے حالات سے غافل نہ ہوتے تو یہودی انہیں گالیاں نہ دیتے اور عیسائی انہیں خدا کا بیٹا نہ کہتے اس غفلت سے جگانے کے لئے یَا سے خطاب فرمایا گیا۔ اگر چہ یہود ونصاریٰ پکے کافر ہیں مگر چونکہ انہیں نبیوں کی طرف نسبت ہے اگر چہ جھوٹی ہی سہی اس لئے انہیں کافر کہہ کر نہ پکارا، اہل کتاب کہہ کر پکارا۔ جب ان نبیوں کی طرف نسبت سے نام وکام بدل گئے تو جس کو حضور ﷺ سے سچی نسبت ہو جائے اس کو کیسے رنگ لگیں گے۔ نسبت نبی کی بہت صورتیں ہیں۔ ساتھ بیٹھنے کی نسبت، رہنے کی نسبت اولاد یا بیوی ہونے کی نسبت اور امتی ہونے کی نسبت۔ ان تمام نسبتوں میں امتی ہونے کی نسبت بہت معتبر ہے، وہ ہی قوی ہے۔ یہ نسبت نہ زمانہ کا اتحاد چاہتی ہے نہ جگہ کا اتحاد۔ یہ نسبت گویا کیمیا ہے جو انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ اگر یہ آیت عیسائیوں کے متعلق ہے تو کتاب سے مراد انجیل شریف اور اہل کتاب سے مراد عیسائی ہیں اور اگر یہ آیت یہود ونصاریٰ دونوں کے متعلق ہو تو کتاب سے مراد توریت وانجیل دونوں ہیں اور اہل کتاب سے مراد یہود ونصاریٰ دونوں قومیں ہیں جیسا کہ ہم نزول میں ابھی عرض کر چکے ہیں۔ **خیال رہے:** کہ اہل کتاب کے معنی ہیں کتاب والے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں کتاب کے ماننے والے اور کتاب کے علم والے۔ پہلی صورت میں سارے کتابیوں سے خطاب ہے۔ عالم ہوں یا جاہل اور دوسری صورت میں ان کے پوپ پادریوں سے خطاب ہے لہٰذا اس کلمہ کی چار تفسیریں ہیں۔ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ۔ لَا تَغْلُوْا کا مادہ ہے غلا یا غلو ہے جس کے معنی ہیں حد سے ہٹ جانا یا حد سے بڑھ جانا۔ چیز مہنگی ہونے کو غلا کہا جاتا ہے، کسی کی قدر ومنزلت میں حد چھوڑنے کو غلو کہا جاتا ہے۔ ہانڈی کے جوش مارنے کو غلیان کہا جاتا ہے۔ رب فرماتا ہے: یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْیِ الْحَمِیْمِ ﴿۴۶﴾ (الدخان: ۴۵۔۴۶) یہاں اگر روئے سخن عیسائیوں سے ہے تو لَا تَغْلُوْا کے معنی ہیں حد سے آگے نہ بڑھو اور اگر عیسائی یہودی دونوں سے ہے تو لَا تَغْلُوْا کے معنی ہیں حد سے نہ ہٹو۔ اس صورت میں افراط وتفریط دونوں کو شامل ہوگا۔ دین کے معنی سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں عرض کیے گئے یہاں اتنا سمجھ لو کہ دین سے مراد عقائد ہیں۔ نیک اعمال کو دین نہیں کہا جاتا بلکہ دینی کام کہا جاتا ہے، بدعمل کو بے دین یا بددین نہیں کہتے۔ دِیْنِكُمْ میں دین کی نسبت ان کی طرف اختیار کرنے کی ہے۔ یعنی اپنے اختیار کیے ہوئے دین میں حد سے نہ بڑھو۔ عیسائیوں یہودیوں میں عملی غلو بھی تھا، عقائد کا غلو بھی تھا۔ ترک دنیا، حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا، دنیا کے آرام، نکاح اولاد سے پرہیز کرنا ان کا عملی غلو بھی تھا اور حضرت عیسیٰ وعزیر علیہم السلام کی شان میں افراط وتفریط کرنا عقیدے کا غلو ہے۔ ان دونوں غلوؤں سے روکا گیا۔ مسلمانوں میں بھی ایسے غلو آ گئے ہیں اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ یہ عبارت پہلی عبارت لَا تَغْلُوْا کی گویا تفسیر ہے۔ چونکہ عیسائیوں نے جو عقیدے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق گھڑ لئے تھے۔ ان سے ذات باری تعالیٰ کی الوہیت باقی رہتی ہی نہ تھی۔ کیونکہ عیسائیوں کے چار فرقے ہو گئے تھے۔ یعقوبیہ، ملکانیہ۔ ان دونوں کا عقیدہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم خود رب ہیں اور نسطوریہ کا عقیدہ تھا کہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام خداتعالیٰ کے بیٹے ہیں اور جناب مریم اللہ کی بیوی۔ مرقو سیہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک جوہر ہیں جن میں تین اقنوم ہیں۔ باپ، بیٹا، روح القدس نیز وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں اپنے باپ یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے الوہیت ہے اور ماں جناب مریم کی طرف سے ناسوتیت۔ ان عقائد سے اللہ تعالیٰ کی توحید بلکہ اس کی ذات و صفات کا انکار لازم آتا ہے اس لئے ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق حق بات ہی کہو (تفسیر خازن)۔ حق بات سے مراد یا تو حق عقیدہ ہے یا حق بات یا اللہ تعالیٰ کے لائق اعتقاد۔ **خیال رھے**: کہ ایک یہودی پولس عیسائی بنا اور اس نے عیسائیوں کے عقیدے بگاڑنے کے لئے یہ عقیدے ان میں رائج کیے جس کا ذکر انشاء اللہ سورۂ توبہ میں آئے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے متعلق شریک ہونے یا باپ و خاوند یا حلول یا اتحاد کے عقیدے نہ رکھو۔ وہ عقیدے رکھو جو اس کی شان کے لائق ہیں وہ، وہ ہی ہیں جو اسلام نے سکھائے۔ **خیال رھے**: کہ حق بمعنی درست بھی آتا ہے اور بمعنی حقیقی یا لائق۔ یہاں دونوں معنی ٹھیک ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے متعلق ٹھیک عقیدہ ہی رکھو یا اس کے متعلق وہ عقیدہ رکھو جو اس کی شان کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کسی طرح لائق نہیں، اولاد فانی چیز کے لئے ہوتی ہے تاکہ اس کی نسل رہے۔ فرشتوں کے لئے اولاد نہیں کیونکہ انہیں تا قیامت فنا نہیں۔ جنتی لوگوں کی اولاد نہیں کیونکہ انہیں فنا نہیں۔ تو وہ رب تعالیٰ جو قدیم و ازلی و ابدی ہے اس کے لئے اولاد کیسی؟ نیز اولاد، بیوی، باپ اور خاوند کی ہم جنس ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ جنس سے پاک ہے۔ **اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ** یہ عبارت **لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ** کی گویا تفسیر و تشریح ہے اس میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کی پانچ صفات بیان ہوئیں۔ آپ مسیح ہیں، آپ جناب مریم کے فرزند ہیں، آپ اللہ کے رسول و نبی ہیں، اللہ کا کلمہ ہیں، اللہ کی طرف سے آئی ہوئی روح ہیں۔ تین وصف کا یہاں ذکر ہوا۔ دو وصفوں کا ذکر اگلے جملے میں ہے۔ مسیح آپ کا مشہور لقب ہے۔ جیسے اسلام میں صدیق، فاروق جناب ابوبکر و عمر کی صفات ہیں۔ یہ عبرانی زبان میں میشح تھا یعنی مبارک (روح البیان)۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ **وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا** (مریم: ۳۱) چونکہ ہر قسم کی برکتیں آپ کے دم قدم سے وابستہ تھیں اسی لئے آپ کو میشح کہتے تھے۔ یا یہ الفاظ عربی ہے مسح یا مساحت یا مسح سے بنا یعنی چھو کر مردے زندہ، بیمار کو اچھے کرنے والے یا ہمیشہ سفر کرنے والے یا سیر و سیاحت میں زندگی گزارنے والے۔ چونکہ آپ کی پیدائش بغیر باپ صرف ماں سے ہوئی اس لئے آپ کو ابن مریم فرمایا جاتا ہے۔ ورنہ قرآن مجید میں نہ تو کسی عورت کا نام لیا گیا سوا مریم کے اور نہ کسی نبی کو ماں یا باپ کی طرف نسبت سے ذکر کیا گیا۔ ہم کو حکم دیا گیا **اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىٕهِمْ** (احزاب: ۵) لوگوں کو ان کے باپوں کی طرف نسبت کر کے پکارو نیز آپ فرماتے ہیں **وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ** (مریم: ۳۲) مجھے رب تعالیٰ نے اپنی ماں سے بھلائی کرنے والا بنایا۔ اگر آپ کے والد بھی ہوتے تو **بِوَالِدَیَّ** ارشاد ہوتا کیونکہ بیٹے پر ماں باپ دونوں کی خدمت لازم ہے۔ فرماتا ہے: **وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا** (بقر: ۸۳) ان قوی دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش صرف ماں سے ہے۔ تیسری صفت بیان ہوئی **رَسُوْلُ اللّٰهِ** رسول اللہ یعنی وہ ابن اللہ خدا کے بیٹے نہیں، رسول اللہ ہیں۔ رسول کے معنی اور نبی، رسول، مرسل میں فرق بارہا بیان ہو چکا ہے۔ **وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْیَمَ**

یہ عبارت رسول اللہ پر معطوف ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی تیسری صفت ہے۔ عربی میں کلمہ کئی معنوں میں آتا ہے۔ لغوی کلمہ، نحوی کلمہ، شرعی کلمہ، منطقی کلمہ جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے۔ یہاں لغوی کلمہ مراد ہے بمعنی بات یا بمعنی امر اس سے مراد کلمہ کن ہے۔ جو حضرت جبرائیل نے کہا کہ جناب مریم کے سینہ پر دم فرمایا اگرچہ زبان و دہان جبرائیل کا تھا مگر یہ کلمہ رب تعالیٰ کا۔ اس لئے ''کلمۃ'' میں کلمے کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کی گئی جیسے ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں تو زبان و دہان ہمارا ہوتا ہے اور کلام رب تعالیٰ کا۔ یا یوں کہو کہ حضرت جبرائیل اللہ کے مقرب بندے ہیں اس لئے ان کا کلمہ رب تعالیٰ کا کلمہ ہے۔ یہ ہی تحقیق اَلْقٰهَآ میں ہے کہ یہ کلمہ دم کرنے والے حضرت جبرائیل ہیں۔ مگر اس دم کو حضرت مریم کے شکم شریف میں پہنچانے والا رب تعالیٰ ہے۔ لہٰذا القا کا فاعل رب ہے یا حضرت جبرائیل کا القا رب تعالیٰ کا القا ہے چونکہ یہ کلمہ دم کیا گیا سینہ شریف پر اور پہنچا شکم شریف میں، براہ راست شکم میں دم نہ کیا گیا اس لئے اِلٰى مَرْيَمَ ارشاد ہوا، فِيْ مَرْيَمَ ارشاد نہ ہوا۔ یا اس کلمہ کی ابتداء ذات باری ہے انتہا جناب مریم لہٰذا الٰی فرمایا گیا جیسے وحی الٰہی کا حال ہے۔ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ یہ عبارت كَلِمَتُهٗ پر معطوف ہے اور حضرت مسیح کی چوتھی صفت۔ اصطلاح عرب میں روح کئی معنی میں بولا جاتا ہے۔ پاک ولطیف چیز چونکہ آپ بغیر نطفے پیدا ہوئے اور جناب مریم کو حیض ونفاس سے پاک وصاف رکھا گیا اس لئے آپ کو روح فرمایا گیا (۲) حیات ظاہری یا حیات باطنی کا ذریعہ جیسے اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (شوریٰ:۵۲) چونکہ آپ باطنی زندگی کا ذریعہ تھے نیز آپ کا دم مردوں میں ظاہری زندگی کا ذریعہ تھا لہٰذا آپ کو روح فرمایا گیا (۳) رحمت رب فرماتا ہے۔ رَحْمَةً مِّنَّا (ص:۴۳) چونکہ آپ بنی اسرائیل پر اللہ کی رحمت تھے لہٰذا آپ روح اللہ ہوئے۔ دم و نفخ، ریح، رَوح، رُوح قریب المعنی ہیں۔ چونکہ آپ کی پیدائش حضرت جبرائیل کے دم و نفخ سے ہوئی اور ان کا دم فرمانا رب کی طرف سے تھا لہٰذا آپ کو روح اللہ کہا گیا۔ رب فرماتا ہے: فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (انبیاء:۹۱) بہر حال رُوْحٌ مِّنْهُ فرمانے میں بہت حکمتیں ہیں (کبیر)۔ ہم سب کو رب نے پانی سے بنایا۔ ہم جما ہوا پانی ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہوا سے بنایا۔ آپ ہوا یعنی نفخ جبرئیل پر کھینچی ہوئی ربانی تصویر ہیں۔ یہ اس کی قدرت ہے کہ پانی پر نقشہ کھینچ دے یا ہوا پر۔ کوئی مصور پانی یا ہوا میں تصویر نہیں بنا سکتا۔ مصرع

کہ کردہ است بر آب صورت گری

مِّنْهُ کی من ابتدائیہ ہے نہ کہ تبعیضیہ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح نہ کہ اللہ کا ٹکڑا۔ جیسے قرآن کریم فرماتا ہے: وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (جاثیہ:۱۳) اس آیت میں بھی من ابتدائیہ ہے نہ کہ تبعیضیہ تمام عالم رب کی طرف سے ہے رب میں سے نہیں۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ یہ جملہ پہلی عبارتوں پر متفرع ہے۔ یعنی چونکہ واقعہ وہ ہے جو ہم نے بیان فرمایا۔ لہٰذا اے عیسائیو! یا اے یہودیو! عیسائیو! اللہ تعالیٰ کے تمام رسولوں کو صحیح طور پر مانو جس ماننے کا نام ایمان ہے۔ **خیال رہے**: کہ تمام نبیوں پر اجمالی ایمان ہے۔ اور حضور پر تفصیلی ایمان ہم پر کسی اور نبی کی اطاعت لازم نہیں کہ ان کے دین منسوخ ہو چکے۔ حضور کی اطاعت لازم ہے کہ ہم حضور کے امتی ہیں اور حضور کا دین منسوخ نہیں نیز اور

نبیوں کے حکم صرف اس جہان میں رہے، ہمارے حضور کا کلمہ یہاں قبر میں، حشر میں بلکہ جنت میں بھی ہے، جنت کی ہر چیز پر حضور کا کلمہ لکھا ہوا ہے۔ یہ فرق ہے حضور پر ایمان لانے میں اور دوسرے نبیوں پر ایمان لانے میں۔ مگر ایمان سب رسولوں پر ہے۔ جناب مسیح کو صرف بشر ماننا نبی نہ ماننا یا ان کو خدا یا خدا کا بیٹا ماننا ایمان نہیں صریحی کفر ہے۔ آنجناب کو عبداللہ اور رسول اللہ مانو۔ اسی طرح انبیائے کرام کا انکار کر کے خدا تعالیٰ کو ماننا ایمان نہیں۔ ایمان یہ ہے کہ رب تعالیٰ کو نبی کی معرفت مانو اس لئے فرمایا: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ۔ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَۃٌ یہ جملہ گویا ''فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ'' کی شرح ہے اس میں خطاب یہود سے نہیں صرف عیسائیوں سے اور عیسائیوں کے بھی اس فرقے سے جو عیسیٰ علیہ السلام کو دوسرا خدا اور جناب مریم کو تیسرا خدا مانتے ہیں۔ ثَلٰثَۃٌ خبر ہے پوشیدہ مبتدا اِلٰہٌ کی یعنی یہ نہ کہو کہ معبود تین ہیں اِنْتَہُوْا خَیْرًا لَّکُمْ یہ جملہ پچھلے جملوں کا تتمہ ہے۔ پہلے حکم دیا گیا ایمان کا اب حکم دیا گیا تثلیث کے عقیدہ سے باز آ جانے کا۔ یا یوں کہو کہ ہر قوم کو مسلمان بناتے وقت اس کے پرانے دین سے اس دین کے عقائد سے توبہ کرائی جاتی ہے۔ چونکہ عیسائی تثلیث کے قائل تھے اس لئے صراحۃً اس سے توبہ کا حکم دیا گیا۔ ''اِنْتَہُوْا'' کا متعلق اور خیر کا عامل فعل پوشیدہ ہے یعنی اِنْتَہُوْا عَنِ التَّثْلِیْثِ وَاقْصِدُوْا خَیْرًا لَّکُمْ تثلیث سے باز آ جاؤ اور اپنی بھلائی چاہو۔ یا یَکُنْ خَیْرًا لَّکُمْ تثلیث سے باز آ ؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ یہ جملہ پچھلے حکم کی علت ہے یعنی تمہارا تثلیث کے عقیدے سے توبہ کر لینا بہتر ہوگا کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سچا معبود ہے۔ جیسے ہر کثرت کی انتہا وحدت پر ہے کہ درخت میں پتے، شاخیں بہت مگر جڑ ایک۔ انسان کے اعضاء بال وغیرہ بہت مگر دل ایک ریل میں ڈبے بہت مگر انجن ایک، ملک میں رعایا بہت مگر بادشاہ ایک، آسمان پر تارے بہت مگر سورج ایک۔ یوں ہی مخلوق بہت مگر خالق ایک، جب ایک شخص کے دو والد یا دو والدہ نہیں ہو سکتے تو ایک مخلوق کے دو خالق کیسے ہو سکتے ہیں؟ سُبْحٰنَہٗٓ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ یہ جملہ رب تعالیٰ کی وحدانیت کا بیان ہے یعنی وہ ایسا واحد ہے کہ اولاد سے پاک کیونکہ اولاد، جنس، نوع، فصل نوع سے پاک ہے کہ اس میں تعدد ہے۔ یہ بھی وحدانیت کے خلاف ہے تو اس کے اولاد کیسی نیز اولاد بقاء نسل کے لئے ضروری ہوتی ہے اور بقاء نسل اسے چاہیے جسے فنا ہو، غیر فانی ذات کی نسل کیسی۔ دیکھو چاند سورج جو صرف قیامت تک باقی ہیں ان کی اولاد نہیں تو رب کی اولاد کیسی؟ خیال رہے کہ ولد، بیٹا بیٹی دونوں کو کہتے ہیں، ابن بیٹے کو بنت بیٹی کو۔ مشرکین تو فرشتوں، تاروں کو رب تعالیٰ کی بیبیاں مانتے تھے عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو، یہود عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ اس ایک جملہ میں تینوں کی تردید ہو گئی لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یہ پچھلے جملہ کی دلیل ہے۔ اس کی تفسیر بارہا ہو چکی ہے۔ یعنی اللہ تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے۔ لہٰذا وہ اولاد سے پاک ہے۔ کیونکہ کوئی شخص اپنے بیوی بچوں کا مالک نہیں ہوتا۔ بنوت، زوجیت کبھی ملکیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے اور جناب مریم اس کی بیوی ہوتیں نعوذ باللہ تو رب تعالیٰ ان کا مالک اور وہ دونوں اس کے مملوک نہ ہوتے حالانکہ وہ دونوں بھی زمین کی مخلوق ہیں۔ عبد کبھی اپنا جز نہیں ہوتا وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا یہ جملہ گزشتہ کی دلیل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کی کارسازی خود فرماتا ہے۔ وہ قادر مطلق ہے لہٰذا وہ اولاد سے پاک ہے۔ باپ

چونکہ اکیلا اپنے سارے کام نہیں کرسکتا اس لئے وہ بیٹیوں اور بیٹوں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ غنی ہے پھر اسے بیٹے بیٹی کی کیا ضرورت ہے۔ وکیل کی تفسیر بار ہا ہو چکی ہے۔

خلاصہ تفسیر تفسیر میں عرض کیا جا چکا کہ اس آیت کریمہ میں خطاب یا تو یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے یا صرف نصاریٰ سے۔ دوسرا احتمال زیادہ قوی ہے۔ اسی کا ہم خلاصہ عرض کرتے ہیں۔ اے کتاب یعنی انجیل کے ماننے والو! یا انجیل کا علم رکھنے والو! اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کو عبدیت سے بڑھا کر انہیں الہ یا الہ کا جز (بیٹا) یا اللہ کا حلول مان لو اور اپنے پوپ پادریوں کو حلال و حرام گناہ کی بخشش کا مالک مان لو اور حلال چیزوں کو حرام اور حرام کو حلال مان لو۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر سچ بولو، اپنی طرف سے انجیل میں زیادتی کر کے اسے کلام الٰہی نہ بناؤ اور اس کے لئے باطل صفات ثابت نہ کرو۔ یہ ہی حق ہے کہ حضرت مسیح یعنی عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اللہ کے بندے، اس کے رسول ہیں اور اللہ کا کلمہ ہیں کہ حضرت جبریل نے کلمہ کن کہہ کر جناب مریم کے گریبان (سینہ) پر دم کیا، وہ حاملہ ہو گئیں، ان کا حمل خاوند کے نطفہ سے نہ ہوا، کلمہ کن سے ہوا اور آپ اللہ کی طرف سے آئے ہوئے روح یا رحمت یا پاکیزہ ذات ہیں لہٰذا تم لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے سارے نبیوں پر صحیح ایمان لے آؤ۔ یہ نہ کہو نہ سمجھو کہ الٰہ تین ہیں باپ، بیٹا، روح القدس، یعنی اللہ تعالیٰ، جناب عیسیٰ، مریم۔ اس تثلیث کے عقیدے سے باز آجاؤ اپنا بھلا چاہو۔ یقین کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات، صفات، شانوں میں ہر طرح اکیلا ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو۔ جو ہر طرح واحد ہو اس کے لئے اولاد ناممکن ہے نیز تمام آسمانوں اور زمین کی چیزوں کا وہ مالک ہے۔ اگر اس کا بیٹا بیٹی یا بیوی ہوتی تو وہ اس کا مالک نہ ہوتا اس کی ملکیت ناقص ہوتی نیز اللہ تعالیٰ سارے عالم کی کارسازی کے لئے کافی ہے۔ اسے عالم چلانے کے لئے کسی بیٹے پوتے یا شریک ساجھی کی ضرورت نہیں۔ جب وہ مالک بھی ہے، خالق بھی غنی و بے نیاز بھی پھر اس کے لئے اولاد ماننا کیسی جہالت ہے؟ **خیال رہے:** کہ بعض انسان کسی کے احکام ڈر سے مانتے ہیں، بعض لالچ سے اور بعض دلائل سے اس لئے اللہ تعالیٰ نے کبھی دوزخ کے عذاب کا ذکر فرما کر ایمان کی طرف دعوت دی۔ کہیں جنت کے ثوابوں کا ذکر فرما کر اور کہیں دلائل بیان فرما کر یہاں تیسری قسم کی تبلیغ ہے کہ دلائل بیان فرمانے کے بعد فرمایا فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ماننے کی یہ تین صورتیں عقل کے لئے ہیں۔ کہ عقل ان تینوں طریقوں سے مانتی ہے مگر طبیعت اور عقل کا ماننا نرالا ہے وہ عشق و محبت سے ماننا ہے ہم اپنی اولاد، ماں، باپ، دوستو، معشوق کو عقل سے نہیں دلیل سے نہیں بلکہ دل سے مانتے ہیں۔ عقل سے ماننا کمزور ہے دل سے ماننا قوی۔

فائدے اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** عام تبلیغ کے ساتھ بعض خاص لوگوں کو خصوصی تبلیغ بھی کرنا سنت الٰہیہ ہے۔ جب کہ ان خاص کے ایمان قبول کر لینے سے دوسرے بہت لوگوں کے ایمان لانے کی امید ہو دیکھو اللہ تعالیٰ نے یہاں اہل کتاب کو خاص طور پر دعوت ایمان دی کہ ان کے ماننے والے عرب میں بہت تھے، ان کا ایمان بہت لوگوں کے ایمان کا ذریعہ [illegible] اہل کتاب کے دو معنی ابھی ہم نے عرض کر

دیئے۔ **دوسرا فائدہ:** غیر فرض کو فرض سمجھ لینا اور حلال چیزوں کو حرام سمجھ لینا، نبیوں ولیوں کو خدا یا خدا کی طرح مان لینا، عالموں پیروں کو حرام وحلال کا مالک سمجھ لینا دین میں غلو ہے اور عیسائیوں کا طریقہ، اس سے ان سادہ لوح مسلمانوں کو عبرت پکڑنی چاہیے جو طیب وحلال چیزوں کو حرام جاننے کو تقویٰ وترک دنیا کو دین سمجھ لیتے ہیں۔ حرام سے بچنے کا نام تقویٰ ہے نہ کہ حلال سے بچنے کا نام۔ بعض لوگ گوشت نہیں کھاتے اور بھنگ چرس پیتے ہیں پھر اپنے کو پہنچا ہوا ولی سمجھتے ہیں۔ یہ ہے غلو۔ بعض لوگ اپنے پیروں مولویوں کو حرام وحلال کا مالک جانتے ہیں کہ جو ان کے مولویوں نے حرام کہہ دیا خواہ اس کی حرمت کی کوئی دلیل نہ ہو مگر اسے حرام ہی کہے جائیں گے۔ یہ ہے غلو۔ اسی بیماری میں آج کل کے وہابی و دیوبندی بہت مبتلا ہیں۔ حضور کو نور کہنا شرک سمجھتے ہیں۔ اپنے مولوی رشید احمد صاحب کو نور مجسم کہتے ہیں (تذکرۃ الرشید)۔ بزرگوں کے عرس کو حرام وشرک کہتے ہیں، اپنے مولویوں پیروں کی یادگاریں اور دن مناتے ہیں۔ جو کفریات ان کے بزرگوں کے زبان وقلم سے نکل گئے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ہے غلو فی الدین یہ ہے اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ:۳۱) اس کی تفصیل کے لئے راہِ جنت بجواب راہِ سنت ملاحظہ کرو۔ **تیسرا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام بغیر والد پیدا ہوئے جیسا کہ ابن مریم فرمانے سے معلوم ہوا۔ جو ان کے لئے باپ مانے وہ اس جیسی بہت سی آیات کا منکر ہے۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ (مریم:۳۲) رب نے مجھے اپنی ماں کا خدمت کرنے والا بنایا اگر آپ کا والد ہوتا تو بِوَالِدَیَّ فرماتے۔ موجودہ زمانہ کے بعض غیر مقلد وہابی اس کے منکر ہو گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے باپ کے قائل ہو گئے۔ دیکھو ان کی کتاب ''عیون زمزم فی میلاد عیسیٰ ابن مریم'' مصنفہ مولوی عنایت اللہ گجراتی غیر مقلد۔ **چوتھا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام میں کسی کا نطفہ شامل نہیں، نہ باپ کا نہ ماں کا جیسا کہ کَلِمَتُهٗ اور وَرُوْحٌ مِّنْهُ فرمانے سے معلوم ہوا۔ آپ کو ابن مریم اس لئے فرماتے ہیں کہ حضرت مریم کی جنس سے ہیں۔ اور آپ کے شکم شریف سے پیدا ہوئے۔ ابن کی یہ ہی تعریف ہے۔ جن لوگوں نے آپ کو جناب مریم کے نطفے سے مانا سخت غلطی کی کہ نطفہ تو زوجین کے ملنے سے ہوتا ہے۔ **خیال رہے:** کہ ابوّت کے لئے نطفہ شرط ہے۔ مگر امومیت یعنی ماں ہونے کے لئے شکم سے پیدا ہونا کافی ہے، نطفہ شرط نہیں لہٰذا حضرت عیسیٰ تو ابن مریم ہیں مگر حضرت حوا جناب آدم علیہ السلام کی بیٹی نہیں کہ آپ کے نطفے سے نہیں۔ **پانچواں فائدہ:** ہر کافر کو مسلمان بنانے کے لئے اس کے کفریہ عقیدے سے توبہ کرانی ضروری ہے۔ جیسا اس کا کفر ویسی ان کی توبہ۔ مشرک کو صرف کلمہ پڑھاؤ، عیسائی سے وہ باتیں قبول کراؤ جو یہاں مذکور ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے وغیرہ۔ **چھٹا فائدہ:** جن کفار کے ایمان لانے کی قطعاً امید نہ ہو انہیں بھی اسلام کی تبلیغ کی جائے۔ لاعلاج بیمار کو بھی طبیب دوا دیئے جاتا ہے۔ یہ فائدہ ''لَا تَقُوْلُوْا'' اور ''اِنْتَهُوْا'' سے حاصل ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** تبلیغ نرمی اور خوش اخلاقی سے کی جاوے۔ بشارت دی جاوے۔ یہ فائدہ خَیْرًا لَّكُمْ سے حاصل ہوا۔ نرم اور میٹھی بات دل میں جلد اتر جاتی ہے۔ ایک چھٹانک شہد سینکڑوں مکھیوں کو پھانس لیتا ہے اور ایک گھڑا سرکہ ایک مکھی کو قید نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شہد میٹھا ہے سرکہ تیز وترش۔

آٹھواں فائدہ: باپ اپنے بیٹے کا، خاوند اپنی بیوی کا مالک نہیں ہوسکتا۔ اگر باپ اپنے غلام بیٹے کو اس کے مولیٰ سے خرید لے تو وہ بیٹا فوراً آزاد ہو جائے گا اور اگر خاوند اپنی بیوی کو خرید ے تو فوراً نکاح ٹوٹ جائے گا اسی طرح اس کے عکس کا حال ہے۔ یہ فائدہ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ سے حاصل ہوا۔ **نواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، وہ کسی بندے کا محتاج نہیں، سارے بندے اس کے حاجت مند ہیں۔ یہ فائدہ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا سے حاصل ہوا۔ جو کوئی خدا تعالیٰ کو کسی بندے کا حاجت مند جانے وہ کافر ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: تم لوگ بھی دین میں غلو کرتے ہو کہ گیارہویں بارہویں کو فرض سمجھتے ہو اور نبیوں ولیوں میں خدائی صفات مان کر انہیں خدا بنا دیتے ہو لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ میں تم بھی داخل ہو۔ نبیوں ولیوں کو علم غیب، حاجت روا، حاضر و ناظر مانتے ہو (دیو بندی)۔ **جواب:** یہ اہل سنت مسلمانوں پر نرا بہتان ہے۔ کوئی سنی ان امور خیر کو فرض نہیں سمجھتا۔ ہزار ہا سنی گیارہویں وغیرہ نہیں کرتے اور کرنے والے بھی کبھی کرتے ہیں کبھی نہیں کرتے۔ پابندی کرنے والے بھی اسے مستحب ہی جانتے ہیں نہ کرنے والوں کو برا نہیں کہتے۔ ہاں ان چیزوں کو حرام کہہ کر تم غلو کرتے ہو کہ بغیر دلیل ہر کار خیر کو تم حرام کہتے ہو۔ ہاں ہم لوگ حرام کہنے والوں کو وہابی سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی علامت ہے۔ کسی سنی نے کسی نبی ولی کو نہ خدا مانا نہ خدا کے برابر۔ علم غیب حاضر و ناظر ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور معجزہ یا کرامت بعض بندوں کو ملے ہیں۔ تم بھی شیطان کے لئے علم غیب اور ملک الموت کو حاضر و ناظر مانتے ہو۔ دیکھو اپنی کتاب ''براہین قاطعہ'' وغیرہ۔ البتہ آپ لوگ نبی کو چوہدری و نمبر دار کی طرح بالکل بے اختیار مانتے ہو۔ دیکھو ''تقویۃ الایمان'' اس کی پوری بحث ہماری کتاب ''جاء الحق'' جلد اول میں ہے۔

دوسرا اعتراض: رُوْحٌ مِّنْهُ سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا جزء ہیں اور سراپا روح ہیں یہ صفت بیٹے میں ہوتی ہے لہٰذا بحکم قرآن عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ مِنْهُ کی مِنْ تبعیضیہ ہے (عیسائی)۔ **جواب:** مِنْهُ کی من تبعیضیہ نہیں بلکہ ابتدائیہ ہے اس کے معنی ہیں اللہ کی طرف سے روح۔ قرآن کریم فرماتا ہے: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (جاثیہ: ۱۳) یہاں بھی منہ موجود ہے۔ تو کیا آسمان و زمین کی ہر چیز خدا کی اولاد ہے۔ تم نے ترجمہ غلط کیا۔ تعجب ہے کہ آیت کریمہ ابنیت مسیح کے انکار کے لئے آئی اور تم اپنی کج فہمی سے ثبوت ابنیت کے لئے مانے لیتے ہو۔

تیسرا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بشر نہیں بلکہ سراپا روح ہیں اور روح بھی اللہ کی (عیسائی)۔ **جواب:** عیسیٰ علیہ السلام بشر بھی ہیں روح بھی۔ والدہ کے شکم سے پیدا ہونا، کھانا، پینا، بیماری و موت کا طاری ہونا بشریت کی دلیل ہے۔ ہم روح کے معنی ابھی تفسیر میں عرض کر چکے کہ روح کے معنی یا تو رحمت ہیں یا دم کرنا یا زندگی بخشنا یا بغیر والد حضرت روح الامین کے اثر سے پیدا ہونا یا مردوں میں روح ڈال کر زندہ کرنا۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں

یہ صفات موجود ہیں اس وجہ سے انہیں رُوْحٌ مِّنْهُ یا رُوْحُ اللّٰہِ کہا جاتا ہے۔ روح ہونا بشریت کے خلاف نہیں۔

چوتھا اعتراض: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ یا کلمۃ اللہ کیوں کہا جاتا ہے، کلمہ کے معنی ہیں بات کیا آپ بات تھے، آپ تو بات والے تھے؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا کہ چونکہ آپ کی پیدائش لفظ کن سے ہوئی اور وہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا لہٰذا آپ کو کَلِمَۃُ اللّٰہِ کہا جاتا ہے یعنی رب کے کلمہ سے پیدا ہونے والے نبی۔

پانچواں اعتراض: عیسیٰ علیہ السلام کو ابن مریم کیوں کہا جاتا ہے۔ آپ تو ان کے نطفے سے پیدا ہوئے نہیں جیسے جناب حوا حضرت آدم کی بیٹی نہیں ایسے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جناب مریم کے بیٹے نہیں۔ **جواب:** ابوت کے لئے نطفہ ضروری ہے مگر امومیت کے لئے نطفہ لازم نہیں۔ یعنی باپ وہ ہے جس کے نطفے سے بچہ بنے مگر ماں وہ ہے جس کے شکم سے اس کا ہم جنس پیدا ہو۔ کیونکہ بچہ کی پیدائش باپ کے شکم سے نہیں ہوتی لہٰذا جناب حوا آدم علیہ السلام کی بیٹی نہیں کہ ان کے نطفے سے پیدا نہیں۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم کے بیٹے ہیں کہ ان کے شکم سے پیدا ہیں۔

چھٹا اعتراض: جب اللہ کافی کارساز ہے، فریادرس ہے، نعمتیں دینے والا، بلائیں ٹالنے والا ہے تو تم نبیوں، ولیوں کو حاجت روا، فریادرس کیوں مانتے ہو اور ان سے حاجتیں کیوں مانگتے ہو؟ **جواب:** قبلہ یہ بیماری تو آپ کو بھی ہے۔ بیماری میں حکیم کے پاس، ناداری میں امیروں کے پاس، مصیبتوں میں فریاد لے کر حاکموں کے پاس آپ دن رات جاتے ہیں۔ نہ معلوم اس وقت آپ خدا کو کافی، وکیل کافی فریادرس وغیرہ مانتے ہیں یا نہیں۔ اس کا نہایت نفیس جواب ہم نے ''جاء الحق'' حصہ اول میں دیا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

دوسری مخلوق سے روح افضل اس لئے ہے کہ وہ صرف امر کن سے بغیر واسطہ پیدا ہوئی۔ یونہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس لئے افضل ہیں کہ وہ بھی امر الٰہی سے بغیر باپ پیدا ہوئے اور روح کا کام ہے بے جان جسم کو جاندار کر دینا۔ یونہی عیسیٰ علیہ السلام مردہ جسم کو زندہ کرتے تھے، اندھے، کوڑھوں کو تندرست کرتے تھے، کیچڑ گارے میں پھونک مار کر جیتا جاگتا پرندہ کر دیتے تھے نیز آپ کی پیدائش کلمہ کن سے ہوئی تھی۔ لہٰذا آپ بھی کلمہ کن سے ہی یہ سب کام کرتے تھے چونکہ آپ روح الامین کے دم سے پیدا ہوئے تو آپ بھی روح اللہ کہلائے۔ کلمہ کن سے پیدا ہوئے تو کلمۃ اللہ آپ کا لقب ہوا۔ معلوم ہوا کہ اصل کا اثر شی میں ہوتا ہے۔ حضرات انبیاء کرام مظہر صفات الٰہی ہیں وہ حضرات رب کے سے کام کر دکھاتے ہیں مگر ..... رب رب ہے اور رسول رسول۔ جو آئینہ اور آئینہ دار میں فرق نہ کرے یعنی آئینہ کو آئینہ دار مان لے وہ بھی کافر ہے۔ اور جو آئینہ کا ہی انکار کر دے وہ بھی کافر ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام آئینہ صفات الٰہیہ ہیں۔ عیسائیوں نے انہیں رب مان لیا۔ یعنی آئینہ کو آئینہ دار مان لیا۔ وہ کافر ہوئے۔ یہود نے آپ کی نبوت و رسالت کا ہی انکار کر دیا یعنی آئینہ کے انکاری ہو گئے وہ بھی کافر ہوئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہونا اسی آئینہ ہونے کا بیان ہے۔ جیسے دور یا پس حجاب والے کو آئینہ دار صرف آئینہ میں نظر آسکتا ہے۔ اگر وہ آئینہ سے الگ ہو جاوے تو آئینہ دار کے جمال

سے محجوب رہے گا۔ اس طرح جو نبی سے علیحدہ ہو گیا وہ رب تعالیٰ کے جمال سے محروم ہو گیا۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ

ہرگز نفرت نہیں کریں گے مسیح اس سے کہ ہوں وہ بندے اللہ کے اور نہ فرشتے

مسیح اللہ کا بندہ بننے سے کچھ نفرت نہیں کرتا اور نہ مقرب

الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ

قرب الٰہی دیئے ہوئے اور وہ جو نفرت کرے اس کی عبادت سے اور تکبر کرے

فرشتے اور جو اللہ کی بندگی سے نفرت اور تکبر کرے

فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

تو عنقریب جمع کرے گا ان کو اپنی طرف سب کو پس لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے

تو کوئی دم جاتا ہے کہ وہ ان سب کو اپنی طرف ہانکے گا تو وہ جو ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ

اور عمل کئے اچھے پس پورا دے گا ان کو ثواب ان کے اور زیادہ دے گا ان کو

اور اچھے کام کئے ان کی مزدوری انہیں بھرپور دے گا اور اپنے فضل سے انہیں

مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا

فضل اپنے سے اور لیکن وہ جو نفرت کریں اور تکبر کریں

اور زیادہ دے گا اور وہ جنہوں نے نفرت و تکبر کیا تھا

فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ

تو عذاب دے گا ان کو عذاب دردناک اور نہ پائیں گے وہ واسطے اپنے

انہیں دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا

دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

مقابل اللہ کے کوئی دوست اور نہ مددگار

نہ اپنا کوئی حمایتی پائیں گے نہ مددگار

تعلقات اس آیت کریمہ کا گزشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بڑے فضائل و درجات کا ذکر ہوا کہ وہ کلمۃ اللہ روح اللہ ہیں وغیرہ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام ان فضائل و درجات کے باوجود ہیں اللہ کے بندے اور اس کے عبادت گزار۔ مقصد یہ ہے کہ اے عیسائیو! تم کس برتے پر اللہ تعالیٰ کی عبادت سے پھرے جاتے ہو۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عیسائیوں کے عقیدے کا ذکر تھا کہ وہ جناب عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا یا تیسرا خدا مانتے ہیں۔ اب خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خیال اپنے متعلق بیان فرمایا جارہا ہے کہ وہ اپنے کو اللہ کا بندہ، اللہ کا مطیع و فرمانبردار ہی سمجھتے ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مملوک مخلوق و مطیع ہے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس کے بندے، مملوک اور مخلوق ہیں گویا پہلے اجمالی ذکر تھا اب اس کی کچھ تفصیل ارشاد ہو رہی ہے۔

شان نزول ایک بار نجران کے عیسائیوں نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عیب لگاتے ہیں حضور انور ﷺ نے پوچھا ہم نے انہیں کیا عیب لگایا؟ وہ بولے کہ آپ ان کو عبداللہ (اللہ کا بندہ) کہتے ہیں۔ ان کے لئے اس سے بڑھ کر کون سا عیب ہوسکتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ عبداللہ ہونا عیب نہیں یہ ان کے اور سب کے لئے فخر ہے۔ اس موقعہ پر حضور ﷺ کی تائید اور نجرانی عیسائیوں کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خازن، روح البیان، مدارک، تفسیر بیضاوی، خزائن العرفان وغیرہ)

تفسیر لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ۔ یَسْتَنْكِفَ کا مادہ ہے نکف بمعنی علیحدہ کرنا، دور کرنا۔ کہا جاتا ہے "نَكَفْتُ الدَّمْعَ میں نے اپنے رخسار سے آنسو پونچھ کر دور کر دیئے" اصطلاح میں کسی چیز سے عار رکھنے اسے برا ماننے کو استنکاف کہا جاتا ہے۔ استکبار سے استنکاف اوپر ہے استکبار ناحق بڑائی کو ہی کہتے ہیں اور حق بڑائی کو بھی مگر استنکاف ناحق بڑائی کو بھی کہا جاتا ہے۔ اس لئے مستکبر کبھی اچھی بڑائی والے کو بھی کہہ دیتے ہیں مگر مستنکف ناحق بڑائی والے کو ہی کہا جاتا ہے۔ اجملی حرف لَنْ اگرچہ مستقبل کی نفی کے لئے آتا ہے۔ مگر کبھی دائمی نفی کے لئے بھی بولا جاتا ہے، یہاں دونوں احتمال ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ دائمی نفی ہے اور ہمارا ترجمہ نفی مستقبل پر اَنْ یَّكُوْنَ سے پہلے من پوشیدہ ہے۔ عبد کے معنی عبادت گزار بھی ہیں اور مطیع و خادم بھی اور مخلوق بھی۔ یہاں تمام معنی درست ہیں۔ مسیح کے معنی ہم بارہا بیان کر چکے ہیں کہ یہ لفظ جب دجال کے لئے آتا ہے تو بمعنی ممسوح العین یعنی ایک آنکھ کا صاف (کانا) ہونا ہے اور جب جناب عیسیٰ علیہ السلام کے لئے آتا ہے تو اس کے معنی چھو کر تندرست کرنے والے یا سیاحت و سیر کرنے والے یا مساحت کر کے تارک الدنیا ہونے والے ہوتے ہیں یعنی جناب مسیح عیسیٰ علیہ السلام کبھی بھی اللہ کے بندے اللہ کے فرمانبردار ہونے، اللہ کی مخلوق ہونے سے عار نہیں کرتے۔ نہ پچھلے زمانہ میں نہ اب نہ آئندہ یا اب بھی جب قریب قیامت زمین پر آئیں گے تو عبدیت سے عار نہیں کریں گے کیونکہ عبدیت تو ان کے لئے باعث فخر ہے نہ کہ باعث عار۔ اس دوسرے معنی سے حضرت مسیح کا اب زندہ

ہونا اور آئندہ پھر زمین پر تشریف لانا ثابت ہوتا ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئندہ تشریف لا کر عبد اللہ ہونے سے شرم نہ کریں گے۔ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ یہ عبارت اَلْمَسِيْحُ پر معطوف ہے۔ یا تو مشرکین عرب کی تردید کے لئے فرشتوں کا ذکر فرمایا گیا کہ وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے، اللہ کا بندہ نہ مانتے تھے یا عیسائیوں کی تردید کے لئے کہ وہ فرشتوں کو نبیوں سے افضل مانتے ہیں یا عجیب سے عجیب تر کا حال بیان فرمانے کے لئے، یعنی اے عیسائیو! تم جناب مسیح کو اس لئے ابن اللہ کہتے ہو کہ وہ بغیر باپ پیدا ہوئے اور غیب کی خبریں دیتے تھے، بیماروں کو تندرست اور مردوں کو زندہ کرتے تھے، انہوں نے کبھی گناہ نہ کیا تو یہ اوصاف فرشتوں میں موجود ہیں، وہ بغیر ماں باپ پیدا ہوئے، وہ لوح محفوظ کا علم رکھتے ہیں (تفسیر کبیر)۔ وہ رب تعالیٰ کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے، وہ دنیا کے سارے انتظامات بچے بنانا، جان نکالنا وغیرہ سارے کام کرتے ہیں۔ بتاؤ وہ اللہ کے بیٹے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے کیسے ہو گئے؟ ملائکہ کے معنی ان کے اقسام پارہ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ (بقرہ: ٣٠) کی تفسیر میں عرض کر چکے ہیں یہاں اتنا سمجھ لو کہ مقربین کے تین معنیٰ ہو سکتے ہیں اللہ سے قرب رکھنے والے فرشتے کہ گناہ کبھی نہ کریں ہمیشہ اس کی اطاعت کریں اس معنی سے سارے فرشتے اس کے مقرب ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (تحریم: ٦) عرش اعظم اٹھانے والے فرشتے جو آٹھ ہیں۔ عبادت الٰہی میں مشغول رہنے والے فرشتے یہ وہ جماعت ہے جو ہمیشہ عبادت الٰہی میں مشغول رہتی ہے۔ دنیاوی انتظامات سے اسے تعلق نہیں اور جو جماعت دنیوی انتظامات کرتی ہے اسے مدبرات امر کہتے ہیں۔ یہاں پہلے معنیٰ زیادہ موزوں ہیں یعنی مقرب فرشتے جن میں حضرت جبرائیل و میکائیل وغیرہم بھی داخل ہیں وہ بھی اللہ کا بندہ ہونے میں عار نہیں کرتے حالانکہ حضرت جبرئیل وہ شان والے فرشتے ہیں جن کے دم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور جناب عیسیٰ علیہ السلام میں یہ صفات اس دم کی برکت سے تھیں۔ معتزلہ وغیرہ نے اس آیت کی بنا پر کہا کہ فرشتے، انبیاء کرام سے افضل ہیں۔ فقیر کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ ان کا یہ استدلال بالکل غلط ہے جیسا کہ انشاء اللہ اعتراضات و جوابات میں عرض کیا جاوے گا۔ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ یہ جملہ گزشتہ جملہ کی دلیل ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی بندگی سے منہ موڑنے والوں کا انجام خراب ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہ ہیں جن کی ابتدا و انتہا انجام سب ہی بہت اعلیٰ ہے۔ پھر وہ اس زمرہ میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں مَنْ سے مراد تمام جن وانس ہیں کہ یہ سزا ان سب متکبرین کے لئے ہے استنکاف اور استکبار میں فرق ابھی بیان کیا گیا کہ استکبار عام ہے اور استنکاف خاص۔ استنکاف ناجائز بڑائی کو ہی کہتے ہیں۔ جس میں اپنی عزت سامنے والے کی ذلت کا خیال ہوتا ہے۔ استکبار عام ہے عبادت سے مراد اللہ کی بندگی کرنا ہے یا اللہ کا بندہ ہونا۔ یہاں تفسیر "روح البیان" میں فرمایا کہ استکبار غلط بڑائی کو ہی کہتے ہیں اور تکبر سچی بڑائی کو بھی کہتے ہیں۔ اس لئے رب تعالیٰ کی صفت ہے۔ متکبر نہ کہ مستکبر ہو سکتا ہے کہ یہاں استنکاف سے مراد ہو خیالی بڑائی اور استکبار سے مراد عملی بڑائی۔ یعنی جو عقیدۃً یا عملاً اللہ کی عبادت سے غرور کرے اس کا یہ حال ہے۔ بعض کفار عرب نے بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ ہم اس لئے مسلمان نہیں

ہوتے کہ اس میں نماز فرض ہے اور نماز میں سجدہ ہے۔ یہ عقیدہ شان کے خلاف ہے۔ یہ ہوا عقیدے کا تکبر کہ نماز سے ہی عار ہے۔ سرداران قریش حج میں مزدلفہ سے ہی لوٹ آتے تھے کہ عرفات تک جانا غرباء فقراء کے ساتھ حج کرنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ یا نماز با جماعت میں غرباء کے ساتھ نماز پڑھنا ہماری سرداری کے خلاف ہے۔ یہ ہوا استکبار یعنی عملی غرور۔ اللہ دونوں تکبروں سے بچائے۔ آمین۔ **فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا** یہ جملہ گزشتہ عبارت کی جزا ہے۔ ف جزائیہ ہے۔ یہاں ایک فعل پوشیدہ ماننا زیادہ بہتر ہے یعنی فلیعلم حشر کے معنی ہیں جمع کرنا۔ اسی لئے قیامت کو حشر کہتے ہیں کہ اس دن تمام اولین و آخرین ایک وقت ایک جگہ میں جمع ہوں گے۔ ھم کا مرجع متکبرین، مستنکفین، مطیعین، عاصین، مومنین و کافرین سب ہیں۔ متکبرین کا تو ذکر ابھی ہوا اور دوسرے لوگ اس سے سمجھ میں آ گئے۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کی عبادت یا عبودیت سے نفرت یا غرور کرے وہ جان رکھے کہ ہم سارے بندوں کو قیامت میں اپنی بارگاہ میں جمع فرمائیں گے۔ اس حال میں کہ کسی کے پاس کوئی تکبر کا سامان نہ ہوگا، کسی کو اس کی رحمت کے سوا کوئی جگہ نہ ملے گی، اس دن سب کے تکبر ٹوٹ جائیں گے۔ پھر جب تواضع و عجز کرنے والے مؤمنوں کو درجے ملیں گے ان پر غضب الٰہی ہوگا تو کیسی رسوائی و شرمندگی ہوگی؟ **فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ**۔ یہ عبارت گزشتہ اجمال کی تفصیل ہے۔ **الَّذِيْنَ** سے مراد صرف انسان ہیں کیونکہ جنات اور فرشتوں کی نیکیوں کا وہ ثواب نہیں جو یہاں مذکور ہے۔ ایمان میں سارے عقائد صحیحہ داخل فرما لیے اور "**عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ**" میں سارے نیک اعمال داخل فرما دیئے۔ چونکہ عقائد اعمال پر مقدم ہیں اس لئے پہلے ایمان کا ذکر فرمایا۔ چونکہ صرف توحید نجات کے لئے کافی نہیں بلکہ ایمان سے نجات ہے اس لئے ہر جگہ ایمان کا ذکر ہوتا ہے کہیں توحید کا ذکر نہیں ہوتا۔ توحید اور ایمان کا فرق ہم پہلے بیان کر چکے۔ **خیال رہے:** کہ نیکیاں بقدر طاقت لازم ہیں اس لئے **الصّٰلِحٰتِ** کو مطلق رکھا یہ نہ بتایا کہ کتنی نیکیاں کرے۔ **فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ** چونکہ **اَمَّا** حرف شرط ہے اس لئے جزا میں ف لائی گئی اس ف میں اشارۃً تعقیب بغیر تراخی بھی معلوم ہوتی ہے **يُوَفِّيْ** بنا ہے توفیۃ سے بمعنی پورا دینا۔ یہاں پورا دینے سے مراد ہے ثواب کم نہ کرنا۔ زیادتی کی نفی نہیں۔ توفیۃ یعنی پورا دینے کے تین معنی ہیں کمی و زیادتی نہ ہونا، بالکل پورا دینا، دوسرے زیادتی نہ ہونا کمی ہو یا نہ ہو تیسرے کمی نہ ہونا زیادتی ہو یا نہ ہو۔ جب یہ لفظ کفار کی سزا کے لئے بولا جائے تو وہاں دوسرے معنی مراد ہوں گے کیونکہ رب تعالیٰ ان کی سزا مطابق جرم کے دے گا۔ زیادہ نہ دے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جرم سے سزا کم دے۔ جیسا کہ بعض کفار کے لئے ہوگا اور جب یہ لفظ مسلمانوں کی جزا کے لئے بولا جائے تو تیسرے معنی میں ہوگا یعنی کم نہ ہونا۔ رب تعالیٰ مؤمن کے اعمال کا ثواب کم نہ کرے گا۔ زیادتی فرمادے تو کرم ہے۔ یہاں تیسرے معنی میں ہے۔ اجور جمع ہے اجر کی بمعنی مزدوری، اجرت، عمل کا بدلہ۔ چونکہ اعمال صالحہ بہت ہیں اور ہر نیکی کا ثواب علیحدہ۔ نیز ایک ایک نیکی پر بہت سے ثواب کی عطا ہے اس لئے اجور جمع ارشاد ہوا۔ خیال رہے کہ ایمان و عمل کے لئے ماضی کے صیغے ارشاد ہوئے اور جزا کے لئے مضارع کے صیغے فرمائے گئے۔ دو وجہ سے ایک یہ کہ عمل کی جگہ دنیا ہے اور جزا کی جگہ آخرت۔ آخرت دنیا کے لحاظ سے مستقبل ہے اور دنیا آخرت کے لحاظ سے ماضی لہٰذا ایمان و عمل کے لئے

ماضی مناسب ہے۔ اور جزا و زیادتی کے لئے مستقبل مناسب ہے۔ دوسرے یہ کہ عمل کا وقت بہت تھوڑا ہے۔ یعنی دنیاوی زندگی کا زمانہ جو چند سال ہے۔ مگر جزاء کا زمانہ دائمی یعنی آخرت جو ابدالاباد تک ہے۔ اس لئے عمل کے لئے ماضی، جزا کے لئے مضارع ارشاد ہوا یعنی جو ایمان و اعمال اختیار کریں انہیں اللہ تعالیٰ اجر دیتا ہی رہے گا، زیادتیاں دیتا رہے گا **وَیَزِیْدُھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ** اس جملہ میں انعام خسروانہ کا ذکر ہے۔ زیادتی کو مطلق فرمایا یہ نہ فرمایا کہ کتنی زیادتی اس سے معلوم ہوا کہ زیادتی ہمارے وہم و گمان و خیال سے وراء ہے۔ فضل کے معنی ہیں زیادتی۔ یہاں وہ زیادتی مراد ہے جو بطور مہربانی عطا کی جاوے۔ زیادتی سے مراد یا تو اعمال کے عوض و ثواب میں زیادتی فرمانا ہے یا جزا اعمال کے علاوہ اور کوئی نعمت دینا مراد ہے جو کہ عمل کا عوض نہ ہو جیسے جنت میں دیدار الٰہی۔ یعنی ایسے مؤمنین و صالحین کو رب تعالیٰ ان کے پورے پورے ثواب بھی دے گا اور اپنے کرم خسروانہ سے زیادتی بھی عطا کرے گا۔ **وَ اَمَّا الَّذِیْنَ اسْتَنْکَفُوْا وَ اسْتَکْبَرُوْا**۔ یہ دوسری جماعت خبیثہ کا ذکر ہے جو صالحین مومنین کے مقابل ہے۔ کیونکہ ہر چیز کی پوری پہچان جب ہی ہوتی ہے جب اس کے مقابل کا پتہ چلے۔ یہاں نفرت و تکبر سے مراد ہے ایمان سے نفرت، نیک اعمال سے نفرت، نیکی نہ کرنا اور جرم ہے لیکن نیکی سے نفرت کرنا دوسرا جرم۔ **فَیُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا**۔ یہ جملہ اس اَمَّا کی جزا ہے جو ابھی اس سے متصل مذکور ہوا۔ عذاب، عقاب اور عتاب کا فرق پہلے بیان ہو چکا۔ گنہگار مؤمن کو اگرچہ عذاب ہو جاوے مگر عذاب الیم جو قلب و قالب اور قالب کے تمام اعضاء کو گھیر لے وہ نہ ہو گا۔ چنانچہ مومن کا دل اور سجدے کے سات اعضاء آگ سے محفوظ رہیں گے۔ عذاب الیم جو دل [illegible] اور جسم سب پر چھا جاوے صرف کفار کے [illegible] ہے۔ رب فرماتا ہے **تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ** (ہمزہ:۷)۔ رب تعالیٰ محفوظ رکھے کیونکہ گناہگار مؤمن جسم کے گناہ تو کر لیتا ہے مگر دل کے گناہ کفر و نفاق نہیں کرتا، کافر قلب و قالب دونوں کے گناہ کرتا ہے، عذاب گناہ کی جگہ میں پہنچے گا۔ **وَّ لَا یَجِدُوْنَ لَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا** یہ ان متنفرین متکبرین کافروں کا دوسرا عذاب ہے۔ دُوْنَ، غَیْرَ، سِوَاء، اِلَّا کے بہت فرق ہم بارہا بیان کر چکے ہیں۔ "دُوْنَ" اکثر مقابل پر یا دور پر بولا جاتا ہے۔ ہر ماسوا کو دُوْنَ نہیں کہتے۔ اِلَّا ہر ماسویٰ کو کہتے ہیں اس لئے جو کوئی کلمہ طیبہ میں بجائے اِلَّا کے دُوْنَ پڑھے لَا اِلٰہَ دُوْنَ اللّٰہِ کہے وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ ولی وہ جو دوستی و قرب کی بنا پر حاکم سے سفارش کر کے مجرم کو چھڑا لے۔ نصیر وہ جو حاکم کا مقابلہ کر کے چھڑا لے۔ یعنی یہ نفرت و تکبر کرنے والے کفار کل قیامت میں اپنے لئے نہ تو کوئی سفارشی پائیں گے جو سفارش و شفاعت کر کے انہیں عذاب الٰہی سے بچائے اور نہ کوئی مددگار پائیں گے۔ جو قوت و طاقت سے انہیں چھڑا لے۔ خیال رہے کہ ولی میں مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اختیار کرنا کفر ہے اور ولی اللہ کا دامن پکڑنا ایمان کا رکن اعلیٰ۔ موجودہ زمانہ کے لوگ ولی اللّٰہ اور وَلی مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ میں فرق نہیں کرتے۔

خلاصہ تفسیر

اے عیسائیو! تم تو حضرت مسیح کو اللہ کا بندہ کہنے کو ان کی توہین سمجھتے ہو۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حضرت مسیح کو اللہ کا بندہ [illegible] میں نفرت [illegible] شرم نہیں [illegible] فخر کرتے [illegible] بلکہ مقربین بارگاہِ الٰہیہ تمام

فرشتے بھی اس عبدیت کو عار نہیں سمجھتے اور وہ حضرات یہ جرم کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ تو اللہ کے پیارے مقبول ہیں۔ متکبرین کا حال یہ ہے کہ جو بندہ بھی اللہ تعالیٰ کا بندہ بنے، اس کی بندگی کرنے سے نفرت، تکبر، عار کرے تو یہ عار کرنے والے لوگ اور نیک و ابرار لوگ ایک جگہ ایک وقت میں یعنی قیامت میں سب جمع ہوں گے پھر ان میں چھانٹ ہوگی اس طرح کہ نیک اعمال کرنے والے مؤمنوں کو رب تعالیٰ ان کے ثواب پورے پورے دے گا، کمی بالکل نہ فرمائے گا۔ اس ثواب کے علاوہ اپنے شاہانہ عطیے خسروانہ انعام سے بھی نوازے گا کہ انہیں ثواب کے علاوہ اور بہت اعلیٰ نعمتیں بخشے گا اور بندگی سے عار کرنے والے متکبر کافروں کو نہایت دردناک دائمی عذاب دے گا کہ ان کے دل و جسم پر عذاب چھا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا جو شفاعت سفارش یا زور و قوت کے ذریعہ انہیں عذاب الٰہی سے بچالے۔ لہٰذا اے عیسائیو! تمہارا کہنا کہ اللہ کا بندہ ہونا عیسیٰ علیہ السلام کے لئے شرم و عار ہے محض باطل ہے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور قریب قیامت زمین پر تشریف لائیں گے، اپنی بندگی کا اعلان قولاً و عملاً و فعلاً کریں گے۔ عیسائیوں کے عقیدہ ابنیت کی تردید فرمائیں گے یہ فائدہ **لَنۡ یَّسۡتَنۡکِفَ** کی دوسری تفسیر سے حاصل ہوا کہ یہ صیغہ نفی مستقبل کے لئے ہے یعنی آئندہ زمانہ میں حضرت مسیح علیہ السلام اپنی عبدیت سے عار نہ کریں گے، عبادت و عبودیت کا اعلان کریں گے۔ اگر آپ کی وفات ہو چکی ہوتی تو یہ مستقبل کے معنی درست کیسے ہوتے۔ **دوسرا فائدہ:** فرشتوں کی پیدائش اور ان کی صفات حضرت مسیح علیہ السلام سے زیادہ عجیب و غریب ہیں کہ حضرت مسیح بغیر باپ پیدا ہوئے تو فرشتے بغیر ماں باپ پیدا ہوئے۔ جناب مسیح حضرت جبرئیل کے دم سے پیدا ہوئے تو فرشتے بغیر کسی کے دم کے صرف کلمہ کن سے پیدا ہوئے۔ حضرت مسیح مردوں کو زندہ بیماروں کو تندرست کرتے تھے تو فرشتے اس قسم کے ہزارہا کام کرتے ہیں۔ یہ فائدہ **وَلَا الۡمَلٰٓئِکَۃُ** کے عطف سے حاصل ہوا کہ یہ عجیب چیز پر عجیب تر چیز کا عطف ہے (تفسیر کبیر)۔ **تیسرا فائدہ:** حضرات انبیاء کرام اور فرشتے گناہوں، کفر و تکبر وغیرہ سے معصوم ہیں کیونکہ کفر و گناہ اور تکبر قیامت میں شرمندگی کا باعث ہوں گے وہ حضرات اس سے محفوظ ہیں یہ فائدہ **وَمَنۡ یَّسۡتَنۡکِفۡ** الخ سے حاصل ہوا جیسا کہ تفسیر میں گزرا۔ **چوتھا فائدہ:** ایمان نیک اعمال پر مقدم ہے اور نیک اعمال بقدر طاقت کرنے ضروری ہیں۔ یہ فائدہ **اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** کی ترتیب سے حاصل ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک مسلمانوں کو صرف اعمال کا بدلہ ہی نہ ملے گا بلکہ اللہ کا فضل بھی ملے گا جو کسی عمل کا بدلہ نہ ہوگا جیسا کہ **وَیَزِیۡدُھُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ** سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** قیامت میں مددگار اور ولی نہ ہونا کفار کے لئے عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے ولی بھی مقرر کرے گا اور مددگار بھی۔ رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو قرآن کریم میں اس کی تعلیم دی۔ **وَاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ وَلِیًّا ۚ وَّاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ نَصِیۡرًا** (النساء: ۷۵) الٰہی! ہمارے لئے اپنی طرف سے ولی اور مددگار مقرر فرما دے۔ ولی وہ جو نفع دے نصیر وہ جو نقصان کو دور کرے۔ جو کوئی کہے کہ خدا کے سوا مددگار ولی کوئی نہیں وہ

اپنے کافر ہونے کا اقرار کرتا ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ فرشتے نبیوں سے افضل ہیں کیونکہ یہاں مسیح پر ملائکہ کو معطوف کیا گیا ہے اور یہاں عطف ترقی کے لئے ہے۔ یعنی اعلیٰ کو اعلیٰ پر معطوف کیا گیا حالانکہ تم کہتے ہو کہ تمام حضرات انبیاء کرام تمام فرشتوں سے افضل ہیں۔ تمہارا یہ عقیدہ اس آیت کے خلاف ہے (معتزلہ)۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ یہاں عجیب تر کو عجیب چیز پر معطوف کیا گیا ہے نہ کہ اعلیٰ کو غیر اعلیٰ پر یہ ترقی عجیب سے عجیب تر کی طرف ہے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مقرب فرشتے اللہ کی عبادت سے نفرت نہیں کرتے تو کیا دوسرے فرشتے مدبرات امر اور کروبین نفرت کرتے ہیں۔ ملائکہ کے ساتھ مقربین کی قید کیوں لگائی گئی؟ **جواب:** اس کا جواب بھی تفسیر میں گزر گیا کہ یہاں مقربین سے مراد قرب الٰہی رکھنے والے فرشتے ہیں۔ یہ صفت سارے فرشتوں میں موجود ہے۔ لہٰذا یہ صفت یہاں احترازیا تخصیص کے لئے نہیں بلکہ توصیف و مدحت کے لئے ہے اور اگر مقربین سے مراد فرشتوں کی خاص جماعت بھی ہو تب بھی مطلب یہ ہوگا کہ جب مقرب فرشتے عبادت الٰہی سے عار نہیں کرتے تو دوسرے فرشتے بدرجہ اولیٰ عار نہیں کر سکتے۔

تیسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کے سوا کوئی مددگار و ولی نہیں۔ تم نبیوں ولیوں کو مددگار اور حمایتی ولی مان کر اس آیت کے انکاری ہو۔ **جواب:** بے شک کافروں، متکبروں، منافقوں کا کوئی مددگار نہیں جیسا کہ لَهُمْ سے معلوم ہوا۔ ہم مؤمن ہیں اللہ تعالیٰ نے بہت سے مددگار ہمارے لئے مقرر فرما دیئے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (مائدہ:۵۵)

تفسیر صوفیانہ

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو تمام فرشتوں سے افضل قرار دیا کیونکہ حضرت مسیح کو عیسائیوں نے خدا کا بیٹا کہا اور فرشتوں کو مشرکین نے خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہا۔ اللہ تعالیٰ نے اشارۃً فرمایا کہ جیسے مذکر کو مونث پر بزرگی حاصل ہے یوں جناب مسیح کو فرشتوں پر افضلیت ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى (نجم:۲۱) یہاں پر مرد کو پہلے بیان فرمایا اور ارشاد ہوا۔ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى (آل عمران:۳۶) یہاں بھی مذکر کا ذکر مونث سے پہلے ہے اور فرمایا: لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (النساء:۱۱) یہاں بھی مذکر کا ذکر پہلے ہے۔ نیز حضرت مسیح تمام فرشتوں سے اس لئے افضل ہیں کہ فرشتے صرف نورانی روحانی مخلوق ہیں اور جناب عیسیٰ علیہ السلام ماں کی طرف سے جسمانی مخلوق یعنی بشر ہیں اور جناب جبریل کی طرف سے روحانی مخلوق ہیں کہ آپ ان کے دم سے اور جناب مریم کے شکم شریف سے پیدا ہوئے۔ لہٰذا فرشتے جناب عیسیٰ علیہ السلام کی گرد کو بھی نہیں پاسکتے (روح البیان)۔ تمام کفروں میں تکبر کا کفر بدترین ہے، شیطان اسی کفر میں گرفتار ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں ہے کہ جس کے دل میں رائی برابر تکبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا اور جس کے دل میں رائی برابر ایمان ہوگا وہ دوزخ میں نہ

رہے گا۔ یہاں تکبر سے مراد وہ ہی تکبر ہے جو ایمان کے مقابل ہو۔ ایک دل میں تکبر و عار اور ایمان نہیں رہ سکتے۔ تکبر دل کی سختی ہے، ایمان دل کی نرمی۔ سختی نرمی ایک دل میں کیسے سمائیں؟ صوفیاء فرماتے ہیں کہ عطیے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ قانونی، اور محبت کے۔ قانونی عطیے میں حساب ہوتا ہے، محبت کے عطیے بغیر حساب۔ ہوٹل میں کھانا کھاؤ تو حساب سے ملے گا۔ پھر بل ادا کرنا ہو گا کیونکہ یہ کھانا قانونی ہے۔ تو دوسری طرف حساب ہے کھانا لو حساب سے قیمت دو حساب سے۔ مگر کسی دوست کے گھر دعوت کھاؤ تو بغیر حساب کھاؤ کہ یہ محبت کا عطیہ ہے۔ دنیا میں مومن بندے دو قسم کے ہیں زاہدین اور عارفین۔ زاہدین تو قانون کے ماتحت حساب سے عبادت کرتے ہیں۔ نماز پانچ وقت کی، زکوٰۃ چالیسواں حصہ، روزے سال میں ایک ماہ کے، حج عمر میں ایک بار۔ انہیں ثواب بھی قانونی ملے گا، حساب سے۔ ان کے لئے فرمایا گیا: فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ مگر عارفین محبت کے ماتحت بلا حساب عبادت کرتے ہیں کہ ہر آن ہر گھڑی نماز میں رہتے ہیں۔ رب فرماتا ہے: هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج: ۲۳) صدیق اکبر موقعہ پڑنے پر سارا گھر راہ خدا میں خیرات کر دیتے ہیں۔ انہیں ثواب بھی محبت والا بغیر حساب ملے گا ان کے لئے ارشاد ہوا: وَيَزِيدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ۔ یہ دونوں فرمان دو قسم کے مہمانوں کے لئے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض عبادات میں اطاعت غالب ہے جیسے نماز زکوٰۃ اور بعض میں ذوق و شوق و عشق کا غلبہ ہے جیسے روزہ، حج اور جہاد۔ پہلی قسم کی عبادات کے لئے فرمایا ہم ان کے ثوابات پورے دیں گے دوسری قسم کے لئے فرمایا فضل زائد دیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام عبادات میں اعضاء ظاہری بھی کام کرتے ہیں اور دل بھی نماز میں سر، آنکھیں، زبان، ہاتھ، پاؤں سب ہی کام کرتے ہیں مگر خشوع و خضوع عجز و انکسار جو نماز کی جان ہے وہ دل سے ادا ہوتے ہیں۔ بدنی کاموں پر اجر و ثواب ملیں گے اور دل کے کام پر فضل۔ اس صورت میں ہر عمل پر اجر بھی ہے فضل بھی۔

يَآاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ
اے لوگو بے شک آئی تمہارے پاس دلیل طرف سے رب تمہارے کے اور اتارا ہم نے
بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل آئی اور ہم نے تمہاری
اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
طرف تمہاری روشنی ظاہر پس لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر
طرف روشن نور اتارا تو وہ جو اللہ پر ایمان لائے
وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ
اور مضبوط پکڑیں اس کو پس عنقریب داخل فرمائے گا ان کو بیچ رحمت اپنی کے اور فضل میں
اور اس کی رسی مضبوط تھامی تو عنقریب اللہ انہیں اپنی رحمت اور اپنے فضل میں

وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۱۷۵﴾

اور ہدایت دے گا ان کو طرف اپنے راستہ سیدھے کی

داخل کرے گا اور انہیں اپنی طرف سیدھی راہ دکھائے گا

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے کئی طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں اللہ کی وحدانیت اور اس کی صفات کا ذکر تھا کہ وہ اولاد وغیرہ سے پاک ہے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفات عالیہ کا ذکر ہے۔ گویا ایمان کے ایک رکن یعنی توحید کے ذکر کے بعد دوسرے رکن یعنی نبوت کا ذکر ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود و نصاریٰ کے ایسے عقیدوں کا ذکر تھا جن پر کوئی دلیل نہ تھی۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ابن اللہ ہونا یا جناب عیسیٰ کا نبی نہ ہونا۔ اب اسلام کے ان عقیدوں کا ذکر ہے جن پر صدہا دلائل قائم ہیں یعنی حضور کا برہان ہونا اور قرآن کریم کا نور ہونا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیات میں اہل کتاب کے غلط عقیدوں کی تردید کی گئی تاکہ وہ ان سے بچیں۔ اب درست اسلامی عقیدوں کی تلقین فرمائی جارہی ہے۔ تاکہ وہ انہیں اختیار کریں۔ گویا پرہیز کا ذکر پہلے ہوا، دوا کا ذکر اب ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیات میں نیک کار مؤمنوں کے اجر و ثواب کا ذکر تھا۔ اب یہ بتایا جارہا ہے کہ مومن کون ہے؟ گویا ایمان کے فوائد بتانے کے بعد ایمان کی حقیقت بتائی جارہی ہے۔ یعنی حضور کی نبوت، قرآن کی حقانیت کو ماننا۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیات کے آخر میں متکبرین کے برے انجام کا ذکر ہوا۔ اب اس ذات کریم کا ذکر فرمایا جارہا ہے جن تک پہنچنے سے انسان تکبر و غرور کی بیماریوں سے نجات پا جاتا ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ شیطان ہمارے دلوں میں غرور و تکبر پیدا کرتا ہے۔ حضور کی نگاہ کرم سے دلوں میں عجز و انکسار پیدا ہوتا ہے۔ گویا بیماری کے بعد علاج اور حکیم روحانی کا ذکر ہے۔

تفسیر

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ۔ ابھی کچھ پہلے عرض کیا گیا کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت تمام جہان کے لئے ہے اور جہان میں انسان اشرف ہے کہ احکام شرعیہ کا عموماً یہ ہی مکلف ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے موقعہ پر عام انسانوں کو پکارا جاتا ہے نہ صرف مسلمانوں کو نہ صرف کافروں کو نہ صرف عربیوں کو نہ صرف عجمیوں کو۔ اس قاعدے سے یہاں ارشاد ہوا **یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ**۔ اے تمام لوگو! اس ناس میں تاقیامت سارے انسان داخل ہیں۔ **قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ** چونکہ کفار و مشرکین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برہان، نبی رسول بن کر تشریف آوری کے منکر تھے اس لئے آیات میلاد لو قَدْ یا لَقَدْ کی تاکید کے ساتھ بیان فرمایا۔ جیسے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (توبہ: ۱۲۸) وغیرہ اس قاعدے سے یہاں قَدْ ارشاد ہوا۔ چونکہ ہم لوگ دنیا میں اپنے کام کے لئے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رب تعالیٰ کے کام کے لئے تشریف لائے نیز ہم سب کچھ بننے کے لئے دنیا میں آئے، وہ سب کچھ بن کر دوسروں کو بنانے کے لئے دنیا میں تشریف لائے اس لئے ہمارے لیے قرآن کریم میں خلق ارشاد ہوتا ہے اور حضور انور کے لئے جَآءَ یا بعث یا اَرْسَلَ ارشاد ہوتا ہے۔ اس قاعدے سے یہاں جَآءَ ارشاد ہوا۔ حضور کی ولادت مکہ معظمہ میں ہوئی اور سکونت مدینہ [illegible] مگر تشریف آوری جلوہ گری ہر گھر بلکہ ہر [illegible]

جگر، سمع و بصر میں ہوئی۔ اس لئے یہاں جَآءَ کُمْ ارشاد ہوا۔ یعنی تم سب کے پاس تشریف لائے۔ جیسے سورج رہتا ہے آسمان پر چمکتا ہے ہر جگہ۔ لغت میں برہان کہتے ہیں مضبوط کرنے والی چیز کو، سخت مضبوطی کو برہن کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں نہایت قوی دلیل کو برہان کہتے ہیں۔ جس سے دعویٰ کو پختہ و مضبوط کیا جاوے جسے مخالف توڑ نہ سکے۔ یہاں حضور ﷺ کے معجزات بلکہ خود ذات پاک مصطفیٰ کو برہان فرمایا۔ کیونکہ حضور ﷺ دعویٰ توحید دعویٰ ذات وصفات کو ایسے ثابت فرمانے والے ہیں کہ سبحان اللہ۔ اللہ کی ذات وصفات کو جاننا ہو تو حضور کو دیکھ لو۔ برہان کی تنوین عظمت کی ہے یعنی بڑی عظیم الشان دلیل مِنْ ابتدائیہ ہے۔ اور مِّنْ رَّبِّكُمْ یا تو برہان کی صفت ہے یا جَآءَ کے متعلق ہے۔ یعنی اے لوگو! تم سب کے پاس ایک بہت مضبوط و قوی دلیل تمہارے رب کی آئی یا ایسی دلیل آئی جو تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ یعنی حضور ﷺ کی ذات گرامی رب تعالیٰ کا ایک تحفہ و انعام ہے جو مخلوق کو عطا ہوا۔ شعر

رب اعلیٰ کی نعمت پہ اعلیٰ درود حق تعالیٰ کی منت پہ لاکھوں سلام

چونکہ حضور کو یہاں برہان فرمایا گیا اور برہان عقل سے جانی جاتی ہے۔ عقل صرف انسانوں میں ہے۔ جنات یا فرشتوں یا دوسری مخلوق میں نہیں۔ اس لئے خطاب صرف انسانوں سے ہوا اور جہاں حضور کی رحمت کا ذکر ہے وہاں عالمین فرمایا گیا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء: ۱۰۷) نیز چونکہ حضور نوع انسان سے ہیں اس لئے یہاں انسانوں ہی کو خطاب ہوا۔ لہٰذا یہ آیت ان آیات کے خلاف نہیں جہاں عالمین فرمایا گیا۔ رَبِّكُمْ فرما کر اشارۃً فرمایا گیا کہ حضور کی بعثت مخلوق کی روحانی پرورش ہے اور ربوبیت الٰہیہ کا مظہر۔ چونکہ وہ رب ہے اور رب وہ جو اپنی مخلوق کو ہر طرح ظاہر و باطن پالے تو جیسے اس نے جسمانی پرورش کے لئے سورج کو چمکایا جس سے نظام عالم وابستہ ہے ویسے ہی اس نے روحانی پرورش کے لئے سورج کو چمکایا، اس شمس الضحیٰ بدرالدجیٰ کو چمکایا جس سے روحانی نظام قائم ہے۔ غرض کہ مِّنْ رَّبِّكُمْ میں بہت نکات ہیں۔ خیال رہے کہ مِّنْ رَّبِّكُمْ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ مِّنْ صلہ کا ہو دوسرے یہ کہ مِّنْ ابتدائیہ ہو۔ لہٰذا اس عبارت کے دو معنی ہوں گے۔ تمہارے رب کی دلیل آئی جس سے رب تعالیٰ کی ذات وصفات کا پتہ لگے۔ دلیل چونکہ رب تعالیٰ کی قائم فرمودہ ہے لہٰذا اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ جیسے سورج رب تعالیٰ کا نور ہے اسے کوئی بجھا نہیں سکتا۔ یا تمہارے رب کی طرف سے دلیل آئی جس سے چیزوں کا حلال وحرام ہونا، اچھا برا ہونا، انسانوں کا کافر و مومن ہونا، جنتی دوزخی ہونا معلوم ہوا۔ چنانچہ بکری کی حلت اور کتے گدھے کی حرمت، زکوٰۃ کا اچھا ہونا، سود کا حرام ہونا، برا ہونا، کفار سے جنگ کا عبادت ہونا، مسلمان سے لڑائی حرام ہونا، حضرت صدیق کا جنتی ہونا ابوجہل کا دوزخی ہونا، طلوع و غروب کے وقت نماز کا درست نہ ہونا۔ غرض کہ تمام ایمانیات کی دلیل حضور اور صرف حضور ہیں عقل کو ان میں دخل نہیں۔ بہرحال حضور ﷺ اللہ کی بھی دلیل ہیں اور اللہ کی طرف سے قائم کردہ دلیل بھی۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا یہ عبارت قَدْ جَآءَ كُمْ پر معطوف ہے اور واؤ عاطفہ ہے۔ اگر عطف تفسیری ہے تو نور سے مراد بھی حضور ﷺ ہیں اس کی تفسیر وہ آیت ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (مائدہ:

۱۵) اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے پاس وہ تشریف لائے جو تمہاری عقلوں کے لئے تو برہان ہیں اور تمہاری آنکھوں کے لئے نور ہیں۔ ان کی نبوت کو عقل سے پہچانیں، آنکھوں سے دیکھو ان میں دونوں صفتیں ہیں اہل عقل انسان انہیں عقل سے پہچانیں کیونکہ وہ برہان ہیں۔ اور بے عقل مخلوق اور سیدھے سادے انسان انہیں آنکھوں دیکھیں کیونکہ وہ نور ہیں اور اگر عطف تفسیری نہ ہو تو نور سے مراد قرآن کریم ہے۔ چونکہ حضور ﷺ پہلے آئے اور قرآن مجید بعد میں نیز کلمہ پہلے پڑھا جاتا ہے پھر قرآن مجید اس لئے حضور کی آمد پہلے بیان ہوئی اور قرآن کی آمد بعد میں مذکور ہوئی۔ چونکہ نور ہلکا بھی ہوتا ہے، تیز بھی۔ ہلکا نور خود نظر آتا ہے کسی کو چمکا تا نہیں اور تیز نور خود بھی نظر آتا ہے دوسری چیزوں کو بھی چمکا تا ہے۔ یہاں مُّبِیْنٌ فرما کر بتایا کہ وہ نور ہلکا نہیں بلکہ بہت تیز ہے۔ اور حضور تو نور بھی ہیں اور نور گر بھی حضور نے صحابہ کرام کو تا قیامت اولیاء اللہ کو نور بنا دیا۔ اس لئے انہیں قرآن مجید نے سراج منیر فرمایا بمعنی نور گر سورج۔ غرض کہ نور کے تین درجے ہیں۔ صرف نور، نور مبین، نور منیر۔ جیسے تارے نور ہیں کہ خود چمکتے ہیں مگر زمین کا اندھیرا دور نہیں کر سکتے اور چاند یہ کہ نور مبین ہے، خود چمکتا ہے اور زمین پر چاندنا کر دیتا ہے، یہ ہے نور مبین...... اور سورج کہ خود چمکتا ہے، زمین پر دھوپ بھی ڈالتا ہے۔ اور چاند تاروں کو منور بھی کر دیتا ہے۔ لہٰذا وہ نور بھی ہے۔ نور مبین بھی اور نور منیر بھی۔ حضور ﷺ نور بھی ہیں۔ نور مبین بھی نور منیر بھی۔ اس لئے قرآن کریم نے انہیں کہیں نور کہا۔ کہیں نور مبین کہیں نور منیر۔ سراج منیر فرمایا۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَاعْتَصَمُوْا بِہٖ اس جملہ میں اس برہان اور نور مبین کی تشریف آوری کا مقصد بیان فرمایا کہ وہ دنیا میں کیوں تشریف لائے الَّذِیْنَ سے مراد صرف انسان ہیں، جن و فرشتے اور دوسری مخلوق نہیں کیونکہ ایمان کی جو جزا یہاں بیان ہو رہی ہے وہ صرف انسانوں کے لئے ہے۔ یہاں ایمان باللہ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو ماننا کیونکہ نبوت ماننے کا ذکر تو "وَاعْتَصَمُوْا بِہٖ" میں ہے۔ اعتصام کے معنی ہیں مضبوط تھامنا کہ چھوٹ نہ جائے بہٖ کا مرجع وہ ہی برہان۔ یعنی حضور ﷺ ہیں۔ جن کا ذکر ابھی ہوا۔ اعتصام فرما کر اشارۃً فرمایا گیا کہ حضور کی ذات والا صفات اس مضبوط رسی کی طرح ہے جس کا ایک کنارہ مالک کے ہاتھ میں ہو دوسرا کنارہ ڈول وغیرہ میں ہو جس کے ذریعہ نیچے والا ڈول اوپر آوے۔ صرف یہ رسی ہی نیچوں کو اوپر پہنچانے کا ذریعہ ہو۔ یعنی جو انسان دو کام کرے ایک تو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو مانے دوسرے دامن مصطفوی کو مضبوط تھامے تو ہم اسے تین نعمتیں بخشیں گے ایک یہ کہ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ رحمت سے مراد یا تو دنیا میں توفیق خیر دینا ہے یا مرتے وقت خاتمہ ایمان پر عطا فرمانا یا بعد موت برزخ کی راحتیں یا بعد قیامت جنت کی نعمتیں غرض کہ یہ کلمہ بہت وسیع ہے اور ہو سکتا ہے۔ کہ یہ چاروں چیزیں ہی مراد ہوں۔ چونکہ یہ رحمتیں ایمان اور اعتصام سے نصیب ہوئیں لہٰذا انہیں بطور جزا بیان فرمایا۔ وَفَضْلٍ۔ یہ دوسرے انعام کا ذکر ہے۔ فضل سے مراد جنت کی وہ نعمتیں ہیں جو ہمارے کسی عمل کا بدلہ نہیں محض عطا رب ذوالجلال ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا دیدار اور دوسری بہت سی وہ نعمتیں جو ہمارے خیال و گمان و وہم سے وراء ہیں۔ وَیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا یہ تیسرے انعام کا ذکر ہے۔ ہدایت کے معنی اور اس کی قسمیں اور قسموں کی علامات ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (فاتحہ:

٦) میں بیان کر چکے۔ نیز صراط مستقیم کے معنی بھی وہاں ہی بیان ہوئے۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لو کہ رحمت و فضل سے مراد جسمانی نعمتیں ہیں اور ہدایت سے مراد روحانی نعمت ہے۔ چونکہ نعمت روحانی اعلیٰ و افضل ہے نعمت جسمانی سے اس لئے اس کا ذکر آخر میں ہوا۔ اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہوئے اِلَیْہِ میں ہ ضمیر کا مرجع ذات رب العالمین ہے۔ یعنی ہم ایسے مضبوط مومن کو ایسے راستے کی ہدایت دیں گے جو اسے ہماری ذات تک پہنچائے۔ یہ ہدایت بشری ارواح میں کبریائی تجلی فرمانے سے نصیب ہو سکتی ہے اور اس کا نتیجہ دونوں جہاں کی سعادتیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے مؤمنوں کو ہم رحمت، فضل، ہدایت خاص جو ہم تک پہنچا دے سب کچھ دیں گے۔

خلاصہ تفسیر

بعض چیزیں حواس سے جانی جاتی ہیں یعنی دیکھ کر، سن کر، سونگھ کر، ٹٹول کر، چکھ کر جو چیز حواس سے معلوم نہ ہو سکے اسے عقل سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ عقل دلیل کے ذریعہ جانتی، مانتی، پہچانتی ہے۔ ہر انسان پر فرض ہے کہ رب کو جانے، پہچانے، مانے مگر اس کی ذات حواس سے وراء ہے تو اسے عقل سے ماننا پڑتا ہے۔ عقل دلیل چاہتی ہے۔ سارا عالم رب کی دلیل ہے مگر یہ دلیل کمزور، ناقص ہے کہ اس عالم کو دیکھ کر بعض عاقل مشرک ہو گئے، بعض عاقل دہریئے بن گئے۔ امام رازی کے چار سو دلائل شیطان نے توڑ دیئے۔ اسی لئے مخلوق کو ایسی برہان کی ضرورت تھی جس سے عقل بہک نہ سکے اور اسے کوئی عاقل توڑ نہ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر رحم فرماتے ہوئے اپنی برہان دنیا میں بھیجی اس برہان الٰہی کا نام ہے۔ محمد رسول اللہ۔ جس کسی نے حضور کی معرفت رب کو مانا وہ نہ مشرک ہوا نہ دہریہ اس لئے ارشاد ہوا۔ اے تمام جہان کے اولین و آخرین انسانو! تم سب کے پاس یعنی تمہارے دلوں میں، سینوں میں، جانوں میں، ایمانوں میں وہ تشریف لائے جو سراپا قوی دلیل ہیں، جن سے ہر دعوئی ایمانی و روحانی ثابت کیا جاتا ہے اور وہ تمہارے رب کے پاس سے اس کا انعام بن کر تشریف لائے اور ہم نے ان کی معرفت تمہاری طرف ایک ظاہر ظہور قوی نور بھیجا۔ ہماری یہ دو نعمتیں بہت اعلیٰ ہیں تو اب جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان لاویں اور اس برہان محمد رسول اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامیں تو اللہ تعالیٰ ان کو تین انعام دے گا۔ (۱) انہیں دنیا میں مرتے وقت قبر میں اور آخرت میں اپنی رحمت خاصہ میں داخل فرمائے گا (۲) انہیں اپنے فضل و کرم میں داخل کرے گا جس فضل کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا (۳) انہیں اپنے تک پہنچنے والے راستہ کی ہدایت دے گا جس کے ذریعے وہ رب تعالیٰ تک پہنچیں گے خیال رہے کہ رحمت عامہ بھی ہوتی ہے اور خاصہ بھی یوں ہی رحمت کسبی بھی ہوتی ہے جس میں بندے کے عمل کو دخل ہو اور عطائی بھی جس میں بندے کے عمل کو قطعاً دخل نہ ہو۔ دیکھو دھوپ، ہوا، پانی، نعمت عامہ عطائی ہیں اور سلطنت، دولت وغیرہ نعمت خاصہ کسبی ہیں۔ یہاں رحمت سے مراد رحمت خاصہ عطائی ہے۔ اس لئے رَحۡمَةٍ مِّنۡهُ فرمایا۔ یعنی وہ رحمت جو خاص رب کی طرف سے ہے، اس میں تمہارے کسب کو دخل نہیں۔

حضور برہان ہیں

حضرات انبیائے کرام کے معجزات اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی دلیل ہیں جن سے رب تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ مگر حضور ﷺ سراپا برہان ہیں کہ تمام دینی وایمانی معمے حضور سے حل ہوتے ہیں، تمام دعوے حضور سے ثابت ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ہو کہ حضور سراپا معجزہ ہیں۔ شعر

دیئے معجزے انبیاء کو خدا نے ہمارا نبی معجزہ بن کے آیا

گزشتہ انبیاء کرام میں کسی کے ہاتھ معجزہ جیسے موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضاء، کسی کی آواز معجزہ جیسے داؤد علیہ السلام کسی کا چہرہ اور حسن معجزہ جیسے یوسف علیہ السلام، کسی کی سانس معجزہ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مگر حضور ﷺ کا ہر عضو معجزہ ہر حال ہر وصف معجزہ نہیں بلکہ معجزات کا مجموعہ ہے۔ دیکھو حضور ﷺ کا بال شریف حضرت خالد کی ٹوپی میں رہا تو انہیں ہر جہاد میں فتح نصیب ہوئی۔ شاہ ہرقل کی ٹوپی میں پہنچا تو اسے دردسر سے شفا نصیب ہوئی۔ بیماروں نے بال شریف دھو کر پیا تو ہر قسم کے مرض سے شفا ملی۔ حضرات صحابہ کرام بال شریف اپنے کفن میں لے گئے تاکہ قبر کی مشکلات حل ہوں۔ حضرت طلحہ کے گھر بال پہنچا تو تمام رات انہوں نے فرشتوں کی تسبیح وتحلیل سنی (مواہب، مدارج النبوۃ)۔

حضور کی آنکھ شریف معجزہ: جو آنکھ اندھیرے اجالے میں آگے پیچھے ہر طرف کو دیکھے۔ اسی آنکھ نے تاقیامت تمام واقعات دیکھے اسی آنکھ نے نماز کسوف میں جنت کو ملاحظہ فرمالیا۔

ناک شریف معجزہ: جس نے مدینہ منورہ میں حضرت اویس قرنی کے ایمان کی خوشبو یمن سے پالی (روح البیان)۔

زبان شریف معجزہ: جس کی ہر بات وحی خدا۔ اس زبان سے جو نکلے وہ ہی ہو جاوے۔ گویا زبان کن کی کنجی ہے۔ جس زبان کا ہر حرف شریعت کا قانون ہے۔

لعاب شریف معجزہ: یہ لعاب جو حضرت جابر کے گھر دعوت کے موقعہ پر ہانڈی اور آٹے میں پڑ گیا تو اس میں ایسی برکت ہوئی کہ تھوڑا سالن وروٹی سینکڑوں مہمانوں نے کھائی، سب سیر ہوئے مگر وہ ویسے ہی باقی رہا۔ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی سے پانی کے چشمے جاری ہوئے، مگر حضور کے لعاب سے ہانڈی کی بوٹیوں، شوربے کے چشمے جاری ہوئے۔ شوربے میں پانی، نمک، مرچ، گھی، مصالحہ سب کچھ ہی ہوتا ہے، سب کے چشمے جاری ہوگئے۔ یہ ہی لعاب حضرت علی کی آنکھ کو لگا تو دکھتی آنکھ کو شفا ہوگئی، یہ ہی لعاب جب حضرت عبداللہ ابن عتیق کے پاؤں کی ٹوٹی ہڈی کو لگا تو ہڈی جوڑ دی، یہی لعاب معوذ ابن عفرا کے کندھے کے کٹے ہوئے ہاتھ کو لگا تو اسے جوڑ دیا، یہ ہی لعاب جب غار ثور میں حضرت ابوبکر صدیق کے پاؤں کے انگوٹھے کو لگا تو سانپ کا زہر ختم فرمادیا، یہ ہی لعاب کھاری کنوئیں میں پڑا تو اسے میٹھا کردیا، یہ ہی لعاب خشک کنویں میں پڑا تو اس میں پانی ہی پانی ہوگیا۔

ہاتھ شریف معجزہ: کہ اس ہاتھ نے بدر کے دن مٹھی بھر کنکر کفار پر پھینک دیئے تو سب کی آنکھوں میں کنکر پہنچ گئے۔ رب نے اس ہاتھ کو اپنا ہاتھ فرمایا کہ فرمایا: **یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (فتح: ۱۰)** اسی ہاتھ میں کنکروں نے کلمہ پڑھا۔ اسی ہاتھ پر صحابہ نے بیعت کی تو رب سے بیعت ہوگئی۔ حضرت جابر کے ہاں ایک دعوت کے موقعہ پر دستر خوان سے حضور انور نے ہاتھ پونچھ لئے تو وہ کپڑے کا دستر خوان پھٹتے پھٹ گیا مگر کبھی آگ میں نہ جلا۔ جب میلا ہو جاتا تو اسے جلتے تنور میں ڈال دیتے تھے وہ صاف ہو جاتا تھا مگر جلتا نہ تھا۔ مولانا فرماتے ہیں۔ شعر

گفت روزے مصطفےٰ دست و دہاں بس بمالید اندریں دستار خواں

انگلیاں شریف معجزہ: ایک پیالہ میں یہ انگلیاں رکھ دی گئیں تو ہر انگلی سے پانی کے چشمے جاری ہو گئے، انگلی شریف کے اشارہ سے چودھویں رات کا چاند چر گیا، انگلی شریف کے اشارہ سے ہی ڈوبا ہوا سورج واپس آیا۔

اشارہ سے چاند چیر دیا چھپے ہوئے خور کو پھیر لیا
گئے ہوئے دن کو عصر کیا یہ تاب و تواں تمہارے لئے

پاؤں شریف معجزہ: جو فرش پر چلے عرش پر چڑھے ان ہی پاؤں شریف کا اثر پتھر لے لے، بیماروں کو ٹھوکر لگ جاوے تو شفا ہو جاوے۔

پسینہ شریف معجزہ: جس میں گلاب سے اعلیٰ خوشبو غرضکہ پسینہ مبارک، دل شریف، دماغ شریف حتی کہ نام مبارک سب کے سب معجزہ ہیں۔ ان کی تفصیل ہماری کتاب ''شان حبیب الرحمٰن'' میں ملاحظہ کرو۔

لباس شریف معجزہ: کہ ایک بار حضرت عائشہ صدیقہ نے حضور انور کا تہبند شریف اوڑھ لیا تو ان کی آنکھوں سے غیب کے پردے اٹھ گئے کہ آپ نے غیبی بارش دیکھ لی جو ایک انصاری کی وفات پر نازل ہوئی جیسا کہ مثنوی شریف میں ہے۔

گفت بہر آن نمود اے پاک حبیب چشم پاکت را خدا باران غیب

بلکہ حضور انور جہاں بیٹھ جاویں وہ جگہ وہ ہوا معجزہ۔ چنانچہ ایک بار حضور انور مسجد نبوی شریف میں وضو فرما رہے تھے موزہ شریف اتار کر رکھ دیا ایک عقاب اڑا کر لے گیا اور اسے الٹ کر پھینکا جس میں سے سانپ نکلا جو مار دیا گیا۔ حضور انور نے اس سے پوچھا کہ تو نے اونچی ہوا سے موزے کا سانپ کیونکر دیکھا وہ بولا

مار در موزہ بہ بینم از ہوا نیست از من عکس تست اے مصطفےٰ

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضور ﷺ رب کی دلیل ہیں۔ توحید دعویٰ ہے۔ مدعی اپنی دلیل کو ہر طرح مضبوط کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور کو ہر طرح قوت بخشی۔ دلیل کی تائید سے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ دلیل پر اعتراض دعویٰ پر چوٹ ہے۔ یونہی حضور کی تائید توحید کی تائید ہے، حضور پر اعتراض توحید پر اعتراض۔ مقدمہ میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں کا زور دلیل اور گواہ پر ہوتا ہے۔ مدعی قوت دیتا ہے مدعا علیہ دلیل

کو کمزور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ **دوسرا فائدہ:** حضور کی معرفت قرآن مجید کی معرفت پر مقدم ہے حضور کو پہلے مانتے ہیں، قرآن کریم کو بعد میں۔ یہ فائدہ ترتیب بیان سے حاصل ہوا۔ کہ برہان کی آمد کا ذکر پہلے ہوا، قرآن کریم کے نزول کا ذکر بعد میں ہوا۔ دیکھو لوکلمہ پڑھ کر مسلمان ہوتے ہیں اور مسلمان بن کر قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ **تیسرا فائدہ:** نجات کا مدار ایمان اور اعتصام پر ہے۔ یعنی تمام ایمانیات کو مانو، حضور ﷺ کا دامن مضبوطی سے تھامو۔ یہ فائدہ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ سے حاصل ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ہدایت ہے کہ اسے رب تعالیٰ نے آخر میں فرمایا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب حضور ﷺ تمام جہان کے نبی ہیں۔ تو آیت کریمہ میں صرف انسانوں سے کیوں خطاب فرمایا گیا کہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ چاہیے تھا کہ عالمین کو خطاب ہوتا۔ **جواب:** چند وجہ سے **ایک** یہ کہ عالمین میں اشرف المخلوق انسان ہے، باقی چیزیں اس کی وجہ سے ہیں۔ اشرف کو خطاب فرمایا باقی ماتحت خود ہی اس خطاب میں آ گئے۔ جیسے رب تعالیٰ نے سجدہ آدم کے حکم میں فرشتوں کو خطاب فرمایا وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ (بقرہ: ۳۰) تو ابلیس خود ہی اس خطاب میں آ گیا تھا۔ **دوسرے** یہ کہ حضور ﷺ کی رحمت، نبوت، نذارت، تمام جہانوں کے لئے ہے مگر حضور کی تشریف آوری، آپ کی تجلی، آپ کا عشق صرف انسانوں کو ملا۔ اس لئے جَآءَكُمْ کا خطاب انسانوں سے ہی مناسب تھا۔ جس کے دل وسینہ میں حضور کی تشریف آوری ہوئی وہ انسان ہی ہے۔ **تیسرے** یہ کہ شریعت کے اکثر وبیشتر احکام صرف انسانوں پر ہی جاری ہیں نبوت کا زیادہ فیض انسان نے ہی لیا۔ **چوتھے** یہ کہ اس آیت کریمہ میں جن ثوابوں کا ذکر ہے۔ وہ صرف انسان ہی کے لئے ہیں فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ الخ۔

دوسرا اعتراض: یہاں برہان سے بھی مراد قرآن شریف ہے اور نور مبین سے بھی مراد قرآن مجید ہے اور یہ عطف تفسیری ہے۔ لہٰذا یہ آیت کریمہ حضور کے میلاد شریف اور آپ کی نعمت شریف کی نہیں (وہابی)۔ **جواب:** بعض لوگوں نے اس آیت کے یہ معنی بھی کیے ہیں۔ مگر یہ تفسیر بہت ہی کمزور وضعیف ہے۔ چند وجہ سے ایک یہ کہ یہ تفسیر اکثر مفسرین کے خلاف ہے۔ جمہور مفسرین کا یہ ہی قول ہے کہ برہان سے مراد حضور ﷺ ہیں دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں اکثر وبیشتر لفظ جَآءَكُمْ اور بعث حضور کی تشریف آوری کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور انزل و نزل قرآن کریم کے لئے۔ چنانچہ فرمایا گیا: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (توبہ: ۱۲۸) وغیرہ ان آیات کی روشنی میں یہاں بھی جَآءَكُمْ کو حضور کے لئے ہونا چاہیے۔ وہ آیات اس آیت کی تفسیر ہیں تیسرے یہ کہ عطف کو تفسیری ماننا اور دونوں جگہ قرآن کریم مراد لینا بلاضرورت درست نہیں۔ تجدید سے تاسیس بہتر ہے۔ یعنی دوسرے جملہ کے نئے معنی مراد ہونا۔ اس سے بہتر ہے کہ اس سے وہ ہی پہلے معنی مراد ہوں۔ چوتھے یہ کہ قرآن کریم ہمارے پاس آیا نہیں لایا گیا ہے۔ حضور نے ہم تک پہنچایا ہے۔ حضور کی تشریف آوری بذات خود ہے اور قرآن کریم کی آمد حضور کی آمد کے تابع ہے۔ تو جَآءَ سے ذاتی آمد مراد لینا افضل ہے۔ پانچویں یہ کہ مخلوق نے حضور سے قرآن کو جانا ہے نہ کہ قرآن سے حضور کو۔ یعنی جب حضور کی نبوت، معجزات وغیرہ سے مان لی تب یہ مانا کہ قرآن کریم ربانی کتاب ہے

کیونکہ محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ یہ نہ ہوا کہ ہم نے پہلے قرآن کو مان لیا پھر قرآن کے بتانے سے حضور کو مانا۔ لہٰذا یہاں پہلے جَآءَ کُمْ بُرْهَانٌ میں حضور کی تشریف آوری کا ذکر ہوا پھر بعد میں اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ میں قرآن کے نزول کا۔ یہ ہی مناسب ہے۔ وہابیوں کی تو عادت ہے کہ آیات نعت میں بلا وجہ توجیہیں، تاویلیں تحریفیں کرتے ہیں۔ شعر

ذکر روکے فضل کاٹے نقص کا جو یاں رہے
پھر کہے مردک کہ ہوں امت رسول اللہ کی

تیسرا اعتراض: یہاں قرآن کریم کے متعلق ارشاد ہوا کہ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ تم سب کی طرف قرآن اتارا۔ مگر دوسری جگہ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ (الدہر: ۲۳) بھی آیا ہے یعنی اے محبوب! آپ پر قرآن اترا۔ دونوں میں سے کون سی بات درست ہے، قرآن حضور کی طرف آیا ہے یا ہماری طرف۔ **جواب:** قرآن کریم کا نزول بلا واسطہ حضور ﷺ پر ہوا۔ اور حضور کے واسطہ سے ہم پر۔ کیونکہ نزول قرآن کا مقصد ہماری ہدایت ہے۔ ان آیات میں بلا واسطہ نزول مراد ہے۔ اور اس آیت کریمہ میں بالواسطہ نزول مراد ہے۔ لہٰذا دونوں آیات درست ہیں۔ اس اعتراض کے اور بہت جوابات ہیں۔

چوتھا اعتراض: اس آیت میں فرمایا گیا کہ جو اللہ پر ایمان لائیں، اس کی رسی مضبوط تھامیں، انہیں رب تعالیٰ ہدایت دے گا سیدھے راہ کی۔ جب وہ ایمان پہلے ہی لا چکے، اعتصام پہلے ہی کر چکے پھر انہیں ہدایت دینے کے کیا معنی۔ ہدایت تو انہیں پہلے ہی مل چکی ہے۔ **جواب:** اس کا جواب سورۃ فاتحہ کی تفسیر اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (فاتحہ: ۶) کی تفسیر میں گزر چکا۔ کہ ہدایت بہت قسم کی ہے۔ بعض ہدایتیں وہ ہیں جو ایمان لانے، تقویٰ اختیار کرنے کے بعد میسر ہوتی ہیں۔ یہاں وہ ہی آخری ہدایت مراد ہے۔ اسی لئے ''اِلَيْهِ'' فرمایا گیا۔ یعنی انہیں ایسے راستہ کی ہدایت فرمائے گا جو خود ذات باری تعالیٰ تک پہنچا دے، جنت تک پہنچانے والے راستہ کی ہدایت تو انہیں پہلے ہی ہو چکی تھی جس سے وہ ایمان لائے۔ یہ ہدایت دوسری ہے۔ یہ ہی جواب رحمت و فضل میں داخل فرمانے کا ہے کہ ایک رحمت و فضل انہیں وہ ملا جو ایمان لانے کا ذریعہ بنا اور ایک رحمت و فضل وہ ہے جو انہیں ایمان لانے، اعتصام کرنے کے بعد ملا۔

تفسیر صوفیانہ

کسی کی جان پہچان یا دیکھ کر ہوتی ہے یا سن کر یا دلائل سے معلوم کر کے۔ دیکھی سنی چیز کے لئے دلائل کی ضرورت نہیں، ان دیکھی ان سنی چیز کی جان پہچان کے لئے دلائل چاہئیں۔ بندے کا کمال ہے معرفت الٰہی اور ذات الٰہی ہماری آنکھ، کان بلکہ خیال و گمان سے وراء ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان وہم
وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت بہ پایاں رسید عمر
ماہمچناں دراول وصف تو ماندہ ایم

عجیب لطف ہے کہ ایمان کے لئے رب تعالیٰ کی معرفت ضروری مگر ہماری عقل سے وراء۔ دیکھو مت مگر جانو، پہچانو، مانو۔ شعر

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

اس لئے مخلوق کو ضرورت تھی کسی ایسے واسطے کی جس کی پہچان رب کی پہچان ہو جس سے نسبت رب تعالیٰ کی نسبت ہو اور جو ذات وصفات رحمان کی قوی برہان ہو۔ اس برہان رحمان کا نام حضور محمد مصطفےٰ ﷺ ہے۔ ان کو پہچان لو۔ رب تعالیٰ کو جان لو گے، مان لو گے۔

لطیفه: کسی فلسفی نے ڈاکٹر اقبال سے پوچھا کیا اللہ تعالیٰ ہے؟ فرمایا کہ ہے، بولا ایک ہے یا چند؟ فرمایا ایک، وہ بولا، دلیل۔ آپ نے فرمایا محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان فیض ترجمان۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہے اور ایک ہے۔ وہ بولا میں عقلی دلیل چاہتا ہوں۔ فرمایا جب دیکھنے والا دیکھ کر خبر دے دے تو عقلی دلیل کی ضرورت نہیں اور فرمایا جب دھوپ دیکھ لی، سورج کا یقین ہو گیا۔ اب سورج کے طلوع پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، دھوپ خود اس کی دلیل ہے۔ دھوپ سورج کی برہان ہے۔

یہاں فرمایا جارہا ہے کہ اے انسانو! تمہارے پاس وہ ذات کریم تشریف لائے جو معرفت الٰہی کی جیتی جاگتی بولتی ہوئی برہان ودلیل ہے۔ پھر وہ خالی نہ آئے بلکہ اپنے ساتھ وہ نور لائے جو خود بھی ظاہر ہے دوسروں کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ یعنی قرآن مجید جو خود نور ہے۔ جن پر نازل ہوا وہ برہان ہیں۔ اب خدارسی کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے، اللہ پر ایمان اور محمد رسول اللہ کے دامن کا اعتصام (مضبوط تھامنا) جس نے یہ دونوں کام کر لئے وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت، رحمت وفضل کے دریا میں غوطے لگائے گا۔ اور اسے رب تعالیٰ اپنی ذات تک پہنچنے کے راستہ کی ہدایت دے گا۔ یا تو ایمان باللہ سے مراد ہے توحید اور اعتصام سے نبوت مراد چونکہ توحید ونبوت ایمان کے دورکن ہیں جیسے پرندے کے لئے دو پر۔ اس لئے دونوں ارشاد ہوئے۔ یا ایمان باللہ سے مراد ہیں سارے ایمانیات اور اعتصام سے مراد ہے ایمان پر استقامت۔ بہ میں ہ کا مرجع یا اللہ تعالیٰ ہے یا ایمان یا قرآن یا برہان یعنی حضور ﷺ، رحمت وفضل وہدایت ان میں کئی احتمال ہیں۔ رحمت سے مراد دنیاوی نعمتیں، فضل سے مراد برزخی نعمتیں، ہدایت سے مراد اخروی نعمتیں یا رحمت سے مراد جسمانی نعمتیں، فضل سے مراد قلبی وجنانی نعمتیں اور ہدایت سے مراد روحانی نعمتیں۔ مگر عشاق کہتے ہیں کہ اللہ کی رحمت، فضل، ہدایت سب کچھ حضور ہی ہیں۔ دنیا میں حضور رحمت ہیں، برزخ میں فضل اور آخرت میں ہدایت۔ جیسے سورج ایک ہے مگر صبح کے وقت اس کے نام، کام، حالات اور ہیں، دوپہر کو کچھ اور، شام کو کچھ اور۔ یہی حال بندہ کا ہے کہ شروع ماہ میں اس کے نام وکام حالات اور ہیں، چودہویں شب کچھ اور، آخر ماہ میں کچھ اور۔ **خیال رہے:** کہ عالم کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی نشانی تو ہے مگر برہان نہیں۔ اللہ کی برہان صرف حضور ہیں ﷺ۔ اس لئے لوگ دنیا کی چیزیں دیکھ کر مشرک بھی ہو جاتے ہیں کہ انہیں کو خالق مان بیٹھتے ہیں مگر حضور کے ذریعہ ہر شخص مومن ہی بنے گا۔ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (شوریٰ: ۵۲) خود قرآن بھی صرف ہادی نہیں۔ فرماتا ہے: یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ

یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا (بقرہ:۲۶) مگر حضور انور صرف ہادی ہیں۔ **خیال رھے:** کہ حضور کے معجزات بعض وہ ہیں جو از آدم تا حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام امتوں میں دیکھے گئے۔ جیسے حضور کے توسل سے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہونا، حضور کے نام کی برکت سے جناب خلیل پر آگ گلزار ہونا، نوح علیہ السلام کی کشتی پار لگنا، بعض وہ ہیں جو ولادت اور پرورش کے وقت دیکھے گئے بعض وہ ہیں جو حضرات صحابہ نے وفات شریف تک دیکھے، بعض وہ ہیں جو قیامت تک دیکھے جائیں گے جیسے قرآن مجید یا اولیاء اسلام کی کرامات یا حضور کا ذکر کثیر یا حضور کی محبوبیت یا حضور کی برکت سے اسلامی فتوحات وغیرہ۔ اس لئے سارے انسانوں سے فرمایا گیا کہ تم سب کے پاس برہان الٰہی آئی۔

یَسْتَفْتُوْنَكَؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِؕ اِنِ امْرُؤٌا

فتوی پوچھتے ہیں لوگ آپ سے فرمادو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے متعلق فتویٰ دیتا ہے اگر کوئی مرد

اے محبوب تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں تم فرمادو کہ اللہ تمہیں کلالہ میں فتویٰ دیتا ہے اگر کسی مرد

هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا

ہلاک ہو جائے کہ نہ ہو واسطے اس کے اولاد اور اس کی بہن ہو تو واسطے اس کی بہن کے آدھا ہے اس کا

کا انتقال ہو جو بے اولاد ہے اور اس کی ایک بہن ہو تو ترکہ میں اس کی بہن کا

تَرَكَۚ وَهُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهَا وَلَدٌؕ فَاِنْ

جو چھوڑا اور وہ اس بہن کا وارث ہوگا اگر نہ ہو اس کی اولاد پس اگر

آدھا ہے اور مرد اپنی بہن کا وارث ہوگا اگر بہن کے اولاد نہ ہو پھر اگر

كَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَؕ وَاِنْ كَانُوْۤا

ہوں وہ دو تو واسطے ان کے دو تہائی ہے اس میں سے جو چھوڑے اور اگر ہوں وہ

دو بہنیں ہوں تو ترکہ میں ان کا دو تہائی اور اگر

اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِؕ

بھائی بہن مرد اور عورتیں تو واسطے مرد کے برابر ہے حصے دو عورتیں کے

بھائی بہن ہوں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر

یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْاؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۠ (۱۷۶)

بیان فرماتا ہے واسطے تمہارے اللہ تا کہ نہ بھکو تم اور اللہ ہے ہر چیز کا جاننے والا

اللہ تمہارے لئے صاف بیان فرماتا ہے کہ کہیں بہک نہ جاؤ اور اللہ ہر چیز جانتا ہے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل وہدایت کو دو چیزوں سے وابستہ فرمایا گیا تھا۔ ایک تو اللہ پر ایمان دوسرے حضور ﷺ سے اعتصام۔ اب ارشاد ہورہا ہے کہ یہ وابستگی حضور ﷺ کی زندگی میں بھی چاہیے اور بعد موت بھی تا کہ معلوم ہو کہ مومن اسلامی قوانین میں زندگی میں اور بعد موت جکڑا ہوا ہے دوسرے دنیاوی قوانین کی طرح صرف زندگی کے لئے نہیں۔

دوسرا تعلق: پچھلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مکمل ذکر ہوا جو بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں جن کے بعد نبوت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر بنی اسمٰعیل میں آ گئی یعنی محمد ﷺ نبی ہوئے جو بنی اسمٰعیل سے ہیں اور بنی اسمٰعیل بھائی ہیں بنی اسرائیل کے۔ کیونکہ حضرت اسحٰق واسمٰعیل علیہما السلام بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا اب کلالہ مورث کا ذکر ہوا۔ جو لا ولد فوت ہو جاوے اور اس کا مال اس کے بھائیوں کی طرف بطور میراث منتقل ہو جاوے۔ غرض کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد مسئلہ کلالہ کا بیان فرمانا بہت ہی موزوں ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیات میں ان یہود کا ذکر ہوا تھا جو اپنے آپ کو اولاد انبیاء ہونے کی وجہ سے جنت کا ٹھیکیدار سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم خواہ کیسے ہی عقیدے رکھیں ہم کیسے ہی عمل کریں جنتی ہیں کیونکہ ہمارے باپ دادا نبی تھے ہم ان کی اولاد ہیں۔ اب ان کی تردید کے لئے مسئلہ کلالہ بیان ہوا جس میں بتایا گیا کہ جیسے لا ولد کا مال بھائی بہنوں میں پہنچ جاتا ہے ایسے ہی نالائق لوگوں کے باپ دادوں کے کمالات دوسروں کو ملتے ہیں جو ان کمالات کے مستحق ہوں۔ تم لوگوں نے کفر وشرک کر کے اپنے باپ داداؤں سے نسبت توڑ دی تم ان کی اولاد حقیقۃً رہے ہی نہیں لہٰذا اب تمہارے باپ داداؤں کے کمالات مسلمانوں کو ملیں گے۔ وہ ان کے وارث حال وارث کمال بنیں گے۔

شان نزول

مسلم وبخاری میں ہے کہ حضرت جابر ابن عبد اللہ فرماتے ہیں میں سخت بیمار ہوا۔ حضور نبی کریم ﷺ اور جناب ابو بکر صدیق میری بیمار پرسی کو تشریف لائے پیدل آئے، میں بے ہوش تھا، حضور ﷺ نے وضو کیا، وضو کے پانی کا چھینٹا مجھ پر مارا، مجھے ہوش آ گیا، دیکھا تو سرکار میرے سرہانے ہیں۔ شعر

سر بالیں انہیں رحمت کی ادا لائی ہے ‏ ‏ حال بگڑا ہے تو بیمار کی بن آئی ہے

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں کلالہ ہوں (لا ولد، لا والد) میرا مال کیسے تقسیم ہوگا؟ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ حضرت جابر کی نو بہنیں تھیں۔ ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ آپ کی سات بہنیں تھیں۔ یہ آیت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل تو ہوئی مگر حضور ﷺ نے فرمایا: اے جابر! تم اس مرض سے وفات نہیں پاؤ گے (تفسیر خازن، روح البیان وغیرہ)۔

(۲) طبری نے حضرت قتادہ سے روایت کی۔ حضرات صحابہ کرام کو کلالہ کے مسئلہ میں اشکال پیش آیا کہ جس میت کی نہ اولاد ہو

نہ ماں باپ اس کی میراث کیونکر تقسیم ہو؟ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (خازن)۔ مگران دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہوسکتا کہ اول سے حضرات صحابہ کرام کو یہ اشکال پیش آرہا ہو۔ کہ حضرت جابر کا یہ واقعہ پیش آگیا ہو۔

تفسیر

یَسْتَفْتُوْنَكَ۔ یہ کلمہ بنا ہے استفتاء سے جس کا مادہ ہے فتویٰ، فتویٰ کے معنی لغوی اور اصطلاحی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اصطلاح میں حکم شرعی کو فتویٰ کہا جاتا ہے۔ استفتاء کے معنی ہیں شرعی مسئلہ پوچھنا۔ اگرچہ مسئلہ پوچھنے والے بظاہر صرف حضرت جابر تھے مگر چونکہ اس کی ضرورت تمام صحابہ کرام بلکہ عام مسلمانوں کو تھی اس لئے صیغہ جمع ارشاد ہوا۔ گویا مقالاً سائل ایک صاحب تھے اور حالاً سائل بہت حضرات۔ یہاں فتویٰ سے مراد کلالہ کا مسئلہ ہے جیسا کہ جواب سے معلوم ہورہا ہے۔ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ۔ سبحان اللہ سوال ہوا رسول اللہ ﷺ سے جواب دیا اللہ تعالیٰ نے کیونکہ حضور سے سوال گویا اللہ تعالیٰ سے سوال ہے اَللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ میں اشارہ فرمایا گیا کہ چونکہ مسئلہ میراث بہت اہم ہے اس لئے براہِ راست اللہ تعالیٰ اس کا حکم دے رہا ہے۔ کلالہ کے معنیٰ، اس کی تحقیق وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ كَلٰلَةً الخ (النساء: ۱۲) کی تفسیر میں عرض کی جا چکی ہے۔ کہ کلالہ بنا ہے کلال سے بمعنی کمزوری یا قوت کی کمی پھر ولادت کے رشتہ کے علاوہ دوسری قرابتوں کو کلالہ کہا جانے لگا۔ کہ وہ قرابتیں بمقابلہ ولادت کی قرابت کے کمزور ہوتی ہیں۔ اصطلاح میں کلالہ ایک وارث کو بھی کہتے ہیں اور ایک مورث کو بھی۔ اولا د وماں باپ کے سوا دوسرے وارث کلالہ ہیں۔ یعنی کمزور قرابت دار اور جو شخص مرے اور اپنے ماں باپ اولاد نہ چھوڑے وہ کلالہ ہے۔ یعنی لاولد (تفسیر خازن) اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ یہ جملہ پہلے جملہ کی تفصیل وتفسیر ہے۔ اِنْ شرطیہ ہے امْرُؤٌا کے معنی ہے مرد اس کا مؤنث امراۃ ہے بمعنی عورت۔ یہاں مرد سے مراد مسلمان مال والا مرد ہے۔ کیونکہ کفار پر اسلامی میراث جاری نہیں ہوتی۔ یونہی بالکل نادار میت پر احکام میراث نہیں کہ اس کے پاس مال ہی نہیں جو تقسیم ہو هَلَكَ فرما کر اشارۃً فرمایا گیا کہ وہ کس طرح مرے اپنی طبعی موت سے یا کسی حادثہ کا شکار ہوکر، یہ بھی اشارۃً بتایا گیا کہ اپنے آپ مرے، اسے کوئی وارث قرابت دار قتل نہ کرے، اگر کرے گا تو قاتل میراث سے محروم ہوگا۔ لَیْسَ لَهٗ، هَلَكَ کی ضمیر سے خالی ہے۔ یعنی مرتے وقت اس کی اولاد نہ ہونا۔ ولد مطلقاً اولاد کو کہتے ہیں۔ بیٹا ہو یا بیٹی۔ ابن بیٹے کو کہتے ہیں۔ تفسیر مدارک نے یہاں ولد سے مراد لیا بیٹا کیونکہ بیٹا ہی میت کے بھائی بہن کو محروم کرتا ہے، بیٹی محروم نہیں کرتی۔ باقی مفسرین نے ولد کے معنی اولاد رکھا۔ بیٹا بیٹی۔ کیونکہ بیٹی کے ہوتے ہوئے بھی بہن ذی فرض ہوکر آدھا مال نہیں لیتی۔ صرف عصبہ ہوجاتی ہے۔ اور یہاں ذکر ہے بہن کے ذی فرض ہوکر آدھا مال لینے کا۔ فقیر کے نزدیک یہ تفسیر قوی ہے۔ خیال رہے کہ کلالہ کے ایک وصف کا ذکر تو اس آیت میں ہوا یعنی اولاد نہ ہونا' دوسرے وصف کا ذکر حدیث شریف میں ہے یعنی ماں باپ بھی نہ ہونا۔ کلالہ کہتے ہی اسے ہیں جس کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ یعنی اگر کوئی مسلمان مرد اس حال میں مرے کہ نہ اس کی اولاد ہو بیٹا بیٹی اور نہ ماں باپ۔ وَلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ یہ جملہ گزشتہ جملہ لَیْسَ لَهٗ پر معطوف ہے۔ ہ کا مرجع وہ فوت ہوجانے والا مرد ہے۔ اخت سے مراد یا تو سگی بہن ہے یا سوتیلی بہن۔ یعنی باپ شریکی۔ کیونکہ ماں شریکی بہن کا ذکر تو

شروع سورۃ نساء میں ہو چکا وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ (النساء: ۱۲) اور اخت اور وہاں ہی بتا دیا گیا کہ ماں شریکی بہن اگر ایک ہو تو اسے چھٹا حصہ ملے گا زیادہ ہوں تو تہائی۔ بہر حال یہاں سگی یا باپ شریکی یعنی سوتیلی بہن مراد ہے اور اسے آدھا مال ملنا بطور ذی فرض ہے۔ یعنی ایسا آدمی جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ بیٹا بیٹی اور اس کے ایک بہن ہو سگی یا سوتیلی تو اسے متروکہ مال سے آدھا ملے گا یہ اس صورت کا بیان ہوا جب بھائی لا ولد مرے اور بہن چھوڑے۔ اب اس کے مقابل صورت کا ذکر ہے۔ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ھو کا مرجع مرد یعنی بھائی ہے۔ اور یرثھا میں ھا کا مرجع بہن فوت شدہ۔ یہاں بھی سگے یا سوتیلے باپ شریکے بہن بھائی مراد ہیں نہ کہ اخیافی (ماں شریکے) اور ولد سے مراد مطلقاً اولاد ہے لڑکا ہو یا لڑکی۔ اور باپ و ماں کی نفی حدیث شریف سے معلوم ہوئی۔ یعنی بھائی اپنی سوتیلی یا سگی بہن کا وارث ہوگا اگر اس کے اولاد اور ماں باپ نہ ہوں۔ چونکہ اس صورت میں بھائی ذی فرض نہیں ہوتا بلکہ عصبہ ہوتا ہے کہ دوسرے ذی فرض وارثوں سے بچا ہوا مال لیتا ہے اور اگر کوئی ذی فرض نہ ہو تو سارا مال اسے ملتا ہے۔ اس لئے یہاں یَرِثُهَاۤ فرمایا نصف یا کم و بیش کا ذکر نہ فرمایا۔ نیز اگر میت بہن کے بیٹی بھی ہو تو بھائی کو سارا مال نہیں مل سکتا اس لئے ولد فرمایا ابن نہ فرمایا۔ لہٰذا یہ جملہ بہت واضح ہے۔ یعنی اگر کلالہ بہن فوت ہو جاوے تو یہ سگا یا سوتیلہ بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اس طرح کہ اگر کوئی ذی فرض وارث بھی ہو تو اس سے بچا ہوا مال لے گا ورنہ پورا مال پائے گا۔ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ۔ یہ کلالہ کی میراث کی دوسری صورت ہے۔ یہ کلالہ فوت ہوا اور اس کی بہنیں ایک سے زیادہ ہیں، بھائی کوئی نہیں تو انہیں کل مال کا دو تہائی ملے گا۔ كَانَتَا کا مرجع بہنیں ہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوا کہ دو بہنوں کی میراث دو ثلث ہیں۔ حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ دو سے زیادہ کی میراث بھی یہی دو تہائی ہے۔ مِمَّا تَرَكَ سے مراد میت کا سارا چھوڑا ہوا مال ہے۔ منقولی ہو یا غیر منقولی۔ تجہیز و تکفین اداء قرض اداء وصیت کے بعد جو مال بچے گا اس میں یہ میراث جاری ہوگی۔ قرآن کریم فرماتا ہے: مِّنْۢ بَعْدِ وَصِیَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَاۤ اَوْ دَیْنٍ (النساء: ۱۲) یعنی اگر کلالہ کی بہنیں ایک سے زیادہ ہوں تو انہیں کلالہ کے متروکہ مال سے دو تہائی ملے گا۔ ایک تہائی سے دوسرے وارث کو اور اگر کوئی وارث نہ ہو تو پھر وہ بقیہ تہائی بھی رد ہو کر انہیں بہنوں کو مل جاوے گا۔ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ یہ کلالہ کے مال کی تقسیم کی تیسری قسم ہے کہ میت لا ولد ہے اور اس کے بھائی بھی ہیں بہن بھی۔ اِخْوَةً جمع ہے اخ بمعنی بھائی کی۔ مگر یہاں مراد بھائی بہن دونوں ہیں۔ تغلیباً اخوۃ فرمایا گیا ہے اس لئے ساتھ ہی ارشاد ہوا رِجَالًا وَّنِسَآءً یعنی مخلوط ہوں۔ بھائی بھی ہوں بہن بھی۔ چونکہ اس صورت میں بہن ذی فرض نہیں ہوتی بلکہ عصبہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا حصہ نصف یا کم و بیش مقرر نہیں فرمایا بلکہ ایک قاعدہ ارشاد ہوا کہ بھائی کو بہن سے دوگنا ملے گا۔ اگر کوئی ذی فرض وارث بھی ہے تو اس سے بچے مال کی تقسیم اس طرح ہوگی ورنہ کل مال کی تقسیم یہ ہے مقصد یہ ہے کہ اگر کلالہ کے سگے یا سوتیلے بھائی بہن دونوں ہوں تو متروکہ مال سے دو حصہ بھائی کو اور ایک حصہ بہن کو ملے گا۔ خیال رہے کہ کلالہ کے یہ معنی اور آیت کی یہ تفسیر عام صحابہ کرام کے مذہب پر ہے۔ سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ کلالہ

وہ ہے جس کے اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں یا نہ ہوں کیونکہ ان کے نزدیک ماں باپ سے بہن بھائی محروم نہیں ہوتے ان کے ہوتے ہوئے بھی انہیں حصہ مل جاتا ہے باقی تمام صحابہ کرام کا مذہب یہ ہی ہے کہ باپ کے ہوتے بہن بھائی محروم ہوتے ہیں (تفسیر احمدی)۔ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا یہ جملہ گزشتہ فرمان کی حکمتیں بیان فرمار ہا ہے۔ یُبَیِّنُ بنا ہے تَبْیِیْنٌ سے بمعنی خوب اچھی طرح صاف صاف بیان فرما دینا لَكُمْ میں خطاب مسلمانوں سے ہے۔ بیان سے مراد میراث و دیگر شرعی احکام بیان فرما دینا ہے۔ اَنْ تَضِلُّوْا سے پہلے یا تو لا پوشیدہ ہے یا کراھیۃ پوشیدہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان تمام احکام کو واضح طور پر اس لئے بیان فرماتا ہے تاکہ اے مسلمانو! تم بہک نہ جاؤ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ اس جملہ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ میراث کے احکام ہماری عقل سے وراء ہیں، رب تعالیٰ نے جس وارث کو جو حصہ دیا بالکل درست و صحیح دیا۔ تم اس میں چون و چرا نہ کرو کیونکہ وہ رب ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے کلالہ کا مسئلہ قرآن مجید میں دو جگہ بیان فرمایا۔ ایک تو سورۃ نساء کے شروع میں دوسری یہاں سورۃ نساء کے آخر میں۔ وہ آیات سردی کے موسم میں نازل ہوئی تھیں اور یہ آیات گرمی کے موسم میں اتریں۔ اس لئے ان آیت کو آیات شتاء کہتے ہیں اور اس آیت کو آیت صیف کہا جاتا ہے (تفسیر کبیر)۔ ان دونوں بیانوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں کلالہ کے مال سے اخیافی بھائی بہن کے حصہ کا ذکر تھا اور یہاں سگی یا سوتیلی باپ شریکی بہن بھائی کے حصوں کا ذکر ہے۔ اس لئے وہاں اور یہاں کے احکام میں بڑا فرق ہے۔ اس آیت میں ایک کو چھٹا حصہ دیا گیا تھا زیادہ کو تہائی اور وہاں بھائی بہن کا حصہ برابر تھا مگر یہاں تین صورتیں بیان فرمائی گئیں۔ (۱) اگر ایک بہن ہے تو اس کا حصہ آدھا ہے (۲) اگر دو یا زیادہ ہیں تو ان کا حصہ دو تہائی ہے۔ یہ دونوں صورتیں جب ہیں جب کہ صرف بہنیں ہوں۔ بھائی کوئی نہ ہو (۳) اگر بھائی بہن دونوں ہوں تو یہ دونوں عصبہ ہوں گے اور بھائی کو بہن سے دوگنا ملے گا۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے صحابہ آپ سے ایک عظیم الشان سوال پوچھ رہے ہیں (یعنی کلالہ کی میراث کا)۔ آپ فرمادیں کہ رب تعالیٰ تم کو کلالہ کے متعلق براہ راست فتویٰ یہ دیتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان فوت ہو جاوے اور اس کی اولاد یعنی بیٹا بیٹی نہ ہو اور نہ ماں باپ ہوں (جیسا کہ حدیث میں ہے) اور اس کی صرف ایک بہن سگی یا ماں شریکی ہو تو اسے کلالہ کے متروکہ مال سے نصف آدھا ملے گا۔ اور اگر اس کے برعکس کلالہ عورت فوت ہو جاوے کہ اس کی اولاد بیٹا بیٹی اور (ماں باپ) کوئی نہ ہوں اور اسی کا صرف بھائی ہو تو وہ بھائی اس کلالہ عورت کے مال کا وارث ہوگا۔ عصبۃً میراث پائے گا یعنی بقیہ ذی فرض وارثوں سے بچا ہوا مال لے لے گا۔ اور اگر ذی فرض وارث کوئی نہ ہو تو کل مال پائے گا اور اگر کلالہ میت کی بہن دو یا زیادہ ہوں تو انہیں متروکہ مال سے دو تہائی ملے گا۔ یہ دونوں صورتیں جب ہیں جب کہ کلالہ کی صرف بہنیں ہوں، بھائی کوئی نہ ہو، اور اگر کلالہ کی بھائی بہن دونوں ہوں سگے ہوں یا علاتی تو اس کا مال اس طرح تقسیم ہوگا کہ مذکر یعنی بھائی کو مونث یعنی بہن سے دوگنا عصبۃً ملے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام خصوصاً میراث کے مسائل واضح طور پر بیان فرماتا ہے تاکہ اے مسلمانو! تم بہک نہ جاؤ۔ رب تعالیٰ کی تقسیم پر

کوئی اعتراض نہ کرو وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ جسے جو دیا ہے جان کر دیا ہے۔ خیال رہے کہ حضرت براء ابن عازب فرماتے ہیں کہ قرآن کی آخری آیت یہ ہی آیت کلالہ ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ اور حضرت ابن عباس کا فرمان ہے کہ سب سے آخر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ (نصر:۱) اتری۔ بعض نے فرمایا کہ آخری آیت ربوا (سود) کی آیت ہے۔ بعض نے فرمایا کہ آخری آیت وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰہِ (بقرہ:۲۸۱) نازل ہوئی۔ جس کے بعد حضور ﷺ صرف اکیس دن حیات رہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ حج الوداع میں عرفہ کے دن اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ (مائدہ:3) نازل ہوئی جس کے بعد سرکار اکیاسی دن یعنی دو ماہ اکیس دن حیات رہے (تفسیر خازن)۔ ان روایات کو یوں جمع فرمایا جا سکتا ہے کہ میراث کے احکام میں سب سے آخری آیت یہ ہی کلالہ کی آیت ہے۔ اور مالی معاملات میں سود کی آیت آخری ہے۔ اور بالکل آخر میں وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰہِ (بقرہ:۲۸۱) ہے لہٰذا ان روایات میں تعارض نہیں، سب اپنے مقام پر درست ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: میت کے مال متروکہ میں چار کام کیے جاتے ہیں۔ اولاً میت کا کفن دفن، اس سے بچے مال سے میت کے قرض کی ادائگی پھر بقیہ مال کے تہائی سے میت کی وصیت جاری کی جاوے پھر بقیہ سے میراث تقسیم ہوگی۔ میت کی فاتحہ ایصال ثواب وغیرہ میت کے مال سے نہ کی جاوے کیونکہ اب وہ مال وارثوں کا ہے۔ یا تو تمام وارث اپنی خوشی سے ایصال ثواب وغیرہ کریں یا پہلے مال تقسیم کریں پھر کوئی وارث اپنے حصے سے یہ کار خیر کرے۔ اگر کوئی وارث نابالغ یا غائب ہے تو مال مشترکہ سے ختم فاتحہ نہ کرائی جاوے۔ خیرات وصدقات کا زمانہ اپنی زندگی ہے جو کچھ ہو سکے جیتے جی اپنے ہاتھوں سے کر جاؤ مرتے ہی بلکہ مرض الموت میں مبتلا ہوتے ہی مال کسی اور کا ہے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضور ﷺ کو بارگاہِ الٰہی میں ایسا قرب خصوصی حاصل ہے جو ہمارے خیال سے وراء ہے دیکھو کلالہ کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا تھا حضور سے مگر جواب دیا رب تعالیٰ نے۔ ورنہ جس سے سوال ہو وہ ہی جواب دیتا ہے۔ یا اس کا مالک یا اس کا مختار یہ فائدہ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْكُمْ سے حاصل ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** مرضی الٰہی یہ ہے کہ مسلمان کسی چیز میں حضور ﷺ سے بے نیاز نہ ہوں۔ ہر وقت ہر طرح ہر چیز میں حضور کے حاجت مند رہیں دیکھو کلالہ کی تعریف میں ایک بات قرآن مجید نے بیان فرمائی۔ یعنی اولاد نہ ہونا یعنی دوسری بات حضور نے بیان فرمائی ماں باپ نہ ہونا۔ یہ فائدہ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ سے حاصل ہوا۔ رب تعالیٰ نے نماز و زکوٰۃ کا حکم دیا مگر اس کی تفصیل نہ بتائی۔ یہ تفصیل حضور ﷺ نے بیان کی۔ **تیسرا فائدہ:** مرد عورت سے افضل ہے۔ اسی لئے پہلے مرد کا ذکر فرمایا جاتا ہے پھر عورت۔ دیکھو یہاں کلالہ مرد کا ذکر پہلے ہوا اور کلالہ عورت کا ذکر بعد میں آتا ہے۔ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ (احزاب:۳۵) یہ فائدہ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ سے حاصل ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** اگر کلالہ کی صرف بہن ہو تو ذی فرض ہوگی اور اگر صرف بھائی ہو تو عصبہ ہوگا، ذی فرض نہ ہوگا۔ دیکھو

بہن کے لئے فرمایا فَلَهَا نِصْفُ اور بھائی کے لئے فرمایا: وَهُوَ يَرِثُهَآ ۔ **پانچواں فائدہ:** اگر کلالہ کے بہن بھائی دونوں ہوں تو بہن اپنے بھائی کی وجہ سے عصبہ ہو جائے گی یعنی عصبہ لغیرہ یہ فائدہ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ سے حاصل ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** جس میت نے اپنی بیٹی چھوڑی ہو وہ کلالہ نہیں اور اس صورت میں اس کی بہن ذی فرض نہ ہوگی، عصبہ ہی ہوگی۔ یہ فائدہ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ سے حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ نے یہاں ولد کی نفی کی صرف ابن کی نفی نہ کی۔ **ساتواں فائدہ:** میراث کے مسائل میں وہ بھی جماعت ہے۔ کہ جتنا حق دو وارثوں کا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ کا یہ فائدہ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ سے حاصل ہوا۔ وہ جو حدیث شریف میں ہے۔ کہ اثنان فما فوقھما جماعة یعنی دو اور زیادہ جماعت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہی ہے کہ میراث کے حق میں جماعت ہیں۔ **آٹھواں فائدہ:** میراث کے مسائل نہایت اہم ہیں۔ دیکھو رب تعالیٰ نے جتنی تفصیل ان کی فرمائی اور دوسرے شرعی احکام کی نہ فرمائی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ علم فرائض (میراث) سیکھو کیونکہ یہ آدھا علم ہے۔ یعنی سارے علوم ایک طرف یہ اکیلا علم ایک جانب کہ سارے علوم کا تعلق انسان کی زندگی سے ہے۔ اور اس علم کا تعلق انسان کی موت سے ہے۔ آدھے میں سارے علوم آدھے ہیں۔ یہ اکیلا علم۔ **نواں فائدہ:** علم میراث کے مسائل عقل و قیاس سے وراء ہیں۔ ان کو مان لو وجہ نہ پوچھو یہ فائدہ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ سے حاصل ہوا۔ مریض طبیب کے نسخہ میں دواؤں کے اوزان پر بحث نہیں کرتا کہ یہ دوا دو ماشہ کیوں ہے یہ پانچ ماشہ کیوں بلکہ بغیر بحث و مناظرہ کیے نسخہ استعمال کرتا ہے۔ یوں ہی بندہ کو چاہیے کہ میراث کے حصوں کی مقدار سے بحث نہ کرے۔ بغیر چون و چرا عمل کرے۔ رب نے جسے جو دیا حق دیا۔ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے بعض چیزیں ایسی رکھی ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں۔ تا کہ انسان بندہ بن کر رہے۔ بندہ مجبور ہو کر رب کو مانتا ہے۔ مجبوری خواہ مالی ہو یا عقلی یا علمی یا قوت و اسباب کی مجبوری ہو۔ انسانی جسم جانا پہچانا جاتا ہے مگر روح جان پہچان سے وراء ہے۔ وہاں یہ ہی کہنا پڑتا ہے کہ رب جانے یہ کیا ہے؟ درخت کی شاخیں پتے جڑ دیکھی جا سکتی ہیں مگر اندرونی رس دیکھا پہچانا نہیں جاتا۔ یونہی شریعت کے بہت سے احکام کی وجہ سے ان کی حکمتیں عقل معلوم کر لیتی ہے مگر میراث کے حصے، نماز کی رکعات، زکوٰۃ کی تعداد وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جہاں عقل جواب دے جاتی ہے۔ وہاں کہنا پڑتا ہے ان کی حکمتیں رب جانے اس لئے اس آیت کے آخر میں ارشاد ہوا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔

ضروری نوٹ: کلالہ کا مسئلہ اور علم میراث کے تمام مسائل ہماری کتاب ''علم المیراث'' میں مطالعہ کرو۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: قرآن مجید میں بہن بھائیوں کا حصہ یہاں کچھ اور بیان ہوا ہے اور سورۃ نساء کے شروع میں کچھ اور بیان ہوا۔ ان دونوں بیانوں میں بڑا فرق ہے۔ مگر ایک بہن کا چھٹا حصہ زیادہ کا تہائی فرمایا گیا اور وہاں بہن بھائی کا حصہ برابر رکھا گیا مگر یہاں ایک بہن کا آدھا زیادہ کا دو تہائی حصہ فرمایا گیا اور بھائی کا حصہ بہن سے دوگنا۔ آیات میں تعارض ہے۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ وہاں شروع سورۃ نساء میں اخیافی بہن بھائی مراد ہیں یعنی ماں شریکے ان کا حصہ وہی چھٹا حصہ اور تہائی ہے۔ اخیافی بھائی بہن حصہ میں برابر ہوتے ہیں

اور یہاں حقیقی اور علاتی بھائی بہن مراد ہیں۔ ان کا حصہ وہی ہے جو یہاں ارشاد ہوا۔ لہٰذا آیات میں تعارض نہیں۔

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کلالہ وہ ہے جس کے اولاد نہ ہو۔ تم نے ماں باپ کے نہ ہونے کی قید کہاں سے لگائی؟ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس یہ ہی فرماتے ہیں۔ دیکھو تفسیر احمدی اور تفسیر ابن کثیر۔ **جواب:** ہاں ان دونوں بزرگوں کا یہی قول ہے۔ مگر جمہور صحابہ اور عام تابعین یہ ہی فرماتے ہیں کہ کلالہ وہ ہے جس کے اولاد بھی نہ ہو ماں باپ بھی نہ ہوں۔ حضرت زید ابن ثابت جو علم فرائض کے امام ہیں ان کا بھی یہ ہی قول ہے۔ چنانچہ بھائی، بہن، باپ، دادا کے ہوتے ہوئے محروم ہیں۔

لطیفہ: حضرت عبداللہ ابن عباس و عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ وہ دونوں حضرات بیٹی کے ہوتے بہن کو محروم مانتے ہیں۔ وہ اسی آیت سے دلیل لیتے ہیں کہ اگر ولد نہ ہو تو بہن کو ملے گا۔ اور ولد کہتے ہیں بیٹے بیٹی کو مگر تمام صحابہ ان کے مخالف ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے۔ **اجعلو الاخوات مع البنات عصبة** بیٹوں کے ساتھ بہنوں کو عصبہ بناؤ۔ چنانچہ بخاری شریف میں بروایت شرجیل ابن حسنہ روایت کی کہ ایک شخص نے حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص نے ایک بیٹی، ایک پوتی ایک بہن چھوڑی ان کی میراث کیسے تقسیم ہو؟ آپ نے فرمایا بیٹی کو آدھا اور بہن کو آدھا اور پوتی محروم اور فرمایا کہ حضرت ابن مسعود سے بھی یہ مسئلہ پوچھ لو، وہ بھی یہ ہی بتائیں گے۔ حضرت ابن مسعود نے یہ سن کر فرمایا کہ اگر میں یہ فتویٰ دوں تو میں گمراہ ہوں جاؤں گا۔ یہاں بیٹی کو آدھا ہے پوتی کو چھٹا حصہ۔ باقی تہائی بہن کو اور فرمایا کہ حضور ﷺ نے ایسے واقعہ پر یہ ہی فیصلہ فرمایا (تفسیر ابن کثیر و احمدی)۔

تیسرا اعتراض: اگر مسئلہ یہ ہے تو یہاں فرمانا چاہیے تھا وَلَیْسَ لَهٗ اِبْن۔ کیونکہ ولد بیٹا بیٹی دونوں کو شامل ہوتا ہے۔ **جواب:** یہاں بہن کی محرومی کا ذکر نہیں بلکہ بہن کے ذی فرض ہو کر نصف یا دو تہائی لینے کا ذکر ہے۔ یہ بات بیٹی کے ہوتے ہوئے بھی ہو جاتی ہے۔ بیٹے سے بہن بالکل محروم ہو جاتی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اللہ تعالیٰ نے سارے شرعی احکام اپنے محبوب کے سپرد فرما دیئے کہ وہ بیان کریں مگر وارثوں کے حصے خود بیان فرمائے۔ اپنے محبوب کے سپرد نہ فرمائے۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ اگر حضور کے ذریعے میراث کے حصے مقرر فرمائے جاتے تو شیطان کسی کے دل میں وسوسہ ڈال دیتا کہ حضور نے بعض وارثوں کی طرف داری کی ہے۔ یہ وسوسہ کفر ہوتا۔ ہم کو کفر سے بچانے، ایمان پر قائم رکھنے کے لئے اور اپنے محبوب ﷺ کو لوگوں کے اعتراض سے بچانے کے لئے یہ کام خود کیا۔ دیکھو حضور ﷺ نے غزوۂ حنین میں کفار حوازن کا مال تقسیم فرمایا اور نو مسلموں کو زیادہ عطا فرمایا تو بعض لوگوں کے منہ سے نکل ہی گیا کہ حضور انور ﷺ قریش کو اتنا دیتے ہیں اور ہم کو محروم رکھتے ہیں حالانکہ ہماری تلواریں ہوازن کے خون سے تر ہیں۔ تب حضور انور نے تمام انصار کو جمع فرما کر ارشاد فرمایا کہ ہم نو مسلموں کو اس لئے زیادہ عطا فرماتے ہیں کہ وہ اسلام پر خوب جم جاویں، تم تو پہلے ہی جمے ہوئے ہو۔ تب ان کے دلوں کو تسلی ہوئی غرض کہ مال کی تقسیم

بہت نازک چیز ہے اس میں لوگ جلد بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اپنے کو اس سے محفوظ رکھنا مناسب ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جیسے نسب کے ذریعہ مالی میراث ملتی ہے ویسے ہی نسبت کے ذریعہ حالی اور کمالی میراث ملتی ہے۔ جس قدر نسبت کی قرابت قوی اور قریب ہے اسی قدر میراث کا حصہ زیادہ ایسے ہی جس قدر نسبت قوی کمال کا حصہ زیادہ اور جیسے ماں باپ سے نسب بھائی بہن کی میراث کا ذریعہ ہے۔ ایسے ہی حضور سے نسبت اولیاء اللہ کے فیوض کا ان کے کمال میراث کا وسیلہ ہے اور جیسے اگر بہن اکیلی ہو تو اس کی میراث اور ہے اور اگر بھائی سے مل کر آوے تو میراث کچھ اور۔ اور یونہی اگر نفس اکیلا ہو تو اس کا نور سے حصہ کچھ اور دل سے ملا ہو تو حصہ کچھ اور ہے۔ غرض کہ اس مال میراث سے کمال میراث کا پتہ لگاؤ۔ نسب سے نسبت کو پہچانو۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ جیسے مالی میراث کے لئے رشتے دو قسم کے ہیں۔ قدرتی رشتے جیسے نسب اور اختیاری رشتے جیسے سبب یعنی نکاح و زوجیت۔ ایسے ہی کمال و حال کی وراثت کے لئے نسبت دو قسم کی ہے۔ قدرتی نسبت اور سببی نسبت۔ حضرت مریم کو بزرگوں سے اور جناب اویس قرنی کو حضور انور سے قدرتی نسبت تھی۔ بعض دوسرے حضرات کو سببی نسبت حاصل ہوئی۔ نسبت و نفرت یہ دونوں چیزیں عجیب تاثیر رکھتی ہیں۔ نسبت سے کمال ملتا ہے، نفرت سے وبال آتا ہے۔ نفرت بھی قدرتی اور سببی ہر طرح کی ہوتی ہے۔ ابولہب بھی حضور انور کا چچا ہے اور حضرت عباس اور حمزہ بھی چچا۔ مگر ابولہب کو حضور انور کی نبوت سے قدرتی نفرت ہوئی۔ حضرت حمزہ کو قدرتی نسبت اور حضرت عباس کو سببی نسبت عطا ہوئی۔ ابولہب کا یہ حال ہوا کہ کسی کافر کے لئے قرآن کریم میں پوری سورت نہیں آئی سواء ابولہب کے۔ یہ بدترین کافر ہوا اور حضرت حمزہ سید الشہداء ہوئے۔ کنعان باوجودیکہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا، ان کی آغوش میں پلا، ان کے گھر میں رہا۔ مگر اس کے دل میں اپنے باپ کی قدرتی نفرت ہی رہی، مارا گیا۔ سببی نسبت کبھی تو کسی نسبت والے کی صحبت سے میسر ہوتی ہے جیسے اپنے شیخ کی محبت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی الفت میسر ہو جائے اور کبھی کسی بلا و مصیبت میں گرفتار ہو کر میسر ہو جاتی ہے۔ حضرت خالد ابن ولید کو متواتر مسلمانوں سے شکست کھانے کی وجہ سے ایمان نصیب ہوا۔ کبھی عبادات اتباع سنت کی برکت سے یہ نسبت میسر ہو جاتی ہے۔

آیاتہا ۱۲۰ سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ مَدَنِيَّةٌ ۵ رکوعاتہا ۱۶

سورۂ مائدہ مدنیہ ہے اس میں سولہ رکوع اور ۱۲۰ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے پورا کرو عہدوں کو حلال کیے گئے واسطے تمہارے

اے ایمان والو اپنے قول پورے کرو تمہارے لئے حلال ہوئے

بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ

بے زبان جانور مگر وہ جو تلاوت کی جائے اوپر تمہارے نہ حلال سمجھنے والے شکار کو

بے زبان مویشی مگر وہ جو آگے سنایا جاوے گا لیکن شکار حلال نہ سمجھو

وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝۱

حالانکہ تم احرام والے ہو تحقیق اللہ حکم دیتا ہے جو چاہے

جب تم احرام میں ہو بے شک اللہ حکم فرماتا ہے جو چاہے

تعلقات

سورۂ مائدہ کا سورۂ نساء سے تعلق یہ ہے کہ سورۂ نساء میں معاشرہ پر بہت زور دیا گیا تھا یعنی بیویوں، قرابت داروں، عزیزوں سے تعلقات، ان سے برتاؤں کا ذکر تھا اب اس سورۂ مائدہ میں تمدن یعنی قوموں کے تعلقات کی تعلیم دی گئی ہے۔ معاشرہ اور تمدن کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ معاشرے پہلے درست کیا جاوے پھر تمدن درست کیا جاوے اس لئے سورۂ نساء پہلے ارشاد ہوئی مائدہ بعد میں۔ **نیز** سورۂ نساء میں زیادہ تر یہود کی تردید فرمائی گئی تھی۔ سورۂ مائدہ میں عیسائیوں کی تردید پر زور ہے۔ گویا مغضوب علیہم کا ذکر فرما کر ضالین کا ذکر فرمایا گیا تاکہ مسلمان دونوں سے بچیں۔

اور آیت کا تعلق آیت سے یہ ہے کہ سورۂ نساء کی آخری آیت میں اس مال کا ذکر تھا جو میت کے بہن بھائی کو بطور میراث ملے۔ میراث بھی ملک کا ذریعہ ہے۔ سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں عقود، عہود پورا کرنے کا حکم ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ عقد یا عہد کے ذریعے جو مال حاصل ہو وہ حلال ہے۔ گویا ایک حلال آمدنی کے بعد دوسری حلال آمدنی کا ذکر فرمایا گیا جو بذریعہ عقد و عہد کے ہو۔

سورۂ مائدہ

سورۃ، آیت، رکوع، منزل کے معنی اور سورۃ کی قسمیں، وجہ تسمیہ ہم سورۂ بقر کی تفسیر میں عرض کر چکے ہیں۔ اس سورت میں چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم پر غیبی دسترخوان آنے کا ذکر ہے اس لئے اس کا نام سورۂ مائدہ ہے۔ عربی میں مائدہ دسترخوان کو کہتے ہیں۔ اس سورۂ کا نام سورۂ عقود اور سورۂ منقذہ بھی ہے (روح المعانی)۔ یہ سورۂ مدنی ہے یعنی ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ اس سورت کی اکثر آیات ۵ اور ۷ ہجری کے درمیان نازل ہوئیں۔ آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ حجۃ الوداع میں مقام عرفات شریف میں نازل ہوئی۔ اس سورۃ میں سولہ رکوع اور ایک سو بیس آیات دو ہزار آٹھ سو چار کلمات ہیں اور گیارہ ہزار سات سو تینتیس حرف ہیں۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے اس سورت میں اٹھارہ قسم کے احکام اتارے ہیں اور دوسری سورت میں اتنی قسم کے احکام نہیں جیسے حرام جانوروں کی تفصیل، فال کھولنے کی حرمت، شکار کے احکام، اہل کتاب کے ذبیحہ کا حکم، طہارت کی تفصیل، چوروں کی سزا، احرام کی حالت میں شکار حرام ہونے کا حکم، بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانوروں وصیلہ، حام وغیرہ کا حکم، وصیت اور اس پر گواہی کا حکم، اذان وغیرہ کا حکم (تفسیر سراج منیر)۔ محققین علماء کے نزدیک اس سورۃ میں صرف دو آیتیں منسوخ ہیں۔ ایک تو لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ الخ (مائدہ: ۲) دوسری فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ (مائدہ: ۴۲) بعض مفسرین نے کم و بیش کا ذکر فرمایا (روح المعانی) سورۂ مائدہ دوسری منزل کی پہلی سورت ہے کہ قرآن مجید کی دوسری منزل یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں کل سات منزلیں ہیں جنہیں فمی بشوق میں جمع کیا گیا ہے۔ سورۂ فاتحہ، مائدہ، یونس، بنی اسرائیل، شعراء، والذاریات، سورۃ ق یہ منزلوں کے مبدا ہیں۔

تفسیر یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہاں ایمان سے لغوی ایمان مراد ہے اور الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا سے مراد اہل کتاب ہیں اور عقود سے مراد وہ عہد و پیمان ہیں جو توریت و انجیل میں اہل کتاب سے لئے گئے تھے۔ حضور ﷺ پر ایمان لانا، حضور کی صفات ظاہر کرنا جو ان کتب میں مذکور ہیں اور معنی یہ ہیں کہ اے وہ لوگو جو توریت و انجیل کو ماننے کے مدعی ہو ان عہد و پیمانوں کو پورا کرو جو تم سے لئے جا چکے ہیں کہ محمد مصطفےٰ ﷺ پر ایمان لے آؤ اور ہو سکتا ہے کہ ایمان سے مراد میثاق کے دن کا ایمان ہو جو قَالُوْا بَلٰی (اعراف: ۱۷۲) سے لیا گیا تھا اور اس میں خطاب سارے انسانوں بلکہ جنات سے بھی ہو۔ اس سورت میں عقود سے مراد وہ عہد و پیمان ہوں گے جو میثاق کے دن اللہ تعالیٰ سے کیے تھے یعنی اے وہ لوگو جو میثاق کے دن قَالُوْا بَلٰی کہہ کر ایمان لا چکے ہو ان عہود اور وعدوں کو پورا کرو جو ہم سے کر گئے تھے کہ ایمان لاؤ، نبی کی فرمانبرداری کرو۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ ایمان سے مراد شرعی ایمان ہے اور خطاب مسلمانوں سے ہے اور عقود سے مراد تمام عہد و پیمان ہے خواہ صریحی عہود ہوں یا ضمنی عہد یا تحریری عہد و پیمان ہوں۔ مومن کلمہ پڑھتے ہی اللہ تعالیٰ سے عبدیت کے حضور ﷺ سے نبوت و امتیت کے عہد کر لیتا ہے۔ ماں باپ سے ابنیت کے بھائیوں سے اخوت کے عہد و

پیان کرتا ہے۔ ان سب عہدوں کا ایفا لازم ہے۔ ان سب کو ایک ہی ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' میں بیان فرما دیا۔ اَوْفُوْا بنا ہے ایفا سے جس کا مادہ وفاءٌ یا وفیٌ ہے بمعنی حفاظت کرنا، پورا کرنا۔ یہ باب تفعیل سے بھی آتا ہے اور باب افعال سے بھی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى (نجم: ۳۷) اب اصطلاح میں وعدہ پورا کرنے کو وفا کہا جاتا ہے یہ ہی معنی یہاں مراد ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ (بقرہ: ۱۷۷) عقود جمع ہے عقد کی۔ عقد کے معنی ہیں گرہ لگانا، مضبوط باندھنا، کسی چیز کو کسی سے ملانا (تفسیر کبیر، روح المعانی) اصطلاح میں معاہدہ کرنے اقرار کرنے کو عقد کہا جاتا ہے۔ عہد اکیلا آدمی بھی کر سکتا ہے مگر عقد دو شخصوں کے درمیان ہوتا ہے عقد اس معاہدہ کو بھی کہا جاتا ہے جس سے کوئی چیز منعقد ہو جاوے جیسے عقد نکاح، عقد بیع، عقد اجارہ وغیرہ۔ حق یہ ہے کہ یہاں عقود میں سارے معاہدے مراد ہیں۔ خواہ بندے نے رب تعالیٰ سے کیے ہوں یا نبی ﷺ سے یا اپنے شیخ سے یا اپنے استاذ سے خواہ آپس میں ایک دوسرے سے جائز معاہدے ہوں جیسے نکاح، تجارت، کرایہ وغیرہ یا جو کفار سے کیے جاویں جیسے عقد، صلح، تعاون وغیرہ (روح المعانی) یعنی اے ایمان والو! تم سارے عہد و پیمان پورے کرو۔ ایمان لا کر جو اللہ رسول سے عہد کیے، بیعت ہو کر جو شیخ سے عہد کیے، نکاح کر کے جو زوجین نے آپس میں عہد کیے، بیع و اجارہ کر کے جو ایک دوسرے سے عہد کیے، صلح وغیرہ کے ذریعہ جو کفار سے عہد کیے، کسی سے کوئی وعدہ کر کے اس سے عہد کیے یہ سب پورے کرو۔ بِالْعُقُوْدِ جمع فرما کر ان تمام قسموں کے عہد مراد لے لئے گئے۔ الف لام عہدی ہے، جس سے سارے جائز عہد مراد ہیں۔ نا جائز وعدہ پورا کرنا حرام ہے جیسے زنا، چوری کرنے کا وعدہ۔ یہاں تفسیر روح المعانی نے عقود کی چوبیس قسمیں بیان فرمائیں اور ان میں سے ہر ایک قسم کا حکم بیان فرمایا کہ کسی عہد کا پورا کرنا فرض ہے، کسی کا پورا کرنا مستحب، کسی کا پورا کرنا حرام ہے، کسی کا پورا کرنا کفر ہے پھر فرمایا کہ یہاں ہر وہ عہد مراد ہے جس کا پورا کرنا فرض یا واجب یا مستحب ہے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ یہ جملہ ایفائے عقود کی تفصیل ہے کہ عقود میں وہ عقد بھی داخل ہے جو بندوں کا رب تعالیٰ کے ساتھ ہے یعنی عبدیت اور الوہیت کا کہ رب تعالیٰ ہمارا الٰہ ہے، مالک ہے۔ ہم اس کے بندے مملوک ہیں اور بندے غلام کی شان یہ ہے کہ جو مولا کھلائے سو کھائے جو پلائے وہ پئے، جو پہنائے وہ پہنے، جب سلائے تب سوئے، جب جگائے تب جاگے اور مالک کی شان یہ ہے کہ اپنے مملوک کی ہر حاجت پوری کرے، گویا بندے کو فکر ہو مالک کے راضی رکھنے، اس کی خدمت کرنے کی۔ مالک کو خیال ہو بندے کی ضرورت پوری کرنے کی اس لئے عقود کے ساتھ رب نے حلال غذاؤں کا ذکر کیا کہ تم فلاں فلاں چیز کھاؤ اور فلاں فلاں چیز نہ کھاؤ اس لئے فرمایا کہ ہمارا حکم یہ ہے۔ تمہارے لئے فلاں فلاں جانور حلال ہیں لہٰذا انہیں حلال جانو اور کھاؤ ان کا حلال جاننا اس عہد کا پورا کرنا ہے۔ ''اُحِلَّتْ'' بنا ہے۔ احلال سے جس کا مادہ حلٌّ ہے بمعنی کھل جانا۔ اسی لئے احرام کھولنے کو احلال کہتے ہیں کہ اس سے احرام کی پابندیوں سے حاجی کھل جاتے ہیں۔ حرم شریف کے سوا زمین کو حل کہتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر انسان حرم کی پابندیوں سے کھل جاتا ہے۔ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ (بلد: ۲) میں حل یا تو حلول سے بنا ہے یا حلال سے۔ یعنی آپ مکہ معظمہ میں تشریف فرما ہیں یا آپ فتح مکہ کے دن حلال ہو کر

بغیر احرام باندھے تشریف لائے ہیں۔ جائز چیزوں کو حلال کہتے ہیں کہ شریعت نے بندوں کو ان کے استعمال کی کھلی اجازت دے دی ہے۔ وہ ہی یہاں مراد ہے لَکُمْ میں خطاب سارے مومنین سے ہے۔ اُحِلَّتْ ماضی فرمانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ آیت کریمہ تو ہجرت کے پانچ سال بعد اتری۔ مگر ہمارے محبوب نے تم کو حرام وحلال غذائیں پہلے ہی بتادی تھیں اور تم ان احکام پر پہلے ہی سے عامل وکاربند ہو۔ گویا یہ آیت کریمہ حضور ﷺ کے دیئے ہوئے احکام کی تائید ہے۔ کیونکہ مسلمان ہجرت سے پہلے ہی یہ حلال جانور کھاتے تھے اور حرام جانوروں سور، کتوں، بلوں وغیرہ سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ آیت تو نبوت کے ظہور سے اٹھارہ برس بعد اور حضور کی ولادت سے اٹھاون برس بعد اتری اس عرصہ میں حضور انور ﷺ اور مؤمنین مکہ پہلے ہی سے حلال گوشت کھاتے رہے حرام سے پرہیز کرتے رہے بَهِيمَةُ بنا ہے بهمٌ سے بمعنی مضبوطی اور پوشیدگی اس لئے سخت پتھر کو اور بہادر انسان کو بہمہ کہتے ہیں۔ کیونکہ انسانوں کی بات ان سے خفیہ رہتی ہے وہ کچھ سمجھ نہیں سکتے اور ان کی حالت انسانوں سے خفیہ کہ وہ کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتے۔ عرف میں درندوں پرندوں کے سوا دوسرے جانوروں کو بہیمہ کہتے ہیں۔ یا ہر چوپایہ کو خواہ خشکی کا ہو یا دریائی۔ الْاَنْعَامِ جمع ہے نعمٌ کی بمعنی اچھی حالت یا اچھی چیز اسی سے ہے نعمۃ اہل عرب اونٹ کو انعام کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ بڑی اچھی چیز ہے۔ بہیمہ عام ہے۔ انعام خاص۔ یعنی بہیمہ ہر بے زبان چار پایہ ہے اور انعام اونٹ اور اس کے مشابہ جانور جیسے گائے، بکری، دنبہ عام کی اضافت خاص کی طرف اگر مفید ہو تو جائز ہے جیسے کہا جاتا ہے مدینۃ البغداد یا شجر اراک یعنی بغداد کا شہر، پیلو کا درخت، یہاں اضافت یا بیان کے لئے ہے یا تشبیہ کے لئے (روح المعانی) یعنی حلال کیے گئے تمہارے لئے چار پائے جانور یعنی اونٹ یا تمہارے لئے اونٹ۔ جیسے چوپائے حلال کیے گئے۔ حلال سے مراد ہے کھانا حلال ہونا۔ سیدنا عبداللہ ابن عباس، ابن عمر، امام جعفر صادق اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ بہیمہ سے مراد ہے پیٹ کا بچہ۔ انعام سے مراد ہے حلال چوپایہ تو معنی یہ ہوئے کہ تمہارے لئے جانور مذبوحہ کے پیٹ کے بچے حلال ہیں۔ کہ اگر گائے وغیرہ کے پیٹ میں بعد ذبح بچہ نکل آوے تو وہ بھی حلال ہے۔ ہمارے ہاں اس شرط سے کہ وہ بھی ذبح کر لیا جاوے۔ اس طرح کہ اس میں جان پڑ چکی ہو۔ امام شافعی کے ہاں مطلقاً (تفسیر کبیر وروح المعانی)۔ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ۔ یہ عبارت بَهِيمَةُ الْاَنْعَامِ سے مستثنیٰ ہے۔ مَا سے مراد جانور ہیں۔ يُتْلٰى عَلَيْكُمْ سے اشارہ اس آیت کریمہ کی طرف ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ الخ (مائدہ: ۳) جو ابھی ایک آیت کے بعد آرہی ہے۔ یہاں اجمال ہے وہاں تفصیل ہے۔ خیال رہے کہ يُتْلٰى عَلَيْكُمْ کا مطلب بھی یہ نہیں کہ وہ جانور جن کا ذکر آگے ہوگا۔ سور، مردار وغیرہ وہ آج تمہارے لئے حلال ہیں، مسلمانوں نے ہجرت سے پہلے بھی کبھی سور، مردار نہ کھائے۔ ان سب جانوروں سے حضور انور ﷺ نے پہلے ہی روک دیا تھا مطلب یہ ہے کہ وہ جانور جنہیں ہمارے محبوب نے پہلے ہی حرام فرمادیا ہے اور قرآن کریم میں بھی عنقریب بیان کر دیئے جائیں گے وہ حرام ہیں، ان کے سوا باقی حلال۔ لہٰذا آیت بالکل واضح ہے غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ لفظ غَيْرَ لَکُمْ کی ضمیر کُمْ سے حال ہے صید سے مراد یا شکار کرنا ہے یا شکار وَاَنْتُمْ حُرُمٌ، مُحِلِّي کی ضمیر سے حال ہے۔ حُرُمٌ

جمع ہے حرام کی بمعنی محرم۔ محرم کے معنی ہیں حرم شریف میں داخل ہونے والا یا حج وغیرہ کا احرام باندھنے والا چونکہ کبھی انسان ان مذکورہ جانوروں کو ذبح نہیں کرتا، شکار سے کام چلاتا ہے کہ وہ گوشت مفت ہی مل جاتا ہے اس لئے یہاں یہ قید لگائی۔ یعنی یہ جانور مذکورہ تمہارے لئے حلال تو ہیں مگر خیال رکھنا کہ بحالت احرام یا حرم شریف میں پہنچ کر انہی پر گزارہ کرنا۔ شکار کی طرف رخ نہ کرنا۔ کیونکہ اس جگہ یا اس وقت تم پر شکار کرنا، شکار کھانا حرام ہے۔ یا یوں کہو کہ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ میں ہرن، نیل گائے وغیرہ شکاری جانور بھی داخل تھے، اس جملہ سے انہیں نکال دیا گیا یعنی تمہارے لئے بے زبان چوپایہ پالتو یا شکاری سب حلال کیے گئے مگر بحالت احرام یا حرم شریف میں شکاری جانور حرام ہیں۔ لہٰذا یہ استثناء متصل ہے اور آیت بالکل واضح ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ اس جملہ میں پچھلے حکم کی حکمت بیان ہوئی۔ مقصد یہ ہے کہ جانوروں کے حلال وحرام ہونے میں تمہاری عقل کام نہیں کر سکتی عقل نہیں سمجھ سکتی کہ کتا بلی کیوں حرام ہیں اور بکری وخرگوش کیوں حلال یا اورزمین کا شکار کیوں حلال ہے، حرم شریف کا شکار کیوں حرام یا دیگر حالات کا شکار کیوں حلال ہے، احرام کی حالت کا شکار کیوں حرام؟ اس کی حکمتیں ہم جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم نافذ فرماتا ہے یا جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

ہماری بیان کردہ تفسیر سے معلوم ہوگیا کہ اس آیت کریمہ کی چند تفسیریں ہیں۔ ہم ان میں سے ایک تفسیر کا خلاصہ عرض کرتے ہیں جو بہت قوی ہے۔ اے مسلمانو! تمام وہ جائز وعدے عہد و پیمان پورے کرو جو تم نے رب تعالیٰ سے یا نبی ﷺ سے یا اپنے شیخ یا استاذ سے یا آپس میں ایک دوسرے سے کیے ہیں۔ خواہ زوجین کے آپس کے معاہدے ہوں یا دوسرے عزیزوں سے یا مسلمان قوم سے یا کفار سے بہرحال سارے وعدے پورے کرو۔ اسی وفاء عہد کے سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ تم ہمارے حلال کیے ہوئے جانوروں کو حلال جانو اور کھاؤ اور ہمارے حرام کیے ہوئے جانوروں کو حرام جانو۔ ان سے بچو۔ ہم فرماتے ہیں کہ تمہارے لئے تمام چوپائے جانور حلال کر دیئے گئے بجز ان کے جو عنقریب تم کو بتا دیئے جائیں گے۔ ان حلال چوپایوں میں بھی یہ قید ہے کہ بحالت احرام بھی اور حرم شریف میں بھی کسی شکاری چوپایہ کو حلال مت جاننا وہ تم پر حرام ہیں۔ ان حلال وحرام جانوروں کے متعلق کچھ چون وچرا نہ کرو۔ پس یہ سمجھ لو کہ رب تعالیٰ علیم وحکیم ہے اس کے ہر حکم میں ہزارہا حکمتیں ہیں۔ جو جانور حلال کیے گئے ان میں تمہارے لئے فائدے ہیں اور جو جانور حرام کیے ان میں تمہارے لئے نقصان ہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ چوپائے حلال جانور دو قسم کے ہیں۔ پالتو جیسے اونٹ، گائے بکری وغیرہ۔ دوسرے شکاری جیسے ہرن، نیل گائے وغیرہ۔ پالتو چوپائے تو بہرحال حلال ہیں۔ شکار چوپائے بحالت احرام بھی اور حرم شریف میں بھی۔ ان کا شکار حرام ہے...... رب تعالیٰ کی حکمتیں ہیں۔ وہ حاکم ہے جو چاہے حکم دے۔ خیال رہے۔ کہ مسلمانوں کے لئے خوراک وغذا نہایت ہی اہم چیزیں ہیں کہ غذا سے نفس قائم ہے، نکاح سے نسب قائم۔ حرام غذا خون، گوشت پوست وغیرہ کو بگاڑ دے گی اور حرام عورت سے نکاح کر لینا نسب کو خراب کرے گا مگر حرام عورتوں اور حرام غذاؤں کے احکام بعد ہجرت آئے۔ کیونکہ حضور نے پہلے ہی مسلمانوں کو نکاح وغذا کے احکام دے دیئے تھے۔ قرآن کریم نے

ان کی تائید فرمائی۔ یہ بھی خیال رہے کہ ہماری غذا میں نباتات یعنی دانے سبزیاں اور حیوانات داخل ہیں۔ بلکہ کبھی جمادات بھی غذائیں بن جاتے ہیں جیسے موتی، مونگا وغیرہ۔ قرآن کریم نے صرف حیوانی غذاؤں کا ذکر فرمایا وہ بھی نہایت اجمالی کہ صرف سور کا گوشت حرام فرمایا باقی کتا، گدھا اور سور کی چربی، کلیجی، گردے وغیرہ حضور نے حرام فرمائے اور نباتات و جمادات کی حلت و حرمت کا قرآن کریم نے کہیں ذکر نہیں فرمایا کہ مولی، گاجر، شلغم حلال ہیں۔ اس کے لئے حضور انور کے احکام ہیں کہ جو نباتات و جمادات نشہ یا نقصان دے وہ حرام ہے۔ بھنگ، چرس، نشہ کی وجہ سے زہر سینکھیا ضرر کی وجہ سے حرام ہے۔ جو نشہ یا ضرر نہ دیں وہ حلال ہیں حتی کہ اگر سینکھیا بھی ضرر نہ دے تو حلال ہے اطباء بعض دواؤں میں استعمال کراتے ہیں۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** مسلمان کو چاہیے کہ عبادات کے ساتھ معاملات بھی درست کرے۔ عبادات و معاملات دونوں روحانی پرواز کے دو پر ہیں۔ جیسے پرندہ بغیر دونوں پروں کے نہیں اڑ سکتا یونہی مسلمان بغیر ان دونوں کے ترقی نہیں کر سکتا یہ فائدہ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ سے حاصل ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** جس سے جو وعدہ کیا جاوے اسے ضرور پورا کیا جاوے یہ فائدہ بھی اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ سے حاصل ہوا۔ اور دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (الاسراء: ۳۴) بشرطیکہ جائز کام یا جائز چیز کا وعدہ ہو۔ **تیسرا فائدہ:** ناجائز کاموں کے وعدے ہرگز پورے نہ کیے جاویں، ان کا توڑ دینا ضروری ہے۔ یہ فائدہ بِالْعُقُوْدِ کے الف لام عہدی سے حاصل ہوا۔ لہٰذا زنا، چوری، جوا کفر کے وعدے ہرگز پورے نہ کرے، انہیں توڑ دے۔ فرمایا نبی ﷺ نے کہ جو ناجائز کام پر قسم کھائے تو قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔ **چوتھا فائدہ:** جو کوئی ممانعت کے دنوں میں روزہ رکھنے کی منت مان لے وہ بھی اپنی منت پوری کرے۔ کہ بجائے اس دن کے اور دن میں روزہ رکھ لے۔ یعنی اس کی قضا کرے۔ کیونکہ منت بھی رب تعالیٰ سے معاہدہ ہے اور معاہدہ پورا کرنا ضروری ہے (حنفی)۔ **پانچواں فائدہ:** اصل اشیاء میں اباحت ہے۔ یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے حرام نہ کی ہو وہ حلال ہے یہ فائدہ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ سے حاصل ہوا۔ کہ سوا ان جانوروں کے جن کو شریعت نے حرام کر دیا باقی تمام جانور حلال ہیں یعنی قرآن و حدیث نے حلال جانوروں کی تفصیل نہ فرمائی صرف حرام جانوروں کی تفصیل کی۔ باقی ان کے ماسوا کو حلال کیا۔ اسی طرح قرآن کریم نے صرف حرام عورتوں کا ذکر فرمایا اور حلال عورتوں کے متعلق فرمایا وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء: ۲۴) دوسرے مقام پر ارشاد ہے قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ الخ (انعام: ۱۴۵) جس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کی حرمت شریعت میں مذکور نہ ہو وہ حلال ہے اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں۔ جو بلا ثبوت اکثر چیزوں کو حرام کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ یہ کام قرون ثلثہ میں نہ تھا۔ لہٰذا حرام ہے ان کا یہ قول اس آیت اور دوسری آیات کے خلاف ہے۔

مسئلہ: ہر وعدہ پورا کرنا ضروری نہیں۔ بعض وعدے پورے کرنے رکن ایمان ہیں۔ بعض فرض، بعض واجب، بعض مستحب، بعض حرام اور بعض کفر جیسا وعدہ اور جیسا موعود لہ یعنی جس سے وعدہ کیا جاوے ویسا وعدہ کا حکم۔ اللہ رسول سے کیے ہوئے

وعدے ضرور پورے کرے۔ دیکھو نذر پوری نہ کرنے، قسم توڑنے پر کفارہ واجب ہے کیوں اس لئے کہ اس میں اللہ سے وعدہ اللہ کی ضمانت توڑنا ہے۔ کسی سے شراب پینے چوری یا جوئے کا وعدہ کیا ہرگز پورا نہ کرے۔ **مسئلہ:** اللہ رسول کے سارے وعدے سچے ہیں اگر کبھی ان کا ظہور نہ ہو تو سمجھ لو کہ کوتاہی ہماری طرف سے ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ رسول وعدے پورے کرنے کا حکم دیں اور خود اپنے وعدے پورے نہ کریں۔ **مسئلہ:** جو نباتات یا جمادات نشہ یا نقصان دیں وہ حرام ہیں باقی حلال۔ رہے جانور تو دریائی جانور سب حرام سوا مچھلی کے۔ خشکی کے بے خون والے جانور سب حرام سوا ٹڈی کے۔ خون والے پرندے جو پنجہ والے شکاری ہوں وہ حرام باقی حلال اور خون والے چرندے جو کیل والے ہوں وہ حرام باقی حلال سواء اونٹ کے کہ اس کے منہ میں کیل ہے مگر حلال ہے۔ کیڑے مکوڑے سب حرام جیسے چوہا، گوہ وغیرہ۔ اس کی تفصیل ہم دوسرے پارہ میں عرض کر چکے ہیں۔ **چھٹا فائدہ:** بہ حالت احرام شکار کرنا حرام ہے۔ ہاں دریائی شکار محرم کو بھی حلال۔ حتی کہ محرم کا شکار کیا ہوا جانور کسی کو حلال نہیں نہ محرم کو نہ دوسرے کو۔ یہ فائدہ **وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ** سے حاصل ہوا۔ احرام خواہ حج کا ہو یا عمرہ کا محرم کے لئے دریائی شکار کی اجازت دوسری آیت میں مذکور ہے۔ **ساتواں فائدہ:** حدود حرم میں شکار کرنا حرام ہے۔ اگر کر لیا تو اس کی قیمت خیرات کرنا ضروری ہے۔ یہ فائدہ **وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ** کی دوسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** جانوروں کی حلت و حرمت میں عقل معذور ہے اس میں صرف فرمان شریعت کی پیروی ضروری ہے۔ جیسے نماز کی تعداد رکعات اور زکوٰۃ کی مقداریں عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہ فائدہ **یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ** سے حاصل ہوا۔ کبھی عقل کو کنارہ کر دینا بھی پڑتا ہے۔ شعر

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

نواں فائدہ: حضور ﷺ رب تعالیٰ کی طرف سے احکام شرعیہ کے مالک و مختار ہیں اور حضور نے بہت سے شرعی احکام نزول آیت کے پہلے ہی جاری فرما دیئے تھے۔ چنانچہ حرام و حلال عورتیں۔ حرام و حلال غذائیں وضو اور غسل کے احکام ہجرت سے پہلے ہی دیئے جا چکے تھے۔ ان کا نزول قرآن کریم میں بعد ہجرت ہوا۔ اگر صرف قرآن ہی حاکم ہوتا تو مسلمان ہجرت سے پہلے وضو کیسے کرتے، غسل کیونکر کرتے اور نکاح و غذا کے احکام کیسے معلوم کرتے؟

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر عقد و عہد و پیمان پورا کرے کیونکہ العقود جمع ہے اور اس پر الف لام استغراقی ہے جس کے معنی ہوئے سارے عقد سارے عہد و پیمان۔ تو کیا حرام کاری، چوری، کفر وغیرہ کے وعدے بھی پورے کرے یہ تو بہت بری بات ہے۔ **جواب:** اس اعتراض کا جواب ابھی تفسیر میں گزر گیا کہ العقود میں الف لام عہدی ہے جس سے جائز و درست عہدوں، عقدوں کی طرف اشارہ ہے۔ استغراق نہیں جائز و ناجائز عہدوں کی تفصیل حدیث شریف میں ہے۔

دوسرا اعتراض: عربی میں بہیمہ بھی جانور کو کہتے ہیں اور انعام بھی جانور کو کہتے ہیں۔ پھر بہیمہ کی اضافت انعام کی

طرف کیوں کر جائز ہوئی۔ مضاف و مضاف الیہ میں تغایر چاہیے۔ **جواب:** بہیمہ اور انعام میں کئی طرح فرق ہے جو ابھی تفسیر میں عرض کیے گئے۔ بہیمہ بمعنی بے زبان انعام بمعنی جانور بہیمہ معنی جانور انعام معنی چوپائے بہیمہ بمعنی چوپائے انعام معنی اونٹ اور اضافت تشبیہ کے لئے یعنی اونٹ جیسے چوپائے حلال ہیں۔ جو شکاری نہ ہوں جیسے گائے، بھینس، بکری وغیرہ اس اضافت سے کتا، بلی، شیر، چیتا وغیرہ نکل گئے۔ بہیمہ معنی پیٹ کا بچہ انعام معنی چوپایا یعنی اگر مذبوحہ چوپائے کے پیٹ میں بچہ نکلے وہ بھی حلال ہے۔ ہمارے ہاں اگر ذبح کرلیا جاوے۔ شوافع کے ہاں مطلقاً۔

تیسرا اعتراض: وفا عہد اور جانوروں کی حلت میں کیا مناسبت ہے۔ ان دونوں کو ایک جگہ کیوں جمع فرمایا گیا؟ **جواب:** ہر مومن کا اللہ تعالیٰ سے اطاعت و فرمانبرداری کا عہد ہے اور رب تعالیٰ کی فرمانبرداری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس کی حلال کردہ چیزوں کو حلال جانے حرام فرمودہ چیزوں کو حرام سمجھے جرح قدح نہ کرے۔ لہٰذا ایفائے عہد کے ساتھ اس کا ذکر گویا اجمالی کے بعد تفصیل کا ذکر ہے۔

چوتھا اعتراض: اس آیت کریمہ میں حرام جانوروں کا نام نہیں لیا بلکہ فرمایا **اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ** وہ آئندہ تم کو بتائے جاویں گے۔ تو اس حرمت کی آیت آنے تک یہ آیت ناقابل عمل ہوگئی کیونکہ اب ہر جانور کے متعلق یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ **مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ** میں داخل ہو۔ اور وہ حرمت کی آیت اس کے بہت عرصہ بلکہ کئی سال کے بعد آئی۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ اگر طبیب مریض سے کہے کہ تم ہر غذا کھاؤ۔ سوا چند غذاؤں کو جو آئندہ بتائی جائیں گی تو اس دوران میں مریض کچھ نہیں کھا سکتا۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ حضور ﷺ نے سارے حرام و حلال جانورامت کو بتادیے تھے یہ آیات تو حضور کی تائید کے لئے آئیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو اس اجمال سے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

پانچواں اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سوا **مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ** کے باقی تمام جانور حلال ہیں۔ کیونکہ **اِلَّا** حصر کا فائدہ دے رہا ہے اور وہاں اس آیت میں چھ جانوروں کی حرمت کا ذکر ہے۔ جن میں صرف ایک جانور یعنی سور حرام لذاتہ ہے۔ باقی پانچ جانور مردار وغیرہ حرام لغیرہ ہیں تو کیا سور کے سوا باقی تمام چوپائے حلال ہیں جیسے کتا، بلی، شیر، چیتا، بھیڑیا وغیرہ۔ **جواب:** اس کا جواب پارہ سیقول آیت **اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃَ** (بقرہ: ۱۷۳) کی تفسیر میں گزر گیا۔ کہ یہاں حصر اضافی ہے حصر حقیقی نہیں۔ یعنی جن جانوروں کو کفار مکہ نے حرام سمجھ رکھا تھا۔ سائبہ، بحیرہ وغیرہ ان کے لحاظ سے حصر فرمایا گیا کہ یہ جانور حرام نہیں بلکہ صرف ہمارے بیان فرمائے جانور حرام ہیں۔ یا **مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ** سے عام معنی مراد ہیں۔ خواہ قرآن میں ان کی ممانعت آوے یا حضور ﷺ کی زبان حق ترجمان سے۔

چھٹا اعتراض: جانوروں کی حلت کے ساتھ احرام کے شکار کی حرمت کا ذکر کیوں فرمایا ان دونوں میں کیا مناسبت ہے، یہ تو بے جوڑ سی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ چوپائے جانور دو قسم کے ہیں۔ پالتو اور شکاری۔ اونٹ، گائے، بکری پالتو ہیں۔ ہرن، نیل گائے شکاری۔ پالتو چوپائے تو بہرحال حلال ہیں اور شکاری چوپائے

بحالت احرام حرام ہیں ویسے حلال اس مناسبت سے ہیں دونوں کو جمع فرمایا ان میں بہت ہی مناسبت ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اے ایمان والو! میثاق کے دن جو ہمارے تمہارے درمیان عہد و پیمان ہو چکے ہیں وہ پورے کرو۔ عہد یہ تھے کہ اپنے وجود خرچ کرو تا کہ مقصود پاؤ ہم تمہارے ہیں تم بھی ہمارے ہو کر رہو۔ ہم سے محبت کرو، ہمارے ماسوا کی محبت میں نہ پھنسو۔ جفا پر صبر کرو اور صبر پر مشقت وقوت کے ساتھ قائم رہو۔ تمہارے لئے بہیمہ، انعام یعنی تمہارے نفس عمارہ حلال کیے گئے کہ یہ نفس امارہ طلب دنیا میں جانوروں کی طرح ہیں کہ انہیں لا الٰہ کی تلوار سے فنا کرو۔ ہاں جب نفس امارہ، نفس مطمئنہ بن کر حرم الٰہی میں داخل ہو جائے جس سے خطاب یہ ہو جاوے ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (فجر: ۲۸) اور وہ نفس دنیا سے متنفر ہو وہ حرم کے شکار کی طرح ہے۔ کہ اسے شکار کرنا ممنوع ہے اور جب تم شوق لقاء یار کا احرام باندھ کر کعبہ وصال کی طرف متوجہ ہوؤ اور ہر مرغوب و مرہوب سے علیحدہ ہو جاؤ اور ہر مطلوب و محبوب سے کنارہ کر لو تو تم محرم ہو اس وقت دنیا کے شکار میں مشغول نہ ہو کہ تمہاری یہ حرکت اس احرام کے خلاف ہو گی۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ جب نفس جانوروں بہائم کی صفت میں ہو تو اس کے ذبح کا حکم دیا اور جب نفس مطمئنہ ہو کر رب کی طرف رجوع کرے تو اسے شکار حرام قرار دیا، اس کے ذبح سے تم کو منع فرمایا اس میں اس رب کی لاکھوں حکمتیں ہیں، اس کے فرمان پر اعتراض نہ کرو (از روح البیان)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے نہ حلال سمجھو نشانیاں اللہ کی اور نہ

اے ایمان والو! حلال نہ ٹھہراؤ اللہ کے نشان اور نہ

الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّيْنَ

حرمت والے مہینہ کو اور نہ ہدی اور نہ ہاروں والیوں کو اور نہ قصد کرنے والوں کو

ادب والے مہینے اور نہ حرم کو بھیجی ہوئی قربانیاں اور نہ جن کے گلے میں علامت آویزاں اور نہ ان کا مال و آبرو

الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ

عزت والے گھر کا جو تلاش کرتے ہو فضل ان کے رب سے اور اس کی رضامندی کو

جو عزت والے گھر کا قصد کر کے آئیں اپنے رب کا فضل اور خوشی چاہتے

وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ

اور جب حلال ہو جاؤ تم تو شکار کرو اور نہ ابھارے تم کو دشمنی کسی قوم کی

اور جب احرام سے نکلو تو شکار کر سکتے ہو اور تمہیں کسی قوم کی عداوت کہ

صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا

کہ روکا انہوں نے تم کو عزت والی مسجد سے اس پر کہ حد سے بڑھو تم اور ایک دوسرے کی مدد کرو

انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا زیادتی کرنے پر نہ ابھارے اور نیکی و پرہیز گاری

عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪

نیکی اور پرہیز گاری اور نہ مدد کرو او پر گناہ اور حد سے بڑھنے پر

پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہم مدد نہ کرو

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲

اور ڈرو اللہ سے بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے

اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ اپنے عہد و پیمان پورے کرو اب اس آیت کریمہ میں ان عہد و پیمانوں کی کچھ تفصیل ہے جن کا تعلق حرم شریف سے ہے یا جن کا تعلق محترم مہینوں سے گویا یہ آیت کریمہ اس آیت کی تفصیل ہے کہ اس آیت میں بالکل اجمال تھا، اس آیت میں کچھ تفصیل۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں حرم شریف اور احرام کی حالت میں شکار کے متعلق کچھ احکام دیئے گئے تھے اب حرم شریف کی دوسری چیزوں کے متعلق احکام بیان ہو رہے ہیں۔ ہدی وغیرہ گویا حرم کی ایک حرمت کا ذکر پہلے تھا دوسری حرمت کا ذکر اب ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں ان شکاری جانوروں کا ذکر تھا جو حرم شریف میں پناہ لے لیں کہ ان کا شکار کرنا حرام ہے۔ اب ان انسانوں کا ذکر ہے جو حرم شریف جا رہے ہوں کہ ان کے جان و مال برباد کرنا حرام ہے۔

شان نزول

ایک بار ایک کافر جس کا نام شریح ابن ہند ابن ضبیعہ تھا لقب حطم یا حطیم تھا، حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اپنے ساتھیوں کو مدینہ منورہ سے باہر چھوڑ آیا، حضور ﷺ نے صحابہ کرام سے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ ایک ربیعہ کا آدمی آوے گا جو شیطان کی زبان سے بولے گا، وہ حاضر ہو کر عرض کرنے لگا یا رسول اللہ! ﷺ آپ لوگوں کو کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ حضور انور نے ارشاد فرمایا! کلمہ، توحید، نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے کی، وہ بولا بہت اچھی دعوت ہے پھر کہنے لگا کہ میرے کچھ خاص دوست ہیں جو اپنی قوموں کے سردار ہیں، میں ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں

کا شعور دلائے۔ ہر وہ چیز جس کو اللہ تعالیٰ نے دین اسلام یا اپنی قدرت یا اپنی رحمت کی علامت قرار دیا۔ ہر وہ چیز جس کو دینی عظمت حاصل ہو کہ اس کی تعظیم مسلمان ہونے کی علامت ہے وہ شعائر اللہ ہے۔ یہاں تو دین اسلام یا احکام اسلام یا ارکان حج وغیرہ مراد ہیں۔ اسی سے ہے شعار بمعنی علامت۔ یعنی اے مسلمانو! تم اللہ کی مقرر کردہ علامات ایمان یا محترم چیزوں کو حلال مت سمجھ لو۔ جیسے دنیاوی سلطنتوں کا حال ہے کہ سارا ملک بادشاہ کا ہوتا ہے مگر بعض انسان بعض جگہ بعض وقت سرکاری ہوتے ہیں اور باقی انسان و مکانات دن، جگہ رعایا کے پولیس وفوج کے آدمی کچہری، ڈاکخانہ وغیرہ کی عمارت جمعہ یا اتوار کے دن سرکاری ہیں کہ ان کی اہانت حکومت کی غداری ہے۔ چپڑاسی سمن تعمیل کرانے جاوے تو بڑے سے بڑے آدمی گھبرا جاتے ہیں۔ چوراہے کے سپاہی کے اشارہ پر کار والوں کو تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ ناغہ کے دن گوشت کرنے پر مقدمہ قائم ہو جاتا ہیں یوں ہی حضرات انبیاء واولیاء سرکاری آدمی ہیں۔ بیت اللہ ماہِ رمضان، جمعہ کا دن، مسجدیں وغیرہ سرکاری چیزیں ہیں ان کی بے حرمتی کو حلال نہ جان لو ان کی تعظیم اور احترام داخل فی الدین ہے، ان کی بے حرمتی ایمان کے خلاف ہے۔ اور زمانہ میں روزہ توڑ دو تو قضا واجب رمضان شریف میں روزہ توڑ دو تو کفارہ بھی واجب۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصریوں نے غلام کہا تو ان کے دامن سے یہ داغ چھڑانے کے لے دنیا بھر میں قحط سالی سات سال کی بھیجی۔ یہ ہے تعظیم شعائر اللہ۔

وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ یہ گویا عام پر خاص کا عطف ہے۔ کیونکہ شَعَآئِرَ اللّٰهِ میں ماہ محترم بھی داخل تھا اسے خصوصیت سے بیان فرمانا اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ حق یہ ہے کہ شہر اور حرام دونوں ہم جنس ہیں۔ جو ایک اور زیادہ سب پر بولے جاتے ہیں۔ شہر کے معنی ہیں مہینہ۔ حرام کے معنی ہیں حرمت والا، عزت والا یا وہ مہینہ جس میں جنگ و جدال کرنا حرام ہو۔ یہ کل چار مہینہ ہیں۔ جب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم کہ اسلام سے پہلے بھی کفار ان مہینوں کا ادب کرتے تھے۔ ان میں چوری ڈکیتی، قتل و غارت قطعاً نہیں کرتے تھے یہ عبارت شَعَآئِرَ اللّٰهِ پر معطوف ہو کر لَا تُحِلُّوْا کا مفعول ہے۔ اور یہاں مذکورہ چاروں مہینے مراد ہیں۔ یعنی عزت والے مہینوں کو حلال نہ بنا لو کہ ان میں قتل و خونریزی کر دیا مہینوں میں تبدیلی کر کے ان محترم مہینوں کو حلال نہ کر لو۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں کفار مہینوں میں تبدیلی کر لیتے تھے کہ رجب کو ربیع الاول بنا لیا اور اسی میں لڑ بھڑ لیے پھر کسی اور مہینہ کو رجب کر لیا جسے وہ لوگ نسی کہتے تھے۔ قرآن کریم نے فرمایا: اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ (توبہ: ۳۷) پہلے معنی زیادہ قوی ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں نے مہینوں میں تبدیلی کبھی نہ کی تھی اور یہاں خطاب مسلمانوں سے ہی ہو رہا ہے۔ ہاں انہوں نے ماہ محترم میں شریح سے جنگ کرنا چاہی تھی۔ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ یہ عبارت الشَّهْرَ الْحَرَامَ پر معطوف ہو کر لَا تُحِلُّوْا کا مفعول بہ ہے۔ ھدی اسم جنس ہے اس کا واحد ھدیۃ ہے بمعنی تحفہ اس کی جمع ھدیٌّ۔ ی کی شدت ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

حلفت برب مکة والمصلی واعناق الهدی مقلدات

شریعت میں ہدی وہ اونٹ یا گائے یا بکری ہے جو کعبہ معظمہ لے جائی جاوے وہاں ذبح کرنے کے لئے اور الْقَلَآئِدَ یہ جمع ہے

حَلَلْتُمْ (مائدہ:۱) سے ہے حَلَلْتُمْ بنا ہے حلال سے بمعنی احرام سے کھل جانا، احرام ختم کر دینا خواہ حج کا احرام ہو یا عمرہ کا اِصْطَادُوْا صید سے بنا ہے بمعنی شکار اصطیاد شکار کرنا۔ یہاں شکار سے مراد خشکی کا شکار ہے کیونکہ دریائی شکار تو بحالت احرام بھی جائز تھا اور حرم کے علاوہ دوسری جگہ کا شکار مراد ہے۔ کیونکہ حرم شریف کا شکار تو ہمیشہ حرام ہے۔ محرم یا حلال وہاں کا شکار نہیں کر سکتا۔ نیز یہ امر وجوب یا استحباب کے لئے نہیں بلکہ صرف مباح کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ جو امر ممانعت کے بعد آوے وہ اس ممانعت کی پابندی اٹھانے کے لئے ہوتا ہے۔ یعنی اے مسلمانو احرام والو! جب تم احرام سے کھل جاؤ تو وہ شکار کر سکتے ہو جو احرام کی وجہ سے تم پر حرام ہو گئے تھے کہ اب وہ پابندی اٹھ گئی۔ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا یہ دوسرا حکم ہے جس کا تعلق احرام کھلنے سے ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ احرام کھول دینے کے بعد تم سے شکار کی پابندی تو اٹھ گئی اس کی تمہیں اجازت دی گئی مگر کفار محرم ہوں یا غیر محرم ان پر زیادتی کرنے کی اجازت نہیں وہ پابندی بعد احرام بھی باقی ہے۔ کسی پر ظلم کرنا مسلمان کی شان نہیں لَا یَجْرِمَنَّ بنا ہے جرم سے جرم کے معنی ہیں پھل درخت سے توڑنا، گناہ کرنا، اسی لئے گناہ کو جرم اور گناہ گار کو مجرم کہتے ہیں اور حمل یعنی کسی بات پر اکسانا اور ابھارنا، ایک شاعر کہتا ہے۔

وَلَقَدْ طَعَنْتُ اَبَا عُیَیْنَةَ طَعْنَةً
جَرَمَتْ فَزَارَةُ بَعْدَهَا اَنْ تَغْضَبَا

اس شعر میں جرم بمعنی اکسانا اٹھانا ہے۔ تیسرے معنی پر جرم دو مفعول چاہتا ہے پہلا مفعول بلا واسطہ ہوتا ہے۔ دوسرا مفعول علیٰ کے واسطے سے خواہ علیٰ پوشیدہ ہو یا ظاہر (روح المعانی)۔ شَنَاٰنُ کے معنی ہیں۔ بغض، نفرت، عداوت رب فرماتا ہے: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (کوثر:۳) تفسیر مظہری میں ہے کہ شَنْاٰنُ نون کے سکون سے صفت بمعنی عداوت و نفرت اور نون کے فتح سے مصدر ہے بمعنی نفرت کرنا کیونکہ مصدر اکثر بروزن فعلان آتے ہیں۔ جیسے ضربان، سیلان، نسلان اور عین کلمہ کے سکون سے صفت جیسے سکران۔ زمان۔ رحمٰن (مظہری)۔ چونکہ یہاں نون کے سکون سے ہے لہٰذا صفت ہے مصدر نہیں۔ قوم سے مراد یا عام کفار ہیں یا کفار مکہ دوسرے معنی زیادہ ظاہر ہیں اَنْ صَدُّوْكُمْ یہ عداوت و بغض کی علت ہے۔ صد کے معنی ہیں روکنا۔ یہاں حدیبیہ کے سال عمرہ کرنے سے روکنا مراد ہے۔ اَنْ تَعْتَدُوْا سے پہلے عَلٰی پوشیدہ ہے اور یہ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ کا دوسرا مفعول ہے۔ اعتداء کے معنی ہیں حد سے بڑھ جانا اس کا مادہ عَدْوٌ ہے۔ اس لئے دشمن کو عدو کہا جاتا ہے۔ دوستی کی حد سے بڑھ جانے والا۔ یعنی ایک کافر قوم نے تم کو عمرہ بیت اللہ سے روکا تھا اسی پر تم کو اس قوم پر سخت غصہ تھا۔ تم کو یہ غصہ و عداوت اس بات پر نہ اکساوے کہ تم موقعہ پا کر ان کفار پر ظلم کرو، حد سے آگے بڑھ کر سزا دو۔ مسلمانوں نے اس حکم پر ایسا عمل کیا کہ سبحان اللہ مکہ فتح ہو جانے پر کسی مکہ والے پر زیادتی ظلم نہ کیا گیا، انہیں امان دی گئی۔ خیال رہے کہ ہر چیز حد میں رہ کر مفید ہے، حد سے نکل کر مضر۔ آگ چولہے میں رہے مفید ہے گھر میں پھیل جائے ہلاک کر دے۔ پانی دریا کی حدود میں رہے مفید ہے۔ کناروں سے نکل جاوے تو سیلاب بن کر ملک تباہ کر ڈالے۔ یونہی غصہ، شہوت، بلکہ آنکھ، کان، ناک وغیرہ حد میں استعمال ہوں تو مفید ہے

ہے، برے کام میں مدد دینا برا ہے۔ ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو یہ ڈر ہی بڑا اچھا کام تمہارے لئے آسان کر دے گا اور تمہارے دلوں سے انتقام کی آگ کو سرد کر دے گا۔ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ اگر تم کو اس قوم پر قابو ہے تو تم پر رب تعالیٰ کو قابو ہے۔ یہ خیال دل میں جمالو اور کبھی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو۔ ہمیشہ حدود شرعیہ کے اندر رہو۔ غرض کہ اس آیت کریمہ میں سات چیزوں سے مسلمانوں کو منع فرمایا گیا۔ شعائر اللہ و دین معظم چیزوں کی بے حرمتی کرنا، محترم مہینوں میں جہاد کرنا یا تبدیلی کرنا، ہدی جانور اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے ہاروں کی بے حرمتی کرنا، عمرہ یا حج کو جانے والوں کی بے حرمتی کرنا، کسی دشمن قوم سے ان پر قابو پا کر حد سے زیادہ بدلہ لینا، برائی پر اپنی قوم کو مدد دینا اور ایک چیز کی اجازت دی گئی۔ احرام کھولنے کے بعد شکار کرنا۔ ایک چیز کا حکم دیا گیا بھلائی پر ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ اس آیت کریمہ میں نہایت اعلیٰ اخلاق کی تعلیم ہے۔

خیال رهے کہ مفسرین اس آیت کریمہ میں تین حکموں کو منسوخ مانتے ہیں۔ محترم مہینوں، یعنی رجب، ذیقعدہ، ذوالحجہ، محرم میں کفار سے جہاد ممنوع ہونا۔ اس کی ناسخ وہ آیت ہے **فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ** (توبہ: ۵) دوسرے بیت اللہ شریف جانے والے کفار کو نہ روکنا۔ انہیں حج و عمرہ تجارت کے لئے جانے دینا۔ تیسرے قلائد کا احترام کرنا کہ مشرکین کی ہدی بیت اللہ شریف جانے دینا یا جو مشرک اپنے گلے میں ہدی کا ہار ڈال لے اس سے کچھ نہ کہنا ان دونوں حکموں کی ناسخ یہ آیت ہے۔ **اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا** (توبہ: ۲۸) حتیٰ کہ سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ سورۂ مائدہ میں صرف اس آیت کے یہ ہی اجزا منسوخ ہیں اور کوئی حکم منسوخ نہیں۔ باقی ساری سورت محکم ہے۔ اب ان محترم مہینوں میں جہاد جائز ہے۔ مشرکین کو بیت اللہ شریف جانے کی اجازت نہیں، ان کی ہدی وہاں یعنی بیت اللہ شریف ہی نہیں جانے دی جاوے گی۔ جن لوگوں نے اس پوری آیت کو محکم مانا ہے وہ ان عبارتوں کے معنی ہی کچھ اور کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ محترم مہینوں کو تبدیل کر کے ان کی بے حرمتی نہ کرو، مسلمان حجاج کو اور ان کی ہدیوں کو بیت اللہ شریف جانے وہاں حج وغیرہ کرنے وہاں تجارات کرنے سے نہ منع کرو۔ مسلمانوں کی ہدی کو حرم شریف پہنچنے وہاں ذبح ہونے سے نہ روکو ان کے نزدیک سورۂ مائدہ پوری محکم ہے، اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں مگر جمہور مفسرین نے پہلا قول اختیار فرمایا ہے۔ یہ آیت فتح مکہ کے ساتھ نازل ہوئی اور **اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ** (مائدہ: ۳) خاص حجۃ الوداع کے دن عرفات شریف میں نازل ہوئی (تفسیر صاوی)۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جس چیز کو کسی عزت و عظمت والی چیز سے نسبت ہو جاوے وہ دینی شعار اور شعائر اللہ بن جاتی ہے۔ اس کی تعظیم ایمان کی علامت ہے، اس کی توہین کفر کی پہچان۔ دیکھو یہاں فرمایا گیا کہ اللہ کے شعائر کو حلال نہ جان لو۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوا: **اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ** (بقرہ: ۱۵۸) صفا مروہ پہاڑ شعائر اللہ سے ہیں کیوں اس لئے کہ انہیں جناب ہاجرہ کے قدم سے نسبت ہے۔ ہدی اور بدنہ شعائر اللہ ہیں۔ کیوں اس لئے کہ انہیں بیت اللہ سے نسبت ہو گئی۔ **دوسرا**

شرعی حدود کا ضرور خیال رکھا جائے۔ حد سے زیادہ بدلہ نہ لیا جاوے اگرچہ نفس کا جوش بہت ابھارے یہ فائدہ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا سے حاصل ہوا۔ چور کا صرف ایک ہاتھ کاٹو اگر جوش میں آ کر دونوں ہاتھ کاٹ دیئے تو مجرم ہوئے۔ قاتل کو قتل کے عوض قتل کرو، اگر مثلہ (ہاتھ، پاؤں، ناک، کان کاٹنا) کر کے قتل کیا تو جرم ہوا۔ رنج و خوشی، غصہ وغیرہ میں نفس کو قابو میں رکھو۔ شعر

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کتنا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

دسواں فائدہ: اللہ کے بندوں سے مدد لینا جائز ہے، حرام یا شرک نہیں اور اِیَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ کے خلاف نہیں۔ یہ فائدہ ''تَعَاوَنُوۡا'' سے حاصل ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ (آل عمران: ۵۲) ان کے مدد گاروں کو آج بھی نصاریٰ کہا جاتا ہے۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت کا نام انصار ہے۔ اگر غیر خدا سے مدد لینا شرک ہوتا تو بندوں سے مدد مانگنے والے انبیاء نعوذ باللہ مشرک ہوئے اور یہ دونوں نام شرک ہوتے۔ **گیارھواں فائدہ:** نیک کام پر مدد دینا نیکی ہے، ثواب ہے۔ برے کام پر مدد دینا گناہ ہے جیسا کہ وَلَا تَعَاوَنُوۡا سے معلوم ہوا۔ نمازی کو وضو کے لئے پانی دینا ثواب ہے۔ ظالم قاتل کو قتل کے لئے چھری دینا گناہ ہے۔ اس فائدے سے بہت سے مسائل حل ہوں گے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: حضور ﷺ نے شریح کا ہاتھ کیوں نہ کٹوایا جب کہ اس نے اہل مدینہ کے جانور چرا لئے تھے حالانکہ حضور ﷺ نے عرینہ والوں کو قتل کر دیا تھا انہوں نے بھی صدقہ کے جانوروں کی چوری کی تھی۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ **جواب:** ان دونوں واقعوں میں چند طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ شریح کافر تھا اور عرینہ والے مسلمان ہو کر مرتد ہو گئے تھے۔ مرتد کی سزا قتل ہے۔ دوسرے یہ کہ شریح صرف چور تھا اور عرینہ والے ڈاکو بھی تھے اور ساتھ ظالم قاتل بھی کہ انہوں نے حضور کے چرواہوں کو ساتھ قتل بھی کر دیا تھا۔ چور اور ڈاکو کی سزا میں بڑا فرق ہے۔ تیسرے یہ کہ شریح مدینہ پاک کا رہنے والا نہ تھا، دار الحرب کا رہنے والا کافر تھا، چوری کر کے دار الحرب میں بھاگ گیا تھا۔ اگر کوئی حربی کافر دار الاسلام میں گھس آوے، چوری کر کے پھر دار الحرب میں بھاگ جاوے، تو اس کے ہاتھ نہیں کٹ سکتے۔ چوتھے یہ جنگل میں چرتے ہوئے جانور جب چرواہا ان کے ساتھ نہ ہو محفوظ مال نہیں ہوتے اور غیر محفوظ مال لے لینا شرعاً چوری نہیں ہوتا۔

دوسرا اعتراض: جب شریح بیت اللہ جاتے ہوئے دیکھا گیا تو اس کا مال کیوں نہ لے لیا گیا، اسے گرفتار کیوں نہ کر لیا گیا۔ کیا اب بھی یہ ہی حکم ہے کہ چور قاتل مل جائے تو اسے نہ پکڑا جائے اگر چور قاتل مسجد میں گھس جاوے تو کیا اسے امان ہے؟ **جواب:** ہم تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ اگر آٰمِّيۡنَ الۡبَيۡتَ الۡحَرَامَ میں کفار بھی داخل ہوں تو یہ آیت منسوخ ہے۔ اب تو کسی کافر کو عرب شریف جانے حج کرنے کی اجازت نہیں ہے یہ عمل اس زمانے کے قانون کے لحاظ سے تھا۔ اب چور قاتل جامع مسجد میں بھی گھس جاوے جب بھی پکڑا جاوے گا ہاں اگر باہر سے قتل کر کے کوئی حرم شریف میں پناہ لے لے تو اسے

حدیبیہ کے موقعہ پر مسلمانوں کو روکا، سب کافروں کے لئے یہ حکم عام نہ ہوتا۔ بہر حال اس آیت پر تمام صحابہ نے عمل پورا پورا کیا۔ اسلام نے حائضہ، نفاس والی عورتوں، جنبی مردوں کو بھی مسجد حرام شریف بلکہ تمام مسجدوں سے روک دیا ہے کیونکہ یہ لوگ نا پاک ہیں اور مسجدیں پاک جگہ۔ لہٰذا مشرکین و کفار جو نجاست کفر میں آلودہ ہیں حرم شریف سے روکے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

ایمان کے بعد تقویٰ بڑی ضروری چیز ہے کہ وہ خدا رسی کا ذریعہ کامل ہے۔ تقویٰ دو قسم کا ہے۔ تقویٰ ظاہری، جسے کہتے ہیں تقویٰ جوارح اور تقویٰ باطنی جسے کہتے ہیں تقویٰ قلوب۔ تقویٰ ظاہری کے دو رکن ہیں۔ ظاہری اعضاء کو برے کاموں سے روکنا، اچھے کاموں میں لگا دینا اور تقویٰ قلوب صرف ایک چیز کا نام ہے وہ تعظیم ماعظمه اللہ یعنی جن کو رب تعالیٰ نے عظمت دی ہے ان کی تعظیم کرنا۔ قرآن کریم فرماتا ہے: وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (حج: ۳۲) انہی معظم چیزوں کا نام شعائر اللہ ہے شعائر اللہ بہت چیزیں ہیں۔ بعضے زمان بعضے مکان، بعضے اخوان، بعضے خلان، بعضے ایام۔ پھر ان شعائر اللہ میں بعض بعض سے اعلیٰ ہیں جیسے حضرات انبیاء و اولیاء بعض بعض سے افضل ہیں پھر ان شعائر اللہ سے جسے نسبت ہو جاوے اس کا ادب ہے۔ قرآن مجید شعائر اللہ میں سے ہے تو اس کی جلد اور بستہ بھی احترام کے لائق ہے کعبہ معظمہ شعائر اللہ سے ہے تو کعبہ کو جانے والی ہدی اور حاجی بھی لائق احترام ہے۔ اس آیت کریمہ کا مقصد یہ ہے کہ اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے اپنے ایمان کی حفاظت کرو ایسا نہ ہو کہ یہ موتی تم سے ضائع ہو جائے اور اس کی حفاظت اس طرح کرو کہ شعائر اللہ کی بے ادبی نہ کرو۔ حتیٰ کہ محترم مہینے جنہیں اللہ نے شعائر اللہ بنا دیا ان کا ادب کرو۔ کعبہ کو جانے والی ہدی بلکہ ہدی کے گلے کا ہار ان کا بھی احترام کرو۔ کعبہ کو جانے والے حاجی یا عمرہ والے لوگ ان کا احترام کرو کہ حجاج وہاں جا کر اللہ کا فضل و رضا حاصل کریں گے، تم یہاں رہ کر ان کا ادب کر کے رضاء الٰہی حاصل کر لو۔ احرام کا یہ ادب کرو کہ اس حالت میں شکار نہ کھیلو۔ ہاں جب احرام سے فارغ ہو جاؤ تو تم سے یہ پابندی اٹھ جاوے گی اور اسلام کی حدود سے باہر قدم نہ نکالو۔ حتیٰ کہ جن کفار نے تم کو کعبۃ اللہ کے عمرہ سے روکا۔ تم ان پر قابو پا کر حد سے آگے نہ بڑھو۔ جوش انتقام میں اسلامی حدود نہ توڑو کہ یہ بھی شعائر اللہ کی بے ادبی ہے۔ رہ روان راہ خدا کو چاہیے کہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور اللہ کا خوف دل میں رکھیں کہ اس سے تمام مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ **خیال رہے** کہ شعائر اللہ کی تعظیم کی صورتیں مختلف ہیں۔ جیسا شعارہ ویسے اس کی تعظیم۔ صفا۔ مروہ شعائر اللہ ہیں اس کی تعظیم یہ ہے کہ اس کا طواف کیا جاوے۔ ہدی کا جانور شعائر اللہ سے ہے۔ اس کی تعظیم یہ ہے کہ بلا ضرورت اس پر سواری نہ کی جائے، اس کے کھانے پینے کا خیال رکھا جائے، اسے بھوکا پیاسا ہرگز نہ رہنے دیا جائے، اس کا دودھ اون وغیرہ جو ذبح سے پہلے حاصل ہو وہ خیرات کر دی جائے، اپنے استعمال میں نہ لائی جائے حتیٰ کہ اس کی جھول، میخ وغیرہ بھی خیرات کر دی جائے۔ محترم مہینوں کی تعظیم یہ ہے کہ ان میں گناہ بے حیائیاں نہ کی جائیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی عبادات کثرت سے کی جائے۔ جسے یہ تعظیم نصیب ہو جائے وہ خوش نصیب۔ ایک بار کسی نے حضرت مرشد برحق صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب قدس سرہ کی خدمت میں کسی کی شکایت کی کہ وہ بہت

اب اس آیت کریمہ میں انہی حرام جانوروں کا ذکر سنایا جا رہا ہے۔ گویا یہ آیت کریمہ گزشتہ آیت میں اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ (مائدہ:۱) کی تفصیل ہے۔ **دوسرا تعلق**: پچھلی آیت میں عارضی حرام جانوروں کا ذکر تھا یعنی شکار کے جانور جن کا شکار کرنا بحالت احرام، حرام تھا۔ اب اصلی حرام جانوروں کا ذکر ہے جو بہر حال حرام ہیں مسلمان خواہ محرم ہو یا حلال یہ جانور ہمیشہ اس پر حرام ہے۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیت میں ان جانوروں کا ذکر تھا جن کا حرام ہونا حرم شریف کی زمین میں تھا یعنی حرم شریف کا شکار۔ اب ان جانوروں کا ذکر ہے جو ہر جگہ ہر وقت حرام ہیں۔ گویا خاص حرمت کے بعد عام حرمت کا ذکر ہے۔

چوتھا تعلق: پچھلی آیت میں مسلمانوں کو تقویٰ کا حکم دیا گیا تھا۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ (مائدہ:۲) اور تقویٰ کی اصل ہے حلال غذا حرام غذائیں کھانے والے کبھی متقی نہیں ہو سکتے اس لئے اب حرام جانوروں کا ذکر ہوا۔ تاکہ مسلمان ان سے بچیں، حلال چیزیں کھائیں اور متقی بنیں۔ گویا تقویٰ کا حکم پہلے تھا اور متقی بنانے والی چیزوں کا بیان اس آیت میں ہے۔ غذا تخم ہے۔ اعمال پھل، غذا اچھی، عمل اچھے، غذا خراب، عمل خراب، پھل کا ذکر پچھلی آیت میں فرمانے کے بعد اب یہاں اس کے تخم کا ذکر ہو رہا ہے۔

شان نزول

اس آیت کریمہ میں دس جانوروں اور ایک عمل کی حرمت کا ذکر ہے۔ یہ گیارہ چیزیں وہ ہیں جو کفار عرب میں بہت مروج تھیں۔ چنانچہ وہ لوگ جانور کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتے پھر اسے کھا لیتے تھے۔ کبھی ذبح کرتے تو اس جانور کا بہتا ہوا خون جما لیتے تھے پھر اسے بھون کر کھاتے تھے۔ بتوں کے نام پر ذبح کرنا، بتوں کے تھان پر بھینٹ چڑھانے کا ان میں عام رواج تھا۔ تیروں سے فال عام طور پر کھولتے تھے۔ ان مروجہ گیارہ رسموں کو حرام کرنے کے لئے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (خازن وغیرہ)۔

تفسیر

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ۔ حُرِّمَتْ باب تفعیل کا ماضی مجہول ہے جس کا مصدر تحریم مادہ حرم ہے۔ حرم کے معنی حرام بھی ہیں اور احترام بھی یہاں بمعنی حرام ہے۔ حلال کا مقابل باب تفعیل یہاں آہستگی کے لئے نہیں بلکہ مبالغہ کے لئے ہے کیونکہ ان چیزوں کی حرمت اسلام میں آہستہ آہستہ نہ آئی بلکہ یک دم آئی۔ وہاں یہ چیزیں قطعاً حرام ہیں کہ ان کا منکر کافر ہے اور انہیں حرام جان کر استعمال کرنے والا سخت فاسق۔ اس لئے اُحْرِمَتْ نہ فرمایا حُرِّمَتْ فرمایا۔ یہاں حرمت گزشتہ تحریم کی خبر دینے کے لئے نہیں ہے بلکہ آج سے حرام فرمانے کے لئے ہے۔ جیسے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (بقرہ:۱۸۳) میں کُتِبَ ماہ رمضان کے روزے فرض فرمانے کے لئے ہے، گزشتہ فرضیت کی خبر دینے کے لئے نہیں۔ جیسے فرضیت کبھی صیغۂ امر سے بیان کی جاتی ہے اور کبھی خبر سے۔ ایسے ہی حرمت کبھی نہی سے بیان فرمائی جاتی ہے کبھی خبر سے۔ یہاں خبر سے بیان ہوئی۔ دوسری جگہ نہی سے بھی بیان فرمائی گئی جیسے وَلَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ الخ (انعام:۱۲۱) اور ہو سکتا ہے کہ یہ خبر ہی ہو اور معنی یہ ہوں کہ لوح محفوظ پر تم میں یہ چیزیں پہلے ہی حرام کر دی گئی تھیں، اس کا ظہور آج ہو رہا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہجرت سے پہلے ہی حضور ﷺ نے مسلمانوں پر یہ تمام چیزیں حرام فرما دی تھیں۔ آج اس آیت میں اسی گزشتہ تحریم کی خبر دی جا رہی ہے۔ اس کی تائید و تاکید کے لئے فقیر کے نزدیک یہ آخری توجیہہ قوی ہے

وغیرہ سب حلال اور وہ اسی آیت سے دلیل پکڑتا ہے۔ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ (روح المعانی) حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ سؤر کھانے والا اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جاوے (روح المعانی) شاید انہوں نے سؤر کھانے کو علامت کفر قرار دیا اور کھانے والے کو مرتد۔ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ یہ عبارت الْمَيْتَةُ پر معطوف ہے۔ مَآ سے مراد ہر قابل ذبح جانور ہے اُهِلَّ بنا ہے اہلال سے جس کا ماخذ ہے ھلال بمعنی پہلی شب کا چاند۔ اہلال کے معنی ہیں۔ چاند دکھانا۔ اب پکارنے کو اہلال کہا جاتا ہے۔ کیونکہ چاند دکھانے والا پکارتا ہے کہ دیکھو چاند وہ ہے۔ اس لئے بچے کے بوقت ولادت رونے کو استہلال کہتے ہیں۔ اصطلاح میں اہلال کے معنی ہیں ذبح کے وقت پکارنا۔ وہ ہی معنی یہاں مراد ہیں جیسے صلوٰۃ کے لغوی معنی ہیں دعا مگر اصطلاح شریعت میں اس کے معنی ہیں نماز۔ تو اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ میں صلوٰۃ کے اصطلاحی معنی مراد ہیں۔ لِغَيْرِ اللّٰهِ اُهِلَّ کے متعلق ہے۔ اور بِهٖ کا مرجع مَآ ہے یعنی حرام ہے وہ جانور جس پر ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا گیا۔ یعنی غیر خدا کے نام پر ذبح کیا گیا اس جملہ کی مکمل تفسیر مع تمام گفتگو کے دوسرے پارے میں عرض کی گئی وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ مشرکین عرب باللات والعزیٰ کہہ کر جانور ذبح کرتے تھے اس جملہ میں ان کے اس عمل کا رد ہے۔ دیکھو تفسیر روح المعانی وغیرہ یہ ہی مقام وَالْمُنْخَنِقَةُ یہ عبارت "مَآ اُهِلَّ" پر معطوف ہے یہ خنق سے بنا ہے بمعنی گلا گھوٹنا۔ اسی لئے گلے کے اندرونی پھوڑے کو خناق کہتے ہیں کہ اس سے مریض کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ یعنی حرام ہے گلا گھوٹا ہوا جانور خواہ اسے گلا گھونٹ کر مارا جائے یا دو لکڑیوں یا کسی اور چیز میں گلا پھنس جاوے جس سے وہ گھٹ کر مر جاوے وہ حرام ہے کہ وہ بھی الْمَيْتَةُ میں داخل ہے۔ وَالْمَوْقُوْذَةُ یہ عبارت معطوف ہے الْمُنْخَنِقَةُ پر یہ لفظ بنا ہے وَقْذٌ سے بمعنی چوٹ مارنا وقیذہ اور موقوذہ وہ جانور ہے جسے چوٹ مار کر ہلاک کر دیا جائے خواہ لاٹھی مار کر یا غلہ مار کر یا بندوق کی گولی مار کر یا گھونسہ وغیرہ مار کر وہ بھی حرام ہے۔ کہ الْمَيْتَةُ میں داخل ہے مردار ہے۔ ذبح کے لئے دھار دار چیز سے کاٹنا ضروری ہے۔ ذبح اختیاری مقام ذبح اور ہے اور اضطراری میں مقام ذبح کچھ اور جیسا کہ آئندہ عرض کیا جاوے گا۔ وَالْمُتَرَدِّيَةُ یہ عبارت وَالْمَوْقُوْذَةُ پر معطوف ہے۔ یہ تردیٌ سے بنا ہے۔ بمعنی گرنا۔ رب فرماتا ہے: وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى (الیل:۱۱) متردیہ وہ جانور ہے جو اوپر چھت وغیرہ سے گر کر مر جاوے۔ یا زمین سے کنویں میں گر کر مرے یہ بھی مَيْتَةُ میں داخل ہے اس کا کھانا حرام ہے۔ یونہی اگر کسی پرندہ کو تیر مارا وہ ہوا میں سے درخت پر گرا پھر وہاں سے زمین پر گرا اور مرا ہوا پایا گیا تو نہ کھایا جاوے ممکن ہے وہ گر کر مرا ہو نہ کہ تیر سے (خازن) وَالنَّطِيْحَةُ یہ معطوف ہے الْمُتَرَدِّيَةُ پر یہ بنا ہے نَطْحٌ سے بمعنی سینگ گھونپ دینا نطیحہ اور منطوحہ وہ جانور ہے جسے دوسرا جانور سینگ گھونپ کر ہلاک کر دے اس کا کھانا بھی حرام ہے کہ یہ بھی میتۃ یعنی مردار میں داخل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میتۃ وہ جانور ہے کہ بغیر کسی سبب اس کی جان نکلے۔ بغیر ذبح، اور یہ تین جانور وہ ہیں جو بغیر ذبح مر گئے ...... لہٰذا یہ چاروں حرام ہیں وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ یہ عبارت النَّطِيْحَةُ پر معطوف ہے۔ مَآ سے مراد وہ جانور ہے جو قابل ذبح ہو۔ اَكَلَ کے بعد مِنْهُ پوشیدہ ہے۔ سَبُعٌ ب کے ضمہ سے صفت مشبہ ہے اس کا مادہ سَبْعٌ ہے ب کے سکون سے بمعنی حملہ کرنا سبع شکاری جانور کو کہتے ہیں جو کیل یا پنجہ

کود دیتے تھے اوران تیروں کومخلوط کر کے ان میں سے ایک اٹھاتے تھے۔ اگر اَمَرَنِیْ والا ہاتھ آ جاتا تو سمجھتے تھے کہ کامیابی ہے۔ اوراگر نَھَانِیْ والا تیر نکلتا تو سمجھتے ناکامی ہے۔ پھر وہ کام نہ کرتے اوراگر خالی تیر نکلتا تو دوبارہ پھر فال کھولتے اور سمجھتے کہ یہ کام مشکل سے ہوگا۔ اس آیت کریمہ میں اس کوحرام فرمایا گیا کہ یہ کام بھی حرام ہے اور آمدنی بھی حرام۔ چونکہ یہ فال منتظمین کعبہ کی آمدنی کا ذریعہ تھی اس لئے اس کوحرام جانوروں کے ساتھ ذکر فرمایا گیا۔ یعنی وہ جانور بھی حرام ہے اور فال کھولنا یا فال کھول کر پیسہ لینا اور کھانا یہ بھی حرام۔ ذٰلِکُمْ فِسْقٌ، ذٰلِکُمْ سے اشارہ یا تو تیروں سے فال نکالنے کی طرف ہے چونکہ یہ کام بہت ہی برا ہے۔ مومن کی شان سے بہت دور لہٰذا ذٰلِکَ اشارہ بعید ارشاد ہوا یا ان مذکورہ تمام محرمات کی طرف ہے۔ دوسرا احتمال زیادہ قوی ہے۔ یعنی یہ حرام جانور اور فال کی آمدنی کھانا، فال نکالنا، فسق و فجور رب کی ناراضگی کا باعث ہے۔ اس سے بہت بچو۔ اس لئے کُمْ ضمیر جمع لائی گئی تا کہ معلوم ہو کہ ان مذکورہ چیزوں میں سے ہر چیز فسق و فجور ہے جس کا چھوڑنا ضروری ہے۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے گیارہ چیزوں کی حرمت بیان فرمائی ہے جن میں سے بعض تو بذات خود حرام ہیں۔ جنہیں حرام لعینہٖ کہتے ہیں اور بعض کی حرمت کسی وجہ سے جسے حرام لغیرہ کہتے ہیں مگر ہیں سب حرام قطعی جس کا انکار کفر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ اے مسلمانو! تم پر حسب ذیل چیزیں قطعاً حرام کی گئی ہیں، ان سے بچے رہو ایک مردار یعنی وہ حلال جانور جس کا ذبح کرنا ضروری تھا مگر وہ بغیر ذبح کیے اپنے آپ ویسے ہی مر گیا دوسرے بہتا ہوا خون کہ اس کا کھانا بھی حرام اور دوسرے طریقہ سے استعمال بھی حرام تیسرے سؤر کا گوشت اور اس کے سارے اجزا۔ مگر خیال رہے کہ مردار جانور کا کھانا تو حرام ہے مگر اس کی کھال، بال پٹھے، ہڈی کا استعمال جائز ہے لیکن سؤر کا کوئی جز کسی استعمال میں نہیں آ سکتا۔ چوتھے وہ حلال جانور جو غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے خواہ اس طرح کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا ہی نہ جاوے کسی اور کا نام لیا جاوے یا اللہ کے نام کے ساتھ اور کا بھی نام لیا جاوے۔ پانچویں وہ جانور جو گلا گھونٹ کا مارا جاوے یا کسی طرح اس کا گلا خود گھٹ جاوے اور مر جاوے۔ چھٹے وہ جانور جو بے دھار والی چیز سے مار دیا جاوے جیسے لاٹھی و غلہ، گولی سے مارا ہوا جانور۔ ساتویں وہ جانور جو اوپر سے گر کر مر جاوے کہ چھت سے زمین پر یا زمین سے کنویں میں گر کر مر جاوے۔ آٹھویں وہ جانور جسے دوسرے جانور نے سینگ گھونپ کر مار دیا کہ اس کی جان نکل گئی۔ نویں وہ جانور جسے شکاری جانور نے کچھ کھالیا کچھ چھوڑ دیا۔ یہ نو جانور تم پر حرام ہیں۔ ہاں یہ آخری پانچ جانور اگر تم ان کو اللہ کے نام پر ذبح کرلو تو حلال ہیں جیسے گولی سے جانور کو مارا اور ابھی وہ زندہ تھا کہ ذبح کرلیا۔ یونہی کنویں وغیرہ میں گرا ہوا جانور وغیرہ۔ دسویں تم پر وہ جانور بھی حرام ہے جو کسی تھان پر بھینٹ چڑھایا گیا۔ اس طرح کہ بت کے سامنے اس کی عبادت کے لئے اس کے نام پر قربان کیا گیا کہ یہ اگرچہ خدا کے نام ذبح ہو مگر حرام ہے۔ جب کہ خود ذبح کرنے والے کی نیت بھینٹ کی ہو۔ گیارہویں تیروں سے فال نکالنا بھی حرام ہے اور فال نکالنے پر جو چیز لی جاوے وہ بھی حرام۔ خیال رکھنا کہ یہ سب چیزیں مستقل طور پر حرام ہیں ان کا استعمال کرنا فسق عملی ہے اور انہیں حلال جاننا فسق اعتقادی یعنی کفر ہے۔ لہٰذا ان سب سے ہی بچے رہو کہ یہ رب تعالیٰ کی

وَمَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ سے حاصل ہوا۔ **مسئلہ:** اگر مشرک نے جانور بت کے لئے پالا پھر وہ اسے بت خانہ میں لایا اس کی بھینٹ کی نیت سے مگر ذبح کرایا مسلمان سے اس نے بسم اللہ پڑھ کر ذبح کر دیا تو یہ جانور حلال ہے۔ (فتاوٰی عالمگیری) اس سے معلوم ہوا کہ بھینٹ میں ذبح کرنے والے کی نیت کا اعتبار ہے نہ کہ مالک کی نیت کا۔ **مسئلہ:** اگر جانور بتوں کے نام چھوڑا جائے۔ مگر مسلمان خدا کے نام پر ذبح کر دے تو حلال ہے کہ یہ نہ تو بھینٹ ہے نہ غیر خدا کے نام پر ذبح کیا ہوا۔ دیکھو بحیرہ، سائبہ جانور بتوں کے نام پر چھوڑے جاتے تھے مگر بحکم قرآن حلال تھے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ الخ (مائدہ: ۱۰۳)

ضروری نوٹ: ہم وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ (بقرہ: ۱۷۳) کی تفسیر دوسرے پارے میں کر چکے ہیں۔ اور اپنی کتاب "جاء الحق" حصہ اول میں مکمل بحث کر چکے ہیں وہاں مطالعہ کرو۔ **مسئلہ:** جانور کے سوا بتوں پر تمام چڑھائے ہوئے چڑھاوے حلال ہیں۔ جیسے پانی، پیسہ، مٹھائی، کھانا، زیور، کچا گوشت کہ اگر مشرکین یہ چیزیں بتوں پر چڑھاویں جب بھی حلال ہیں یہ مسئلہ مَاذُبِحَ فرمانے سے حاصل ہوا۔ ذبیحہ کا حکم اور ہے دوسری چیزوں کا حکم کچھ اور۔ اگر بتوں کا ہر چڑھاوا حرام ہو تو بعض ہندو بتوں کے نام پر کنویں کھدوا دیتے ہیں، ان کا پانی بھی حرام ہو جانا چاہیے بلکہ خود گنگا و جمنا کا پانی حرام ہو جانا چاہیے کہ مشرکین ان پانیوں کی پوجا کرتے ہیں پھر اگر یہ پانی حرام ہوں تو گنگا جمنا سے نکالی ہوئی نہریں اور ان سے سیراب کیے ہوئے کھیت کی پیداوار بھی حرام ہونی چاہیے۔ نعوذ باللہ غرض کہ سوا بتوں کے ذبیحہ کے تمام چڑھاوے حلال ہیں۔ **مسئلہ:** کسی جانور کو بت کے پاس اللہ کے نام پر ذبح کر دینے سے وہ حرام نہیں ہو جاتا بلکہ بت کی بھینٹ سے حرام ہوتا ہے۔ بھینٹ کی پہچان یہ ہے کہ اس سے گوشت مقصود نہ ہو صرف خون بہا کر بت کی پرستش مقصود ہو۔ اس لئے یہاں عَلَى النُّصُبِ فرمایا عند النصب نہ فرمایا۔ یہ قیدیں ضرور خیال رہیں۔ **چھٹا فائدہ:** پانچواں جانور الْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وغیرہ اگر ان کو بروقت ذبح کر لیا جاوے تو حلال ہو جاویں گے۔ جیسا کہ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** فال کھولنا بھی حرام ہے اور فال کھلوانا بھی حرام۔ یونہی نجومیوں سے غیب کی چیزیں پوچھنا بھی حرام ہے، اس پر پیسہ لینا دینا بھی حرام ہے۔ یہ فائدہ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ سے حاصل ہوا۔ یونہی قرآن کریم سے فال کھولنا حرام ہے بلکہ اس میں احتمال کفر ہے۔ کیونکہ قرآن مجید قانون الٰہی ہے نجومی کی پوتھی نہیں ہے۔ یہاں تفسیر روح المعانی میں حضرت علی و معاذ رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم سے فال کھولنا جائز ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سورۂ اخلاص (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) سات بارے پڑھے پھر یہ دعا تین بار پڑھے اَللّٰهُمَّ بِكِتَابِكَ تَفَآءَلْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنِيْ فِيْ كِتَابِكَ مَاهُوَ الْمَكْتُوْمُ فِيْ سِرِّكَ الْمَكْنُوْنِ پھر قرآن مجید کھولے اور اس کے پہلے صفحہ کو دیکھے تو پتہ چل جاوے گا مگر یہ روایت صحیح نہیں حق یہ ہے کہ فال کھولنا قرآن مجید سے بھی حرام ہے۔ **مسئلہ:** کسی اچھی چیز سے اچھی فال لینا بالکل جائز ہے۔ فال لینا اور فال کھولنا یا فال نکالنا کچھ اور۔ جیسے ہم کسی کام کو جارہے ہیں کسی مقبول بندے سے اچانک ملاقات ہو گئی یا کسی کے منہ سے اچھی

رواج ہو گیا ہے کہ بات بات پر مریض میں خون چڑھاتے ہیں یہ ممنوع ہے۔

تیسرا اعتراض: اس کی کیا وجہ ہے میتہ، موقوذہ وغیرہ کو مطلقاً حرام فرمایا گیا مگر خنزیر کے لئے لحم یعنی گوشت کی قید لگائی گئی یا تو وہاں بھی لحم المیتہ یعنی مردار کا گوشت فرمایا جاتا یا یہاں الخنزیر فرمایا جاتا لحم کی قید نہ لگائی جاتی۔ اس فرق بیان میں کیا حکمت ہے؟ **جواب:** سؤر کے علاوہ دوسرے جانور بذات خود حرام نہیں بلکہ کسی عارضہ سے حرام ہیں۔ یعنی اس کا مردار ہونا یا موقوذہ ہونا ان چیزوں نے انہیں حرام کیا اور سؤر بذات خود حرام ہے اس لئے ان جانوروں میں وجہ حرمت بیان کرنے کے لئے انہیں ان وصفوں سے بیان کیا اور سور کو کسی وصف خاص سے بیان نہ کیا اور عرب والے سؤر کا صرف گوشت ہی کھاتے ہیں دوسری چیزیں کلیجی گردے وغیرہ نہ کھاتے تھے۔ مردار وغیرہ کی ہر چیز کھا جاتے تھے۔ ان کے رواج کو روکنے کے لئے اسی طرح بیان فرمایا۔ جیسے رب کا فرمان کہ دو گنا تگنا سود نہ کھاؤ یا فرمان کہ اگر تمہاری لونڈیاں بچنا چاہیں تو انہیں زنا پر مجبور نہ کرو وغیرہ یہ تمام قیدیں ان کی رسم کے بیان کے لئے ہیں یا اس لئے کہ لوگ حضور کے محتاج رہیں۔ سؤر کا گوشت قرآن نے حرام کیا، اجزاء حضور نے۔

چوتھا اعتراض: مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے معنی یہ ہے کہ جس چیز کو غیر خدا کے نام پر پکارا جاوے وہ حرام ہے۔ وہ چیز جانور ہو یا کچھ اور نیز جانور پر اس کی زندگی میں غیر خدا کا نام پکارا جاوے یا ذبح کے وقت۔ کیونکہ مَا بھی عام ہے۔ اور اُهِلَّ کے معنی ہیں پکارا جاوے۔ نہ تو ما میں جانور کی قید ہے نہ پکارنے میں ذبح کے وقت کی قید۔ لہٰذا گیارہویں کی مٹھائی، میلاد شریف کا کھانا، جناب غوث پاک کی بکری، خواجہ اجمیر کے نام کی دیگ سب ہی حرام ہیں اور مَآ اُهِلَّ بِهٖ میں داخل ہے (گجراتی جہلاء دیوبند) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں جو ہم دوسرے پارہ میں دے چکے ہیں۔ ایک جواب الزامی ہے دوسرا تحقیقی۔ جواب الزامی تو یہ ہے کہ پھر تو دنیا کی کوئی چیز حلال نہیں ہو سکتی، ہر چیز حرام ہی ہو گی کیونکہ ہر چیز کی نسبت کسی نہ کسی بندے کی طرف ہوتی ہے۔ دیوبند کا مدرسہ، مولوی صاحب کی کتاب، میری کتاب، فلاں آدمی کی روٹی، فلاں شخص کی بیوی۔ اب فرمایا جائے کون چیز نسبت سے خالی ہے۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ آپ کی یہ تفسیر نہیں بلکہ آیت کریمہ کی تحریف ہے۔ اہلال کے لغوی معنی ہیں پکارنا مگر شرعی معنی ہیں ذبح کے وقت پکارنا جیسے صلوٰۃ کے لغوی معنی ہیں دعا مگر شرعی معنی ہیں نماز تو اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ میں صلوٰۃ کے معنی ہیں نماز نہ کہ دعا اگر یہاں اُهِلَّ کے لغوی معنی مراد ہوں تو دوسری آیات میں تعارض ہو گا۔ دیکھو قرآن کریم بحیرہ، سائبہ جانوروں کو حلال فرما رہا ہے حالانکہ ان جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑا جاتا تھا اور ان کی زندگی میں ان پر غیر خدا کا نام لیا جاتا تھا۔ معلوم ہوا کہ بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانور بحیرہ و سائبہ وغیرہ حلال ہیں یہ تو جانوروں کا ذکر ہوا۔ کفار عرب اپنی کھیتوں کی پیداوار کا کچھ حصہ بتوں کے نام پر کر دیتے تھے قرآن کریم نے ان کے اس عمل کی برائی تو بیان کی مگر اسے حرام نہ فرمایا۔ اسی طرح اپنے بعض جانور بتوں کے نام پر کر دیتے تھے انہیں بھی حرام نہ کہا چنانچہ فرمایا: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (انعام: ۱۳۶) آخر میں فرمایا

اور ڈرو مجھ سے آج کامل کر دیا میں نے واسطے تمہارے دین تمہارا اور پوری کر دی میں نے

اور مجھ سے ڈرو آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر

عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ

اوپر تمہارے نعمت اپنی اور راضی ہوا میں واسطے تمہارے اسلام کے دین سے پس جو

اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا تو جو

اضْطُرَّ فِىْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ

بیقرار ہو جاوے بھوک میں نہ مائل ہونے والا گناہ کی طرف

بھوک پیاس کی شدت میں ناچار ہو یوں کہ گناہ کی طرف نہ جھکے

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳﴾

تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

تعلقات

اس جملہ کا پچھلی عبارت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں حرام جانوروں کا ذکر تھا۔ اب دین کے کامل ہونے کا تذکرہ ہے تاکہ معلوم ہو کہ اب ان احکام میں ترمیم تنسیخ نہ ہو گی۔ یہ جانور ہمیشہ حرام رہیں گے کیونکہ جو کچھ ترمیم تنسیخ ہونا تھی وہ ہو چکی، اب اس کے بعد کوئی حکم تبدیل نہ ہوگا۔ گویا حرمت کا ذکر پچھلی آیت میں تھا اور حرمت کے دوام کا ذکر اس آیت میں ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حرام جانوروں کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں اپنی نعمت کامل فرمانے کا ذکر ہے۔ کیونکہ بری چیزوں کو حرام کر دینا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ گویا پچھلی آیت میں جانوروں کی حرمت کا ذکر تھا اب اس حرمت کے نعمت ہونے کا ذکر ہے۔ طیب چیزوں کا حرام کر دینا عذاب ہے اور خبیث چیزوں کا حرام فرما دینا نعمت بنی اسرائیل پر بعض اچھی چیزیں حرام کر دی گئی تھیں ان کی نافرمانی کی وجہ سے وہ عذاب تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: **فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ** (النساء: ١٦٠) یوں ہی بعض دینوں میں شراب کا حلال ہونا رب تعالیٰ کا عتاب تھا۔ ہمارے دین میں کوئی طیب چیز حرام نہیں اور کوئی خبیث چیز حلال نہیں۔ یہ ہم پر اللہ کی رحمت ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ حرام جانوروں کا کھانا فسق و بدکاری ہے۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ کبھی مجبوری میں یہ جانور کھانا حرام نہیں ہوتا گویا ان جانوروں کی اصل حرمت بیان فرمانے کے بعد ان کی عارضی حلت اب بیان ہو رہی ہے۔

اَلْیَوْمَ کے معنی ہیں آج۔ الیوم کے بھی دو معنی ہوتے ہیں آج کا دن یہ وقت اور یہ زمانہ جیسے کہا جاتا ہے کل میں جوان تھا، آج بوڑھا ہو گیا۔ اس کل اور آج سے مراد ہے گزشتہ زمانہ اور موجودہ زمانہ یہاں اَلْیَوْمَ اسی آخری معنی میں ہے۔ یہ اَکْمَلْتُ کا ظرف مقدم ہے جس سے حصر کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اَکْمَلْتُ بنا ہے اکمال سے جس کا مآخذ ہے کمال بمعنی پورا کرنا۔ کمال چار معنی میں بولا جاتا ہے۔ کمال ذاتی یعنی کسی چیز کے اجزاء کا مکمل ہو جانا۔ جیسے جب مکان کی چھت پڑ جاوے تو کہا جاتا ہے مکان مکمل ہو گیا۔ کمال وصفی یعنی چیز کے تمام اوصاف کا جمع ہو جانا۔ مکان میں رنگ روغن قلعی وغیرہ ہو گئی، مکمل ہو گیا۔ انسان عالم فاضل ہنر مند ہو گیا، کامل ہو گیا۔ تیسرے عارضی حالت سے منتقل ہو کر اصلی حالت پر پہنچ جانا۔ بچہ کو گھٹی اور ماں کا دودھ چھوڑا کر اصل غذا دی جانے لگی، آج غذا کامل ہو گئی۔ دشمن کی دست برد سے محفوظ ہو جانا۔ دیوار ناقص تھی، اس کی اینٹیں چوری ہو جانے کا خطرہ تھا، پوری اونچی کر دی گئی اب چوری کا خطرہ جاتا رہا، مکمل ہو گئی۔ یہاں چاروں معنی بن سکتے ہیں (۱) آج دین کو ذاتی طور پر کامل کر دیا کہ جتنے شرعی احکام آنے والے تھے آ چکے۔ اب کوئی حکم نہ آوے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس آیت کریمہ کے بعد کوئی حکم شرعی نازل نہ ہوا۔ آج ہم نے اسلام کو ان صفات پر کر دیا جس پر اسے قیامت تک رہنا ہے اب کوئی حکم منسوخ نہ ہوگا، احکام شرعیہ میں کوئی ترمیم و تنسیخ نہ ہوگی یا دین کے ارکان بھی آج مکمل ہو گئے ہیں اور دین کے مسنون کے طریقے بھی مکمل ہو گئے۔ فرائض وارکان دین کے گویا اجزا ہیں اور حضور کی سنتیں گویا دین کے صفات لہٰذا دین ذاتاً اور وصفاً مکمل ہو گیا۔ زیور کا رکن سونا ہے اور اس کا حسن نگینہ موتی سے جڑائی اور اس کی گھڑائی کہ سونا ان خوبیوں کے بغیر پہننے کے قابل نہیں ہوتا۔ آج اسلام کامل کر دیا گیا یعنی عارضی احکام ختم فرما کر اصلی احکام پر قائم کر دیا گیا۔ شروع اسلام میں گدھا، شراب، متعہ عارضی طور پر حلال رہے۔ ماہ رمضان کے احکام نماز وغیرہ میں بہت تبدیلیاں ہوئیں مگر وہ تمام عارضی حکم ختم ہو چکے، اصلی دائمی حکم آ گئے۔ آج اسلام محفوظ ہو گیا۔ دشمنوں کی دست برد سے اس کی حفاظت کر دی گئی کہ پچھلی کتابوں پچھلے دینوں کی طرح اس میں کوئی کمی بیشی نہ کر سکے گا۔ لَکُمْ میں لام نفع کا ہے اور کم میں خطاب صحابہ کرام یا عام مسلمانوں سے ہے۔ یعنی یہ تکمیل دین اے مسلمانو! تمہارے نفع تمہاری عزت افزائی کے لئے کی گئی یا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں تو یہ دین پہلے ہی مکمل تھا مگر تمہارے لئے اس کمال کا ظہور آج ہوا۔ یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے کامل کرنے کے لئے یہ دین آج مکمل کر دیا گیا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو پہلے ہی سے کامل و مکمل ہیں۔ دین کے معنی اور دین، ملت، مذہب میں فرق بارہا بیان کیا جا چکا ہے کہ دین، عقائد اور اصول و قواعد کو کہا جاتا ہے۔ مذہب فروعی مسائل کو بولا جاتا ہے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی مختلف مذہب ہیں مختلف دین نہیں۔ اسلام و عیسائیت وغیرہ مختلف دین ہیں۔ دین کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہوتی ہے جیسے اسلام اللہ کا دین ہے یعنی اللہ کا بنایا ہوا۔ اللہ کی طرف سے آیا ہوا دین ہے اور نبی کی طرف بھی کہا جاتا ہے۔ دین موسوی، دین عیسوی یا دین محمدی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ دین بنانے والا ہے اور حضرات انبیاء دین لانے والے اور اس کی نسبت بندوں کی طرف بھی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے ہمارا دین یعنی ہمارا اختیار کیا ہوا دین۔ یہاں دین کو بندوں کی طرف نسبت دی گئی۔ کیونکہ دین میں ترمیم و تنسیخ اور اس کی تکمیل بندوں

اَکْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ کی تفسیر ہو جاوے کہ وہاں دین سے مراد اسلام ہے۔ غرض کہ یہاں رَضِیْتُ اگر ناراضی کا مقابل ہے تو یہ بھی اَلْیَوْمَ سے تعلق رکھتی ہے اور معنی یہ ہیں کہ اب تک تو دوسرے دین جیسے موسوی عیسوی وغیرہ سے میں راضی تھا مگر آج صرف اسلام دین سے راضی ہوں۔ اب عیسائی یہودی ہو کر مجھے کوئی راضی نہیں کر سکتا۔ وہ دین پہلے ہدایت تھے اب عین کفر ہیں۔ ماں کا دودھ بچپن میں حلال بھی تھا ذریعہ بقا بھی۔ جوانی میں حرام بھی ہے ہلاکت بھی اور اگر بمعنی خوشی ہے۔ تو یہ گزشتہ زمانہ کا ذکر ہے۔ یعنی اول ہی سے میں نے تمہارے لئے اسلام دین کو اور اسلام کے لئے تم کو منتخب کر لیا تھا۔ میں اس سے خوش وراضی تھا۔ اور ہوں کہ دین اسلام تمہارے لئے ہو اور تم دین اسلام کے لئے، میرے انتخاب میں تم پہلے ہی آ چکے ہو۔ فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ یہ جملہ گزشتہ جملہ حُرِّمَتْ الخ سے متصل ہے۔ درمیان میں وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا سے لے کر "دِیْنًا" تک سات جملہ معترضہ تھے۔ ف فصیحہ ہے مَنْ سے مراد ہر مسلمان ہے۔ اضْطُرَّ بنا ہے ضررٌ سے اور اضطرار کے معنی میں ضرر یا ضرورت میں واقع ہو جانا یہ مقابل ہے اختیار کا مَخْمَصَةٍ بنا ہے خمص سے بمعنی خالی ہونا۔ دبلے آدمی کو رجل خمیص کہا جاتا کہ اس کا جسم گوشت سے خالی ہو جاتا ہے اصطلاح میں مخمصہ وہ بھوک ہے جو ہلاکت کے قریب کر دے جس سے آدمی کا پیٹ غذا سے بالکل خالی ہو جاوے یعنی جو مسلمان بھوک میں مجبور ولاچار ہو جاوے کہ بجز حرام غذا کے اسے اور کچھ میسر نہ ہو۔ بھوک سے جان نکل جانے کا خطرہ ہو۔ ہر بھوک کا یہ حکم نہیں اس لئے یہاں مخمصہ فرمایا جوع نہ فرمایا۔ جوع ہر بھوک کو کہتے ہیں۔ مخمصہ ایسی بھوک کو غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ یہ عبارت اضْطُرَّ کے ضمیر ھو سے خالی ہے جو اضْطُرَّ کا نائب فاعل ہے۔ مُتَجَانِفٍ بنا ہے جنف سے جنف کے معنی ہیں کسی کی طرف جھکنا مائل ہونا جیسے جنف کے معنی ہیں کسی سے ہٹنا، دور ہونا۔ حنیف کے معنی ہیں برائیوں سے دور جنیف کے معنی ہیں برائیوں کی طرف مائل لام بمعنی الی ہے۔ اثم سے مراد ہے وہ حرام غذا الذت کے لئے کھانا یا ضرورت سے زیادہ کھا لینا ہے۔ حتی کہ اگر دو لقمہ سے جان بچ جاتی ہو تو تیسرا لقمہ کھانا گناہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ کل فعل محذوف کا حال ہو۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یہاں ف جزائیہ نہیں بلکہ تعلیلیہ ہے۔ یہ جملہ فَمَنِ اضْطُرَّ کی جزا نہیں، اس کی جزا پوشیدہ ہے۔ یہ اس پوشیدہ جزا کی علت۔ اور وجہ ہے یعنی جو مسلمان بھوک پیاس میں مجبور ہو جاوے اور حرام غذا کھا لے اس طرح کہ گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو وہ پکڑا نہ جاوے گا یا گناہ گار نہ ہوئے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا بھی ہے، مہربان بھی۔ وہ کریم ایسے مجبوروں کو پکڑتا نہیں، بخش دیتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اس آیت میں دو جگہ اَلْیَوْمَ ہے ایک تو اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا میں اور دوسرے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ الخ (مائدہ: ۳) میں اَلْیَوْمَ سے مراد اس آیت کے نزول کا دن، اس کی تاریخ ہے۔ دوسرے اَلْیَوْمَ میں دو احتمال ہیں۔ اگر دین کامل کرنے سے مراد ہے۔ تا قیامت دین کا قابل نسخ نہ ہونا۔ حضور ﷺ کے بعد کسی نبی کا نہ آ سکنا تو اَلْیَوْمَ سے یہ زمانہ مراد ہے۔ اور اگر آئندہ کسی آیت حکم کا نہ اترنا اور کسی اتری ہوئی آیت کا منسوخ نہ ہونا مراد ہے تو اَلْیَوْمَ کے معنی ہوں گے۔ آج کا دن آج کی تاریخ لہٰذا اس آیت کی دو تفسیریں ہیں اسی طرح دِیْنَكُمْ دو جگہ مذکور ہیں ایک

کے ایمان کی گارنٹی دے دی۔ **چوتھا فائدہ:** اللہ کا خوف اس کی خشیت رب کی بڑی نعمت ہے۔ مگر یہ کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ جس کو خوف خدا عشق جناب مصطفیٰ نصیب ہو گیا اسے دو جہان مل گئے۔ یہ فائدہ وَاخْشَوْنِ سے حاصل ہوا۔ خوف چند قسم کا ہے۔ ایذا کا خوف جیسے سانپ سے ڈر، ظلم کا خوف، جیسے ظالم حاکم سے خوف۔ اپنے جرم و خطا کا خوف جیسے مجرم کو عادل حاکم سے خوف۔ ہیبت کا خوف جسے کہتے ہیں رعب۔ پہلے دو خوف نفرت پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے آخری دو خوف اطاعت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ہم گناہ گاروں کو رب سے خوف ہے اپنی خطاؤں کی وجہ سے۔ حضرات انبیاء کو خوف ہے ہیبت شاہانہ سے۔ ایک طالب علم کو ماں باپ اور استاذ کا خوف ہے۔ تو محنت سے پڑھتا ہے۔ یہاں وَاخْشَوْنِ میں یہ آخری دو خوف مراد ہے۔ احتیاط کا خوف ظلم کا خوف کفار سے ضرور چاہیے تاکہ مسلمان ان سے محتاط رہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (یونس: ۶۲) یہاں یہ مطلب ہے کہ اولیاء اللہ کو غیر خدا کی اطاعت یا ہیبت کا خوف نہیں ہوتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا کے پہلی بار سانپ بن جانے پر اس سے خوف کرنا ایذا کا خوف تھا اور فرعون سے خوف کرنا ظلم کا خوف تھا۔ لہٰذا خشیت غیر خدا سے مسلمان کو نہیں ہوتی۔ جس دل میں خوف خدا رہتا ہے اس میں خوف غیر نہیں ہوتا۔ **پانچواں فائدہ:** حضور ﷺ آخری نبی ہیں آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ یہ فائدہ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ سے حاصل ہوا۔ جب دین کامل ہو چکا تو اب کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی۔ سارے نبی ذات و صفات اور ساری غیبی چیزوں کے سمعی گواہ تھے۔ حضور عینی گواہ اور عینی گواہ پر گواہی ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد کسی گواہ کی ضرورت نہیں رہتی، حضور کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ **چھٹا فائدہ:** دین کے اصول و قواعد و قانون میں زیادتی کمی نہیں ہو سکتی وہ مکمل ہو چکے۔ اب نمازیں نہ چار ہوں نہ چھ۔ یہ فائدہ بھی اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ سے حاصل ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** دین کے فروعی مسائل کی حد نہیں، وہ ہمیشہ بڑھتے رہیں گے، نئی نئی ضرورتیں پیش آتی رہیں گی مسائل کا استنباط ہوتا رہے گا۔ یہ فائدہ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ سے حاصل ہوا کہ اتمام کہتے ہی اسے ہیں کہ اس میں کمی نہ ہو سکے زیادتی ہو سکے اس لئے اَكْمَلْتُ کے بعد دین ارشاد ہوا۔ اور اَتْمَمْتُ کے بعد نعمت عقائد دین میں مسائل نعمت ہیں۔ **آٹھواں فائدہ:** اسلام کے سوا کسی دین سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں۔ کوئی شخص کسی اور دین میں رہ کر کتنی ہی عبادتیں کرے مردود ہے۔ یہ فائدہ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا سے حاصل ہوا۔ جڑ کٹ جانے کے بعد شاخوں کو پانی دینا بیکار ہے۔ **نواں فائدہ:** قرآن کریم کی اصطلاح میں اسلام صرف دین محمدی کا نام ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دین خواہ آسمانی ہو یا زمینی اسلام نہیں۔ یہ فائدہ بھی اس جملہ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ سے حاصل ہوا۔ **دسواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ اسلام سے راضی ہے نہ کہ توحید سے توحید تو شیطان کے پاس بھی ہے اور بہت کافر فرقے توحیدیے ہیں جیسے آریہ اور سکھ وغیرہ یہ فائدہ بھی الْاِسْلَامَ فرمانے سے حاصل ہوا اس لئے سارے قرآن مجید میں نہ لفظ توحید ہے نہ اس کا کوئی مشتق، ایمان، اسلام اور اس کے مشتقات قرآن مجید میں ہیں۔ ہم کو پکارا گیا تو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب سے اَلَّذِیْنَ وَحَّدُوْا سے نہ فرمایا۔ خیال رہے کہ توحید کے ساتھ نبوت شامل ہو تو ایمان و اسلام

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کے سوا کسی کا خوف نہ چاہیے۔ مگر مسلمان، نبیوں، ولیوں سے ڈرتے ہیں یہ ڈر شرک ہے۔ **جواب:** ان سے ڈرنا رب تعالیٰ سے ڈرنا ہے جیسے ان سے محبت رب تعالیٰ سے محبت ہے۔ حکام سے خوف سلطان ہی سے خوف ہے کہ یہ سلطان ہی کے نائب ہیں۔

تیسرا اعتراض: لوگ بادشاہوں سے ڈرتے ہیں۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ تمہارے بعض بیوی بچے تمہارے دشمن ہیں فَاحْذَرُوْهُمْ (تغابن: ۱۴) ان سے ڈرتے رہو۔ وہ آیت اس آیت وَاخْشَوْنِ کے خلاف ہے۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ خوف چار پانچ قسم کے ہیں جن میں سے دو پہلی قسم کے خوف رب سے چاہئیں۔ باقی آخری دو تین قسم کے خوف بندوں سے چاہئیں۔ دشمن سے محتاط رہنا، اپنا بچاؤ اختیار کرنا ضروری ہے۔

چوتھا اعتراض: اگر آج کفار دین اسلام سے مایوس ہو چکے تو پھر اس آیت کے نزول کے بعد بھی کفار نے مسلمانوں سے جنگ کیوں کی، ان کی لڑائیاں ہمیشہ مسلمانوں سے رہیں اور اب بھی ہیں پھر مایوسی کہاں ہوئی؟ **جواب:** کفار مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ کفر اسلام کی ضد ہے۔ اس دشمنی وضد کی وجہ سے لڑائیاں ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں گی۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلام ہمارے مٹائے مٹے گا نہیں مگر عداوت اور دلی عناد سے مجبور ہیں۔ شعر

نیش کژدم نہ از پے کین است   مقتضائے طبیعتش این است

بچھو کی عادت ڈنک مارنا ہے۔ وہ تو مارے گا ہی کسی کا کچھ بگڑے یا نہ بگڑے۔

پانچواں اعتراض: اس آیت میں ارشاد ہوا کہ میں نے تمہارا دین آج کامل کر دیا تو کیا آج حجۃ الوداع سے پہلے ناقص تھا اگر ناقص تھا تو جو صحابہ اس زمانہ میں وفات پا گئے وہ ناقص دین پر گئے۔ **جواب:** اس وقت کے لحاظ سے اسلام کامل تھا اور جو احکام اس وقت تھے ذریعہ نجات تھے۔ مگر آج قیامت تک کے لئے دین کامل ہو گیا کہ اب کوئی حکم منسوخ نہ ہوگا مثلاً جس زمانہ میں زکوٰۃ، روزہ، حج فرض نہیں ہوئے تھے اس وقت صرف کلمہ ونماز پڑھ لینا بھی کامل تھا۔ اس پر نجات تھی۔ اب ان احکام کے آجانے پر ان پر عمل کرنا کامل ہوا۔ شیر خوار بچے کے لئے ماں کا دودھ کامل غذا ہے۔ جوان ہو جانے پر روٹی چاول وغیرہ کامل غذا ہے۔ بیمار کے لئے ساگودانہ کامل غذا ہے تندرست کے لئے دوسری غذائیں کامل ہیں۔ **دوسرا جواب:** یہ ہے کہ یہاں کمال دین سے مراد ہے احکام اسلام کا نسخ نہ ہونا اور حضور کے بعد کسی نبی کا نہ ہونا۔ اور ''اَلْيَوْمَ'' سے مراد صرف آج کا خاص دن نہیں بلکہ یہ وقت اور یہ زمانہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے دین قابل نسخ تھے۔ بعد میں اور انبیاء کرام کی تشریف آوری کی امید تھی اب یہ دین کامل ہو گیا۔ کبھی منسوخ نہ ہوگا۔

چھٹا اعتراض: جب دین اسلام کامل ہو چکا تو اماموں کی تقلید اور چار مذاہب کی کیا ضرورت ہے اور بعد میں علم فقہ کیوں بنایا گیا، اسلام میں کون سی کمی تھی جو ان اماموں نے پوری کی اور قرآن وحدیث میں کیا نقصان تھا جو فقہ سے دور کیا گیا (غیر مقلد)۔ **جواب:** دین، عقیدوں اور کلی قانون اور اصول کا نام ہے۔ یہ مکمل ہو چکے رہے جزوی مسائل اور ضروریات

والا مسلم (ابوکلام بے دینی)۔ **جواب**: اسلام بنا ہے۔ سلم سے سلم کے چار معنی ہیں۔ (۱) اطاعت و فرمانبرداری (۲) صلح رب فرماتا ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ (انفال: ۶۱)۔ امن و امان۔ حضور فرماتے ہیں: اَلْمُؤْمِنُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا کہ اپنا کچھ نہ رہے۔ سب کچھ اس کا ہو جاوے۔ حضور سوتے وقت فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَيْكَ یہ چاروں خوبیاں صرف اسلام میں ہیں اور کسی دین میں نہیں، یہ چاروں صفات صرف مسلمانوں میں ہیں دوسری کسی قوم میں نہیں۔ مسلمان اپنے کو اللہ رسول کے سپرد اس طرح کر دیتا ہے کہ سبحان اللہ سر سے لے کر پاؤں کے ناخن تک اسلامی قوانین میں جکڑا ہوا ہے۔ جسم کے بعض بال کٹوانا حرام ہیں۔ جیسے بھویں پلک بعض بال کٹوانا واجب ہے۔ جیسے زیر ناف۔ ناک، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں سب زیر فرمان الٰہی استعمال کرنے کا حکم ہے۔ حتیٰ کہ سونا، جاگنا، بلکہ مرنا، جینا سب اللہ رسول کے زیر فرمان ہے۔ اسی لئے یہ ہی مسلمان کہلانے کا مستحق ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (انعام: ۱۶۲) اگر ہم صحیح طور پر مسلمان بن جاویں تو ہمارا ہر کام عبادت ہو جاوے اور پھر ہمارے اعضا میں قوت رحمانی کارفرما ہو۔

تفسیر صوفیانہ

اس آیت کریمہ میں بہ ظاہر خطاب سارے مسلمانوں سے ہے۔ مگر بہ باطن خطاب طالبین مولیٰ سے ہے۔ طالبین مولا کے لئے دنیا مردار ہے۔ یہاں کی عام حلال چیزیں خون ہیں۔ حرام چیزیں سؤر یا تھوڑی دنیا جو پردہ بن جائے۔ وہ خون ہے۔ زیادہ دنیا جو دل پر غفلت کی مہر لگا دے وہ سؤر ہے اور ریا نام و نمود کی عبادت جس میں غیر خدا کو راضی کرنے کی نیت ہو وہ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ ہے وہ دل جنہیں نفس مارہ نے گھونٹا ہوا ہے یہ اَلْمُنْخَنِقَةُ ہیں جو اوپر سے نیچے کی طرف دینْ سے دنیا کی طرف گر پڑے وہ وَالْمُتَرَدِّيَةُ ہے اور متکبر دنیادار لوگ جو ایک دوسرے پر فخر کریں۔ ستائیں وہ گویا وَالنَّطِيْحَةُ جانور ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے نے سینگ مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ اور وہ عبادات جو بری حرکتوں اور محبت دنیا کی وجہ سے برباد ہو گئیں وہ گویا مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ہیں جو دنیا کے بت پر ذبح کر دی گئیں۔ جو اللہ کی عبادت شک کے ساتھ ادا کی جاوے کہ نہ معلوم قبول ہو یا نہ قبول ہو وہ گویا تیروں سے فال نکالی چیز ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ اے راہ حق پر چلنے والے مولیٰ کے طلب گارو! جو ہمارے مؤمنوں کی فہرست میں آ چکے ہیں تم پر غافل کرنے والی دنیا تھوڑی ہو یا بہت اور ریاکاری کی عبادتیں وہ نفس جو دنیا میں پھنس کر رہ گئے اور ان لوگوں سے میل جول جو متکبرین ایک دوسرے کو نیچے دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور دنیاداروں کی جھوٹی (نیم خوردہ) دنیا اور جو عبادات درست ہونے کے بعد برباد ہو جاویں وہ اور مشکو عبادات حرام کر دی گئیں۔ ان سب سے پرہیز رکھو کہ یہ تمام چیزیں فسق اور راہ مار ہیں۔ تم سے شیطان اور اس کی ذریت بفضلہ تعالیٰ مایوس ہو چکے ہیں۔ کیونکہ تم ہماری امان میں ہو۔ تم ان سے بے دھڑک رہو۔ ہمیشہ خوف خدا رکھو کہ اس قدم سے ہی تم یہ راستہ طے کر سکتے ہو۔ اس بازو سے تم اڑ سکتے ہو، اس سواری سے یہ سفر بہ آسانی کر سکتے ہو۔ حضرت سہل فرماتے ہیں بڑا عاجز وہ شخص ہے جو مجبور سے ڈرے قادر و قیوم سے بے خوف ہو جاوے۔ قادر مطلق کا خوف دل

تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ
سکھادو تم انہیں اس میں سے جو سکھایا تم کو اللہ نے پس کھاؤ اس میں سے جو روک رکھیں وہ جانور
علم تمہیں خدا نے دیا اس میں سے انہیں سکھاتے تو کھاؤ اس میں سے جو وہ مار کر تمہارے
عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ
اوپر تمہارے اور ذکر کرو نام اللہ کا اوپر اس کے اور ڈرو اللہ سے
لئے رہنے دیں اور اس پر اللہ کا نام لو اور اللہ سے ڈرتے رہو
اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴
بیشک اللہ جلد لینے والا ہے حساب
بیشک اللہ کو حساب کرتے دیر نہیں لگتی

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں حرام جانوروں کا ذکر تھا تا کہ مسلمان ان کے کھانے سے بچیں۔ اب حلال جانوروں کا تذکرہ ہے جسے مسلمان کھائیں یہ دونوں چیزیں تقویٰ کی اصل ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد تھا کہ جس جانور کو تم ذبح کر لو اسے کھا سکتے ہو۔ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ جس جانور کو تمہارا شکاری کتا مار لے وہ بھی تم کھا سکتے ہو مگر کچھ شرائط کے ساتھ گویا ذبح اختیاری کا ذکر پچھلی آیت میں تھا اور ذبح اضطراری کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ جس جانور کو دوسرا جانور مار دے یعنی نطیحہ وہ کھانا حرام ہے۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ جس جانور کو تمہارا سکھایا ہوا شکاری جانور زخمی کر کے مار دے تو حلال ہے گویا غیر شکاری جانور کے مارے ہوئے کا ذکر پہلے ہوا اور سکھائے ہوئے شکاری جانور کے مارے ہوئے کا ذکر اب ہو رہا ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں دین کے کامل ہونے اور نعمت کے پورے ہونے کی خبر دی گئی۔ اب اس کا ثبوت دیا جا رہا ہے۔ کامل دین وہ جس میں انسان کی ساری ضروریات پوری کی گئیں ہوں۔ زندگی کا کوئی شعبہ تشنہ نہ چھوڑا گیا ہو۔ ضروریات زندگی میں سے ایک اہم ضرورت شکار ہے۔ خصوصاً ملک عرب کے لئے جہاں بعض علاقوں میں صرف شکار پر گزارا ہوتا تھا اس لئے اب شکار کے احکام بیان ہوئے۔

شان نزول

اس آیت کریمہ کے نزول کے متعلق چند روایات ہیں۔ (۱) طبرانی نے بروایت حضرت ابورافع نقل فرمایا کہ ایک بار حضرت جبرئیل امین نے حضور ﷺ کے دروازہ شریف پر کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت مانگی، حضور انور نے اجازت دے دی مگر وہ اندر آئے نہیں، حضور نے فرمایا کہ اے جبریل! ہم اجازت دے چکے تم آتے کیوں نہیں؟ عرض کیا کہ حضور کے گھر ایک کتا ہے اور ہم اس گھر میں نہیں جاتے جہاں کتا موجود ہو، حضور ﷺ نے حکم

حضور کے ہاں عطائیں، ہوتی رہیں گی۔ شعر

منگتے تو ہیں منگتے کوئی شاہوں میں دکھادو   جس کو مری سرکار سے ٹکڑا نہ ملا ہو

یہاں سوال سے مراد ان پانچوں قسم میں سے پہلی قسم کا ہے۔ ما استفہامیہ ہے۔ ذا اسم اشارہ ہے ان دونوں سے مراد جانور ہیں جیسے کہ جواب سے ظاہر ہے۔ اُحِلَّ احلال سے بنا جس کے معانی ابھی کچھ پہلے عرض کیے گئے لَهُمْ سے مراد سارے مسلمان ہیں کیونکہ حلال وحرام کے احکام مسلمانوں پر ہی جاری ہوتے ہیں یعنی اے محبوب! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ جانور کون کون سے ہیں جو مسلمانوں کے لئے حلال کیے گئے جنہیں مسلمان کھا سکتے ہیں۔ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ یہاں اُحِلَّ میں یا تو آج حلال فرمادینے کا ذکر ہے یا گزشتہ زمانہ میں حلال فرمادینے کا تذکرہ ہے۔ یعنی آج تم کو کہا جاتا ہے۔ کہ حلال کردی گئیں یا کہ پہلے سے ہی حلال کی جاچکی ہیں۔ طیبات سے مراد جانور ہیں جیسے کہ سوال وجواب سے معلوم ہورہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس سے ساری طیب چیزیں مراد ہوں، جانور ہوں یا کوئی اور چیز۔ طیب سے مراد یا لذیذ ومزیدار چیزیں ہیں یا وہ جن کی طرف انسانوں خصوصاً اہل عرب کا دل مائل ہو۔ بشرطیکہ وہ درست طبیعت والا ہو۔ ورنہ خبیث النفس لوگوں کے دل تو گندی چیزوں کی طرف بھی مائل ہوتے ہیں۔ یا طیب وہ جانور ہے جو اللہ کے نام پر ذبح ہوگیا ہو یا ہر وہ چیز جسے کتاب وسنت واجماع و قیاس نے حرام نہ کیا ہو (تفسیر خازن، کبیر، تفسیرات احمدیہ، روح المعانی، بیضاوی وغیرہ)۔ تیسرے معنی زیادہ موزوں ہیں یعنی جسے شریعت نے منع نہ فرمایا ہو یعنی تمہارے لئے ہر وہ جانور حلال فرمادیا جسے شریعت نے منع نہ فرمایا۔ یہ فائدہ یاد رکھو۔ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ یہ عبارت الطَّيِّبٰتُ پر معطوف ہے۔ اور ما سے پہلے لفظ "صید" پوشیدہ ہے۔ ما سے مراد شکاری جانور ہیں عَلَّمْتُمْ سے مراد ہے شکار کرنے کی تعلیم دے دینا۔ من بیان ہے ما کا جوارح جمع ہے جارحۃ کی جس کا مادہ جرح ہے۔ جرح کے معنی زخم بھی ہیں اور کمانا بھی اسی لئے انسان کے ظاہری اعضاء کو جوارح کہتے ہیں کہ ان سے کمائی کی جاتی ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ (جاثیہ: ۲۱) اور فرماتا ہے: وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ (انعام: ۶۰) ان دونوں آیتوں میں جرح بمعنی کسب ہے۔ یہاں جوارح سے مراد شکاری جانور ہیں خواہ چرندے ہوں جیسے کتا، چیتا، یا پرندے جیسے باز، شکرہ، شاہین وغیرہ۔ کیونکہ یہ جانور زخمی بھی کرتے ہیں اور کمائی بھی کرتے ہیں۔ شکار کیا ہوا جانور ان کی کمائی ہے۔ یعنی تمہارے لئے حلال ہے ان شکاری جانوروں کا شکار جنہیں تم شکار کرنا سکھالو۔ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ۔ مُكَلِّبِيْنَ عَلَّمْتُمْ کی ضمیر سے حال ہے۔ یہ بنا ہے تکلیب سے۔ جس کے معنی ہیں کتے کو شکار سکھانا یا کتے کو شکار کے لئے چھوڑنا۔ عربی میں ہر شکاری جانور کو کلب کہہ دیتے ہیں تُعَلِّمُوْنَهُنَّ الخ مُكَلِّبِيْنَ کا بیان ہے۔ اور اس کی شرح ہے ھن کی ضمیر جوارح کی طرف لوٹتی ہے۔ یا تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مُكَلِّبِيْنَ کی ضمیر سے حال ہے یا یہ نیا جملہ ہے جو معترضہ جملہ کے طور پر یہاں بیان ہوا۔ عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ سے مراد وہ مسائل شکار ہیں جو حضور ﷺ نے مسلمانوں کو سکھائے۔ خیال رہے کہ یہاں رب تعالیٰ نے شکاری کتوں کی تعلیم کے لئے تین عبارتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ آپ کے جاں نثار صحابہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ حرام جانور تو قرآن کریم نے بتا دیئے۔ حضور فرمادیں کہ ہمارے لئے کون سے جانور یا کون کون سی چیزیں حلال ہیں فرمادو کہ تمہارے لئے تمام وہ لذیذ مزیدار پاک چیزیں اور جانور حلال ہیں جنہیں شریعت نے حرام نہ فرمایا اور تمہارے لئے ان شکاری جانوروں کے شکار بھی حلال ہیں جنہیں تم سکھا کر سدھالو۔ خواہ وہ جانور چرندے ہوں جیسے کتا چیتا وغیرہ یا پرندے جیسے باز، شکرہ، شاہین وغیرہ بشرطیکہ وہ تعلیم دیئے ہوئے ہوں تم نے انہیں شکار کے وہ طریقے سکھا دیئے ہوں جو رب تعالیٰ نے تم کو بتا دیئے ہوں یا براہ راست یا محبوب ﷺ کی معرفت۔ ایسے جانور جب شکار کریں تو تم وہ شکار کھاؤ۔ جو انہوں نے تمہارے لئے روک رکھا اس میں سے خود نہ کھایا۔ ان کتوں کو چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ اگر تم کتے کے منہ میں جانور زندہ پاؤ تو بسم اللہ سے ذبح کر لو یا بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ۔ ان تمام پابندیوں پر پورا عمل کرو، خدا سے ڈرو۔ شکار کے شوق میں حرام کو حلال کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا اور ساری مخلوق کا پورا حساب لے گا اور بہت جلد لے گا۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اصل اشیاء میں اباحت ہے یعنی حرام وہ چیز ہے جسے شریعت حرام کرے۔ مگر حلال وہ چیز ہے جسے شریعت نے حرام نہ کیا ہو۔ جس سے خاموشی ہو وہ حلال ہے۔ یہ فائدہ اَلطَّیِّبٰتُ سے حاصل ہوا۔ رب تعالیٰ نے حرام جانوروں کے نام پچھلی آیت میں گنائے مگر حلال جانوروں کے لئے صرف طیبات فرمادیا طیبات کے معنی ابھی ابھی تفسیر میں عرض کر چکے کہ طیب وہ ہے جسے شریعت حرام نہ کرے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا (انعام: ۱۴۵) جس سے معلوم ہوا کہ شریعت میں جس کی حرمت نہ ملے وہ حلال ہے۔ لہٰذا گیارہویں شریف کی مٹھائی، میلاد شریف کے تبرکات حلال ہیں کیوں کہ شریعت نے انہیں حرام نہ کیا۔ یہ بھی خیال رہے کہ قرآن مجید میں سواء سوّر کے کسی حرام جانوروں کا ذکر نہیں ہاں کچھ مردار جانوروں کا ذکر ہے۔ باقی تمام حرام جانوروں کی تفصیل نبی ﷺ نے ہی بیان فرمائی۔ اور سوّر کا بھی صرف گوشت ہی قرآن نے حرام کیا، اس کے باقی اعضاء بھی حضور انور نے ہی حرام فرمائے لہٰذا طیب وخبیث کی تفصیل حضور کے اقوال طیبہ سے ہی ہوسکتی ہے۔ **دوسرا فائدہ:** شکاری جانور کا مارا ہوا جانور حلال ہے اگر چہ وہ اس کے منہ میں مر جاوے اور ہم اسے ذبح نہ کرسکیں۔ یہ فائدہ وَمَا عَلَّمْتُمْ سے حاصل ہوا۔ جیسا ابھی تفسیر میں عرض کیا گیا۔ **مسئلہ:** ایسے شکار کے حلال ہونے کے لئے آٹھ شرطیں ہیں۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی نہ ہو تو شکار حرام ہے۔ (۱) جانور شکاری ہو غیر شکاری نہ ہو جیسے بلی (۲) وہ جانور سکھایا ہوا ہو۔ چنانچہ آوارہ غیر شکاری کتے کا شکار حرام ہے (۳) وہ شکاری جانور مسلمان کا ہو، مشرک کا نہ ہو لہٰذا ہندو یا مجوسی کے شکاری کتے کا شکار حرام ہے (۴) اس نے شکار کو زخمی کر کے مارا ہو ...... گلا گھونٹ کر ماردیا تو حرام ہو گیا (۵) اس کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر چھوڑا گیا ہو۔ اگر جان بوجھ کر بسم اللہ نہ پڑھی ہو تو حرام ہے (۶) اگر شکار زندہ شکاری کے پاس پہنچ جاوے تو اسے ذبح کر لیا جاوے (۷) شکاری کتے کے ساتھ غیر

اعتراضات

پہلا اعتراض: علم کے معنی ہیں صورت حاصلہ فی العقل، پھر کتوں اور دوسرے شکاری جانوروں کو علم کیسے ہوسکتا ہے۔ان کے پاس عقل کہاں ہے جس میں صورت حاصل ہو تو یہاں عَلَّمْتُمْ اور تُعَلِّمُوْنَهُنَّ کیونکر درست ہوا؟ **جواب:** یہ منطقیوں کی اصطلاح ہے وہ بھی علم حصولی حادث کے لئے ہے۔علم حضوری اور علم قدیم وغیرہ کی یہ تعریف نہیں۔فرشتوں یا منطقیوں کی عقول عشرہ جنات کو بلکہ خود رب تعالیٰ کو علم ہے۔وہاں عقل وغیرہ کہاں ہے۔خود ہم کو اپنا علم ہے۔یہاں صورت کہاں ہے۔علم کی تعریف ہے۔ما به الانکشاف۔جس وصفت سے کوئی چیز کھلے اور ظاہر ہو۔قرآن کریم منطق کی اصطلاحوں کا پابند نہیں۔

دوسرا اعتراض: یہاں فرمایا گیا فَكُلُوْا یعنی کھاؤ اور فَكُلُوْا امر ہے۔امر وجوب کے لئے آتا ہے تو شکار کا گوشت کھانا واجب ہے۔ **جواب:** جو امر پابندی اٹھانے کے لئے ہو وہ صرف مباح کرنے کے لئے ہوتا ہے نہ کہ وجوب کے لئے جیسے وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (مائدہ:۲) یہاں بھی ایسا ہی ہے۔

تیسرا اعتراض: مِمَّآ اَمْسَكْنَ کے من سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا شکار نہ کھایا جاوے اس کا بعض حصہ کھایا جاوے تو کیا پورا شکار کھانا حرام ہے ورنہ پھر من کے کیا معنی ہوں گے؟ **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر میں گزر چکا کہ مِمَّآ کا مایا تو زائد ہے پھر تو یہ اعتراض پڑتا ہی نہیں اور اگر تبعیضیہ ہو تب بھی مطلب یہ ہے کہ اس کے حلال اعضا کھاؤ جیسے گوشت، کلیجی، گردے وغیرہ حرام اعضا نہ کھاؤ جیسے، پتہ، خصیہ، فرج، ذکر، دبر، خون وغیرہ۔

چوتھا اعتراض: تم نے کہا کہ کتا پالنا بھی جائز ہے اور کتے کی خرید و فروخت بھی درست ہے۔حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ جس گھر میں جاندار کی تصویر یا کتا یا جنبی انسان ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔جو چیز رحمت کے فرشتوں کی آڑ بنے وہ جائز کیوں کر ہوسکتی ہے لہٰذا کتا پالنا حرام ہے۔ **جواب:** یہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر مخصوص البعض ہے تصویر سے مراد جاندار کی تصویر ہے اور وہ تصویر بھی ایسی جو بلا ضرورت ہو، شوقیہ ہو، عزت سے ہو۔روپیہ پیسہ نوٹ کی تصویر ضرورت کی بناء پر رکھی جاتی ہے۔بستر یا فرش کی تصویر پاؤں سے روندی جاتی ہے اس کی کوئی حرمت نہیں ہوتی۔یہ دونوں ممنوع نہیں۔یونہی جو کتا بلا ضرورت شوقیہ پالا جاوے وہ ممنوع ہے۔شکار یا گھر بار یا جانوروں یا کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا پالنا جائز ہے۔اس سے رحمت کے فرشتے نہیں رکتے۔یونہی بلا وجہ جنبی رہنا حرام ہے۔اگر رات میں جنبی ہوا، وضو کر کے سو رہا۔فجر سے پہلے غسل کر لیا تو اس جنبی سے رحمت کے فرشتے نہیں رکیں گے۔یہ تفصیل دوسری حدیث میں ہے۔بہر حال بلا وجہ کتا پالنا جیسا کہ آج فیشن بن گیا ہے۔حرام ہے اور مذکورہ بالا ضرورتوں سے پالنا موجود ہے۔

پانچواں اعتراض: تم نے کہا کہ کتے کی خرید و فروخت درست حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے کتے کی قیمت سے منع فرمایا۔معلوم ہوا کتے کی خرید و فروخت حرام ہے۔ **جواب:** یہ حدیث اس وقت کی ہے جب کتا پالنا مطلقاً حرام تھا اس کا قتل کر دینا واجب تھا۔یہ حکم منسوخ ہو گیا اور بعد میں ضرورۃً اس کے پالنے کی اجازت دے دی گئی جیسا کہ

کہ ہم کو اس سفر طلب مولیٰ میں کون چیزیں حلال ہیں تم فرمادو کہ تمہیں طیبات حلال ہیں جو رب تعالیٰ سے غافل نہ کریں۔ غفلت پیدا کرنے والی ریا کی نماز خبیث ہے۔ اور اطاعت اللہ رسول کے ماتحت کاروبار طیب ہے۔ نفس کتا ہے۔ بعض نفوس آوارہ کتے ہیں۔ وہ جس چیز کو خواہش سے حاصل کریں وہ آوارہ کتے کا شکار ہے اور حرام ہے۔ بعض نفس ہیں تو کتے مگر ہیں معلم یعنی سیکھے ہوئے شکاری ہیں۔ وہ جس چیز کی خواہش کریں وہ شکاری کتے کا شکار ہے وہ حلال ہے غافل آدمی کا کھانا، پینا، سونا جاگنا طریقت میں حرام ہے کہ یہ نفس کتے کا شکار ہے۔ جو غیر شکاری ہے عاقل آدمی کے یہ سارے کام حلال بلکہ باعث ثواب ہیں کہ یہ معلم کتے کے شکار ہیں۔ ان کا استعمال کرو مگر پھر بھی اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانے والا ہے کہ عامل کو عمل ختم کرنے سے پہلے بدلہ دیتا ہے کہ اپنا قرب وقبولیت عطا فرمادیتا ہے جو خود ہی اپنی زندگی برباد کر کے اپنا خانہ خراب کرے تو وہ جائے۔ شعر

چرا از غیر شکایت کنم کہ ہم چو حباب　　ہمیشہ خانہ خراب و ہوائے خویشتنم

(از روح البیان) خیال رہے کہ کلب معلم کی نشانی یہ ہے کہ مالک کے چھوڑنے پر شکار پر جھپٹ پڑے بلانے پر لوٹ آئے۔ شکار سے بغیر مولیٰ کی اجازت خود کچھ نہ کھائے نفس معلم جب بنے گا۔ جب اس کا یہ حال ہو جاوے۔ شعر

رہ حق میں ہو دوڑ اور بھاگ ان کی　　شریعت کے قبضہ میں ہو باگ ان کی

جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ　　جہاں کر دیا گرم گرما گئے وہ

صوفیاء فرماتے ہیں کہ کسی کا مملوک جانور یعنی پالتو کوئی شکار نہیں کر سکتا۔ اس کی جان شکاریوں سے محفوظ ہے۔ مگر غیر مملوک جنگلی آوارہ جانور کی جان محفوظ نہیں۔ ہر شکاری اسے شکار کر سکتا ہے یونہی جو بندہ کسی بندے کا بندہ نہ بنے اس کا ایمان وتقویٰ غیر محفوظ ہے۔ شیطان نفس امارہ۔ برے ساتھی جب چاہیں اسے شکار کر لیں۔ اگر اپنے ایمان کی حفاظت چاہتے ہو تو کسی کے بن کر کسی کے ہو کر رہو۔ ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب کہا۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے

میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

جس لفافہ پر بیمہ کمپنی کی مہر نہ ہو، رجسٹری نہ ہو وہ خطرے میں ہوتا ہے خدا کرے ہمارے دلوں پر حضور کے نام کی مہر لگ جاوے تا کہ اس کا ایمان خیریت سے اپنے ٹھکانہ پر پہنچے۔ شعر

دل پہ کندہ ہو ترا نام کہ وہ دزد رجیم　　الٹے ہی پاؤں پھرے دیکھ کے طغریٰ تیرا

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ

آج حلال کر دی گئیں واسطے تمہارے پاکیزہ چیزیں اور کھانا ان

آج تمہارے لیے پاک چیزیں حلال ہوئیں اور کتابیوں کا

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں مسلمان کے شکار کی حلت کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں اہل کتاب کافروں کے شکار کیے ہوئے جانور کے حلال ہونے کا ذکر ہے کہ کفار کتابی کا معلم کتا جو شکار کرے وہ حلال ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں مسلمان کے ذبیحہ کے حلال ہونے کا ذکر تھا کہ ارشاد ہوا تھا وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ اب اہل کتاب کفار کے ذبیحہ کے حلال ہونے کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں حلال جانوروں کا ذکر تھا۔ اب حلال عورتوں کا تذکرہ ہے کیونکہ غذا کے بعد بیوی کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ **چوتھا تعلق:** گزشتہ پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ اسلام بہت مکمل دین ہے۔ اب اس کے کامل ہونے کا ثبوت دیا جارہا ہے کہ اسلام میں صرف عبادات کی تفصیل نہیں بلکہ اس میں معاملات حتی کہ کھانے، عورتوں کی حلت وحرمت کی تفصیل ہے۔ گویا وہ آیت مجمل تھی اور یہ آیت اس کی تفصیل ہے۔

تفسیر

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ۔ اَلْيَوْمَ کی تفسیریں ابھی کچھ پہلے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کی تفسیر میں عرض کی دی گئیں۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اس جگہ اَلْيَوْمَ سے یا تو اس آیت کے نزول کا دن مراد ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ شروع اسلام میں ضرورت کے لحاظ سے بعض چیزیں خبیث حلال تھیں جیسے شراب یا عورتوں سے متعہ اور بعض طیب چیزیں حرام تھیں جیسے بیوہ سے نکاح کرنا ایک سال عدت سے پہلے۔ مگر یہ احکام عارضی تھے۔ آج اسلام کے اصل احکام جاری ہو گئے کہ صرف طیب چیزیں ہی حلال کر دی گئیں اور خبیث چیزیں سب حرام کر دی گئیں اور ساری طیب چیزیں حلال کر دی گئیں کوئی طیب چیز حرام نہ رہی۔ یا ''اَلْيَوْمَ'' سے مراد ہے یہ زمانہ اور یہ وقت۔ تب مطلب یہ ہوگا کہ گزشتہ دینوں میں بعض خبیث چیزیں حلال تھیں اور بعض طیب چیزیں حرام۔ مگر اب اسلام میں خبیث چیزیں ساری حرام کر دی گئیں۔ طیب چیزیں ساری حلال فرما دی گئیں۔ لہٰذا اُحِلَّ سے یا تو آج حلال فرمانا مراد ہے یا گزشتہ حلال ہو چکنے کی خبر دینا مراد ہے۔ لَكُمْ میں خطاب سارے مسلمانوں سے ہے۔ طیبات کی تفسیر ابھی پچھلی آیت میں عرض کر دی گئی کہ جس چیز کو شریعت نے حرام نہ کیا ہو وہ طیب ہے۔ یہ ہی قول قوی ہے۔ یعنی اے مسلمانو! آج کے دن یا اسلام میں تمہارے لئے تمام طیب چیزیں حلال کر دی گئیں کہ تم پر کوئی خبیث چیز حلال نہ رہی اور کوئی طیب چیز حرام نہ رہی وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یہ عبارت الطَّيِّبٰتُ پر معطوف ہے اور اُحِلَّ کا نائب فاعل۔ طعام کی تین تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد دال، چاول، گندم وغیرہ غذائیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے مراد تمام غذائیں ہیں۔ مذبوحہ جانور ہوں یا کوئی اور چیز۔ تیسرے یہ کہ اس سے مراد ذبیحہ ہے۔ یعنی اہل کتاب کے کھانے تمہارے لئے حلال ہیں بلاوجہ انہیں حرام مت سمجھو۔ چنانچہ آج تک یورپ کی تیار کردہ غذائیں، دوائیں ولایتی گھی وغیرہ اسلامی ممالک میں بھی کھائے جاتے ہیں یا اہل کتاب کے بھیجے ہوئے کھانے پینے کے ہدیہ تحفے تمہارے لئے حلال ہیں۔ پڑوسی کفار اور کفار کے پڑوسی ملک کو اخلاقاً ہدیہ دو اور ان کے ہدیے قبول کرو کہ اسی میں اخلاق کا برتاوا بھی ہے اور تبلیغ اسلام بھی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے کفار کے ہدیے قبول بھی کیے ہیں، انہیں ہدیے دیئے بھی ہیں یا اہل

مِنْ قَبْلِكُمْ۔ یہ عبارت پہلے وَ الْمُحْصَنٰتُ پر معطوف ہے یہاں بھی محصنات سے مراد پاک دامن عفیفہ عورتیں ہیں۔ اس کا مقابل ہے فاسقات یعنی بدچلن، زانیہ، فاحشہ عورتیں۔ **خیال رهے**: کہ زنا کی سزا رجم میں جو محصن آتا ہے وہاں اس سے مراد ہے وہ مسلمان، بالغ، عاقل جو شادی شدہ ہو اور حلال صحبت کر چکا ہو اور تہمت کی سزا میں جو محصنہ آتا ہے وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (نور: ۴) وہاں محصنہ سے مراد وہ عاقلہ، بالغہ، مؤمنہ عورت ہے، جو عفیفہ ہو۔ ان دونوں جگہ محصنات میں ایمان کی قید ہے۔ مگر یہاں محصنات سے مراد صرف نیک چلن عورت ہے۔ یہاں ایمان کی قید نہیں۔ صرف پاک دامن مراد ہے۔ غرض کہ محصنہ کے تین معنی ہیں۔ خاوند والی عورت۔ اس سے نکاح حرام ہے۔ رب فرماتا ہے: وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء: ۲۴) عاقلہ، بالغہ، مومنہ عورت، پاک دامن عورت۔ یہاں تیسرے معنی میں محصنہ ارشاد ہوا ہے۔ حضرت امام شافعی کے ہاں یہاں محصنات سے مراد آزاد کتابیہ عورتیں ہیں کیونکہ ان کے ہاں کتابیہ لونڈی سے مسلمان کا نکاح درست نہیں، ہمارے ہاں درست ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہاں محصنات سے مراد مطلقاً کتابی عورت ہے۔ خواہ حربیہ ہو یا ذمیہ۔ بعض صحابہ کے نزدیک ذمیہ کتابیہ مراد ہے۔ ان کے ہاں حربیہ کتابیہ سے مسلمان کا نکاح جائز نہیں (خازن، کبیر، روح المعانی، ابن کثیر وغیرہ)۔ یہ مِن بھی تبعیضیہ ہے اور یہ محصنات بھی ترغیب اور بیان استحباب کے لئے ہے۔ ورنہ فاسقہ کتابیہ سے بھی نکاح درست ہے۔ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ اس کا تعلق مذکورہ محصنات سے ہے۔ مؤمنہ ہوں یا کتابیہ اور اذا ان کی حلیت کا ظرف ہے۔ اٰتَيْتُمُوْ بنا ہے ایتاءٌ سے بمعنی دینا اور دینے سے مراد دے دینا، سپرد کر دینا۔ یا اس کا وعدہ کر لینا۔ اُجُوْرَ جمع اجرت اس سے مراد یہاں مہر ہے۔ اگر عورت آزاد ہے تو اس کو یا اس کے ولی کو مہر دیا جاوے گا۔ اگر لونڈی ہے تو اس کے مولیٰ کو دیا جاوے گا کہ یہ اس ہی کا حق ہے۔ یہاں مہر دینے کا حق اس کی تاکید کے لئے ہے شرطیت کے لئے نہیں۔ کیونکہ نکاح کا جواز نہ تو مہر مقرر کرنے پر موقوف ہے نہ مہر دے دینے پر۔ اگر بغیر مہر کے بھی نکاح کر لیا گیا تب بھی درست ہے اور مہر مثل واجب ہوگا۔ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ یہ عبارت اٰتَيْتُمُوْهُنَّ کے فاعل ضمیر سے حال ہے۔ محصنات میں تو عورتوں کی پاکدامنی کا ذکر ہے اور یہاں مردوں کی پاک دامنی کا ذکر ہے۔ یہاں بھی احصان سے صرف پاک دامنی مراد ہے۔ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ اسی مُحْصِنِيْنَ کا بیان ہے مُسٰفِحِيْنَ بنا ہے سفاح سے بمعنی زنا۔ یہاں علانیہ زنا مراد ہے۔ کیونکہ خفیہ زنا کا ذکر تو آگے آ رہا ہے۔ چونکہ ابھی فرمایا گیا تھا اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ تو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید عورت کو صحبت کی اجرت (خرچی) دے کر اس سے صحبت کرنا حلال ہے۔ اسی لئے اس کی تصریح فرما دی گئی کہ وہاں اجور سے مراد مہر ہیں جو کہ نکاح سے واجب ہوتے ہیں۔ یہ خرچی تو خالص حرام ہے اور اس سے صحبت زنا وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ یہ عبارت غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ پر معطوف ہے۔ اور اسی کی طرح اٰتَيْتُمُوْهُنَّ کے فاعل سے حال اَخْدَانٍ جمع ہے خدن کی بمعنی دوست و یار۔ مذکر و مونث دونوں پر بولا جاتا ہے۔ یہاں اَخْدَانٍ مفعول مضاف الیہ ہے مُتَّخِذِيْٓ کا اس سے مراد یا تو ان عورتوں سے ناجائز تعلق ہے یا خفیہ زنا یعنی تم نہ تو ان سے علانیہ زنا کرو نہ خفیہ زنا کرو نہ ان سے ناجائز تعلق آنا جانا رکھو بلکہ نکاح

کمائی ضائع ہو جاوے۔ یہ دونوں سزائیں یعنی ضبطی اعمال اور آخرت میں خسارہ اسی صورت میں ہے کہ کافر کفر پر مر جاوے۔ اگر مرتے مرتے توبہ کر کے مسلمان ہو گیا تو دونوں سزاؤں سے بچ جاوے گا۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! آج یعنی اسلام کی تشریف آوری پر یا اس آیت کریمہ کے نزول کے دن تمام پاکیزہ و ستھری چیزیں تمہارے لئے حلال کر دی گئیں۔ اس طرح کہ حرام چیزوں کی تفصیل بیان کر دی گئیں۔ ان کے علاوہ تمام چیزیں جو شریعت میں حرام نہ کی گئی ہوں وہ حلال قرار دی گئیں اور اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ تمہارے لئے حلال کیے گئے اور تمہارے ذبیحے اہل کتاب کے لئے حلال کیے گئے تو ان کی کتابوں میں یا قرآن مجید میں اس آیت سے یونہی اے مسلمانو! مومنہ عورتیں جو پاک دامن عفیفہ ہوں وہ بھی تمہارے لئے حلال ہیں۔ اور کتابیہ پاک دامن عفیفہ عورتیں تمہارے لئے حلال۔ جب کہ تم ان کے طے شدہ مہر ادا کر دو کہ انہیں نکاح سے استعمال کرو نہ تو علانیہ طور پر ان کے ساتھ زنا کرو نہ ان کے ساتھ خفیہ طریقہ سے یارانہ گانٹھو۔ خیال رکھو کہ کتابیہ عورتوں سے نکاح تو کر سکتے ہو۔ مگر ان کی صحبت ان کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنے آپ کو یا اپنی اولاد کو کافر نہ ہونے دینا۔ ان کی صحبت میں کسی اسلامی ایمانی عقیدے کا انکار نہ کرنا۔ کیونکہ جو شخص کسی اسلامی عقیدے سے انکار کر دے تو اس کے سارے نیک اعمال ضبط ہو جاتے ہیں اور آخرت میں وہ بہت ہی خسارہ میں رہتا ہے اس لئے کفر سے اپنے کو اور اپنی اولاد کو بچائے رہنا۔

ضروری نوٹ: اہل کتاب کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں کے نکاح کے متعلق علمائے اسلام کے چند قول ہیں۔ چنانچہ ان کے ذبیحہ کے متعلق چار قول ہیں۔ **ایک:** یہ کہ عربی بنی تغلب کتابیوں کا ذبیحہ حرام ہے اور باقی اہل کتاب کا ذبیحہ حلال۔ یہ قول سیدنا علی مرتضیٰ کا ہے۔ **دوسرے:** یہ کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مطلقاً حلال ہے خواہ وہ اللہ کے نام پر ذبح کریں یا کسی اور کے نام پر جیسے حضرت مسیح یا حضرت مریم یا حضرت عزیر کے نام پر۔ یہ قول امام شعبی اور عطاء کا ہے۔ **تیسرے:** یہ کہ کتابیوں کا ذبیحہ مطلقاً حرام ہے خواہ اللہ کے نام پر ذبح کریں یا کسی اور کے نام پر یہ مذہب روافض کا ہے ان کے ہاں اس آیت میں طعام سے مراد دانہ غلہ وغیرہ ہیں نہ کہ ذبیحہ۔ **چوتھے:** یہ کہ سارے کتابیوں کا ذبیحہ حلال ہے۔ اگر وہ اللہ کے نام پر ذبح کریں اور اگر غیر خدا کے نام پر ذبح کریں یا بغیر کچھ پڑھے ذبح کر دیں تو حرام۔ یہ قول عام علمائے دین کا ہے یہ ہی احناف کا قول ہے۔ اسی طرح کتابیہ عورتوں کے ساتھ نکاح کے متعلق چار قول ہیں (۱) یہ کہ کسی کتابیہ عورت سے مسلمان کا نکاح درست نہیں خواہ ذمیہ ہو یا حربیہ۔ آزاد ہو یا لونڈی یہ قول سیدنا عبداللہ ابن عمر کا ہے۔ ان کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ وہ آیت ہے وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (البقرہ:۲۲۱) وہ فرماتے ہیں کہ کتابی ڈبل مشرک ہے کیونکہ عام مشرک تو خدا کا شریک مانتے ہیں۔ یہ خدا کا شریک بھی مانتے ہیں اور اس کا بیٹا، بیٹی بیوی بھی۔ وہاں فقط شرک ہے۔ یہاں شرک بھی ہے نسبی و سسرالی رشتہ بھی۔ نعوذ باللہ۔ حضرت عطاء کہتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت کی ہے جب مسلمان عورتیں کم تھیں۔ تب کتابیہ عورتیں حلال کر دی گئی تھیں۔ جب مسلمان عورتیں کثرت سے ہو گئیں تو حکم ختم ہو گیا کیونکہ کافرہ سے محبت بحکم قرآن حرام ہے اور بیوی محبوبہ

اس میں تمام طیب چیزیں حلال ہیں اور تمام خبیث چیزیں حرام۔ ایسی کوئی چیز نہیں جو طیب ہو مگر حلال نہ ہو۔ یونہی ایسی کوئی چیز نہیں جو خبیث ہو اور حرام نہ ہو۔ یہ فائدہ اَلطَّیِّبٰتُ کو جمع فرمانے سے حاصل ہوا۔ پچھلے دینوں میں بہت سی طیب چیزیں حرام تھیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ (النساء:۱۶۰) **تیسرا فائدہ:** ہر کتابی کا ذبیحہ حلال ہے خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، آزاد ہو یا غلام۔ یہ فائدہ وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کے اطلاق سے حاصل ہوا۔ مگر خیال رہے کہ ذبیحہ ہو محض مارا ہوا نہ ہو یعنی (کتابی) اسے اللہ کے نام پر ذبح کرے۔ **چوتھا فائدہ:** کفار کا ہدیہ لینا انہیں ہدیہ دینا جائز ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ ہمارے پڑوسی یا رشتہ دار ہوں۔ جیسا کہ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔ ہم ابھی خلاصہ تفسیر میں عرض کر چکے کہ حضور ﷺ نے کفار کے ہدیے ان کی دعوت قبول فرمائیں۔ مگر خیال رہے کہ یہ ہدیے اور دعوتیں ان سے محبت اور کفر کی طرف میلان کی وجہ سے نہ ہوں۔ ادائے حقوق کے ہدیے، تبلیغ کے ہدیے، اخلاق اسلامی کے اظہار کے ہدیے، ان کا لین دین کفار سے جائز ہے۔ کافر پڑوسی، کافر ماں باپ، کافر عزیزوں کے حق ادا کرو۔ اجنبی کفار کو ہدیے دینا تبلیغ اسلام کے لئے جائز ہیں مگر محبت و پیار کے بدلے، رشوت کے ہدیے، ذلت کے ہدیے، ان کا لین دین کفار سے ہرگز جائز نہیں۔ ہدیوں کے اقسام و احکام خیال رکھنے چاہئیں۔ **پانچواں فائدہ:** کتابیہ عورت سے مسلمان مرد کا نکاح حلال ہے خواہ وہ آزاد ہو یا لونڈی ہو ذمیہ ہو حربیہ۔ یہ فائدہ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کے اطلاق سے حاصل ہوا۔ مگر ذبیحہ اور نکاح کی حلت مذہبی کتابوں کے لئے ہے جو عیسائیت یا یہودیت پر قائم ہوں۔ بعض میمیں قادیانی یا بہائی مذہب رکھتی ہیں ان سے نکاح حرام ہے کہ وہ مرتد ہیں عیسائی نہیں یوں ہی جو مسلمان عیسائی ہو جاوے اس سے نکاح حرام ہے۔ کہ وہ مرتد ہے عیسائی نہیں اور مرتد سے نکاح حرام ہے۔ کہ وہ مرتدین ہیں عیسائی نہیں۔ یونہی جو مسلمان عیسائی ہو جاوے اس سے نکاح حرام ہے۔ اولاد حرامی ہوگی۔ **چھٹا فائدہ:** بہتر یہ ہے کہ پاک دامن، صالحہ، نیک عورت سے نکاح کیا جاوے۔ کہ بیوی ہمارے بچوں کی کان ہے۔ خراب کان سے اچھا لوہا کیسے نکل سکتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب کہا۔ شعر

بے ادب ماں باادب اولاد جن سکتی نہیں معدن زر معدن فولاد بن سکتی نہیں

یہ فائدہ اَلْمُحْصَنٰتُ فرمانے سے حاصل ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** متعہ حرام ہے۔ کیونکہ اس میں احصان یعنی پاک دامنی نہیں یہ محض سفاح یعنی شہوت رانی اور عیاشی ہے۔ اسی لئے متاعی عورت بیوی نہیں ہوتی نہ اسے فوت شدہ خاوند کی میراث ملے اگر خاوند بمدت متاع میں فوت ہو جاوے۔ نیز متاعی بیوی کے لئے کوئی حد نہیں جتنی چاہو کر لو۔ اگر وہ بیوی ہوتی تو چار سے زیادہ حلال نہ ہوتیں۔ اس کی بحث ہم پچھلے پاروں میں کر چکے ہیں۔ **آٹھواں فائدہ:** جسے کتابیہ عورت سے نکاح کرنے میں اپنے یا اپنی اولاد کے کافر ہونے کا اندیشہ ہو اس کے لئے یہ نکاح حلال نہیں۔ یہ فائدہ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِالْاِیْمَانِ الخ کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔ **نواں فائدہ:** کافر کی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں، گناہ قائم رہتے ہیں۔ یہ فائدہ فَقَدْ حَبِطَ

پانچواں اعتراض: اس کی کیا وجہ ہے کہ کتابیہ عورتوں سے نکاح درست ہے اور مسلمان عورت کا کتابی مردوں سے نکاح حرام۔ ذبیحہ کی طرح یہ حلت دوطرفہ کیوں نہیں ہوئی؟ **جواب:** چند وجہ سے۔ ایک یہ کہ خاوند حاکم ہے۔ بیوی محکوم اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء: ۳۴) مسلمان کا کافر کے محکوم بننا اسلام کی توہین ہے۔ دوسرے یہ کہ اولاد باپ کی ہوتی ہے۔ اگر خاوند کافر ہو بیوی مسلمان تو اولاد کافر ماننا پڑے گی یہ بھی شان اسلام کے خلاف ہے۔ تیسرے یہ کہ اکثر عورت خاوند کے دین پر آجاتی ہے، خاوند عورت کے دین پر کم آتا ہے۔ اگر خاوند کافر بیوی مسلمان ہو تو عورت کا مسلمان رہنا مشکل ہو جاوے گا۔ خاوند اپنے گھر جو کفریہ رسوم بیوی سے کرائے گا اسے کرنا پڑیں گی۔ اس لئے اس کے دین کا خطرہ ہے۔ بیوی خادمہ خاوند مخدوم ہے۔

چھٹا اعتراض: یہاں اَلْمُحْصَنٰتُ سے مراد پاک دامنی نہیں بلکہ آزاد کتابیہ عورتیں ہیں۔ کتابیہ لونڈی سے نکاح جائز نہیں اس لئے کہ تم بھی کہتے ہو کہ فاسقہ کتابیہ سے نکاح حلال ہے۔ اگر محصنات سے مراد پاک دامنی ہے تو یہ آیت تمہارے بھی خلاف ہے۔ نیز یہاں ارشاد ہوا کہ تم ان بیویوں کو ان کا مہر دو حالانکہ لونڈی کا مہر اس کو نہیں ملتا بلکہ اس کے مولا کو ملتا ہے۔ ان وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ میں محصنات سے مراد آزاد ہیں نہ کہ پاک دامن (تفسیر کبیر) امام فخر الدین رازی نے نہایت اہتمام سے یہ دلائل مذہب شافعی کی تائید میں بیان فرمائے۔ **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں۔ ایک الزامی دوسرا تحقیقی۔ جواب الزامی تو یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں اَلْمُحْصَنٰتُ دو جگہ ارشاد ہوا ہے ایک تو اَلْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ دوسرا وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اگر آپ دوسرے محصنات کو آزاد عورت کے معنی میں لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کتابیہ لونڈی سے نکاح حرام ہے تو چاہیے کہ پہلے محصنات کو بھی آزاد مومنہ کے معنی میں لیں اور فرماویں کہ مسلمان لونڈی سے بھی نکاح مطلقاً حرام ہے حالانکہ مومنہ لونڈی سے آپ بھی نکاح جائز مانتے ہیں۔ لہٰذا جیسے پہلا محصنات بمعنی پارسا ہے ایسے ہی یہ محصنات بھی بمعنی پارسا ہونا چاہیے۔ نیز آپ بھی فرماتے ہیں کہ مومنہ لونڈی کا مہر اس کے مولیٰ کو دیا جاوے گا۔ حالانکہ یہاں ارشاد ہوا اِذَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ لہٰذا یہ آیت آپ شوافع کے بھی خلاف ہے۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ یہاں دونوں جگہ محصنات سے مراد پاک دامن عورت ہی ہے مگر یہ قید ترغیب کے لئے ہے۔ کہ اگرچہ نیک اور فاسقہ دونوں سے نکاح حلال ہے۔ مگر پارسا نیک صالحہ سے نکاح کرنا بدرجہ اتم موجود ہے یعنی مستحب ہے اور قید استحباب کے لئے ہے۔ ایسی مثالیں قرآن کریم میں بہت ہیں جہاں استحباب کے لئے قیدیں لگائی گئیں اور چونکہ لونڈی خود اپنے مولیٰ کی ملک ہے لہٰذا مولیٰ کو اس کا مہر دینا گویا لونڈی کو ہی دینا ہے۔ بہرحال نہایت قوی یہ ہی ہے کہ یہاں دونوں جگہ محصنات بمعنی پارسا ہے۔

ساتواں اعتراض: جب کتابیہ عورت سے نکاح بہت خطرناک ہے تو اس کی اجازت ہی کیوں دی گئی۔ **جواب:** یہ خطرناک بھی ہے اور فائدہ مند بھی امید ہے کہ کتابیہ عورت ہماری صحبت سے مسلمان ہو جاوے۔ اس کے پیٹ کی اولاد

ہیں وہ بھی حلال ہے اور پچھلی آسمانی کتابوں کے وہ حقائق و معارف جو گزشتہ اہل کتاب نبیوں کو عطا ہوئیں حلال کی گئیں۔ تمہارے مقدر میں کی گئیں۔ مگر چاہیے کہ تم ان حقائق و معارف کو ان کا مہر دو۔ ان کا مہر ترک وجود ہے۔ اپنے وجود کو فنافی الذات کر دو ایسی میں محسن رہو کہ ترک وجود مشائخ واصلین کے ذریعہ کرو۔ مسافحین نہ بنو۔ یعنی نفس کے لئے ترک وجود نہ ہو نہ کسی اور ماسوی اللہ کے لئے کہ یہ اَخۡدَانٍ میں داخل ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ ہی ساقی ہو، وہ ہی مشرب، وہ ہی شراب، جو کوئی مومن بن کر کافر ہو جاوے یعنی اس راستہ پر پڑ کر ہٹ جاوے۔ اس کی ساری کوششیں بیکار گئیں اور آخرت میں وہ پورے نقصان میں رہا (روح البیان)۔

يَآيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَى الصَّلٰوةِ
اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے جب اٹھو تم طرف نماز کے
اے ایمان والو جب نماز کو کھڑے ہونا چاہو۔
فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ وَاَيۡدِيَكُمۡ اِلَى الۡمَرَافِقِ
تو دھولو تم منہ اپنے اور ہاتھ اپنے کہنیوں تک
تو اپنا منہ دھوؤ اور کہنیوں تک ہاتھ
وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ اِلَى الۡـكَعۡبَيۡنِ‌ؕ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ
اور مسح کرو تم سروں کا اپنے اور دھوؤ پاؤں اپنے ٹخنوں تک اور اگر ہو تم
اور سروں کا مسح کرو اور گٹوں تک پاؤں دھوؤ اور اگر تمہیں
جُنُبًا فَاطَّهَّرُوۡا‌ ؕ
بے غسلے تو خوب پاک ہوؤ
نہانے کی حاجت ہو تو خوب ستھرے ہولو

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو شکار کے مسائل بتائے گئے۔ شکاری آدمی کبھی شکار کے شوق میں نماز و وضو وغیرہ عبادات سے غافل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب وضو غسل و تیمم کے مسائل بیان فرمائے جا رہے ہیں تاکہ مسلمان شکار کی وجہ سے نماز و طہارت سے غافل نہ ہو جاویں۔ گویا مشاغل کے بعد نماز کے مسائل کا ذکر فرمایا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو کتابیہ عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی چونکہ خطرہ تھا کہ غافل مسلمان کتابیہ عورتوں کی صحبت میں کفر اختیار نہ کر لیں یا ان کے پیٹ

قرآن پڑھنے لگو۔ ایسے ہی یہاں ہے کہ جب تم نماز میں کھڑے ہونے لگو اور یا قیام نماز سے مراد ہے نماز کے لئے اٹھنا، گھر یا دوکان یا آرام گاہ سے نماز کو چلنا یہ ہی ظاہر ہے کیونکہ یہاں فرمایا گیا۔ اِلَى الصَّلٰوةِ اگر نماز کا قیام مراد ہوتا تو فِي الصَّلٰوةِ ہوتا نہ کہ اِلَى الصَّلٰوةِ۔ ان صورتوں میں ایک قید لگانی پڑے گی کہ جب تم نماز کے لئے چلو اور بے وضو ہو کیونکہ وضو کرنا بے وضو پر فرض ہے، باوضو پر نہیں۔ یا فَاغْسِلُوْا کا امر استحبابی ہو کیونکہ جس کا پچھلا وضو ہوا سے بھی نماز کے لئے وضو کر لینا مستحب ہے۔ داؤد ظاہری کے نزدیک ہر نماز کے لئے وضو فرض ہے خواہ انسان بے وضو ہو یا باوضو۔ اس کی دلیل یہ ہی آیت ہے (تفسیر کبیر) بعض مفسرین نے کہا کہ ابتداء ہر نماز کے لئے وضو فرض تھا بعد میں ایک وضو سے چند نمازیں جائز ہوئیں۔ یہ آیت کریمہ اسی وقت کی ہے۔ بعض نے فرمایا کہ قُمْتُمْ سے مراد سو کر اٹھنا ہے یعنی جب تم سو کر نماز کی طرف چلو۔ اس صورت میں حضور ﷺ اس حکم سے خارج ہوں گے کیونکہ حضور کی نیند وضو نہیں توڑتی۔ چونکہ یہاں قیام سے مراد نماز کے لئے اٹھ کر جانا ہے اس لئے اس کے بعد الی لایا گیا۔ صلٰوۃ سے مراد فرض، نفل، واجب ہر نماز ہے کہ نماز پنجگانہ، نماز عید، نماز نفل سب کے لئے وضو فرض ہے، کوئی نماز بغیر وضو جائز نہیں۔ ہاں نماز پنجگانہ کے لئے وضو کرنا مستحب ہے یعنی اگر ظہر کا وضو ہو تو عصر کے لئے تازہ وضو کر لینا بہتر ہے۔ مگر فرض کے وضو سے سنتیں و نفل ادا کرنا سنت ہے کہ ظہر کے لئے جو وضو کیا گیا اس سے ظہر کی سنتیں و نفل بھی پڑھے حتی کہ نماز اشراق فجر کے وضو سے پڑھنا سنت ہے، اس کے لئے تازہ وضو کرنا سنت کے خلاف ہے۔ خیال رہے کہ کپڑے، جسم کی صفائی، پاکی، یونہی جنابت سے غسل بہر حال ضروری ہے۔ جسم گندہ نہ رکھو، ناپاک کپڑے نہ پہنو، بے غسل مت رہو مگر وضو صرف نماز کے ارادہ کرنے پر کرو۔ ویسے بغیر وضو رہنا منع نہیں اس لئے رب تعالیٰ نے وضو کے لئے قید لگائی اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ کی مگر غسل کے لئے فرمایا: اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا (مائدہ:۶) اور کپڑے و بدن کی پاکی کے لئے فرمایا وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (مدثر:۴) اور فرمایا دیا وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر:۵)۔ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ یہ جملہ اِذَا قُمْتُمْ کی جزا ہے۔ وضو میں چار فرض ہیں۔ پہلا فرض چہرہ دھونا ہے دوسرا فرض کہنیوں سمیت ہاتھ دھونا تیسرا فرض کچھ سر کا مسح کرنا چوتھا فرض ٹخنوں سمیت پاؤں دھونا۔ اس لئے رب تعالیٰ نے پہلے چہرہ دھونے کا ذکر فرمایا۔ اِغْسِلُوْا بنا ہے غَسْلٌ بمعنی دھونے سے غَسل۔ غین کے فتح سے ہونا اور غُسل غین کے پیش سے نہانا۔ نہانے کے لئے اغتسال بولا جاتا ہے۔ اتنا پانی ڈالنا کہ بہہ کر کم از کم ایک قطرہ ٹپک جاوے، دھونا ہے اس سے کم مسح ہے۔ وُجُوْہ جمع ہے وجہ کی بمعنی چہرہ جس کی لمبائی سر کے بالوں کی ابتداء سے ٹھوڑی کے نیچے تک ہے اور چوڑائی ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک ہے۔ عربی میں وجہ چہرے کو کہتے ہیں اور فم منہ کو یعنی داخل ہونٹ سے حلق تک۔ فم میں کلی ہوتی ہے، چہرہ دھویا جاتا ہے۔ تفسیر روح المعانی نے فرمایا ہونٹ بند کرنے سے جو حصہ ڈھک جاتا ہے وہ فم یعنی منہ ہے جو کلی میں تر ہو گا اور جو حصہ کھلا رہتا ہے وہ وجہ یعنی چہرہ ہے چونکہ ہر آدمی کا ایک ہی چہرہ ہوتا ہے اس لئے وجوہ بھی جمع ارشاد ہوا اور کم بھی جمع تا کہ مضاف کی اکائیاں مضاف الیہ پر تقسیم ہو جاویں جیسے کہا جاتا ہے اُرْكَبُوْا فُرُوْسَكُمْ تم اپنے گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ۔ یعنی ہر شخص ایک گھوڑے پر۔ ایسے ہی یہاں ہے کہ ہر شخص اپنا ایک چہرہ دھوئے نہ

چونکہ ٹخنے بھی اٹھی ہوئی ہڈیاں ہیں اس لئے اسے کعب کہتے ہیں۔ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ چھوٹی طہارت یعنی وضو کے بعد بڑی طہارت یعنی غسل کا حکم دیا واؤ یا تو عاطفہ ہے اور یہ جملہ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ پر معطوف ہے اور اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ کی جزاء ہے لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم نماز کے لئے اٹھو اور ہو جنبی تو غسل کرلو۔ مقصد یہ ہوا کہ نماز کے لئے اٹھنے پر بے وضو پر وضو واجب ہے اور بے غسلے پر غسل ضروری۔ یا واؤ ابتدائیہ ہے اور یہ جملہ نیا ہے۔ تب اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر تم جنبی ہو تو غسل کرلو۔ نماز کی قید نہ ہوگی۔ كُنْتُمْ یا تو اپنے ہی معنی میں ہے یا بمعنی صِرْتُمْ یعنی اگر تم جنبی ہو یا جنبی ہو جاؤ۔ مگر پہلے معنی زیادہ موزوں ہیں۔ کیونکہ جو شخص بحالت کفر جنبی ہو جائے بعد میں مسلمان ہو تو غسل واجب ہے۔ غرض کہ بحالت اسلام جنبی ہو جانا ضروری نہیں لہٰذا كُنْتُمْ اپنے معنی میں ہونا بہتر ہے۔ جنب بنا ہے جنابت سے بمعنی دوری۔ رب فرماتا ہے: فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (قصص:۱۱) یعنی موسیٰ علیہ السلام کی بہن مریم نے دور سے دیکھا اور فرعونیوں کو اس کی خبر نہ تھی اس لئے پرہیز اور بچنے کو اجتناب کہتے ہیں کہ اس میں نقصان دہ چیز سے دوری اختیار کی جاتی ہے۔ کروٹ کو جنب کہتے ہیں کہ جس کی طرف سے کروٹ لے لی جاوے اس سے دوری ہو جاتی ہے۔ چونکہ بے غسلا آدمی نماز، تلاوت، قرآن، مسجد، طواف وغیرہ سے دور رہتا ہے اس لئے اسے جنبی کہا جاتا ہے۔ جُنُبًا اسم جنس ہے واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ فَاطَّهَّرُوْا کی ف جزائیہ ہے۔ اور اطهروا باب تفعل کا امر ہے۔ اصل میں تطهروا تھا۔ ت ط سے بدل کر ط میں ادغام ہوگئی۔ ہمزہ زائد لائی گئی (روح المعانی) مگر قوی یہ ہے کہ باب افعل کا امر ہے۔ اس کا مصدر ہے اطهرو بمعنی خوب پاک ہونا۔ معنی یہ ہوئے کہ اگر تم جنبی ہو تو پاک ہو جاؤ۔ جنابت کی تین صورتیں ہیں شہوت سے منی نکلنا، صحبت کرنا کہ حشفہ غائب ہو جائے، احتلام ہونا۔ خوب پاک ہونے کا مطلب ہے کہ سر سے پاؤں تک کے سارے ظاہری اعضاء دھولو اور منہ میں کلی اور ناک میں پانی ڈال لو کہ یہ دونوں مقام ایک اعتبار سے ظاہری جسم ہیں۔

نکتہ عجیبہ: اللہ تعالیٰ نے وضو میں اعضا کا نام لیا کہ یہ تین عضو دھوؤ اور سر کا مسح کرو۔ مگر غسل میں کسی عضو کا نام نہ لیا بلکہ فرمایا خوب پاکی کرو۔ جس سے معلوم ہوا کہ جنبی کو سارا جسم دھونا فرض ہے نیز اگر یہ عبارت مستقل جملہ ہے تو نکتہ یہ ہے کہ وضو کے لئے ارادۂ نماز کی قید لگائی۔ کہ جب نماز کے لئے اٹھو تو وضو فرض ہے۔ مگر غسل کے لئے یہ قید نہیں بلکہ فرمایا گیا کہ اگر تم جنبی ہو یا جنبی ہو جاؤ تو غسل کرلو۔ معلوم ہوا کہ نماز کے علاوہ اوقات میں بے وضو رہنا گناہ نہیں۔ مگر بلا وجہ بے غسل رہنا گناہ ہے۔ بے نماز آدمی پر صرف نماز نہ پڑھنے کا گناہ ہے لیکن اگر وہ بے غسل رہے تو اس پر نماز نہ پڑھنے کا گناہ بھی ہے اور بے غسل رہنے کا بھی گناہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس گھر میں جنبی (بے غسلا) یا کتا یا جاندار کی تصویر ہو اس میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ یہاں جنبی فرمایا گیا۔ محدث یعنی بے وضو نہ فرمایا گیا۔ ہاں اگر رات میں نہانے کی حاجت ہو جاوے تو اسے اجازت ہے کہ نماز فجر کے وقت غسل کرے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

لئے روزے میں ان جگہوں میں پانی وغیرہ پہنچ جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اگر یہ دونوں اندرونی حصہ ہوتے تو روزہ ٹوٹ جاتا۔
ساتواں فائدہ: اعضاء وضو میں چہرہ دھونا فرض ہے مگر ہاتھ پاؤں پورے دھونا فرض نہیں کیونکہ چہرے کے ساتھ اِلٰی نہ فرمایا گیا۔ ہاتھوں اور پاؤں کے ساتھ اِلٰی ارشاد ہوا ہے۔ یعنی ان دونوں عضوں کے لئے حدود بیان ہوئے۔ **آٹھواں فائدہ:** وضو میں سارے سر کا مسح فرض نہیں۔ بعض سر کا مسح فرض ہے کیونکہ یہاں بِرُءُوْسِكُمْ فرمایا گیا ب کے ساتھ اس بعض کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ ایک بار چوتھائی سر کا مسح کیا، اس سے کم کبھی نہ کیا۔ اگر چوتھائی سے کم کا مسح بھی جائز ہوتا تو حضور بیان کے لئے کبھی کم پر بھی مسح فرماتے (احناف)۔ **نواں فائدہ:** پاؤں پر مسح نہ ہوگا بلکہ انہیں دھویا جاوے گا کیونکہ یہاں ارشاد ہوا وَ اَرْجُلَكُمْ لام پر فتح کے ساتھ جس سے معلوم ہوا کہ یہ وُجُوْهَكُمْ پر معطوف ہے اور اِغْسِلُوْا کا مفعول ہے۔ اگر یہ رُءُوْسِكُمْ پر معطوف ہوتا اور اِمْسَحُوْا کے متعلق ہوتا تو اَرْجُلِكُمْ لام کے کسرہ کے ساتھ ہوتا۔ **دسواں فائدہ:** وضو نماز کے لئے فرض ہے۔ کسی اور عبادت کے لئے فرض نہیں جیسا کہ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ سے معلوم ہوا مگر غسل مطلقاً فرض نہیں جیسا کہ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا سے معلوم ہوا۔ دیکھو کہ اس کی دوسری تفسیر جیسے نماز کے علاوہ بھی ستر کھولنا ننگا رہنا منع ہے ایسے ہی بے غسلا جنبی رہنا منع ہے۔ **مسئلہ:** آٹھ چیزوں سے وضو ٹوٹتا ہے اور پانچ چیزوں سے غسل (۱) پیشاب، پاخانہ کی راہ سے کسی چیز کا نکلنا (۲) بہتا خون جو ظاہر جسم پر بہے (۳) منہ بھر کر قے (۴) سونا یا بیہوشی، نشہ، جنون، رکوع سجدہ والی نماز میں ٹھٹھا مار کر ہنسنا۔ اسباب غسل یہ ہیں۔ منی کا شہوت سے نکلنا، صحبت کرنا، احتلام، حیض، نفاس کا ختم ہونا ان تمام کی تفصیل کتب فقہ میں ملاحظہ فرماؤ۔ یہ مذکورہ پانچ غسل تو فرض ہیں باقی اور موقعوں پر غسل یا سنت ہیں یا مستحب یا جائز جیسے جمعہ۔ عیدین۔ احرام کے وقت عرفات میں پہنچنا حاجی کے لئے، مسلمان ہوتے وقت، میت کو غسل دے کر یہ غسل سنت یا مستحب ہیں۔ ٹھنڈک کے لئے غسل جائز ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب بھی نماز کے لئے اٹھے وضو ضرور کرے خواہ پچھلا وضو ہو یا نہ ہو۔ **ضروری نوٹ:** یہ اعتراض داؤد کا ہے جو فرقہ ظاہریہ کا امام ہے۔ ظاہری فرقہ آیات کے بالکل ظاہری معنی کرتے ہیں، کسی آیت میں کوئی تاویل نہیں کرتے۔ ان مردودوں کے ہاں صرف سؤر کا گوشت حرام ہے، اس کی کلیجی، گردے وغیرہ سب حلال وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں لحم الخنزیر ہی کو حرام کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض بھی انہی کا ہے۔ ان کے لئے ہر نماز کے لئے وضو فرض ہے۔ **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں۔ ایک الزامی دوسرا تحقیقی۔ جواب الزامی تو یہ ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: **اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىٕطِ** (مائدہ:۶) تم میں جو کوئی پاخانہ سے ہو کر آوے وہ وضو کرے تو چاہیے کہ جو آدمی پاخانہ دیکھنے یا کسی بچہ کو رفع حاجت کے لئے بٹھا لینے جاوے اس کا وضو ٹوٹ جاوے اور جو جنگل میں یا نالی پر پیشاب یا پاخانہ کرے کسی کی ہوا نکلے اس کا وضو نہ ٹوٹے کیونکہ یہ شخص پاخانہ ہو کر نہ آیا۔ اگر آیات قرآنیہ کے ایسے معانی کیے جائیں تو دین برباد ہو جاوے گا۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل شریف اس

امت رسول اللہ کا ہے (از تفسیر روح المعانی)۔ یہ اعتراض موجودہ شیعوں کا ہے۔ **جواب:** قرآن مجید کی عام قرأت متواترہ متعاملہ وَ اَرْجُلَكُمْ لام کے فتح سے اور یہ وُجُوْهَكُمْ پر معطوف ہو کر اِغْسِلُوْا کا مفعول ہے۔ تو جیسے منہ اور ہاتھ کا دھونا فرض ہے، مسح کافی نہیں۔ ایسے ہی پاؤں کا دھونا فرض ہے مسح کافی نہیں اَرْجُلِكُمْ لام کے جر سے یہ بھی ایک قرأت ہے۔ ہمارا اس پر بھی عمل ہے کہ چمڑے کے موزے پہنے ہوں تو ہم مسح ہی کرتے ہیں ننگے پاؤں کو دھوتے ہیں۔ اور موزوں پر مسح کرتے ہیں۔ ہمارا عمل دونوں قرأتوں پر ہے۔ مگر تمہارا عمل صرف کسرہ کی قرأۃ پر ہے۔ فتحہ کی قرأت پر نہیں۔ نیز حضور ﷺ اور تمام صحابہ کرام اہل بیت عظام نے ہمیشہ پاؤں دھوئے ہیں کبھی ان پر مسح نہ کیا۔ بغیر چمڑے کے موزوں کا ان کا عمل اس آیت کی تفسیر ہے۔ نیز دھونے میں مسح بھی ہو جاتا ہے مگر مسح میں دھونا نہیں ہوتا کیونکہ ہم پاؤں مل کر دھوتے ہیں۔ ملنا مسح ہے تو ہمارا عمل دونوں قرأتوں پر ہے۔ مسح کرنے والوں کا عمل ایک قرأۃ پر نہیں لہٰذا دھونا ہی چاہیے۔

چھٹا اعتراض: تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حضرت انس، جابر، ابن عباس اور بہت سے صحابہ کرام پاؤں پر مسح کرتے تھے اور وہ حضرات اس مسح پر بہت دلائل دیتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت انس نے ایک بار حجاج ابن یوسف سے کہا کہ پاؤں کا مسح تو حکم خداوندی ہے اور پاؤں کا دھونا تیرا حکم ہے۔ پھر تم لوگ وضو میں پاؤں پر مسح کیوں نہیں کرتے (شیعہ)۔ **جواب:** جی ہاں تفسیر ابن کثیر میں ہے ایک جگہ یہ بھی ہے کہ یہ تمام روایات غریب ہیں ان میں سے صحیح کوئی نہیں۔ اور وہاں ہی پاؤں کے مسح کی پرزور تردید کی ہے۔ پاؤں دھونے کا سخت تاکیدی حکم ہے۔ ابن کثیر کی پوری عبارت دیکھو۔ خود نبی کریم ﷺ اور سارے صحابہ اہل بیت ہمیشہ پاؤں دھوتے تھے، مسح کبھی نہیں کرتے تھے۔ بتواتر ثابت ہے۔ ان کا عمل اس آیت کی تفسیر ہے۔

ساتواں اعتراض: تیمم میں صرف منہ اور ہاتھوں کا مسح ہوتا ہے، سر اور پاؤں کا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ وضو میں پاؤں کا مسح ہی ہوگا سر کی طرح اگر منہ اور ہاتھوں کی طرح پاؤں بھی دھلتے ہوتے تو تیمم میں ان کا بھی مسح ہوتا تیمم میں مغسول اعضاء کا مسح ہے ممسوح اعضاء چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ **جواب:** تمہارا قاعدہ ہی غلط ہے کہ تیمم میں مغسول اعضاء کا مسح ہوتا ہے ورنہ غسل کے تیمم میں سارے جسم کا مسح چاہیے تھا بلکہ گھوڑے کی طرح زمین پر لوٹنا پڑتا کیونکہ غسل میں کسی عضو کا مسح نہیں ہوتا وہاں سارے اعضاء دھونے پڑتے ہیں۔

آٹھواں اعتراض: پیشاب پاخانہ کی نجاست بہت سخت ہے کہ بغیر دھوئے پاک نہیں ہوتے۔ منی کی نجاست معمولی ہے کہ مل دینے یا رگڑ دینے سے بھی پاک ہو جاتی ہے نیز منی انسان کا مادہ ہے۔ انسان نہایت ہی پاک و صاف ہے تو کیا وجہ ہے کہ پیشاب پاخانہ سے صرف چند اعضاء کا دھونا یعنی وضو کرنا فرض ہوا اور منی نکلنے سے تمام اعضاء کا دھونا یعنی غسل فرض ہوا۔ اس کا برعکس ہونا چاہیے تھا۔ **جواب:** وضو، نماز کی رکعات، میراث کی مقدار ہماری عقل و فہم سے وراء ہیں۔ یہ تو تعبدی مسائل ہیں کہ سمجھو مت مان لو۔ اس کی حکمتیں رب تعالیٰ جانتا ہے یا اس کے محبوب ﷺ۔ جہاں تک ہماری عقل کام کرتی ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ پیشاب پاخانہ غذا کھانے کا نتیجہ ہے۔ سب سے پہلے دانہ کھانے والے حضرت آدم علیہ السلام

ظاہری اعضاء کا ہوتا ہے۔ ظاہری پانی سے اور حقیقت معرفت کی نماز کا وضو باطنی اعضاء کا ہوتا ہے۔ تو یہ ندامت وغیرہ کے پانی سے شریعت کی نماز کے ارکان سجدہ وسجود ہیں۔ اس نماز کے رکن ترک موجود ہے۔ شعر

نماز عابداں سجدہ سجودے   نماز عاشقاں ترک وجودے

مگر شریعت کی نماز فرض سب پر ہے۔ گناہ گار ہو یا ولی۔ وہ نماز کسی کسی کو میسر ہوتی ہے اللہ اس قال کو حال بنادے اور وہ نماز بھی نصیب کرے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ
اور اگر ہو تم بیمار یا اوپر سفر کے یا آئے کوئی تم میں سے
اور اگر تم بیمار یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی
مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ
پاخانہ سے یا چھوا تم عورتوں کو پس نہ
قضائے حاجت سے آیا یا تم نے عورتوں سے صحبت کی اور
تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا
پاؤ تم پانی پس قصد کرو تم مٹی پاک کا پس مسح کرو
ان صورتوں میں پانی نہ پایا تو پاک مٹی سے تیمم کرو تو
بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ
تم اپنے چہروں کا اور اپنے ہاتھوں کا اس سے نہیں ارادہ کرتا ہے اللہ کہ بنائے
اپنے منہ اور ہاتھوں سے مسح کرو اللہ نہیں چاہتا کہ
عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ
اوپر تمہارے کوئی تنگی اور لیکن ارادہ کرتا ہے کہ
تم پر کوئی تنگی رکھے ہاں یہ چاہتا ہے کہ
لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ
پاک کرے تم کو اور کہ پورا کردے اپنی نعمت کو اوپر تمہارے شاید کہ تم
خوب ستھرا کرے اور اپنی نعمت پوری کرے تم پر کہ کہیں تم

مختلف مالوں کے مختلف نصاب ہیں سونے کی زکوٰۃ کا نصاب کچھ اور ہے، چاندی کا نصاب کچھ اور، پیداوار کا نصاب اور، جانوروں کا نصاب کچھ اور۔ یونہی نماز بیٹھ کر پڑھنے کی بیماری کی حد کچھ اور ہے، روزہ قضاء کرنے کی بیماری کی حد کچھ اور بلکہ روزہ توڑ دینے کی بیماری کی حد اور، تیمم جائز ہونے کی بیماری کی حد کچھ اور۔ یہاں تیمم جائز کرنے والی بیماری کا ذکر ہے۔ اگر کوئی امیر آدمی گرمیوں میں اپنے وطن میں روزہ نہ رکھ سکے تو ٹھنڈے پہاڑ پر جا کر روزہ رکھے۔ یونہی کوئی بیمار آدمی ٹھنڈے پانی سے وضو نہ کر سکے تو گرم پانی سے کرے۔ تیمم ہرگز نہ کرے عَلٰی سَفَرٍ یہ عبارت مَّرْضٰٓی پر معطوف ہو کر کُنْتُمْ کی خبر ہے عَلٰی سَفَرٍ سے مراد ہے راستہ میں ہونا۔ کسی جگہ بستی میں ٹھہرا ہوا نہ ہونا۔ کہ بستی میں عموماً پانی مل جاتا ہے۔ سفر سے مراد شرعی سفر نہیں جس میں قصر ہوتا ہے۔ مطلقاً راستہ یا جنگل میں ہوتا ہے جہاں کہ پانی نہ ملے۔ خلاصہ یہ کہ تیمم کے جواز کی دو صورتیں ہیں۔ پانی کے استعمال پر قادر نہ ہونا اور پانی موجود نہ ہونا۔ پہلی صورت کو مَّرْضٰٓی میں بیان فرمایا اور دوسری صورت کو عَلٰی سَفَرٍ نے بیان فرمایا یعنی جب تم پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو بیماری کی وجہ سے یا تمہارے پاس موجود نہ ہو۔ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ ہو سکتا ہے کہ یہ اَوْ بمعنی واؤ ہو اور اس عبارت کا تعلق عَلٰی سَفَرٍ سے ہو اور یہ تیمم کے وجوب کی ایک صورت کا بیان ہو مِّنْكُمْ میں خطاب ہر اس مسلمان سے ہے جس پر نماز فرض ہو۔ لہٰذا اس سے حائضہ اور نفاس والی عورت علیحدہ ہے۔ غائطہ نشیبی زمین کو کہتے ہیں اس کی جمع ہے غیطان، جیسے حائط کی جمع ہے حیطان۔ اہل عرب حاجت پوری کرنے کے لئے نشیبی جگہ تلاش کر کے بیٹھتے تھے تاکہ پردہ رہے اور قضائے حاجت پوری کرنے کو کہتے ہیں۔ غائط سے آنا جیسے آج کل بعض دیہاتی اسے جنگل پھر کے آنا کہتے ہیں یہ نہایت نفیس و باریک کنایہ ہوتا ہے یعنی جب تم بستی سے باہر ہو، راہ طے کر رہے ہو اور تم مسافروں میں سے کوئی غایت سے آئے (جنگل پھر کر آئے) مطلب وہ ہی ہوا کہ پیشاب یا پاخانہ کر کے آئے۔ خیال رہے کہ اب پاخانہ کی عمارت کو بھی عربی میں غائط کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اور آج کل کی عربی میں مرحاض کہتے ہیں۔ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ یہ اَوْ اپنے معنی میں ہے۔ اور یہ عبارت جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ پر معطوف ہے اس تیمم کی دوسری صورت کا بیان ہے۔ یعنی غسل کا تیمم لٰمَسْتُمُ بنا ہے ملامسةٌ سے جس کا مادہ ہے لمسٌ۔ عرف میں لمس کہتے ہیں چھونے کو اور ملامسہ کہتے ہیں صحبت کرنے کو۔ نساء سے مراد بیوی یا لونڈی ہیں۔ کیونکہ یہاں لٰمَسْتُمُ میں حلال صحبت مراد ہے اور ہو سکتا ہے کہ لٰمَسْتُمُ سے مراد ہو چمٹنا، پورا پورا چھونا جس سے تمام جسم عورت کے تمام جسم سے مل جاوے۔ پورا مس ہو جاوے جسے مباشرت فاحشہ کہا جاتا ہے۔ یعنی عورت سے ننگے ہو کر چمٹنا کہ شرمگاہیں مل جاویں اس سے وضو ٹوٹتا ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ وضو تم پر واجب ہو جاوے یا اس لئے کہ تم پیشاب پاخانہ کرو یا اس لئے کہ بیوی سے چمٹو۔ مگر پہلے معنی نہایت ہی موزوں ہیں کہ اس میں وضو و غسل دونوں کے تیمموں کا ذکر ہو جاوے گا۔ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً۔ اس عبارت کا تعلق جَآءَ اَحَدٌ اور لٰمَسْتُمُ دونوں سے ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ نہ پانے سے مراد پانی موجود نہ ہونا ہے اور اس کا تعلق اَوْ عَلٰی سَفَرٍ سے ہے مَآءً سے مراد بقدر کفایت پانی ہے۔ یعنی اگر تم سفر میں راستہ طے کر رہے ہو اور اس حال میں تم مسافروں ہی سے کوئی پیشاب پاخانہ کرے جس

دیا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اے مسلمانوں! اللہ تعالیٰ تم پر تنگی فرمانا نہیں چاہتا کیونکہ تم اس کے محبوب کی امت ہو۔ دوسری امتوں پر سخت احکام تھے۔ خیال رہے کہ ناممکن چیزوں کا حکم کسی امت کو نہ دیا گیا اور دشوار چیزوں کا حکم اس امت مرحومہ کو نہیں دیا گیا۔ یہاں یہ ہی بتایا ہے کہ ہم نے تم کو مشکل و دشوار احکام نہیں دیئے۔ آسان حکم دیئے **وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ** یہ جملہ وضو، غسل اور تیمم کے احکام کی حکمتیں بیان فرما رہا ہے۔ یہاں بھی **لِيُطَهِّرَكُمْ** مفعول بہ ہے۔ **يُرِيْدُ** کا لام زائدہ ہے۔ **كُمْ** میں خطاب مسلمانوں سے ہے **لِيُطَهِّرَ** بنا ہے **تطھیر** سے بمعنی خوب پاک وصاف فرمادینا۔ اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ وضو سے صرف وہ اعضا پاک ہوں گے جن کو پانی لگے نہیں بلکہ تم دھوگے چار اعضاء اور اس سے پاک ہو جاوے گا تمہارا سارا جسم، پیشاب، پاخانہ سے تمام جسم پر حدث (بے وضو ہونا) طاری ہو گیا تھا۔ ہم نے چار اعضاء دھلوا کر سارا جسم پاک فرمادیا یہ اس کا کرم ہے۔ دوسرے یہ کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ تیمم سے تمہارے جسم پر ناپاکی رہے گی۔ صرف دب جاوے گی اور تم کو اس دبی ہوئی نجاست کے باوجود نماز کی اجازت دے دی جاوے گی نہیں بلکہ جیسے وضو ناپاکی دور کر دیتا ہے یوں ہی تیمم ناپاکی بالکل دور کر دیتا ہے اور تم تیمم سے بھی یونہی پاک ہو جاتے ہو جیسے وضو سے پاک ہوتے ہو۔ تیسرے یہ کہ تم یہ نہ گمان کرنا کہ وضو غسل یا تیمم سے صرف ظاہری جسم پاک ہوگا اور تم کو نماز کی اجازت ہو جاوے گی۔ بلکہ رب تعالیٰ وضو وغیرہ سے تم کو گناہوں، خطاؤں سے بھی پاک فرمادیتا ہے۔ یہ وضو وغیرہ تمہارے جسم، دل، دماغ، خیال کی پاکیوں کا ذریعہ ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ فرماتے ہیں نبی ﷺ کہ جب انسان وضو میں ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے کیے ہوئے سارے گناہ (صغیرہ) معاف ہو جاتے ہیں، جب کلی کرتا ہے تو منہ سے کیے ہوئے گناہ معاف ہوتے ہیں، جب منہ دھوتا ہے تو آنکھوں کے کیے ہوئے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے گناہ (بدگمانی، برے خیالات) معاف ہو جاتے ہیں، جب پاؤں دھوتا ہے، تو پاؤں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ وضو کی برکت سے بندہ پاک وصاف ہو جاتا ہے اسی لئے ہمارا غسالہ اچھا نہیں۔ اس کے پینے سے مرگی کا مرض پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ پانی ہمارے گناہ لے کر گرتا ہے۔ حضور کا غسالہ شفا ہے کہ وہ نور سے مس ہو کر گرا ہے۔ اس کا بیان انشاء اللہ فوائد میں ہوگا۔ غرض کہ اس عبارت کا تعلق یا صرف وضو سے ہے یا وضو و غسل دونوں سے ہے یا صرف تیمم سے۔ خیال رہے کہ جیسے طبی لحاظ سے بعض اعضاء پر دوا لگانا دوسرے عضو کو فائدہ دیتا ہے۔ کہ تلوؤں میں نمک و گھی کی مالش کرو تو آنکھوں میں دماغ میں ٹھنڈک پہنچتی ہے، دل خوش ہو تو چہرہ کھل جاتا ہے، دل غمگین ہو تو چہرہ مرجھا جاتا ہے۔ یوں ہی طب ایمان کے علاج کا اثر ہے۔ کہ چار اعضاء دھونے سے باقی دوسرے اعضاء بھی پاک ہو جاتے ہیں قالب کو پاک وصاف کرنے سے قلب، دماغ، خیالات، ارادے، نیت پاک وصاف ہو جاتے ہیں **وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ**۔ یہ جملہ **لِيُطَهِّرَكُمْ** پر معطوف ہے، **يُرِيْدُ** کا مفعول ہے۔ اس میں وضو، وغیرہ کی دوسری حکمت کا ذکر ہے۔ اتمام سے مراد نعمت کا مکمل کر دینا وصفا ہم اتمام اور اکمال کا فرق **اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ** (مائدہ: ۳) کی تفسیر میں عرض کر چکے ہیں۔ نعمت سے مراد یا دنیاوی نعمت ہے یا اخروی نعمت۔ دنیاوی نعمت تو وہ ثواب ہے جو غسل و وضو کرنے والے کو عطا

بھی ہوں اور باطن بھی نعمت دوسری نعمت باطنیہ جو بظاہر تکلیف دہ ہوں۔ درحقیقت نعمت۔ باپ اپنے بچے کو اعلیٰ غذائیں، پھل، لباس دیتا ہے۔ یہ ظاہری نعمتیں ہیں اور علم بھی سکھاتا ہے۔ اس پر سختی بھی کرتا ہے۔ یہ باطنی نعمت ہے۔ یہاں نعمت سے مراد باطنی نعمت ہے کہ وضو و نماز بظاہر سختی ہے، پابندیوں کا مجموعہ ہے۔ ایک نماز انسان کو پابندیوں میں جکڑ دیتی ہے۔ نمازی آدمی کا سونا جاگنا۔ پابندی کا کپڑوں جسم پر پابندیاں جماعت کا سچا پابند بلا وجہ سفر نہیں کرتا مگر حقیقت میں یہ ہیں نعمتیں۔ یہاں نعمت سے مراد نعمت باطنیہ ہے۔

نکتہ عجیبہ: اس پوری آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چند دوہری عبادتیں بیان فرمائیں۔ دو طہارتیں ایک اصل ایک بدل۔ چنانچہ وضو اصل ہے تیمم بدل۔ یوں ہی غسل اصل ہے۔ تیمم ان کا بدل۔ ان طہارتوں کے دو سبب۔ وضو کا سبب چھوٹا حدث۔ غسل کا سبب بڑا حدث۔ تیمم کی دو وجہیں۔ پانی نہ ملنا، پانی کے استعمال پر قادر نہ ہونا۔ تیمم کی دو قسمیں۔ چھوٹے حدث سے تیمم یعنی تیمم وضو اور بڑے حدث سے تیمم یعنی تیمم غسل۔ تیمم کے دو رکن یعنی دو دفعہ ہاتھ مٹی سے لگانا۔ ایک بار چہرے کے مسح کے لئے دوسری بار ہاتھ کے مسح کے لئے۔ پھر ان کے چھ فائدے بیان فرمائے۔ خوب پاک ہونا اور رب تعالیٰ کی نعمت کا کامل ہونا جیسا کہ ابھی تفسیر سے معلوم ہوا۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** تیمم جائز ہونے کی صرف دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پانی موجود نہ ہو دوسرے یہ کہ پانی تو ہو مگر اس کے استعمال پر قدرت نہ ہو۔ یہ فائدہ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ سے حاصل ہوا۔ پانی کے استعمال پر قادر نہ ہونے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک ایسی بیماری جس میں پانی کا استعمال مضر ہو دوسرے پانی پر دشمن یا موذی جانور کا قبضہ جو پانی نہ لینے دے جیسے کربلا میں حضرت سید الشہداء جناب حسین رضی اللہ عنہ کو پیش آیا تیسرے یہ کہ وضو کرنے سے ایسی نماز فوت ہو جانے کا اندیشہ جس کی قضا نہیں جیسے نماز عیدین یا نماز جنازہ۔ اگر یہ جارہی ہوں تو تیمم کر کے نماز ادا کرے۔ مگر نماز جنازہ میں یہ حکم غیر ولی کے لئے ہے۔

دوسرا فائدہ: تیمم وضو کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور غسل کے لئے بھی۔ مگر دونوں تیمم ایک ہی طرح ہوں گے۔ یعنی منہ اور ہاتھوں پر مسح سے صرف نیت کا فرق ہو گا۔ یہ فائدہ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ الخ اور اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** سفر یا بیماری میں جب کہ غسل ناممکن ہو اپنی بیوی سے صحبت کرنا بالکل جائز ہے پانی کے خوف سے صحبت ممنوع نہیں۔ یہ فائدہ بھی لٰمَسْتُمُ سے حاصل ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** عربی زبان خصوصاً قرآن مجید کی زبان بہت ہی مہذب ہے کہ اس میں شرمیلے مضمون کو اشارۃً کنایۃً سے بیان کیا جاتا ہے دیکھو یہاں بیوی سے صحبت کو کس قدر لطیف اشارہ سے بیان فرمایا۔ لٰمَسْتُمُ فرمایا اس کے لئے صریحی لفظ بھی عربی میں ہے۔ نَیْکٌ مگر سارے قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال نہیں ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** تیمم میں نیت شرط ہے، وضو میں نیت شرط نہیں۔ دیکھو یہاں بیان تیمم میں فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا الخ علیحدہ فرمایا اور فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ علیحدہ فرمایا۔ تیمم کے معنی ہیں ارادہ کرنا نیت کرنا مگر وضو کے بیان میں

ہی یہ دو بھی آ سکتی ہیں۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ قرآن مجید متن ہے۔ حدیث شریف شرع فقہ گویا اس کا حاشیہ، متن کو حاشیہ اور شرح واضح کرتا ہے یہ چیزیں حدیث پاک اور فقہ سے حاصل ہوئیں۔ یہاں قرآن مجید نے دو وجہوں کا اجمالی ذکر فرمایا ہے پانی استعمال نہ کر سکنے کو مَّرْضٰى سے بیان کیا اور پانی نہ ملنے کو عَلٰى سَفَرٍ سے باقی رہی تفصیل وہ بولتے ہوئے قرآن یعنی نبی کریم ﷺ اور ان کے نائبین علماء نے بیان فرمائیں۔

دوسرا اعتراض: یہاں لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ سے مراد ہے عورتوں کو چھونا، انہیں ہاتھ لگانا۔ عورت کو چھونا وضو توڑ دیتا ہے۔ صحبت کرنا مراد نہیں۔ **جواب:** لٰمَسْتُمْ کے یہ معنی کرنے سے تین خرابیاں ہوں گی۔ ایک یہ کہ اس صورت میں بڑے حدث یعنی جنابت کے تیمم کا ذکر نہ ہوگا۔ حالانکہ یہاں دونوں حدثوں کے تیمم کا ذکر فرمانا مقصود ہے۔ آیت ناقص ہوگی۔ دوسرے یہ کہ لٰمَسْتُمْ کو باب مفاعلة سے لانے کا فائدہ کوئی نہ ہوگا۔ لمس کے معنی ہیں چھونا ملامسة کے معنی ہیں دو طرفہ۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح چھونا یعنی صحبت، تیسرے یہ کہ یہ معنی حدیث پاک کے خلاف ہیں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ جب حضور انور ﷺ نماز تہجد پڑھتے تھے تو میں آپ کے سامنے لیٹی ہوتی تھی، حضور سرکار جب سجدہ فرمانے لگتے تو مجھے ہاتھ لگا دیتے، میں پاؤں سمیٹ لیتی، آپ سجدہ کر لیتے تو میں پاؤں پھیلاتی تھی۔ اگر عورت کو ہاتھ لگانا وضو توڑ دیتا تو دوران نماز میں حضور ام المؤمنین کو ہاتھ نہ لگاتے۔ نیز اگر عورت کو ہاتھ لگنے سے مرد کا وضو ٹوٹ جاوے تو چاہیے کہ عورت کا وضو ہرگز نہ ہو سکے۔ جو دوسرے کا وضو توڑے وہ خود باوضو کیونکر ہوگی۔

تیسرا اعتراض: تم نے وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ (مائدہ:٦) کی تفسیر میں کہا کہ بعض سر کا مسح فرض ہے نہ کہ کل کا کیونکہ یہاں رءُوس پر ب آئی ہے ب سے بعضیت معلوم ہوتی ہے۔ تو یہاں فرمایا گیا بِوُجُوْهِكُمْ یہاں بِوُجُوْهِكُمْ میں ب ہے تو چاہیے تھا کہ تیمم میں بھی بعض چہرے کا مسح ہو نہ کہ کل کا (مالکی حضرات) **جواب:** واقعی ب تو یہ ہی چاہتی تھی۔ مگر چونکہ تیمم میں چہرے کا مسح وضو میں منہ دھونے کے قائم مقام ہے اور وضو میں چہرہ پورا دھلتا ہے اس لئے تیمم میں پورے چہرے کا مسح فرض ہوا۔

چوتھا اعتراض: یہاں ارشاد ہوا۔ اَيْدِيْكُمْ اور ساتھ ہی اِلَى الْمَرَافِقِ ارشاد نہ ہوا۔ تو چاہیے کہ تیمم میں بغل تک ہاتھوں کا مسح فرض ہو کیونکہ پورا ہاتھ بغل تک ہی ہے۔ **جواب:** اس کا جواب بھی اسی مذکورہ جواب سے معلوم ہو گیا کہ چونکہ تیمم میں ہاتھوں کا مسح وضو میں ہاتھ دھونے کے قائم مقام ہے۔ اس لئے وہاں تک ہی مسح کیا جاوے گا جہاں تک وضو میں دھلتا ہے۔

پانچواں اعتراض: اس آیت کے آخر میں فرمایا گیا لِيُطَهِّرَكُمْ اور ارشاد ہوا لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ حالانکہ پچھلی امتوں کو بھی وضو دیا گیا تھا۔ ان کا وضو بھی انہیں پاک کرتا تھا۔ اللہ کی نعمت تھی تو ہم کو خصوصیت سے یہ کیوں فرمایا گیا۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا ہے کہ خوبیاں کی جس سے جسم کے ساتھ دل بھی پاک ہو جاوے۔ یہ صرف اس

جو عہد لیا اس نے تم سے جس کا جب کہ کہا تم نے سنا ہم نے اور اطاعت کی ہم نے اور ڈرو تم اللہ سے

جو اس نے تم سے لیا جب کہ تم نے کہا ہم نے سنا اور مانا اور اللہ سے ڈرو

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

بیشک اللہ جاننے والا ہے سینوں والیوں کو

بے شک اللہ دلوں کی بات جانتا ہے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: پچھلی آیت کریمہ میں عمومی نعمتوں کا ذکر ہوا جو تا قیامت سارے مسلمانوں کو عطا ہوئیں۔ یعنی تیمم کی رعایتیں، وضو کی کراتیں۔ اب ان خصوصی نعمتوں کا ذکر ہے جو صرف حضرات صحابہ کرام کو خصوصیت سے عطا فرمائی گئیں۔ یعنی صحابیت اور حضور کی بیعت جو انہی حضرات کو میسر ہوئیں، ہم لوگوں کو نصیب نہیں۔ **دوسرا تعلق**: پچھلی آیت کریمہ میں تیمم کا ذکر ہوا۔ تیمم وہ فضیلت ہے جو امت رسول ﷺ کو حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ کے صدقہ سے نصیب ہوئی۔ یعنی یہ نعمت متعدی ہے۔ اب اس خاص نعمت کا ذکر ہے جو صحابہ کرام پر لازم رہیں۔ یعنی متعدی فضیلت کے بعد لازم فضیلت کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیات میں غذا، نکاح وغیرہ معاملات پر پابندیاں لگائی گئی تھیں اور وضو و تیمم وغیرہ عبادات کا حکم دیا گیا تھا۔ نفس پر یہ پابندیاں اور عبادت گراں تھے۔ اس لئے اب اس چیز کا ذکر فرمایا جو ان تمام مشکلات کو آسان کر دے۔ یعنی اللہ کی نعمتوں میں غور کرنا اس کے انعام سوچنا کہ اگر یہ کام نفس پر گراں ہوں تو اللہ کی نعمتیں اور اپنے عہد و پیمان سوچ لیا کرو۔ پھر فیصلہ کیا کرو کہ جس منعم کے ایسے انعامات ہیں اس کے احکام ماننا لازم ہیں۔ غرض کہ مشکل چیزوں کا ذکر پہلے تھا اور مشکل کو آسان کرنے والی چیز کا ذکر اب ہے۔ **چوتھا تعلق**: پچھلی آیت کے آخر میں فرمایا گیا تھا تاکہ تم شکر کرو جس سے معلوم ہوا تھا کہ گزشتہ احکام پر عمل کرنا عملی شکر ہے۔ اب قولی شکر کا حکم دیا جا رہا ہے۔ غرض کہ شکر کی ایک قسم کا ذکر پہلے تھا دوسری قسم کا ذکر اب ہے۔

تفسیر

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ یہ جملہ نیا ہے اور واؤ ابتدائیہ ہے اُذْكُرُوْا بنا ہے۔ ذِكْرٌ سے بمعنی یاد کرنا یا یاد رکھنا، یاد دلانا، چرچا کرنا۔ پھر یاد کرنا زبان سے بھی ہوتا ہے، دل سے بھی، عمل سے بھی، جسے ذکر زبانی، ذکر جنانی، ذکر ارکانی کہا جاتا ہے۔ یہاں سارے معنی بن سکتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ اس میں خطاب حضرات صحابہ سے ہے۔ ممکن ہے کہ عام مسلمانوں سے خطاب ہو یا عام انسانوں سے۔ اس لئے نعمت میں بھی تین احتمال ہیں کہ نِعْمَةَ اللّٰهِ سے مراد یا صحابیت ہے یا ایمان و قرآن وغیرہ یا انسانیت اور انسانوں پر اللہ کے احسانات خصوصی ہیں۔ لہٰذا جملہ کی تین تفسیریں ہیں۔ نعمت کے معنی اس کے اقسام اور دنیاوی دینی۔ دینی نعمتوں کی کچھ تفصیل سورۂ فاتحہ کی تفسیر اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے ماتحت بیان ہو چکے۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ قیمت، اجرت، جرمت، نعمت ان چاروں میں فرق ہے۔ قیمت وہ مال جو مال کے عوض

فرمایا کہ اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ہر مسلمان کلمہ پڑھتے وقت رب تعالیٰ سے کرتا ہے۔ اسلام قبول کرنا بھی ایک قسم کا وعدہ ہے۔ اس صورت میں میثاق سے مراد سارے مسلمانوں کے وعدے ہیں۔ جب مسلمان کلمہ طیبہ پڑھتا ہے تو رب کا بندہ ہونے اور حضور کا امتی ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اس اقرار میں رب تعالیٰ کی عبادات، حضور کی اطاعات کا پختہ وعدہ ہے۔ جیسے کوئی کسی کے نوکر یا غلام ہونے کا اقرار کرے اور اس کو اپنا آقا تسلیم کرے تو اس کی اطاعت کا وعدہ کر لیتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یوم الست کے دن کا وعدہ ہے جو تمام روحوں سے لیا گیا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی (اعراف: ۱۷۲) اس صورت میں تمام انسانوں کا وعدہ ہے۔ خواہ مومن ہو یا کافر۔ فقیر کے نزدیک تین تفسیریں قوی ہیں اور اس سے صحابہ کرام کے وعدے مراد ہیں یہ وعدے تفسیر کبیر نے بہت تفصیل سے بیان فرمائے۔ اَلَّذِیْ۔ میثاق کی صفت ہے۔ واثق کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ کُمْ میں وہی تین احتمال ہیں جو ابھی عرض ہوئے۔ کہ اس سے مراد صحابہ کرام ہیں یا تمام مسلمان یا سارے انسان پہلی توجیہ قوی ہے۔ بِہٖ کا مرجع میثاق ہے۔ یعنی اپنا وہ عہد و پیمان بھی یاد رکھو جو اللہ تعالیٰ نے تم سے لیا۔ صحابہ کرام کے وہ عہد اگرچہ حضور نے لیے تھے مگر چونکہ حضور کا عہد لینا رب تعالیٰ کا ہی عہد لینا ہے۔ حضور سے وعدہ رب تعالیٰ سے وعدہ ہے اس لئے واثق کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف بالکل درست ہے (تفسیر خازن و کبیر وغیرہ)۔ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا یہ عبارت واثق کا ظرف ہے۔ اور اِذْ ظرفیہ یا یہ وَاذْکُرُوْا الخ کی علت ہے اور اِذْ تعلیلیہ قُلْتُمْ میں وہ ہی تین احتمال ہیں کہ اس میں خطاب حضرات صحابہ سے ہے یا عام مسلمانوں سے یا تمام انسانوں سے۔ پہلا احتمال زیادہ قوی ہے کیونکہ میثاق کے دن تمام روحوں نے صرف بَلٰی کہا تھا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا نہیں کہا تھا۔ یوں ہی ہر مسلمان ایمان لاتے وقت یہ الفاظ صراحۃً نہیں کہتا۔ سَمِعْنَا اور اَطَعْنَا دونوں ماضی ہیں مگر سَمِعْنَا اپنے ہی معنی میں ہے اور اَطَعْنَا بمعنی مستقبل سَمِعْنَا کا مفعول بہ حضور کے وہ فرمان ہیں جو بروقت بیعت حضور فرماتے تھے۔ اَطَعْنَا کا مفعول وہ فرمان ہیں جو حضور ﷺ عطا فرماتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ سَمِعْنَا بھی بمعنی مستقبل ہو۔ یعنی تم نے عہد کرتے وقت کہا تھا کہ ہم نے آپ کا فرمان سن لیا اور ہمیشہ آپ کے احکام کی اطاعت کریں گے یا ہمیشہ ہم آپ کے فرمان سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اگر یہ خطاب حضرات صحابہ سے ہے تو اس کے معنی ہیں تقویٰ پر قائم رہو۔ کیونکہ صحابہ کرام متقی تو تھے ہی۔ اگر عام مسلمانوں سے خطاب ہے تو معنی ظاہر ہے کہ اللہ سے ڈرو۔ تقویٰ کے معنی اس کے اقسام عام انسانوں، مسلمانوں، اولیاء اللہ، حضرات انبیاء کرام کے تقووں میں فرق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ جیسا متقی ویسا اس کا تقویٰ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ اس جملہ نے گزشتہ سارے احکام کی تائید فرما دی۔ علیم و عالم اور علام کا فرق بارہا بیان ہو چکا۔ ذات مونث ہے۔ ذو کا بمعنی والا۔ لہٰذا ذات کے معنی ہوئے والی الصُّدُوْرِ جمع ہے صدر کی بمعنی سینہ۔ یہاں اس سے مراد دل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ دل والی باتوں کو ہمیشہ سے اچھی طرح جانتا ہے۔ لہٰذا ظاہری تقویٰ کے ساتھ باطنی تقویٰ بھی اختیار کرو۔ اپنے خیالات و ارادے درست رکھو۔ ہمیشہ خیال رکھو کہ ہم تمہارے دلوں کے ارادوں، خطرات سے خبردار ہیں۔

پانچواں فائدہ: کوئی شخص اپنے نیک اعمال پر بھی فخر نہ کرے۔ اسے رب تعالیٰ کی توفیق کا نتیجہ سمجھے یہ توفیق اللہ کی نعمت ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے حضرات صحابہ کرام کے ایمان، صحابیت، عبادات، جہاد وغیرہ کو نعمت اللہ فرمایا۔ ہاں اس پر شکر کرے فخر برا ہے شکر اچھا۔ **چھٹا فائدہ:** بیعت عقبی اور بیعت رضوان والے سارے صحابہ رب تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں۔ جنہیں رب تعالیٰ نے یہ بیعت کا شرف بخشا۔ یہ فائدہ بھی نعمت اللہ سے حاصل ہوا۔ کہ ان بیعتوں کو رب نے نعمت اللہ فرمایا۔ **ساتواں فائدہ:** کوئی شخص کسی درجے پر پہنچ کر صحابہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ تمام غوث و قطب و ابدال صحابہ کی گرد قدم کو نہیں پہنچ سکتے۔ یہ فائدہ "عَلَیْکُمْ" کی ضمیر خطاب سے حاصل ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** تمام انبیاء کے صحابہ سے حضور کے صحابہ افضل ہیں۔ یہ فائدہ بھی اسی "عَلَیْکُمْ" سے حاصل ہوا جس میں فرمایا کہ وہ نعمت یاد کرو جو صرف تم پر کی گئی کسی اور نبی کے صحابہ پر نہ کی گئی سبحان اللہ۔ **نواں فائدہ:** حضرات صحابہ نے حضور سے کیے ہوئے سارے وعدے پورے کیے، وہ اپنے وعدوں کے سچے تھے۔ کیونکہ یہاں رب تعالیٰ نے ان کے وعدوں کا ذکر تو فرمایا مگر ان کی مخالفت وعدہ کا ذکر نہ فرمایا۔ یعنی یہ تو فرمایا کہ تم نے کہا تھا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا مگر یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ عہد پورا نہ کیا۔ غرض کہ اسی آیت کریمہ نے حضرت صحابہ کرام کے وہ مناقب بیان کیے کہ سبحان اللہ۔ **دسواں فائدہ:** اپنے فضائل و مناقب بطور شکر یہ لوگوں کو سنانا جائز بلکہ بہتر ہے۔ یہ فائدہ وَاذْكُرُوْا کی تیسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ اس کے معنی یہ کیے کہ اے صحابہ! اللہ کی جو نعمت تم پر ہے وہ لوگوں سے ذکر کرو کہ ہم کو رب نے یہ انعام دیا۔ حضور فرماتے ہیں اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ میں اولاد آدم کا سردار ہوں۔ یہ فرمان رب کے شکر کے لئے ہے نہ کہ فخر و بڑائی کے طور پر۔ **گیارھواں فائدہ:** کیے ہوئے وعدے یاد دلانا سنت الٰہیہ ہے جیسا کہ مِیْثَاقَهُ کی تفسیر سے معلوم ہوا۔ **بارھواں فائدہ:** حضور سے وعدہ رب تعالیٰ سے وعدہ ہے۔ یوں ہی حضور کا وعدہ رب تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ جیسا کہ وَاثَقَ سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ سے وعدہ لیا تھا حضور نے مگر فرمایا کہ رب نے وعدہ لیا کیونکہ آپ رب تعالیٰ کے مختار خاص ہیں۔ **تیرھواں فائدہ:** وعدہ پورا کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ رب نے فرمایا اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ (اسراء: ۳۴) اور فرمایا اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (بقرہ: ۴۰) حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مریم: ۵۴) اور فرمایا: وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤى (نجم: ۳۷) ہمارے حضور کو نبوت سے پہلے کفار صادق الوعد کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ جو شخص وعدہ کا پختہ ہو جاوے تو اس کے کیے ہوئے وعدے رب تعالیٰ بھی پورے فرماتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے لو اقسم علی اللہ لا برہ۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہاں نِعْمَةَ اللّٰهِ واحد کیوں ارشاد ہوا۔ حضرات صحابہ پر تو بہت سی نعمتیں ہیں۔ نعماء اللہ جمع فرمانا چاہیے تھا۔ **جواب:** تفسیر سے معلوم ہوا کہ یہاں نعمت جنس ہے جو واحد و جمع سب کو شامل ہے۔ یعنی جنس نعمت میں غور کرو کون ہے جو رب تعالیٰ کی نعمتیں گن سکے یا نعمت سے مراد خاص نعمت ہے یعنی صحابیت جس میں تمام نعمتیں داخل ہیں (تفسیر کبیر)۔

تجھی کو دیکھنا تیری ہی سننا تجھ میں گم ہونا
حقیقت معرفت اہل طریقت اس کو کہتے ہیں
ریاضت نام ہے تیری گلی میں آنے جانے کا
تصور میں تیرے رہنا عبادت اس کو کہتے ہیں

کیا لطف ہے کہ اس قرآن نے ایک جگہ فرمایا فَاذْكُرُونِیْٓ اَذْكُرْكُمْ (بقرہ: ۱۵۲) تم مجھے یاد کرو۔ یہاں فرمایا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ اللہ کی نعمت یعنی محمد رسول اللہ کو یاد کرو۔ اور اپنا وہ وعدہ اور عہد بھی یاد رکھو جو تم میثاق کے دن ہم سے کر گئے تھے۔ ہماری الوہیت اور ان محبوب کی نبوت پر ایمان لانے۔ عہد ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کے جھگڑوں میں پھنس کر ہمارا عہد و پیمان بھول جاؤ۔ ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ جسم سے اور کام بھی کرو مگر دل میں دھیان ہمارے محبوب کا رکھو۔ ہم دل کی باتوں کو جانتے دیکھتے ہیں۔ اگر تمہارا دل ہمارا کاشانہ بن گیا تو وہاں دنیا نہ پہنچنے پائے گی۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ جیسے شہر میں تمام مکانات، عمارتیں انسانوں کی ہوتی ہیں۔ جہاں نماز اور تلاوت بھی ہوتی ہے اور دنیاوی کام بھی۔ مگر مسجدیں خاص اللہ کی جہاں صرف عبادات ہوتی ہیں ایسے ہی انسان کے دوسرے اعضاء سے دنیاوی کاروبار بھی کیے جاویں اور اللہ کا ذکر بھی مگر دل صرف اللہ کی یاد کے لے ہونا چاہیے اور جیسے کوٹھی میں سارے کمرے دوسرے کاموں کے لئے مگر مالک کے آرام کا کمرہ صرف مالک کے لئے۔ وہاں نہ کوئی سامان رہے نہ کوڑا کچرا۔ یونہی اے انسان! تیرا دل صرف خدا خانہ ہو جہاں یار کے سوا کچھ نہ ہو۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ کی ہر وقت وہاں تجلی ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ
اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو جاؤ تم قائم رہنے والے واسطے اللہ کے گواہ
اے ایمان والو اللہ کے حکم پر خوب قائم ہو جاؤ انصاف کے
بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا
ساتھ انصاف کے اور نہ اکسائے تم کو عداوت کسی قوم کی
ساتھ گواہی دیتے اور تم کو کسی قوم کی عداوت اس پر
تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ
اوپر اس کے کہ نہ انصاف کرو تم انصاف کرو وہ زیادہ قریب ہے پرہیزگاری کے
نہ ابھارے کہ انصاف نہ کرو انصاف کرو وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے

قوام کی جو مبالغہ ہے قیام کا بمعنی بہت ہی قائم رہنے والے یا بہت ہی قائم رکھنے والے۔ دوسرے معنی پر اس کا مفعول پوشیدہ ہے احکام اللہ یالاوامر اللہ یالحقوق اللہ۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا ترجمہ دونوں احتمال پر درست ہے اگر "کُوْنُوْا" تامہ ہے تو قَوّٰمِیْنَ حال ہے اگر ناقصہ ہے تو قَوّٰمِیْنَ اس کی خبر ہے۔ یعنی اے مسلمانو! اللہ کے لئے قائم رہو کہ تمہاری زندگی اور زندگی کا ہر حال نفس کے لئے نہ ہو، رب تعالیٰ کے لئے ہو۔ تمہاری موت اس کے لئے ہو اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (انعام: ۱۶۲) غرض کہ تمہاری زندگی وموت نہ شیطانی ہو، نہ نفسانی ہو بلکہ رحمانی یعنی رحمان کے لئے ہو (تفسیر خازن عن ابن عباس)۔ خیال رہے کہ ہر چیز کسی مقصد کے لئے بنائی جاتی ہے جب تک اس کا مقصد پورا ہوا س کی قدر ہوتی ہے، بیکار ہونے پر پھینک دی جاتی ہے۔ ہماری زندگی کا مقصد اللہ کی اطاعت ہے اگر ہم نے یہ مقصد پورا کیا تو ہماری قدر ہے ورنہ ہماری زندگی بیکار ہے۔ جمادات، حیوانات بلکہ ہر چیز میں یہ قائدہ جاری ہے۔ گھڑی وقت دے تو اس کی جگہ جیب ہے۔ اگر ٹھہر جائے تو اس کی جگہ کوڑا گھر، بھینس دودھ دے، بیل کھیتی کرے تو اس کی جگہ ہمارے گھر میں ورنہ بیکار ہونے پر اس کی جگہ ذبح خانہ ہے۔ یہ باتیں دیکھو اور عبرت پکڑو تمہارے مملوک جانور تمہارے ہر حکم پر صابر وشاکر ہیں اور تم ان کی ہر طرح خبر گیری کرنے والے۔ تم ہمارے ہر حکم پر صابر وشاکر و فرمانبردار رہو۔ ہم ہر طرح تمہاری خبر رکھیں گے یا اے مسلمانوں! اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو قائم کرنے، قائم رکھنے والے ان پر قائم پابند رہو۔ حتی کہ اگر تم کو بادشاہت ملے تو وہ بادشاہت تمہاری نہ ہو بلکہ ہماری حکومت ہو۔ تم ملک میں ہمارے قوانین نافذ کرو۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (حج: ۴۱) غرض کہ اس فرمان کی دو تفسیریں ہیں ہر تفسیر دریا ناپید کنار ہے۔ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ یہ یا تو "کُوْنُوْا" کی دوسری خبر ہے یا دوسرا حال یا قَوّٰمِیْنَ کا بدل پہلے دو احتمال قوی ہیں شُھَدَآءَ جمع ہے شہید یا شاھد کی بمعنی گواہ بِالْقِسْطِ کی ب مصاحبت کی ہے۔ بمعنی ساتھ، قسط کے معنی بارہا بیان ہو چکے کہ اس کے معنی حصہ بھی ہیں اور انصاف بھی۔ یہاں بمعنی انصاف ہے۔ شہادت بہت عام ہے۔ اللہ ورسول کی گواہی، اپنے نفس کی گواہی، دوسروں کے متعلق گواہی، مقدمات میں گواہی یہ سب اس میں داخل ہیں۔ ہر گواہی میں انصاف لازم ہے کہ سچی گواہی دی جائے اگرچہ وہ گواہی اپنے عزیز کے خلاف ہو یا دشمن کے موافق ہو کسی کی رعایت سے یا کسی کی دشمنی سے جھوٹی گواہی نہ دو قسط سے بنا ہے قسطاس بمعنی ترازو کا پلہ۔ کیونکہ اس کے ذریعے حصے برابر کیے جاتے ہیں۔ غرضیکہ گواہی کی پانچ صورتیں ہیں۔ اللہ کی ذات وصفات کی گواہی، حضور ﷺ کی صفات حمیدہ کی گواہی، اپنے نفس کے قصور وجرم کی گواہی، شریعت کے حقوق کی گواہی، کسی حقدار کے حق کی گواہی۔ آخری دو گواہیاں تو حاکم کی عدالت میں ہوتی ہیں اور کسی کسی کو کبھی کبھی ان کا موقعہ ملتا ہے۔ مگر پہلی تین گواہیاں ہر مسلمان ہر وقت دے کہ یہ مدار ایمان وتقویٰ ہے۔ نیز آخری دو گواہیاں صرف زبان سے ہوتی ہیں مگر پہلی تین گواہیاں دل، زبان اور کان سب سے ادا ہوتی ہیں حتی کہ شہید اپنے خون کے قطروں سے وہ گواہیاں دیتا ہے۔ آج ہم اللہ رسول کی گواہی دیں کل حضور ہماری گواہی دیں گے۔ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ یہ جملہ کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ پر معطوف ہے لَا یَجْرِمَنَّ

سے خوف خدا ہوتا ہے۔ یعنی سزا کا خوف اور نیک کاروں کو نیکیاں قبول نہ ہونے کا خوف کہ ہماری نیکیاں اس بارگاہ کے لائق نہیں۔ مگر ابرار کو بارگاہ الٰہی کی ہیبت کا خوف لہٰذا گناہ گار، پرہیزگار اور ابرار کے خوف میں بہت فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو آخری درجہ یعنی گناہ گاروں کا خوف ہی عطا فرمائے۔

خلاصہ تفسیر تفسیر سے معلوم ہو چکا ہے کہ اس آیت کریمہ کی بہت سی تفسیریں ہیں۔ ہم ان میں سے ایک تفسیر کا خلاصہ عرض کرتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے پانچ چیزوں کا تاکیدی حکم دیا۔ "قوام للہ" رہنا۔ انصاف سے گواہی دینا، جوش غضب میں بے انصافی نہ کرنا، ہمیشہ عدل و انصاف کرنا، اللہ سے ڈرنا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے۔ ہمیشہ اللہ کی رضا کے لئے اس کے تمام احکام پر خوب مضبوطی سے قائم رہو۔ گواہ بنو تو انصاف سے گواہی دو۔ اپنی گواہی میں اپنے پرائے کا لحاظ نہ کرو۔ اگر اپنی ذات یا اپنے عزیز کے خلاف گواہی دینا پڑے تو دے دو۔ اگر دشمن کے موافق دینا پڑے تو دے دو اور کسی قوم کی عداوت و بغض کی وجہ سے عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑو ہمیشہ انصاف کرو۔ بات کہو انصاف کی، فیصلہ کرو انصاف کا، بدلہ لو تو انصاف سے کہ یہ عدل و انصاف مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہمیشہ ہر حال میں ہر شخص کے ساتھ ہر طرح عدل و انصاف کرو۔ یہ عدل و انصاف تقویٰ سے بہت ہی قریب ہے۔ عادل شخص بہت جلد متقی و پرہیزگار بن جاتا ہے، ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ جان رکھو کہ اللہ تمہارے تمام اعمال سے خبردار ہے۔ خبیر و قدیر حاکم سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیے۔ خیال رہے۔ کہ **الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** کے خطاب میں حضور ﷺ کا داخل ہونا لازم نہیں۔ حضور کے لئے خطاب **يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ**، **يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ** **يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ** ہیں۔ یہاں بھی عدل و انصاف تقویٰ کا حکم مسلمانوں کو دیا گیا۔ حضور ﷺ تو پیدائشی عادل اور بے مثال انصاف فرمانے والے ہیں۔ جو ذات کریم شیر خوارگی میں جناب حلیمہ کا صرف ایک پستان چوسیں۔ دوسرا پستان حلیمہ کے بچے کے لئے چھوڑ دیں۔ ان سے بے انصافی کا اندیشہ ہی نہیں ہوسکتا۔ شعر

بھائیوں کے لئے ترک پستان کریں
بچپنے کی نصافت پہ لاکھوں سلام

فائدے اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** تمام نیک اعمال پر ایمان مقدم بلکہ شرط جواز اور شرط قبول ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے عدل و انصاف وغیرہ معاملات کا خصوصیت سے مومنین کو حکم دیا۔ پہلے **الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** سے خطاب کیا پھر یہ احکام دیئے۔ **دوسرا فائدہ:** ہر مومن کو چاہیے کہ صرف عبادت پر ہی کفایت نہ کرے بلکہ عبادات و معاملات دونوں درست کرے جیسا کہ **قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ** اور **شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ** سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** کسی کو اس کی پیدائش سے پہلے یا وفات کے بعد یا اس کی غیر موجودگی میں پکارنا شرک نہیں۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ان جیسی آیات میں **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** فرما کر قیامت تک کے مسلمانوں کو پکارا۔ جو اس ندا کے وقت

مومن وکافر کا فرق نہ رہے۔ حق فیصلہ کرے، امانت، قرض کافر کا بھی ادا کرے وعدے عہد جو کفار سے کیے ہوں وہ بھی پورے کرے۔ دیکھو رب تعالیٰ شنان قوم یعنی کفار سے عداوت کی ممانعت نہ کی بلکہ انصاف نہ کرنے کی ممانعت فرمائی۔ **دسواں فائدہ:** عدل کے بہت درجے ہیں۔ اپنے اور رب تعالیٰ کے معاملہ میں عدل، آس پڑوسیوں سے عدل، عزیزوں دوستوں سے عدل مسلمانوں کے ساتھ عدل مملوک جانوروں، غلاموں سے عدل اپنے میں اور نبی ﷺ کے معاملہ میں عدل، اپنے اور ماں باپ کے معاملہ میں عدل، اپنے میں اور عزیزوں کے درمیان عدل، آس پڑوسیوں سے عدل، عزیزوں دوستوں سے عدل، مسلمانوں کے ساتھ عدل، مملوک جانوروں غلاموں سے عدل، بیوی بچوں کے درمیان عدل اور مدعی مدعا علیہ کے درمیان عدل۔ آخری عدل تو صرف حکام بادشاہ کریں گے مگر باقی عدل ہر مسلمان کرے۔ ہم کسی کی تنخواہ لے کر اس کے ہو جاتے ہیں تو کتنی بے انصافی ہے۔ رب کی نعمتیں استعمال کر کے اس کے نہ ہو رہیں۔ جب رب نے دنیا کی تمام چیزیں ہمارے لئے بنائیں تو ہم اس کے لئے کچھ نہ کریں بڑی بے انصافی ہے۔ دنیا کے معمولی کام کے لئے بارش وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر معمولی بہانہ سے نماز یا مسجد چھوڑ دیتے ہیں۔ کتنی بے انصافی ہے نیز ہر نعمت ہم کو حضور کے ہاتھوں ملی۔ اگر حضور کی عظمت و اطاعت نہ کریں تو کیسی بے انصافی ہے۔ ہر ادنیٰ چیز اعلیٰ پر قربان ہوتی ہے۔ جمادات، نباتات پر اور نباتات حیوانات پر، حیوان انسان پر قربان۔ یونہی مال جسم پر جسم جان اور جان عزت پر قربان کرتے ہیں تو ہم کیوں نہ قربان ہوں اس محبوب حقیقی ﷺ پر یہ کتنی بے انصافی ہے۔ پھر اپنے ماں باپ کے معاملہ میں انصاف کرو کہ یہ تمہاری بے کسی کے وقت کے ساتھی ہیں۔ سب رشتہ دار تم کو بعد میں کام آئے مگر یہ تمہارے اس وقت کام آئے جب تمہارا مددگار کوئی نہ تھا اب تم بھی ان کے ایسے وقت خدمت کو تیار رہو۔ جب ان کے اعضا بھی جواب دے جائیں۔ اولاد، عزیز و اقارب کے درمیان انصاف کرو۔ تمام بیویوں اور اولاد کو ایک نظر سے دیکھو۔ غریب عزیزوں کی خدمت کرو تمہیں رب نے زیادہ مال اس لئے دیا ہے کہ اس میں غریبوں کا بھی حصہ ہے۔ پڑوسیوں مسلم قوم کے ساتھ عدل کرو غرضیکہ اس ایک جملہ میں بہت گنجائش ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں فرمایا گیا کہ تم کسی قوم کی عداوت میں بے انصافی نہ کرو تو کیا کسی شخص کی عداوت میں ناانصافی کرنا جائز ہے۔ بے انصافی تو بہر حال بری چیز ہے خواہ کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے کی جاوے۔ پھر قوم کی عداوت کی قید کیوں لگائی؟ **جواب:** شخصی عداوت معمولی اور عارضی ہوتی ہے۔ قومی عداوت ذاتی اور دائمی ہوتی ہے۔ بعض مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے شخصی دشمن بن جاتے ہیں مگر قومی دشمن نہیں بن سکتے۔ اگر قومی دشمن بنیں تو کافر ہو جاویں۔ مگر پھر یہ شخصی دشمنی عارضی چند روزہ ہوتی ہے۔ جب کفر و اسلام کا سوال پیدا ہو جائے تو یہ تمام دشمن ایک ہو کر کفر کے مقابلہ میں جان دے دیتے ہیں۔ دیکھو آج پاکستان بنے اٹھارہ سال ہو گئے۔ مگر رن کچھ، لاہور، سیالکوٹ وغیرہ محاذوں پر جب کفار نے یلغار کی اور ان سے ہم مسلمانوں کی جنگ صرف سترہ دن رہی۔ ان سترہ دن میں پاکستانی مسلم قوم میں وہ اتحاد و یگانگت ہو گئی کہ ساری سیاسی، مذہبی جماعتیں شیر و شکر ہو کر دشمن کے مقابل سینہ سپر

جواب سے معلوم ہو گیا کہ جب انتہائی غیظ و غضب میں ناانصافی جائز نہ ہوئی۔ تو معمولی غصہ میں کیوں کر جائز ہو گی۔ آیت کریمہ نے بے انصافی کی جڑ کاٹی ہے جس سے شاخیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

ساری عبادات انسان کی زندگی سے وابستہ ہیں کہ مرتے ہی ختم ہو جاتی ہیں مگر قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ یعنی قائم للہ باقی باللہ ہونا وہ عبادت ہے کہ مرے بعد بھی مومن سے جاری ہوتی ہے۔ جس کی زندگی اور زندگی کا ہر شعبہ لِلّٰہ ہو تو اس کی موت اور موت کے بعد کا ہر حال بھی للہ ہی ہوتا ہے۔ اس کی موت کی حقیقت یہ ہوتی ہے۔ شعر

مرگ مومن چیست ہجرت سوئے یار ترک ایں عالم و رفتن کوئے یار

مومن کی موت یار کی طرف ہجرت ہے۔ اس دنیا کو چھوڑ کر یار کی گلی میں جا بسنا ہے۔ یہاں عمل پر قائم رہنا ہے وہاں یار کے دربار میں قائم رہنا جو کسی چیز کے سہارے پر ہو تو اگر سہارا مضبوط و قوی ہے وہ چیز قوی اور اگر سہارا کمزور ہے تو وہ چیز کمزور۔ اگر بنیاد قوی ہے تو دیوار قوی اور اگر دیوار قوی ہے تو چھت قوی۔ بغیر سہارا پتہ ہو تو جنگل میں اڑتا پھرتا ہے۔ اگر کسی مضبوط پتھر کا سہارا مل جائے تو پھر اسے کوئی آندھی نہیں اڑا سکتی۔ اگر مومن کی زندگی اللہ کے سہارے پر ہو تو اللہ تو باقی ہے، مومن بھی باقی ہو جاتا ہے اسے موت بھی فنا نہیں کر سکتی اس کی موت وصال یار ہے۔ دنیا میں انصاف والی گواہی دو توحید کی، رسالت کی، حشر نشر کی، قرآن مجید کی حقانیت کی سچی گواہی دو تا کہ کل قیامت میں یہ چیزیں تمہاری گواہی دیں بلکہ اپنے گناہوں کا اقرار کر کے اپنے خلاف یہاں دنیا میں گواہی دیتے رہو تا کہ کل قیامت میں تمہارے اعضاء تمہارے حق میں گواہی دیں۔ یونہی اللہ کے دوستوں اس کے دشمنوں کے بلکہ اپنے نفس و قلب و روح کے درمیان عدل و انصاف کرو۔ اپنے بیوی بچوں دوست و دشمن میں عدل کرو تا کہ تم پر رحم کیا جاوے۔ عیش و طیش یہ دو حالتیں انسان کو عدل سے ہٹا دیتی ہیں۔ تم ان دونوں حالتوں میں عدل کرو۔ کسی قوم کے خلاف طیش میں آ کر ظلم نہ کرو تا کہ متقی بن جاؤ۔ یہاں تفسیر روح البیان میں ہے کہ نوشیرواں کے تخت پر لکھا تھا کہ ملک بغیر امارت نہیں چلتا اور امارت یعنی حکومت بغیر مردوں کے نہیں چلتی اور انسان بغیر عدل کے مرد نہیں بنتا۔ اللہ تعالیٰ سچی گواہی اور انصاف کی توفیق دے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ

وعدہ فرمایا اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور کام کئے انہوں نے اچھے

ایمان والے نیکوکاروں سے اللہ کا وعدہ ہے

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

کہ ان کے لئے بخشش ہے اور ثواب بڑا اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا

ہے جنت یا اس کا مفعول بہ ہے کہ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ لَهُمْ میں لام ملکیت یا نفع کا ہے هُمْ کا مرجع الَّذِيْنَ ہے لَهُمْ کے مقدم فرمانے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ اور یہ حصر ان دونوں چیزوں کے لحاظ سے ہے۔ یعنی بخشش اور بڑا ثواب صرف نیک کار مومنوں کے لئے ہے۔ رہے گناہ گار مومن ان کے لئے مغفرت تو ہے مگر اجر عظیم نہیں بلکہ انہیں جنت وغیرہ کی عطاء، فضل ربانی اور شفاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نصیب ہوں گے۔ اجر معاوضہ کو کہا جاتا ہے۔ جب ان کے پاس اعمال ہی نہیں یا ہیں مگر اجر عظیم کے لائق نہیں تو انہیں فضل ملے گا۔ لہٰذا حصر درست ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ۔ یہ جملہ نیا ہے اور واؤ ابتدائیہ ہے۔ یہ وَعَدَ کا مفعول نہیں کیونکہ وعدہ اچھی چیز کا ہوتا ہے۔ عذاب کا وعدہ نہیں ہوتا، وعید ہوتی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہاں الَّذِيْنَ سے مراد تمام کفار ہیں۔ خواہ انسان ہوں یا جنات کیونکہ عذاب سارے کفار کو ہوگا۔ آیات سے مراد آیات قرآنیہ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات اور احکام الٰہیہ سب ہی ہیں۔ خیال رہے کہ ہر کفر تکذیب ہے اور ہر کافر اللہ کی آیتوں کا جھٹلانے والا ہے خواہ دانستہ طور پر ہو جیسے کفار کے علماء۔ پوپ پادری وغیرہ یا بے خبری سے کافر جیسے وہ جو اپنے پیشواؤں کی پیروی میں کافر ہوئے۔ کیونکہ جھٹلانے والے کی پیروی کرنا بھی جھٹلانا ہے۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ یہ عبارت وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا کی خبر ہے جحیم یا تو دوزخ کا نام ہے یا اس کے خاص طبقہ کا نام۔ خیال رہے کہ دوزخ میں جانا اور ہے مگر دوزخ والا ہونا کچھ اور مکان میں جانا رہنا اور ہے مگر مکان والا ہونا کچھ اور۔ کرایہ دار یا ہمارا ملاقاتی جو مہمان بن کر ہمارے گھر آوے وہ مکان میں آتا ہے اور رہتا تو ہے مگر مکان والا نہیں۔ گناہگار مسلمان اگرچہ عارضی طور پر دوزخ میں جائیں گے مگر دوزخ والے نہ ہوں گے، دوزخ والے صرف کفار ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ واضح ہے۔ یعنی جنہوں نے ایک بار بھی کفر و تکذیب اختیار کر لیا اور اس پر قائم رہے وہ دوزخ والے ہیں۔ دوزخ ان کا ہے وہ دوزخ کے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ میں اللہ کریم و رحیم کے ایک بڑے اہم وعدہ کا ذکر ہے۔ کریم کے وعدہ فرمانے کی چار صورتیں ہوتی ہیں کسی بندے نوا سے فرما دینا کہ اس مضمون کی عرضی ہم کو دے دو۔ وہ بے نوا یقین کرتا ہے کہ کریم نے عطا کا وعدہ فرما لیا ہے۔ کسی بھکاری سے کہہ دینا کہ کل مانگنے آنا۔ یہ بھی وعدہ ہے۔ کسی سے فرما دینا کہ ممکن ہے ہم تم کو کچھ دیں یہ بھی وعدہ ہے۔ صاف صاف کہہ دینا کہ ہم تم سے یہ دینے کا وعدہ کرتے ہیں، یہ بڑا ہی اہم وعدہ۔ قرآن کریم میں وعدہ کی یہ چاروں صورتیں استعمال ہوئی ہیں۔ دعاؤں کی آیات نازل فرمائیں۔ عرضی دینے کے لئے ہم کو آستانہ عالیہ پر حاضری کا حکم دیا۔ یہ بھی وعدہ ہے۔ ہم سے فرمایا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یہ بھی وعدہ ہے۔ اپنے حبیب سے فرمایا: عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (الاسراء: ۷۹) یہ بھی وعدہ ہے اور یہاں صراحتہً وَعَدَ اللّٰهُ فرمایا یہ بھی وعدہ یہاں چوتھی قسم کا وعدہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی دو قسمیں ہیں بلاواسطہ وعدے جو بذریعہ وحی کتاب اللہ میں کیے گئے اور بالواسطہ وعدے جو پیغمبر نے خود کسی سے کر لئے وہ بھی ربانی و رحمانی وعدے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں کسی مسلمان کا نام لے کر کوئی وعدہ نہیں فرمایا گیا۔ حضور انور نے نام بنام صحابہ سے وعدے کیے کہ ابوبکر جنتی، حسنین جنتی جوانوں کے سردار ہیں یہ سب

موقوف ہے۔ مسلمانوں کے بچوں کو جنت وہی یعنی ماں باپ کے طفیل ملے گی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (طور: ۲۱) عطا کی جنت ان لوگوں کو ملے گی جنہیں جنت بھرنے کے لئے پیدا فرمایا جاوے گا۔ دوسرے یہ کہ یہاں دو قیدیں اجر عظیم کے لئے ہے۔ نیک کاروں کے لئے اجر عظیم ہے اور ہم جیسوں کے لئے فضل عظیم۔ اجر تو اس کو ملے جس کے پاس اجرت کی چیز ہو۔ شعر

یا رب تیرے فضل و کرم ہوں میرے گواہ صفائی کے

ورنہ رضا سے چور پہ تیرے ڈگری تو اقبالی ہے

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ دوزخی صرف وہ ہی کافر ہیں جو آیات الٰہیہ کا جھٹلانے والا بھی ہو تو چاہیے کہ جو صرف کافر ہو۔ آیات الٰہیہ کا جھٹلانے والا نہ ہو۔ وہ دوزخی نہ ہو حالانکہ ہر کافر دوزخی ہے۔ **جواب:** اس کے بھی دو جواب ہیں ایک یہ کہ ہر کافر اللہ کی آیت کا انکاری ہے۔ اگر انکاری نہ ہو تو کافر کیسے ہو۔ حضور کی نبوت کا انکار کرنا ہی آیات الٰہیہ کا انکار ہے وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ۔ یہ جملہ كَفَرُوْا کی تفسیر ہے۔ دوسرے یہ کہ اصحاب جحیم ہونا یعنی دوزخ کے سخت ترین طبقے میں رہنا یہ ان کافروں کے لئے جو منکر آیات بھی ہیں۔ تقلیدی کافر ہلکے طبقے میں ہوں گے۔ یعنی یہاں جحیم سے مراد دوزخ کا خاص طبقہ ہے۔ جہاں عذاب بہت سخت ہے۔

تیسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر متقی مومن کی بخشش ہے اور بخشش تو گناہ سے ہوتی ہے۔ جن کے گناہ ہی نہ ہوں۔ جیسے حضرات انبیائے کرام یا خاص صحابہ کرام اور خاص اولیاء اللہ ان کی بخشش کیسی پھر یہ آیت عام کیسی ہوئی؟ **جواب:** اس کا جواب ابھی فائدوں میں گزر گیا کہ گناہوں کی بخشش گناہ گاروں کے لئے ہے۔ خطاؤں کی بخشش نیک کاروں کے لئے ہے۔ عبادات میں قدرے کوتاہی کی بخشش مقبولین کے لئے ہے۔ شعر

زاہداں از گناہ توبہ کنند عارفاں از اطاعت استغفار

چوتھا اعتراض: اگر وَعَدَ اللّٰهُ میں معراج کی رات والی خلوت خاص کا وعدہ فرمایا۔ تو وہ وعدہ رب تعالیٰ نے حضور اقدس سے کیا نہ کہ مسلمان سے تو وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فرمانا کیوں کر درست ہوا؟ **جواب:** غلاموں کے متعلق آقا سے جو وعدہ کیا جائے وہ غلاموں سے ہی وعدہ ہوتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ ہمارے سب کے آقا و مولیٰ ہیں اور اس رات تو ساری امت کی نمائندگی بھی فرما رہے تھے۔ لہٰذا وہ وعدہ سب سے ہوا۔ حضور کی معرفت ہوا۔ جیسے رب تعالیٰ نے مسلمانوں کی جان و مال جنت کے عوض خرید لی حالانکہ اس خرید و فروخت کی ہم کو خبر نہیں۔ وہ بھی حضور ہی کی معرفت ہوئی ایسے ہی یہ وعدہ۔

تفسیر صوفیانہ

اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش عام ہے مگر اس کے لینے والے صرف مومن ہیں ادھر کی عطا میں کمی نہیں۔ اس طرف کے لینے میں کمی ہے جیسے سورج اور بارش کا فیض عام ہے مگر اندھا آدمی نہیں نور لیتا۔ اور کھاری زمین سبز نہیں ہوتی۔ مولانا فرماتے ہیں

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں نیک کار مسلمانوں کو بخشش اور بڑے ثواب کی خوشخبری دے کر ایمان وتقویٰ کے اخروی فائدے بتائے گئے تھے۔ اب اس ایمان وتقویٰ کے دنیاوی فائدے بتائے جارہے ہیں۔ یعنی دنیاوی آفتوں سے نجات تاکہ لوگ ایمان وتقویٰ میں رغبت کریں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کفر کے اخروی وبال کا ذکر تھا۔ یعنی کافروں کا دوزخی ہونا۔ اب ان کی دنیاوی ناکامیوں کا تذکرہ ہے۔ مسلمانوں پر قابو نہ پاسکنا۔ اسلام کا فروغ دیکھ کر ہمیشہ جلتے بھنتے رہنا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو عدل وانصاف کا حکم دیا گیا تھا۔ اب کفار کی زیادتیوں چیرہ دستیوں کا ذکر فرمایا گیا تاکہ بتایا جاوے کہ ایسے بدباطن خائن کفار کے ساتھ بھی وقت آنے پر عدل کرو۔

شان نزول

اس آیت کریمہ کے شان نزول کے متعلق چند روایات ہیں (۱) حضور ﷺ اپنے ساتویں غزوہ میں تھے جسے غزوہ ذی انمار بھی کہتے ہیں اور غزوہ ذات الرقاع بھی حضور نے مقام عصفان میں نماز ظہر باجماعت ادا کی۔ بنی ثعلبہ اور بنی محارب جو کفار تھے اور حضور کے مقابل۔ انہوں نے یہ نماز باجماعت دیکھ کر بہت افسوس کیا کہ ہم کو مسلمانوں کے قتل عام کا موقعہ ملا مگر ہم نے ہاتھ سے کھودیا۔ جیسے ہی یہ لوگ سجدے میں گئے تھے ویسے ہی ان کو قتل کردیتے۔ ان پر بعض کفار بولے کہ ابھی ایک نماز بھی آرہی ہے جو مسلمانوں کو جان ومال سے زیادہ پیاری ہے۔ اس وقت اپنی حسرت نکال لینا چنانچہ کفار تیار ہوگئے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور انور کو کفار کے برے ارادے کی خبر دی اور نماز خوف کے احکام نازل ہوئے۔ جس میں مسلمان دو ٹولیاں ہوکر نماز باجماعت پڑھتے ہیں۔ آدھے نماز میں آدھے کفار کے مقابل رہ کر ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں اور دوسری رکعت میں ان ٹولیوں کی تبدیلی ہوجاتی ہے اور دوسری رکعت نماز بھی اسی طرح ادا ہوتی ہے۔ اس کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (خازن، روح البیان وتفسیر کبیر وغیرہ) مسلم شریف۔

(۲) جب بیر معونہ کا واقعہ ہوا کہ کفار ستر صحابہ کرام کو دھوکہ سے اپنے علاقے میں لے گئے تو انہوں نے ۶۷ صحابہ کو تو شہید کردیا۔ تین حضرات بچ گئے جن میں عمرو ابن امیہ ضمیری بھی تھے ان تین بچنے والے حضرات میں سے ایک بزرگ پر ایک کافر نے حملہ کیا وہ بھی مارا گیا یہ بھی یہ کہتے ہوئے شہید ہوئے اَلْجَنَّةُ وَ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ قسم رب کی جنت یہ ہے۔ باقی دو صحابی مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ انہیں بنی سلیم کے دو کافر ملے جن کو حضور ﷺ نے امان نامہ لکھ کر دیا ہوا تھا۔ ان بزرگوں کو اس امان کی خبر نہ تھی۔ انہوں نے دونوں کافروں کو قتل کردیا۔ ان مقتولین کی قوم نے حضور ﷺ سے دونوں کی دیت (خون بہا) مانگی۔ حضور ﷺ چھ صحابہ کے ساتھ بنی نضیر (یہود مدینہ) کے محلہ میں تشریف لے گئے اور ان سے اس دیت میں مدد مانگی۔ کیونکہ بنی نضیر نے جن شرطوں پر معاہدہ کیا تھا ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ہمارے خطاءً قتل کی دیت میں تم مدد دیا کرنا۔ وہ بڑی محبت ظاہر کرتے ہوئے بولے۔ حضور تشریف رکھیں۔ ہم کھانا بھی لاتے ہیں اور دیت کی رقم کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ حضور کو ایک گھر کی دیوار کے نیچے بٹھایا اور اوپر چھت سے بڑا بھاری پتھر حضور انور پر پھینکا تاکہ آپ اس سے دب کر شہید ہوجاویں۔

کے متعلق ہو۔ تب تو قوم فرمانا بالکل ظاہر ہے کہ وہاں پوری قوم نے مسلمانوں کو نماز میں ہلاک کر دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اَنْ یَّبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَهُمْ یہ عبارت هَمَّ کا مفعول ہے یَّبْسُطُوْٓا بنا ہے بسطٌ سے بمعنی پھیلانا، دراز کرنا۔ جب اس کا مفعول ید یعنی ہاتھ ہو تو اس سے مراد ہوتا ہے۔ پکڑنا قتل یا ہلاک کرنے کے لئے اور اگر اس کا مفعول لسان یعنی زبان ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں گالی دینا، برا بھلا کہنا۔ بہر حال دست درازی یا زبان درازی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں چونکہ ایدی مفعول ہے لہٰذا اس کے معنی قتل و ہلاکت ہے۔ اگر اس آیت کا نزول حضور ﷺ کے واقعہ پر ہے تو "اِلَیْکُمْ" فرمانا اس لئے ہے کہ حضور ﷺ کی ایذا رسانی ساری امت کی ایذا رسانی ہے اور اگر اس کا نزول نماز با جماعت کے متعلق ہے تو "اِلَیْکُمْ" بالکل ظاہر ہے۔ یعنی ایک قوم نے تمہاری طرف دست درازی کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ فَکَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْکُمْ یہ جملہ هَمَّ پر معطوف ہے۔ ف عاطفہ ہے کفّ بنا ہے کف سے بمعنی روکنا ہتھیلی کو کف اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے چیز روکی جاتی ہے۔ مٹھی کی چیز گرنے سے رک جاتی ہے۔ ساری جماعت کو کافہ کہا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً (التوبہ: ۳۶) اس لئے کہ پوری جماعت دوسری کو اپنے اندر آنے سے روکتی ہے۔ اَیْدِیُ سے مراد یا تو ذات ہے یا خود ہاتھ ہی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو یا ان کے شر کو تم سے روک لیا کہ تم تک ان کا شر نہ پہنچ سکے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ یہ عبارت اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ پر معطوف ہے اور مسلمانوں کو تقویٰ کا حکم دے رہی ہے بلکہ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ کا نتیجہ بیان فرما رہی ہے۔ یعنی اللہ کی یہ نعمت یاد کرو اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرو کہ مخلوق اس کے قبضے میں ہے۔ اس کے بغیر ارادہ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تقویٰ کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے کہ اگر اس کے بعد دوزخ یا آگ کا ذکر ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں بچنا۔ جیسے فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (بقرہ: ۲۴) اور اگر اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ڈرنا۔ لہٰذا یہاں بمعنی ڈرنا ہے۔ ڈرنا دل سے بھی ہوتا ہے زبان سے بھی اور اعمال سے بھی۔ یہاں تینوں ڈر مراد ہیں۔ تقویٰ کی حقیقت اس کے اقسام و احکام و فوائد شروع سورۂ بقرہ میں عرض کیے جا چکے۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ یہ نیا جملہ ہے۔ لہٰذا واؤ ابتدائی ہے عَلَى اللّٰهِ کے مقدم فرمانے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ توکل کا مادہ وَکْلٌ ہے۔ بمعنی سونپنا، سپرد کرنا۔ اب بمعنی بھروسہ کرنا آتا ہے۔ توکل کی حقیقت اس کے درجات و اقسام پہلے عرض کیے جا چکے ہیں۔ یعنی مومنوں کو چاہیے کہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کریں کہ کارساز حقیقی وہ ہی ہے۔ خیال رہے کہ توکل علی اللہ اسباب پر عمل کرنے کے خلاف نہیں۔ حضور ﷺ نے اسباب جہاد جمع فرمائے، جہاد کیا پھر ساتھ ہی خدا پر بھروسہ فرمایا۔

خلاصۂ تفسیر

اے مسلمانو! اللہ کی وہ نعمت یاد کرو یا یاد رکھو یا اس کا چرچا کرو۔ جب کہ ایک کافر قوم نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ تم پر دست درازی کرے۔ ان کا ارادہ بڑا خطرناک تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی نے تم پر کرم فرمایا کہ تم سے ان کے ہاتھ روک لے اور تم کو ان کے شر سے بچا لیا۔ اس وقت تم سے سارے اسباب منقطع تھے۔ صرف اس کے کرم سے تم بچے۔ لہٰذا یہ نعمت یاد رکھو اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو مومنوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کریں۔ وہ مہربان ہو تو سب

ھدایت: غازی کو جہاد میں تین چیزوں سے پرہیز چاہیے اور تین چیزوں پر عمل، جہاد میں محض حصول مال، ملک گیری کی نیت ہرگز نہ کرے، اللہ کے دین کی خدمت، مظلوم مسلمانوں کی نصرت وحمایت کی نیت ہو۔ اپنی تعداد یا اپنی قوت یا اپنے ہتھیار پر ہرگز بھروسہ نہ کرے۔ دوران جہاد غنیمت لوٹنے کی کوشش نہ کرے۔ پہلے فتح حاصل کرے پھر سب مال غنیمت بفضلہٖ تعالیٰ اپنا ہے۔ کرنے والے کام یہ ہیں۔ جہاد میں تقویٰ وتوکل اختیار کرے۔ ہاتھ میں تلوار ہو، منہ میں اللہ کا نام۔ فتح ونصرت کو رب تعالیٰ کا عطیہ جانے، اس کا شکر کرے، نماز ہرگز نہ چھوڑے، افراتفری کی حالت میں پیدل یا سواری پر چلتے ہوئے اشارہ سے نماز پڑھے۔ رب فرماتا ہے فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا (بقرہ:۲۳۹)۔ **ساتواں فائدہ:** مجاہد صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کرے۔ مخلوق پر توکل نہ کرے۔ سب سے مدد لے مگر توکل کسی پر نہ کرے۔ یہ فائدہ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ سے حاصل ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اِذْ هَمَّ قَوْمٌ بقاعدہ نحوی اذْكُرُوْا کا ظرف نہیں ہو سکتا کیونکہ ''اذْكُرُوْا'' مستقبل ہے اور هَمَّ ماضی۔ اس قدر اختلاف زمانہ ہوتے ہونے ظرفیت کیسی۔ پھر یہاں اِذْهَمَّ کو اذْكُرُوْا کا ظرف کیوں بنایا گیا؟ **جواب:** ہم تفسیر میں عرض کر چکے کہ اِذْهَمَّ قَوْمٌ۔ نِعْمَتَ اللّٰهِ کی صفت یا حال ہے۔ اور ظرف ہے کائنۃ یا الکائنہ کا۔ یعنی اس نعمت کو یاد کرو جو تم کو اس وقت ملی جب ایک قوم نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا۔

دوسرا اعتراض: یہاں فرمایا گیا۔ نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اللہ کی وہ نعمت یاد کرو جو تم پر ہے حالانکہ دشمن کے برے ارادے سے حضور ﷺ کو بچایا گیا تھا۔ تو یہ نعمت حضور پر تھی علیک کیوں نہ فرمایا؟ **جواب:** حضور انور ﷺ کا دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنا مسلمانوں کے لئے نعمت الٰہیہ ہے۔ حضور انور پر تو ہر جگہ ہر حال میں اللہ کا کرم ہے ہی۔ دنیا میں رہیں تو رحمت ہیں، رب کے پاس حاضر ہو جاویں تو نعمت ہیں۔ جان کا جسم میں رہنا بدن کے لئے نعمت ہے۔ نور نظر کا آنکھ میں رہنا آنکھ کے لئے نعمت ہے۔ کہ جان سے جسم کی بقا ہے اور نظر سے آنکھوں کی بہار۔ ان کے بغیر دونوں بے کار۔ شعر

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
جان ہیں وہ جہان کی جان ہے تو جہان ہے

تیسرا اعتراض: ذکر سے کیا فائدہ اللہ کی اطاعت چاہیے۔ محض ذکر بیکار ہے۔ پانی پانی کیے جاؤ پیاس نہیں بجھے گی۔ پیاس تو پانی پینے سے بجھے گی پھر ذکر کا حکم کیوں دیا؟ **جواب:** ذکر وفکر دونوں ہی اعلیٰ ہیں۔ عظمت سے جس کا ذکر کیا جاوے اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ برائی سے جس کا ذکر ہوتا رہے اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ ہم کو بفضلہٖ تعالیٰ حضور ﷺ سے محبت ہے حالانکہ دیکھا نہیں۔ کیوں آپ کا ذکر کرتے کرتے اور ذکر سنتے سنتے اللہ کا ذکر اس کی نعمتوں کا ذکر اس سے محبت کا ذریعہ ہے اور محبت اطاعت کا ذریعہ، اطاعت میں دارین کی سعادت۔ پانی کی مثال غلط دی۔ غذائیں کھائی جاتی ہیں بعض دوائیں

ہے کہ بندہ کو آزماوے مگر بندے کو حق نہیں کہ رب کو آزمائے۔ بندہ کا حق ذکر، فکر، تقویٰ اور توکل ہے۔ راضی برضا رہنا توکل کی جان ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا

اور البتہ تحقیق لیا اللہ نے مضبوط عہد بنی اسرائیل سے اور بھیجا ہم نے

اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے

مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ

ان میں سے بارہ افسروں کو اور فرمایا اللہ نے بیشک میں ساتھ ہوں تمہارے

ان پر بارہ سردار قائم کئے اور فرمایا میں بیشک تمہارے ساتھ ہوں

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ

اگر تم نے نماز قائم کی اور دی تم نے زکوٰۃ اور ایمان لائے تم رسولوں پر میرے

ضرور اگر تم نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ

وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ

اور عزت کی تم نے ان کی اور قرض دیا تم نے اللہ کو قرض اچھا تو البتہ مٹادوں گا

اور ان کی تعظیم کرو اور اللہ کو قرض حسن دو بیشک میں تمہارے گناہ

عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ

میں تم سے برائیاں تمہاری اور ضرور داخل کروں گا میں تم کو باغوں میں کہ بہتی ہیں نیچے سے ان کے نہریں

اتار دوں گا اور ضرور تمہیں باغوں میں لے جاؤں گے جن کے نیچے نہریں رواں ہیں

فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾

پس جو کفر کرے گا بعد اس کے تم میں سے پس بیشک بہک جاوے گا وہ سیدھے راستہ سے

پھر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے وہ ضرور سیدھی راہ سے بھٹکا

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح کا تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود مدینہ کی وہ بدعہدی بیان ہوئی جو انہوں نے حضور ﷺ سے کی اب ان یہود کے اسلاف کی وہ بد

کہتے ہیں کہ وہ پہاڑ میں وسیع سوراخ کر کے بنایا جاتا ہے۔رب فرماتا ہے۔ فَنَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ (ق:۳۶) منقبت اور مناقب ان صفات کو کہتے ہیں جو چھان بین اور کرید کے بعد معلوم یا بیان کیے جاویں۔اصطلاح میں نقب کے معنی ہیں تفتیش اور تجسس و تلاش یہاں نقیب یا بمعنی اسم مفعول ہے یعنی چنے ہوئے ،تلاش کیے ہوئے لوگ جنہیں قوم نے اپنی سرداری یا نمائندگی کے لئے چن لیا یا بمعنی اسم فاعل ہے یعنی اپنی قوم کے حالات کی تلاش وتجسس میں رہنے والے لوگ۔ بہر حال نقیب اس سردار کو کہتے ہیں جو قوم کا نگران ہوان میں مبلغ ہوں۔خیال رہے کہ یہ نقیب بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے چنے گئے اور قوم میں تبلیغ کے لئے اور کنعانی کفار میں جاسوسی کے لئے بھیجے گئے تھے۔مگر چونکہ اللہ کے مقبولوں کا کام خود رب تعالیٰ کا کام ہوتا ہے اسی لئے بَعَثْنَا فرمایا یعنی ہم نے بھیجے جیسا کہ ابھی ہم نے اَخَذَ اللّٰہُ سے عرض کیا۔ وَقَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ مَعَکُمْ یہ عبارت بھی اَخَذَ اللّٰہُ پر معطوف ہے۔اس میں خطاب یا تمام بنی اسرائیل سے ہے جن سے عہد و میثاق لیا گیا تھا یا ان نقیبوں سے جنہیں بنی اسرائیل کی طرف تبلیغ کے لئے یا جبارین کی طرف جاسوسی کے لئے بھیجا گیا۔ مَعَکُمْ میں معیت (ہمراہی) سے مراد رحمت و کرم کی ہمراہی ہے۔اللہ تعالیٰ زمانی اور مکانی ہمراہی سے پاک ہے۔ہم ہمراہی کے معانی اور اس کے اقسام اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (بقرہ: ۱۵۳) کی تفسیر میں کر چکے۔یعنی رب تعالیٰ نے ان بنی اسرائیل سے یا بارہ نقیبوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت فرمادیا کہ ہماری رحمت ہمارا کرم تمہارے ساتھ ہے۔ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ اس جملہ میں معیت وہمراہی کی تفسیر فرمائی گئی لام تاکیدی ہے۔ان شرطیہ اس شرط کی جزا آگے آرہی ہے۔ لَاُکَفِّرَنَّ عَنْکُمْ الخ صلوٰۃ کے معنی اور نماز قائم کرنے کی تفسیر اور نماز پڑھنے ،نماز قائم کرنے میں بہت فرق ہے۔ہم اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ کی تفسیر اور شروع سورۃ بقرہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ (بقرہ: ۳) کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔بنی اسرائیل پر نماز فرض تھی۔دن رات میں دو نمازیں ،چونکہ نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت۔بدنی مالی سے افضل ہے۔اس لئے نماز کا ذکر پہلے ہوا۔اسلامی نماز اور اسرائیلی نماز میں چند طرح فرق ہے۔اسلامی نماز دن رات میں پانچ بار ہے۔اسرائیلی نماز دو بار۔اس نماز میں رکوع ہے یہود کی نماز میں رکوع نہ تھا جیسا کہ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (بقرہ: ۴۳) کی تفسیر میں عرض کیا جا چکا ہے۔اسلامی نماز میں تلاوت قرآن فرض ہے۔ان کی نماز میں تلاوت توریت فرض نہ تھی۔ورنہ توریت ضائع نہ ہوتی۔تو ہمارے قرآن کا بقا کا ذریعہ نماز ہے کہ اس کی وجہ سے مسلمان کے بچہ بچہ کو کچھ سورتیں یاد کرنا پڑتی ہیں۔تراویح کی برکت سے بعض لوگ حافظ ہوتے ہیں۔ہماری نماز میں التحیات ہے۔ان کی نماز میں نہ تھی بہر حال اصل نماز تھی نوعیت میں فرق تھا۔یونہی ان کے ہاں نماز جمعہ ،نماز عیدین ،نماز کسوف نماز استخارہ وغیرہ نہ تھی۔اسلام میں یہ نمازیں ہیں۔ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ یہ عبارت اَقَمْتُمْ پر معطوف ہے اور دوسری شرط زکوٰۃ کے معنی اور ایتاء الزکوٰۃ کی تفسیر پہلے بیان ہو چکی ہے۔بنی اسرائیل پر مال کا چوتھائی حصہ زکوٰۃ فرض تھی۔ہمارے ہاں سونے چاندی وغیرہ کی زکوٰۃ چالیس حصہ ہے۔ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ اگرچہ ایمان اور حضرات انبیاء کرام کی تعظیم و مدد نماز وزکوٰۃ پر مقدم ہے کہ ایمان پہلے اختیار کرو۔نماز وغیرہ بعد میں مگر چونکہ یہود و نصاریٰ نماز وزکوٰۃ کے اس وقت تک منکر

سے ہے اس لئے نہروں کا ذکر فرمایا۔ نہر حسین بھی ہوتی ہے اور خطرناک نہیں ہوتی۔ مفید ہی ہوتی ہے نیز نہر کا پانی قبضے میں ہوتا ہے۔ بحر یعنی دریا میں یہ بات نہیں۔ اس لئے جنت میں نہریں ہیں۔ بحریں ہیں یعنی دریا نہیں۔ چونکہ جنت میں صرف پانی کی نہر نہ ہوگی بلکہ پانی، دودھ، شہد، شراب طہور ہر چیز کی نہریں ہوں گی اس لئے جمع ارشاد ہوا۔ یعنی ہم ایسے مخلص باعمل مؤمنوں کے سارے عمل بخش دیں گے اور اس کے علاوہ ایسے باغات میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں **فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ** یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ ف تعقیب کی ہے اور یہ جملہ گزشتہ اعلان پر مرتب ہے۔ من سے مراد یا تو وہ اسرائیلی ہیں جن کا ذکر ہو رہا ہے یا عام اسرائیلی یا تمام انسان یا سارے جن وانس۔ کَفَرَ بنا ہے۔ کفو بمعنی انکار سے اس کا مفعول محذوف ہے۔ یا حضرات انبیاء کرام یا نماز وزکوٰۃ، تعظیم انبیاء کرام وغیرہ وہ چیزیں جو ابھی مذکور ہوئیں۔ **ذٰلِكَ** سے اشارہ ایمان کی طرف نہیں بلکہ اسی مذکورہ اعلان کی طرف ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ کرایا گیا تھا۔ **مِنْكُمْ** میں مِنْ تبعیضیہ ہے **سَوَآءَ السَّبِيْلِ** سے مراد وہ عقیدے و اعمال ہیں جو رب تعالیٰ تک یا جنت تک پہنچا دیں یعنی اس اعلان اور وعدہ انعام کے بعد اب جو کوئی ان مذکورہ چیزوں میں سے کسی چیز کا یا کسی نبی کا انکار کرے گا سمجھ لو کہ وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا۔ کبھی رب تعالیٰ تک یا جنت تک نہیں پہنچ سکتا۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے ایک موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل سے ایک پختہ عہد لیا اور اس عہد کی پابندی کی۔ نگرانی کرنے اور دشمن کی طاقت وقوت کا اندازہ لگانے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو خبر دینے کے لئے موجودہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں سے بارہ سردار مقرر کیے۔ فی قبیلہ ایک سردار۔ یہ بارہ سرداروں کا تقرر بھی موسیٰ علیہ السلام کی معرفت ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان اسرائیلیوں سے وعدہ فرمایا کہ میری رحمت، میرا کرم، میری نگرانی تمہارے ساتھ ہے۔ اگر تم لوگوں نے نمازیں قائم رکھیں کہ ہمیشہ صحیح طور پر صحیح وقت پر پڑھتے رہے اور تم زکوٰۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لا کر قائم رہے۔ ان کی تعظیم وتوقیر و مدد کرتے رہے اور زکوٰۃ کے علاوہ اور نفلی صدقے خوش دلی سے حلال و مرغوب مال سے ادا کرتے رہے۔ یا غریب مسلمانوں کو بغیر سود قرضہ دیتے رہے یا غیرت مند مسلمانوں غریبوں کو جو خیرات لینے سے شرم کریں قرض کے بہانہ صدقہ دیتے رہو۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے کرم پر قرض قرار دیا ہے کہ تم کو اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔ اگر تم نے یہ اعمال کیے تو ہم تمہارے سارے چھوٹے بڑے گناہ معاف فرما دیں گے اور تم کو ایسے باغات عطا فرمائیں گے جن کے نیچے دودھ۔ شہد۔ پانی، شراب طہور کی نہریں رواں ہیں وہاں سے تم کو کبھی نکالیں گے نہیں۔ پھر اس اعلان کے بعد ان وعدوں کے بعد بھی جو کوئی تم میں سے حضرات انبیاء کرام کا یا ان مذکورہ چیزوں میں سے کسی چیز کا انکار کرے گا۔ تو سمجھ لو کہ وہ اللہ تک یا جنت تک پہنچانے والے سیدھے راستے سے بہک گیا۔ وہ کسی طرح اللہ تعالیٰ تک یا جنت تک نہیں پہنچ سکتا۔ خیال رہے کہ بنی اسرائیل کی نماز وزکوٰۃ کے صرف اخروی دو فائدے تھے۔ یعنی گناہوں کی معافی جنت کا داخلہ۔ اسلام میں زکوٰۃ کے دنیاوی، برزخی، اخروی بہت فائدے ہیں۔ نماز سے وضو سے چہرے کی چمک، حاجتیں

پھر بمشکل ان پر جہاد ہوا۔ اور ان کے سردار عوج بن عنق (واللہ اعلم) کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بہ نفس نفیس قتل کیا۔ خیال رہے کہ اکثر مورخین نے اور ان کی پیروی میں بہت سے مفسرین نے اس قوم کنعان کے سردار کا نام عوج ابن عنق یا ابن عناق یا ابن عوق لکھا ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی عمر تین ہزار سال تھی، قوم عاد سے تھا اس کا قد تین ہزار تین سو تینتیس گز تھا۔ حتی کہ اس کا سر بادل سے اوپر ہوتا تھا۔ اور طوفان نوح اس کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا اور وہ ان نقیبوں کو اپنی آستینوں میں ڈال کر لئے پھرا۔ اور کہا بنی اسرائیل سے ہماری شہ زوری کا ذکر کر دینا اور بھی بہت مبالغہ آمیز باتیں لکھی ہیں مگر یہ روایات عقل و نقل سب کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ اتنے قد کا آدمی زندہ نہ رہنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا سر طبقہ زمہریر اور کرہ آگ سے بھی اوپر نکلا ہوا ہوگا پھر وہ زندہ کیسے رہا۔ ان بزرگوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ عوج سمندر سے مچھلی پکڑ کر سورج سے بھون لیتا تھا تعجب ہے کہ مچھلی بھون لیتا تھا۔ مگر اس کا سر نہیں بھنتا تھا۔ نیز طوفان نوحی میں کوئی کافر نہ بچا۔ سب غرق ہو گئے اور صرف نوح علیہ السلام کی ذریت سے آئندہ نسل انسانی چلی۔ اسی لئے انہیں آدم ثانی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ **وَ جَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ** (صافات: ۷۷) پھر عوج کیسے بچ رہا؟ بہر حال یہ درست ہے کہ کنعانین بہت شہ زور، طاقت ور، مال دار اور عیش و عشرت والی قوم تھی۔ بنی اسرائیل نے ان کے مقابلہ سے انکار کر دیا۔ ان کے عہد جہاد کا ذکر تو اس آیت میں ہے اور عہد توڑنے کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ ہم نے بہت احتیاط سے یہ واقعہ عرض کیا۔ ان اسرائیلی روایات پر بہت سے اعتراضات ہو سکتے ہیں۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اللہ کے محبوب بندوں کے کام رب تعالیٰ کے کام ہیں۔ وہ حضرات فنافی اللہ ہوتے ہیں۔ دیکھو بنی اسرائیل سے جہاد کا یہ وعدہ اور ان میں سے بارہ نقیبوں کا چناؤ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ آپ نے انہیں قوم کنعانین میں جاسوسی کے لئے بھیجا۔ مگر رب العالمین نے فرمایا کہ یہ کام ہم نے کیے جیسا کہ **اَخَذَ اللّٰهُ** اور **بَعَثْنَا** سے معلوم ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** جہاد بڑی پرانی عبادت ہے۔ عہد موسوی میں بھی تھا۔ **تیسرا فائدہ:** ایمان اور نیک اعمال کے ذریعے سیئات یعنی چھوٹے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ اعمال گویا پہلے دل کے لئے صابن ہیں۔ یہ فائدہ **لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ** الخ سے حاصل ہوا۔ خیال رہے کہ ایمان سے زمانہ کفر کے سارے چھوٹے بڑے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور نیک اعمال کے ذریعہ گناہ صغیرہ معاف ہوتے ہیں۔ مگر حقوق العباد کسی چیز سے معاف نہیں ہوتے۔ لہٰذا کافر مسلمان ہونے کے بعد بھی زمانہ کفر کے قرض ادا کرے گا۔ یہ بھی خیال رہے کہ عفو، مغفرت، تکفیر ان سب سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مگر عفو و مغفرت میں براہ راست رب تعالیٰ معافی دے دیتا ہے اور تکفیر یہ ہے کہ بعض اعمال کے ذریعہ گناہ معاف فرمائے۔ جیسے گھوڑا لوٹ کر جب جسم ہلاتا ہے تو ساری مٹی جھڑ کر وہ صاف ہو جاتا ہے۔ بگلا کیچڑ میں لوٹے مگر جہاں اس نے پر جھاڑے۔ صاف ہو گیا یہ ہے عفو اور ہم نے اپنا میلا کپڑا پانی و صابن سے دھویا یہ ہے کفارہ۔ یہاں کفارہ کا ذکر ہے۔ **چوتھا فائدہ:** دین موسوی میں نماز بھی تھی اور زکوٰۃ

اگر مان لیا جاوے جب بھی مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ مؤمنوں کے ساتھ ہے۔ رحمت وکرم، بندہ نوازی، ستاری، غفاری سے اور کافروں کے ساتھ قہاری جباری سے ہے۔ ساتھ ہونے کی بہت قسمیں ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ بالکل صاف ہے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت کریمہ میں نماز وزکوٰۃ کے بعد ایمان کا ذکر کیوں فرمایا ایمان تو نماز زکوٰۃ بلکہ تمام اعمال سے پہلے ہے۔ **جواب:** اس کے کئی جواب تفسیر سے معلوم ہو گئے جن میں سے ایک یہ ہے کہ نماز وزکوٰۃ درست ہونے کے لئے ایمان کی قید ہے کہ ایمان کے ساتھ ہوں تو درست ہیں ورنہ نہیں۔ مومن ہونا نماز وزکوٰۃ سے پہلے چاہیے۔ مگر مومن رہنا آخر دم تک ضروری ہے، قید مقید کے بعد مذکور ہوتی ہے۔

تیسرا اعتراض: ایمان اللہ تعالیٰ، نبیوں، کتابوں، قیامت، جنت ودوزخ فرشتوں سب پر ہی لایا جاتا ہے۔ تو یہاں فقط رسولوں کا ذکر کیوں ہوا۔ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ۔ **جواب:** یا اس لئے کہ ان تمام کا ماننا ایمان کا ڈھانچہ ہے اور رسولوں کو ماننا ایمان کی روح ہے۔ ابلیس سب کو مانتا تھا مگر کافر رہا۔ بہت سے کفار توحید وغیرہ سب کو مانتے ہیں مگر کافر ہیں۔ کیوں اس لئے کہ رسول کے منکر ہیں۔ دین بدلتا ہے نبی بدلنے سے۔ تمام آسمانی دینوں میں توحید یکساں ہے۔ نبوت میں فرق ہے تو یہ سب دین الگ ہو گئے۔ قبر میں توحید کے جواب پر نجات نہیں نبوت کے جواب پر نجات ہے یا اس لئے کہ نبی کو ماننے میں ان سب کا ماننا آجاتا ہے۔ جیسے سو کے عدد میں تمام اکائیاں دہائیاں آجاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی خدا کو مانے نبی کو نہ مانے۔ مگر ناممکن ہے کہ نبی کو مانے خدا کو نہ مانے ان وجوہ سے صرف رسل کا ذکر ہوا۔

چوتھا اعتراض: رسولوں پر ایمان کے بعد ان کی تعظیم کا ذکر کیوں ہوا۔ کہ فرمایا وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ۔ **جواب:** اس لئے کہ تعظیم رسول بقاء ایمان بلکہ صحت ایمان کا ذریعہ ہے۔ ایمان کے بعد بقاء کے ذریعہ کا ذکر ہوا۔

پانچواں اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو اسلام لا چکنے کے بعد کافر ہو وہ گمراہ ہے۔ یعنی مرتد۔ تو کیا اصلی کافر گمراہ نہیں۔ دیکھو فرمایا گیا۔ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ حالانکہ سارے کافر گمراہ ہیں۔ **جواب:** ذٰلِكَ سے اشارہ ایمان و اعمال کی طرف نہیں بلکہ مذکورہ اعلان کی طرف یا مذکورہ عہد و پیان کی طرف ہے یعنی اس عہد و پیان کے بعد یا ہمارے اس اعلان عام کے بعد جو کفر کرے وہ بہت بڑا گمراہ ہے کیوں کہ بے خبری کی حالت کا کفر یا گناہ قابل پکڑ نہیں جسے نبوت کی روشنی نہ پہنچے۔ اس کے لئے صرف عقیدہ توحید ہی نجات کے لئے کافی ہے۔

چھٹا اعتراض: بنی اسرائیل سارے رسولوں پر ایمان کیسے لا سکتے تھے۔ اس وقت سارے نبی تشریف نہ لا چکے تھے۔ بہت رسول بعد میں آنے والے تھے۔ جو نبی ابھی آئے ہی نہ ہوں ان پر ان کی تعظیم ان کی مدد کیسے ممکن ہے۔ لہٰذا ان سے یہ کہنا کیوں کر درست ہوا کہ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ **جواب:** اجمالی ایمان آئندہ رسولوں پر بھی لایا جا سکتا ہے۔ یہ خیال کیا جاوے کہ آئندہ جس قدر رسول آئیں گے وہ برحق ہوں گے۔ ہمارا سب پر ایمان ہے۔ یونہی آئندہ تعظیم و مدد کا حال ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک موقعہ پر مدینہ منورہ کی زمین کا ادب کیا کہ جب آپ کا تخت اس سرزمین پر پہنچا جو کہ ہوا میں

کی انتہائی تعظیم سے حاصل ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کی تعظیم نصیب کرے۔ آمین (از روح البیان) یہاں تفسیر عرائس البیان نے مقبولین الہی کی بہت قسمیں ان کے احکام ان کے فیوض و برکات بیان فرمائے۔ چنانچہ فرمایا نقباء، بدلا، نجباء، اصفیا اتقیاء، مقربین، عارفین، موحدین، صدیقین، شہداء، صالحین، اخیار، ان سب کے سردار غوث ہیں۔ ان سے ہی نظام عالم قائم ہے (عرائس البیان)۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ

پس بوجہ توڑنے ان کے اپنے عہدوں کولعنت کی ہم نے ان پر اور کر دیا ہم نے دلوں کو ان کے سخت

توان کی کیسی بد عہدیوں پر ہم نے انہیں پر لعنت کی اور ان کے دل سخت کر دیئے

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ

بدلتے ہیں کلموں کو جگہوں سے اپنے اور بھول گئے وہ ایک حصہ اس میں سے نصیحت کی گئی تھی جس کی

اللہ کی باتوں کو ان کے ٹھکانوں سے بدلتے ہیں اور بھلا بیٹھے بڑا حصہ ان نصیحتوں کا جو انہیں دی گئیں

وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآىٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ

اور رہیں گے آپ مطلع ہوتے او پر خیانت کے ان کی طرف سے سوا تھوڑوں کے ان میں سے

اور تم ہمیشہ ان کی ایک نہ ایک دغا پر مطلع ہوتے رہو گے سوا تھوڑوں

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

پس معاف کرو ان سے اور در گزر کرو بیشک اللہ پسند کرتا ہے نیک کاروں کو

تو انہیں معاف کرو اور در گزر کرو بے شک احسان والے اللہ کو محبوب ہیں

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اس عہدو پیمان کا ذکر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل سے لئے گئے تھے۔ اب انہی اسرائیلیوں کے ان عہد و پیمان کے توڑنے، ان کی مخالفت کرنے کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں عہدو پیمان کے پورا کرنے کے فوائد کا ذکر تھا۔ اب عہد و پیمان توڑنے، اس کے خلاف کرنے کی برائیوں کا ذکر ہے تا کہ لوگ عہد توڑنے سے بچیں، عہد پورے کرنے کے پابند رہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کے آخیر میں فرمایا گیا تھا کہ جو اس کے بعد کفر کرے گا وہ سیدھے راستے سے بہکے گا۔ یہ اجمالی حکم تھا۔ اب اس اجمال کی تفصیل بیان ہو رہی ہے کہ ان لوگوں نے کیسے کفر کیے اور سیدھے راستے سے کیسے بہکے۔ گویا یہ آیت پچھلی آیت کا تتمہ ہے۔

اس میں اثر نہ کرے۔ رب فرماتا ہے: فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر: ۲۲) یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ یہ نیا جملہ ہے جس میں لعنت اور دل کی سختی کے انجام کا ذکر ہے۔ تحریف کے معنی ہیں کنارہ سے دور کر دینا۔ یہ بنا ہے حرف سے بمعنی طرف و کنارہ۔ اصطلاح میں بدل دینے کو تحریف کہتے ہیں کہ اس میں بدلی ہو چیز کو حد سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اسے حال کے صیغہ سے ارشاد فرمانا یا تو گزشتہ واقعہ کا نقشہ ذہن میں قام کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ توریت شریف کی تحریف یہودی پہلے ہی کر چکے تھے یا ان کی موجودہ تحریف کا ذکر ہے۔ کیونکہ یہودی حضور کے زمانہ میں تحریف کرتے رہتے تھے یا حال استمراری ہے یعنی تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ حکم سے مراد توریت شریف کی آیات میں خواہ احکام کی آیات ہوں یا سزاؤں کی یا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعتیہ آیات۔ مواضع جمع ہے موضع کی بمعنی جگہ۔ اس جگہ سے مراد یا تو توریت شریف کے اوراق ہیں کہ وہ اصلی آیات کو مٹا کر ان کی جگہ دوسری آیات بناوٹی لکھ دیتے ہیں تب تحریف سے مراد لفظی تحریف ہے یا مواضع سے مراد صحیح معنی و مطلب ہے یعنی وہ آیات توریت کی باطل تاویلیں کر کے اصل مقصد سے ہٹا دیتے ہیں۔ تب تحریف سے مراد تحریف معنوی ہو گی۔ یہود توریت شریف میں دونوں قسم کی تحریفیں کرتے ہیں۔ آج مسلمانوں کے باطل فرقے قرآن مجید میں تحریف معنوی تو کرتے ہیں مگر بحمدہ تعالیٰ تحریف لفظی نہیں کر سکتے اور ان کی تحریف معنوی کی بھی دھجیاں اڑادی جاتی ہیں۔ کیوں نہ ہو کہ رب تعالیٰ اس قرآن کا محافظ ہے۔ چونکہ کلم اسم جنس ہے اس لئے مَّوَاضِعِهٖ میں ضمیر واحد لائی گئی۔ اسم جنس کے لئے واحد اور جمع دونوں ضمیریں آسکتی ہیں۔ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ۔ یہ جملہ ''یُحَرِّفُوْنَ'' الخ پر معطوف ہے اور اس میں سختی دل کے دوسرے نتیجہ کا ذکر ہے۔ نَسُوْا بنا ہے نسیان سے بمعنی بھول جانا کبھی مجازاً چھوڑ دینے کو نسیان کہہ دیتے ہیں۔ یہاں بہت سے مفسرین نے چھوڑنے کے معنی بھی کیے ہیں مگر حقیقی معنی بن سکتے ہوں تو بلا وجہ مجازی معنی نہیں کرنا چاہئیں۔ حظ کے معنی ہیں نصیب یا حصہ مِّمَّا کا مِنْ تبعیضیہ ہے ما سے مراد دین موسوی کے شرعی احکام ہیں ذُكِّرُوْا بنا ہے تذکیر سے بمعنی امر اور ہوسکتا ہے کہ تذکیر بمعنی نصیحت کرنا، یاد دلانا ہی ہو۔ یعنی یہ یہودی توریت شریف کے بہت سے احکام کو جن کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ چھوڑ بیٹھے یا توریت کا بہت سا حصہ بھول گئے۔ وہ حصہ ان کے حافظہ سے نکل ہی گیا۔ یہ ہے ان کی بدکاریوں کا نتیجہ کہ علم بھول گئے۔ ان کا حافظہ کمزور ہو گیا۔ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ یہ جملہ نیا ہے جس میں ان کے دائمی عیب کا ذکر ہے لَا تَزَالُ میں خطاب یا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے یا ہر قرآن پڑھنے والے سے ہے یا ہر مسلمان سے تَطَّلِعُ کے ساتھ لَا تَزَالُ لگانے سے اطلاع کی ہمیشگی بتائی گئی خَآئِنَةٍ خیانة سے بنا جو امانت داری کا مقابل ہے یا تو یہ مصدر ہے۔ جیسے كاذبة یا لاغية یا كافية یا عافية یا طاغية۔ رب فرماتا ہے: فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ (الحاقہ: ۵) اور لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً (غاشیہ: ۱۱) اور لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (واقعہ: ۲) (کبیر) یا اسم فاعل ہے۔ فعلة یا نفس یا شخص پوشیدہ کی صفت ہے (روح المعانی) منهم حاصلة کے متعلق ہو کر خَآئِنَةٍ کی صفت ہے۔ خیانت سے مراد حضور سے کیے ہوئے عہد توڑنا یا حضور کے مقابل مشرکین کی مدد کرنا یا حضور انور کو زہر دینا یا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نیچے بٹھا کر اوپر سے بھاری پتھر لڑکانا تاکہ حضور شہید ہو جاویں۔ یہ تمام حرکتیں

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ میں یہود کے پانچ گناہوں کا اور ان کی پانچ سزاؤں کا ذکر ہے ان کے پانچ گناہ ایک کلمہ میں فرمائے گئے۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ کیونکہ پچھلی آیت میں یہود کے پانچ عہد و پیمان کا ذکر ہے۔ نماز، زکوٰۃ، ایمان وغیرہ ان پانچ عہدوں کے توڑنے کو اس ایک لفظ میں بیان فرما دیا۔ پانچ سزائیں لعنت، دل کی سختی، تحریف کلمات الٰہیہ، بہت سے عہد بھول جانا، ہمیشہ خیانتیں کرنا۔ یہ ہیں سزائیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ اے محبوب! ﷺ بنی اسرائیل سے پانچ عہد تو وہ لئے گئے تھے جو ابھی بیان ہوئے مگر ان لوگوں نے سارے عہد توڑ دیئے۔ حضرات انبیاء کو شہید انہوں نے کیا، نماز، زکوٰۃ کے یہ انکاری ہو گئے، آپ کے یہ...... دشمن ہو گئے۔ اس بدعہدی کی وجہ سے ہم نے ان پر دین و دنیا میں پھٹکار کر دی۔ ان کے دل سخت کر دیئے جس سے کوئی نصیحت اللہ کی آیت ان میں اثر نہیں کرتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ دن رات توریت شریف کی آیتیں لفظاً و معناً بدلتے رہتے ہیں۔ کتاب اللہ کی حفاظت کرنے کی بجائے اس کے بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس پھٹکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توریت شریف کا بہت حصہ بھول گئے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ آپ ان کی خیانتوں پر برابر اطلاع پاتے رہیں گے۔ مگر ان میں تھوڑے لوگ وہ ہیں جو سچے پکے وفادار اطاعت شعار ہیں۔ جیسے عبداللہ ابن سلام اور ان کی جماعت۔ لہٰذا اے محبوب! آپ ان کو معافی دیں، ان سے درگزر فرمائیں کہ یہ کام احسان ہیں اور اللہ تعالیٰ محسنوں کو پسند فرماتا ہے۔ فقیر نے یہ اجمالی تفسیر اس کی تفصیل ابھی تفسیر میں عرض کر دی۔ ملاحظہ فرمالیں۔ خیال رہے کہ دینی، قومی، قانونی مجرموں سے درگزر جو مسلمانوں کی کمزوری کی بنا پر تھی۔ وہ جہاد کی آیتوں سے منسوخ ہو چکی۔ ہجرت سے پہلے مسلمانوں کو حکم تھا کہ سرکش، ظالم، خون خوار کفار سے کچھ نہ کہو۔ ابھی ان پر جہاد نہ کرو۔ اس قسم کی آیات جہاد والی آیات سے منسوخ ہے۔ یہاں اخلاقی معافی کریمانہ درگزر کا حکم ہے۔ یہ معافی تا قیامت باقی ہے۔ حضور انور نے فتح مکہ کے دن ابو سفیان وغیرہ کو معافی دی۔ کون سی معافی، اخلاق والی۔ اب اسلامی حکام۔ بڑے لوگوں دوستوں۔ ماں باپ خاوند کو چاہیے اپنے تعلق والوں اور ماتحتوں کی ہر بات پر پکڑ نہ کریں ورنہ گھر بگڑ جائیں گے، ملک برباد ہو جائیں گے، آپس میں فتنہ وفساد برپا ہوں گے۔ اکثر موقعہ پر چشم پوشی کریں تاکہ گھر اور ملک و قوم کا نظام قائم رہے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** وعدہ خلافی بدعہدی بڑا ہی جرم ہے جس پر لعنت، سختی دل وغیرہ ہوتی ہے۔ خصوصاً اللہ تعالیٰ یا حضور ﷺ سے کیے ہوئے وعدے کہ ان کے خلاف کرنا بڑا ہی جرم ہے۔ **دوسرا فائدہ:** دل کی سختی اللہ کا عذاب ہے اور دل کی نرمی اللہ کی رحمت یہ فائدہ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً سے حاصل ہوا۔ سختی دل کی علامت آنکھوں کی خشکی ہے اور نرمی دل کی علامت آنکھوں کی تری ہے۔ **تیسرا فائدہ:** بعض گناہوں کی وجہ سے دل سخت ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بعض نیکیوں کی برکت سے دل نرم پڑ جاتا ہے۔ اللہ کے محبوبوں کی بے ادبی عموماً دل سخت کر دیتی ہے اور نرم دلوں کی صحبت مقبولین بارگاہ سے الفت و محبت دل نرم کر دیتی ہے یہ فائدہ فَبِمَا نَقْضِهِمْ الخ سے حاصل ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** زیادہ گناہوں فسق و فجور سے حافظہ کمزور ہو جاتا ہے،

کی ترتیب نہیں بدلتے تھے۔ رب تعالیٰ نے مٹانے کو ہٹانا کیوں فرمایا۔ یہ تو واقعہ کے خلاف ہے۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر سے معلوم ہو گیا کہ اگر تحریف سے مراد تحریف معنوی ہے تو مواضع سے مراد آیات کے محمل اور آیات کے مقصد ہیں۔ یعنی وہ آیات توریت کے مقصد غلط بیان کرتے ہیں۔ ان کو مقاصد سے ہٹا دیتے ہیں۔ اور اگر تحریف لفظی مراد ہے تو ہٹانے سے مراد مٹانا ہی ہے۔ کہ مٹائی ہوئی آیت اپنی جگہ سے ہٹا دی جاتی ہے۔ ہٹانا عام ہے۔

تیسرا اعتراض: عفو و صفح یعنی معافی اور درگزر میں کیا فرق ہے۔ یہاں ارشاد ہوا۔ فَاعْفُ اور فرمایا وَاصْفَحْ دونوں ایک ہی معلوم ہوتے ہیں۔ **جواب:** کسی جرم کو دل سے نکال دینا مجرم پر ناراض نہ رہنا معافی ہے۔ عفو کے معنی ہیں مٹانا اور مجرم کو منہ سے کچھ نہ کہنا سزا نہ دینا صفح یعنی درگزر ہے۔ غرض کہ عفو کا تعلق دل سے ہے اور درگزر کا تعلق زبان و ارکان سے ہے یہ دونوں ایک نہیں ہیں۔

چوتھا اعتراض: بعض مفسرین نے اس آیت فَاعْفُ عَنْهُمْ کو منسوخ مانا ہے۔ وہ کیوں؟ **جواب:** وہ حضرات معافی اور درگزر کے معنی کرتے ہیں حربی کفار سے جنگ نہ کرنا یہ حکم واقعی آیات جہاد سے منسوخ ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہاں ذمی یہود کی حرکتوں سے درگزر کرنا ہے۔ یہ حکم اب بھی باقی ہے سورۂ مائدہ کی کوئی آیت منسوخ نہیں جیسا کہ ہم نے عرض کیا۔

پانچواں اعتراض: اس آیت کریمہ میں یہود کے متعلق ارشاد ہوا۔ لَعَنّٰهُمْ۔ ہم نے ان کو رحمت سے دور کر دیا، ان پر پھٹکار کر دی۔ مگر یہود تو بڑے مال دار ہیں۔ اب تو ان کی بادشاہت بھی قائم ہو گئی۔ خاص فلسطین میں۔ پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ **جواب:** لعنتی آدمی کے پاس جو دنیاوی اُخروی نعمت آوے وہ رحمت نہیں ہوتی۔ پھٹکار و عذاب ہی ہوتی ہے۔ صفراوی مزاج والا جو کھاوے۔ اس سے صفرا بنتا ہے۔ یہود کا مال دولت ان کی ظاہری عزت ان کی زندگی موت قبر وحشر ان کے لئے سب لعنت ہے۔ وہ مال سے اور زیادہ گناہ کرتے ہیں۔ مومن کے لئے سب چیزیں رحمت ہیں کہ وہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیتا ہے۔ لہٰذا آیت بالکل حق ہے۔ اور انشاء اللہ ان کی یہ سلطنت ان کی بڑی خواری کا پیش خیمہ ہے۔ کسی کمزور کو بڑے پہلوانوں کے مقابلہ میں اکھاڑے میں کھڑا کر دیا جاوے تو انشاء اللہ یہ اس کے پچھاڑے جانے کا پیشہ خیمہ ہے۔ اللہ رسول سچے ہیں، انہوں نے جو خبر دی ہے حق ہے۔

تفسیر صوفیانہ

بے وفائی بدترین جرم ہے۔ جس سے انسان جانور سے بدتر ہو جاتا ہے۔ وفاداری اور صادق العہد ہونا بہت اعلیٰ وصف ہے۔ کفار مکہ ظہور نبوت سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امین اور صادق الوعد کے القاب سے یاد کرتے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

بیوفائی چوں سگاں راعار بود　　بیوفائی چوں رواداری نمود

حق تعالیٰ فخر آورد از وفا　　گست من اوفی بعہد غیرنا

صدق وعدہ اور وفاء عہد حق تعالیٰ کی صفات ہیں۔ جس بندے کو اللہ تعالیٰ یہ نعمتیں دے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔ وعدہ کسی

اور بغض دن قیامت تک اور عنقریب خبر دے گا ان کو اللہ اس کی
اور بغض ڈال دیا اور عنقریب اللہ انہیں بتادے گا
بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿١٤﴾
جو وہ کرتے تھے
جو کچھ وہ کرتے تھے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں یہود کی بدعہدیوں، وعدہ خلافیوں کا ذکر ہوا۔ اب عیسائیوں کی بدعہدیوں، وعدہ خلافیوں کا ذکر ہے۔ چونکہ یہود پہلے ہیں۔ عیسائی بعد میں اس لئے یہود کا ذکر پہلے ہوا، عیسائیوں کا بعد میں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں یہود کی تحریفوں کا ذکر ہوا کہ انہوں نے توریت کو بدل دیا۔ اب عیسائیوں کی تحریف کا ذکر ہے کہ یہ بھی یہود سے پیچھے نہ رہے۔ تبدیلی انجیل میں ان کی طرح بلکہ ان سے بھی سوا ہو گئے جیسا کہ نَسُوا حَظًّا الخ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں بدعہد یہود سے درگزر فرمانے کا حکم دیا گیا اب اشارۃً وعدہ خلاف عیسائیوں سے درگزر کا ذکر ہے۔

تفسیر

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَى أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ واؤ سر جملہ ہے اور مِنْ ابتدائیہ۔ یہ مِنْ متعلق مقدم ہے۔ اَخَذْنَا کا یہ مقدم کرنا اہتمام کے اظہار کے لئے ہے۔ رب العالمین نے عیسائیوں کو خود نہ فرمایا۔ النصاریٰ بلکہ فرمایا قَالُوا إِنَّا نَصَارَى جنہوں نے اپنے کو نصاریٰ کہا۔ دو وجہ سے ایک یہ کہ یہ نام رب نے انہیں نہ دیا بلکہ انہوں نے خود اپنا نام نصاریٰ رکھ لیا۔ بخلاف ہم مومنوں کے کہ ہمارا نام رب نے مسلمین رکھا۔ فرماتا ہے هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ (حج: ۷۸) دوسرے یہ بتانے کے لئے کہ وہ صرف زبانی طور پر اپنے کو نصاریٰ یعنی اللہ کا یا اللہ کے دین کا مددگار کہتے ہیں مگر عملاً مدد نہیں کرتے۔ ان کا یہ محض دعویٰ ہے عمل اس کے خلاف ہے۔ نصاریٰ یا ناصر بمعنی مددگار کی جمع ہے۔ چونکہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ۔ ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ اس لئے ان کو نصاریٰ کہا گیا۔ یا چونکہ یہ لوگ شام کی ایک بستی ناصرہ یا نصوریہ کے رہنے والے تھے اس لئے نصاریٰ کہلائے۔ بعض نے فرمایا کہ نصاریٰ نصران کی جمع ہے۔ جیسے ندمان کی جمع ندامی یا نصری کی جمع ہے جیسے مہرائے کی جمع مہاریٰ۔ **خیال رهے** کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسکندر رومی کے تین سو چار سال بعد بیت اللحم میں پیدا ہوئے۔ بیت اللحم بیت المقدس سے بارہ میل فاصلہ پر ہے۔ پھر جناب مریم انہیں مصر لے گئیں۔ جب آپ بارہ سال کے ہوئے تو آپ کو شام کی بستی ناصرہ میں لائیں۔ ناصرہ کے رہنے والوں کو ناصری یا نصاریٰ کہا جانے لگا۔ پھر دین عیسائیت کا نام نصرانیت اور عیسائیوں کا نام نصاریٰ ہو گیا۔ دیکھو تفسیر روح المعانی یہ ہی مقام۔ میثاق کے معنی بارہا عرض کیے جا چکے ہیں۔ ھم کا مرجع یا تو نصاریٰ ہیں یا یہود جن کا ذکر پچھلی آیت میں گزرا۔ دوسری صورت میں یہاں کاف تشبیہ پوشیدہ ہوگا۔ اور یہ منصوب بنزع الخافض ہوگا۔ یعنی جو لوگ اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں ہم نے ان

دنیا میں کرتے رہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ان کے سارے کرتوتوں کی خبر عنقریب دے گا اور ان پر فرد جرم قائم فرما کر سزا سنائے گا۔

خلاصہء تفسیر وہ لوگ جو نصرانیت کے مدعی ہیں اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی معرفت ان سے مضبوط عہد لیا کہ ہمارے محبوب ﷺ پر ایمان لانا، ان کے دین کی مدد کرنا۔ اگرچہ سارے نبیوں نے ہی اپنی امتوں سے یہ عہد لیا تھا کہ نبی آخر الزماں کا زمانہ پائیں تو ایمان لائیں مگر عیسیٰ علیہ السلام نے خصوصیت سے حضور پر ایمان لانے کا عہد لیا۔ کیونکہ اب انتظار کی گھڑیاں قریباً ختم ہو چکی تھیں، اب اور کسی نبی کی آمد نہ تھی، حضور ہی آنے والے تھے، آپ وہ صبح کا ستارہ تھے جو آفتاب کی آمد کی خبر دیا کرتا ہے اس لئے آپ نے خصوصیت سے یہ عہد لیا مگر وہ بہت جلد انجیل کی نصیحتوں کا بڑا حصہ بھول گئے یا انہوں نے بھلا دیا۔ ہم نے انہیں اس بھلاوے کی سزا دنیا میں تو یہ دی کہ ان کے فرقے بنا دیئے اور ان فرقوں کے درمیان قیامت تک دشمنی ڈال دی کہ وہ ہمیشہ آپس میں لڑتے بھڑتے اور دھول جوتا کرتے رہیں گے۔ ان کا ہر فرقہ دوسرے کو کافر کہتا اس پر لعنت کرتا رہے گا۔ اور عنقریب وقت آرہا ہے کہ قیامت میں ہماری بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور ہم ان کو ان کی ساری بدعقیدگیاں، بدعملیاں بتا کر گنا کر ان سے اقرار کرا کر انہیں سخت سزا دیں گے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں ہی توبہ کر کے اسلام کے دامن میں آجاویں۔

عیسائی تفرقہ بازی کی ابتدا کیسے ہوئی

روح البیان نے اس جگہ عیسائیوں کی فرقہ بندی کا عجیب واقعہ بیان فرمایا وہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کو عیسائیوں سے سخت عداوت تھی۔ ان کی عیسائیوں سے بارہا خطرناک جنگیں ہوئیں۔ یہود کا ایک بہت بڑا پوپ اپنی قوم سے بولا کہ میں ایسی تدبیر کرتا ہوں جن سے عیسائی ہمیشہ آپس میں ہی لڑتے رہیں۔ ہم سے لڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس نے اپنی ایک آنکھ پھوڑی اور اپنے آپ کو کانا کر کے عیسائیوں کے علاقہ میں گیا۔ اور بولا کہ تم مجھے پہچانتے ہو میں یہودی تھا۔ اور میری تمہاری بہت لڑائیاں ہوئی ہیں۔ مجھے تم سے سخت عداوت تھی۔ ایک رات حضرت روح اللہ عیسیٰ علیہ السلام خواب میں میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا تو میری قوم سے کیوں عداوت رکھتا ہے اور میرے منہ پر طمانچہ مارا جس سے میری یہ آنکھ جاتی رہی۔ میں نے حضرت روح اللہ کے ہاتھ پر توبہ کی۔ عیسائی بنا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے مجھے اپنے خاص علوم عطا فرمائے اور مجھے حکم دیا کہ میں تم لوگوں میں آکر وہ علوم تمہیں سکھاؤں۔ عیسائیوں کی زود اعتقادی تو مشہور ہی ہے۔ سارے عیسائی بولس (پولس) کے بہت ہی معتقد ہو گئے۔ بولس ایک بالا خانہ میں رہنے سہنے لگا جس میں ایک کھڑکی تھی، یہ اس بالا خانے میں اکیلا رہتا، اس بالا خانہ کے اردگرد عیسائیوں کا مجمع لگا رہتا۔ وہ کبھی اپنی کھڑکی کھولتا انہیں اپنا دیدار دیتا اور احکام شرعیہ سناتا۔ کبھی بری باتوں کا حکم دیتا پھر اس کی ایسی توجیہہ کرتا کہ عیسائی حیران رہ جاتے۔ ہوتے ہوتے اس کا علم و عمل کا شہرہ دور دور عیسائیوں میں ہو گیا۔ عیسائی دور

نے اپنے خدام سے فرمایا مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ (الصف: ۱۴) اللہ کے لئے میرا مددگار کون ہے تو حواریوں نے جواب دیا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (الصف: ۱۴) ہم ہیں اللہ کے مددگار اس لئے ان کو نصاریٰ کہا گیا۔ یعنی حضرت مسیح کے مددگار حضور کے صحابہ کی ایک جماعت کا نام انصار ہے۔ یعنی اسلام و مسلمین و مہاجرین کے مددگار۔ حضرات اولیاء اللہ میں ایک طبقہ کا نام غوث ہے یعنی عالم کے مددگار۔ یہ فائدہ بھی اِنَّا نَصٰرٰۤی سے حاصل ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** انسان کو چاہیے کہ اپنے نام اپنے لباس اپنی قوم کی لاج رکھے۔ ایسے کام کرے جو نام و مقام و لباس کے مناسب ہوں یہ فائدہ ''قَالُوْۤا'' کی دوسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ عالمگیر کے بہروپیہ نے فقیری لباس کی شرم کی تھی۔ علماء کو چاہیے کہ کام بھی عالموں کے سے کریں۔ شعر

کام وہ لے لیجئے تم کو جو راضی کریں!
ٹھیک ہو نام رضا تم پہ کروڑوں درود

پانچواں فائدہ: بدعقیدگی اور بدعملی کی سزا دنیا میں آپس کی پھوٹ، عداوت، دشمنی ہے۔ یہ فائدہ فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ سے حاصل ہوا۔ قوم میں اتفاق اللہ کی رحمت ہے۔ **چھٹا فائدہ:** عیسائی فرقوں کی آپس کی عداوتیں، دشمنیاں دائمی ہیں کبھی ختم نہیں ہوسکتیں۔ یہ فائدہ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ سے حاصل ہوا۔ جیسا کہ اب بھی دیکھا جارہا ہے اور دیکھا جاتا رہے گا۔ **ساتواں فائدہ:** قیامت میں رب تعالیٰ مجرموں کو ویسے ہی دوزخ میں نہیں بھیج دے گا بلکہ پہلے ان کے جرم بتائے گا، دکھائے گا، ان سے اقرار کرالے گا پھر سزا دے گا۔ باقاعدہ پیشی، گواہی، جرح وغیرہ سب کچھ ہوگی پھر سزا۔ یہ فائدہ وَسَوْفَ یُنَبِّئُهُمُ سے حاصل ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** قیامت اگرچہ بظاہر بہت دور ہے۔ مگر حقیقۃً بہت ہی قریب ہے اس لئے اس کی تیاری چاہیے۔ یہ فائدہ سَوْفَ یُنَبِّئُهُمُ میں سَوْفَ فرمانے سے حاصل ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ عیسائیوں کو احکام الٰہی بھول جانے کی دنیا میں بھی سزا دی گئی۔ آخرت میں بھی بھول جانا تو گناہ نہیں پھر اس پر سزا کیسی؟ **جواب:** اس اعتراض کے تین جواب ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام میں بھول و خطا پر معافی ہے۔ اس سے پہلے نہ تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام پر عتاب محبوبانہ ہوگیا۔ دوسرے یہ کہ یہاں بھول سے مراد چھوڑ دینا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا (اعراف: ۵۱) عیسائیوں نے دیدہ دانستہ احکام انجیل چھوڑ دیئے۔ تیسرے یہ کہ بھول جانے اور بھلا دینے میں بڑا فرق ہے۔ بھول جانے پر سزا نہیں، بھلا دینے پر سزا ہے۔ انہوں نے احکام انجیل بھلا دیئے تھے۔

دوسرا اعتراض: تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ عیسائیوں میں فرقہ بندی ایک یہودی بولس نے قائم کی۔ پھر رب تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا فَاَغْرَیْنَا۔ ہم نے عداوت ڈال دی۔ یہ تو بولس کا کام تھا۔ **جواب:** بولس کا یہ کام حق تعالیٰ کے ارادہ سے ہوا بندہ مظہر ہے۔ فاعل حقیقی رب تعالیٰ ہے۔

تیسرا اعتراض: اس آیت کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ میں آپس میں قیامت تک بغض و عداوت رہے

قیامت میں اور اس کے بعد ان کی عداوتیں ختم ہو جائیں گی۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ قیامت میں دوست بھی دشمن ہو جائیں گے سوا پرہیزگاروں کے۔ ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا۔ کہ اس سے مراد ہمیشگی ہے نہ کہ انتہاء اور اگر انتہا ہی مقصود ہو تو قیامت کے دن ان دنیاوی عداوتوں کی انتہا ہو جائے گی۔ اس دشمنی کا نتیجہ جنگ لڑائیاں ہیں۔ قیامت اور بعد قیامت دشمنی کی نوعیت دوسری ہوگی۔ بہر حال قیامت میں ایک نوعیت کی دشمنی کی انتہا ہو گی۔ نہ کہ جنسی دشمنی کی انتہا لہٰذا آیات میں تعارض نہیں۔

آٹھواں اعتراض: یہاں فرمایا کہ ہم نے عداوت و بغض ڈال دیا۔ عداوت و بغض تو ایک ہی چیز ہیں۔ پھر انہیں الگ الگ کیوں فرمایا؟ **جواب:** اس آیت کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ دشمنی عداوت ہے اور دل میں عداوت کا محفوظ رہنا بغض ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ان دونوں کے ذکر میں تکرار نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

محبتیں تین قسم کی ہیں۔ نفسانی، شیطانی، رحمانی و روحانی۔ نفسانی و شیطانی محبتیں مرتے ہی ختم ہو جاتی ہیں بلکہ عداوتوں میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ مگر رحمانی و روحانی محبتیں ابدالا باد تک قائم رہتی ہیں۔ دنیا میں بھی یہ دونوں محبتیں صرف ظاہری ہوتی ہیں، حقیقت میں عداوتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ محبتیں دل کی دل سے یا روح کی روح سے نہیں ہوتیں بلکہ نفس کی نفس سے ہوتی ہے۔ مگر رحمانی و روحانی محبتیں حقیقی ہوتی ہیں کیونکہ اس میں دل دل سے اور روح روح سے محبت کرتے ہیں۔ عیسائی فرقوں کی آپس کی محبتیں نفسانی یا شیطانی تھیں نہ کہ رحمانی و روحانی۔ کیونکہ ان میں سے روحانیت ختم ہو چکی تھی اس لئے فرمایا گیا کہ ہم نے ان میں عداوت و بغض تا قیامت ڈال دیا۔ یعنی ان کے دل و جان ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ لہٰذا ان کی ظاہری محبتیں بھی حقیقی عداوتیں ہیں جو محبت کی شکل میں نمودار ہیں۔ قیامت میں چونکہ حقیقت اللہ ہوگی۔ اس لئے اس دن یہ محبتیں اپنی اصلی حالت میں نمودار ہوں گی اس لئے فرمایا: **وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ** اہل وفاق میں عداوت و بغض نہیں اور اہل نفاق میں آپس میں محبت و انس نہیں ہو سکتی۔ اس آیت میں حقیقت کا بیان ہے۔ مخلصین مومنین کی دنیاوی عداوتیں بھی عارضی ہیں بلکہ حقیقی محبتیں ہیں جو ظاہری عداوتوں میں نمودار ہیں۔ قیامت کے دن اصل روپ میں نظر آئیں گی۔ رب فرماتا ہے: **وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ** (حجر: ۴۸)

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ
اے کتابیو تحقیق آئے تمہارے پاس رسول ہمارے جو بیان کرتے ہیں واسطے تمہارے
اے کتاب والو بیشک تمہارے پاس ہمارے رسول تشریف لائے کہ تم پر ظاہر فرماتے ہیں
كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ

شان نزول

ابن جریر نے بروایت حضرت عکرمہ بیان کیا کہ ایک بار یہود کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور اس نے حضور سرکار سے رجم کے متعلق پوچھا یعنی زانی کو سنگسار کرنا کیسا ہے؟ حضور انور ﷺ نے فرمایا: تم میں بڑا عالم کون ہے؟ انہوں اپنے بڑے پادری ابن صوریا! کی طرف اشارہ کیا۔ کہ عرب میں یہود کا بڑا پادری عالم یہی ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے اس سے فرمایا اے ابن صوریا تجھے قسم ہے اس کی جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توریت اتاری، تجھے قسم ہے اس کی جس نے بنی اسرائیل پر طور اکھیڑا، تجھے قسم ہے اس کی جس نے بنی اسرائیل کے لئے من وسلویٰ اتارا۔ حضور انور نے اس شان سے اسے قسمیں دیں کہ ابن صوریا کانپ گیا۔ فرمایا۔ سچ بول توریت میں زانی کے رجم کا حکم ہے یا نہیں؟ ابن صوریا بولا قسم ہے اس رب کی جس کی قسمیں مجھے آپ نے دیں کہ توریت میں رجم کا بہت تاکیدی حکم ہے۔ فرمایا کہ پھر تم لوگوں نے رجم کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ وہ بولا کہ ہماری قوم میں زنا بہت پھیل گیا خصوصاً بڑے لوگ زیادہ کرنے لگے۔ تب ہم نے اس بڑھتی ہوئی وبا کو قابو سے باہر دیکھ کر اس کی سزا ہلکی کر دی یعنی زانی کا سر مونڈھ دینا، منہ کالا کر دینا اور سو کوڑے مار دینا۔ اس موقعہ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں حضور ﷺ کی تعریف و تائید فرمائی (روح المعانی)۔

تفسیر

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا۔ قرآن مجید میں اکثر آیات توحید میں قُلْ کا ارشاد ہوتا ہے۔ جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (اخلاص:۱) اور آیات نعت میں قُلْ ارشاد نہیں ہوتا۔ کیونکہ توحید کے گواہ حضور ﷺ ہیں اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا (احزاب:۴۵) اور حضور کی رسالت اور حضور کی صفات عالیہ کا گواہ حق تعالیٰ ہے وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (فتح:۲۸) چونکہ یہاں حضور ﷺ کی صفات عالیہ کا ذکر ہے اس لئے قُلْ ارشاد نہ ہوا۔ حضور کی بعثت سارے انسانوں کی طرف ہے اس لئے ایک جگہ فرمایا گیا۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (النساء:۱۷۴) لیکن بمقابلہ دوسرے کفار کے اہل کتاب پر حضور کی اطاعت زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ دوسرے لوگ حضور کی صفات سے بے خبر تھے۔ اہل کتاب کو سب کچھ خبر تھی۔ کہ توریت و انجیل میں حضور کی صفات کا پورا پورا بیان تھا۔ نیز عرب میں اہل کتاب کی عزت تھی۔ ان کے ایمان لانے سے دوسروں کے ایمان لانے کی قوی امید تھی۔ اس لئے یہاں خصوصیت سے اہل کتاب سے خطاب فرمایا گیا۔ اہل کتاب سے مراد یا کتاب اللہ ماننے والے ہیں یا اسے جاننے والے۔ پہلی صورت میں سارے کتابیوں سے خطاب ہے۔ دوسری صورت میں ان کے پادریوں سے۔ کتاب سے مراد جنس کتاب ہے جس میں توریت، انجیل وغیرہ سب داخل ہیں۔ لہٰذا یہاں یہود و عیسائی دونوں مراد ہیں۔ اگرچہ حضور کی تشریف آوری تمام دنیا والوں کو مفید ہے مگر اہل کتاب کو زیادہ مفید کہ حضور کی تشریف آوری سے ان کی کتابوں کی تصدیق ہوگئی، ان کے نبیوں کی عظمت و عزت کو چار چاند لگ گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی والدہ مریم سے یہود کی تہمتیں دور ہوگئیں۔ غرض کہ دوسرے کفار کو حضور سے ایمان ملا مگر اہل کتاب کو حضور سے ایمان بھی ملا اور یہ تصدیقیں بھی۔ جیسے سورج سے عام زمین کو روشنی ملتی ہے۔ اچھی زمین ہو یا زمین شور مگر

۲ آیت ۱۳ میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ہماری خاطر لعنتی بنا جو سولی دیا جاوے وہ لعنتی ہے (۳) کتاب یرمیاہ باب ۲۳ آیت ۱۱ میں ہے کہ نبی اور کاہن دونا پاک ہیں اسی کی آیت ۱۶ میں ہے۔ یروشلم کے نبیوں سے ہی تمام ملک میں بے دینی پھیلی ہے (۴) حضرت یہودا (یوسف علیہ السلام کے بھائی) نے اپنی بہو سے زنا کیا۔ اسے چھنالے کا حمل رہا۔ دیکھو کتاب پیدائش باب ۳۹ آیت ۲۰ تا ۲۴۔ یہ ہیں عیسائیوں کی انجیل شریف پر مہربانیاں مسلمان بلکہ تمام انسان سوچیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیائے کرام پر کتنے احسانات فرمائیں۔ کہ انہیں عیسائیوں کی ان تہمتوں سے بری فرمایا۔ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ یہ جملہ پہلے جملہ يُبَيِّنُ لَكُمْ پر معطوف ہے اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صفت کا ذکر ہے۔ يَعْفُوا کا فاعل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں كَثِيرٍ سے مراد انہیں یہود و نصاریٰ کی بہت سی وہ دوسری قسم کی خیانتیں ہیں۔ جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر نہ فرمایا۔ یہاں بھی کثیر سے حقیقی کثرت مراد ہے نہ کہ اضافی یعنی وہ محبوب تمہاری بہت سی خیانتوں کی معافی دیتے ہیں۔ انہیں ظاہر نہیں کرتے ورنہ وہ تمہاری ساری خیانتوں، ساری اصلی آیات سے پورے پورے واقف ہیں۔ یہ وہ خیانتیں ہیں جن کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ چونکہ حضور دنیا میں دوسرے نبیوں یحییٰ و زکریا علیہما السلام وغیرہ کی طرح توریت جاری کرنے اس پر عمل کرانے کے لئے تشریف نہیں لائے بلکہ تمام گزشتہ کتابیں منسوخ فرمانے تشریف لائے ہیں۔ اس لئے ساری توریت کو ظاہر نہیں کرتے۔ ان کے ظاہر نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خبردار بھی نہیں۔ خبردار تو وہ ہر چیز سے ہیں مگر جن کے ظاہر کرنے کی ضرورت ہے وہ ظاہر کرتے ہیں، جن کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں وہ ظاہر نہیں فرماتے۔ عدم اظہار بے علمی کی دلیل نہیں قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ یہ جملہ نیا ہے۔ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صفات کا ذکر ہے۔ كُمْ میں خطاب تو سارے انسانوں سے ہے کہ حضور سب کے پاس ہی تشریف لائے یا اہل کتاب سے دوسرا احتمال زیادہ قوی ہے کیونکہ ابھی ابھی انہی سے خطاب ہوا مِّنَ اللّٰهِ کا تعلق یا تو جَآءَ سے ہے تو مِنْ ابتدائیہ ہے یعنی اللہ کی طرف سے۔ یا مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ کا حال مقدم ہے۔ یعنی اللہ کا نور لہٰذا اس جملہ کی دو تفسیریں ہیں۔ پہلی تفسیر کا منشا یہ ہوگا کہ حضور دنیا میں آ کر نور نہ بنے، کسی سے نورانیت حاصل نہ کی بلکہ رب کی طرف سے اس کی عطا سے نور بن کر دنیا میں آئے حضور کی تمام صفات ربانی ہیں۔ ہم صرف انسانیت لے کر دنیا میں آتے ہیں باقی تمام صفات، عالم، حاکم، حافظ، قاری یہاں آ کر بنتے ہیں اور یہ تمام صفات یہاں ہی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ صرف انسانیت لے جاتے ہیں حضور سب کچھ رب کی طرف سے لائے اور ان میں سے کوئی صفت دنیا میں چھوڑ کر نہ گئے تمام صفات سے اب بھی موصوف، آپ اب بھی رسول، نور، برہان، شفیع ہیں اور رہیں گے۔ دوسری تفسیر میں آیت کا منشا یہ ہے کہ حضور اللہ کا نور ہیں، انہیں رب نے نور بنایا ہے، کسی انسان نے منور نہیں کیا لہٰذا کسی کے بجھائے بجھ نہیں سکتے۔ گیس بجلی انسان کے مصنوعاتی نور ہیں تو انہیں انسان بجھا دیتا ہے، مگر چاند، سورج ربانی نور ہیں کسی کے بجھائے نہیں بجھتے۔ حضور کا نور کوئی نہیں بجھا سکتا۔ اس نور کی تنوین تعظیمی ہے۔ یعنی بڑا نور۔ خیال رہے کہ نور وہ ہے جو خود ظاہر ہو۔ دوسرے ظاہر کرے یہ نور دو قسم کا ہوتا ہے۔ نور حسی جیسے سورج، چاند، تارے، بجلی، گیس، چراغ وغیرہ جس سے آنکھیں منور

البیان وروح المعانی) بِہٖ کو لفظ اللہ سے پہلے فرمایا گیا تا کہ حصر کا فائدہ ہو۔ کیونکہ اب اللہ تعالیٰ لوگوں کو صرف حضور سے اور صرف قرآن سے ہی ہدایت دیتا ہے اب کسی اور نبی کسی اور کتاب سے ہدایت نہیں مل سکتی۔ ہدایت کے دو معنی ہیں۔ راہ دکھانا اور منزل پر پہنچا دینا۔ حضور نے سارے جہان کو راہ خدا دکھائی۔ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (فرقان: ۱) اور مسلمانوں کو رب تک پہنچا دیا۔ یَهْدِیْ مضارع فرما کر ہمیشگی بتائی گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ حضور کے ذریعہ ہدایت دیتا رہے گا۔ جب سورج ہمیشہ نور دیتا ہے، دن نکالتا رہتا ہے، موسم بناتا، پھل پکاتا، زمانہ گزارتا رہتا ہے تو حضور تو نبوت کے آسمان کے سورج ہیں۔ ہمیشہ آپ سے ایمان، عرفان وغیرہ ملتے ہی رہیں گے۔ گزشتہ نبیوں کی ہدایتیں وقتی تھیں، حضور کی ہدایت دائمی ہے۔ بِہٖ سے اشارۃً دو باتیں بتائی گئیں۔ ایک یہ کہ اب کسی نبی کی پیروی ہدایت نہیں۔ ہدایت صرف حضور کے پاس ہے دوسرے یہ کہ عقلی یا دلائل سے ہی توحید ماننے والا ہدایت پر نہیں۔ حضور کی معرفت توحید ماننے والا ہدایت پر ہے۔ رات کو ہر گھر میں الگ چراغوں سے نور لیا جاتا ہے مگر دن میں ہر شاہ و گدا کے گھر میں ایک سورج کی ہی دھوپ ہوتی ہے۔ رات کے نور مختلف ہیں مگر دن کا نور ایک ہے۔ حضور سورج ہیں اسلام دھوپ ہے تیسرے یہ کہ اگرچہ ہادی حقیقی رب تعالیٰ ہے مگر ہدایت کا وسیلہ حضور ہیں کہ حضور کے توسط سے رب ہدایت دیتا ہے۔ اگر یہ واسطہ بیچ میں نہ ہو تو ہدایت ملنا غیر ممکن ہو جاوے۔ جیسے ہماری پیدائش کے لئے ماں باپ، علم کے لئے استاذ وسیلہ ہیں۔ ایک بہ نے بہت سے معمے حل کر دیئے۔ وسیلوں کے دروازوں پر جانا پڑتا ہے، ان کا احسان بھی ماننا پڑتا ہے۔ یوں ہی حضور کے دروازے پر جاؤ ان کا احسان مانو۔ ہدایت کے معنی اور اقسام ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں عرض کر چکے ہیں مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ، مَنْ موصولہ ہے یا موصوفہ اتَّبَعَ صلہ ہے یا صفت یہ یَهْدِیْ کا مفعول اول ہے۔ اتباع اور اطاعت کے معانی اور ان کے آپس میں فرق ہم اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ (آل عمران: ۳۲) کی تفسیر میں عرض کر چکے ہیں۔ یہاں اتباع سے مراد ہے تقدیری اتباع یعنی جس کے متعلق علم الٰہی میں آچکا کہ یہ اتباع کرے گا۔ رضوان مصدر ہے بمعنی رضاء اور اس سے مراد ہے رضائے الٰہی کے اسباب۔ دین اسلام اور اچھے اعمال۔ ہ کا مرجع رب تعالیٰ ہے۔ سُبُلَ جمع ہے سبیل کی۔ ہم سبیل اور طریق کا فرق سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں عرض کر چکے ہیں۔ سلام سے مراد یا تو سلامتی ہے بمعنی امن یا اس سے دار السلام یعنی جنت مراد ہے یا رب تعالیٰ کا نام ہے اور سُبُلَ السَّلٰمِ یا تو رِضْوَانَهٗ کا بدل ہے یا یَهْدِیْ کا مفعول بہ دوم ہے۔ **خیال رھے:** کہ رضوان ر کے کسرہ سے بھی آتا ہے اور ر کے پیش سے بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس نور یا اس کتاب یا ان دونوں کے ذریعہ۔ ان لوگوں کو جنت کے راستوں یا رب کے راستوں یا سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے جس کے مقدر میں لکھا ہے۔ رب کی مرضی پر چلنا وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ۔ یہ جملہ پہلے جملہ یَهْدِیْ پر معطوف ہے۔ هُمْ کا مرجع وہ ہی من ہے جو مَنِ اتَّبَعَ میں گزرا۔ چونکہ وہ معنی جمع تھا اس لئے اس کے لئے ضمیر جمع لائی گئی۔ ظلمات سے مراد کفر، گمراہی، بدعملی ہے۔ اور نور سے مراد ایمان، خوش عقیدگی، نیک عمل ہیں۔ چونکہ کفر بہت ہیں۔ ایمان صرف ایک۔ اس لئے ظلمات کو جمع اور نور کو واحد لایا گیا۔ اذن سے مراد حکم یا ارادہ یا توفیق ہے اس کا تعلق یخرج

جاویں گے انہیں کسی سے پوچھنا نہ پڑے گا یہ سب نعمتیں رب کا خاص فضل ہیں۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضور ﷺ تمام کتب آسمانی کی آیات و احکام پر مطلع ہیں اور یہود و نصاریٰ کی خیانتوں سے بھی پورے پورے واقف ہیں کہ کون سی آیات اصل میں کیا تھی پھر تبدیل کر کے کیا بنائی گئی یا کس طرح چھپا دی گئی۔ یہ فائدہ **یُبَیِّنُ لَکُمْ** سے حاصل ہوا۔ کسی چیز کو وہ ہی بیان کر سکتا ہے جو اس چیز سے واقف ہو۔ اس سے پتہ چلا کہ حضور تمام زبانوں کو جانتے ہیں کیونکہ توریت زبان عبرانی میں تھی۔ حضور تو فریادی جانوروں، لکڑیوں، پتھروں کی زبان بھی جانتے ہیں تو انسانوں کی زبانیں کیوں نہ جانیں۔ آج حضور کے آستانہ پر ہر زبان ہر ملک کے لوگ صلوٰۃ و سلام عرض و معروض کرتے ہیں۔ کوئی فرشتہ حضور کو ترجمہ کر کے نہیں بتاتا۔ نیز لوگوں کی خفیہ حرکتوں سے خبردار ہیں۔ یہود توریت کی آیتوں میں چھپ کر تبدیلیاں کرتے تھے مگر حضور کو پتہ تھا۔ **دوسرا فائدہ:** حضور ﷺ نے یہود و نصاریٰ کی بہت سی خیانتوں کو ظاہر فرما دیا جن کے اظہار کی ضرورت تھی اور بہت سی خیانتوں سے درگزر فرمائی جن کے اظہار کی ضرورت نہ تھی مگر جانتے سب تھے۔ یہ فائدہ **یَعْفُوْا** سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** حضور ﷺ اللہ کا نور ہیں۔ رب تعالیٰ نے جیسے حضور کو اور بہت صفات بخشے۔ حضور رسول اللہ، نبی اللہ، حبیب اللہ ہیں۔ یونہی حضور نور اللہ ہیں۔ یہ فائدہ **مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ** کی پانچویں تفسیر سے حاصل ہوا۔ حضور کی نورانیت صرف عقلی نہیں بلکہ حسی بھی ہے۔ چنانچہ حضور انور کے جسم اقدس کا سایہ نہ تھا۔ حضور کے چہرۂ انور سے نور دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے حضور کے اسماء طیبہ میں ایک نام نور بھی ہے۔ روح سب کی نور ہے۔ حضور کا جسم اطہر بھی نور ہے۔ حضور کی اولاد مطہرات بھی نور ہے۔ اس لئے حضرت عثمان کا لقب ذوالنورین ہے یعنی دو نور والے اس لئے کہ آپ کے نکاح میں حضور کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ و کلثوم آگے پیچھے آئیں۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح منہ یعنی روح اللہ ہیں۔ یونہی حضور انور **مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ** یعنی نور اللہ ہیں۔ کسی شہر کو منورہ نہیں کہا جاتا۔ سوائے مدینہ منورہ کے یہ شہر نورانی کیوں کہلایا اس لئے کہ یہاں اللہ کے نور کا ظہور ہے، ان کی تجلی گاہ ہے۔ **چوتھا فائدہ:** حضور کی نورانیت میں کمی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے نور ہیں۔ یہ فائدہ **مِّنَ اللّٰهِ** کی پہلی تفسیر سے حاصل ہوا۔ دیکھ لو اس نُور کو بجھانے کی کوشش کرنے والے بجھ گئے۔ حضور چمکتے ہی رہے **يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ** (الصف: ۸) اور کیوں نہ ہو کہ حضور اللہ کی حفاظت میں ہیں۔ جیسے لیمپ کی بتی چمنی کی حفاظت میں ہوتی ہے۔ فرمایا ہے: **مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ** (نور: ۳۵) ان دونوں آیتوں میں بھی نور سے مراد حضور انور ﷺ ہیں۔ **پانچواں فائدہ:** حضور ﷺ قرآن کتاب اللہ سے افضل ہیں۔ یہ فائدہ نور کو کتاب اللہ پر مقدم کرنے سے حاصل ہوا۔ حضور ﷺ خیر خلق اللہ ہیں یعنی تمام مخلوق سے بہتر اور قرآن مجید یعنی نقوش کاغذ، کتابھی مخلوق ہیں۔ لہٰذا حضور اس سے بھی افضل ہیں نیز حضور انور نبی ہیں۔ قرآن مجید حضور کا معجزہ ہے۔ نبی کا درجہ معجزہ سے بڑا ہوتا ہے۔ نیز قرآن مجید کو دیکھنے والا پڑھنے والا قاری ہے، کعبہ کو دیکھنے والا حاجی، جہاد کرنے والا غازی اور فیصلہ کرنے والا

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب حضور ﷺ کی تشریف آوری تمام جہان کی طرف تمام جہان کے لئے ہوئی تو یہاں صرف اہل کتاب سے کیوں فرمایا کہ ہمارے رسول تمہارے پاس آئے۔ کیا حضور دوسروں کے پاس نہیں آئے؟ **جواب:** اس کے چند جوابات ابھی تفسیر میں گزر گئے۔ ایک یہ کہ اس آیت کریمہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف تمہارے پاس ہی حضور آئے بلکہ معنی یہ ہیں کہ تمہارے پاس بھی آئے یہ نہ سمجھو کہ ہم اہل کتاب کو حضور کی ضرورت نہیں۔ سورج کی ضرورت سب کو ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ رسول جن کی دھوم میں تمہاری کتابوں تمہارے پیغمبروں کی بشارتوں سے مچی ہوئی ہیں۔ وہ تمہارے پاس آئے۔ تم سے پہلے اہل کتاب ترستے چلے گئے تم فخر کرو اور ان کی اطاعت کرو۔ تیسرے یہ کہ یہ رسول دوسروں کے پاس بشیر و نذیر بن کر آئے تمہارے پاس تمہاری کتابوں کے مصدق بن کر بھی آئے، تم پر ان کا احسان زیادہ ہے۔ بارش و سورج کا احسان اعلیٰ زمین پر بمقابلہ بنجر زمین کے زیادہ ہے۔ لہٰذا آیت بالکل ظاہر ہے۔ چوتھے یہ کہ دوسروں کے پاس حضور اس لئے آئے کہ انہیں علم دین سے پاک کریں اور قرآن و حکمت سنائیں اور سکھائیں اور تمہارے پاس اس لئے بھی آئے کہ تمہاری کتابوں کی چھپی آیات، چھپے احکام ظاہر فرما دیں یعنی تم کو دوسروں سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

دوسرا اعتراض: جب حضور خود نور ہیں تو پھر یہ کیوں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ حضور کے ذریعہ لوگوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔ یہ نور کون سا ہے جس کی طرف نکالا گیا۔ **جواب.** حضور بیرون ہیں جیسے سورج اور اس نور سے مراد انسان کا اندرونی نور ہے۔ جیسے آنکھوں کی روشنی یہ روشنی بھی حضور ہی کے ذریعہ ملتی ہے۔ اس نور میں تین احتمال ہیں۔ ہم کو صفاتی ظلمتوں سے نورانی صفات کی طرف نکالتا ہے۔ ہم ماں کے پیٹ سے جاہل، بے شعور، بے ادب، ناواقف پیدا ہوتے ہیں۔ حضور کے ذریعہ ہم کو علم، دانش، شعور وغیرہ کے نور ملتے ہیں۔ کچھ ماں کی گود میں، کچھ باپ کے سایہ میں، کچھ استاذ و شیخ کی معرفت۔ دوسرے ظلماتی اعمال سے نورانی اعمال کی طرف نکالتا ہے۔ نماز روزہ وغیرہ نورانی اعمال ہیں، محرمات شرعیہ نورانی اعمال۔ تیسرے یہ کہ دل کی ظلمتوں سے دل کے نور کی طرف نکالتا ہے۔ دل زمین کی طرح ہے بذات خود تاریک کسی کی تجلی سے روشن۔ جب روشن ہو جاتا ہے تو متقی بن جاتا ہے۔ وہ جو حدیث پاک میں ہے کہ اپنے دل سے فتویٰ لو۔ جسے یہ اچھا کہے وہ نیکی ہے اور جسے برا کہے وہ گناہ یا عثمان غنی سے فرمایا کہ تم جو چاہو کرو تم جنتی ہو چکے۔ یہ انہیں نورانی دلوں کا ذکر ہے۔ نورانی دل ہمیشہ حضور کے قدموں میں رہتا ہے۔ جیسے مانوس بکری کو رسی کی ضرورت نہیں۔ مانوس چڑیا کو پنجرے میں رکھنے کی حاجت نہیں۔ وہ تو ویسے ہی مالک سے ہل مل گئی۔ یونہی منور دل مانوس دل ویسے ہی حضور کے دامن میں رہے گا۔ جسم کے وطن مختلف ہیں مگر دل کا وطن یار کی گلی ہے۔

تیسرا اعتراض: حضور ﷺ نور نہیں ہیں وہ تو ہم جیسے بشر ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف:۱۱۰)۔ **جواب.** حضور ﷺ بشر بھی ہیں نور بھی ہیں۔ جیسے حضور رسول بھی ہیں نبی بھی۔ یا جیسے عیسیٰ علیہ السلام بشر

اس نور مجسم کی نورانیت دیکھ سکیں۔ ورنہ بصیرت والوں سے سن کر مان لیں اندھے کو چاہیے کہ اگر وہ خود نہ دیکھ سکے تو دیکھنے والوں کی مان لے۔ دیکھنے والوں کا ایک شعر سنو۔

گرچہ صد مرحلہ دورم زبہ پیش نظرم وجھہ فی نظری کل غدات و عشی

چھٹا اعتراض: اگر حضور نور ہیں تو والدین سے پیدا کیوں ہوئے، نور کسی سے پیدا نہیں ہوتا۔ **جواب:** نور کا ماں باپ سے پیدا نہ ہوسکنا کسی آیت یا حدیث سے ثابت نہیں۔ ہماری روح، آنکھ کی روشنی، قوت خیالیہ یہ سب چیزیں نور ہیں اور ماں باپ سے پیدا ہوتی ہیں۔ جب روح اللہ، کلمۃ اللہ ماں کے شکم سے پیدا ہو سکتے ہیں تو نور اللہ بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ جنت میں حوروں کے شکم سے نورانی مخلوق پیدا ہوگی جس کا حوالہ ابھی گزرا۔ ان سب باتوں کا لحاظ نہ کرو تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور نور بھی ہیں بشر بھی بشریت کی بنا پر پیدائش ہے۔

ساتواں اعتراض: یہاں سُبُلَ السَّلٰمِ جمع کیوں فرمایا گیا۔ سلامتی کا راستہ تو ایک ہی ہے۔ یعنی اسلام پھر جمع فرمانے کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** یہ راستہ نوعاً ایک ہے۔ مگر فرداً بہت یعنی اسلام راستہ ہے سلامتی کا۔ پھر اسلام کا ہر رکن سلامتی کا راستہ ہے اور اسلام کے ارکان تو بہت ہیں للہذا سلامتی کے یہ راستے بھی بہت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب سلامتی کے راستے ہیں۔ یہاں جمع فرمانا افراد کے لحاظ سے ہے اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (فاتحہ: ۵) میں صراط واحد فرمانا نوعیت کے لحاظ سے ہے۔

آٹھواں اعتراض: پھر یَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ میں صراط واحد کیوں ارشاد ہوا۔ وہاں بھی جمع ہی فرمانا چاہیے تھا۔ **جواب:** اگر صراط مستقیم سے مراد آخرت میں جنت کا راستہ ہے تب تو وہ ایک ہی ہے جس میں پل صراط پڑتا ہے للہذا اسے واحد فرمانا نہایت صحیح ہے اور اگر اس سے مراد جنت کا وہ راستہ ہے جو دنیا میں ہے تو یہاں نوع کی وحدانیت مراد ہے۔ کیونکہ دنیا میں جنت کا راستہ صرف ایک ہے یعنی اسلام باقی تمام دین گمراہی ہیں اور دوزخ کے راستے تب بھی واحد فرمانا درست ہے۔

نواں اعتراض: اس آیت میں ارشاد ہوا کہ جو رضائے الٰہی کی اتباع کرے ہم اسے سلامتی کے راستوں کی رہبری فرمائیں گے۔ جو شخص رضاء الٰہی کی اتباع کر چکا وہ تو ہدایت پا چکا پھر ہدایت دینے، راہ دکھانے کے کیا معنی؟ **جواب:** اس اعتراض کا ایک جواب تو وہ ہے جو ابھی تفسیر میں گزر گیا کہ یہاں اتباع کرنے سے مراد علم الٰہی میں اس کی اتباع کرنا یعنی جس کے متعلق علم الٰہی میں آچکا کہ یہ رضاء الٰہی پر چلے گا۔ للہذا مطلب واضح ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہدایت سے مراد ہے ہدایت پر قائم رکھنا یعنی جو اللہ کی مرضی پر چلے گا اسے اللہ تعالیٰ سلامتی کے راستوں کی ہدایت پر قائم رکھے گا۔ جیسا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (فاتحہ: ۵) کی تفسیر میں عرض کیا گیا۔ **خلاصہ:** یہ ہے کہ علماء کرام کے نزدیک اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو رضاء الٰہی کی اتباع کرنا چاہے۔ اسے اللہ تعالیٰ اس نور کے ذریعہ ہدایت دیتا ہے جیسے شہروں کے چوراہوں پر راستہ بتانے والی

تمہاری چھپائی ہوئی آیات کو ظاہر فرماتے ہیں۔ پھر خیال رہے کہ حضور نور ہیں اور قرآن مجید مبین ہے۔ حضور قرآن کو ظاہر کرتے ہیں، چمکاتے ہیں۔ قرآن کریم حضور کے صفات حمیدہ بیان کرتا ہے۔ اب ہدایت حضور ﷺ کی ذات سے وابستہ ہے جو حضور کے دامن سے وابستہ ہوگا ہدایت پر ہوگا، جو الگ ہوگا گمراہ ہوگا۔ حتیٰ کہ قرآن سے ہدایت ملے گی تو حضور کے ذریعہ ملے گی۔ قرآن کتاب ہے، حضور نور ہیں۔ نور کے بغیر کتاب سے فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ نظر آئے نہ سمجھا جائے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ
البتہ تحقیق کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا بے شک اللہ وہ مسیح ہیں بیٹے مریم کے
بیشک کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہیں
قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ
فرمادو کہ تو کون مالک ہوتا ہے طرف سے اللہ کے کسی چیز کا اگر ارادہ کرے اللہ یہ کہ ہلاک کردے
تم فرمادو پھر اللہ کا کوئی کیا کر سکتا ہے اگر وہ چاہے کہ ہلاک کردے
الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ
مسیح بیٹے مریم کو اور ماں کو ان کی اور ان کو جو ہیں زمین میں سب کو
مسیح ابن مریم اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو
وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ
اور اللہ کا ہی ہے ملک آسمانوں اور زمین کا اور ان کا جو درمیان ہے ان کے
اور اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان
يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾
پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور اللہ اوپر ہر چیز کے قدرت والا ہے
جو چاہے پیدا کرتا ہے اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں ارشاد ہوا تھا کہ نبی کریم ﷺ اہل کتاب کی بہت سی چھپائی ہوئی چیزوں کو ظاہر فرماتے ہیں۔ اب اہل کتاب کے ایک خصوصی عقیدے کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جو انہوں نے تبدیل کر دیا کہ اصل عقیدہ چھپالیا، نیا عقیدہ اختیار کر لیا۔ گویا یہ آیت کریمہ پچھلی آیت کی تفصیل یا تفسیر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں ارشاد ہوا تھا کہ اے کتابیو! تمہارے

فرقہ توحید کا قائل ہے مگر حضرت مسیح میں الوہیت کا حلول مانتا ہے۔ یہاں اسی ہی تیسرے فرقے کا بیان ہے۔ دوسری آیات میں باقی دو فرقوں کا تذکرہ ہے۔ خیال رہے کہ یعقوبیہ اور ملکانیہ فرقے صراحۃً حضرت مسیح کو خدا نہیں کہتے تھے، وہ توحید کے مدعی تھے مگر ان کے عقیدے سے یہ لازم آتا تھا کہ حضرت مسیح خود اللہ ہوں۔ یہاں ان کے عقیدے کا نتیجہ اور اس کا لازم مراد ہے وہ کہتے تھے کہ حضرت مسیح میں لاہوت اور ناسوت ہے۔ لاہوت رب تعالیٰ کو کہتے تھے اس لئے ان کا عقیدہ اسی طرح بیان ہوا (روح المعانی وغیرہ) جیسے انسان میں حیوانیت اور ناطقیت ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ انسان حیوان ہے اور انسان ناطق ہے۔ لفظ اللہ اسم اِنَّ ہے اور اَلْمَسِيْحُ الخ اس کی خبر هُوَ بیان حصر کے لئے ہے۔ یہاں حصر میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ الوہیت کو مسیح میں منحصر کیا گیا ہو دوسرے یہ کہ مسیح کو الوہیت میں منحصر کیا جاوے تیسرے یہ کہ جانبین میں حصر ہو یعنی اللہ مسیح ہی ہیں یا مسیح اللہ ہی ہیں یا اللہ مسیح ہیں اور مسیح اللہ ہیں۔ پہلا احتمال زیادہ قوی ہے جیسے زید هو المنطلق کے ہوتے ہیں۔ زید چلنے والا ہی ہے کہ چلنے کو زید میں منحصر نہیں کیا جاتا بلکہ زید کو چلنے میں منحصر کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ جناب مسیح کو اس لئے الٰہ کا محل مانتے تھے کہ آپ بغیر باپ پیدا ہوئے۔ آپ مٹی سے پرندے کو اصل پرندہ بنا دیتے تھے لہٰذا آپ خالق ہوئے۔ آپ ناقابل علاج بیماروں کو شفا دیتے تھے لہٰذا آپ شافی الامراض ہوئے۔ آپ مردہ زندہ کر دیتے تھے لہٰذا آپ محی یعنی زندہ کرنے والے ہوئے۔ یہ صفات رب تعالیٰ کی ہیں نہ کہ بندے کی لہٰذا آپ بندے نہیں الٰہ ہیں۔ ان تینوں دلائل کے نہایت نفیس جوابات یہاں رب تعالیٰ نے ارشاد فرمائے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن مریم فرما کر ان عیسائیوں کی پرزور تردید فرما دی گئی۔ کیونکہ کسی کا بیٹا ہونا الوہیت کے خلاف ہے۔ یونہی کسی سے بننا کسی میں سے نکلنا الوہیت کے خلاف ہے۔ لہٰذا نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہو سکتے ہیں نہ حضرت آدم علیہ السلام۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم کے بیٹے ہیں، ان کے شکم سے پیدا ہوئے اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنے۔ یہ بھی بتا دیا گیا کہ آپ بغیر باپ صرف ماں سے پیدا ہوئے۔ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔ اس جملہ میں الوہیت مسیح کی دوسری پرزور تردید ہے۔ قُلْ میں خطاب یا تو حضور ﷺ سے ہے یا ہر قرآن پڑھنے والے سے یا ہر عقل رکھنے والے سے۔ پہلا احتمال زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ رب تعالیٰ کی ذات و صفات کے گواہ ہیں۔ توحید الٰہی پر حملہ کرنے والوں کو جواب حضور ہی دیں تو مناسب ہے۔ مدعی پر جو اعتراض مدعی الیہ کا ہو اس کا جواب گواہ دیتا ہے۔ فَمَنْ کی ف یا تو عاطفہ ہے اور یہ جملہ ایک پوشیدہ عبارت پر معطوف ہے یا جزائیہ ہے اور یہ جملہ ایک پوشیدہ شرط کی جزا (روح المعانی) مَنْ میں انکاری سوال ہے يَّمْلِكُ بنا ہے ملکٌ بمعنی قدرت سے اور یہاں دفع کرنے کی قدرت مراد ہے۔ مِنَ اللّٰهِ میں ایک مضاف پوشیدہ ہے۔ یعنی مِنْ اَمْرِ یا مِنْ اِرَادَةِ اللّٰهِ۔ شَيْئًا۔ يَّمْلِكُ کا مفعول بہ ہے یا مِنَ اللّٰهِ حال مقدم ہے شَيْئًا کا اور معنی یہ ہیں کہ جو شی، رب کی طرف سے جاری ہوگئی اس کے ارادے میں آ گئی اس کا مالک رب کے مقابلہ میں کون ہے کہ خلاف ارادہ الٰہی اسے روک دے یا یہ معنی ہیں کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں تو کون ہے جو اللہ کے ارادہ اللہ کے چاہے میں سے کسی چیز کو دور کر سکے، دفع کر سکے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ان تکلفات سے پاک ہے، یہ ترجمہ

عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر ہر طرح قادر ہے۔ جسے چاہے جیسے چاہے پیدا فرما دے۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر شئی کے معانی اور قدرت کے اقسام اور اس جملہ کے مضمون کی پوری شرح پارہ الٓمٓ میں عرض کی جا چکی ہے وہاں مطالعہ فرماؤ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے خلق پر قادر ہے نہ کہ ہر چیز کے کسب پر۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے عیسائیوں کے مشہور عقیدے الوہیت مسیح کی تردید میں چار قوی دلائل فرمائے اور عیسائیوں کے تین دلائل کے بہترین جواب دیئے چنانچہ تردید الوہیت مسیح کے لئے حسب ذیل دلائل قائم فرمائے۔ ان کا ابن مریم ہونا، ماں کے شکم سے پیدا ہونا، آپ کو موت آسکنا، اللہ تعالیٰ کا تمام آسمانی زمینی چیزوں کا مالک ہونا جن میں حضرت مسیح بھی داخل ہیں۔ یعنی آپ کا مملوک الٰہی ہونا۔ اللہ تعالیٰ کا قادر و غالب ہونا اور حضرت مسیح کا مقدور یعنی تحت قدرت داخل ہونا۔ یہ دلائل عبدیت مسیح کے ہیں اور عیسائیوں کے تمام دلائل کے جوابات یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ میں دے دیئے گئے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ وہ عیسائی نرے کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام خود الٰہ ہی ہیں کیونکہ ان میں الوہیت ایسے حلول کیے ہے جیسے پھول میں رنگ و بو یا آگ میں روشنی و گرمی۔ اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے جواب میں فرما دو کہ کیا کوئی شخص خواہ جناب مسیح ہوں یا کوئی اور ایسا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کو موڑ دے کہ خدا جو کرنا چاہے اسے نہ کرنے دے اگر اللہ تعالیٰ خود جناب مسیح ان کی والدہ بلکہ تمام زمینی چیزوں زمینی آدمیوں کو موت دینا چاہے تو وہ انہیں نہ مرنے دے۔ عیسائی بھی ایسی جرأت نہ کر سکیں گے کہ حضرت مسیح میں رب تعالیٰ کا مقابلہ کرنے کی طاقت مان لیں۔ یہ خیال رکھو کہ تمام آسمان اور ساری زمین اور ان کے درمیان کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، وہ مالک حقیقی ہے، سب اس کی مملوک۔ جناب مسیح آسمان و زمین کے درمیان کی ہی مخلوق ہیں تو وہ بھی اللہ کے بندے اللہ کے مملوک ہوئے پھر وہ اللہ کیسے ہو سکتے ہیں بندہ مالک کا ہمسر نہیں ہو سکتا اور تم لوگ نہ تو حضرت مسیح کے بغیر باپ پیدا ہونے سے دھوکہ کھاؤ نہ ان کے اس معجزے سے دھوکہ کھاؤ کہ وہ مٹی کے پرندے بنا کر ان میں دم کر کے اصل پرندہ جاندار بنا دیتے تھے، مردوں کو زندہ، بیماروں کو اچھا کر دیتے تھے۔ ان صفات کی وجہ سے وہ الٰہ نہیں ہو گئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے جیسے چاہے پیدا فرماتا ہے۔ اسے ہر چیز پر ہر طرح قدرت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ پیدا ہونا رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے ہے۔ یونہی حضرت مسیح کے دم سے مٹی کے پرندوں کا جاندار بن جانا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے ان معجزات کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے قائل ہو جاؤ۔ خود جناب مسیح کو خدا مت مان لو۔ اللہ اللہ ہے بندہ بندہ ہے۔ **خیال رہے:** کہ اللہ تعالیٰ نے بعض چیزیں بغیر کسی اصل کے پیدا فرما دیں محض اپنی قدرت سے جیسے آسمان و زمین بعض چیزیں کسی اصل سے بنائیں۔ بعض غیر جنسی اصل سے جیسے حضرت آدم اور بہت جاندار چیزیں جو مٹی سے بنیں اور بنتی رہتی ہیں اور بعض ہم جنس اصل سے صرف نر سے جیسے حضرت حوا۔ یا صرف عورت سے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا نر و مادہ دونوں سے جیسے عام انسان اور بعض چیزیں دوسری مخلوق کے واسطے سے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے کچھ چڑیاں پیدا فرما دیں۔ ان سب کا خالق رب تعالیٰ

کسی مقبول بندے کو خدا یا خدا کا بیٹا مان لیں تو ان کے جواب میں ان ماننے والوں کو برا کہا جاوے گا۔ ان مقبولوں کا احترام قائم رکھا جاوے گا اور اگر کسی مردود کو لوگ خدا کہنے لگیں تو عابد و معبود دونوں کی برائی بیان کی جاوے گی۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ان عیسائیوں کو تو کافر کہا جو جناب مسیح کو خدا کہتے تھے۔ کہ فرمایا: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا۔ مگر جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نہایت احترام سے نام لیا کہ انہیں مسیح فرمایا یعنی چھو کر مردے زندہ فرمانے والے اور بیماروں کو شفا دینے والے اور انہیں ابن مریم فرمایا۔ یعنی بغیر والد کے معجزانہ طور پر صرف ماں سے پیدا ہونے والے۔ ان کے معجزات ان کی عظمتوں کو قائم رکھا۔ لیکن جہاں بت پرستوں کی تردید فرمائی گئی تو ان کے ساتھ ان کے بتوں کی بھی خبر لی گئی کہ فرمایا گیا کہ اگر ان سے مکھی بھی کچھ چھین لے تو چھڑا نہ سکیں۔ حتیٰ کہ فرمایا: ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (حج: ۷۳) یعنی یہ عابد و معبود طالب و مطلوب دونوں ہی ضعیف ولاچار و حقیر ہیں حتیٰ کہ ایک جگہ ارشاد ہوا اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (انبیاء: ۹۸) تم اور تمہاری معبود چیزیں اینٹ پتھر سب دوزخ کا ایندھن ہو دونوں فرقوں کی تردید میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقبولوں کی مقبولیت ان کے پوجا کیے جانے سے کم نہیں ہو جاتی۔ کعبہ میں بت رکھ دیئے جاویں تو کعبہ کعبہ ہی رہتا ہے۔ افسوس کہ موجودہ زمانہ کے وہابی یہ فرق نہ سمجھ سکے۔ **آٹھواں فائدہ:** اللہ کے سوا ہر چیز قابل فنا ہے یعنی ممکن ہے رب تعالیٰ کی ذات و صفات فنا سے وراء ہیں۔ یعنی واجب ہیں۔ یہ فائدہ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ سے حاصل ہوا۔ **مسئلہ:** اللہ کے سوا ہر چیز قابل فنا ہے۔ یعنی ممکن ہے مگر بعض ممکنات کو فنا نہیں وہ ابدی ہیں۔ جیسے جنت اور وہاں کی نعمتیں اور بعد قیامت جنتی لوگ۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: اُكُلُهَا دَآئِمٌ (الرعد: ۳۵) اور فرماتا ہے: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (آل عمران: ۱۵) یونہی دوزخ اور وہاں کے عذاب اور بعد قیامت دوزخی لوگ کہ انہیں فنا نہیں۔ فنا کے قابل ہونا اور ہے اور فنا ہو جانا کچھ اور۔ بہرحال بہت سی مخلوق ابدی ہے کہ اسے فنا نہیں۔ مگر ماسوی اللہ کوئی چیز ازلی نہیں۔ ازلیت مخلوقیت کے خلاف ہے۔ کوئی چیز ہمیشہ سے نہیں رب کے پیدا کرنے سے ہوئی۔ **نواں فائدہ:** حضور ﷺ بہت شان والے ہیں تمام نبیوں میں آپ کی انوکھی ہی آن ہے۔ دیکھو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار معجزے دیکھ کر عیسائیوں نے انہیں خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دیا۔ ہمارے حضور کے ہزاروں معجزات دیکھ کر کسی مسلمان نے انہیں خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہا۔ سب نے عبداللہ و رسولہ ہی مانا۔ یہ ہے حضور کی طاقت خداداد۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کل چار مردے زندہ کیے، حضور نے باذن پروردگار اس سے کہیں زیادہ مردے زندہ کیے۔ دیکھو مدارج النبوت، لکڑی پتھروں سے کلمہ پڑھوالیا، ڈوبا سورج واپس کیا، چاند توڑ کر جوڑ دیا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سارے عیسائی کافر ہیں۔ مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف بعض عیسائی کافر ہیں کل نہیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ (البینہ: ۶) یعنی اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر ہوئے۔ من تبعیضیہ سے معلوم ہوا کہ بعض اہل کتاب کافر ہیں۔ آیات میں تعارض ہے۔ **جواب:** اس آیت کریمہ میں کفروا کے معنی ہیں کافر

لازم آجاتا ہے۔ پانی میں شکر حلول کرے تو یقیناً پانی کو میٹھا کہا جاوے گا یہاں لزومی قول مراد ہے۔ **خیال رہے:** کہ بندہ رب تعالیٰ کا مظہر تو ہوسکتا ہے بلکہ ہے مگر اس کا محل نہیں ہوسکتا۔ آئینہ سورج کے مقابل ہو کر سورج کا مظہر بن جاتا ہے مگر سورج کا محل نہیں ہو جاتا۔ بندہ کو رب کا مظہر ماننا ایمان ہے۔ محل ماننا کفر یہ فرق خیال رہے حال ہمیشہ محل کا محتاج ہوتا ہے اور مظہر اصل کا محتاج ہے۔

چھٹا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ نبی ولی کسی چیز کے مالک نہیں، قادر نہیں۔ ملکیت قدرت سب رب کی ہے۔ جیسا کہ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ الخ سے معلوم ہوا۔ جو مسلمان حضور کو مالک قادر مانیں وہ بھی عیسائیوں کی طرح کافر ہیں۔

جواب: یہاں ذاتی ملکیت ذاتی عرفانی قدرت کی نفی ہے جو لازم الوہیت ہے۔ کسی بندے میں ایسی ملکیت وقدرت ماننا کفر وشرک ہے۔ اللہ کی عطا سے اس کے چاہنے سے ہم اپنے مکان وجائیداد کے مالک ہیں کہ انہیں فروخت بھی کر سکتے ہیں، ان کا کرایہ بھی کھا سکتے ہیں۔ باشاہ ملک کا مالک ہے۔ حضرت سلیمان ہوا، جنات، انسانوں کے مالک تھے۔ رب فرماتا ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ (ص:۳۶) حضرات انبیاء کرام رب کے بندے اس کے مملوک ہیں۔ مگر ہمارے آقا ہمارے مولیٰ ہیں۔ شہر کا ڈی سی بادشاہ کا نوکر ہے مگر ہمارا حاکم ہے۔ ہماری ماں ہمارے باپ کی خادمہ ہے مگر ہماری مخدومہ ہے۔ حضرات انبیاء کو اپنی نسبت سے دیکھنا چاہیے کہ وہ ہمارے کون ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

بندے سے خدا تعالیٰ کو جاننا معرفت ہے اور بندہ میں اس کو ماننا کفر ہے۔ عیسائی اس میں اور سے میں فرق نہ کر سکے مظہر کو محل مان بیٹھے کافر ہو گئے۔ رب وہ ہے جو اوپر نیچے ہونے سے پاک ہے۔

مولانا فرماتے ہیں

دامن او گیر اے یار دلیر — کو منزہ باشد از بالا و زیر
نے چو عیسےٰ سوے گردوں برشود — نے چو قارون در زمین اندر رود
ربی الاعلیٰ ست ورد آں جہاں — رب ادنیٰ در خور ایں ابلہاں

عیسائی آئینہ اور آئینہ دار میں فرق نہ کر سکے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئینہ جمال الٰہی تھے انہیں رب مان بیٹھے لہٰذا کافر ہوئے۔ اس آیت کریمہ میں یہ ہی بیان فرمایا گیا کہ ظل اصل کے تابع ہوتا ہے۔ اصل ظل کے تابع نہیں ہوتا۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام اصل میں الٰہ ہیں تو ان کے افعال ومعجزات حکم الٰہی کے تابع کیوں ہیں۔ پھر تو چاہیے تھا کہ وہ رب تعالیٰ کی مخالف بھی کر سکیں کہ رب تعالیٰ انہیں یا ان کی ماں کو یا کسی اور کو موت دینا چاہے اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچالیں۔ جب یہ ناممکن ہے تو ان کا الٰہ ہونا بھی ناممکن ہے۔ شعر

آئینہ رونما است ولے رونمی شود — بندہ خدا نما است ولے اونمی شود

یہودیوں کا عام بشر میں سے ہونا ان پر عذاب الٰہی آنے سے ثابت فرمایا جا رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ حضرت مسیح موت سے اپنے کو بھی نہیں بچا سکتے۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ وہ جناب باوجود نبی اللہ ہونے کے عیسائی کفار کو عذاب الٰہی سے نہیں بچا سکتے۔ کیوں کہ عیسائیوں کے متعلق رب تعالیٰ عذاب کا ارادہ فرما چکا ان کے کفر وطغیان کی وجہ سے اور کوئی شخص ارادہ الٰہی کو بدل نہیں سکتا۔

شان نزول

ابن جریر اور بیہقی نے دلائل النبوت میں حضرت عبد اللہ ابن عباس سے روایت کی کہ حضور انور ﷺ کی خدمت میں نعمان ابن آصی، بحری ابن عمرو، وشاش ابن عدی یہود کی جماعت حاضر ہوئی۔ حضور ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور اسلام قبول نہ کرنے پر خدا کے عذاب سے ڈرایا۔ یہ لوگ بولے کہ ہم تو اللہ کے پیارے، اللہ کے بیٹے ہیں۔ ہم کو عذاب ہو سکتا ہی نہیں، آپ دوسروں کی فکر کریں انہیں عذاب سے ڈرائیں، اور عیسائی عموماً اپنے کو اللہ کا بیٹا اور اللہ تعالیٰ کو آسمانی باپ کہتے تھے۔ کیونکہ ایک بار حضرت مسیح نے فرمایا تھا کہ میں اپنے اور تمہارے باپ کے پاس جا رہا ہوں۔ اور ہم کو عذاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حضرت مسیح ہمارے گناہوں کے کفارہ میں سولی پا چکے۔ ان کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (روح المعانی، تفسیر صاوی، خازن وغیرہ)۔

تفسیر

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ چونکہ یہاں یہود ونصاریٰ سے ان کی جماعتیں مراد ہیں اور جماعت مؤنث ہے۔ اس لئے قالت مؤنث ارشاد ہوا۔ جب فاعل جمع مکسر ہو تو فعل مذکر کا صیغہ بھی آ سکتا ہے اور مؤنث کا بھی جیسے **قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ** (ابراہیم: ۱۱) اور جیسے **وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ** (یوسف: ۳۰) یہاں قول سے مراد یا تو زبانی دعویٰ ہے یا دلی اعتقاد۔ یہود ونصاریٰ سے مراد یا تو وہ ہی جماعت ہے جس نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر یہ دعویٰ کیا تھا یا اس زمانہ کے سارے یہودی عیسائی یا ان کے سارے اولین وآخرین تا قیامت ہونے والے۔ تیسرا احتمال زیادہ قوی ہے کیونکہ تمام عیسائیوں، یہودیوں کا یہ ہی عقیدہ ہے ابناء جمع ہے ابن کی ابن کے معنی ہوتے ہیں بیٹا۔ مگر یہاں بمعنی اولاد ہے۔ کیونکہ ان کے مرد تو اپنے کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اور کہتے ہیں اور ان کی عورتیں اپنے کو اللہ کی بیٹیاں کہتی ہیں۔ **اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ** میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں مضاف پوشیدہ ہے۔ یعنی **اَبْنَاءُ اَنْبِيَاءِ اللّٰهِ** ہم اللہ کے نبیوں کے بیٹے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ عیسائی و یہودی بنی اسرائیل تھے اور اولاد انبیاء اس لئے ان کا یہ دعویٰ تھا یا یہود تو حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور عیسائی جناب عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور یہودی اپنے کو حضرت عزیر کا کنبہ سمجھتے ہیں۔ عیسائی اپنے کو جناب مسیح کا قریبی عزیز سمجھتے ہیں اور بیٹے کے پیارے بھی گویا بیٹے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے اپنے کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ کلمہ مجاز ہو۔ یعنی ہم خداوند تعالیٰ سے ایسا قرب رکھتے ہیں جیسا بیٹا باپ سے۔ بہر حال یہ دونوں جماعتیں اپنے کو حقیقۃً خدا کا بیٹا نہیں مانتیں۔ بلکہ یہودی صرف حضرت عزیر کو اور عیسائی صرف عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ اس لئے رب تعالیٰ نے ان کی اس بکواس کی تردید میں اپنا اولاد و ماں باپ سے پاک ہونے کا ذکر نہ فرمایا بلکہ دوسرے

رب تعالیٰ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی مخلوق مباشرت بالید سے بنا۔ فرمایا گیا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ (ص:۷۵) دوسرا تواضع وانکسار کے لئے بشر کہنا۔ جیسے حضرات انبیاء کرام نے اپنے کو بشر کہا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (کہف:۱۱۰) تیسرے اہانت کے لئے بشر کہنا جیسے شیطان نے کہا تھا قَالَ لَمْ اَکُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ (حجر:۳۳) یہاں اہل کتاب کو بشر فرمانا ان کی اہانت کے لئے ہے۔ یعنی تم میں سوا بشریت کے اور کوئی کمال نہیں۔ متقی مومن بنو گے بخشے جاؤ گے ورنہ سزا پاؤ گے۔ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ۔ یہ عبارت پچھلے مضمون کی دلیل ہے یعنی دیگر انسانوں کی طرح تم بھی عام انسان ہو۔ تم میں مومن بھی ہیں، کافر بھی، متقی بھی اور فاجر بھی۔ اللہ تعالیٰ تم میں سے مومنوں کو بخشے گا، کافروں کو سخت عذاب دے گا۔ متقیوں کو بخشے گا، فاجروں کو اگر چاہے گا، بخش دے گا، چاہے گا تو گناہوں کی سزا دے گا۔ خیال رہے کہ مغفرت رب تعالیٰ کو محبوب ہے اس لئے اس کا ذکر پہلے ہوا۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم میں سے مومن گناہ گاروں کو جنہیں چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔ یہ مطلب نہیں کہ مومن متقیوں کو چاہے گا تو بخشے گا۔ چاہے گا تو بلاوجہ سزا دے گا۔ لہٰذا آیت واضح ہے۔ وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ اس آیت کی تفسیر بارہا ہو چکی ہے کہ لِلّٰہِ میں لام ملکیت کا ہے اور یہاں عالم اجسام کا ذکر ہے جو آسمان و زمین اور ان کے درمیانی چیزوں کا نام ہے۔ دوسرے عالم جیسے عالم انوار، عالم ارواح، عالم امر کا یہاں ذکر نہیں اس فرمان عالی کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف ملکیت، عبدیت سے نسبت کرے۔ یہ کہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بندے مملوک ہیں، اس کی مخلوق ہیں، اس کے قبضہ میں ہیں، اس کے عابد ہیں۔ کہ انسان کی عزت اسی میں ہے۔ کوئی اپنے کو رب کا بیٹا اس کا بھائی بھتیجا نہ کہے۔ تم سب یہاں اس کی مملوک و مخلوق ہو اور سب کو وہاں اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اسے اپنے عقائد، اعمال، اقوال کا حساب دینا ہے تو یہاں اپنے اعمال و اقوال کو درست کرو۔ مقصد یہ ہے۔ کہ کسی کی پکڑ سے بچنے کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ زور سے بچا جاوے یا زر سے یا زاری سے۔ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے، قادر مطلق ہے۔ اس کی پکڑ سے بچنے کے لئے زور یا زر کام نہیں آسکتے وہاں صرف زاری کام آتی ہے۔ شعر

زور را بگذار زاری را بگیر   رحم سوئے زاری آید اے فقیر

خلاصہ تفسیر

یہود و نصاریٰ جہاں اور بہت سی بے دینیوں، گمراہیوں، کفریات میں مبتلا ہیں وہاں وہ اپنے متعلق اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہیں کہ ہم کو اچھے عقائد، اچھے اعمال کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم جو چاہیں اعمال کریں۔ جنت ہماری ہے۔ کیوں کہ ہم خدا کے محبوب بیٹے بیٹیاں ہیں۔ اس لئے کہ ہم خدا کے بیٹے کے گروہ اس کے خاندان سے ہیں۔ یہود کہتے ہیں کہ عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں، ہم ان کے خاندان سے ہیں۔ عیسائی سمجھتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں، ہم ان کے خاندان سے ہیں۔ ہم کو رب تعالیٰ نہ پکڑے گا نہ عذاب دے۔ اے محبوب! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اے مسلمانو! تم ان کو جواب دو کہ اگر تم خدا کے پیارے بیٹے ہو کسی گناہ پر تمہیں کوئی عذاب نہ ہوگا۔ بہرحال جنتی ہو تو تم پر گزشتہ زمانوں میں تمہاری بداعمالیوں کی وجہ سے دنیا میں آسمانی عذاب کیوں آئے حتیٰ کہ تم ایک زمانہ میں بندر، سور بنا کر ہلاک کر

تَعْصَی الرَّسُوْلَ وَاَنْتَ تَظْھَرُ حُبَّہٗ ھٰذَا الْمُعَمَّرِیُّ فِی الْفَعَالِ بَدِیْعٌ
لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقًا لَاَطَعْتَہٗ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

حضرت سعدی نے کیا خوب فرمایا

ہر کہ سیمائے راستاں دارد سر خدمت بر آستاں دارد

حضرت انبیائے کرام رب کے محبوب اور اس کے اعلیٰ درجے کے مطیع ہیں بلکہ اطاعت سے محبوبیت حاصل ہوتی ہے۔ ہاں کبھی محبوبیت سے اطاعت نصیب ہوتی ہے۔ حضرت مریم پیدائشی محبوبۂ رب العالمین تھیں۔ تو انہیں اطاعت بھی علی الکمال میسر ہوئی۔ **پانچواں فائدہ:** بغیر ایمان و عمل اچھا نسب محض بے کار ہے۔ کافر کے لئے نسب سے کچھ فائدہ نہیں نہ اس کے لئے نبی کی اولاد ہونا فائدہ مند۔ یہ فائدہ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ سے حاصل ہوا۔ کہ رب تعالیٰ نے ان بنی اسرائیل کو جو نبیوں کی اولاد تھے، محض بشر فرمایا۔ ان کی تمام فضیلتوں کی نفی فرما دی۔ کنعان نبی زادہ تھا مگر کفار کے ساتھ ڈوبا کیونکہ خود کافر تھا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہودی صرف عزیر علیہ السلام کو عیسائی صرف عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ اپنے سارے لوگوں کو نہ خدا کا بیٹا کہتے تھے نہ کہتے ہیں۔ پھر قرآن کریم کا یہ فرمان کیوں کر درست ہوا کہ یہود و نصاریٰ اپنے کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر میں گزر گیا۔ کہ یہ لوگ پیدائش کے لحاظ سے صرف ان دو حضرات کو ہی خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ مگر دوسرے معنیٰ سے اپنے کو خدا کا بیٹا بناتے تھے۔ یعنی ہم خدا تعالیٰ کو بیٹے کی طرح پیارے ہیں۔ یا ہم خدا کے بیٹے عزیر یا عیسیٰ علیہ السلام کے کنبے ہیں لہٰذا گویا اس کے بیٹے ہی ہیں۔ وہاں حقیقۃً بیٹا مراد ہے اور یہاں مجازی بیٹا مراد۔

دوسرا اعتراض: اگر دنیاوی تکالیف بندے کی محبوبیت کے خلاف ہیں۔ تو نبیوں ولیوں کو یہ تکالیف کیوں پہنچتی ہیں۔ وہ تو رب تعالیٰ کے محبوب بندے ہیں۔ پھر فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ درست کیسے ہوا۔ پھر یہود و نصاریٰ اس کے جواب میں یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم کو دنیاوی تکالیف ایسے ہی پہنچیں جیسے حضرات انبیاء کرام کو پہنچیں حالانکہ وہ محبوب بندے ہیں، ایسے ہی ہم بھی محبوب ہیں اور ہم کو یہ تکالیف پہنچیں۔ لہٰذا یہ دلیل مکمل کیسے ہوئی؟ **جواب:** یہاں تکالیف کا ذکر نہیں بلکہ دنیاوی اور اخروی عذابوں کا ذکر ہے جیسے دنیا میں صورتیں مسخ ہونا۔ آسمان سے پتھر برسنا جنہیں خود یہود بھی عذاب کہتے تھے۔ یوں ہی آخرت میں چالیس دن دوزخ میں رہنا جس کے یہود بھی قائل تھے۔ یونہی یہود کو دنیاوی عزت و عظمت سے محروم کر دیا جاتا۔ باوجودیکہ وہ اولاد انبیاء ہیں۔ یہ وہ عذاب ہے جن سے ان کی مردودیت ثابت ہوتی ہے۔

تیسرا اعتراض: رب تعالیٰ نے یہاں تو یہود کو بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ فرمایا اور ان کے تمام کمالات کی نفی فرما دی۔ مگر دوسری آیت میں یہود کے متعلق ارشاد ہوا۔ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (بقرہ: ۴۷) میں نے تم کو تمام جہانوں پر فضیلت دی ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔ **جواب:** اس آیت کریمہ میں موجودہ یہودیوں سے خطاب ہے۔ جو بدعقیدہ، بدعمل، بے

یہاں دنیا میں تم پر تمہاری بدکاریوں کی وجہ سے عذاب آ گئے تو وہاں بھی عذاب آئیں گے۔ تم اپنے کو خدا کا بیٹا پیارا نہ سمجھو بلکہ مجرم بندہ سمجھ کر توبہ کرو۔ رب کے ہاں محض نسب نہیں دیکھا جاتا ایمان وعمل کی پرسش ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس غلط خوش فہمی سے بچائے، توبہ کی توفیق دے۔ اے مسلمان! خیال رکھ کہ دنیا میں بار بار نہیں آنا جو کرنا ہے کر لے۔ حضرت بلہے شاہ قصوری فرماتے ہیں۔

نت نت کیسی استغفار
توبہ کر لے ایک ہی بار
ایس وطن دا ایک ہی پھیرا
مڑ نہیں آونا دوجی بار
توبہ کر لے ایک ہی بار

قرآن کتاباں چاروں فیر
کر دے چانن وچ اندھیر
پہلے پھیر لے دل کا پھیر
پھر کر توبہ استغفار
توبہ کر لے ایک ہی بار

بلہے شاہ دی سنو حکایت
جس کا مرشد شاہ عنایت
مرشد ملیا ہوئی ہدایت
مرشد کر گیا بیڑا پار
توبہ کر لے ایک ہی بار

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ
اے کتابیو بے شک آئے تمہارے پاس ہمارے رسول جو بیان کرتے ہیں واسطے تمہارے
اے کتاب والو بیشک تمہارے پاس ہمارے رسول تشریف لائے کہ تم پر ہمارے احکام ظاہر
عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ
اوپر بند ہو جانے رسولوں کے یہ کہ کہو تم نہیں آیا ہمارے

خلاف ہے۔ کیونکہ یہود حضرت داؤد علیہ السلام کو نبی مانتے ہیں، زبور شریف کو آسمانی کتاب تسلیم کرتے ہیں حالانکہ داؤد علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بہت عرصہ بعد ہوئے۔

تفسیر يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ یہاں ندا یا اظہار غضب کے لئے ہے یا اظہار کرم کے لئے یا غافلوں کو بیدار فرمانے کے لئے۔ پہلا احتمال زیادہ قوی ہے۔ کہ اظہار غضب کے لئے ہے۔ کیوں کہ وہ اہل کتاب عناد و بغض کی وجہ سے حضور کی نبوت کے انکاری تھے۔ اہل کتاب سے مراد یا تو صرف یہود ہیں جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوتا ہے یا یہود و عیسائی دونوں، دوسرا احتمال زیادہ قوی ہے۔ کہ قرآن کریم میں الفاظ کے عموم کا لحاظ ہوتا ہے نہ کہ خصوصی شان نزول کا اگرچہ اہل کتاب عقیدۃً مشرک و کافر تھے انہیں مشرکین و کافرین کے لفظ سے خطاب ہونا چاہیے تھا مگر چونکہ ان کو اللہ کے سچے نبیوں، سچی کتابوں سے نسبت تھی۔ اگرچہ جھوٹی و غلط نسبت ہی سہی۔ اس نسبت کا احترام کرتے ہوئے انہیں کافر یا مشرک کے بجائے اہل کتاب کے لفظ سے خطاب ہوا۔ اہل کتاب کے معنی ہیں کتاب کو جاننے والے یا کتاب آسمانی کو ماننے والے۔ پہلی صورت میں کتابیوں کے پوپ و پادریوں سے خطاب ہے دوسری صورت میں عام کتابیوں سے دوسرے معنی زیادہ موزوں ہیں۔ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا چونکہ مدینہ کے اہل کتاب و مشرکین و کفار کی طرح محمد ابن عبد اللہ کی تشریف آوری تو مانتے تھے محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے منکر تھے یا حضور انور کی ولادت کے تو قائل تھے مگر حضور کی تشریف آوری، آپ کی بعثت کے انکاری تھے۔ اس لئے اس مضمون کو تاکیدی قد سے شروع فرمایا گیا۔ حضور کی ولادت اور تشریف آوری یعنی بعثت کا فرق ہم ابھی کچھ پہلے بیان کر چکے ہیں۔ حضور کی تشریف آوری نبوت کے لحاظ سے ساری مخلوق کی طرف ہے۔ دعوت کے لحاظ سے سارے انسانوں کی طرف اور کتب آسمانی کی تصدیق کے لحاظ سے سارے مؤمنین اہل کتاب کی طرف اور پوپ پادریوں کے چھپائے ہوئے مسائل بدلی ہوئی آیات کو ظاہر فرمانے کے لحاظ سے کفار اہل کتاب کی طرف ہے یہاں چوتھی حیثیت کا ذکر ہے۔ اس لئے خصوصی طور پر کتابیوں کو مخاطب کر کے فرمایا قَدْ جَآءَكُمْ۔ کیونکہ آگے حضور کی صفت بیان کا ذکر ہے۔ جیسے سورج نورانیت دینے کے لئے سارے عالم پر طلوع کرتا ہے۔ اور دانہ پکانے کے لئے باغوں پر پھل پکانے پھول پکانے کے لحاظ سے باغوں پر گندی زمین کو خشک کر کے پاک بنانے کے لئے ناپاک زمین پر۔ لعل بنانے کے لئے بدخشاں کے پہاڑوں پر طلوع کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا ایک طلوع عام ہے، باقی چند طلوع خاص۔ پھر جیسے سورج کے غروب سے اس کا طلوع یعنی چمکنا اور ظہور ختم ہو جاتا ہے، اس کا وجود ختم نہیں ہوتا یونہی حضور ﷺ کی وفات سے حضور کا ظہور ختم ہوا، آپ کا وجود یا نبوت ختم نہ ہوئی۔ ہم موت سے فنا ہو جاتے ہیں حضرات انبیاء خصوصاً سید الانبیاء ﷺ موت سے ہم سے چھپ گئے وہاں فنا نہیں بہر حال یہاں صرف اہل کتاب سے خطاب فرمانا کہ تمہارے پاس یہ رسول تشریف لائے، بالکل مناسب ہے۔ چونکہ ان اہل کتاب نے حضور کو رسول نہیں مانا اور حضور سے فیض نہ لیا اس لئے رَسُوْلُكُمْ نہ فرمایا بلکہ رَسُوْلُنَا ارشاد ہوا۔ مسلمانوں نے حضور کو مانا، حضور سے سب کچھ لیا۔ لہٰذا ان کے متعلق رَسُوْلُكُمْ بھی ارشاد ہوا۔ اور مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (توبہ: ۱۲۸) بھی۔ يُبَيِّنُ لَكُمْ یہ عبارت رَسُوْلُنَا سے

انور کی تشریف آوری کی حکمت کا بیان ہے۔ اَنْ تَقُوْلُوْا سے پہلے کراھۃً پوشیدہ ہے یا اَنْ سے پہلے لام پوشیدہ ہے اور اَنْ کے بعد لا مقدر۔ اصل میں لِئَلَّا تھا۔ قول سے مراد یا تو دنیا میں لوگوں سے کہنا ہے یا آخرت میں بارگاہ الٰہی میں عرض کرنا ہے۔ مِنْ زائدہ تنکیر یہ ہے۔ بشارت کے ساتھ اگر تصدیق کا ذکر ہو تو اس سے کسی نبی کی تشریف آوری کی بشارت مراد ہوتی ہے اور اگر اس کے ساتھ ڈرانے کا ذکر ہو تو رحمت بخشش معافی کی بشارت و خوشخبری مراد ہوتی ہے۔ یہاں بشارت دوسرے معنی میں ہے کیونکہ اس کے بعد وَّلَا نَذِیْرٍ۔ ہمارے حضور کسی نبی کے بشیر نہیں۔ کیوں کہ آپ کے بعد نبی کوئی نہیں۔ ہاں حضور اللہ کی رحمت، بخشش وغیرہ کے بشیر ہیں یعنی یہ محبوب اس لئے تشریف لائے تا کہ تم کل قیامت میں رب تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی بدکاریوں کا یہ عذر نہ کر سکو کہ مولیٰ گزشتہ نبیوں کی تعلیم دنیا سے گم ہو چکی تھی، کوئی اور نبی ہمارے پاس پہنچا نہیں، ہم نیک اعمال کس کی تعلیم سے کرتے یا تم دنیا میں لوگوں سے نہ کہو کہ ہماری کتابوں نبیوں نے آخری بشیر و نذیر کی آمد کی خبر دی تھی مگر وہ تو کوئی نہ آئے لٰہذا ہماری کتابیں غلط ہیں فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ یہ عبارت ان کی معذرت کا جواب ہے۔ بشیر و نذیر سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کم سے خطاب اہل کتاب سے ہے۔ فقد کی ف فصیحہ ہے۔ جس سے پہلے ایک عبارت پوشیدہ ہے یعنی اب تم اپنی بے علمی کا عذر نہ کر سکو گے کہ تمہارے پاس عربی قریشی ہاشمی مطلبی نبی تشریف لے آئے جو بشیر بھی ہیں نذیر بھی۔ اب تم کو ان کی اطاعت سے بغیر چارہ نہیں۔ سارے نبی بشیر و نذیر تھے مگر ان کی بشارت و نذارت اور حضور کی بشارت و نذارت میں تین طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ وہ حضرات خاص قوم کے بشیر و نذیر ہوتے تھے۔ ہمارے حضور سارے جہان کے بشیر و نذیر ہیں لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان:۱) دوسرے یہ کہ وہ حضرات ایک خاص وقت تک بشیر و نذیر ہوتے تھے۔ ہمارے حضور تا قیامت بلکہ روز قیامت کے بھی بشیر و نذیر۔ کیونکہ آپ کی نبوت کبھی منسوخ نہیں۔ تیسرے یہ کہ ان تمام حضرات کی بشارت و نذارت سن کر تھی۔ حضور کی بشارت و نذارت دیکھ کر کہ حضور نے معراج میں جنت وہاں کے طبقے دوزخ وہاں کے درکات ان سب کے مستحقین بلکہ رب کی ذات و صفات کو دیکھا۔ اس لئے بشیر و نذیر تنوین سے فرمایا گیا۔ یعنی شاندار بشیر و نذیر وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ صدیوں پیغمبر نہ بھیجے، اس پر بھی قادر ہے کہ آخر میں ایک ایسا رسول بھیج دے جو صدیوں کی تاریکی و کفر کو دور فرما کر نہ مٹنے والا دن نکال دے۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے مظہر ہیں۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ گزشتہ زمانوں میں بیک وقت صدہا پیغمبر ہوں۔ مگر لوگ ہدایت کم لیں اور اس پر بھی قادر ہے کہ اکیلے حضور سارے عالم کو ہدایت دیں۔ اس کی ہی قدرت تو ہے کہ رات کو لاکھوں چراغوں تاروں چاند سے نور دے مگر پورا نہ ہو۔ پھر وہ قادر و قیوم دن میں ایک سورج سے سارے جہان میں روشنی کر دے۔ جب ایک سورج ہر حصہ زمین کو چمکا سکتا ہے تو ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہان کے دلوں کو چمکا سکتے ہیں۔ فرماتا ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب:۲۱) ایک رسول تمام لوگوں کی زندگیوں کے لئے نمونہ ہیں۔ حالانکہ لوگوں کی زندگیاں مختلف ہیں۔ کسی کی زندگی شاہانہ ہے کسی کی گدایانہ۔

کھاتی۔ مگر عرب کی عورت اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں زندہ دفن کر دیتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی قوم کو صرف تیرہ برس میں ٹھیک کیا صلی اللہ علیہ وسلم۔ شعر

سب چمک والے اجلوں میں چمکا کیے   اندھے شیشوں میں چمکا ہمارا نبی

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے اہل کتاب امتوں کے بھی نبی ہیں۔ حضور کی نبوت کسی ملک کسی قوم کسی زمانہ سے خاص نہیں۔ ہر ملک ہر قوم کے لئے تا قیامت نبی ہیں۔ یہ فائدہ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ سے حاصل ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تمام دنیا کو فائدہ پہنچا مگر اہل کتاب کو بہت ہی فائدہ پہنچا جیسا کہ تفسیر میں عرض کیا گیا۔ یہ فائدہ بھی جَآءَكُمْ میں كُمْ خطاب سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** حضور صلی اللہ علیہ وسلم اصل توریت و انجیل سے بھی خبردار ہیں اور یہود و نصاریٰ کی تحریفوں سے بھی باخبر ہیں۔ یہ فائدہ يُبَيِّنُ الخ سے حاصل ہوا۔ اصل توریت و انجیل اور اس کی تحریفوں کو وہ ہی بیان کر سکتا ہے جو ان سے واقف ہو۔ **چوتھا فائدہ:** حضور کی تشریف آوری سے صدیوں پہلے انبیاء کرام کی تشریف آوری بند ہو چکی تھی۔ دنیا میں اندھیرا چھا چکا تھا۔ یہ فائدہ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ سے حاصل ہوا۔ اس فاصلہ کی رفتار ہم ابھی تفسیر میں عرض کر چکے کہ دنیا میں چھ سو برس اور عرب میں چار ہزار سال سے کوئی نبی نہ آئے تھے۔ **پانچواں فائدہ:** حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا پر اللہ کی حجت ہیں۔ جن سے اہل کفر و عناد کی زبانیں بند ہو گئیں۔ یہ فائدہ اَنْ تَقُوْلُوْا الخ سے حاصل ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** حضور سے لے کر قیامت تک کبھی زمانہ فترت نہ ہو گا۔ نہ کبھی دنیا سے نور نبوت غائب ہو۔ کیوں کہ اس مدنی سورج صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کبھی غروب نہیں۔ یہ سورج ہمیشہ چمکے گا۔ یہ فائدہ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ سے حاصل ہوا۔

کیا خبر کتنے تارے کھلے چھپ گئے   پر نہ ڈوبے نہ ڈوبا ہمارا نبی

ساتواں فائدہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبشر و مصدق نہیں۔ بلکہ تمام نبیوں کے صرف مصدق ہیں۔ ہاں حضور بشیر و نذیر ہیں۔ یعنی ثواب و عذاب کی خبریں دینے والے۔ مگر حضور کی بشارت و نذارت دیکھی ہوئی ہے دیگر انبیاء کرام کی بشارتیں سمعی تھیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تمام انسانوں بلکہ تمام جہانوں کے لئے ہے اور سب کی طرف ہے تو یہاں صرف اہل کتاب کو مخاطب کر کے کیوں فرمایا گیا کہ تمہارے پاس ہمارے رسول تشریف لائے۔ **جواب:** چند وجہوں سے۔ ایک یہ کہ عرب میں اہل کتاب کی بڑی عزت تھی۔ کیوں کہ وہ اہل علم بھی تھے اور اولاد انبیاء بھی۔ ان کے ایمان لے آنے سے دوسرے لوگوں کے ایمان کی قوی امید تھی۔ اس لئے انہیں خصوصیت سے دعوت ایمان دینے کے لئے انہیں خطاب فرمایا گیا دوسرے یہ کہ اہل کتاب ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منتظر تھے اور لوگوں کو منتظر بنائے ہوئے تھے تیسرے یہ کہ حضور کی تشریف آوری سے زیادہ فائدہ اہل کتاب کو ہی پہنچا کہ حضور کے دم قدم سے ان کے نبیوں، ان کی کتابوں کی تصدیق تائید ہوئی، ان کی کتب کی تصحیح ہوئی۔

تشریف لائے جن سے ان کے دل عرش معلٰی بن گئے۔ غرض کہ آنے والے محبوب ایک ہیں مگر آمد کی نوعیتوں میں فرق ہے۔ جیسے قرآن کریم کسی کے صرف ہاتھوں میں آتا ہے۔ کسی کے دماغ میں رہتا بستا ہے، کسی کے دل میں جلوہ فگن ہوتا ہے۔ عام مسلمانوں کے ہاتھوں میں، حافظوں کے دماغوں میں، علماء وصوفیاء کے دلوں میں آتا ہے یا جیسے سورج زمین شورہ کے صرف ظاہر کو چمکاتا ہے مگر اعلیٰ زمین کے اندرون میں بھی پہنچتا ہے۔ کہ وہاں دانہ کو پرورش کر کے اگا دیتا ہے۔ لہٰذا اہل کتاب سے "جَآءَكُمْ" فرمانا اور نوعیت کے لئے ہے۔ مومنین سے "جَآءَكُمْ" فرمانا اور نوعیت کا ہے جو چیز انتظار کے بعد ملتی ہے اس کی قدر ہوتی ہے۔ حضور کی آمد کا انتظار صدیوں کرایا پھر بھیجا تاکہ لوگ اس نعمت عظمٰی کی قدر جانیں۔ حضور اللہ کی طرف سے گواہ ہیں۔ کسی کے لئے گواہ کسی پر اس کے خلاف گواہ کہ قیامت میں رب تعالیٰ کے فیصلے کفار کی زبان بندی حضور ہی کے ذریعہ ہو گی۔ اس آیت میں حضور کے اس وصف کا ہی بیان ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ يُبَيِّنُ لَكُمْ میں یبین کا مفعول پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے اس میں بہت گنجائش ہو گئی۔ حضور ﷺ ہمیشہ ہر مفید چیز بیان فرماتے ہیں۔ حتیٰ کہ انسان کو اس کی اپنی حقیقت بتاتے ہیں کہ تو کون ہے اور تیرا درجہ کیا ہے۔ جس نے یہ سمجھ لیا وہ عارف باللہ ہو گیا اور اپنے کو رب تک پہنچنے کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ بندے کی بڑی ترقی یہ ہے کہ حضور کے قدم تک پہنچ جاوے۔ شعر

تیری معراج کہ تو لوح و قلم تک پہنچا ‏ ‏ ‏ ‏ میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ
اور جب کہا موسیٰ نے واسطے اپنی قوم کے اے قوم میری یاد کرو تم نعمت اللہ کی
اور جب موسیٰ نے کہا اپنی قوم سے اے میری قوم اللہ کا احسان اپنے
عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ
جو اوپر تمہارے ہے جب کہ بنائے اس نے تم میں نبی اور بنایا تم کو بادشاہ
اوپر یاد کرو کہ تم میں سے پیغمبر کئے اور تمہیں بادشاہ کیا
وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۰
اور دیا تم کو وہ جو نہ دیا کسی کو جہان والوں میں سے
اور تمہیں وہ دیا جو آج سارے جہان میں کسی کو نہ دیا
يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ
اے قوم میری داخل ہو جاؤ زمین پاک میں وہ جو لکھی اللہ نے

ہو، نزدیک ہو، دور نہ ہو، کچھ دور بھی ہو بالکل نزدیک نہ ہو، روشنی میں ہو اندھیرے میں نہ ہو، بے پردہ ہو پردہ کی آڑ میں نہ ہو۔ مگر دل کی بصیرت اور دماغ کے خیال کے لئے یہ کوئی چیز شرط نہیں، خیالی، موجود، معدوم، دور، قریب اگلی پچھلی سب چیزیں دیکھ لیتا ہے۔ حضور ﷺ کی قوت نظری ہماری قوت خیالی سے زیادہ قوی ہے۔ اگلی پچھلی باتیں سب دیکھتی ہے اس لئے اِذْ سے پہلے اُذْکُرُ ارشاد ہوا۔ جناب کلیم اللہ کا ان سرکشوں کو یٰقَوْمِ فرما کر پکارنا تالیف قلوب کے لئے ہے۔ طریقہ تبلیغ یہ ہی ہے کہ نرمی سے کلام کیا جاوے اُذْکُرُوْا اُذْکُرْ سے مشتق ہے بمعنی یاد کرنا۔ یاد زبانی بھی ہوتی ہے، جنانی بھی، ارکانی بھی۔ زبان سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا چرچا کرنا بھی عبادت ہے۔ دل سے ان کا اعتراف و اقرار کرنا بھی عبادت ہے۔ نعمتوں کے شکریہ میں نیک اعمال کرنا گناہ سے بچنا بھی عبادت ہے یہاں تینوں قسم کے ذکر مراد ہیں۔ یہاں نعمت اللہ سے مراد عام نعمتیں بھی ہو سکتی ہیں اور خاص نعمتیں بھی جو خصوصاً بنی اسرائیل کو عطا ہوئیں۔ دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں جیسا کہ عَلَیْکُمْ سے معلوم ہو رہا ہے۔ اس نعمت کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ یعنی اے میری قوم! اللہ کی ان نعمتوں کو یاد کرو، یاد رکھو جو خصوصیت سے تم پر ہیں۔ ان نعمتوں کا زبان سے چرچا کرو، دل سے بھی اقرار و اعتراف کرو نیز اس شکریہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میری فرمانبرداری کرو۔ وہ نعمتیں یہ ہیں۔ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ۔ اِذْ یا تو ظرفیہ ہے اور یہ جملہ اُذْکُرُوْا کا مفعول بہ ہے یا اِذْ تعلیلیہ ہے اور یہ جملہ اُذْکُرُوْا کی علت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس موقعہ پر تین خصوصی نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ پہلی نعمت نبوت ہے۔ بنی اسرائیل میں بہت زیادہ نبی تشریف لائے۔ کسی قوم کسی قبیلہ میں اتنے نبی نہ آئے جتنے بنی اسرائیل میں۔ چنانچہ یعقوب علیہ السلام سے لے کر ہمارے حضور ﷺ تک تمام بنی اسرائیل میں آئے۔ صرف ہمارے حضور ﷺ بنی اسماعیل میں تشریف لائے۔ اگر چہ بہت نبی بنی اسرائیل میں آنے والے تھے مگر چونکہ ان کی تشریف آوری یقینی تھی اس لئے جَعَلَ ماضی فرمایا گیا (تفسیر کبیر وغیرہ) خیال رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد سے سارے نبی جناب ابراہیم علیہ السلام ہی کی اولاد میں ہوئے۔ بنی اسحاق میں انبیاء بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل میں ہمارے حضور۔ یہاں تفسیر کبیر نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ صرف بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل میں ہی نبی بھیجے گا۔ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا یہ عبارت جَعَلَ فِیْکُمْ پر معطوف ہے۔ اور قَالَ مُوْسٰی کا مقولہ۔ یہاں بھی کم میں خطاب بنی اسرائیل سے ہے۔ اس میں حق تعالیٰ کی دوسری نعمت کا ذکر ہے۔ یعنی بنی اسرائیل کو سلطنت عطا ہونا۔ ملوک جمع ہے ملک کی بمعنی سلطان و بادشاہ جیسے بنی اسرائیل میں نبی بہت ہوئے ایسے ہی ان میں سلاطین و بادشاہ بہت ہوئے۔ حتیٰ کہ بعض وہ ہستیاں بھی ہیں جو نبی بھی ہیں سلطان و بادشاہ بھی۔ جیسے یوسف علیہ السلام اور داؤد و سلیمان علیہما السلام۔ چونکہ قوم کے ایک فرد کا بادشاہ ہونا گویا کل قوم کی سلطنت ہے اس لئے یہاں جَعَلَکُمْ فرمایا۔ جَعَلَ فِیْکُمْ نہ فرمایا اور کسی میں کسی فرد کا نبی ہونا ساری قوم کی نبوت نہیں۔ اس لئے وہاں جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ فرمایا۔ بعض شارحین نے فرمایا کہ یہاں ملوک سے مراد آزاد ہونا، وسیع مکانوں کا مالک ہونا جس میں نہریں ہوں۔ خادم ولونڈیوں کا مالک ہونا کہ بنی اسرائیل پہلے فرعون کی رعایا تھے۔ رب نے اسے غرق کر کے انہیں آزاد مختار کیا۔ لہٰذا یہ سب لوگ ملک یعنی آزاد و مختار و

وطن و مسکن بنے گی یا آخر کار تم کو ملے گی یا اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض فرما دیا کہ اس زمین پر جہاد کر کے فاتحانہ شان سے داخل ہو۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے تحریریں چار قسم کی ہیں۔ تین تحریریں تو چیز کے ہونے سے پہلے اور ایک تحریر اشیاء کے وجود کے ہونے کے بعد۔ سارے عالم کے بننے سے پہلے ایک ایک واقعہ کی تحریر لوح محفوظ میں۔ دوسرے پندرہویں شعبان کی شب میں سال بھر کے آنے والے واقعات کی تحریر فرشتوں کے صحیفوں میں۔ تیسرے ماں کے پیٹ میں بچے کے آئندہ حالات کی تحریر۔ چوتھے اعمال کرنے پر نامۂ اعمال کی تحریر۔ یہاں پہلی تحریر مراد ہے۔ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ یہ عبارت ادْخُلُوا الْاَرْضَ الخ پر معطوف ہے۔ ارتداد سے مراد ہے پھر جانا۔ ادبار سے مراد پیٹھیں جمع دبر کی۔ یعنی یہ حکم سن کر تم آگے بڑھو غازیانہ شان سے چلو۔ بزدل ہو کر پیٹھوں کی طرف یعنی پیچھے و مصر وغیرہ کی جانب مت لوٹ جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ ارتداد سے مراد دین سے پھر جانا، مرتد ہو جانا ہو یعنی اس حکم پر فوراً عمل کرو، اس کا انکار کر کے مرتد نہ ہو جاؤ کیونکہ نبی کے حکم کا انکار کفر ہے۔ پہلے معنی زیادہ ظاہر ہیں۔ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ۔ یہ عبارت یا تو لَا تَرْتَدُّوْا نہی کا جواب ہے یا ایک پوشیدہ شرط کی جزا۔ انقلاب سے مراد یا زمین میں لوٹ جانا ہے۔ یا دین سے پھر جانا خٰسِرِيْنَ حال ہے فَتَنْقَلِبُوْا کے فاعل ''انتم'' سے یہ خسارہ سے بنا ہے۔ بمعنی پورا گھاٹا عظیم نقصان یعنی اگر تم نے جہاد نہ کیا اور مصر کو واپس لوٹ گئے تو پورا پورا نقصان اٹھا کر لوٹو گے۔ کہ پھر قوم جبارین تم کو بزدل سمجھ کر تم پر حملہ کر دے گی۔ تم کو مصر سے بھی نکال دے گی یا اگر تم مرتد ہو گئے تو دونوں جہان میں نقصان پاتے ہوئے مرتد ہو گئے۔ جس سے تمہاری دنیا بھی خراب دین بھی برباد ہوگا۔ جہاد کبھی فرض ہوتا ہے کبھی نہیں اور جب فرض ہوتا ہے تب بھی سب پر قتال و جنگ فرض نہیں ہوتا۔ بعض غازی لڑتے ہیں بعض ان کا کھانا پکاتے زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے ہیں۔ بعض شہروں میں رہ کر ملک کی حفاظت اور دوسرے کام کرتے ہیں۔ مگر جب نبی لڑنے کو فرما دیں تو لڑنا فرض ہو جاتا ہے اس کا انکار کفر۔ یہ ہی آپ نے فرمایا کہ میرے اس فرمانے سے کہ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ تم سب پر وہاں داخل ہو جانا فرض ہو گیا، اب اس کا انکار کر کے مرتد نہ بنو۔

خلاصہ تفسیر

ہماری بیان کردہ تفسیر سے معلوم ہو گیا کہ اس آیت کریمہ کی چند تفسیریں ہیں ہم ان میں سے ایک تفسیر کا خلاصہ عرض کرتے ہیں۔ اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم وہ وقت بھی یاد فرماؤ جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ اے میری قوم! اللہ کی وہ نعمتیں یاد کرو جو تم پر ہیں کہ اس نے تم میں بہت سے نبی مبعوث فرمائے کہ اتنے نبی کسی قوم میں نہیں آئے۔ یہ تمہاری بڑی عزت ہے۔ نیز تم سب کو دنیاوی بادشاہ بنایا کہ بنی اسرائیل میں بڑے بڑے سلطان و حکمران کیے جس سے تم شاہی قوم ہوئے اور تم کو وہ نعمتیں بخشیں جو نہ تم سے پہلے کسی قوم کو ملیں اور نہ تمہارے بعد تا قیامت کسی کو ملیں۔ تمہاری خاطر فرعونی لوگ غرق کیے گئے، دریا چیرا گیا، تم پر من و سلویٰ اترنے والا ہے، تم میں کثرت سے اولیاء اللہ ہوئے اور ہوں گے۔ لہٰذا تم ان نعمتوں کا شکریہ اس طرح ادا کرو۔ کہ بیت المقدس کی پاک زمین پر قوم جبارین کا قبضہ ہے۔ تم ان پر جہاد کرو اور فاتحانہ شان سے بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ اس ظالم و جابر و کافر قوم کو ہلاک کر

قوم نبی نہیں کہلاتی مگر بادشاہ کی قوم بادشاہ کہلاتی ہے۔ یعنی نبی زادے اپنے کو نبی نہیں کہہ سکتے مگر شہزادے اپنے کو بادشاہ کہہ سکتے ہیں۔ دیکھو رب تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ملوک فرمایا مگر انہیں نبی نہ فرمایا بلکہ فرمایا جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ۔ **پانچواں فائدہ:** بنی اسرائیل کو رب تعالیٰ نے بعض ایسی نعمتیں دیں جو نہ ان سے پہلے کسی کو دیں نہ بعد میں جیسے من وسلویٰ برسانا۔ غیبی روشنی کے لئے آسمان سے نورانی ستونوں کا اترنا۔ پتھر سے پانی کے چشمے بہتے رہنا۔ بحر قلزم کا چیرنا وغیرہ۔ یہ فائدہ وَاٰتٰكُمْ الخ سے حاصل ہوا۔ مگر ان ناقدروں نے ہمیشہ احسان فراموشی کی جس سے تا قیامت ذلیل وخوار ہو گئے۔ **چھٹا فائدہ:** جس سرزمین میں اللہ کے مقبول بندے رہیں وہ مقدس ہو جاتی ہے۔ یہ فائدہ الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ سے حاصل ہوا کہ سرزمین فلسطین اس لئے مقدس ہے کہ وہ حضرات انبیاء کا جائے مقام ہے۔ **ساتواں فائدہ:** اگر کسی متبرک مقام پر مشرکین و کفار غلبہ کرلیں تو اس سے ان مقامات کے تقدس میں فرق نہیں آتا۔ دیکھو اس وقت زمین بیت المقدس پر قوم جبارین کا قبضہ تھا مگر اسے ارض مقدسہ فرمایا گیا۔ جب کعبۃ اللہ شریف میں بت تھے۔ تب بھی وہ بیت اللہ تھا۔ اگر مسجد میں کتے گھس جاویں تو مسجد کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔ **آٹھواں فائدہ:** جہاد بڑی پرانی عبادت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی تھا۔ یہ فائدہ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الخ سے حاصل ہوا۔ کیونکہ یہاں داخلہ سے مراد بیت المقدس میں فاتحانہ، غازیانہ، مجاہدانہ داخلہ ہے۔ **نواں فائدہ:** اللہ کی نعمتوں کا شکریہ عملی یہ ہے کہ اس کی اطاعت، اس کے نبیوں کی فرمانبرداری کی جاوے۔ صرف زبان سے الفاظ ادا کر دینا کافی نہیں دیکھو یہاں اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ کے بعد ادْخُلُوا الْاَرْضَ فرمایا گیا۔ کہ اللہ کی نعمتوں کا ذکر یہ ہے کہ بیت المقدس پر جہاد کرو۔ **دسواں فائدہ:** جس بستی میں اللہ کے مقبول بندے رہتے ہوں یا مقبولوں کی قبریں ہوں۔ ان بستیوں کو شریف یا مقدس یا معظم کہنا چاہیے جیسے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، یا بغداد شریف، اجمیر شریف وغیرہ۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے فلسطین کی زمین کو جہاں حضرات انبیاء کرام کے مزارات ہیں۔ ارض مقدسہ فرمایا۔ یہ آیت اس مسئلہ کی ماخذ ہے۔ کہا جاتا ہے مزاج شریف، اسم شریف، جب مزاج اور اسم شریف ہو سکتا ہے تو بغداد و اجمیر و سرہند کو بھی شریف کہا جاسکتا ہے۔ کہ یہ مقامات بزرگوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ **گیارھواں فائدہ:** اللہ کے مقبول بندوں کی نگاہ لوح محفوظ میں لگی ہے۔ وہ حضرات وہاں کے واقعات جانتے ہیں۔ یہ فائدہ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ سے حاصل ہوا۔ اگر رب تعالیٰ نے کسی کو کچھ بتانا ہی نہ تھا لوح محفوظ میں یہ سب لکھا کیوں۔ خدا کو اپنے بھول جانے کا اندیشہ تو نہ تھا بلکہ کسی کو بتانا مقصود تھا اس لئے سب کچھ لکھ دیا۔ اس وجہ سے اسے کتاب مبین کہتے ہیں یعنی خاص بندوں پر ظاہر کرنے والی کتاب۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: بنی اسرائیل کو نبوت بھی دی گئی اور سلطنت بھی۔ مگر نبوت کے متعلق فرمایا گیا جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ اور سلطنت کے متعلق ارشاد ہوا جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا طریقہ بیان میں فرق کیوں ہے، دونوں جگہ عبارت یکساں کیوں نہ ہوئی؟ **جواب:** اس کے دو جواب ابھی تفسیر میں گزر گئے۔ ایک یہ کہ یہاں ملوک سے مراد آزاد خود مختار ہے نہ کہ سلطان و بادشاہ۔ چونکہ سارے اسرائیلی فرعون کی غلامی سے آزاد و خود مختار ہوئے تھے لہٰذا

بہت ہی افضل ہیں جو نبیوں کی دعائیں قرآن مجید میں نقل ہوئیں کہ ان میں الفاظ، زبان نبی اور کلام الٰہی کی تاثیریں جمع ہو گئیں۔ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ بہت ہی مقدس فرمان ہے کہ یہ قرآن بھی ہے اور کلیم اللہ کی حدیث بھی اذکر پہلے پوشیدہ ہے۔ یعنی اے نبی! آپ وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا۔ یاد وہ چیز کرائی جاتی ہے جو علم میں تو ہو توجہ میں نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ تمام اگلی پچھلی باتیں حضور کے علم میں ہیں بلکہ حضور کے مشاہدہ میں ہیں۔ رب فرماتا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ (فجر:٦) یا فرماتا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (الفیل:١) صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ انسان کا دل گویا مقدس زمین ہے جسے دنیاوی آلائشوں سے پاک وصاف رکھنا ضروری ہے۔ دل میں دنیا اور دنیاوی جھگڑوں، بغض وحسد وکینہ یا کفر وشرک وبدعقیدگیوں کا آ جانا گویا قوم جبارین کا ارض مقدسہ پر قبضہ کر لینا ہے۔ اللہ کے مقبولوں کی جماعت گویا قوم موسیٰ ہے۔ جن کے متعلق ارشاد ہوا کہ اے قوم موسیٰ! یعنی مقبولین بارگاہ الٰہی تم پر اللہ کے بڑے فضل وکرم ہیں۔ تم میں انبیاء، رسل، اولیاء ہیں اس نعمت کا شکریہ یہ ہے کہ پس ماندہ دلوں پر نظر کرو اور مجاہدانہ وغازیانہ نظر فرما کر وہاں سے اس قوم جبارین کو نکال دو تا کہ وہ دل پاخانہ اغیار نہ رہیں بلکہ کاشانہ یار بن جاویں۔ دل ہمارے ہیں مگر ان پر قبضہ غیروں نے جما لیا ہے۔ ان ناجائز قابضین کو وہاں سے نکالو تا کہ یہ دل کی بستیاں اصل مالک کی تجلی گاہ بن جاویں جیسے کسی ملک پر سلطان کا قبضہ فوج کے ذریعہ ہوتا ہے۔ کہ فوج ہی دشمن کو وہاں سے نکالتی یا دباتی ہے۔ اسے فتح کر کے سلطان کے حوالے کرتی ہے۔ یونہی دل پر تجلی یار کا قبضہ ان مقبول بندوں کے ذریعہ ہوتا ہے جو ربانی فوج ہے۔ جس دل میں اس فوج کا داخلہ نہ ہو وہاں نور الٰہی نہیں پہنچتا۔ اس لئے ارشاد ہوا: يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ۔ جب حضور انور ﷺ مع مہاجرین وانصار مکہ معظمہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہو گئے۔ تب کعبۃ اللہ سے بت اور مکہ معظمہ سے شرک وکفر نکلے۔ رحمت رب تعالیٰ کی ہوتی ہے مگر اس کے داخلہ کے لئے جماعت الٰہیہ کا داخلہ شرط ہے۔ جسم میں دوا جاتی ہے تو بیماری نکلتی ہے اور وہاں شفاء داخل ہوتی ہے۔ جو بغیر واسطہ اولیاء وانبیاء اپنے دل کی صفائی چاہے وہ احمق ہے۔، ہمیشہ نامراد رہے گا۔ شعر

کھول دو سینہ مرا فاتح مکہ آ کر — کعبہ دل سے صنم کھینچ کے کر دو باہر
آپ آ جایئے سینہ میں مرے جاں ہو کر — سلطنت کیجئے اس جسم میں سلطان ہو کر

گھر میں گھر والا آتا ہے تو مع سامان آتا ہے۔ جب نکلتا ہے تو سامان پہلے نکل جاتا ہے۔ حب رسول حب اولیاء۔ خوف خدا نور الٰہی کا سامان ہے جب دل میں نور آنے والا ہوتا ہے تو پہلے وہاں یہ سامان آتا ہے اور جس دل پر پھٹکار ہونے والی ہوتی ہے تو پہلے وہاں سے یہ سامان نکل جاتا ہے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ

انہوں نے کہا اے موسیٰ بیشک اس زمین میں قوم ہے جبارین

بھول گئے جو ہم نے ان کو دیں۔ غرق فرعون۔ بحر قلزم کو ان کے لیے چیر نا وغیرہ اور جہاد سے انکار کر دیا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خاص حکم جہاد کا ذکر تھا۔ اب بنی اسرائیل کی اس حکم سے سرتابی کا تذکرہ ہے کہ وہ اپنے نبی کے فرمان سے سرتابی کر بیٹھے تا کہ حضور ﷺ کو موجودہ یہود کی سرتابیوں سے صدمہ نہ ہو۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کریم بندہ نواز کی عطا کا ذکر تھا اب ناسمجھ بندوں کی اس عطا سے محرومی کا تذکرہ ہے۔ دین کے بعد لین کا ذکر ہے۔ کہ داتا نے عطا کی پیش کش کی مگر لینے والے نے انکار کر دیا۔

تفسیر قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی یہ نیا جملہ ہے جس میں بنی اسرائیل کے جواب کا ذکر ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دیا۔ قالو کا فاعل وہ سارے اسرائیلی ہیں جن سے بیت المقدس میں داخلہ کے لئے کہا گیا۔ اگر چہ یہ عرض چند شخصوں نے کی ہوگی۔ مگر چونکہ وہ چند ساری قوم کے نمائندے تھے اور نمائندوں کا کہنا سب کا کہنا ہوتا ہے اس لئے سب کو کہنے والا قرار دیا گیا اور فرمایا گیا۔ قَالُوْا ان میں سے بعض صالح اسرائیلی مستثنیٰ ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ ان لوگوں کا اپنے پیغمبر کو نام لے کر پکارنا بھی سرکشی ہے۔ ان بدنصیبوں کے جواب کی ابتدا ہی بے ادبی سے ہوئی۔ کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کو یا نبی اللہ یا کلیم اللہ کہہ کر خطاب نہ کیا۔ جسے اللہ کوئی درجہ دے اسے نام سے پکارنا گویا اس درجہ کا انکار کرنا ہوتا ہے۔ اگر بیٹا اپنے ماں باپ کو نام لے کر پکارے تو گویا وہ اس کے ماں باپ ہونے کا انکار کرتا ہے۔ ڈی سی کو نام لے کر پکارو تو اس کے اس عہدے کا انکار کرتے ہو۔ اس لئے اس پکارنے والے سے حکومت بھی ناراض ہوتی ہے۔ یونہی پیغمبر کو صرف نام لے کر پکارنے سے رب تعالیٰ ناراض ہے۔ حضور کے صحابہ حضور کو نہ تو نام لے کر پکارتے تھے۔ نہ نام بھیا، ابا کہہ کر۔ کیوں کہ قرآن مجید میں ہے کہ حضور ﷺ کو بڑے ادب سے پکارنا ضروری ہے۔ صرف نام سے پکارنا ممنوع ہے۔ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (نور: ۶۳) چونکہ انہیں داخلہ کا حکم موسیٰ علیہ السلام نے ہی دیا تھا اس لئے انہوں جواب بھی آپ ہی کو دیا۔ یا اللہ کہہ کر رب تعالیٰ سے عرض نہ کیا۔ اگر چہ وہ حکم رب تعالیٰ کی طرف سے تھا۔ اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ۔ یہ عبارت قَالُوْا کا مفعول بہ ہے۔ اس لئے اِنَّ کسرہ سے آیا۔ فِیْهَا کا مرجع وہ زمین بیت المقدس ہے جہاں جانے کا جس کے فتح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ قوم جبارین سے مراد وہ ہی عمالقہ قوم ہے جو قوم عاد کی بقیہ تھی جو اس وقت بیت المقدس پر قابض تھی (خازن)۔ جبار مبالغہ کا صیغہ ہے۔ جب یہ خدا تعالیٰ کی صفت ہو تو یہ بنتا ہے۔ جبر۔ بمعنی تلافی کر دینا، سختی، غلبہ، سرکشی۔ دوسرے کو دبانا سے بنتا ہے۔ اس سے ہے مجبور۔ یعنی دبایا ہوا یا بنتا ہے جبارہ سے بمعنی بلند قامت۔ کہا جاتا ہے نخلة جبارة اونچی کھجور جہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں (خازن، معانی، کبیر وغیرہ) یعنی اس بستی میں بہت سخت، غالب، سرکش قوم ہے۔ یا بہت بلند قامت جسم پہلوان لوگ ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مصر میں صرف ایک جابر بادشاہ تھا فرعون۔ باقی اس کے سارے تابع اور تابعین میں بعض لوگ مومن تھے۔ پھر وہ فرعون بھی قد و قامت میں ہماری طرح تھا۔ اس کے باوجود رب تعالیٰ نے ہم کو اس پر جہاد کرنے کا حکم نہ دیا بلکہ خود ہی اسے غرق کر دیا۔ تو یہاں فلسطین میں تو

معنی یہ ہے کہ انہیں ڈرانے والے اسرائیلیوں میں سے دو شخص جن پر اللہ نے یہ انعام فرمایا کہ انہیں رازداری اور وفاداری کی توفیق دی۔ انہوں نے یہ کہا دوسرے یہ کہ رَجُلٰنِ سے مراد قوم عمالقہ کے دو آدمی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بفضلہٖ تعالیٰ ایمان لے آئے تھے۔ اس صورت میں اَلَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ سے مراد قوم عمالقہ ہے۔ اور یَخَافُوْنَ کا مفعول ھم پوشیدہ ہے۔ اور انعام سے مراد ایمان لانے کی توفیق ہے۔ یعنی جس قوم سے یہ اسرائیلی ڈر رہے تھے۔ اسی قوم کے دو آدمیوں نے انہیں یہ جواب دیا۔ ان دو آدمیوں پر اللہ نے یہ انعام کیا تھا وہ ایمان لے آئے تھے تیسرے یہ کہ من بمعنی لام ہے اور الذین سے مراد ڈرنے والے اسرائیلی ہیں۔ یعنی دو شخصوں نے ڈرنے والے اسرائیلیوں سے یہ کہا ان دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا کہ ان کے دل قوی بنائے تھے۔ گویا اسرائیلی دو قسم کے ہوگئے۔ ڈرنے والے جو کہ بہت تھے اور نہ ڈرنے والے جو کہ تھوڑے تھے ڈرنے والوں سے یہ کلام کیا گیا۔ مگر پہلی تفسیر زیادہ قوی ہے۔ اُدْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ یہ قَالَ رَجُلٰنِ کا مقولہ ہے جس میں اسرائیلیوں کو جنگی تدبیر بتائی گئی ہے۔ عَلَیْهِمْ کا مرجع قوم عمالقہ ہے اور باب سے مراد شہر قدس کا دروازہ ہے۔ دخول سے مراد ہمت کر کے گھس جانا ہے۔ یعنی ہمت کر کے دروازہ بیت المقدس میں گھس جاؤ اس پر قبضہ کر لو۔ جس سے قوم عمالقہ نہ نکل سکے اور بے بس ہو کر ہتھیار ڈال دے۔ ان پر ایسی تنگی کرو کہ انہیں جائے قرار اور جائے فرار کچھ نہ رہے۔ اچانک ان پر جا پڑو۔ ٹوٹ پڑو۔ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ یہ پہلی عبارت کا نتیجہ ہے ہٗ کا مرجع دروازہ ہے یعنی ہم تم کو یقین دلاتے ہیں کہ جب تم دروازہ شہر پر قبضہ کر لو گے تو انشاء اللہ تم نہایت آسانی سے فتح یاب ہو جاؤ گے۔ کیوں کہ ان کے جسم بڑے ہیں مگر ان کے پہلوؤں میں دل نہیں۔ جنگ صرف جسم و ہتھیار سے نہیں بلکہ دل سے ہوتی ہے۔ جنگ میں دلیری چاہیے۔ صرف گدھے کا سا موٹا جسم کافی نہیں۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ یہ مومن کا وہ روحانی ہتھیار ہے جس کا توڑ کافر کے پاس نہیں۔ ایمان، تقویٰ اور اللہ پر بھروسہ۔ یعنی اگر تم سچے مسلمان ہو تو اللہ پر ہی بھروسہ کرو۔ وہ چاہے تو ابابیل سے فیل مروا دے۔ یہاں توکل سے مراد توکل عام مومنین ہے۔ یعنی اولاً اسباب جمع کرنا۔ پھر مسبب الاسباب پر بھروسہ کرنا۔ ترک اسباب والا توکل مراد نہیں کہ یہ خواص کا توکل ہے۔ وہ بھی خاص حالات میں۔ جہاد میں توکل مع اسباب چاہیے (تفسیر خازن)۔

خلاصہ تفسیر

جب موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس پر جہاد کا حکم دیا۔ بنی اسرائیل پہلے ہی قوم عمالقہ کی قد آوری، شہ زوری کا حال اپنے دس نقیبوں کی زبانی سن کر ڈر چکے تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے موسیٰ! علیہ السلام بیت المقدس میں جو قوم ہے جس سے جہاد کرنے کا آپ ہم کو حکم دیتے ہیں وہ قوم تو بڑی شہ زور، قد آور ہے، بڑے جابر لوگ ہیں، ہم ان سے مقابلہ نہیں کر سکتے، ہم وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر وہ خود بخود وہاں سے نکل جاویں تو ہم بھی سیر و تفریح کرنے وہاں پہنچ جاویں گے۔ خیال رہے کہ ان لوگوں کے اس جواب کے چار جز ہیں ایک یٰمُوْسٰۤى دوسرا اِنَّ فِیْهَا تیسرا اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا چوتھا فَاِنْ یَّخْرُجُوْا الخ۔ اسی جواب کی ابتداء جناب کلیم اللہ کی بے ادبی سے شروع ہوئی۔ کہ انہوں نے صرف نام لے کر پکارا۔ یا موسیٰ۔ لہٰذا سادی باتیں ہی غلط ہوئیں۔ جس دیوار کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی ہو وہ

عَلَیْهِمُ الْبَابَ سے حاصل ہوا کہ ان دونوں ولیوں نے دشمن کے محاصرہ کرنے کی وہ تدبیر بتائی جس پر آج تک عمل ہو رہا ہے۔ آج بھی دشمن کی فوج کو گھیرے میں لے لینا بڑی کامیاب تدبیر سمجھی جاتی ہے دشمن کے نکلنے کا دروازہ بند کرے۔ پھر وہ تمہارے قابو میں ہے۔ یوسف علیہ السلام نے سلطنت کے امور سارے عالم کو رزق الٰہی کی تقسیم اس خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے کہ سبحان اللہ۔ وہ حضرات یہ کام کس سے سیکھ کر مصر میں آئے تھے۔ رب تعالیٰ سے سیکھ کر ہمارے حضور نے جو سلطنت رانی جنگ کے قوانین بنائے۔ وہ آج تک دوسری قومیں بھی برت رہی ہیں یہ ہے اس کا علم خداداد۔ **آٹھواں فائدہ:** فتح ونصرت تو فوج کی کثرت ہتھیاروں کی فراوانی پر موقوف نہیں۔ یہ تو رب تعالیٰ کے کرم پر موقوف ہے۔ اگر وہ چاہے تو ابابیل سے فیل مروادے۔ یہ فائدہ فَتَوَكَّلُوْٓا الخ سے حاصل ہوا۔ اس کا تجربہ ۶ دسمبر ۱۹۶۵ء کی اس جنگ سے ہوا۔ جس میں ہندوستان نے پوری طاقت سے غافل پاکستان پر حملہ کیا...... ان کا پروگرام یہ تھا۔ کہ بہتر گھنٹوں میں لاہور سے پشاور تک کو فتح کر لینا ہے۔ ان کی فوج پینتالیس ہزار تھی، ٹینک، ہوائی جہاز، توپیں سینکڑوں تھیں۔ مگر چھ سو اسلامی فوج نے ان کی یلغار کو روک لیا اور سترہ دن کی جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار کے چھ سو ٹینک، سو اسو ہوائی جہاز ایک بحری جہاز اسلامی فوج کے ہاتھوں تباہ ہوئے۔ اور تیس ہزار کے قریب فوج ہلاک ہوئی۔ مختلف محاذوں پر سولہ سو میل سے زیادہ علاقہ پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ ہے۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا کا ظہور۔ اے مولیٰ تیری شان کریمی کے قربان۔ بدر وحنین کی نصرتیں اب بھی اتر سکتی ہیں۔ خدا کرے ہم بندے بنیں۔ **نواں فائدہ:** مومن غازیوں کا سب سے اعلیٰ ہتھیار ایمان اور توکل ہے ان ہتھیاروں کا توڑ کفار کے پاس نہیں۔ یہ فائدہ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ سے حاصل ہوا۔ بحالت جنگ ان دو ہتھیاروں سے ضرور کام لیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: وہ بنی اسرائیل اس سرتابی سے مرتد ہو گئے تھے یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیوں پیغمبر کے حکم کا انکار کفر ہے۔ اگر مرتد ہو گئے تو انہیں ارتداد کی سزا کیوں نہ دی گئی؟ **جواب:** مرتد نہیں ہو گئے تھے گنہگار ہو گئے تھے۔ پیغمبر کے حکم پر عمل نہ کرنا کفر نہیں گناہ ہے۔ ہاں ان کے حکم کو غلط سمجھنا کفر ہے۔ اس کا یہاں ثبوت نہیں۔ کیونکہ وہ اسرائیلی اس بدعملی کی وجہ بیان کر رہے ہیں۔ کفار کا شہ زور ہونا، اپنا کمزور ہونا۔ لہٰذا یہ گناہ ہوا فسق ہوا۔ کفر نہیں ہوا۔

دوسرا اعتراض: اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے لئے توکل ضروری ہے۔ جو رب تعالیٰ پر توکل نہ کرے وہ مومن نہیں تو کیا بے صبرے لوگ کافر ہیں۔ **جواب:** یہ فرمان ترغیب کے لئے ہوتا ہے۔ مومنین سے مراد کامل مومنین ہیں۔ جیسے ایک باپ اپنے بیٹے سے کہتا ہے کہ اگر تو میرا بیٹا ہے تو میری اطاعت کر۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ نافرمان فرزند اپنے باپ کا بیٹا نہیں رہتا۔ اس کی نسل باپ سے ٹوٹ جاتی ہے مطلب یہ ہی ہوتا ہے کہ اگر لائق بیٹا ہے تو اطاعت کر۔

تیسرا اعتراض: ان دونوں بزرگوں نے بنی اسرائیل کو یہ کیوں نہ کہا کہ چلو جنگ کرو۔ یہ کیوں کہا کہ دروازہ شہر میں

نبی کے ہاتھ قبول نہ کیے مشقتیں برداشت نہ کیں۔ اس سے محروم رہے۔ کھٹے درخت کی شاخ میٹھے سے پیوند کر دی جاوے میٹھی ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ پیوند لگانے والا کوئی کاریگر ہو جو آکھ سے آکھ ملا دے۔ کاغذ کو کاغذ سے ملاتے ہیں۔ بذریعہ گوند کے۔ اینٹ کو اینٹ سے جوڑتے ہیں بذریعہ گارے یا سیمنٹ کے۔ لکڑی کو لکڑی سے جوڑتے ہیں بذریعہ کیلوں کے۔ بندے کو رب سے وصال ہوتا ہے بذریعہ نبوت کے اور ولایت کے۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا
کہا انہوں نے اے موسیٰ بیشک ہم وہاں ہرگز داخل نہ ہوں گے کبھی بھی جب وہ رہیں اس
بولے اے موسیٰ ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں ہیں
فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾
میں پس جاؤ تم اور رب تمہارا پس لڑو بے شک ہم یہاں بیٹھے رہیں گے
تو آپ جائیے اور آپ کا رب تم دونوں لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں
قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ
عرض کیا اے میرے رب بے شک نہیں مالک ہوتا ہوں میں مگر اپنی ذات کا اور اپنے بھائی کا
موسیٰ نے عرض کی کہ اے رب میرے بے شک اختیار نہیں مگر اپنا اور اپنے بھائی کا تو تو ہم
بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ
پس فرق کر دے ہمارے درمیان اور درمیان قوم بدکاروں کے فرمایا پس تحقیق وہ حرام ہے
کو بے حکموں سے جدا رکھ فرمایا پس تو وہ زمین ان پر حرام ہے
عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ
اوپر ان کے چالیس سال تک حیران پھریں گے وہ زمین میں
چالیس برس تک بھٹکتے پھریں گے زمین میں
فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ ع
پس نہ افسوس کرو تم اوپر قوم بدکار کے
تو تم ان بے حکموں کا افسوس نہ کھاؤ

موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے اور اس زمانہ میں بڑے بھائی، والد، بادشاہ کو رب کہہ دیتے تھے۔ بمعنی مربی (تفسیر کبیر) جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ ارۡجِعۡ اِلٰی رَبِّكَ (یوسف: ۵۰) مگر پہلی تفسیر زیادہ قوی ہے۔ اس جملہ میں اور بہت سے احتمال ہیں۔ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ اس جملہ میں قاعدون سے مراد ہے آگے نہ بڑھنا خواہ اس طرح کہ وہاں ہی ٹھہرے رہیں یا اس طرح کہ یہاں سے مصر کو واپس لوٹ جاویں۔ یعنی ہم یہاں ہی ٹھہریں گے، یہاں سے آگے نہ بڑھیں گے۔ ان بدنصیبوں کا یہ سرکشی کا جواب سن کر آپ نے منہ پھیر لیا اور نہایت خشوع وخضوع عجز وانکسار کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں عرض کیا قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَ اَخِیۡ۔ اب تک نبی اور ان کی امت کے درمیان کلام کا ذکر ہوا۔ اب کلیم اللہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان عرض و جواب کا ذکر ہے۔ چونکہ دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کو پکارنا سنت ہے اس کی مہربانی حاصل کرنے کے لئے اس لئے آپ نے پہلے اسے پکارا اور رب کہہ کر پکارا۔ بیان استحقاق کے لئے۔ کیوں کہ مربوب کا رب پر حق ہے۔ مانگنے کا حق۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ماں کے پیٹ میں بلاواسطہ پالتا ہے اور پیدا ہونے کے بعد بالواسطہ۔ مگر اس نے موسیٰ علیہ السلام کو تو پیدائش کے بعد بھی بلاواسطہ پالا۔ کہ ماں تو آپ کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا گئی تھی۔ رب نے ہی انہیں ان کے انگوٹھے سے دودھ دیا اور پھر سارے سامان پرورش مہیا کیے۔ اس لیے آپ نے رب کہہ کر پکارا کہ قوم مجھے چھوڑ گئی۔ میرا تیرے سوا کوئی نہیں۔ خیال رہے کہ اس عبارت کی بہت سی ترکیبیں ہیں۔ مگر آسان ترکیب یہ ہے کہ اَخِیۡ معطوف ہے نَفۡسِیۡ پر اور اِلَّا کے ماتحت ہے۔ حالت نصبی میں ہے۔ ملک سے مراد ہے قبضہ اور قابو واختیار۔ عرفی ملکیت مراد نہیں۔ کیوں کہ کوئی شخص اپنی ذات اور اپنے بھائی کا خصوصاً جب کہ بھائی نبی ہو مالک نہیں ہوسکتا۔ ظاہر یہ ہے کہ اخی سے مراد حضرت ہارون علیہ السلام ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اخی سے مراد دینی بھائی ہوں۔ یعنی حضرت ہارون، ویوشع، وکالب علیہم السلام۔ یا اخ سے مراد رشتہ دار ہوں کیونکہ حضرت ہارون تو آپ کے بھائی تھے اور یوشع علیہ السلام بھانجہ اور کالب ابن یوقنا بہنوئی (تفسیر کبیر) یعنی اے میرے رب! مجھے صرف اپنی جان اور اپنے بھائیوں کا ہی اختیار ہے۔ بنی اسرائیل تو میرے قبضہ واختیار سے باہر ہیں۔ میرے کہنے سے وہ جہاد نہیں کرتے۔ خیال رہے کہ نبی کا اپنی امت سے بیزار ہو جانا خدا تعالیٰ کا بڑا عذاب ہے۔ جب ماں باپ، دینی استاذ، شیخ کی ناراضی انسان کو تباہ کر دیتی ہے تو نبی کی بیزاری خدا کی پناہ۔ نبی اپنی امت کے جان، مال، اولاد، بیوی، گھربار سب کے مالک ہوتے ہیں۔ دیکھو خاوند پر بیوی کو نہ تو بادشاہ حرام کرسکتا ہے نہ مالک، نہ ماں باپ نہ کوئی اور مگر نبی بیوی کو بیوی رہتے ہوئے حرام فرما سکتے ہیں۔ حضرت کعب پر زمانہ بائیکاٹ میں ان کی بیوی حرام کر دی گئیں۔ یہ ہے نبی کی ملکیت۔ موسیٰ علیہ السلام کا لَاۤ اَمۡلِكُ فرمانا انتہائی غضب کا اظہار ہے۔ نبی ہی تو امت کی پناہ ہیں۔ جب وہ ہی ناراض ہو گئے تو سہارا کون سا رہ گیا۔ لہٰذا جناب کلیم اللہ کا یہ فرمان ان لوگوں پر غضب الٰہی ہے فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ۔ پچھلی عبارت دعا کی تمہید تھی۔ یہ عبارت اصل دعا ہے ف ترتیب کی ہے۔ فرق سے مراد ہے فاصلہ ودوری۔ اگر جگہ کی دوری مراد ہے تو آخرت میں دوری ہوگی اور اگر فیصلہ کی دوری وفرق مراد ہے تو دنیا میں ہوگی۔ بَیۡنَنَا میں نا سے مراد خود اپنی ذات اور

موسیٰ علیہ السلام سے ہے اور قوم فاسقین سے مراد یہ ہی ضدی نافرمان اسرائیلی ہیں۔ یعنی اے موسیٰ! علیہ السلام آئندہ آپ ان اسرائیلیوں کی پریشانی دیکھ کر غم ورنج نہ فرمانا۔ یہ تو ہیں ہی اس لائق اور ان کی یہ سزا آپ کی اس بددعا سے ہے۔ اس معنی سے یہ جملہ بالکل ظاہر ہے۔ بعض نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام یہ بددعا فرما کر رنجیدہ ہوئے تھے۔ تب فرمایا گیا کہ آپ اس پر غم نہ کریں مگر بات وہ ہی ہے جو ہم نے عرض کی۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے ان دو بزرگوں کا حکیمانہ جواب تو سن لیا جو انہوں نے بنی اسرائیل کے سمجھانے کے لئے دیا۔ اب بنی اسرائیل کا جواب الجواب بھی سنیئے کہ وہ ایسی عظیم الشان فتح کی بشارتیں سننے کے باوجود بولے کہ اے موسیٰ! علیہ السلام آپ اور آپ کے ساتھی یوشع و کالب خواہ کچھ بھی کہیں ہمارا جواب یہ ہے کہ جب تک قوم جبارین بیت المقدس میں ہے ہم وہاں کبھی بھی قدم نہ رکھیں گے۔ جہاد بہت بڑی چیز ہے اگر آپ کو جہاد کا شوق ہے تو بسم اللہ آپ خود جائیں اپنے رب کو ساتھ لے جائیں۔ آپ اور آپ کا رب دونوں جہاد کریں ہم تو یہاں ہی ٹھہریں گے آگے نہ بڑھیں گے۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے اس نافرمان قوم سے مایوس ہو کر جناب باری میں دعا اور معذرت کی کہ میرے مولیٰ یہ قوم میرے قابو کی نہیں۔ مجھے تو صرف اپنی ذات اور اپنے بھائی ہارون و یوشع و کالب پر ہی اختیار ہے۔ میرے مولیٰ میں تو اس قوم سے تنگ آ گیا۔ ہم چاروں میں اور نافرمان قوم میں علیحدگی فرما دے کہ ہمارے لئے اور قسم کا فیصلہ فرما۔ ان کے لئے دوسری قسم کا فیصلہ کر دے۔ تب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بذریعہ وحی یا بذریعہ الہام فرمایا کہ اچھا وہ مقدس بستی ان کے لئے چالیس سال تک حرام کر دی گئی کہ ان کا اس بستی میں اس عرصہ تک جانا ناممکن ہے۔ یہ ایک میدان میں ہی حیران و سرگرداں پھریں گے۔ اور آئندہ آپ ان کی پریشانی ملاحظہ فرما کر غم نہ کرنا۔ یہ لوگ ترس کھانے، رحم کرنے کے لائق نہیں ہیں، یہ سزا ان کے لئے نہایت موزوں ہے۔ چنانچہ یہ چھ لاکھ اسرائیلی زمین شام و مصر کے درمیان ایک نو کوس چوڑے تیس میل لمبے میدان میں اس طرح قید کر دیئے گئے کہ یہ لوگ دن بھر چلتے کہ یہاں سے نکل جاویں مگر شام کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے تھے وہاں ہی ہیں۔ اس عرصہ میں ان کی غذا کے لئے ان پر من و سلویٰ اتارا گیا۔ من میٹھا حلوا تھا اور سلویٰ نمکین کباب۔ جو روزانہ ان کو قدرتی طور پر مل جاتے تھے۔ ایک پتھر سے بارہ چشمے پانی کے جاری کر دیئے گئے۔ جس سے یہ پانی پئیں نہائیں۔ اس دوران میں ان کے کپڑے نہ گلے نہ پھٹے نہ میلے ہوئے۔ جو بچہ ان کے پیدا ہوتا۔ اس پر قدرتی ناخن کا لباس ہوتا تھا جو اس کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا تھا۔ رات کو روشنی کے لئے ایک ستون نمودار ہوتا تھا جو اس میدان میں بجلی کی ٹیوب کا کام دیتا تھا۔ دن کو ہلکا بادل ان پر سایہ کرتا تھا (از روح المعانی و بیان و کبیر و خازن وغیرہ) یہ پورا واقعہ بالتفصیل پہلے پارہ میں گزر چکا ہے۔ چالیس سال پورے ہونے پر بنی اسرائیل حضرت یوشع علیہ السلام یا موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ بیت المقدس پر حملہ آور ہوئے۔ اسے فتح کیا اس وقت بلعم ابن باعورا کے مردود ہونے اور سورج کے ٹھہر جانے کا واقعہ پیش آیا۔

ہے۔ زبردست فوج کا وہاں پہرا ہے۔ کیونکہ بیت المقدس کے آدھے شہر پر یہود کا قبضہ ہے۔ ان سے ہر وقت خطرہ ہے۔ وہاں یہ فقیر کئی گھنٹے حاضر رہا۔ بہت جاذبیت اور فیض ہے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ**: حضور ﷺ کے صحابہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ سے کہیں افضل ہیں، باوفا ہیں۔ دیکھو ان لوگوں نے تو اپنے نبی سے کہہ دیا کہ آپ اور آپ کا رب جائیں، جہاد کریں، ہم یہاں ہی رہیں گے۔ جہاد کی تکالیف آپ کو ہی پہنچیں۔ ہم تو جہاد بلکہ فتح کے بعد آرام حاصل کرنے وہاں پہنچیں گے گویا اپنے آرام پر نبی کو قربان کر رہے ہیں۔ مگر ایک بار حضور انور ﷺ کو متفکر دیکھ کر حضرت مقداد ابن اسود وغیرہم نے فرمایا تھا کہ یارسول اللہ! ﷺ ہم اصحاب موسیٰ نہیں ہیں جو آپ سے عرض کریں کہ آپ اور آپ کا رب جہاد کریں، ہم یہاں ہی رہیں گے۔ ہم تو اصحاب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ شعر

تعالیٰ اللہ یہ شیوہ ہی نہیں ہے باوفاؤں کا — پیا ہے دودھ ہم لوگوں نے غیرت مند ماؤں کا
اگر ارشاد ہو بحر فنا میں کود جائیں ہم — ہلاکت خیز گرداب بلا میں کود جائیں ہم
نبی کا حکم ہو تو پھاند جائیں ہم سمندر میں — جہاں کو محو کر دیں نعرہ اللہ اکبر میں

ان صحابہ کرام نے اپنا سب کچھ حضور پر قربان کر دیا اور جنگ بدر و حنین وغیرہ میں ساتھ دیا۔ عہد فاروقی میں تو ان حضرات نے کمال ہی کر دیا۔ جیسے حضور تمام نبیوں کے سردار ہیں ویسے ہی حضور کے صحابہ تمام نبیوں کے صحابہ کے سردار ہیں۔ یوں سمجھو کہ امت مصطفوی اپنے نبی کے نام پر فدا اور قربان تھی اور ہے۔ امت موسوی اپنے آرام پر اپنے کو قربانی کرنا چاہتی ہے۔ حضور انور پر ہجرت کی رات اور احد کے دن دشواریاں پیش آئیں مگر ان دونوں وقتوں میں صحابہ نے حضور کا ساتھ نہ چھوڑا۔ حضور کی ہجرت کے وقت صرف دو صحابی مکہ میں تھے حضرت ابوبکر اور علی، باقی حضرات ہجرت کر چکے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے جو قربانیاں دیں وہ دنیا کو معلوم ہیں۔ **دوسرا فائدہ**: بنی اسرائیل ایسی سرکش قوم ہے کہ ان سے ان کے نبی بھی بیزار تھے اس لئے آپ نے فرمایا کہ الٰہی! مجھے صرف اپنے برادر اور اپنے بھائی پر ہی قابو ہے۔ اب بھی بنی اسرائیل یعنی یہود تمام دنیا کے لئے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے پیغمبر ہم سے کبھی بیزار نہیں ہوئے۔ ہمیشہ ہمارے لئے دعائیں ہی کرتے رہے۔ رات کو جب سب سوتے ہیں تو وہ رحمت والے کھڑے ہو کر مصلیٰ پر امت کے لئے روتے ہیں۔ **تیسرا فائدہ**: بروں سے علیحدگی اچھی ہے۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے علیحدگی کی دعا کی۔ **چوتھا فائدہ**: جہاد کی فرضیت کے لئے فوج اور دوسرا جنگی سامان شرط ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل کے انکار کر دینے پر موسیٰ علیہ السلام کو جہاد کا حکم نہ دیا گیا کیوں کہ شرائط جہاد ختم ہو چکے تھے۔ ظاہری اعتبار صرف دو چار آدمی جہاد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے لئے جہاد مؤخر کر دیا گیا۔ **پانچواں فائدہ**: پیغمبر کی مخالفت کی وجہ سے کبھی دنیا میں بھی مصیبت آ جاتی ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل کی اس حرکت میں ان پر دنیاوی آفت آ گئی کہ ۔۔۔ تمام تیہ میں قید کر دیئے گئے۔ یوں ہی پیغمبر کی اطاعت سے دنیا میں بھی اللہ کی رحمتیں مل جاتی

ضرور تھے پھر یہ کلام کیوں کر درست ہوا؟ **جواب:** مفسرین نے اس سوال کے کئی جواب دیئے ہیں۔ قوی اور بہتر جواب وہ ہے جو ہم نے تفسیر میں ابھی عرض کیا کہ یہاں اخ سے مراد صرف نسبی بھائی نہیں بلکہ دینی بھائی مراد ہے۔ جس میں وہ سب حضرات شامل ہیں اخ جنسی معنی میں ہے۔

دوسرا اعتراض: بنی اسرائیل تو اپنی اس سرکشی کی وجہ سے تیہ میں قید کیے گئے۔ حضرت موسیٰ و ہارون اور دوسرے مؤمنین وہاں کیوں قید کیے گئے انہوں نے کیا قصور کیا تھا؟ **جواب:** وہ حضرات وہاں قید نہ کیے گئے بلکہ ان قیدیوں کو سنبھالنے کے لئے وہاں رکھ گئے۔ جیسے جیل میں حکومت کا پورا عملہ رہتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ کیوں قیدیوں کو سنبھالنے، ان کی حفاظت کے لئے اگر یہ حضرات وہاں نہ ہوتے تو بنی اسرائیل کو وہاں نہ من وسلویٰ ملتا، نہ پانی نہ روشنی نہ سایہ۔ یہ سب کچھ ان بزرگوں کی برکت سے ملا۔ ان کے قدم بابرکت تھے۔

تیسرا اعتراض: جب موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ خدایا ہم کو ان فاسقوں سے الگ رکھ تو آپ کو تیہ میں ان مجرموں کے ساتھ کیوں رکھا گیا، کیا یہ دعا قبول نہ ہوئی؟ **جواب:** بعض مفسرین نے اسی وجہ سے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تیہ میں نہ رہے مگر یہ قوی نہیں کیوں کہ حضرت ہارون، یوشع اور کالب علیہم السلام تو یقیناً وہاں رہے۔ پھر بھی اعتراض پڑ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے صرف اپنی علیحدگی کی دعا نہ کی تھی بلکہ سب مسلمانوں کی علیحدگی کی دعا کی تھی۔ کہ عرض کیا تھا۔ **فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ** قوی جواب یہ ہے۔ کہ یہاں درجے مرتبے کی جدائی مراد ہے نہ کہ جگہ یا وقت کی علیحدگی۔ لہٰذا آپ تیہ میں رہتے ہوئے بھی ان مجرمین سے الگ رہے۔ جیل کے حکام جیل میں ہوتے ہوئے بھی قیدیوں سے الگ رہتے ہیں۔ لہٰذا آیت واضح ہے۔

چوتھا اعتراض: موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو خبر دی تھی کہ یہ زمین مقدسہ اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔ پھر وہ لوگ اس زمین کو کیوں حاصل نہ کر سکے اور مقام تیہ میں کیوں قید ہوئے کیا اللہ تعالیٰ کا وعدہ غلط ہو گیا۔ **جواب:** اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا مگر چالیس سال کے بعد۔ ان کی سرکشی سے چالیس سال کی معیاد پڑ گئی۔ پھر یہ بنی اسرائیل وہاں کے فاتح وہاں کے حاکم و سلطان بنے۔ اسی لئے یہاں فرمایا گیا کہ یہ زمین چالیس سال تک ان پر حرام ہے یعنی اس مدت کے بعد پھر وہاں جائیں گے۔

پانچواں اعتراض: رب تعالیٰ نے آخر میں یہ کیوں فرمایا۔ کہ **فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ** کہ آپ ان فاسقوں پر غم نہ کرو۔ جب خود ہی موسیٰ علیہ السلام نے ان پر بددعا کی تھی تو ان پر غم کرنے کے کیا معنی پھر اس فرمان کا مطلب کیا ہے؟ **جواب:** ہم اس کا جواب اشارۃً ابھی تفسیر میں دے چکے۔ مقصد یہ ہے کہ آئندہ آپ ان لوگوں کی تکلیف دیکھ کر غم نہ کریں۔ دیکھو حضرت نوح علیہ السلام نے خود ہی کفار پر بددعا فرمائی۔ پھر آپ نے اپنے فرزند کنعان پر غم بھی کیا۔ ایسا آپ نہ کرنا لہٰذا آیت واضح ہے۔

میں حاضر ہوئے، پیغام پہنچایا، فرمایا پھر کیا ہوگا، عرض کیا پھر موت، فرمایا تو ابھی سہی۔ صوفیاء اس طمانچہ مارنے کی نہایت عجیب وجہ بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ پہلے ملک الموت نے عرض کیا کہ میں اس لئے آیا ہوں تا کہ آپ کو دار الفناء سے دار البقا کی طرف منتقل کر دوں۔ آپ نے طمانچہ مار دیا کہ ہم دار الفنا میں ہی ہیں کہاں جو ہمیں منتقل کرو گے۔ ادب سے ہمارا درجہ پہچانتے ہوئے کلام کرو چنانچہ بعد میں دوبارہ حاضر ہو کر ملک الموت نے عرض کیا۔ اس لئے آیا ہوں لا صل الحبیب الی الحبیب۔ پیارے کو پیارے سے ملا دوں، آپ فوراً تیار ہو گئے۔ اس طمانچہ میں تعلیم ادب تھی۔ اس حدیث کے بہت نکات سوالات کے جوابات ہمارے مواعظ (مواعظ نعیمیہ) میں ملاحظہ کرو۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا
اور تلاوت کرو اوپر ان کے خبر آدم کے دو بیٹوں کی ساتھ حق کے جب کہ قربانی دی ان دونوں نے قربانی
اور انہیں پڑھ کر سناؤ آدم کے دو بیٹوں کی سچی خبر جب دونوں نے ایک ایک نیاز پیش کی
فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ
پس قبول کر لی گئی ان دونوں میں سے ایک سے اور نہ قبول کی گئی دوسرے سے
تو ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی نہ ہوئی
قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۷﴾
وہ بولا کہ میں قتل کروں گا تجھے کہا اس کے سوا نہیں کہ قبول کرتا ہے اللہ پرہیزگاروں سے
بولا قسم ہے میں تجھے قتل کروں گا کہا اللہ اسی سے قبول کرتا ہے جسے ڈر ہے
لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ
البتہ اگر پھیلایا تو نے میری طرف ہاتھ اپنا تا کہ قتل کر دے تو مجھے نہیں ہوں میں پھیلانے والا
بے شک اگر تو اپنا ہاتھ مجھ پر بڑھائے گا کہ مجھے قتل کرے تو میں اپنا ہاتھ
یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾
ہاتھ اپنا طرف تیری تا کہ قتل کر دوں تجھے بے شک میں ڈرتا ہوں اللہ سے پالنے والا جہانوں کا
نہ بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو مالک سارے جہان کا
اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ

انسان بنی آدم ہیں اس لئے انہیں ابن آدم فرمایا گیا۔ کیونکہ آگے آ رہا ہے۔ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الخ (مائدہ: ۳۲) مگر حق یہ ہے کہ ان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کے دو صلبی بیٹے ہیں قابیل اور ہابیل۔ کیونکہ اسی آیت کے بعد آ رہا ہے کہ قاتل کو مقتول کی نعش دفن کرنے کا طریقہ نہ آیا تو کوے کو بھیج کر دفن کرنا سکھایا گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی میت تھی اور پہلا دفن۔ اگر بنی اسرائیل کے دو آدمی ہوتے تو انہیں دفن کا طریقہ معلوم ہوتا۔ بِالْحَقِّ یا تواتْلُ کے متعلق ہے یا ثابۃً کے متعلق ہو کر نَبَاَ کی صفت ہے۔ یعنی اے محبوب! آپ بنی اسرائیل کو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کی سچی خبر سنا دیجئے یا حق کے ساتھ تلاوت فرما دیجئے۔ **خیال رھے:** کہ حضرت حوا کے بیس حمل سے چالیس بچے پیدا ہوئے۔ ہر حمل میں ایک لڑکا ایک لڑکی پیدا ہوتے تھے۔ ان میں پہلے سے قابیل اور اس کی بہن اقلیمہ پیدا ہوئے۔ ایک سال کے بعد پھر حمل سے ہابیل اور لیوا پیدا ہوئے۔ ہابیل کے قتل ہو جانے پر ایک لڑکی زیادہ بچ رہی۔ اس لئے حضرت شیث علیہ السلام اکیلے پیدا ہوئے۔ بعض نے کہا کہ قابیل اور اقلیمہ جنت میں پیدا ہوئے تھے مگر صحیح یہ ہے کہ زمین پر آ کر پیدا ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی نسل میں ایسی برکت دی کہ آپ کے وفات کے وقت چالیس ہزار انسان موجود تھے۔ بیٹے پوتے، نواسے سب ملا کر۔ اس زمانہ میں لڑکے پر اپنی توام (ساتھ پیدا ہونے والی) لڑکی حرام دوسرے حمل کی بچی حلال ہوتی تھی۔ اس لئے قابیل کے لئے لیوا حلال تھی اور ہابیل کے لئے اقلیما حلال۔ مگر اقلیما خوبصورت تھی اس لئے قابیل نے چاہا کہ اس سے ہی نکاح کرے۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا یہ لڑکی تیرے لئے حرام ہے۔ یہ ہابیل کے نکاح میں جا سکتی ہے۔ قابیل بولا آپ جھوٹ کہتے ہیں رب تعالیٰ کا یہ حکم نہیں ہے، آپ کی اپنی رائے ہے، آپ ہابیل کو زیادہ چاہتے ہیں اس لئے آپ کی کوشش یہ ہے کہ خوب صورت لڑکی اس کی بیوی بنے۔ تب آپ نے فرمایا۔ اچھا تم دونوں اقلیمہ کے متعلق قربانیاں پیش کرو جس کی قربانی قبول ہو جاوے وہ ہی اقلیمہ سے نکاح کرے۔ دونوں نے قبول کر لیا اس کا ذکر یہاں ہے۔ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا۔ اِذْ ظرف ہے۔ نَبَاَ کا نَبَاءَ ہی اس میں عامل ہے۔ کیونکہ نَبَاَ میں معنی مصدر ہیں۔ قربان اس پیش کش کا نام ہے جس سے قرب الٰہی حاصل کیا جاوے قَرَّبَا کا فاعل وہ دو بیٹے ہیں۔ قابیل و ہابیل قربان میں جانور ہی کی قید نہیں کوئی چیز ہو قرب الٰہی کے لئے پیش ہو قربان ہے۔ قابیل کھیتی باڑی کرتا تھا۔ ہابیل جانور پالتا تھا۔ چنانچہ ہابیل نے تو نہایت نفیس دنبہ ذبح کیا اور قابیل نے نہایت ردی گندم کی بالیاں لیں حتی کہ جس بالی میں اچھی گندم تھی وہ مل کر خود کھا لی۔ یہ دونوں چیزیں ایک پہاڑ پر رکھ دیں۔ قابیل کی نیت یہ تھی کہ اگر میری قربانی قبول نہ بھی ہوئی جب بھی اقلیمہ کو چھوڑوں گا نہیں۔ ہابیل نہایت اخلاص سے قربانی لے گیا۔ دل میں سوچ لیا کہ میں اللہ کے حکم پر راضی ہوں، جو فیصلہ ہوگا مجھے منظور ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ۔ یہ ہابیل و قابیل قربانیاں پیش کرنے کے نتیجہ کا بیان ہے ف تعقیب بلا تراخی کے لئے اَحَدِهِمَا سے مراد ہابیل اور الْاٰخَرِ سے مراد ہے قابیل۔ اس زمانہ میں قربانی قبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ سفید رنگ کی غیبی آگ آسمان سے آتی اور قربانی کی چیز کو جلا جاتی تھی۔ مردود قربانی پر آگ نہ آتی تھی یہ جلاتی تھی وہ یونہی پڑی رہتی تھی۔ اس قاعدہ سے اس پہاڑ پر غیبی

اصل وطن آخرت ہے۔ دنیا تو ایک سفر کی منزل ہے۔ وہاں سے دنیا میں آیا ہے۔ وہاں ہی جانا ہے اس لئے وہاں جانے کو رجوع ''بوء'' یعنی لوٹنا واپس ہونا کہا جاتا ہے۔ اِثۡمِیۡ میں مضاف پوشیدہ ہے اصل میں اِثۡمُ قَتۡلِیۡ تھا۔ یہاں گناہ کی نسبت ہابیل کی طرف سببت کی نسبت ہے نہ کہ فاعلیت کی اور اِثۡمِكَ سے مراد قابیل کے پچھلے گناہ ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کا حکم نہ ماننا، ناجائز نکاح کا ارادہ کرنا، ہابیل کے قتل کا ارادہ کرنا پھر قتل کے بعد مرتد ہو جانا۔ گانا، بجانا، باجے تاشے ایجاد کرنا وغیرہ اور ہوسکتا ہے۔ کہ اثمی سے مراد ہابیل کے سارے گزشتہ گناہ ہوں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ظالم قاتل پر مقتول کے گناہ لاد دیئے جائیں گے۔ لہٰذا آیت واضح ہے۔ یعنی میں چاہتا ہوں کہ میں ظالم نہ بنوں، مظلوم بنوں۔ تاکہ تو قیامت میں میرے تمام گناہوں کا بوجھ بھی اٹھا لے اور اپنے گناہوں کا بھی۔ فَتَكُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ۔ یہ عبارت ان تَبُوۡٓاَ پر مرتب ہے۔ اَصۡحٰبِ النَّارِ سے مراد ہے۔ دائمی دوزخی ہو جانا۔ جو کافروں کے لئے ہوگا۔ یا تو قابیل اس وقت ہی مرتد ہو چکا تھا۔ نبی کے فرمان کو غلط سمجھنے کی وجہ سے یا آئندہ مرتد ہونے والا تھا۔ اس لئے ہابیل نے یہ کہا وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيۡنَ ظاہر یہ ہے کہ یہ کلام بھی ہابیل کا ہی ہے جو انہوں نے قابیل سے کیا۔ ظالمین سے مراد مرتدین یا قاتلین ہیں۔ ذلک سے اشارہ گزشتہ سزاؤں کی طرف ہے۔ اپنے اور دوسرے کے گناہ لے کر لوٹنا دائمی دوزخی ہونا۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ فرمان رب تعالیٰ کا ہو۔ اور خطاب نبی کریم ﷺ سے ہو۔ یعنی اے محبوب! ظالموں، قاتلوں، مرتدوں کی یہ ہی سزا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے محبوب ﷺ ان حاسدین، بے وفا معاندین، یہودیوں کو یا اپنی امت کو یا تمام لوگوں کو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کا سچا واقعہ پڑھ کر سنا دو۔ جب کہ دونوں بھائیوں میں ایک لڑکی اقلیمہ کے متعلق اختلاف ہوا۔ تو آدم علیہ السلام کے حکم سے قرعہ اندازی کے طریقہ پر دونوں نے بارگاہ الٰہی میں اپنی اپنی قربانیاں پیش کیں۔ اس طرح کہ ہابیل نے تو اعلیٰ درجہ کا دنبہ نہایت خوش دل نیک نیتی سے اور قابیل نے اپنے کھیت کے گندم کی ردی بالیاں نہایت بددلی بدنیتی سے ایک پہاڑ پر رکھ دیں۔ چنانچہ ہابیل کی قربانی تو قبول ہوگئی کہ غیبی آسمانی آگ ان کے دنبہ کو جلا گئی یا اٹھا لے گئی اور قابیل کی قربانی رد ہوگئی کہ اس کی ردی بالیاں ویسے ہی پڑی رہیں تو قابیل بجائے توبہ کرنے کے حسد کی آگ سے اور بھڑک گیا بولا کہ اے ہابیل! میں تجھے قتل کر دوں گا تاکہ تو اقلیمہ سے نکاح نہ کر سکے۔ ہابیل نے کہا کہ اس قربانی کے رد ہونے میں میرا کیا قصور ہے، میں حق پر ہوں، بے قصور ہوں۔ اخلاص سے میں نے قربانی پیش کی، نیک نیت میں تھا اور تو ناحق پر ہے، قصور مند ہے۔ قربانی میں نہ تجھے اخلاص نصیب ہوا نہ نیک نیتی لہٰذا تو فاسق ہے۔ فاسق کی قربانی قابل قبول نہیں۔ اللہ تعالیٰ متقیوں پرہیزگاروں کی قربانیاں قبول کرتا ہے۔ اے قابیل سن لے! اگر تو نے مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ کیوں کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ قاتل کی سزا رب تعالیٰ کے یہاں بہت ہی سخت ہے۔ سن لے میں بزدل یا کمزور نہیں ہوں۔ تجھ سے عمر میں بڑا بھی ہوں، طاقت میں زیادہ بھی مگر میں چاہتا ہوں کہ میں تیرے گناہ لے کر رب تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر نہ ہوں بلکہ تو میرے قتل کا گناہ اور اپنے باقی سارے گناہ لے کر یا میرے

جسے غیبی آگ جلا جاتی تھی۔ ہر جگہ نماز ادا ہو جانا، تیمم، قربانی کا گوشت، مال غنیمت صرف اسلام میں حلال ہوئے اس سے پہلے حلال نہ تھے۔ **بارھواں فائدہ:** حسد تمام گناہوں کی جڑ ہے شیطان مردود ہوا تو حسد سے۔ قابیل ہلاک ہوا تو حسد سے۔ قتل ہابیل حسد کی بنا پر ہوا۔ اللہ تعالیٰ حسد سے بچائے۔ **تیرھواں فائدہ:** تمام فتنوں میں عورت کا فتنہ بہت زبردست ہے۔ دنیا میں پہلا قتل عورت کی وجہ سے ہوا۔ قابیل نے ہابیل کو عورت ہی کی وجہ سے قتل کیا۔ زن، زر، زمین یہ جھگڑے کی بنیاد ہیں۔ ان سب میں زن بہت خطرناک ہے۔ شعر

جھگڑے کی بنیادیں تین زن ہے زر ہے اور زمین
اگر نیک بودے سر انجام زن زناں را مزن نام بودے نہ زن

چودھواں فائدہ: مظلوم مقتول کے گناہ ظالم قاتل پر ڈال دیئے جائیں گے۔ کہ وہ اپنے گناہوں کی بھی سزا بھگتے گا اور مظلوم کے گناہوں کی بھی جیسا کہ **بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ** کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا۔ **پندرھواں فائدہ:** مرتد دائمی دوزخی ہے کہ کفار کی کبھی بخشش نہیں۔ یہ فائدہ **مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ** سے حاصل ہوا۔ **سولھواں فائدہ:** اگر مظلوم مقتول اپنی جان بچانے کے لئے قاتل کو قتل کر دے۔ جب کہ اس کے بغیر قتل کیے اپنی جان نہ بچتی ہو تو جائز ہے۔ اسے حفاظت خود اختیاری کہتے ہیں لیکن اگر مظلوم خود قتل ہو جاوے، ظالم کو قتل نہ کرے تو جب کہ اسے اپنا قتل ہو جانا یقین سے معلوم ہو تو جائز بلکہ ثواب ہے۔ یہ فائدہ **مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ** سے حاصل ہوا۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ہابیل کے اس صبر کی تعریف فرمائی۔ دیکھو حضرت عثمان غنی نے ظالم قاتل کا مقابلہ نہ کیا صابر رہتے ہوئے تلاوت قرآن کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ آپ کا یہ عمل اس آیت کی تفسیر ہے۔ باغیوں سے جنگ نہ کرنا، مظلوم شہید ہو جانا، اس آیت سے ثابت ہوا۔ اور حضرت علی نے باغیوں سے جنگ کی۔ ان کا عمل اس آیت پر تھا۔ **فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ** (حجرات:۹) یہ دونوں حضرات اللہ کے پیارے ہیں۔ **سترھواں فائدہ:** قربانی کی قبولیت تقویٰ و اخلاص سے ہے نہ کہ محض ظاہری ٹیپ وٹاپ سے۔ یہ فائدہ **اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ** سے حاصل ہوا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: **لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا** الخ (حج:۳۷)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہابیل نے اپنے کو قابیل کے سامنے پیش کر دیا اپنے بچاؤ کی کوشش نہ کی۔ یہ تو خودکشی ہے جیسے زہر کھا کر یا اپنے کو پھانسی لگا کر ہلاک کرنا خودکشی ہے ایسے ہی ظالم قاتل کے سامنے لیٹ جانا، اس کے ہاتھ میں تلوار دے دینا، اپنا گلا اس کے سامنے کر دینا بھی خودکشی ہے پھر ہابیل نے یہ کیوں کیا اور رب تعالیٰ نے ان کی اس حرام موت کی تعریف کیوں فرمائی (بعض بے دین)؟ **جواب:** ظلماً قتل سامنے آ جاوے تو اس وقت چار صورتیں ہوتی ہیں جن میں سے تین صورتیں جائز ہیں ایک صورت ناجائز۔ ایک اپنا دفاع کرنا یعنی ظلم کا مقابلہ کرنا اگرچہ اس دفاع میں حملہ آور کو قتل کرنا ہی پڑ جاوے یا اس سے جنگ و قتال کی نوبت آ جاوے۔ حضرت حسین اور حضرت علی کا قاتلین سے مقابلہ اسی بناء پر تھا۔ دوسرے یہ کہ ایسی حالت میں ظالم کو قتل نہ کرنا اپنے بچاؤ کی اور

علیہ السلام کی محبت تھی۔ کہ آپ یوسف علیہ السلام سے الگ ہو کر ہم سے محبت کرنے لگیں گے۔ بنیادوں میں فرق تھا تو پھلوں اور نتیجوں میں فرق ہو گیا۔ چونکہ ابھی یہ واقعہ پورا بیان نہیں ہوا کچھ حصہ ابھی آ رہا ہے اس لئے اس کی تفسیر صوفیانہ انشاء اللہ آگے بیان ہو گی۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ
پس رغبت دی اس کو اس کے نفس نے قتل کی اپنے بھائی کے پس قتل کر دیا اس کو پس ہو گیا
تو اس کے نفس نے اسے بھائی کے قتل کا چاؤ دلایا تو اسے قتل کر دیا تو رہ گیا
الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ
نقصان والوں سے پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کھودتا تھا زمین میں
نقصان میں تو اللہ نے ایک کوا بھیجا زمین کریدتا تھا
لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى
تا کہ دکھائے اس کو کیسے چھپائے جسم مردہ اپنے بھائی کا بولا ہائے خرابی میری
تا کہ اسے دکھائے کیوں کر اپنے بھائی کی لاش چھپائے بولا ہائے خرابی میں اس
اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ
کیا عاجز ہو گیا میں یہ کہ ہوؤں میں مثل اس کوے کے پس چھپا دیتا میں
کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ میں اپنے بھائی
سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ ۚۛ
مردہ جسم اپنے بھائی کا تو ہو گیا وہ شرمندوں سے
کی لاش چھپاتا تو پچھتاتا رہ گیا

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات کریمہ سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں قابیل کے ارادہ قتل کا ذکر تھا اب اس کے فعل قتل کا ذکر ہے۔ گویا یہ آیت اس مضمون کا نتیجہ بیان فرما رہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں ہابیل کی نصیحتوں کا ذکر تھا جو اس نے قابیل کو کیں تا کہ وہ اس ارادہ سے باز رہے۔ اب اس کی نصیحت قبول نہ کرنے کا ذکر ہے گویا تبلیغ کا ذکر پہلے تھا اور تبلیغ کے اثر نہ ہونے کا ذکر اب ہے۔

یا رب تعالیٰ کا اس کوے کو اس کام کے لئے مقرر فرمانا۔ جب کسی کام کی عظمت یا اہمیت دکھانی ہو تو اسے رب تعالیٰ کی طرف نسبت کیا جاتا ہے اور جب کسی کام کی حقارت یا اس کی جزا دکھانی ہو تو شیطان کی طرف نسبت کیا جاتا ہے۔ جیسے فَاَنْسٰهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ (یوسف: ۴۲) چونکہ کوے کے اس فعل سے تا قیامت انسانوں کو دفن کی تعلیم دینی تھی اس لئے فَبَعَثَ اللّٰهُ فرمایا۔ یعنی بعث کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کی گئی۔ غُرَابًا بنا ہے غروب سے بمعنی غائب ہو جانا، دور ہو جانا اس لئے سورج کے چھپنے کے غروب کہتے ہیں۔ مسافر کو غریب کہ وہ اپنے وطن سے دور ہے، انوکھی چیز کو بھی غریب چیز کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی نظر سے غائب رہتی ہے۔ کوے کو عربی میں غراب اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے گھر سے بہت دور نکل جاتا ہے۔ (غ) یَّبْحَثُ بنا ہے بحث سے۔ بحث کے معنی ہیں کھل جانا، ظاہر ہو جانا، مباحثہ، مناظرہ کو اس لئے بحث کہتے ہیں کہ اس سے اصل واقعہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ زمین کریدنے کو بھی بحث اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے زمین کا اندرونی حصہ کھل جاتا ہے۔ (غ، ل) قابیل نے ہابیل کو قتل تو کر دیا مگر یہ نہ جانا کہ اب اس لاش کو کیا کرے۔ اس لئے یہ لاش ایک تھیلے میں ڈال کر چالیس دن اپنے کندھے پر لئے پھرا۔ حیران تھا کہ کیا کرے تب اللہ تعالیٰ نے اس کی تعلیم کے لئے دو کوے بھیجے۔ ایک کوے نے دوسرے کو قتل کر کے اپنی چونچ اور پنجوں سے زمین کرید کر گڑھا کیا اور مرے کوے کو اس گڑھے میں رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ تب قابیل کو دفن کرنے کا طریقہ آیا اور اس نے اسی ترکیب سے ہابیل کی لاش دفن کی یہاں اس کا ذکر ہے۔ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ یہ عبارت "فَبَعَثَ اللّٰهُ" کے متعلق ہے لام تعلیلیہ ہے۔ یُرِیَ اِرَاءَةٌ سے بنا ہے بمعنی دکھانا اس کا فاعل رب تعالیٰ ہے۔ بعض نے کہا کہ فاعل کوا ہے۔ یُوَارِیْ بنا ہے وریٌ سے بمعنی چھپانا۔ رب فرماتا ہے لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ (اعراف: ۲۶) اسی سے ہے تواری۔ فرماتا ہے: حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (ص: ۳۲) مخلوق کو وری کہتے ہیں کہ ان سے زمین چھپ جاتی ہے۔ پیچھے کو وراء کہا جاتا ہے۔ فرمایا فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ (النساء: ۱۰۲) بلکہ کبھی آگے کو بھی وراء کہہ دیتے ہیں کہ وہ بھی چھپا ہوتا ہے۔ رب فرماتا ہے وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ (کہف: ۷۹) سواء کو بھی وراء کہا جاتا ہے، فرماتا ہے وَ یَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (بقرہ: ۹۱) ان سب میں چھپنے کے معنی ملحوظ ہیں۔ سَوْءَةَ، ساء یسوء سے ہے بمعنی رنجیدہ و غمگین ہونا۔ اب مراد وہ چیز سَوْءَةَ کہلاتی ہے جس کا ظاہر ہونا غمگین کرے۔ اس لئے ستر کو "سَوْءَةَ" کہا فحش بے حیائی کے کام کو سوءۃ کہا جاتا ہے کہ ان کا کھلنا غمگین کرتا ہے۔ یہاں ہابیل کی لاش کو سوءۃ کہا۔ کیونکہ قابیل اسے چھپانا چاہتا تھا۔ اس کے ظہور سے اسے غم تھا ورنہ ہابیل کے مردہ جسم پر کپڑے تھے اور وہ تھیلے میں چھپا ہوا تھا۔ یعنی رب تعالیٰ نے کوا اس لئے بھیجا کہ وہ کوا اسے دکھا دے۔ یا رب تعالیٰ کوے کے ذریعے اسے دکھا دے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ کیوں کر دفن کرے قَالَ یٰوَیْلَتٰۤی اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ۚ۔ قول سے مراد یا تو دل میں کہنا ہے۔ یعنی سوچنا یا زبان سے کہنا خود منہ میں بڑبڑانا یا ندا کے لئے۔ یا اظہار افسوس کے لئے۔ وَیْلَتٰی بنا ہے ویلٌ سے ویل اور ویح دونوں کے معنی ہیں۔ قبح، برائی، خرابی یہ لفظ اظہار افسوس

پہلے کسی درخت میں کانٹے نہ ہوتے تھے، بعض درختوں کے پھل کھٹے بعض کے پکے ہوگئے، پہلے سب کے میٹھے ہوتے تھے، زمین کا رنگ گندمی ہوگیا، پہلے اس مٹی کا رنگ یہ نہ تھا (تفسیر صاوی و روح البیان)۔ اسی وقت آپ سمجھ گئے کہ آج کوئی بڑا حادثہ ہوا ہے اس میں اختلاف یہ ہے کہ یہ قتل کہاں واقع ہوا؟ بعض نے فرمایا کہ بصرہ میں ہوا، بعض نے فرمایا کہ زمین ہند میں بلکہ بعض نے کہا کہ خود مکہ معظمہ میں غار حرا کے پیچھے ہوا۔ اور اس وقت حضرت آدم طواف کعبہ کر رہے تھے۔ اس وقت ہابیل کی عمر بیس یا پچیس سال تھی (روح البیان و خازن)۔ قتل کا یہ واقعہ ہوتے ہی قابیل کا رنگ سیاہ ہوگیا پہلے سفید تھا، دل نہایت سخت ہوگیا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام گھر آئے تو قابیل سے پوچھا کہ ہابیل کہاں ہے؟ بولا کہ میں ہابیل کا محافظ نہ تھا مجھے خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ آپ نے فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے اسے قتل کر دیا ہے ورنہ تو پہلے گورا تھا، اب کالا کیوں ہوگیا۔ پہلے زمین خون ایسے ہی چوس لیتی تھی۔ جیسے آج پانی کو چوس لیتی ہے۔ آپ کی اس وقت کی دعا سے زمین نے خون چوسنا جذب کرنا چھوڑ دیا تا کہ آئندہ قتل کا سراغ خون سے لگ سکے۔ آپ کو قتل ہابیل سے بہت صدمہ ہوا۔ تب آپ نے بطور مرثیہ کچھ کلمات زبان سریانی میں فرمائے۔ عربی شاعر نے اسے عربی اشعار میں یوں بیان کیا۔

تغیرت البلاد و من علیها   فوجه الارض مغبر قبیح
تغیر کل ذی لون وطعم   وکل بشاشة الوجه الصبیح
ومالی لا اجود بسکب دمع   و هابیل تضمنه الضریح
اری طول الحیوة علی نقما   فهل انا من حیاتی مستریح

یعنی تمام شہر اور شہروں کے لوگ بدل گئے۔ خود زمین خیالی رنگ بری ہوگئی۔ ہر رنگ و مزے والی چیز بدل گئی اور حسین چہروں کی بشاشت جاتی رہی۔ میں آنسو کیوں نہ بہاؤں اور ہابیل کو قبر نے گود میں لے لیا۔ عمر بھر اس کی تکلیف محسوس کروں گا۔ اب مجھے زندگی میں چین نہ آئے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اشعار ہی آدم علیہ السلام نے کہے۔ مگر تفسیر خازن و روح المعانی و تفسیر کبیر نے اس کا انکار کیا اور فرمایا کہ حضرات انبیاء کرام شعر نہیں کہا کرتے۔ یہ اشعار تفسیر خازن و روح البیان نے نقل فرمائے۔ آدم علیہ السلام کو اس قتل کا اتنا صدمہ ہوا کہ آپ بقیہ عمر پھر ہنسے نہیں۔ قابیل اپنی بہن اقلیمہ کو جس کا وہ خواہش مند تھا جو اس کے لئے حرام تھی اسے لے کر عدن بھاگ گیا۔ وہاں ہی اس سے اس کی اولاد حرام کی ہوئی ایک دن ابلیس نے اس سے کہا کہ اگر تو آگ کی پرستش کرتا ہوتا تو تیری قربانی کو بھی آگ کھا لیتی۔ ہابیل آگ پوجتا تھا اس لئے آگ نے اس کی قربانی قبول کر لی۔ قابیل نے یہ سن کر آگ کی پرستش شروع کر دی اور سب سے پہلے آتش پرستی قابیل نے ہی کی۔ اسی نے ستار، سارنگی، گانا، باجے ایجاد کیے۔ آخر میں جب بوڑھا ہوگیا تو اس کی اولاد اسے پتھر مارا کرتی تھی۔ آخر اس کے ایک بیٹے نے اسے قتل کر دیا۔ کفر و طغیان پر بڑی ذلت کے ساتھ مرا۔ قتل ہابیل کے پچاس سال بعد حضرت شیث علیہ السلام اکیلے پیدا ہوئے اور آپ ہی آدم علیہ السلام کے خلیفہ اور نبی برحق ہوئے۔ آپ اول عابد، زاہد، شب زندہ دار تھے (عام تفاسیر و روح البیان وغیرہ)۔

کیں۔ یونہی سعید کا دل برے مشورے قبول نہیں کرتا۔ **بارھواں فائدہ:** جن دنوں میں منحوس کام ہو چکے ہوں۔ وہ دن قیامت تک منحوس ہیں۔ دیکھو منگل کا دن منحوس ہوا کہ اس دن قتل ہابیل واقع ہوا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (قمر:۱۹) اس طرح جن دنوں میں اچھے واقعات ہو چکے ہیں وہ دن سعید ہیں جیسے دوشنبہ یا جمعہ یا ماہِ رمضان۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: قابیل تو کافر ہو چکا تھا۔ ہابیل مومن رہا۔ مومن کافر کا دشمن ہے نہ کہ بھائی۔ پھر اسے ہابیل کا بھائی کیوں کہا گیا رب فرماتا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (حجرات:۱۰) سارے مومن آپس میں بھائی ہیں۔ یہ آیت کریمہ اس آیت کے خلاف ہے۔ **جواب:** بھائی بہت قسم کے ہوتے ہیں۔ نسبی بھائی، ملکی بھائی، کاروباری بھائی اور دینی بھائی، استاد بھائی، پیر بھائی، وطنی بھائی وغیرہ۔ یہاں اس آیت کریمہ میں نسبی بھائی مراد ہے۔ یعنی باپ وماں جایا۔ واقعی قابیل ہابیل کا ماں جایا بھائی تو تھا اور وہاں اس آیت میں دینی بھائی مراد ہے۔ کافر مومن کا دینی بھائی نہیں۔ لہٰذا دونوں آیتیں درست ہیں۔

دوسرا اعتراض: جب قابیل کافر ہو چکا تھا تو اس کا نکاح لیوذا لڑکی کے ساتھ بھی شرعاً جائز نہ تھا۔ کیونکہ کافر مرد سے مسلمہ عورت کا نکاح درست نہیں۔ پھر آدم علیہ السلام نے اس پر یہ نکاح کیوں پیش فرمایا۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح پیش فرمانے کے وقت قابیل کافر نہیں ہوا تھا بعد میں ہوا۔ اگر اس کا نکاح لیوذا سے ہوتا تو مومن کا مومنہ سے نکاح ہوتا۔ دوسرے یہ کہ یہ حکم ہمارے اسلام کا ہے کہ کافر کا نکاح مومنہ سے درست نہیں، ان دینوں میں درست تھا بلکہ شروع اسلام میں بھی ایسے نکاح ہوئے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی دو صاحبزادیوں کے نکاح ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے ہوئے تھے بعد میں انہوں نے طلاقیں دے دی تھیں پھر یہ حکم منسوخ ہوا۔

تیسرا اعتراض: مردہ کو دفن کرنا جانوروں کا کام ہے۔ مردہ انسان کو جلانا یا پانی میں بہانا چاہیے۔ خود قرآن کہہ رہا ہے کہ کوے نے کوے کو دفن کیا (ہندو)۔ **جواب:** اس قسم کے اعتراضوں کے جوابات ہم نے اپنی کتاب ''اسرار الاحکام'' میں دیئے ہیں۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ انسان کو دفن کرنا عقل وفطرت کے عین موافق ہے۔ جلانا یا پانی میں بہنا خلاف عقل بھی۔ خلاف فطرت بھی۔ انسان کی پیدائش مٹی سے ہے تو چاہیے کہ مٹی، مٹی میں ملا دی جاوے۔ آگ و پانی انسان کی اصل نہیں، اس میں کیوں جلایا یا بہایا جاوے۔ نیز دفن کرنے میں میت کی پردہ پوشی ہے۔ کسی کو پتہ نہیں لگتا کہ قبر میں میت کا کیا حال ہوا۔ جلانے اور بہانے میں اس کی ایسی پردہ دری ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اسلام میں میت کو ڈبونا سخت مجبوری کی حالت میں ہے۔ کہ کوئی سمندری جہاز میں زمین سے بہت دور فوت ہو جاوے۔ تب اس کی تجہیز وتکفین ونماز جنازہ کر کے اس میں وزن باندھ کر سمندر کی تہ میں پہنچا دیا جاوے۔ مگر یہ مجبوری سے ہے۔

چوتھا اعتراض: پھر تو انسان کوے کا شاگرد ہوا اور کوے کا درجہ انسان سے زیادہ ہوا (آریہ)۔ **جواب:** شاگردی موقوف ہے سیکھنے اور سکھانے پر یہاں یہ نہ تھا۔ کسی کو کچھ کرتے ہوئے دیکھ کر کچھ سمجھ لینا شاگردی نہیں یہ تو رب تعالیٰ کی طرف

وہ دوزخ میں نہیں بلکہ دوزخ سے دور ایک جھیرے میں ہیں۔ دیکھو محبت نبی اور عداوت نبی کے کفروں میں فرق ہے۔ عداوت خلیل کی وجہ سے گرگٹ کا مارنا ثواب ہوا اور محبت خلیل کی بناء پر ہدہد پانی کا بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خاص خادم بنا دیا گیا۔ اس کا گوشت حلال نہ کیا گیا تا کہ لوگ اس کا شکار نہ کریں۔ محبت کی وجہ سے احد پہاڑ زیارت گاہ خاص و عام بن گیا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ
اس وجہ سے لکھا ہم نے اوپر بنی اسرائیل کے
اس سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا
اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ
کہ بے شک وہ شخص جو قتل کر دے کسی جان کو بغیر بدلے جان کے یا فساد کے
کہ جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کیے
فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ
زمین میں پس گویا قتل کر دیا اس نے لوگوں کو تمام
تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا
وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ
اور جس نے زندہ رکھا اس جان کو پس گویا زندہ رکھا تمام لوگوں کو
اور جس نے ایک جان کو جلایا اس نے سب لوگوں کو جلایا
وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ٘ ثُمَّ اِنَّ
اور البتہ تحقیق آئے ان کے پاس رسول ہمارے ساتھ روشن دلیلوں کے پھر بے شک
اور بے شک ان کے پاس ہمارے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ آئے پھر بے شک
كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾
بہت سے ان میں پیچھے اس کے بیچ زمین کے زیادتی کرنے والے ہیں
ان میں بہت اس کے بعد زمین میں زیادتی کرنے والے ہیں

سے یا گلا گھونٹ کر کسی اور ذریعہ سے۔ بلکہ قتل کرنا، قتل کرانا، قاتل ظالم کی مدد پر قتل کرنا حتی کہ بعد قتل اس ظالم کو صاف بچالینا بھی سخت جرم ہے کہ یہ بھی قتل نفس کے متعلقات سے ہے **نَفْسًا** سے مراد انسانی جان ہے۔ جانور وغیرہ تو شکار بھی کیے جاتے ہیں، ذبح بھی مگر ظلماً جانور کو مارنا بھی گناہ ہے جیسے گائے، بھینس، بکری کو بھوکے پیاسے ماردینا حرام ہے۔ بنی اسرائیل کی وہ بڑھیا دوزخ میں گئی جس نے بلی کو باندھ کر ماردیا نہ اسے کھانے کو دیا نہ کھولا حتی کہ وہ بھوکی پیاسی مرگئی۔ اور اس رنڈی کی نجات ہوگئی جس نے پیاس سے مرتے ہوئے کتے کو پانی پلادیا جس سے اس کی جان بچ گئی۔ **بِغَیْرِ نَفْسٍ** سے مراد ہے بغیر قتل نفس **فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ** سے مراد قتل کے علاوہ وہ جرم ہیں جس سے مجرم قتل کا مستحق ہوجاوے۔ جیسے ڈکیتی بغاوت، زنا وغیرہ۔ یعنی جو شخص بھی کسی انسان کو بغیر جان کی عوض (قصاص) اور بغیر قصور و جرم کے قتل کردے۔ خیال رہے کہ آٹھ جرموں کی سزا قتل ہے۔ قتل عمد، زنا، ڈکیتی، بغاوت، خروج، کافر حربی ہونا، مرتد ہونا، بلاقصور کسی پر جان لینے کی نیت سے حملہ آور ہونا اور اس شخص کا بغیر قتل کسی طرح اپنے کو نہ بچا سکنا ان سب صورتوں میں مجرم کا قتل جائز ہے۔ مگر قصاص، زنا، بغاوت، ڈکیتی خروج ارتداد میں سلطان اسلام کے حکم سے قاضی کے فیصلہ سے قتل کیا جاوے گا۔ آخری دو مجرموں کو بغیر حکم سلطان بھی قتل کیا جاسکتا ہے۔ کافر حربی کو اور حملہ آور کو۔ اس لئے یہاں **بِغَیْرِ نَفْسٍ** اور فساد کی قید لگائی گئی۔ **فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا** یہ عبارت **مَنْ قَتَلَ** کی جزا و خبر ہے۔ اس پورے جملہ کی بہت تفسیریں کی گئی ہیں (۱) ایک شخص کا قتل دنیاوی سزا میں تمام جہان کے قاتلوں کی طرح ہے۔ یعنی دونوں کی سزا قصاص ہے۔ ایک آدمی کے قاتل کو بھی قتل ہی کیا جاوے گا۔ بہت سوں کے قاتل کو بھی قتل ہی کیا جاوے گا (۲) جس قسم کی سزا اخروی ایک کے قاتل کے لئے ہے۔ وہ ہی اخروی سزا بہت کو قتل کرنے والے کے لئے ہے یعنی دوزخ اگرچہ دونوں سزاؤں کی کیفیت میں فرق ہو (۳) جس قسم کے غضب و عتاب کا مستحق ایک کا قاتل ہے اس قسم کے غضب الٰہی کا مستحق بہت سوں کا قاتل ہے (۴) جس نے نبی یا امام عادل یا سلطان اسلام یا عالم دین یا ولی اللہ کو قتل کیا اس نے گویا تمام جہان کو قتل کیا۔ کیونکہ موت العالم موت العالم۔ یہ قول حضرت ابن عباس کا ہے (۵) جس نے ایک بے قصور مسلمان کا قتل جائز سمجھا گویا اس نے جہان بھر کا قتل جائز سمجھا۔ کیونکہ حرام ہونے میں دونوں قتل یکساں ہیں۔ یہ قول قتادہ کا ہے (تفسیر مظہری، خازن وغیرہ) یا ایک مظلوم کو قتل کرنا اور قتل کی ابتداء کرنا تمام جہان کے قتلوں کا ذریعہ ہے۔ کہ پھر لوگ اس کی دیکھا دیکھی اوروں کو قتل کریں گے تو ان سب قتلوں کا عذاب اس پہلے قاتل کو بھی ملے گا کہ قتل کا موجد یہ ہے جیسا کہ تا قیامت قتلوں کے عذاب میں قابیل کا حصہ ہے۔ **وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا** یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ **مَنْ** سے مراد ہر شخص ہے **هَا** کا مرجع بے قصور نفس انسانی ہے۔ کسی کو زندہ کرنے کی بہت صورتیں ہیں (۱) کوئی شخص بھوک یا پیاس سے مر رہا تھا اسے کھلا پلا کر موت سے بچالیا (۲) کوئی شخص ظلماً قتل ہو رہا تھا اسے قاتل ظالم سے چھوڑا لیا (۳) کوئی نابینا کنویں میں گر رہا تھا اسے گرنے سے بچالیا (۴) کوئی شخص خودکشی کر رہا تھا اسے سمجھا بجھا کر اس حرکت سے باز رکھا (۵) کوئی شخص قتل ہونے والی حرکت کرنا چاہتا تھا۔ قتل یا زنا۔ اسے اس حرکت سے باز رکھا جس سے اس کی جان بچ گئی (۶) کسی بچی کو ظالم ماں زندہ دفن کرنا

شریف سے نقل فرمائے اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ الخ (مائدہ:۴۵) کبھی صرف بنی اسرائیل کی سرکشی بیان فرمانے کے لئے نقل فرمائے جاتے ہیں۔ ہمارے لئے قابل عمل نہیں لَا تَعْدُوْا فِی السَّبْتِ (النساء:۱۵۴) ہفتہ کے دن شکار نہ کرو اور اس کی مخالفت پر عذاب آ جانے کا ذکر ۔ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ (بقرہ:۶۵) کبھی یہ دونوں مقصود ہوتے ہیں۔ ہم سے عمل کرانا، اسرائیلیوں کی سرکشی کا ذکر فرمانا۔ یہاں اس تیسرے مقصد کے لئے قتل کے اس قانون کا تذکرہ توریت شریف سے نقل فرمایا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے ظلماً قتل کے موجد یعنی ظالم سفاک قاتل قابیل کا حال معلوم فرمالیا اور لوگوں سے بیان بھی فرمادیا۔ اس کا انجام آپ کے سامنے ہے۔ قابیل کے ان واقعات کے مدنظر ہم نے تمام لوگوں پر خصوصاً بنی اسرائیل پر جو اپنے اولاد انبیاء ہونے پر فخر کرتے ہیں اور جرموں پر دلیر ہیں یہ لکھ دیا تھا کہ جو شخص کسی نفس انسانی کو بلاوجہ قتل کرے کہ نہ تو اس نے کسی کو قتل کیا ہو نہ زمین میں ڈکیتی، زنا، بغاوت وغیرہ سے فساد پھیلایا ہو پھر بھی اسے قتل کر دیا تو اس پر ایسا گناہ ہے جیسے کوئی تمام لوگوں کو قتل کر دے کہ ان دونوں قاتلوں کی دنیاوی سزا قصاص ہے، اخروی سزا عذاب نار قہر قہار اور جس نے کسی مرتے ہوئے کو بچالیا کہ ظلماً قتل ہو رہا تھا اسے قاتل سے چھڑا لیا، بھوک پیاس سے مر رہا تھا بچالیا، آفت ناگہانی سے قریب موت تھا کہ بچالیا اسے ایسا ثواب ملے گا جیسے کہ سارے انسانوں کو موت سے بچائے۔ کیونکہ ایک پر مہربانی اور تمام پر مہربانی ایک ہی قسم کی نیکی ہے۔ اس کا ثواب بھی ایک ہی قسم کا ہے۔ پھر بنی اسرائیل کے پاس بہت نبی تشریف لائے، معجزات دکھائے، احکام الٰہی سنائے۔ انہوں نے بھی ان سے یہ ہی فرمایا کہ ظلماً قتل سخت جرم ہے۔ ان تمام کے باوجود پھر بھی بہت سے اسرائیلی زمین میں فساد پھیلاتے رہے اور پھیلا رہے ہیں کہ نبیوں کو قتل کیا۔ بنی اسرائیل نے آپس میں سخت خونریزی کی، انہوں نے آپ کو زہر دیا، انہوں نے آپ پر جادو کیا، انہوں نے مسلمانوں کے خلاف تمام مشرکین عرب کو جمع کر کے غزوۂ احزاب والا واقعہ پیش کیا۔ غرض کہ ہمیشہ سے ان کے ہاتھ حضرات انبیاء کرام کے خون سے رنگین ہیں، ان کے دامنوں پر ہزار ہا قسم کے فسادات کے دھبے ہیں ایسی سرکش قوم کی مخالفت سے آپ ملول نہ ہوں۔ یہ تو عادی مجرم ہیں۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ظلماً قتل بہت سے گناہوں کا باعث ہے۔ اس قتل کی وجہ سے قابیل نبی زادہ ہونے کے باوجود ہلاک ہوا۔ اور بنی اسرائیل اولاد انبیاء ہونے کے باوجود تباہ ہوئے۔ حسد، کینہ، قتل ہزار ہا جرموں کی جڑ ہے۔ یہ فائدہ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ سے حاصل ہوا۔

دوسرا فائدہ: گناہ ایجاد کرنا زبردست گناہ ہے کہ آئندہ تمام گناہ گاروں کی سزا میں اس موجد کا حصہ ہوگا اور نیکی ایجاد کرنا زبردست نیکی ہے کہ آئندہ تمام نیک کاروں کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہوگا۔ موجد قتل تمام قتلوں کا ذمہ دار ہے۔ پہلی جان بچانے والا تمام جان والوں کے ثواب میں حصہ دار ہے۔ جیسا کہ اس آیت کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا۔ اس میں بدعت حسنہ و بدعت سیہ کی ایجاد کی طرف اشارہ بھی ہے۔ موجد خیر کو تا قیامت خیر کرنے والوں کا ثواب ملتا رہتا ہے۔ اور موجد شر کو تا قیامت شرارتیوں کے عذاب سے حصہ ملتا رہتا ہے۔ یہ اسلام کا بڑا عام قاعدہ ہے۔ **تیسرا فائدہ:** جو سزا ایک قتل کی ہے

تا قیامت باقی ہے۔ مصرع

جو کیلی سے لاگا اس کا بال نہ بیکا ہو

جو حضور سے وابستہ ہوا وہ فنا نہیں ہوتا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: ظالم قاتل سے قصاص لینے کا حکم دین موسوی سے پہلے تھا یا نہیں۔ اگر نہیں تھا تو ان دینوں میں عالم کا انتظام کیونکر قائم تھا۔ اور اگر تھا تو یہاں صرف بنی اسرائیل کا ذکر کیوں ہوا۔ کہ فرمایا گیا **كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الخ۔** **جواب:** قصاص کا حکم تمام دینوں میں رہا۔ یہاں ظلماً قتل کی سختی کا ذکر ہے۔ یہ بنی اسرائیل کے لئے ہوئی یعنی ان سے کہا گیا کہ ایک نفس کا قاتل تمام انسانوں کے قاتل کی طرح مجرم ہے یہ سختی پہلے دینوں میں مذکور نہ تھی (تفسیر خازن)

دوسرا اعتراض: اگر بنی اسرائیل سے پہلے بھی قصاص کا حکم تھا تو آدم علیہ السلام نے قابیل سے قصاص کیوں نہ لیا؟ **جواب:** یا اس لئے کہ آپ کو اس قتل کا شرعی ثبوت نہ ملا۔ آج بھی قاتل پھانسی سے بچ جاتے ہیں ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے یا اس لئے کہ قابیل وہاں سے بھاگ گیا حضرت آدم علیہ السلام کے قبضہ میں نہ رہا۔ آج قاتل اگر دوسرے ملک دوسری حکومت میں بھاگ جاوے جہاں اس بادشاہ کی دسترس نہ ہو تو اسے پھانسی کیسے دی جائے یا اس لئے کہ اس وقت آدم علیہ السلام کو قصاص لینے پر قدرت نہ تھی۔ قصاص کے لئے حکم سلطان ضروری ہے اور سلطان کے لئے حکومت، غلبہ، قدرت لازم۔

تیسرا اعتراض: بنی اسرائیل سے پہلے قتل پر وہ سختیاں کیوں نہ ہوئیں جو ان پر ہوئیں۔ جب قصاص دائمی حکم تھا تو چاہیے تھا کہ یہ سختیاں بھی دائمی ہوتیں **كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ** کیوں ارشاد ہوا؟ **جواب:** اس اعتراض کے چند جوابات ابھی تفسیر میں عرض کیے گئے۔ کہ بنی اسرائیل بہت ظالم قاتل خونخوار قوم تھی۔ ان سے پہلے لوگ قتل پر اتنے دلیر نہ تھے جتنے دلیر یہ بنی اسرائیل تھے۔ قاتلین انبیاء یہ ہی بنی اسرائیل ہیں۔ عادی مجرم کی سزا سخت ہوتی ہے۔

چوتھا اعتراض: اس آیت میں ارشاد ہوا کہ ایک آدمی کا قتل تمام انسانوں کے قتل کی طرح ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہر قتل علیحدہ جرم ہے۔ تو ایک کے قاتل نے ایک جرم کیا، سو کے قاتل نے سو جرم کیے پھر یہ دونوں برابر کیسے؟ **جواب:** اس اعتراض کے چند جوابات ابھی تفسیر میں گزر گئے کہ قتل کی سزا قصاص ہے۔ ایک قتل کی سزا بھی یہ ہی ہے۔ لاکھ قتل کی سزا بھی یہ ہی قصاص۔ کیونکہ قصاص انتہائی سزا ہے۔ جس کے اوپر کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ ایک بار زنا کی سزا بھی رجم ہے اور سو بار زنا کی سزا بھی وہ ہی رجم۔ اور اگر اخروی سزا مراد ہے تو تشبیہ صرف نوعیت میں ہے کیفیت میں نہیں۔ یعنی ایک جان لینے والے قاتل کو لاکھوں جان لینے والے قاتل کی سی سزا ملے گی۔ جیسے ایک قسم کے کفر اور لاکھوں قسم کے کفر کی سزا یکساں ہے۔ ایک شخص قرآن کریم کی صرف ایک آیت کا انکار کر کے کافر ہوا دوسرا آدمی سارے قرآن کا انکار کر کے کافر ہوا تیسرا آدمی انبیاء کی نبوت بلکہ خداوند تعالیٰ کی ہستی کا انکار کر کے کافر ہو۔ یہ سب ہی کافر ہیں۔ سزا کفر میں سب برابر ہیں اگرچہ کیفیت عذاب میں مختلف

آتے ہیں اس لئے ارشاد ہوا بِاٰیٰتِنَا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ماں کے سوا کسی فرعونی دائی کا دودھ نہیں پیا۔ ہمارے حضور نے دائی حلیمہ کا بایاں پستان نہیں پیا یہ ہے ان کی خبر داری۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ

اس کے سوا نہیں کہ بدلہ ان لوگوں کا جو جنگ کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول سے

وہ کہ اللہ اور اس کے رسولوں سے لڑتے

وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْۤا

اور کوشش کرتے زمین میں فساد کی یہ کہ قتل کیے جاویں

اور ملک میں فساد کرتے پھرتے ہیں ان کا بدلہ یہی ہے کہ گن گن کر

اَوْ یُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ

یا سولی دیے جاویں یا کاٹے جاویں ہاتھ ان کے اور پاؤں ان کے

قتل کر دیے جاویں یا ان کے ایک طرف سے ہاتھ اور دوسری طرف سے

مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِؕ ذٰلِكَ

الگ طرفوں سے یا نکال دیے جاویں زمین سے یہ

پاؤں کاٹے جاویں یا زمینوں سے دور کر دیے جاویں

لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ

واسطے ان کے رسوائی ہے دنیا میں اور واسطے ان کے آخرت میں

یہ دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے

عَذَابٌ عَظِیْمٌۙ (۳۳) اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا

عذاب ہے بڑا سوا ان لوگوں کے جو توبہ کر لیں

بڑا عذاب مگر وہ جنہوں نے توبہ کر لی

مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْۚ

پہلے سے اس کے کہ قابو پاؤ تم اوپر ان کے

کریمہ قبیلہ عرینہ کے متعلق نازل ہوئی کہ اس قبیلہ کے کچھ آدمی مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ اسلام ظاہر کر کے مدینہ پاک میں رہنے لگے، کچھ دن بعد بیمار ہو گئے، حضور ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ ہمارے صدقہ کے اونٹوں میں جاؤ، وہاں ان کا دودھ اور ان کا پیشاب پیو شفا پاؤ گے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ صحت یاب ہونے پر حضور کے چرواہوں کو قتل کر دیا اور اونٹ لے کر بھاگ گئے۔ حضور ﷺ نے ان کے پیچھے حضرت یسار رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ ان بدنصیبوں نے حضرت یسار کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انہیں شہید کر دیا۔ پھر یہ سب لوگ بہت جلد ہی گرفتار کر کے بارگاہِ عالی میں پیش کیے گئے۔ حضور ﷺ نے ان کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر آنکھیں پھوڑ کر مقام حرہ کے تپتے میدان میں پھنکوا دیا۔ وہ کئی دن تڑپ تڑپ کر وہاں ہی مرے اور انہیں پانی تک نہ دیا گیا۔ اس موقعہ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ آئندہ ڈاکوؤں کو یہ سزائیں نہ دی جاویں وہ دی جاویں جو اس آیت کریمہ میں مذکور ہیں۔ گویا یہ آیت اس سنت کی ناسخ ہے (تفسیر خازن، کبیر، مظہری وغیرہ)۔

تفسیر

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ۔ اِنَّمَا حصر کے لئے ہے۔ ڈاکوؤں کی سزا صرف ان تین میں منحصر ہے ان کے علاوہ اور کوئی سزا دینا جائز نہیں۔ لہٰذا اب ڈاکوؤں کا مثلہ نہ کیا جاوے گا۔ یعنی ان کے چاروں ہاتھ پاؤں کاٹے نہ جائیں گے۔ آنکھیں پھوڑی نہ جائیں گی۔ لفظ جزا مشترک ہے۔ ثواب کو بھی جزا کہتے ہیں، سزا کو بھی۔ یہاں بمعنی سزا ہے۔ جزاء اسم جنس ہے ایک اور زیادہ سب پر بولا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں تین سزاؤں پر بولا گیا۔ الَّذِیْنَ سے مراد مسلمان یا اہل ذمہ کفار ڈاکو ہیں۔ حربی کفار ڈاکوؤں کا وہ حکم نہیں جو یہاں مذکور ہے۔ یونہی مرتدین ڈاکوؤں کا بھی یہ حکم نہیں۔ یُحَارِبُوْنَ بنا ہے حرب سے جس کے معنی ہیں جنگ مگر مخالفت حکم کو بھی حرب کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم سود خواروں کے متعلق فرماتا ہے: فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ (بقرہ: ۲۷۹) اور فرماتا ہے۔ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ (توبہ: ۱۰۷) یہاں تو بمعنی مخالفت حکم و نافرمانی ہے۔ تب تو مطلب بالکل ظاہر ہے اور ہو سکتا ہے کہ حقیقی معنی میں ہو تو اس کے بعد لفظ اولیاء پوشیدہ ہے۔ لہٰذا آیت پر کوئی اعتراض نہیں۔ فقیر کی اس تفسیر سے بہت اعتراض اٹھ گئے۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ رسول کی نافرمانی کرتے ہیں یا وہ لوگ جو مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں کہ راہ ماری کر کے انہیں ڈراتے دھمکاتے یا لوٹتے یا قتل کرتے ہیں۔ چونکہ مسلمان اللہ رسول کے پیارے ہیں اس لئے ان سے جنگ گویا اللہ رسول سے ہی جنگ ہے اللہ کے بندوں کو ستانا رب کو ایذا دینا ہے۔ حضور کی امت کو پریشان کرنا حضور کو دکھ دینا ہے چنانچہ زمانہ نبوی میں ایک شخص جمعہ کی نماز کو آیا تو پیچھے مگر لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے آنے کی کوشش کرنے لگا تو حضور نے فرمایا بیٹھ جا تو نے اللہ رسول کو ایذا دی ہے اس کے برعکس اللہ کی مخلوق حضور کی امت کو راحت دینا اللہ رسول کو راضی کرنا ہے۔ شعر

کرو مہربانی تم اہل زمین پر خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر

وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا ظاہر یہ ہے کہ یہ عطف تفسیری ہے اور یہ جملہ یُحَارِبُوْنَ الخ کی تفسیر ہے۔ یَسْعَوْنَ بنا ہے سعیٌ سے بمعنی کوشش کرنا۔ اس سے ڈکیتی کی عام کوشش مراد ہے۔ راستہ روکنا، مال لوٹنا، قتل کرنا، مسافروں کو صرف ڈرانا

اَیۡدِیۡهِمۡ وَ اَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ یہ عبارت یُصَلَّبُوۡۤا پر معطوف ہے اس میں ان ڈاکوؤں کی سزا کا ذکر ہے جو مسافروں کا صرف مال لوٹیں کسی کو قتل نہ کریں۔ ان کی سزا یہ ہے کہ ان کا داہنا ہاتھ گٹے کے نیچے سے اور بایاں پاؤں ٹخنے کے نیچے سے کاٹ دیا جاوے۔ بشرطیکہ انہوں نے اتنا مال لوٹا ہو کہ ہر ڈاکو کو چوری کا نصاب مل سکے۔ یعنی دس درہم یعنی پونے تین روپیہ ہر ڈاکو میں حصہ آ سکیں۔ تب ہر ایک کو سزا دی جا سکے گی کیونکہ یہ چور سے زیادہ ظالم ہیں۔ انہوں نے ڈرایا بھی مال بھی چھینا (تفسیر روح المعانی و روح البیان وغیرہ) اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ یہ عبارت تُقَطَّعَ پر معطوف ہے۔ اس میں ان ڈاکوؤں کی سزا کا ذکر ہے جو صرف راستہ روکیں۔ مسافروں کو ڈرائیں۔ قتل یا مال کی لوٹ نہ کریں۔ اس ڈرانے کی سزا ہے زمین سے نکال دینا۔ ہمارے ہاں اس سے مراد جیل میں ڈال دینا اور جب تک کہ عملی طور پر اس کی توبہ ثابت نہ ہو جاوے جیل سے نہ نکالنا۔ کیوں کہ جیل میں ایک قسم کا دیس نکالا ہے۔ عرب جیل کو دیس نکالا کہتے ہیں چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے جو جیل میں تھا۔

خَرَجۡنَا مِنَ الدُّنۡیَا وَ نَحۡنُ مِنۡ اَهۡلِهَا   فَلَسۡنَا مِنَ الۡاَمۡوَاتِ فِیۡهَا وَلَا الۡاَحۡیَآءُ

اِذَا جَآءَ نَا السَّجَانُ یَوۡمًا لِحَاجَةٍ   عَجِبۡنَا وَ قُلۡنَا جَآءَ هٰذَا مِنَ الدُّنۡیَا

(روح المعانی) یعنی ہم دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے نکل چکے ہیں۔ اب ہم جیل میں نہ مردے ہیں نہ زندہ جب کبھی کسی کام کو جیل کے حکام ہمارے پاس آتے ہیں تو ہم تعجب سے کہتے ہیں کہ یہ دنیا سے آئے ہیں بہر حال یہاں دیس نکالے سے مراد جیل میں ڈال دینا ہے۔ امام شافعی کے ہاں وطن سے نکال دینا مراد ہے۔ بعض اماموں کے ہاں انہیں ہر جگہ سے نکالتے رہنا کہیں ٹھہرنے نہ دینا مراد ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں ڈاکوؤں کا فساد بڑھے گا گھٹے گا نہیں۔ وہ جہاں جائیں گے ڈکیتی کریں گے، حکومت کو پریشانی ہی رہے گی۔ لہٰذا مذہب حنفی قوی ہے۔ ذٰلِكَ لَهُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا۔ یہ نیا جملہ ہے ذٰلِكَ مبتدا ہے اور خِزۡیٌ اس کی خبر لَهُمۡ اس خِزۡیٌ کا متعلق مقدم ہے۔ ذٰلِكَ سے اشارہ ان چاروں سزاؤں کی طرف ہے یعنی یہ سزائیں تو ان ڈاکوؤں کی دنیاوی رسوائی ہیں جس سے یہ ذلیل و خوار ہوں اور دوسروں کو عبرت ہو۔ ان سزاؤں سے وہ عذاب آخرت میں نہیں بچیں گے۔ بلکہ وَ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ یہاں آخرت سے مراد قبر قیامت اور بعد قیامت سب ہی ہیں۔ یعنی ان ڈاکوؤں کے لئے بعد موت ہر جگہ اللہ تعالیٰ کا سخت عذاب ہے۔ یہ سزائیں وہاں کا عذاب نہ دفع کریں نہ کم کریں اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡهِمۡ یہ عبارت ساری گزشتہ سزاؤں اور اخروی عذاب سے استثناء ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ڈاکو پکڑے جانے سے پہلے خود بخود سچی توبہ کریں، ڈکیتی چھوڑ دیں اور حاکم کے پاس خود ہی حاضر ہو جائیں گزشتہ پر ندامت آئندہ کے لئے باز رہنے کا عہد کر لیں تو وہ اخروی عذاب سے بھی بچ جاویں گے اور دنیاوی حد شرعی سے بھی۔ اب ان کا حکم یہ ہوگا کہ لوٹے ہوئے مال مالکوں کو واپس کریں۔ اگر کسی کو قتل کیا ہے تو ان پر قصاص ہے کہ مقتول کا ولی چاہے تو انہیں قتل کرا دے چاہے تو ان سے دیت لے یا معاف کر دے۔ یوں ہی اگر ان ڈاکوؤں نے کسی کے اعضا کاٹے ہیں تو بھی وہ حق العبد ہوں گے۔ کہ وہ مقطوع چاہے تو ان کے اعضاء قصاص میں کٹوائے چاہے دیت لے چاہے معاف کر دے۔

قصاص لوٹا ہوا مال واپس کرنا ان پر لازم ہوگا کہ یہ سزا شرعی نہیں بلکہ حق عباد ہے۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ حق خواہ اللہ تعالیٰ کا ہو یا شریعت کا یا بندے کا بہر حال اس کے لئے ضروری ہے کہ مارا ہوا حق ادا کرے۔ جو سزا یا کفارہ ہو وہ اسے پورا کرے۔ ساتھ میں توبہ بھی کرے ورنہ آخرت کی سزا سے بچنا مشکل ہے۔ نمازیں رہ گئی ہیں تو قضا بھی کرے۔ توبہ بھی۔ روزہ توڑا ہے تو قضا و کفارہ بھی کرے، توبہ بھی۔ چوری کی ہے تو ہاتھ بھی کٹیں توبہ بھی کرے۔ زنا میں پکڑا گیا ہے تو رجم بھی ہو توبہ بھی کرے۔ ڈکیتی کی ہے تو یہ سزائیں بھی بھگتے توبہ بھی کرے۔ ہاں اگر زانی چور ڈاکو خود ہی عدالت میں حاضر ہو کر سزا لے لیں تو ان کی یہ حاضری ہی توبہ میں شمار ہے۔ حضرت ماعز کے متعلق حضور نے فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اہل مدینہ پر تقسیم ہو تو سب بخشے جاویں۔ جناب ماعز کی حاضری عدالت اور اقرار زنا کو توبہ قرار دیا۔

حکایت

خلافت حیدری کے مبارک دور میں ایک ڈاکو تھا۔ حارثہ ابن بدر تیمی بصری جس نے بصرہ میں اودھم مچار کھا تھا اسے اللہ نے توبہ کی توفیق دے دی، اس نے کچھ قریشی لوگوں سے کہا کہ میں توبہ کرتا ہوں مجھے حضرت اسد اللہ حیدر کرار علی ابن ابی طالب خلیفۃ المسلمین سے معافی دلوا دو۔ کسی نے ہمت نہ کی وہ ڈاکو سعید ابن قیس ہمدانی کے پاس یہ عرض لے کر حاضر ہوا۔ انہوں نے حارثہ کو کوفہ لے جا کر دربار حیدری کے کسی گوشہ میں چھپا دیا اور خود امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ڈاکوؤں کے احکام پوچھے۔ جناب امیر المؤمنین نے یہ حکم بیان فرمایا کہ جو ڈاکو پکڑنے جانے سے پہلے توبہ کرے اسے معافی ہے سعید نے کہا اگر چہ حارثہ ابن بدر ہی ہو۔ فرمایا اگر چہ وہ ہی ہو۔ سعید بولے حارثہ نکل، پیش ہو جا چنانچہ حارثہ نکل آیا اور سعید نے کہا حضور یہ ہے حارثہ۔ توبہ کر کے حاضر ہوا ہے۔ چنانچہ جناب امیر المؤمنین نے اس کو امان دے دی اور حارثہ بعد میں مخلص دین دار ہو گیا (ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم، تفسیر روح المعانی)۔ یہ ہے اس آیت کریمہ کی تفسیر جناب علی قرآن ناطق ہیں۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اسلام میں جرموں کی سزائیں بہت سخت ہیں۔ کیوں نرم سزاؤں سے جرم نہیں رکتے۔ دیکھو حضور ﷺ رحمۃ اللعالمین ہیں مگر آپ نے عرینہ کے مرتدین ڈاکوؤں کو وہ سخت سزا دی کہ سن کر دل کانپ جاتے ہیں۔ بس اس ایک سزا سے ملک میں امن ہو گیا۔ ورنہ عرب جیسے ملک میں امان قائم ہونا، ناممکن تھا۔ نرم سزاؤں کا انجام آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

دوسرا فائدہ: جیسے حدیث سے قرآن کریم کا نسخ ہو سکتا ہے ایسے ہی قرآن سے حدیث کا نسخ بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھو عرینہ والے ڈاکوؤں کی سزا جو حدیث سے ثابت تھی وہ اس آیت کریمہ سے منسوخ ہو گئی۔ اب ڈاکوؤں کی سزا یہ ہے جو یہاں مذکور ہوئی۔ بیت المقدس کا قبلہ ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے اور اس کا نسخ ہو کر کعبۃ اللہ کا قبلہ ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے۔ یوں ہی آیات قرآنیہ احادیث سے منسوخ ہو سکتی ہیں۔ دیکھو غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی ہونا قرآنی آیات سے ثابت ہے اس کا منسوخ ہونا حدیث سے ثابت ہے۔ اب غیر خدا کو سجدہ تعظیمی حرام ہے۔ اس کی مفصل بحث ہم آیت مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ الخ

حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ رسول سے جنگ کرنے کے معنی ہیں ان کے پیاروں سے جنگ کرنا۔ عرینہ کے ڈاکوؤں نے حضور سے جنگ نہ کی تھی۔ حضرات صحابہ کو دکھ پہنچایا تھا۔ یہ سوال و جواب تفسیر کبیر نے یہاں ہی بیان فرمادیا۔

دوسرا اعتراض: عربی میں لفظ اَوْ اختیار کے موقعہ استعمال ہوتا ہے۔ تو اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ امام و حاکم کو اختیار ہے کہ وہ ڈاکوؤں کو خواہ قتل کرائے خواہ سولی دے خواہ ان کے ہاتھ پاؤں کٹوا دے خواہ انہیں قید کرے پھر تم نے تقسیم کیوں کی کہ ایسے ڈاکو کو قتل کرواور ویسے ڈاکو کو سولی دو (خواجہ حسن بصری و مجاہد وغیرہم) دیکھو قسم کے کفارات میں بھی لفظ اَوْ ارشاد ہوا۔ وہاں اختیار دیا گیا۔ **نوٹ:** حضرت ابن عباس خواجہ حسن بصری، سعید ابن میتب، امام نخعی و مجاہد کا یہی مذہب ہے۔ کہ ہر ڈاکو کے متعلق سلطان اسلام کو اختیار ہے کہ ان چار سزاؤں میں سے جو چاہے سزا دے (تفسیر خازن) **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا۔ کہ جب ایک جرم کی چند سزاؤں کو اَوْ کے ساتھ بیان کیا جاوے تو وہاں اَوْ اختیار دینے کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن اگر چند جرموں کی سزاؤں میں اَوْ ارشاد فرمایا جائے تو وہاں تقسیم کے لئے ہوتا ہے کہ فلاں جرم کی یہ سزا اور فلاں جرم کی یہ سزا۔ اس آیت کریمہ نے چار قسم کے ڈاکوؤں کی چار سزائیں بیان فرمائیں۔ للہذا یہاں تقسیم ہے اور کفارہ قسم میں ایک جرم یعنی قسم توڑنے کی چند سزائیں بیان ہوئیں ہیں للہذا وہاں اختیار ہے (تفسیر احمدی)

تیسرا اعتراض: انسان کو سولی دینا یا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالنا نہایت وحشیانہ سزا ہے۔ اسلام بہت مہذب دین ہے اس میں ایسی وحشیانہ سزائیں نہ ہونا چاہئیں۔ یونہی زانی کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دینا انتہائی درجہ کی بربریت ہے (بعض بے دین)۔ **جواب:** افسوس ہے کہ مسلمانی کے دعویدار اس قسم کے واہیات اعتراض کرتے ہیں۔ آج کافر حکومتیں بھی کہتی ہیں کہ عرب میں اسلامی سزاؤں نے ہی امن قائم کی۔ جواہر لعل نہرو وزیر اعظم بھارت نے کہا تھا کہ انڈیا میں عرب کی سزائیں جاری کرنا چاہئیں۔ ایک بدمعاش کو سخت سزا دے کر قوم کو سنبھال دینا ملک میں امن قائم کر دینا عین انصاف ہے۔ گلا عضو کاٹ دو تا کہ باقی اعضا درست رہیں اسلام کی سخت سزاؤں نے ہی ڈاکوؤں کو رہبر بنایا۔ سر بازار ایک چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاوے تو انشاء اللہ پچاس سال تک ملک میں چوری نہ ہو۔ قوم کو شخص پر قربان نہ کرو شخص کو قوم پر قربان کرو۔

چوتھا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ڈاکو پکڑے جانے سے پہلے توبہ کرلے تو سب کچھ معاف۔ یہ عجب قانون ہے کہ قتل لوٹ غارت کر کے توبہ توبہ کہہ لو تو سب کچھ معاف ہو گیا۔ **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر میں گزر گیا کہ توبہ سے ڈکیتی کی سزا جو حق شرعی ہے وہ معاف ہو گی۔ قتل کا قصاص، لوٹے مال کی واپسی معاف نہ ہو گی۔ جیسا کہ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ فرمانے سے معلوم ہوا۔

پانچواں اعتراض: اس آیت کریمہ میں ڈکیتی کی چوتھی سزا بیان فرمائی گئی نفی من الارض جس کا ترجمہ ہے زمین سے نکال دینا۔ احناف نے اس کے معنی کیے جیل بھیج دینا یہ معنی لغت کے بھی خلاف ہے عقل کے بھی خلاف۔ جیل بھیجنے کو زمین سے نکالنا نہیں کہا جاتا اس کا ترجمہ دیس نکالا یا جلا وطنی ہونا چاہیے (شوافع، مالک وغیرہم) **جواب:** یہاں نفی ارض کے

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف

الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾

وسیلہ اور کوشش کرو اللہ کے راستے میں تاکہ تم کامیاب ہو

وسیلہ ڈھونڈو اور اس کی راہ میں جہاد کرو اس امید پر فلاح کہ پاؤ

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں راہزنوں ڈاکوؤں کا ذکر تھا، ان کی سزا کا تذکرہ تھا اب رہبروں کی جماعت ان کے فیوض و برکات کا ذکر ہے۔ یعنی حضرات اولیاء اللہ جو رب تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ عظمیٰ ہیں رہزنوں کی سزا کے بعد رہبروں کے فیضان کا ذکر ہے۔ تاکہ لوگ ڈاکوؤں سے بچیں اولیاء اللہ کا دامن پکڑیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں ڈاکوؤں کی شرعی سزا کے ساتھ کرم کریمانہ کا ذکر بھی ہوا۔ کہ اگر ڈاکو پکڑے جانے سے پہلے توبہ کرلیں تو اس شرعی سزا سے بچ جائیں گے اب وہ دروازے بتائے جارہے ہیں جہاں توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ ان دکانوں کا ذکر فرمایا جارہا ہے جہاں سے توبہ و تقویٰ کے سودے ملتے ہیں۔ یعنی حضرات اولیاء کے آستانے جو رب رسی کا وسیلہ عظمیٰ ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ رسول سے جنگ کرنے والوں کی سزا کا ذکر ہوا۔ اب تقویٰ کا حکم دیا وہ جنگ فسق تھی۔ تقویٰ اس کا علاج ہے تاکہ لوگ تقویٰ کے ذریعہ فسق سے بچیں اور ساتھ ہی وہ دروازے بتائے گئے جہاں سے تقویٰ نصیب ہوتا ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں ڈکیتی کی سزا کا ذکر تھا جو جرموں کے روکنے کا عارضی علاج ہے۔ اب تقویٰ اور وسیلہ اختیار کرنے کا حکم ہے۔ جو جرموں کا اصل دائمی علاج ہے۔ گویا گناہوں کے سیلاب کے روکنے کے لئے کوچہ بندی کا ذکر پہلے ہوا اور نفس پر تقویٰ وسیلہ کے بند باندھنے کا ذکر اب ہورہا ہے۔ جہاں سے گناہ چلتے ہیں۔ **پانچواں تعلق:** گزشتہ پچھلی آیات میں ان یہود پر عتاب کیا گیا جو بدعقیدہ و بدعمل تھے۔ اس کے باوجود اولاد انبیاء ہونے پر فخر و تکبر کرتے تھے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ مومنو! تم ان بے وقوف یہود کی طرح نہ ہونا۔ تم تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنا اور حضرات انبیاء اولیاء کو وسیلہ بنانا۔ صرف اولاد نبی ہونا مفید نہیں بلکہ متوسل بالنبی ہونا مفید ہے۔

تفسیر

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔ الناس میں خطاب سارے انسانوں سے ہوتا ہے اور **الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** میں کبھی صرف صحابہ کرام سے کبھی سارے انسان مومنین سے کبھی تمام جن وانس مومنوں سے، کبھی سارے ملائکہ جنات انسان مومنوں سے بظاہر یہاں خطاب تمام انسان مومنوں سے ہے اور ہوسکتا ہے کہ تمام مومنین فرشتوں جنات اور انسانوں سے ہو۔ کیونکہ تقویٰ و پرہیزگاری اور خدارسی کے لئے توسل سب ہی کو ضروری ہے۔ اس لئے یہاں عام خطاب ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ نیز الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب میں عموماً حضور ﷺ داخل نہیں ہوتے۔ ان کے خطاب يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ۔ یا یھا الرسول۔ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ۔ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ہیں یہاں بھی خطاب ہم مسلمانوں سے ہے حضور انور سے

(تفسیر روح المعانی و خازن) اصطلاح میں کسی چیز کے ذریعہ کو وسیلہ کہا جاتا ہے۔ یہاں وسیلہ کے تمام معنی بن سکتے ہیں مگر آخری معنی یعنی ذریعہ قوی ہے، وسیلہ عام ہے۔ حضرات اولیاء، انبیاء، نیک اعمال، ان حضرات کے تبرکات سب ہی اس میں شامل ہیں۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہاں اعمال کے علاوہ دوسرے وسیلے مراد ہیں کیونکہ اعمال تو اتَّقُوا اللّٰهَ میں آ گئے تقویٰ کے بعد وسیلہ کی تلاش کا حکم دے کر بتایا گیا کہ کوئی متقی تقویٰ کے کسی درجہ پر پہنچ کر خدارسی کے لئے وسیلے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنے قدم سے اسٹیشن پر پہنچ سکتے ہیں، مکہ معظمہ نہیں پہنچ سکتے وہاں جانے کے لئے کسی خاص سواری کی حاجت ہے۔ یونہی تقویٰ کے قدم سے براہ راست رب تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتے۔ خدارسی کے لئے کسی وسیلہ عظمیٰ کی ضرورت ہے۔ تقویٰ سے وسیلہ تک پہنچو وسیلہ سے رب تک۔ کوئی متقی مسلمان یہ نہ سمجھے کہ میں تو متقی ہو گیا اب مجھے خدارسی کے لئے کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں جیسے ہر مومن اعمال و تقویٰ کا حاجت مند ہے یونہی ہر متقی وسیلہ کا محتاج ہے۔ وَ جَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ یہ چوتھا حکم ہے۔ جو وسیلہ تلاش کرنے کے بعد دیا گیا ہے۔ جَاهِدُوْا بنا ہے مجاہدہ سے جس کا مادہ ہے جھد بمعنی مشقت۔ جہاد کو بھی جہاد اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مشقت ہوتی ہے۔ یہاں یا تو جہاد مراد ہے تو فِیْ سَبِیْلِهٖ کی ضمیر رب تعالیٰ کی طرف لوٹے گی۔ یا تلاش میں محنت و مشقت کرنا مراد ہے اس صورت میں یہ ضمیر یا تو وسیلہ کی طرف ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف یا تقویٰ کی طرف۔ لہٰذا اس عبارت کی چار تفسیریں ہیں۔ یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کرو یا وسیلہ کی راہ میں کوشش کرو یا تقویٰ کی راہ میں یا اللہ کی راہ میں کوشش کرو۔ لہٰذا یہ کلمہ بہت جامع ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اس عبارت کی تفسیر بارہا عرض کی جا چکی ہے۔ لَعَلَّ ہمارے لئے بمعنی امید ہوتا ہے اور رب تعالیٰ کی نسبت سے یقین کے لئے ہے۔ یعنی اس امید سے یہ کام کرو کہ تم کامیاب ہو جاؤ یا اس لئے کہ تم کامیابی حاصل کرو۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو تین چیزوں کا حکم دیا اور ان تین چیزوں کا ایک نتیجہ ارشاد فرمایا۔ تقویٰ، وسیلہ کی تلاش، مجاہدہ کا حکم دیا، فلاح و کامیابی کا وعدہ فرمایا چنانچہ ارشاد ہوا کہ اے وہ لوگو یا اے وہ مخلوق! جو ایمان لا چکے اللہ سے ڈرو کہ اس کی اور اس کے محبوب ﷺ کے حکم کی پیروی کرو اور صرف اپنے تقویٰ پر ہی بھروسہ نہ کرو۔ صرف ایمان تقویٰ رب تک نہیں پہنچا سکتے بلکہ رب تک پہنچنے کے لئے وسیلہ کی تلاش کرو جس کے ذریعے تمہارے ایمان و اعمال بخیریت تمام منزل مقصود تک پہنچیں اور وسیلہ کی تلاش میں کوشش و مشقت کرو تا کہ تم دین و دنیا میں کامیاب رہو۔ خیال رہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہم سے شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور ہر جگہ ہے مگر ہر جگہ ملتا نہیں۔ اس کے ملنے کے مقامات خاص ہیں ان مقامات پر جانا رب کی تلاش کے لئے ضروری ہے۔ جیسے ریل گزرتی ساری لائن سے ہے مگر ملتی ہے اسٹیشن پر۔ یونہی پاور بجلی کے سارے تار میں ہوتا ہے مگر روشنی ملتی ہے بلب سے۔ اس لئے وسیلہ کی تلاش کا حکم دیا پھر وسیلہ کے پاس تم جاؤ۔ تمہارے پاس وسیلہ نہیں آئے گا۔ موسیٰ علیہ السلام گئے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس خود خضر علیہ السلام نہیں آئے تھے۔ قانون قدرت ہے وسیلہ کے پاس جانا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ایمان کا ذکر فرمایا پھر تقویٰ کا

کیا تھا؟ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ (بقرہ: ۲۴۸) اس صندوق میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کا چین وسکون ہے اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں۔ اس میں وفات یافتہ بزرگوں کے تبرکات سے وسیلہ پکڑنے کا حکم ہے۔ فرمایا ہے: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ (انفال: ۳۳) اے محبوب! ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ہم ان پر عذاب نہیں بھیجیں گے اور فرماتا ہے: لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (فتح: ۲۵) اگر مکہ سے یہ مسلمان نکل جاتے تو ہم کفار مکہ کو عذاب دے دیتے اور فرماتا ہے: يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ (اسراء: ۵۷) یہ لوگ خود اس کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں جو ان میں سے اللہ سے زیادہ قرب والا ہو۔ اس قسم کی بائیس آیات وسیلہ کی ہیں۔ حضرت کبشہ نے اپنے مشکیزہ کا منہ کاٹ کر رکھ لیا تھا جس سے منہ لگا کر حضور نے پانی پیا تھا۔ مدینہ کے بیماروں کو یہ چمڑا کا ٹکڑا دھو کر پلاتی تھیں، انہیں شفا ہوتی تھی۔ حضرت امیر معاویہ نے اپنے وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ میرے پاس حضور ﷺ کے بال و ناخن شریف ہیں وہ میرے کفن میں میری آنکھوں اور میرے منہ پر رکھ دیئے جاویں تاکہ قبر کی مشکل آسان ہو۔ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ سے لوگوں نے بارش نہ ہونے کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا۔ کہ میرے حجرے کی چھت کھول دو جس میں حضور ﷺ کی قبر انور ہے۔ چھت کھولنا تھی کہ خوب بارش ہوئی۔ اس قسم کی صدہا احادیث ہیں۔ جن میں حضور کے تبرکات سے توسل ثابت ہے۔ قیامت میں وسیلہ کی تلاش پہلے ہوگی، وہاں کا کاروبار حساب و کتاب بعد میں شروع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ غنی ہے، ہم فقیر و محتاج۔ جب رب تعالیٰ غنی ہو کر بغیر وسیلہ ہم کو کوئی دنیاوی اور دینی نعمت نہیں دیتا۔ تو ہم محتاج ہو کر وسیلہ سے بے نیاز کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس نے ہم کو ہستی دی تو ماں باپ کے ذریعہ، علم دیا استاذ کے ذریعہ، مال دیا مال داروں کے وسیلہ سے، شفا دی حکیم کے وسیلہ سے، موت دی تو ملک الموت کے وسیلہ سے، ہم کو ایمان، قرآن، رحمت رحمان ملی تو حضور ﷺ کے وسیلہ سے، بزرگوں کا وسیلہ وہ نعمت ہے جس کا فیض جانوروں بلکہ زمین و زمان کو حاصل ہوتا ہے۔ اصحاب کہف کا کتا ان بزرگوں کے وسیلہ سے عظمت والا ہوا۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ کی سرزمین حضور ﷺ کے وسیلہ سے عظمت والی ہوئی۔ حتی کہ رب تعالیٰ نے شہر مکہ کی قسم فرمائی اس لئے کہ وہاں حضور جلوہ گر تھے لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ (بلد: ۲) بہر حال بزرگوں کا وسیلہ ایسا اہم مسئلہ ہے جس پر عقل و نقل قرآن و احادیث شاہد ہیں۔ مخالفین کے پاس ایک آیت ایک حدیث ایسی نہیں جس کا ترجمہ ہو کہ بزرگوں کا وسیلہ نہ پکڑو۔ صرف عقلی ڈھکوسلے ہیں۔ جن سے وہ آیات و احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ یہاں تفسیر صاوی شریف میں ہے کہ وہ لوگ گمراہ اور بدنصیب ہیں جو مسلمانوں کو اولیاء اللہ کی زیارت کی وجہ سے کافر و مشرک کہتے ہیں اور زیارت اولیاء کو عبادت غیر اللہ قرار دیتے ہیں یہ مردود ہیں یہ زیارت اولیاء اللہ ابتغاء وسیلہ ہے۔ اس آیت کے ماتحت (تفسیر صاوی)۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** مسلمانوں کو نیک اعمال کے ساتھ کوئی اور وسیلہ بھی ڈھونڈنا ضروری ہے صرف نیک اعمال پر ہی قناعت نہ کرے۔ یہ فائدہ

کے انکاری ہیں، زندہ بزرگوں کے وسیلہ کے قائل ہیں۔

پہلا اعتراض: بندوں کا وسیلہ کوئی چیز نہیں صرف اپنے اعمال کا وسیلہ چاہیے یہاں اس آیت میں وسیلہ سے مراد نیک اعمال کا وسیلہ ہے (عام دیوبندی) **جواب:** یہ غلط ہے اعمال کے ساتھ بزرگوں کا وسیلہ بھی ضروری ہے سارے نیک اعمال تو اتَّقُوا اللّٰهَ میں آ چکے پھر وسیلہ کا حکم ہوا۔ معطوف اور معطوف علیہ میں فرق ضروری ہے۔ اس لئے یہاں بزرگوں کا وسیلہ ضرور مراد ہے نیز فرماؤ کہ نیک اعمال کہاں سے حاصل کرو گے وہ بھی حضور ﷺ بلکہ علماء و صلحاء اولیاء اللہ کے ذریعہ سے ہی حاصل ہوں گے پھر وسیلہ مقبولین ضروری ہوا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ فجر کی نماز نیکی ہے اور سورج نکلتے وقت کی نماز گناہ کیسے معلوم ہوا کہ بکری اور گائے کھانا نیکی ہے کتا بلی کھانا گناہ غرضکہ تم اعمال کے محتاج اور اعمال حضور کے حاجت مند۔ حضور ﷺ بارگاہِ الٰہی میں یقیناً مقبول ہیں اور ہمارے اعمال بالکل مشکوک نہ معلوم کہ مقبول ہیں یا مردود۔ تعجب ہے کہ ہمارے مشکوک اعمال تو خدا رسی کا وسیلہ ہو جائیں اور یقیناً مقبول یعنی حضور ﷺ اور ان کے وارثین علماء اولیاء وسیلہ نہ بنیں اللہ تعالیٰ سمجھ دے۔

دوسرا اعتراض: اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے وہ بغیر وسیلہ ہر چیز ہم کو دے سکتا ہے وسیلہ ماننا خدا تعالیٰ کو مجبور ماننا ہے لہٰذا وسیلہ اولیاء شرک ہے (عام دیوبندی) **جواب:** وہ تو قادر ہے مگر ہم مجبور ہیں ہم بغیر وسیلہ اس سے نہیں لے سکتے آگ گرم کر سکتی ہے مگر روٹی بغیر وسیلہ اس سے گرم نہیں ہو سکتی لہٰذا اور میاں میں وسیلہ ضروری ہے۔ حضرت صاحب تم بغیر ماں باپ کے پیدا کیوں نہیں ہو جاتے آپ کی تشریف آوری کے وقت دائی پہلے آتی ہے اور مولوی صاحب پیچھے براجمان ہوتے ہیں وسیلہ کے انکاریوں کو چاہیے کہ دائی کے بغیر وسیلہ پیدا ہو جایا کریں اور مسلمانوں کی مدد کے بغیر کفن دفن لے لیا کریں۔

تیسرا اعتراض: اگر ہم کو حضور کے وسیلہ کی ضرورت ہے تو نبی کریم کو بھی ہمارے وسیلہ کی ضرورت ہے۔ نبی کریم نے حضرت عمر سے فرمایا تھا کہ اے میرے بھائی! مکہ معظمہ پہنچ کر میرے لئے بھی دعا کرنا۔ ہم کو حکم ہے درود شریف پڑھو درود شریف کیا ہے حضور کے لئے رحمت کی دعا ہم کو حکم ہے کہ اذان کے بعد حضور کے لئے وسیلہ ملنے کی دعا کریں۔ اگر حضور ہم سے بے نیاز ہیں تو ہم دعائیں کیوں کرتے ہیں؟ **نوٹ:** یہ اعتراض تفسیر روح المعانی نے بھی خاص انداز میں کیا ہے وہ بھی وسیلہ کے سخت منکر ہیں۔ ابن تیمیہ ملحد کے پیروکار ہیں۔ **جواب:** حضور ﷺ ہماری ان دعاؤں کے ہرگز حاجت مند نہیں ہم دعائیں کریں یا نہ کریں حضور پر رحمتوں کی بارش ہر وقت ہو رہی ہے ہماری یہ دعائیں تو صرف مانگنے کھانے کا بہانہ ہیں جیسے بھکاری داتا کے دروازے پر اس کی جان و مال بال بچوں کو دعائیں دے کر بھیک لیتا ہے۔ اس لئے رب تعالیٰ نے ہم کو درود شریف کا حکم دینے سے پہلے فرما دیا اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ (احزاب: ۵۶) یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے تو درود بھیجتے ہی ہیں تم دعائیں کرو یا نہ کرو پھر فرمایا کہ تم ان کے لئے دعائیں کرو تا کہ جو رحمت کی بارش ان پر ہو رہی ہے اس کا چھینٹا تم پر بھی مار دیا جاوے یہ دعائیں مانگنے کھانے کا بہانہ ہیں۔ جیسے رب تعالیٰ کی الوہیت رزاقیت سمع بصر ہماری عبادت ہماری مرزوقیت پر موقوف نہیں سورج کی نورانیت ہمارے نور لینے پر موقوف نہیں یوں ہی حضور کی نبوت حضور کے

نہیں فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کا منشاء یہ ہے کہ مولیٰ ہم صرف نبی ﷺ کا وسیلہ ہی نہیں پکڑتے بلکہ ان کے عزیزوں، قریبوں، ان سے نسبت رکھنے والوں کا بھی وسیلہ اختیار کرتے ہیں اس میں وسیلہ کو عام کرنا مقصود ہے کہ وسیلہ اولیاء اللہ کا بھی ہوسکتا ہے اس لئے آپ نے بِعَمِّ نَبِیِّکَ کہا بالعباس نہ کہا ورنہ حضرات صحابہ نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فرمان پر حضور انور کی قبر شریف کے وسیلہ سے رب سے بارش مانگی جیسا کہ ہم ابھی تفسیر میں عرض کر چکے۔

ساتواں اعتراض: جیسے ہم کو حضور کے توسل کی ضرورت ہے یوں ہی حضور کو ہمارے وسیلہ کی حاجت ہے۔ حضور کا دین، حضور کا قرآن، حضور کے احکام ہماری کوششوں کے وسیلہ سے دنیا میں شائع ہوتے ہیں۔ ہماری عبادات سے حضور کو ثواب ملتا ہے۔ ہم لوگ حضور کی رعایا اور فوج ہیں بادشاہ کو رعایا کی بھی ضرورت ہے فوج کی بھی۔ **جواب:** اس کا جواب الزامی تو یہ ہے کہ پھر خدا تعالیٰ کو بھی مخلوق کا وسیلہ کا محتاج مانو کہ اس کا دین اس کا قرآن اس کی عبادات بندوں ہی کے ذریعہ سے دنیا میں پھیل رہی ہیں۔ جواب **تحقیقی** یہ ہے کہ وسیلہ وہ ہوتا ہے جس کے نہ ہونے سے چیز بھی نہ ہو یعنی موقوف علیہ حضور کا دین ثواب درجات ہم پر موقوف نہیں ہم حضور کے حاجت مند ہیں حضور ہم سے غنی ہم سے یہ خدمات لینا ہماری عزت افزائی کے لئے ہے۔ چپڑاسی بادشاہ کا حاجت مند ہے بادشاہ چپڑاسی کا محتاج نہیں حضور کی خدمت کے لئے جنات فرشتے بلکہ خاک پانی ہوا سب حاضر ہیں۔

آٹھواں اعتراض: رب تعالیٰ فرماتا ہے سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ ؕ لَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَہُمۡ ؕ (منافقون: ٦) ان منافقوں کے لئے دعا مغفرت کریں یا نہ کریں ہم تو انہیں ہرگز نہیں بخشیں گے۔ بولو کہاں گیا وسیلہ؟ حضور کی دعا سے بھی بخشش نہیں۔ **جواب:** اس بخشش نہ ہونے کی وجہ یہ ہی تھی کہ منافقین حضور کے وسیلہ کے انکاری تھے سیدھے براہ راست رب تک پہنچنا چاہتے تھے چنانچہ تمہاری پیش کردہ پوری آیت یہ ہے وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا یَسۡتَغۡفِرۡ لَکُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ لَوَّوۡا رُءُوۡسَہُمۡ وَ رَاَیۡتَہُمۡ یَصُدُّوۡنَ وَ ہُمۡ مُّسۡتَکۡبِرُوۡنَ ۝ سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ الخ (منافقون: ٥-٦) یعنی جب منافقون سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول اللہ تمہارے لئے دعا کریں تو اپنا سر پھیر لیتے ہیں اور غرور کرتے ہوئے آپ کے پاس نہیں آتے۔ ان مردودوں بے وسیلوں کے لئے آپ اپنے کرم کریمانہ سے دعا دے بھی دو ہم تب بھی انہیں بخشیں گے کیونکہ وہ وسیلہ کے انکاری ہیں۔ مؤمنوں کے متعلق حضور انور سے فرماتا ہے وَ صَلِّ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمۡ ؕ (توبہ: ١٠٣) اے محبوب! آپ ان کے لئے دعا فرماؤ آپ کی دعا ان کے دلوں کا چین ہے یہ ہیں وسیلہ والے لوگ۔

ضروری نوٹ: حضور ﷺ سے توسل کی تین صورتیں ہیں۔ توسل جنانی، توسل لسانی، توسل عملی، توسل جنانی یہ ہے کہ دل میں عقیدہ رکھے کہ اللہ کی ہر رحمت حضور کے توسل سے ملے گی۔

بہ خدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مفر مقر جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

حضور اللہ کی رحمتوں کا دروازہ ہیں ... دوسرے یہ کہ ... بارگاہ الٰہی میں حضور کے وسیلہ سے دعا کرے اِلٰھِیۡ بِجَاہِ نَبِیِّکَ

اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ اب رہا یہ سوال کہ خدا رسی کا وسیلہ کہاں ڈھونڈو اس کے متعلق صوفیاء فرماتے ہیں کہ ہر چیز اس کے دروازے سے ڈھونڈھی جاتی ہے بادشاہ سے ملنا ہو تو اس کے دروازے اس کی گلی اس کے دفتر اس کی مسجد میں جاؤ جہاں وہ نماز کے لئے آتا ہے۔ ریل کی تلاش ہے تو اسٹیشن پر آؤ جہاں وہ ٹھہرتی ہے یوں ہی رب تعالیٰ سے ملنا ہو تو حضور کے دروازے پر آؤ حضور کی محبت چاہیے تو حضرات اولیاء و علماء کے آستانوں پر حاضری دو اللہ نصیب کرے۔ ریل گزرتی ہے تمام لائن سے مگر ملتی ہے اسٹیشن پر اللہ کی رحمت ہے ہر جگہ مگر ملتی ہے رحمت کے اسٹیشن پر پاور سارے تاریں ہے مگر روشنی وہاں ہی ملے گی جہاں بلب ہو گا۔ ان حضرات کے آستانہ رنگ برنگے بلب ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ۔ غرضکہ جیسے دنیاوی نعمتیں اپنی اپنی منڈیوں میں ملتی ہیں یونہی روحانی نعمتیں بھی منڈیوں میں ملتی ہیں خدا رسی کا وسیلہ اس کی منڈی ہے حضور کے عاشقوں کے سینے میں۔ رب فرماتا ہے: لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ (بلد: ۲) مجھے اس شہر کی قسم ہے جس میں تم تشریف فرما ہو وہ شہر کون سا ہے وہ شہر ان کے چاہنے والوں کے سینے ہی تو ہیں ان کے آستانوں پر جاؤ مگر خالی ہاتھ نہ جاؤ بلکہ عقیدت و محبت کی نقدی لے کر جاؤ ان شاء اللہ سودے لے کر آؤ گے یار کے ملنے کے یہ ہی بازار ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا
بے شک وہ جو کافر ہوئے اگر تحقیق ان کا ہو وہ جو زمین میں ہے سارے کا سارا
بیشک وہ جو کافر ہوئے جو کچھ زمین میں ہے سب اس کی برابر اور اگر ان کی
وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا
اور اس کی مثل ساتھ اس کے تاکہ فدیہ دیں اس کا عذاب سے قیامت کے دن کے تو نہ
ملک ہو کہ اسے دے کر قیامت کے عذاب سے اپنی جان چھوڑائیں تو
تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝٣٦ يُرِيْدُوْنَ
قبول کیا جاوے ان سے اور واسطے ان کے عذاب دردناک ارادہ کریں گے
ان سے نہ لیا جاوے گا اور ان کے لئے دکھ کا عذاب ہے دوزخ
اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ؗ
یہ کہ نکل جاویں آگ سے اور وہ نہ ہوں گے نکلنے والے اس سے
سے نکلنا چاہیں اور وہ اس سے نہ نکلیں گے
وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ

ہے یہ ہمیشہ فعل پر داخل ہوتا ہے اس لئے یہاں ثبت فعل پوشیدہ ہے اور اَنَّ لَهُمْ پورا جملہ اس ثبت کا فاعل ہے لَهُمْ اَنَّ کی خبر مقدم ہے اور مَّا فِی الْاَرْضِ الخ اس کا اسم مؤخر۔ لو کی جزا آگے آ رہی ہے مَا تُقُبِّلَ الخ لَهُمْ کا مرجع الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ہے لام ملکیت یا قبضہ کا ہے۔ ھم سے مراد ہر فرد کافر ہے نہ کہ پوری جماعت کفار۔ مَا سے مراد ہر قسم کا مال ہے۔ سونا چاندی وغیرہ بلکہ موتی، مونگے وغیرہ بھی داخل ہو سکتے ہیں کیونکہ سمندر کی چیزیں بھی زمینی چیزیں ہی ہیں کہ سمندر زمین پر ہے جَمِيْعًا مَا کی تاکید معنوی ہے وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ اس عبارت میں واؤ عاطفہ ہے اور مثلہ معطوف ہے مَّا فِی الْاَرْضِ پر اَنَّ کا اسم ہے مَعَهٗ یا ثابتاً کا ظرف ہو کر یا تو مِثْلَهٗ کی صفت ہے یا حال لہٰذا اس کا تعلق پچھلی عبارت سے واضح ہے۔ مِثْلَهٗ کی اور مَعَهٗ کی ضمیریں مَّا فِی الْاَرْضِ کی طرف ہیں یعنی اگر یہ ثابت ہو جاوے کہ ہر کافر کے پاس یا اس کی ملکیت میں ساری زمین کے سارے ظاہری و باطنی مال ہوں اور اتنے ہی مقدار میں اور مال بھی ہوں یعنی زمینی مال کا دوگنا ہو لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لام بمعنی کے ہے اسی کا تعلق اس ثبت سے ہے جو اَنَّ کی خبر لَهُمْ سے پہلے پوشیدہ ہے لِيَفْتَدُوْا بنا ہے افتداء سے جس کا مادہ فدیہ ہے فدیہ وہ مال ہے جو پھنستی جان چھوڑانے کے عوض دیا جاوے اس لئے قرآن کریم نے اس مال کو فدیہ فرمایا جو ظالم خاوند کے ہاتھ میں پھنسی عورت خاوند کو دے کر طلاق لے یوں ہی قاتل جو خون بہا دیتا ہے اسے فدیہ کہا جاتا ہے یہاں وہ مال مراد ہے جو رشوت کے طور دے کر حاکم کی پکڑ سے اپنے کو بچایا جاوے قیامت کے دن کے عذاب سے یا تو میدان محشر کا عذاب مراد ہے۔ وہاں کی سخت دھوپ، زمین کی تپش، سخت پیاس، دل کی گھبراہٹ، پسینہ کی روانی وغیرہ یا دوزخ کا دائمی عذاب مراد ہے جس کا فیصلہ قیامت کے دن کیا جاوے گا یا دونوں عذاب مراد یعنی کفار کا یہ حال ہوگا کہ اگر ان کے پاس ساری روئے زمین کے مال بلکہ اتنے ہی اور مال ہوتے ہیں جس کا فدیہ دے کر وہ قیامت یا بعد قیامت یا دونوں کے عذاب سے بچ جاتے تو وہ اس مال کا فدیہ دینے میں دریغ نہ کرتے مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ یہ لو کی جزاء ہے تُقُبِّلَ کا نائب فاعل وہ ہی مَّا فِی الْاَرْضِ ہے الخ ہے جو اس کا اسم مؤخر تھا یعنی اتنے عظیم مال کا فدیہ ان سے قبول نہ کیا جاتا اور انہیں عذاب سے رہائی نہ دی جاتی یہاں روح المعانی نے کہا کہ مَا تُقُبِّلَ سے پہلے لِيَفْتَدُوْا بِهٖ پوشیدہ ہے وہ پوشیدہ جملہ اور یہ جملہ دونوں لو کی جزاء ہیں۔ اس مَا تُقُبِّلَ نے اس پوشیدہ جزاء سے بے نیاز کر دیا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اس جملہ کی بہت سی ترکیبیں ہیں مگر آسان ترکیب یہ ہے کہ یہ مستقل جملہ ہے لَهُمْ خبر مقدم ہے عَذَابٌ مبتدا مؤخر۔ عذاب، عقاب اور عتاب کا فرق ہم بارہا بیان کر چکے ہیں اَلِيْمٌ بنا ہے الم سے بمعنی درد و تکلیف الیم بمعنی دردناک تکلیف دہ یعنی ان کفار کا عذاب سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ان کا عذاب ہلکا بھی نہ ہوگا آئندہ کبھی ختم بھی نہ ہوگا ہمیشہ ہمیشہ رہے گا لَهُمْ کا لام لزوم عذاب کے لئے ہے يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ یہ جملہ علیحدہ ہے جس میں کفار کے دوزخ میں ہمیشہ رہنے وہاں سے کبھی کسی طرح نہ نکلنے کا ذکر ہے ارادہ سے مراد یا دلی ارادہ ہے یا کوشش کرنا یا تمنا و آرزو کرنا پہلے اور دوسرے معنی زیادہ ظاہر ہیں اس نکلنے کے ارادہ یا کوشش کی یا تو یہ صورت ہوگی کہ کبھی دوزخ کا دروازہ کھلا کرے گا یہ لوگ نکل جانے کے لئے دروازے کی طرف دوڑیں گے۔ جب وہاں یعنی

جزاء کے لئے قیامت کا دن اسی لئے رکھا گیا ہے تا کہ مسلمانوں کے سارے بھیجے ہوئے صدقات و خیرات پورے جمع ہو جاویں پھر ان کے ثواب دیئے جاویں تا قیامت زندے مسلمان مردہ مسلمان کو ایصال ثواب کرتے رہیں گے۔ **دوسرا فائدہ:** کافر کسی قسم کا ہو اسے عذاب دائمی ہوگا اس کا فدیہ قبول نہ ہوگا۔ یہ فائدہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کے اطلاق سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** کفار کو میدان محشر میں اتنی سخت تکلیف ہوگی کہ خدا کی پناہ دوزخ کی تکلیف تو بعد میں آوے گی۔ یہ فائدہ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔ مؤمنوں کے لئے انشاء اللہ عرش اعظم کا سایہ بھی ہوگا اور پینے کے لئے کوثر کی نہر بھی میدان محشر میں پہنچی ہوگی جہاں سے مرتدین کو ہٹا دیا جاوے گا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ **چوتھا فائدہ:** دردناک عذاب صرف کفار کو ہوگا، گنہ گار مومن کو اگر عذاب ہوگا بھی تو ہلکا ہوگا کہ اس کی رسوائی نہ ہوگی دل و دماغ کو آگ نہ جلائے گی۔ یہ فائدہ وَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ میں لَھُمْ کو مقدم کرنے سے حاصل ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** کفار دوزخ سے نکلنے کی خود کوشش کریں گے ناکام رہیں گے مگر گنہ گار مومن جو دوزخ میں جاوے گا وہ خود وہاں سے نکلنے کی کوشش نہ کرے گا بلکہ اسے نکالنے کی کوشش اس کے نبی حضرات اولیاء اللہ، علماء دین کریں گے آخر اسے نکال ہی لائیں گے حتی کہ حکم ہوگا کہ جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہے اسے نکال لاؤ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ یہ فائدہ وَ مَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ الخ سے حاصل ہوا وہاں سے نکلنا اپنی کوشش سے نہیں ہوگا بلکہ مقبولوں کی کوشش اللہ کی رحمت سے ہوگا۔ **چھٹا فائدہ:** کفار کے لئے عذاب دائمی ہوگا کہ کبھی وہاں سے چھٹکارا نہ پائیں گے۔ گنہ گار مومن کے لئے دائمی عذاب نہیں عارضی عذاب ہوگا۔ یہ فائدہ لَھُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ میں لھم کو مقدم کرنے سے حاصل ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** کفار کا عذاب کبھی ہلکا نہ ہوگا انہیں جتنی تکلیف دوزخ میں داخل ہوتے وقت محسوس ہوگی۔ اتنی ہی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ یہ فائدہ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔ مومن کا عذاب کچھ عرصہ بعد ہلکا ہو جاوے گا حتی کہ بعض مؤمنوں کی جان نکال لی جاوے گی بعد میں جنت کے داخلہ کے وقت پھر ڈالی جاوے گی جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہے بہر حال یہ آیت کریمہ کفار کے لئے ہے یہ عذاب انہی کے ہیں۔

حکایت

نافع ابن ازرق خارجی نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے ایک بار کہا کہ آپ تو کہتے ہیں کہ بعض تو میں دوزخ سے نکالی جائیں گی مگر قرآن کریم فرماتا ہے کہ وَ مَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْھَا وہ کبھی آگ سے نکلیں گے ہی نہیں، آپ نے فرمایا اے دل کے اور آنکھوں کے اندھے! اوپر سے آیت پڑھ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یہ ساری سزائیں کفار کے لئے ہی ہیں (روح المعانی)۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ میں اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کیوں فرمایا گیا الکفرین فرمانا کافی تھا وہ لفظ مختصر بھی تھا۔ **جواب:** اس لئے کہ الکفار کہنے سے شاید کوئی سمجھتا کہ یہ سزا ان کے لئے ہے جو دنیا میں ہمیشہ کافر ہو کر زندہ رہے کافر مریں گَفَرُوْا ماضی فرما کر یہ بتا دیا کہ صرف ایک بار کفر کر لینا اور بغیر

دماغی دلی جرموں کے نتیجے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دل ودماغ کو یار کا کاشانہ بنائے رکھے آمین۔ حضرات صوفیاء فرماتے ہیں کہ دوزخ سے بچنے کی کوشش مومن بھی کرتا ہے کافر بھی مگر ان دونوں کی کوششوں میں چند طرح فرق ہے ایک یہ کہ مومن یہ کوشش بروقت کرتا ہے یعنی زندگی میں کافر یہ کوشش بعد وقت کرے گا یعنی بعد موت دوزخ میں پہنچنے کے بعد۔ دوسرے یہ کہ مومن حق اور جائز کوشش کرتا ہے یعنی ایمان و نیک اعمال کر کے، گناہوں سے توبہ کر کے، رب کو راضی کر کے، کافر ناحق اور ناجائز کوشش کرے گا یعنی دروازہ دوزخ سے نکل جانے بھاگ جانے یا اچھل جانے سے اس لئے مومن اس کوشش میں بفضلہ تعالیٰ کامیاب ہے اور کافر ناکام۔ مجرم حاکم کے سامنے پیش ہو کر کوشش کر کے بری ہو جاوے تو جیل سے بچ جاتا ہے جو قیدی جیل سے بھاگ جانے کی کوشش کرے وہ زیادہ سزا کا مستحق ہو جاتا ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کے اس ارادے کی برائی بیان فرمائی۔ اللہ تعالیٰ دوزخ سے بچنے کی صحیح کوشش نصیب کرے وہاں زر یا زور کام نہیں آتا وہاں تو زاری کام کرتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

زور را بگذار زاری را بگیر رحم سوئے زاری آید اے فقیر

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا

چور اور چورنی پس کاٹ دو ہاتھ ان کے بدلہ اس کا جو انہوں

اور جو مرد یا عورت چور ہو تو ان کا ہاتھ کاٹو ان کے کئے کا بدلہ

كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ

نے کیا عذاب طرف سے اللہ کے اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے پس جو توبہ کرے

اللہ کی طرف سے سزا اور اللہ غالب حکمت والا ہے تو جو اپنے ظلم

مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ

پیچھے ظلم اپنے کے اور درست کرے پس تحقیق اللہ توبہ ڈالے گا اوپر اس کے تحقیق

کے بعد توبہ کرے اور سنور جائے تو اللہ اپنی مہر سے اس پر رجوع فرمائے گا بیشک

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

اللہ بخشنے والا مہربان ہے کیا نہ جانا تم نے کہ تحقیق اللہ اس کا ملک ہے آسمانوں

اللہ بخشنے والا مہربان ہے کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ کے لئے ہے آسمانوں

وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ

چورانے پر یہ سزا نہیں کہ شراب مسلمان کے لئے قیمتی مال نہیں تیسرے مال کا مملوک ہونا لہٰذا کفن چور کا ہاتھ نہ کٹے گا کہ کفن مملوک نہیں چوتھے مال کا معصوم ہونا لہٰذا حربی کافر کے مال کی چوری، چوری نہیں غنیمت ہے کہ اس کا مال شریعت میں معصوم نہیں۔ پانچویں مال کا محفوظ ہونا لہٰذا راستہ یا کھلی مسجد سے کسی کا مال لینا جب کہ مالک وہاں موجود نہ ہو، چوری نہیں۔ جگہ کی شرط ہے محفوظ ہونا غیر محفوظ جگہ سے کسی کا مال لے لینا چوری نہیں۔ چور میں شرط ہے عاقل ہو بالغ، دیوانہ یا بچہ چوری کرے ہاتھ نہ کٹے گا یہ قیدیں ضرور خیال میں رہیں مسروقہ مال کا نصاب ہونا یعنی دس درہم کی قیمت کا ہونا یہ چوری کے لئے شرط نہیں بلکہ چوری کی اس سزا کے لئے شرط ہے۔ خیال رہے کہ چوری ہوتی ہے ہمت اور قوت سے جو مرد میں زیادہ ہے عورت میں کم۔ اس لئے یہاں مرد چور کا ذکر پہلے ہوا عورت چورنی کا ذکر بعد میں اور زنا شہوات سے ہوتا ہے اور شہوات عورت میں زیادہ ہے مرد میں کم نیز عورت کی بغیر رضا مرد اس سے زنا نہیں کر سکتا اس لئے زنا کی سزا میں عورت زانیہ کا ذکر پہلے ہے مرد زانی کا ذکر بعد میں کہ ارشاد ہے اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا الخ (نور: ۲) قطع سے مراد ہے تلوار وغیرہ دھاردار چیز سے ہاتھ کاٹنا لہٰذا چور کا ہاتھ توڑا مروڑا یا شل نہ کیا جاوے گا بلکہ دھاردار چیز سے کاٹا جاوے گا اگرچہ ید پورے ہاتھ کو کہتے ہیں مگر یہاں کلائی تک ہاتھ مراد ہے لہٰذا چور کی نہ تو صرف انگلیاں کٹیں گی نہ پورا ہاتھ صرف کلائی کی جڑ سے ہاتھ کٹے گا۔ ہتھیلی انگلیاں جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔ ایدی سے مراد صرف داہنا ہاتھ ہے مطلقاً ہاتھ نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأۃ میں ایمانھا ہے (روح المعانی وغیرہ) اس لئے چور و چورنی دو کے لئے ایدی جمع بولا گیا اگر چور کے دونوں ہاتھ کٹتے ہوتے تو ید کا تثنیہ آتا ایدی جمع ارشاد نہ ہوتا۔

قاعدہ ایسا عضو جو جسم میں ایک ہی ہو۔ جب تثنیہ کی طرف مضاف ہوتا ہے تو جمع لایا جاتا ہے اور اگر وہ عضو جسم میں دو ہوں اور تثنیہ کی طرف مضاف ہوں تو تثنیہ لائے جاتے ہیں چونکہ جسم میں داہنا ہاتھ ایک ہی ہے اس لئے ایدیھما ارشاد ہوا رب تعالیٰ فرماتا ہے: فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (تحریم: ۴) دیکھو جسم میں دل ایک ہوتا ہے تو یہاں دو عورتوں کے لئے قلوب جمع ارشاد ہوا اہل عرب کہتے اشبعت بطونھما (تفسیر خازن، روح المعانی، کبیر وغیرہ) یاد رکھو کہ یہ آیت کریمہ کئی طرح مجمل ہے چوری کیسی ہو کتنے مال کی ہو کون سا ہاتھ کاٹا جاوے، ہاتھ کہاں سے کاٹا جاوے، چور کا ہاتھ کون کاٹے، کہاں کاٹا جاوے دارالاسلام میں یا اور جگہ بھی۔ ان تمام چیزوں کو حدیث پاک نے بیان فرمایا۔ یہاں فَاقْطَعُوْٓا میں خطاب اسلامی حکام و سلاطین سے ہے، ہر شخص یہ سزا نہیں دے سکتا۔ دس درہم یعنی پونے تین روپیہ سے کم کی چوری میں ہاتھ نہ کٹے گا یہ ہی احناف کا مذہب ہے۔ جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا قوی یہ ہے کہ یہ عبارت فَاقْطَعُوْٓا کا مفعول لہ ہے، مفعول مطلق وغیرہ نہیں یہاں جزاء بمعنی سزا ہے کیونکہ یہ جرم کے بعد مذکور ہے اور سزا سے مراد دنیاوی سزا ہے یعنی شرعی حد۔ اخروی سزا سے بچنے کے لئے توبہ بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے یہاں كَسَبَا فرمایا گیا، سَرَقَا نہ فرمایا گیا تاکہ معلوم ہو کہ چور اس سلسلہ میں جو جرم کرے اس کی سزا یہ ہی ہاتھ کٹنا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی سزا نہیں لہٰذا اگر چور چوری کا مال کھا پی لے یا

بڑے مجرم بخش دے تو اسے کون منع کر سکتا ہے اور اگر معمولی جرم پر پکڑے تو اسے کون روک سکتا ہے وہ مالک الملک جو ہے اَلَمْ تَعْلَمْ میں خطاب یا تو حضور ﷺ سے ہے تو یہ فرمان نہایت ہی محبت و کرم کا ہے یا مسلمان قرآن پڑھنے والے سے دونوں صورتوں میں استفہام انکاری ہے یعنی اے محبوب! آپ جانتے ہی ہیں یا اے قرآن پڑھنے والے مسلمان تیرا تو ایمان ہی ہے کہ رب تعالیٰ مالک الملک ہے۔ خیال رہے کہ حضور ﷺ اس وقت سے عارف باللہ اور عابد ہیں جب کہ وقت بھی نہ بنا تھا۔ لاکھوں سال حضور نے ایسی عبادت کی کہ صرف ایک معبود تھا اور ایک ہی عابد اول ما خلق اللہ نوری۔ ملک کہتے ہیں ظاہری ملکیت کو اور ملکوت کہتے ہیں باطنی ملکیت کو ملک عام بندوں حتیٰ کہ کفار کو بھی دے دیا جاتا ہے مگر ملکوت صرف خاص انبیاء و اولیاء کو عطا ہوتا ہے۔ سمٰوٰت اور ارض کی تفسیریں بارہا بیان ہو چکی ہیں یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ۔ دونوں جگہ مَنْ سے مراد مجرم و گناہ گار ہیں کیونکہ سزا بھی جرم کی ہوتی ہے اور بخشش و معافی بھی جرم کی لہٰذا اس جملہ کے معنی یہ نہیں کہ جس نیک کار صالح بندے کو چاہے تو بلا قصور سزا دے دے اور جسے چاہے اسے معافی دے دے بلکہ معنی یہ ہیں کہ وہ کریم جس مجرم گناہ گار کو چاہے سزا دے جس مجرم کو چاہے معاف فرما دے رہے بے گناہ یا معصوم بندے نہ ان کے لئے سزا ہے نہ معافی کیونکہ وہ بے جرم و بے قصور ہیں جیسے فرشتے یا شیر خوار فوت شدہ انسان بچے یا معصوم یا محفوظ انسان لہٰذا یہ آیت کریمہ ہم جیسے گناہ گاروں کے لئے ہے۔ خیال رہے کہ حضرات انبیاء کرام کا دعاء مغفرت کرنا یا تو اپنی خطاؤں کی مغفرت کے لئے ہے یا دوسروں کی تعلیم کے لئے۔ عطاء جنت چار طرح ہوگی اپنے عمل سے دوسروں کے عمل کی برکت سے جیسے مسلمانوں کے شیر خوار فوت شدہ بچے محض اللہ کے فضل سے جیسے وہ جنہی لوگ جنہیں رب تعالیٰ بغیر شفاعت بخشے گا۔ اپنے دست قدرت میں لے کر اور جنت بھرنے کے لئے جو مخلوق پیدا ہوگی مگر دوزخ ملنے کی صرف ایک وجہ ہے اپنی بدعملی۔ بغیر جرم کسی کو عذاب دینا رب کی شان سے بعید ہے پھر فرمایا کہ تم لوگ اپنے جرموں کی سزا دیئے جاؤ گے دنیا کی تکلیف سزا نہیں لہٰذا بغیر عمل بھی آ سکتی ہیں وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت والا ہے اس کی مکمل تفسیر مع سوال و جواب پہلے پارے میں ہو چکی کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے پیدا کرنے پر قادر ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ہر عیب سے موصوف ہونے پر قادر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے اسلامی حاکمو و بادشاہو! جب تمہاری رعایا میں کوئی مرد یا عورت چوری کرے تو ان دونوں کا ایک ایک ہاتھ (داہنا) کلائی سے کاٹ دو یہ ہاتھ کاٹنا اور دونوں کی چوری اور تمام متعلقہ جرموں کا جو وہ چوری کے سلسلہ میں کر لیں بدلہ ہے یہ سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرت ہے کہ ایسی سزا دیکھ کر کوئی چوری کی ہمت نہ کرے گا۔ جان لو کہ اللہ سب پر غالب بھی ہے جس جرم کی جو سزا چاہے مقرر فرما دے اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں حکمت والا بھی ہے اس کے قوانین اور سزاؤں میں ہزار ہا حکمتیں ہیں (۱) یہ تو چور کی دنیاوی سزا ہے جو چور اپنے اس جرم و سزا کے بعد سچی توبہ بھی کرے۔ اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح بھی کرے کہ کبھی چوری نہ کرنے کا عہد کرے تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اسے آخرت کی سزا نہ دے گا (۲) جو چور چوری کرنے کے بعد توبہ کرے کہ مالک مال سے معافی مانگ لے اور اصلاح بھی کرے کہ اس کا چرایا

قانون کے ماتحت صدہا جزئی مسائل نکل سکتے ہیں دلائل و مسائل اور تفصیل کتب فقہ میں ملاحظہ کرو (۱۱) چور کے ہاتھ کاٹنا زانی کا رجم، قاتل سے قصاص لینا وغیرہ تمام سزاؤں میں حاکم کا فیصلہ شرط ہے بغیر فیصلہ حاکم ہر کس و ناکس یہ سزائیں نہیں دے سکتا لہٰذا اگر سلطان اسلام خود ہی جرم کرے تو اس کو یہ سزائیں نہیں دی جاسکتیں کیونکہ وہ تو حاکم اعلیٰ ہے اس پر فیصلہ کون کرے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا بہت بڑا ظلم ہے تین روپیہ کے مال کے عوض ایک انسان کا ہاتھ کاٹ دینا جس کی قیمت ہی نہیں ہوسکتی کہاں کا انصاف ہے (بعض بے دین)

جواب: ہاتھ کٹنا مال کے عوض نہیں بلکہ خدائی قانون توڑنے کی سزا ہے قانون بڑی قیمتی چیز ہے قانون شکنی پر کبھی پوری قوم کو ہلاک کردیا جاتا ہے نیز اگر ایک شخص کا ہاتھ کٹ جانے سے ملک میں چوری بند ہو جاوے اور لوگوں کے جان و مال محفوظ ہو جاویں تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ جہاں جب تک چوری کی یہ سزا رہی وہاں بڑے امن و امان سے لوگ زندگی بسر کرتے رہے۔

دوسرا اعتراض: اگر چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے کیونکہ چوری ہاتھ سے ہوتی ہے تو چاہیے کہ زنا کی سزا آلہ تناسل کاٹنا ہو کہ زنا اس سے ہوتا ہے اس کی سزا رجم کیوں ہے (آریہ) **جواب:** یہ غلط ہے زنا سارے جسم سے ہوتا ہے کیونکہ منی کا نکلنا سارے جسم سے ہوتا ہے نیز چوری میں مال برباد کیا جاتا ہے اور زنا میں آئندہ نسل تباہ کی جاتی ہے کہ اس سے حرام کا بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی ساری نسل برباد ہو جاتی ہے نیز اگر زانی مرد کا آلہ تناسل کٹوایا تو زانیہ عورت کو پھر کیا سزا دی جاسکتی ہے لہٰذا زنا کی سزا رجم بالکل حق ہے۔

تیسرا اعتراض: چوری کی سزا میں مرد کا ذکر پہلے ہے اور زنا کی سزا میں عورت کا ذکر پہلے ہے اس فرق بیان کی کیا وجہ ہے اس میں کیا حکمت ہے۔ **جواب:** یہ فرق ہم ابھی تفسیر میں عرض کرچکے ہیں کہ چوری میں اصل مرد ہے کہ چوری ہوتی ہے طاقت، ہمت اور جرأت سے جو فطرتاً مرد میں زیادہ ہے اور زنا میں عورت اصل ہے کہ زنا ہوتا ہے شہوت سے اور شہوت عورت میں زیادہ لہٰذا دونوں جگہ اصل کا ذکر پہلے کیا گیا۔

چوتھا اعتراض: قرآن کریم نے مطلقاً چوری میں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا لہٰذا ہر چوری پر ہاتھ کٹنا چاہیے۔ تم نے نصاب کی قید کہاں سے لگائی کہ اتنی قیمت کے مال کی چوری میں ہاتھ کٹے گا کم میں نہیں اگر ایک پیسہ کی چوری بھی کرے تو ہاتھ کٹنا چاہیے (نوٹ) حضرات عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن زبیر، خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے کہ ہر چوری پر ہاتھ کٹے گا (یہ اعتراض ان کا ہی ہے) تفسیر خازن وغیرہ نے نقل فرمایا۔ **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں، ایک الزامی، دوسرا تحقیقی۔ جواب الزامی تو یہ ہے کہ قطع ید بھی مطلق ہے چاہے چور کے پورے کاٹ دو چاہے انگلیاں چاہے کلائی سے چاہے کہنی سے چاہے کندھے سے حالانکہ آپ بھی کلائی سے ہاتھ کٹواتے ہیں اور جواب تحقیقی یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ مطلق نہیں بلکہ مجمل ہے۔ مطلق میں امر کلی مطلوب ہوتا ہے اور مجمل میں فرد مبہم مطلوب ہوتا ہے جس کی تفصیل درکار ہوتی ہے اس آیت کریمہ کی تفصیل احادیث پاک سے ہوتی ... احادیث ... نے ہی چوری کا نصاب مقرر فرمایا اور احادیث نے ہی ہاتھ

اطاعت مصطفوی کا بھی۔ رب فرماتا ہے: اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ (النساء:۵۹) یوں ہی ہر گناہ میں اللہ تعالیٰ کی معصیت بھی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی بھی لہٰذا اس میں ڈبل گناہ ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ کی معصیت کا اور حضور کی نافرمانی کا۔ کیونکہ ہمارے گناہوں سے حضور کو تکلیف ہوتی ہے جس سے حضور کو تکلیف ہو اس میں حضور کی حق تلفی ہے۔ جیسے چور اگر مقدمہ دائر ہونے سے پہلے صاحب حق بندے سے معافی چاہ لے اور مقدمہ پیش نہ ہو تو وہ ہاتھ کٹنے سے بچ جاتا ہے یوں ہی اگر ہم چور قیامت میں مقدمہ پیش ہونے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر معافی حاصل کر لیں تو انشاء اللہ سزا سے معافی مل جاوے گی۔ خیال رکھو کہ حضور حاکم بھی ہیں کریم رحیم بھی۔ رب فرماتا ہے: بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ (النساء: ۱۰۵) معلوم ہوا حضور حاکم ہیں اور فرماتا ہے: بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ (التوبہ: ۱۲۸) معلوم ہوا کہ حضور انور رؤف بھی ہیں رحیم بھی اور قاعدہ ہے کہ اگر مجرم خود چل کر حاکم کریم کی عدالت میں پیش ہو جاوے تو پھر وہ پکڑتے نہیں معاف فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ برادران یوسف علیہ السلام دربار یوسفی میں حاضر ہوئے تو آپ نے انہیں گزشتہ جرموں کی سزا نہ دی بلکہ فرما دیا لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ ؕ یَغۡفِرُ اللّٰہُ لَکُمۡ ۫ (یوسف: ۹۲) اور جب حضرت ابوسفیان، عکرمہ بلکہ ہندہ، وحشی جیسے مجرم حضور عالی کی عدالت عالیہ میں حاضر ہوگئے تو حضور نے انہیں معافی دے دی بلکہ انہیں انعام شاہانہ عطایاء خسروانہ سے مالا مال کر دیا تو کیا تعجب ہے کہ وہ ابوسفیان کو بخشنے والے مولیٰ ہندہ کو معافی دے دینے والے کریم، عکرمہ اور وحشی سے درگزر فرمانے والے رؤف رحیم ہم چوروں سے بھی درگزر فرما دیں۔ اب پڑھ دیا آیت فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِہٖ وَ اَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوۡبُ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ

بد سہی چور سہی مجرم ناکارہ سہی — اے وہ کیسا ہی سہی ہے تو کریما تیرا
چور حاکم سے چھپا کرتے ہیں یاں اس کے خلاف — تیرے دامن میں چھپے چور انوکھا تیرا

اللہ تعالیٰ ہم مجرموں چوروں کو اس حاکم کریم کی بارگاہ عدالت تک حاضری نصیب کرے وہاں پہنچنے کی دیر ہے انشاء اللہ مشکلیں حل ہو جاویں گی نصیبے کھل جائیں گے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ (النساء: ۶۴)

لطیفہ: اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مولوی محمد علی لاہوری قادیانی اپنی تفسیر بیان القرآن میں لکھتے ہیں یہاں ہاتھ کاٹنے سے مراد چور کو چوری سے روک دینا ہے یعنی چور کو سمجھا بجھا کر چوری سے منع کر دو۔ یہ ہے قادیانی تفسیریں یہ تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے۔ تمام امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر متفق ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹے جاویں۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ لَا يَحۡزُنۡكَ الَّذِيۡنَ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡكُفۡرِ

اے رسول نہ غم میں ڈالیں آپ کو وہ لوگ جو جلدی کرتے ہیں کفر میں

اے رسول تمہیں غمگین نہ کریں وہ جو کفر پر دوڑتے ہیں

کی اہمیت کا تذکرہ ہے جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوگا۔

شان نزول

خیبر یا فدک کے یہودیوں میں ایک امیر خاندانی گھرانے کے ایک شادی شدہ جوڑے نے آپس میں زنا کر لیا۔ بحکم توریت ان پر رجم کی سزا جاری ہوتی تھی مگر وہاں کے یہودی پادریوں نے ان دونوں کو اس سزا سے بچانا چاہا انہیں پتہ لگا تھا کہ بمقابلہ توریت کے قرآن مجید کے احکام بہت نرم ہیں اور یہودیت سے آسان دین ہے اس لئے وہاں کے پوپ پادریوں نے خفیہ طور پر ایک جماعت یہود مدینہ بنی قریظہ کے پاس بھیجی اور ان جانے والوں کو سمجھا دیا کہ چونکہ بنی قریظہ ہمارے ہم مذہب ہیں اور حضور ﷺ کے ہم وطن ہیں اس لئے تم ان کی معرفت حضور کی بارگاہ عالی میں حاضر ہونا اور یہ مسئلہ دریافت کرو مگر علانیہ حاضری نہ دینا بلکہ خفیہ طور پر وہاں جانا اگر وہ سرکار رجم کے سوا کسی اور سزا کا حکم دیں تو بسر وچشم قبول کر کے اس سزا کا مدینہ منورہ میں بھی اعلان کرنا اور آ کر اپنے وطن خیبر میں بھی خوب دھوم مچانا تا کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ایک سچے نبی نے یہ ہلکی سزا تجویز فرمائی ہے جن کی نبوت توریت سے ثابت ہے اور اگر وہ رجم کا حکم دیں تو اسے ہرگز قبول نہ کرنا اور چپکے سے واپس آ جانا اس جانے آنے کی کسی کو خبر نہ کرنا۔ چنانچہ یہ جماعت مدینہ منورہ حاضر ہوئی بنی قریظہ سے خفیہ طور پر ملی اور ان سے سارا ماجرہ بیان کیا۔ چنانچہ ان لوگوں کے ساتھ یہ یہود مدینہ بھی حضور کی خدمت میں آئے جن میں کعب بن اشرف، کعب ابن اسد، سعید ابن عمرو اور مالک ابن صیف بھی تھے اپنے ساتھ کچھ منافقین کو بھی لے لیا جو بظاہر مسلمان تھے در پردہ کافر اور عرض کیا کہ یارسول اللہ شادی شدہ زانی کی سزا کیا ہے حضور نے فرمایا کیا تم میری تجویز کردہ سزا مانو گے وہ سب یک زبان ہو کر بولے کہ ماننے ہی کے لئے تو یہاں آئے ہیں فرمایا اس کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا ہے وہ بولے ان کی سزا یہ نہیں ہے آپ نے بہت سخت سزا تجویز فرما دی۔ حضور انور نے فرمایا کہ کیا تم جوان بے داڑھی والے کانے، گورے چٹے عالم کو مانتے ہو جو فدک میں رہتا ہے اور اس کا نام ابن صوریا ہے وہ بولے کہ آج روئے زمین پر اس سے بڑا توریت کا عالم کوئی نہیں فرمایا اسے بلوالو اور اس سے فتویٰ لو ہمارے سامنے چنانچہ فدک سے اسے بلایا گیا (فدک خیبر سے تیس میل جانب تبوک ہے اب وہ جگہ اجڑ چکی ہے حضور انور ﷺ نے فرمایا اے ابن صوریا! تجھے قسم ہے اس رب کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توریت اتاری، جس نے فرعون کو غرق کیا، جس نے بنی اسرائیل پر من وسلویٰ اتارا سچ بونا کہ توریت شریف میں شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے یا نہیں ابن صوریا آپ کے فرمان عالی سے کانپ گیا اور بولا کہ بے شک توریت میں ایسے زانی کی سزا رجم ہے فرمایا کہ پھر تم نے اس حکم پر عمل کیوں چھوڑ دیا تب اس نے اس کے متعلق بڑا عجیب و غریب قصہ بیان کیا کہ ہمارے ایک بادشاہ کے عزیز نے زنا کر لیا تھا بادشاہ نے ہم لوگوں سے کہا کہ کسی صورت سے میرے اس عزیز کی جان بچالو تم کو اتنا انعام دیا جائے گا تب ہم لوگوں نے بجائے رجم کے منہ کالا کرنا، گدھے پر سوار کرنا، شہر میں پھرانا، کچھ کوڑے مار دینے کی سزا مقرر کر لی۔ اس پر یہودی ابن صوریا کو برا بھلا کہنے لگے اور اس فیصلہ کے انکاری ہو گئے مگر اب یہ معاملہ بہت مشہور ہو چکا تھا چنانچہ ان دونوں زانی و زانیہ کو مسجد نبوی کے سامنے ہی دروازہ سے کچھ دور رجم کیا گیا مگر منافقین

موقعہ پر اس قوم کے ایمان کا غم ہوا تھا یہ غم عبادت تھا مگر اس غم عبادت سے رب نے منع فرمایا کیونکہ جس پر ذمہ داریاں بہت ہوں اس کا دل بے غم چاہیے۔ حضور پر سارے عالم کا بوجھ ہے اگر آپ کے دل کو غم ہوں تو یہ بوجھ کیسے اٹھے اس لئے فرمایا لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ سے مراد وہ منافقین ہیں جو یہود مدینہ اور یہود خیبر و فدک کے ساتھ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تھے فتویٰ حاصل کرنے کے بہانہ سے یُسَارِعُوْنَ کی اصل سرعت ہے مصدر مسارعت جس کے معنی ہیں جلدی کرنا کفر سے مراد ہے اظہار کفر یا کفار کی طرف میلان ہے ورنہ منافقین کافر تو پہلے ہی سے تھے۔ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ یہ عبارت الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ کا بیان ہے مِنْ کا تبیین پوشیدہ کے متعلق ہو کر حال ہے الَّذِیْنَ کا یا یُسَارِعُوْنَ کے فاعل کا بِاَفْوَاهِهِمْ۔ قَالُوْۤا کے متعلق ہے اور وَلَمْ تُؤْمِنْ الخ قَالُوْۤا پر معطوف یعنی اے رسول! ﷺ آپ کو یہ منافقین غمگین نہ کریں جو بہت جلد کفر کا اظہار کر دیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے پہلے ہی صرف منہ سے کہہ دیا تھا کہ ہم ایمان لائے ان کے دل ایمان نہ لائے تھے ایسوں کے کفر بکنے سے آپ ہرگز غمگین نہ ہوں وَ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اس عبارت کی کئی ترکیبیں ہیں اور کئی معنی ایک یہ کہ یہ جملہ نیا ہے واؤ ابتدائیہ ہے مِنَ الَّذِیْنَ خبر مقدم ہے سَمّٰعُوْنَ مبتدا موخر دوسرے یہ کہ واؤ عاطفہ ہے اور یہ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا معطوف ہے مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا پر اور سَمّٰعُوْنَ ان کی حالت کا بیان ہے۔ لِلْكَذِبِ کا لام یا صلہ کا ہے یا غایۃ کا لہٰذا اس عبارت کی چار تفسیریں ہوں گی یعنی بعض یہودی آپ کا فرمان جھوٹ بولنے کے لئے سنتے ہیں تا کہ آپ کی بات سن کر جائیں اور جھوٹی باتیں آپ کی طرف منسوب کر دیں یا بعض یہودی وہ ہیں جو جھوٹی باتیں سنتے ہیں سچی باتیں نہیں سنتے یا آپ ان منافقون اور ان یہودیوں سے غمگین نہ ہوں جو ہمیشہ جھوٹی باتیں سنتے ہیں ان ہی ترکیبوں کے لئے هَادُوْا پر ط کا وقف ہے۔ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ لَمْ یَاْتُوْكَ ط اس عبارت میں ان منافقین اور یہود کے دوسرے عیب کا ذکر ہے یہ عبارت یا تو دوسرا مبتدا ہے یا دوسرا حال لِقَوْمٍ میں لام صلہ کا ہے یا غایۃ کا اس لئے اس عبارت کی بھی چند تفسیریں ہوں گی لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ سے مراد وہ خیبر یا فدک کے یہودی ہیں جو مدینہ منورہ خود حاضر نہ ہوئے تھے کچھ لوگوں کو سمجھا بجھا کر مدینہ منورہ بھیجا تھا یعنی آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والے یہ یہودی اور منافقین آپ کے فرمان نہیں سنتے یہ تو دوسروں کی باتیں سنتے ہیں علماء یہودی یا یہ لوگ آپ سے مسئلہ ماننے کے لئے نہیں سنتے دوسروں کے لئے سنتے ہیں جاسوس ہیں دوسروں تک آپ کی باتیں پہنچاتے ہیں وہ دوسرے کون ہیں وہ ہی جو خود آپ کے پاس نہ آئے خیبر یا فدک میں رہے انہیں بھیج دیا اور ہوسکتا ہے کہ یہ بھی ان آنے والے لوگوں ہی کی صفت ہو یعنی یہ منافقین و یہود جو آپ کی خدمت میں فتویٰ لینے آئے ہیں یہ آپ کے پاس آئے ہی نہیں کیونکہ ان کے جسم تو آپ کے پاس ہیں مگر دل دوسرے لوگوں کے پاس اس صورت میں لَمْ یَاْتُوْكَ کا تعلق ہوگا سَمّٰعُوْنَ سے۔ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ یہ عبارت لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ کے دوسری صفت ہے اس کی پہلی صفت تھی لَمْ یَاْتُوْكَ۔ یُحَرِّفُوْنَ کے معانی بہت دفعہ بیان ہو چکے تحریف لفظی تحریف معنوی کے اقسام احکام تفصیل سے بتا دیئے گئے كَلِمَ سے مراد توریت شریف کی مقرر کردہ

کیوں غم کرتے ہیں۔ **خیال رھے:** کہ اس موقعہ پر حضور ﷺ کی خدمت میں تین جماعتیں حاضر ہوئیں تھیں۔ منافقین یہود و مدینہ، یہود فدک یا یہود خیبر۔ اس آیت کریمہ میں ان تینوں جماعتوں کے متعلق تین باتیں ارشاد ہوئیں، منافقین کا ذکر ہوا **وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ** تک یہود مدینہ کا ذکر ہوا **سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ** تک اور یہود خیبر کا ذکر ہوا **لَمْ يَاْتُوْكَ** ان تینوں جماعتوں کے فیض نہ لینے کی تین وجہیں بتائیں۔ منافقین اس لئے فیض نہیں لیتے کہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں۔ یہود مدینہ اس لئے فیض حاصل نہیں کرتے کہ وہ بری نیت سے آتے ہیں یا جھوٹوں کی بھی سنتے ہیں۔ یہود خیبر اس لئے فیض پاتے نہیں کہ وہ آپ کے پاس آئے ہی نہیں ان کے جسم حاضر ہیں مگر دل غیر حاضر۔ سبحان اللہ کیسی پیاری ترتیب اور کیسا پیارا بیان۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضور ﷺ کو یا کہہ کر پکارنا جائز ہے۔ یہ پکار سنت الٰہیہ بھی ہے، سنت انبیاء کرام بھی، سنت صحابہ بھی بلکہ سنت ملائکہ بھی لہٰذا مسلمانوں کا یارسول اللہ یا نبی اللہ یا حبیب اللہ کہنا بالکل جائز باعث ثواب ہے بلکہ حضور اقدس کو پکار کر صلوٰۃ وسلام عرض کرنا بھی سنت صحابہ سے ثابت ہے اس لئے ہر نماز میں التحیات واجب ہے اور التحیات میں حضور کو پکار کر سلام عرض کیا جاتا ہے۔ **اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ** الخ احادیث سے ثابت ہے کہ درخت و پتھروں نے حضور اقدس کو پکار کر سلام عرض کیا۔ دیکھو مشکوٰۃ شریف باب المعجزات۔ یہ فائدہ **يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ** سے حاصل ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** حضور ﷺ کو نام لے کر یا ایسے القاب سے پکارنا جن سے دوسرے عام لوگوں کو پکارا جاتا ہے، حرام ہے لہٰذا صرف یا محمد یا بشیر یا ابا یا بھیا چچا وغیرہ کہہ کر نہ پکارو انہیں یارسول اللہ یا نبی اللہ وغیرہ پیارے پیارے القاب سے پکارو۔ یہ فائدہ بھی **يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ** سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے محبوب اکبر ہیں کہ رب تعالیٰ ان کے قلب پاک کو طرح طرح جگہ جگہ تسلیاں دیتا ہے کہ قلب محبوب پر غم نہ آنے پائے۔ اللہ تعالیٰ ان کا دل میلا نہیں ہونے دیتا۔ سبحان اللہ یہ فائدہ **لَا يَحْزُنْكَ** الخ سے حاصل ہوا

تو جو چاہے تو ابھی میل مرے دل کی دھلے ۔۔۔ کہ خدا دل نہیں کرتا کبھی میلا تیرا

چوتھا فائدہ: ہر مبلغ عالم کو چاہیے کہ لوگوں کے اثر نہ لینے سے غمگین نہ ہو تبلیغ کیے جاؤ کہ تبلیغ بڑا ثواب ہے بارش سے ہر زمین فائدہ نہیں اٹھاتی مگر بادل برستا ہی رہتا ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے فرمایا: **سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ** (بقرہ:۶) یہ نہ فرمایا کہ **سَوَآءٌ عَلَيْكَ** یعنی ان کفار کے لئے آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے وہ تو ایمان نہ لائیں گے مگر آپ کے لئے برابر نہیں آپ کو تو تبلیغ کا ثواب ملے گا ہی۔ یہ فائدہ بھی **لَا يَحْزُنْكَ** الخ سے حاصل ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** اظہار کفر بھی کفر ہے یعنی منہ سے کفر کی بات بکنا کفر ہے یہ فائدہ **يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ** سے حاصل ہوا۔ منافقین دل سے پہلے بھی کافر تھے آج ان کے کفری باتیں کرنے یعنی اظہار کفر کو کفر فرمایا گیا۔ لہٰذا اگر منافق بھی کفر ظاہر کرے تو مرتد ہوگا۔ **چھٹا فائدہ:** زبان سے ایمان ظاہر کر دینے سے انسان شرعاً مسلمان بن جاتا ہے اس پر مسلمانوں کے احکام جاری ہو جاتے ہیں مگر عنداللہ مومن نہیں اللہ کے نزدیک مومن وہ ہی ہے جو دل سے ایمان لائے۔ شرط جواز اور ہے شرط قبول کچھ اور یہ

اگر کسی سے کفر سنا گیا تو قتل کیا جاوے گا۔ دیکھو مشکوٰۃ شریف باب الکبائر۔

تیسرا اعتراض: سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا کہ حضور کی بارگاہ میں وہ لوگ دوسروں کی طرف سے مسئلہ پوچھنے آتے تھے یہ کوئی جرم نہ تھا پھر اسے ان کے عیوب میں کیوں شمار کیا گیا یہ تو اچھی بات ہے۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ اس جملہ کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ یہ لوگ آپ کی نہیں سنتے دوسروں یعنی کفار کی سنتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ لوگ مسئلہ پوچھنے نہیں آئے بلکہ جاسوسی کرنے آئے ہیں تا کہ آپ کی باتیں بطور جاسوسی دوسروں تک پہنچائیں۔ تبلیغ کے لئے حضور کے احکام پہنچانا عبادت ہے مگر جاسوسی کے لئے پہنچانا جرم ہے۔

چوتھا اعتراض: یہود خیبر و فدک مسلمان نہ تھے کافر تھے پھر ان کو زنا پر حضور نے رجم کیوں کرایا۔ رجم میں زانیہ اور زانی کا مسلمان ہونا بھی شرط ہے۔ **نوٹ:** حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک زنا کے احصان میں اسلام ضروری نہیں اگر کافر شادی شدہ بھی زنا کرے تو رجم کیا جاوے گا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اس احصان میں اسلام شرط ہے کافر زانی پر رجم نہیں۔ یہ اعتراض امام شافعی کا ہے یہ واقعہ ان حضرات کی ہی دلیل ہے۔ **جواب:** حضور ﷺ نے ان یہود پر اسلامی رجم نہیں فرمایا بلکہ ان کے مذہب کے مطابق حکم توریت ان پر جاری فرمایا اس لئے حضور انور نے ان سے اس زنا کا اسلامی ثبوت نہ مانگا اور اس رجم کے لئے خود ان کے علماء کو جمع فرمایا ان سے حکم توریت دریافت فرمایا ان سے فتویٰ دلا کر رجم کیا۔ اسلامی رجم میں یہ کب ہوتا ہے کہیں ثابت نہیں کہ حضور ﷺ یا حضرات صحابہ کرام نے عرب کے مشرک زانیوں کو رجم کیا ہو حالانکہ عرب کے مشرکوں میں زنا عام تھا اگر زنا کے احصان کے لئے اسلام شرط نہیں کافر زانی کو بھی رجم کرنا چاہیے تو مشرکین عرب تو بہت ہی رجم کیے جاتے امام اعظم کا قول بہت ہی قوی ہے۔ زنا کے احصان میں زانی زانیہ کا مسلمان ہونا شرط ہے۔

پانچواں اعتراض: اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ اور دوسرے مقام پر فرمایا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (مائدہ: ۱۳) یعنی وہاں لفظ بعد نہیں ہے ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ **جواب:** ان دونوں میں بڑا فرق ہے اس آیت میں جہاں لفظ بعد نہیں وہاں تحریف سے مراد ہے تحریف معنوی اور مواضع سے مراد ہے آیات توریت کے محل یعنی وہ آیات توریت کی فاسد تاویلیں کر کے ان کے اصل محل سے ہٹاتے ہیں اور یہاں جہاں کے لفظ بعد بھی ہے تحریف سے مراد لفظی یعنی آیات کے الفاظ مٹا دینا یا بدل دینا، آیات کا توریت سے نکال دینا لہٰذا ان دونوں میں فرق ظاہر ہے۔ (تفسیر خازن)

چھٹا اعتراض: ان منافقین نے اس موقعہ پر توحید یا رسالت یا قرآن یا کسی ایمان رکن کا انکار نہیں کیا تھا بلکہ حضور انور کے فتویٰ رجم کا بھی انکار نہیں کیا تھا پھر رب تعالیٰ نے ان کے کفر کا فتویٰ کیوں دیا کہ فرمایا: یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ۔ **جواب:** اس لئے کہ انہوں نے حضور کے فتوے کو بے محل فتویٰ قرار دیا، حضور کے کسی کلام، کام، کسی حال پر اعتراض کفر ہے۔ ہمارے کام و کلام نفسانی، شیطانی، رحمانی ہر طرح کے ہوتے ہیں ہمارے اعضاء پر کبھی دن ہوتا ہے کبھی رات نفس و

کلیم طور پہ رب کا کلام لینے گئے — خود ان کے گھر میں خدا کا کلام آتا ہے

آپ نے دنیا میں آ کر دنیا کو سجا دیا جو ان سے نہ سجا وہ کہیں نہ سجے گا جو ان سے روشن نہ ہوا وہ کہیں روشن نہ ہوگا جو ان کے ہاتھوں پار نہ لگا وہ کبھی پار نہ لگے گا

بزم کونین سجانے کے لئے آپ آئے — شمع توحید جلانے کے لئے آپ آئے
ایک پیغام جو ہر دل میں اجالا کر دے — ساری دنیا کو سنانے کے لئے آپ آئے
ایک مدت سے بھٹکتے ہوئے انسانوں کو — ایک مرکز پہ بلانے کے لئے آپ آئے
ناخدا بن کے ابلتے ہوئے طوفانوں میں — کشتیاں پار لگانے کے لئے آپ آئے

غرضکہ یہ آیت کریمہ بہت ہی عبرت ناک ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آستانہ کی صحیح حاضری نصیب کرے آمین، صوفیاء فرماتے ہیں کہ وہ ہی درخت پھل دے سکتا ہے جس کی شاخیں اُوپر ہوں اور جڑ نیچے گرد و غبار والے پتھر پر دانہ اگ جاوے تو پھل نہیں دیتا کہ اس کی جڑ نیچے نہیں گئی یوں ہی وہ کلمہ مغفرت کے پھل دیتا ہے جس کی شاخ زبان و اعضاء ظاہری پر ہوں مگر جڑیں دل کی گہرائیوں میں اتری ہوں۔ منافقین کی زبان پر تو کلمہ تھا مگر دل میں نہ تھا۔ فرمایا گیا: بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (مائدہ:۴۱) اس لئے رب نے انہیں کافر قرار دیا۔ کارتوس کی گولی ضرور مار کرتی ہے مگر جب کہ اسے بارود شکار تک پہنچا دے عقائد و اعمال گولی ہیں اور حضور کی توقیر و تعظیم بارود۔

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ

اور وہ کہ ارادہ کرے اللہ فتنہ کا اس کے پس ہرگز نہیں مالک ہو گے تم اس کے لئے اللہ سے کچھ یہ

اور جسے اللہ گمراہ کرتا ہے تو ہرگز تو اللہ سے اس کا کچھ نہ بنا سکے گا وہ ہیں

الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا

وہ لوگ ہیں کہ نہیں ارادہ کیا اللہ نے یہ کہ پاک کرے دلوں کو ان کے ان کے لئے دنیا میں

کہ اللہ نے ان کا دل پاک کرنا نہ چاہا انہیں دنیا میں

خِزْيٌ ۚ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوْنَ

رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں عذاب ہے بڑا۔ بڑے سننے والے

رسوائی ہے اور انہیں آخرت میں بڑا عذاب بڑے جھوٹ سننے

لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ

قریظہ نے کہا کہ ہم تو ایک ہی دیت دیں گے ہمارا ان کا دین نسب ایک ہے تو اس تفریق کی کیا وجہ اور ہم اس کا فیصلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالیہ سے کرائیں گے۔ چنانچہ یہ دونوں فریق بنی قریظہ اور بنی نضیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالیہ میں اس فیصلے کے لئے آئے بنی قریظہ تو خوشی سے آئے مگر بنی نضیر مجبوراً تب یہ آیت کریمہ فَاِنْ جَآءُوْكَ الخ نازل ہوئی (تفسیر خازن، تفسیر ابن کثیر) ابو داؤد، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے مستدرک میں بھی یہی ہی روایت کی۔ اس کے نزول کے متعلق اور روایات بھی ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری دو آیتیں اسی واقعہ زنا کے متعلق نازل ہوئیں جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں مگر زیادہ قوی قول یہ ہے کہ یہ حصہ قتل بنی نضیر کے متعلق آیا۔ چنانچہ آئندہ آیات کا مضمون بھی اسی کی تائید کر رہا ہے اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ الخ (مائدہ: ۴۵) اس نفس بالنفس کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل کے متعلق یہ آیت ہے۔ واللہ اعلم۔

تفسیر وَ مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ، یہاں مَنْ سے مراد انسان و جنات ہیں کہ کفر و گناہ یہ ہی دو مخلوق کرتی ہیں انسانوں سے بھی وہ انسان اس سے خارج ہیں جن کے محفوظ یا معصوم یا جنتی ہونے کا وعدہ الٰہی ہو چکا ہے ارادہ اور مشیت اور رضا میں فرق بارہا بیان ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض کے گمراہ کرنے کافر کرنے کا ارادہ کرتا ہے مگر کسی کے کفر یا گمراہی سے نہ راضی ہے نہ حکم فرماتا ہے سب کو ایمان و تقویٰ کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ ایمان و تقویٰ سے ہی راضی و خوش ہے، فتنہ کے بہت معنی ہیں عذاب دینا، ہلاک کرنا، رسوا کرنا، گمراہ کرنا، امتحان کرنا، آزمائش میں ڈالنا یہاں سوائے امتحان کے باقی تمام معنی بن سکتے ہیں بہتر یہ ہے کہ ایسے عام معنے کیے جاویں کہ یہ تمام معنی اس میں آ جاویں۔ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْــٴًـا یہ عبارت وَ مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ کی خبر بمعنی جزا ہے فَلَنْ تَمْلِكَ میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اس فرمان عالی سے مقصود ہے حضور انور کا غم و رنج دور فرمانا اور ہو سکتا ہے کہ خطاب ہر مسلمان سے ہو مِنَ اللّٰهِ یا تو متعلق ہے۔ تَمْلِكَ کے یا متعلق ہے کائنا۔ ثابتاً پوشیدہ کے اور یہ کائنا حال ہے شَیْــٴًـا کا شیء سے مراد یہاں ہدایت، رحمت، لطف و مہربانی ہے (روح المعانی) یا شَیْــٴًـا سے مراد دفع عذاب ہے دیکھو روح البیان۔ یعنی اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ جس بندے کو عذاب دینا، ہلاک کرنا، گمراہ کرنا چاہے تو آپ رب تعالیٰ کی طرف سے اس کی ہدایت وغیرہ کے مالک نہیں یا آپ اس کے لئے اللہ کی ہدایت و رحمت وغیرہ کے مالک نہیں یا آپ اللہ تعالیٰ کے مقابل اس کی ہدایت کے مالک نہیں یہ تفسیریں خیال رکھنی چاہئیں۔ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ۔ یہاں اُولٰٓىٕكَ سے اشارہ تو مَنْ کی طرف ہے جو بھی مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ میں مذکور ہوا چونکہ وہ معنی میں جمع تھا لہٰذا اُولٰٓىٕكَ جمع لایا گیا یا اس سے اشارہ ان ہی منافقین اور یہود کی طرف ہے جو اس مقدمہ میں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تھے چونکہ یہ لوگ اللہ کی رحمت سے بہت دور تھے اس لئے اُولٰٓىٕكَ اشارہ بعید فرمایا گیا وہاں جسم کا قرب بغیر روحانی قرب کے معتبر نہیں لَمْ یُرِدِ میں گزشتہ زمانہ کا ذکر ہے یعنی ازل سے ہی اللہ نے ارادہ نہ فرمایا یا جب وہ لوگ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تب ارادہ نہ فرمایا۔ طہارت سے مراد باطنی پاکی ہے جس کا تعلق دل و دماغ خیال و ارادہ سے ہوتا ہے اس لئے اس کے بعد قلوب کا ذکر ہے اور مراد ہے کفر۔ بے دینی، گمراہی سے پاک فرمانا یعنی یہ لوگ تو وہ بدنصیب ہیں کہ روز

کے متعلق حق فیصلہ کرنا۔ عالم دین کا سچے مستفتی سے رشوت لے کر صحیح فتویٰ دینا، عالم کا جھوٹے مستفتی سے رشوت لے کر جھوٹا اور غلط فتویٰ دینا۔ یہ چاروں رشوتیں حرام ہیں۔ سحت میں داخل ہیں مگر چوتھی رشوت یعنی مال لے کر غلط فتویٰ دینا کفر بھی ہے کہ اس میں دین کو بدل ڈالنا ہے یہ ہی حرکت یہود کے پوپ پادری کرتے تھے۔ حکام کے ہدیے خاص دعوتیں، عید، بقر عید کو رعایا کے تحفے یہ سب رشوتیں ہیں کہ دینے والے یہ چیزیں اس لئے دیتے ہیں کہ پھر وقت پر حاکم سے ناجائز فائدے حاصل کیے جاوے۔ یہ بھی خیال رہے کہ رشوت اور اجرت میں فرق ہے رشوت حرام ہے، اجرت جائز۔ حکام و علماء و مفتیان کی تنخواہ اجرت ہیں لہٰذا حلال ہیں۔ مفتی کا درست فتویٰ لکھ کر دینے مہر لگانے کی اجرت لینا حلال ہے کہ مفتی پر فتویٰ بتانا فرض ہے۔ اسے لکھ کر دینا جس سے اس کا فتویٰ کچہری میں کام آوے اور پھر بعد میں مفتی کا کچہری میں گواہی دینا اپنے فتویٰ کی تصدیق کے لئے حاکم کے سامنے پیش ہونا فرض نہیں لہٰذا ان کی اجرت لے سکتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا یُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ (بقرہ: ۲۸۲) لکھنے والے اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جاوے ان کی اجرتیں دے دی جاویں فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ یہاں ف جزائیہ ہے اور یہ عبارت ایک پوشیدہ شرط کی جزا ہے یعنی جب ان کا حال یہ ہے تو آپ کو اختیار ہے۔ جَآءُوْكَ کا فاعل وہ ہی خیبر و فدک یا بنی نضیر وغیرہ کے یہودی ہیں جو حضور انور کی رعایا نہ تھے اور آپ کی خدمت میں اپنے فیصلے لاتے تھے مگر ماننے کے لئے نہیں بلکہ آسانی ڈھونڈنے کے لئے کہ اگر ہماری رائے کے مطابق آسان فیصلہ ہو تو مان لیں گے ورنہ نہیں۔ لہٰذا یہ آیت محکم ہے کسی آیت سے منسوخ نہیں حکم سے مراد ہے فیصلہ فرمانا اور اَعْرِضْ سے مراد ہے فیصلہ نہ کرنا یعنی جب یہ یہود نضیر یا خیبر آپ کو پنچ بنا کر آپ سے فیصلہ کرانا چاہیں تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ اس کا پنچ بننا قبول کریں یا رد فرمادیں وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ یَّضُرُّوْكَ شَیْــٴًـا اس عبارت میں حضور کی بے نیازی کا ذکر ہے اعراض کے معنی منہ پھیرنا ہیں اس کا مادہ اور اس مادہ کے معانی بارہا بیان ہو چکے ہیں یعنی اے محبوب ﷺ اگر آپ ان مقدمات میں پنچ بننا قبول نہ فرماویں اور ان کی طرف دھیان نہ دیں تو یہ لوگ آپ کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے کیونکہ ہم آپ کے حافظ و ناصر ہیں وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ: ٦٨) لیکن اگر ان کا مقدمہ آپ طے کریں تو خیال رکھیں کہ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ قسط کے معانی تیسرے پارے کی تفسیر میں عرض کیے جا چکے ہیں کہ اس کے معنی ہیں حصہ اصطلاح میں انصاف کو قسط کہتے ہیں کیونکہ اس میں ہر ایک کا حصہ اسے صحیح طور پر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں حکم سے مراد پنچائتی فیصلہ ہے یعنی اگر آپ ایسے مقدمات میں پنچ بننا قبول فرمالیں اور ان کا فیصلہ کریں تو فیصلہ انصاف سے کریں کہ سیاسی امور میں اسلام کے مطابق فیصلہ فرماویں اور عبادات، معاملات، میراث میں ان کے مذہب کے مطابق ان پر حکم جاری فرماویں یہ خطاب بظاہر تو حضور سے ہے مگر درحقیقت ہم سب کو بتانا مقصود ہے کہ حضور ﷺ کا انصاف نہ کرنا ظلم کرنا ناممکن ہے ہماری اس تفسیر سے معلوم ہوگیا کہ یہ عبارت گزشتہ عبارت کی ناسخ نہیں اور یہ ساری آیت محکم ہے اس کا کوئی لفظ منسوخ نہیں حقیقت یہ ہے کہ سورۃ مائدہ پوری کی پوری محکم ہے اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قسط

دے سکتا مگر رب تعالیٰ کی عطا سے بعض بندے مختار ہیں ان کے ہاتھوں رب تعالیٰ کی عطائیں ملتی ہیں۔ یہ فائدہ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ کی ف جزائیہ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** بزرگوں کی صحبت سے وہ ہی فیض یاب ہوگا۔ جو اپنے کو خالی سمجھ کر ان سے لینے کے لئے ان کے دروازوں پر جاوے جو پہلے ہی سے اپنی پختہ رائے لے کر جاوے وہ ہرگز وہاں سے کچھ نہ لے گا۔ خالی ڈول کنوئیں سے پانی لاتا ہے، بھرا ڈول کیا لائے۔ سفید کپڑا رنگا جاتا ہے جو کپڑا پہلے سے پختہ سیاہ ہوا سے کوئی کیسے رنگے۔ یہ فائدہ سَمّٰعُوْنَ کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** کفار کی غیبت یعنی انہیں پس پشت برا کہنا جائز ہے۔ یہ فائدہ سَمّٰعُوْنَ اور اَكّٰلُوْنَ کی دوسری تفسیر سے حاصل ہوا کہ یہود کے پوپ پادری خیبر یا فدک میں تھے اور ان کی برائی مدینہ منورہ میں قرآن مجید میں پڑھی جارہی تھی کہ وہ حرام خور ہیں۔ ابولہب اور اس کی بیوی جمیلہ کبھی کے مر گئے مگر اس کی برائیاں سورۃ لہب میں اب تک پڑھی جارہی ہے۔ **چھٹا فائدہ:** رشوت لینا مطلقاً حرام ہے خواہ رشوت لے کر ظلم کرے یا انصاف مگر رشوت دینا جب حرام جب کہ رشوت کے ذریعے ظلم کرایا جاوے اگر ظالم حاکم بغیر رشوت لئے ہمارا حق ہم کو نہیں دیتا تو اس مجبوری میں اسے رشوت دے کر اپنا حق حاصل کرنا جائز ہے۔ یہ فائدہ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ سے حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ نے رشوت خواری کی مطلقاً برائی فرمائی رشوت دینے کی مطلقاً برائی بیان نہ کی۔ **ساتواں فائدہ:** جس شخص کی آمدنی حرام و حلال سے مخلوط ہو اس کے ہدیے قبول کرنا، اس کی دعوت کھانا، اس سے تجارتی لین دین کرنا جائز ہے۔ دیکھو حضور ﷺ نے شاہ اسکندریہ یعنی مقوقس کا ہدیہ قبول فرمایا اور حضور نے ان ہی یہود سے قرض لیا جن کے متعلق ارشاد ہوا۔ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ نیز حضور ﷺ بازار سے خرید و فروخت کرتے تھے حالانکہ وہاں کے دوکاندار بعض سود خوار بھی تھے۔ بعض خائن بھی (تفسیر روح البیان) نیز اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے گھر، یوسف علیہ السلام کو شاہ مصر کے گھر، ہمارے حضور ﷺ کو ابوطالب کے گھر برسوں رکھا وہاں ہی ان کی پرورش کی حالانکہ ان لوگوں کی کمائی و آمدنی خالص حلال نہ تھی۔

مسئلہ: چند آمدنیاں سخت حرام ہیں (۱) سود (۲) جوئے سے حاصل شدہ مال (۳) غصب (۴) خیانت (۵) شراب (۶) سور (۷) مردار کی قیمت (۸) گانے بجانے والوں کی اجرت (۹) زنا کی اجرت (۱۰) جادوگری کی اجرت (۱۱) فال کھولنے کہانت کرنے کی اجرت (۱۲) رشوت کی آمدنی۔ امام حسین فرماتے ہیں کہ اگر تم اپنے مقروض کے گھر قرض کی بناء پر دعوت بھی کھاؤ تو حرام ہے کہ یہ سود ہے (تفسیر روح البیان) **آٹھواں فائدہ:** کسی کا پنچ بننا لازم نہیں اگر کوئی ہم کو پنچ بنانا چاہے تو ہم کو اختیار ہے کہ قبول کریں یا نہ کریں۔ یہ فائدہ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ سے حاصل ہوا۔ **نواں فائدہ:** حاکم وقت کو اپنی رعایا کے مقدمات طے کرنا ضروری ہے مگر غیر لوگوں کے مقدمات طے کرنا جو اس کی رعایا نہ ہوں ضروری نہیں اسے اختیار ہے کہ مقدمہ لے یا نہ لے۔ یہ فائدہ بھی اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔

مسئلہ: مفتی پر فتویٰ دینا، مبلغ پر تبلیغ کرنا بہر حال لازم ہے خواہ اپنے ملک کا آدمی فتویٰ مانگے یا غیر ملک کا یعنی مسئلہ بتانا ضروری ہے، لکھنا لازم نہیں۔ دیکھو یہ یہود خیبر کے رہنے والے تھے اس وقت تک خیبر فتح نہ ہوا تھا لہٰذا وہ حضور کی رعایا نہ تھے اور

بھرے گا اگر رہٹ پانی تقسیم کرے تو کھیت کو سینچ دے گا لیکن اگر بجلی کا ٹیوب ویل وہ ہی پانی تقسیم کرے تو زمین کے مربے ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ کنواں ایک پانی ایک خالق و مالک ایک مگر قاسموں کے فرق سے تقسیم میں فرق ہے۔ چراغ، گیس، بجلی، چاند، سورج سب ہی نور کے قاسم ہیں مگر ان میں جو فرق ہے وہ سب کو معلوم ہے سارے نبی اللہ کی نعمتوں کے قاسم تھے مگر حضور ﷺ قاسم اعلیٰ ہیں ان حضرات نے محدود وقت میں محدود قوموں کو نعمت الٰہیہ تقسیم فرمائیں۔ حضور ﷺ نے تا قیامت سارے عالم کو اللہ کی نعمتیں دیں پھر کنوئیں، دریا ہوتے ہوئے بھی بارش کی دعائیں کی جاتی ہیں۔ قاسم کے ہوتے ہوئے قاسم اعلیٰ کی تلاش ہوتی ہے یوں ہی دوسرے انبیاء کی امتوں نے بلکہ ان نبیوں نے حضور کی دعائیں مانگیں قاسم اعلیٰ کے آنے پر دوسرے قاسموں کی تقسیمیں بند ہو جاتی ہیں۔ بارش ہو جانے پر کنوؤں، نہروں، دریاؤں سے پانی نہیں لیا جاتا یوں ہی حضور کی تشریف آوری پر تمام نبوتیں منسوخ ہو گئیں بہر حال حضور رب کی نعمتوں کے قاسم اعلیٰ ہیں خود فرماتے ہیں اَللّٰهُ الْمُعْطِيْ وَاَنَا قَاسِمٌ۔ حضرات صحابہ کرام نے اس قاسم اعلیٰ سے ایسی نعمتیں حاصل کیں کہ خود قاسم بن گئے۔ جیسے بارش سے تالاب قاسم بن جاتے ہیں مگر منافقین اور یہ خیبر و فدک کے یہود نے اس قاسم اعلیٰ کی تقسیم سے حصہ نہ لیا۔ اس لئے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ انہیں پاک کرنے کا رب تعالیٰ نے ارادہ ہی نہ فرمایا ایسے محروم لوگ دنیا و آخرت میں خسارہ میں ہیں جو چمگادڑ سورج سے نور نہ لے سکے وہ چراغوں سے روشنی کیا لے گا ان کا حال یہ ہے کہ ان کے کانوں میں اپنے پوپ پادریوں کی آوازیں گونج رہی ہیں یہ آپ کی کیا سنیں ان کے پیٹوں میں حرام غذائیں بھری ہیں تو آپ کی صحبت سے فیض کیسے لیں۔ یار کا جلوہ شرک و شرکت سے پاک ہے ایک دل میں دو محبتیں ایک کان میں دو آوازیں ایک سینہ میں دو آرزوئیں کیسے جمع ہوں؟ حضور کا آستانہ تو وہ ہے کہ جسم اطہر پر یہ عام مکھی بھی نہیں بیٹھتی کہ یہ گندگیوں پر بیٹھنے کی عادی ہے پھر سید الطاہرین ﷺ کے جسم پاک پر کیسے بیٹھے یہ بھی گندگیوں پر بیٹھنے والی مکھیاں ہیں۔ آپ سے فیض کیسے لیں۔

اے بسا مرغے پرندہ دانہ جو ۔ کہ بریدہ حلق ادھم حلق او!
اے بسا ماہی در آبا دوردست ۔ گشتہ از حرص کلو ماخوذ شست
اے بسا قاضی و منبر نیک خو ۔ از کلولے رشوتے او زرد رو
بلکہ درہاروت و ماروت آں شراب ۔ از عروج چرخ شاں شد سدباب

رشوت، شہوت، حرص، طمع نے ہاروت و ماروت کے لئے آسمان پر جانے کا دروازہ بند کر دیا تو ان منافقوں یہودیوں کے لئے ان کی حرام خوری نے بارگاہ رسالت میں بھی حاضری کا دروازہ بند کر دیا۔ اب ان کے دل اس دربار میں نہیں آ سکتے۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ

اور کیسے حکم بنائیں گے وہ آپ کو حالانکہ ان کے پاس توریت ہے کہ اس میں حکم ہے اللہ کا

دادرسی حضور نے فرمائی جس کے متعلق بہت احادیث ہیں۔ رب فرماتا ہے: لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان:۱) مگر حکم کبھی کبھی کسی کسی کے بنا کرتے تھے۔ اس موقعہ پر بھی یہود وخیبر کے حضور حکم تھے۔ حکم بننے نہ بننے کا حضور کو اختیار دیا گیا تھا۔ آج بھی اعلیٰ سے اعلیٰ حکام کبھی کسی خاص موقعہ پر فریقین کے حکم یعنی پنچ بن جاتے ہیں یعنی اے محبوب! تعجب کی بات ہے کہ اپنی مانی جانی پہچانی توریت کا حکم تو نہیں مانتے اور آپ کو یہ مانتے نہیں پھر کیسے اپنا حکم بناتے ہیں یا اے محبوب! یہ آپ کو اپنا حکم کیسے بنا سکتے ہیں حالانکہ یہ نہ مسلمان ہیں نہ آپ کے ذمی رعایا نہ آپ کو سچا نبی مانتے ہیں، آپ کی ہر بات کو غلط جانتے ہیں لہٰذا یہ آپ کو حکم نہیں بناتے بلکہ حکم توریت سے بچنے کے لئے بہانہ بناتے ہیں ان کا ظاہر کچھ ہے باطن کچھ اور وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ یہ عبارت يُحَكِّمُوْنَ کے فاعل سے حال ہے۔ عِنْدَهُمْ خبر مقدم ہے اور التَّوْرٰىةُ مبتداء موخر اور یہ عبارت حصر کا فائدہ دیتی یا التَّوْرٰىةُ فاعل ہے ثبت فعل پوشیدہ کا عِنْدَهُمْ عندم اس کا ظرف۔ اگر تورات فاعل ہے تو فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ تورات کا حال ہے ورنہ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ نیا جملہ ہے (روح المعانی) یعنی آپ کو یہ پنچ کیسے بنا سکتے ہیں حالانکہ ان کے پاس توریت ہے جس میں اللہ کا حکم یعنی زانیوں کو سنگسار کرنے کی سزا موجود ہے اور یہ لوگ توریت کے ماننے کے دعوے دار بھی ہیں پھر توریت کو چھوڑ کر آپ کے پاس کیسے آتے ہیں۔ خیال رہے کہ ان لوگوں کے پاس اگرچہ تحریف شدہ توریت تھی مگر رجم کی آیات بعینہٖ اس میں باقی تھیں وہ نکالی نہ گئی تھیں۔ ان آیات پر ان لوگوں نے عمل چھوڑ دیا تھا اس لئے یہاں ارشاد ہوا فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ اور بہت سی اصلی آیات موجود تھیں اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ موجودہ توریت کی آیتوں کا نہ اقرار کرو نہ انکار بلکہ یوں کہہ دو کہ ہم اللہ کی ساری آیتوں پر ایمان لائے۔ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یہ جملہ معطوف ہے يُحَكِّمُوْنَكَ پر اور ثُمَّ رتبہ کی تراخی کے لئے ہے نہ کہ زمانہ کی تراخی کے لئے يَتَوَلَّوْنَ بمعنی مستقبل ہے یہ بنا ہے قول سے جس کا مادہ ولی بمعنی قرب ہے۔ باب تفعل سلب مادہ کے لئے ہے یعنی قریب نہ ہونا دور ہو جانا۔ اب منہ پھیرنے قبول نہ کرنے یا انکار کرنے کو تَوَلّٰی کہا جاتا ہے کہ ان چیزوں سے انسان اس سے دور ہو جاتا ہے۔ ذٰلِكَ سے اشارہ ہے تحکیم کی طرف یعنی یہ لوگ آپ کو حکم بنانے کے بعد آپ کے حکم سے پھر جائیں گے اسے قبول نہ کریں گے کیونکہ یہ ماننے کے لئے آپ کو حکم نہیں بنا رہے ہیں بلکہ اپنی رائے کی تائید کے لئے آپ کو آڑ بنانا چاہتے ہیں یہ تفسیر قوی ہے بعض نے فرمایا کہ یہ جملہ علیحدہ ہے اور يَتَوَلَّوْنَ حال کے معنی میں ہے یعنی یہ لوگ اس توریت کے ہوتے ہوئے حکم توریت سے پھر جاتے ہیں اسے نہیں مانتے تو آپ کا حکم کیا مانیں گے وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ یہ جملہ نیا ہے واؤ ابتدائیہ ہے اُولٰٓئِكَ سے اشارہ انہیں حاضرین یہود کی طرف سے ہے چونکہ وہ دل سے حضور انور سے دور تھے اگرچہ جسماً قریب تھے۔ اس لئے اُولٰٓئِكَ اشارہ بعید ارشاد ہے۔ مؤمنین سے مراد توریت پر ایمان لانے والے یا حضور پر ایمان لانے والے ہیں یا آپ کا فیصلہ ماننے والے یعنی یہ لوگ توریت کے ماننے والے نہیں اپنی رائے کے متبع ہیں یا یہ لوگ آئندہ بھی آپ پر ایمان نہ لائیں گے کافر ہی مریں گے یا یہ لوگ آپ کا یہ فیصلہ نہ مانیں گے آخری دو صورتوں میں یہ غیبی خبر ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: قرآن کریم نے یہاں فرمایا کہ یہود کے پاس توریت ہے دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ یہود نے توریت میں تحریف کر دی یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (النساء: ۴۶)ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔ جب وہ توریت مسخ کر چکے تو ان کے پاس توریت رہی ہی نہیں۔

جواب: یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ان کے پاس بالکل درست غیر محرف توریت ہے اگر یہ فرمایا جاتا تب تعارض ہوتا یہاں محرف توریت کے موجود ہونے کا ذکر ہے جس میں کچھ اصلی تھی کچھ مسخ شدہ لہٰذا آیات میں تعارض نہیں۔

دوسرا اعتراض: یہاں ارشاد ہوا کہ اس توریت میں اللہ کا حکم ہے حالانکہ اس میں بہت سے احکام تھے پھر حکم واحد کیوں ارشاد ہوا۔ **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ حکم اللہ اسم جنس ہے جس میں ایک اور زیادہ سب شامل ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ یہاں حکم اللہ سے مراد رجم کا حکم ہے جس میں یہود ابھی تک ترمیم نہ کر سکے تھے آیت رجم بعینہ موجود تھی مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ رجم کا فتویٰ آپ سے لینے کیوں آئے، یہ فتویٰ تو توریت میں موجود ہے اس پر عمل کیوں نہیں کرتے، آپ کے تو یہ لوگ معتقد نہیں توریت کے معتقد ہونے کے مدعی ہیں۔

تیسرا اعتراض: یہاں رب تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ یہ یہود مومن نہیں مومن لغوی معنی میں ہے یا اصطلاحی معنی میں۔ **جواب:** دونوں معنی ہو سکتے ہیں یعنی یہ لوگ مرتے دم تک مومن نہ ہوں گے، کافر ہی مرے گے یہ اصطلاحی معنی ہوئے اور اس میں غیبی خبر ہے یا یہ لوگ توریت کے ماننے والے نہیں صرف دعویٰ ایمان کرتے ہیں یا یہ معنی ہیں کہ یہ لوگ آپ کے فیصلہ پر ایمان نہ لائیں گے صرف سیاسی طور پر آپ کو حکم بناتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

آنکھ صدہا چیزیں دیکھ سکتی ہے، کان صدہا چیزیں ہزاروں آوازیں سن سکتے ہیں، ایک زبان ہزارہا الفاظ بول سکتی ہے مگر ایک دل میں دین و دنیا دونوں کی محبتیں نہیں رہ سکتیں دل اس میان کی طرح ہے جس میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں اس گھر میں دوئی کی گنجائش ہی نہیں جہاں اور جس دل میں محبت دنیا ہے اس میں دین کی محبت کیسے آوے۔ یہود کے پاس توریت تھی ان کے دل میں توریت نہ تھی، ہوتی بھی کیسے ان کے دل میں تو حسد، کینہ، بغض انبیاء تھا اس لئے رب تعالیٰ نے فرمایا وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ اور آگے فرمایا فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ جس سے معلوم ہوا کہ توریت میں تو رجم کا حکم تھا مگر ان کے دلوں میں توریت نہ تھی کسی کے پاس کتاب ہونا کمال نہیں۔ کمال ہے دل میں کتاب ہونا۔ اس وجہ سے رب تعالیٰ نے فتویٰ دیا کہ وہ مومن نہیں۔ غذا پانی پاس رکھا رہے نہ بھوک دفع ہوگی نہ پیاس جب یہ چیزیں پیٹ میں اتریں گی تب بھوک و پیاس کو دفع کریں گی۔ یوں ہی کتاب اللہ پاس رکھی ہے دل کا کفر دفع نہ ہوگا جب تک دل میں کتاب نہ اتر جاوے۔ یہ بھی خیال رہے کہ کتاب اللہ خود دل میں نہیں اترتی بلکہ نبی کی نگاہ کرم یا نبی کے نائبین کا بازوئے رحمت کتاب اللہ کو دل میں اتارتا ہے۔ صابن اور پانی خود بخود کپڑا صاف نہیں کرتے نہ کپڑے میں لگتے ہیں جب تک کہ کوئی ہاتھ کام نہ کرے ان یہودیوں کے پاس کتاب اللہ تھی مگر کوئی ید اللہ ان کے سر پر نہ تھا اس لئے کافر کے کافر رہے۔

کے لئے آپ سے فیصلہ کراتے ہیں ان کا ظاہر کچھ اور ہے باطن کچھ اور اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ تو توریت کو بھی دل سے نہیں مانتے اسے اپنی رائے کے مطابق بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو دل سے کیسے مانیں گے حالانکہ توریت کی ایسی اعلیٰ شان ہے۔

تیسرا تعلق: پچھلی آیت کریمہ میں فرمایا گیا تھا کہ یہود کے پاس توریت ہے اور توریت میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے یعنی زانی کو سنگسار کرنا اب توریت شریف اور اس کے احکام کی عظمتوں کا ذکر ہے گویا توریت کے نزول کے بعد اس کی عظمت کا ذکر فرمایا گیا۔

شان نزول

اگلی تین آیتوں میں تین مقام پر تین عتاب فرمائے گئے۔ چنانچہ اس آیت کے آخر میں ہے وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ۔ دوسری آیت کے آخر میں فرمایا گیا وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (مائدہ: ۴۵) تیسری آیت کے آخر میں ارشاد ہوا وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (مائدہ: ۴۷) بعض مفسرین نے فرمایا کہ تینوں عتاب یہود پر ہیں ان کے تین حالات کے لحاظ سے ان پر تین طرح عتاب فرمایا گیا۔ کافر، ظالم، فاسق، فرما کر۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ پہلے دو عتاب یہود پر نازل ہوئے اور تیسرا عتاب عیسائیوں پر کیوں وہاں انجیل شریف کا ہی ذکر ہے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ پہلا عتاب تمام مشرکین و کفار پر ہے دوسرا عتاب یہود کے متعلق نازل ہوا۔ تیسرا عتاب عیسائیوں کے متعلق نازل ہوا (تفسیر خازن و روح المعانی) تفسیر خازن نے فرمایا کہ یہ آیات بھی اس واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں جب کہ یہود خیبر نے حضور ﷺ کو حکم بنا کر زنا کی سزا کا فیصلہ حضور سے کرانا چاہا تھا (خازن)

تفسیر

اس آیت کریمہ میں توریت شریف کے چھ صفات بیان ہوئے۔ اسے ہم نے اتارا، اس میں ہدایت ہے، اس میں نور ہے، اس پر حضرات انبیاء و مشائخ و علماء فیصلے کرتے رہے، اس کی حفاظت نبیوں، بزرگوں، علماء کے ذمہ کی گئی۔ یہ حضرات اس کے شہداء و ذمہ دار رہے اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ چونکہ توریت شریف کا نزول یک دم ہوا تھا۔ قرآن مجید کی طرح آہستگی سے نہ ہوا اس لئے اَنۡزَلۡنَا باب افعال سے فرمایا گیا۔ نزول قرآن تین بار ہوا ایک تو لوح محفوظ سے آسمان دنیا کے بیت العزت تک یہ نزول ستائیسویں رمضان کی شب میں ہوا۔ یعنی شب قدر میں ہوا دوسرا نزول ہر رمضان میں حضور انور پر ہوتا تھا کہ جبرئیل امین حضور کے ساتھ قرآن کا دور فرماتے تھے۔ تیسرا نزول تئیس سال میں آہستہ آہستہ یہ نزول احکام جاری فرمانے کے لئے تھا۔ پہلے نزول کے لحاظ سے قرآن کریم کے لئے اَنۡزَلۡنَا آتا ہے۔ بقیہ کے لحاظ سے نَزَّلۡنَا ارشاد ہوتا ہے توریت کے معانی ہم پہلے پارہ میں عرض کر چکے ہیں کہ اگر یہ لفظ عربی ہے تو بنا ہے تورية سے بمعنی اشارہ کنایہ، رموز کی باتیں کرنا۔ چونکہ توریت شریف میں اکثر آیات رمز اشارہ کنایہ کے طور پر تھیں۔ قرآن کریم کی طرح صاف صاف نہ تھیں اس لئے اسے توریت کہتے ہیں۔ خیال رہے کہ آیات توریت کے لئے شان نزول نہیں کیونکہ وہ ساری یک دم آئی۔ آیات قرآنیہ کے شان نزول ہوتے ہیں کہ فلاں صحابی کے فلاں واقعہ پر یہ آیت آئی تا کہ ان صحابہ کا احسان سارے مسلمانوں

اس قوم کو کہا گیا هَادُوْا کیونکہ یہ قوم یہودی کہلاتی تھی حضرات انبیاء یہودی نہیں کہلاتے تھے جیسے حضور ﷺ کی امت مسلمان کہلاتی ہے حضور ﷺ کو مسلمان نہیں کہتے وہ تو مسلمان بنانے والے ہیں وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ۔ یہ عبارت معطوف ہے النَّبِيُّوْنَ پر اور يَحْكُمُ کا فاعل ہے الرَّبّٰنِيُّوْنَ جمع ہے ربانی کی بمعنی اللہ والے اور احبار جمع حبر کی جس کے معنی ہیں اچھی چیز۔ خوب صورت نقش یا وہ خوشی جس کا اثر چہرے پر ظاہر ہو جاوے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ (روم:۱۵) ربانی سے مراد ہے عابدین لوگ یعنی اولیاء اللہ اور احبار سے مراد ہیں فقہاء و علماء اہل کتاب یا ربانی سے مراد ہے عام علماء اور احبار سے مراد ہیں ان کے مجتہدین علماء یا ربانیون سے مراد ہیں عادل منصف بادشاہ و حکام اور احبار سے مراد ہیں علماء یہود چونکہ اصل حاکم حضرات انبیاء کرام ہوتے تھے اور اولیاء اللہ، علماء، حکام ان کے تابع ہو کر حاکم ہوتے تھے اس لئے پہلے حضرات انبیاء کرام کا ذکر ہوا پھر ان اولیاء، علماء کا بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ۔ اس عبارت کا تعلق يَحْكُمُ سے ہے ب سبب یا وجہ کی ہے اسْتُحْفِظُوْا کا نائب فاعل ربانیین اور احبار ہیں۔ من زائدہ ہے۔ کتاب اللہ سے مراد توریت شریف ہے جس کا ذکر ابھی ہوا یعنی یہ مشائخ و علماء و سلاطین و حکام اس لئے توریت سے فیصلے کرتے تھے کہ ان سب کو حضرات انبیاء کرام کی طرف سے کتاب اللہ یعنی توریت کا محافظ بنایا گیا تھا ان میں سے ہر ایک پر یہ فرض تھا کہ توریت کی حفاظت کرے اس کے الفاظ، معانی، احکام میں تبدیلی نہ آنے دے۔ یہ فرق ہے قرآن و توریت میں کہ قرآن کریم کی حفاظت خود رب تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لے لی اور ان کتب کی حفاظت مخلوق کے ذمہ رکھی اس کا اثر یہ ہوا کہ قرآن کریم محفوظ رہا اور وہ کتب بدل گئیں وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ یہ عبارت معطوف ہے۔ اسْتُحْفِظُوْا پر اور كَانُوْا کا اسم وہ ہی ربّنیین اور احبار ہیں۔ عَلَيْهِ کا مرجع کتاب اللہ یعنی توریت شریف ہے۔ شُهَدَآءَ جمع ہے شہید کی بمعنی رقیب و محافظ و ذمہ دار یہاں شہید بمعنی گواہ نہیں۔ اس لئے یہاں علیہ ارشاد ہوا جیسے وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ:۱۴۳) (روح المعانی و بیان وغیرہ) یعنی یہ علماء و صالحین توریت شریف کے محافظ و نگران مقرر کیے گئے تھے جانب انبیاء کرام سے فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ یہ جملہ ایک پوشیدہ شرط کی جزاء ہے یعنی جب توریت کی شان یہ ہے تو اس میں خطاب موجودہ علماء یہود کو ہے جو لوگوں کے ڈر اپنی آمدنی کم ہو جانے کے خوف سے احکام توریت لوگوں پر جاری نہیں کرتے تھے، انہیں بدلتے تھے یعنی جب اس توریت شریف کی یہ شان ہے تو اے علماء یہود! تم لوگوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو، توریت کے احکام صحیح صحیح بیان کر دو۔ خوف، خشیت، وقی کے معنی ان میں فرق ہم بارہا بیان کر چکے ہیں۔ مخلوق سے خوف چند قسم کے ہیں بعض خوف کفر ہیں، بعض خوف حرام، بعض خوف مباح، بعض خوف عین ایمان ہیں ان مختلف خوفوں کا مختلف آیات میں ذکر ہے کہیں فرمایا کہ مخلوق سے خوف کرو، کہیں ہے نہ کرو، کہیں ہے کہ اولیاء اللہ کو خوف نہیں، کہیں ہے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے خوف ہوا۔ مخلوق کا وہ خوف جو ایمان سے روکے وہ کفر ہے جو فرائض و واجبات سے روکے وہ حرام ہے جیسے ڈیوٹی کے خوف سے نماز نہ پڑھے یہ خوف کہ میرا ایمان دولت ہے کہیں اسے شیطان یا برے ساتھی چھین نہ لیں۔ اس لئے بد مذہبوں کی صحبت، ان کے وعظوں، ان کی کتابوں سے بچے یہ خوف ایمان بلکہ

آخرت ہے یہ تو قیمت ہے جس سے آخرت حاصل کی جاوے اس کے ساتھ ہی تھوڑی بھی ہے کہ اسے فنا ہے فانی چیز کتنی بھی ہو تھوڑی ہے۔ خیال رکھو کہ جو عالم، حاکم یا کوئی اور اللہ کے اتارے ہوئے احکام جاری نہ کرے انہیں چھپائے یا انہیں بدلے وہ مطلقاً کافر ہے تم چندروزہ زندگی کے لئے ایمان چھوڑ کر کافر کیوں ہوتے ہو۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** توریت شریف بہت شاندار کتاب ہے اس میں عقائد، احکام سب کچھ ہیں بہت سے انبیاء کرام اس کے مبلغ رہے۔ قرآن مجید کے بعد توریت کی ہی شان ہے، اسی کا درجہ ہے۔ پہلی آسمانی کتاب توریت ہے، آخری کتاب قرآن مجید ہے اور کسی کتاب کو یہ شرف حاصل نہ ہوا کہ حضرات انبیاء کرام اس کے عامل و مبلغ ہوں یہ توریت شریف کی خصوصی شان ہے۔ **دوسرا فائدہ:** ہر نبی پر کتاب الٰہی نہ آئی۔ دیکھو سلسلہ انبیاء حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا مگر پہلی کتاب توریت موسیٰ علیہ السلام پر آئی۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام سے پہلے انبیاء کرام صاحب کتاب نبی نہ تھے۔ بعض پر صحیفے اترے تھے نیز حضرات انبیاء کرام قریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں اور آسمانی کتب چار اگر ہر نبی پر نئی کتاب آتی تو کتابیں بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار ہی آتیں۔ یہ فائدہ **یَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ** سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** توریت یا زبور یا انجیل کے احکام اگر قرآن مجید میں بغیر تردید ذکر فرمائے جاویں تو ہمارے لئے بھی واجب العمل ہیں (تفسیر ابو سعود)۔ یہ فائدہ بھی **یَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ** سے حاصل ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** کتاب الٰہی کی حفاظت کرنا علماء پر فرض ہے یہ فائدہ **بِمَا اسْتُحْفِظُوْا** سے حاصل ہوا۔ چنانچہ الفاظ قرآن کی حفاظت کے لئے حفاظ، طریقہ تلاوت کی حفاظت کے لئے قرأ، معانی و احکام قرآن کی حفاظت کے لئے علماء، اسرار و رموز قرآن کی حفاظت کے لئے صوفیاء مقرر فرمائے گئے۔ **پانچواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے گزشتہ آسمانی کتب کی حفاظت اپنے ذمہ کرم پر نہ لی تھی بلکہ بندوں کے سپرد فرمائی تھی اس لئے وہ بگڑ گئیں فنا ہو گئیں۔ قرآن کریم کی حفاظت خود اس کریم نے اپنے ذمہ کرم پر لی ہے۔ فرمایا: **وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (حجر:۹) اس لئے قرآن کریم کا ایک نقطہ بھی نہ بدلا۔ یہ فائدہ بھی **بِمَا اسْتُحْفِظُوْا** سے حاصل ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** ربانی مشائخ اور علماء دین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑے ہی مرتبہ والے ہیں کہ رب تعالیٰ نے انہیں ہی حفاظت دین حفاظت کتب الٰہیہ کے لئے منتخب فرمایا جنہوں نے یہ فرض ادا کیا ان کی شان ہمارے وہم و گمان سے وراء ہے۔ یہ فائدہ بھی **بِمَا اسْتُحْفِظُوْا** سے حاصل ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** جو عالم یا حاکم شرعی احکام کو غلط سمجھے، مروجہ قوانین کی تحریفیں کرے یوں ہی جو کہے کہ قرآنی قوانین اس زمانہ کے لئے تھے اب نیا زمانہ ہے نئے قوانین چاہئیں یا کہیں کہ چور کے ہاتھ کاٹنا زانی کو رجم کرنا ظلم ہے وہ کافر ہے۔ یہ فائدہ **فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ** سے حاصل ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** رشوت لے کر حکم شریعت بدلنا غلط فتویٰ دانستہ دینا کفر ہے، طریقہ یہود ہے۔ یہ فائدہ **لَا تَشْتَرُوْا** الخ سے حاصل ہوا۔ **نواں فائدہ:** دنیا اور سامان دنیا کتنا بھی زیادہ ہو مگر ہے تھوڑا۔ یہ فائدہ **ثَمَنًا قَلِيْلًا** سے حاصل ہوا۔ دنیا ثمن ہے اور قلیل ہے۔ **دسواں فائدہ:** رب تعالیٰ کے مقابلہ میں مخلوق سے ڈرنا مخلوق کے خوف سے دین

دوسرا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ گزشتہ انبیاء کرام توریت کے احکام جاری فرماتے تھے ان کے پاس اپنی کتب نہ تھیں۔ انہیں رب تعالیٰ نے آسمانی کتابیں عطا نہ فرمائیں مگر دوسری آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام نبیوں کو آسمانی کتابیں عطا ہوئیں۔ چنانچہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (آل عمران: ۱۸۴) ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔ **جواب:** تمہاری پیش کردہ آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ہر رسول کو نئی کتاب ملی تھی وہ حضرات کتاب والے ہو کر آئے خواہ نئی کتاب والے خواہ پرانی کتاب پر عامل بن کر۔ رب تعالیٰ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد فرماتا ہے: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ: ۱۲۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسلمان کو نئی کتاب نہیں سکھاتے سب کو ایک ہی کتاب قرآن مجید سکھاتے ہیں نیز اس آیت کریمہ کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ آپ سے پہلے ان رسولوں کو جھٹلایا گیا تھا جو صاحب کتاب تھے یعنی حضرت موسیٰ و داؤد و عیسیٰ علیہم السلام۔

تیسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ توریت پر تین جماعتوں نے عمل کیا۔ انبیاء، اولیاء، علماء لہٰذا چاہیے کہ حضور کے بعد نبی آویں تاکہ قرآن پر بھی یہ تین جماعتیں عمل کریں۔ اگر اب نبوت نہ رہے تو قرآن کا درجہ توریت سے گھٹ جاوے گا کہ توریت پر عمل تین جماعتوں کا اور قرآن پر عمل صرف دو کا یعنی اولیاء و علماء کا۔ نبوت اچھی چیز ہے تو چاہیے کہ کبھی ختم نہ ہو اچھی چیز باقی رہنی چاہیے (مرزائی) **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں۔ الزامی اور تحقیقی۔ جواب الزامی تو یہ ہے کہ اگر مرزا جی نبی ہوں تو تب بھی قرآن کا درجہ توریت سے کم ہی رہے گا کیونکہ توریت والے عمل کرنے والے ہزار ہا نبی اور قرآن پر عمل کرنے والے صرف ایک نبی یعنی مرزا جی وہ بھی تیرہ سو برس کے بعد۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ قرآن پر ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل سارے نبیوں کے عمل سے افضل ہے کیونکہ حضور تمام نبیوں سے افضل ہیں پھر قرب قیامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام نبیوں کے نمائندے ہو کر سب کی طرف سے قرآن پر عمل کریں گے۔ نیز معراج کی رات سارے نبی اسلامی نماز حضور کے پیچھے پڑھ گئے گویا سب نے قرآنی نماز پڑھی۔ رات میں چاند، تارے، بجلی، گیس، چراغ اچھی چیزیں ہیں مگر دن میں یہ سب بیکار ہیں کیونکہ سورج چمک رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام نبوتیں اچھی تھیں اب آفتاب نبوت چمک رہا ہے کسی اور چراغ کی ضرورت نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تا قیامت سب کو کافی ہے۔

چوتھا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ آیات الٰہیہ کو فروخت کرنا ممنوع و حرام ہے تو تعویذ پر اجرت لینا، تعلیم قرآن پر تنخواہ لینا حرام ہونا چاہیے حالانکہ ہمارے صوفیاء، علماء ان پر اجرت و تنخواہ لیتے ہیں یہ عمل کیوں جائز ہوا؟ **جواب:** اس کا تفصیلی جواب پارہ الم میں دیا جا چکا ہے اور ابھی تفسیر میں بھی کچھ عرض کر دیا گیا کہ آیات کو فروخت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ روپیہ لے کر آیات کے احکام بدل دیئے جاویں۔ تعویذ ایک قسم کا روحانی علاج ہے علاج کی اجرت لینا جائز ہے۔ حضرات صحابہ کرام نے ایک سانپ کاٹے ہوئے پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کر دی اس پر تیس بکریاں اجرت وصول کی سب نے بکریاں کھائیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا تو حضور انور نے اسے جائز فرمایا بلکہ خود بھی اس گوشت کا بقیہ

اپنے نور سے ملتی ہے۔ ہمارے حضور نزول قرآن سے پہلے نمازی وغیرہ تھے۔

تفسیر صوفیانہ

کتاب الٰہی میں ہدایت بھی ہوتی ہے نور بھی ہدایت دماغ کے ذریعہ تمام جسم کو ملتی ہے مگر نور کا مقام مومن کا دل ہے، کتاب کا نور دل میں ہی پہنچتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ توریت میں ہدایت بھی ہے نور بھی ہدایت راہ دکھاتا ہے نور راہ منور کر کے چمکا کر اس پر چلاتا ہے مگر یہ ہدایت اور نور دماغ و دل میں جب پہنچتے ہیں جب کہ نبی کا دست کرم وہاں پہنچائے ورنہ گدھے پر دفتر رکھ دو بیکار ہے کہ وہاں جسم پر کتابیں پہنچیں دل و دماغ تک نہ پہنچیں اس لئے ارشاد ہوا۔ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الخ صوفیاء فرماتے ہیں کہ ہر نبی مسلم ہیں مطیع ہیں مگر جیسی ہستی ویسی اطاعت وہ حضرات سراپا اطاعت الٰہیہ ہیں لہٰذا سراپا ہدایت ہیں بڑے خزانہ کی حفاظت کے لئے بڑا مضبوط قفل درکار ہے چونکہ وہ کتب الٰہیہ قیمتی خزانہ تھیں اس لئے ان کی حفاظت کے لئے حضرات انبیاء و مشائخ و علماء مقرر فرمائے گئے۔ رب نے فرمایا: بِمَا اسْتُحْفِظُوْا۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ جس دنیا میں سے دین نکل جاوے وہ اس مردار کی طرح ہے جس میں سے جان نکل جاوے وہ اگرچہ کتنا ہی موٹا تازہ ہو اس کی قیمت کچھ نہیں نہ تو اس کی قیمت ہے نہ وہ کسی کی قیمت۔ مولانا فرماتے ہیں

این جہاں جیفہ است مردار و رخیص ۔۔۔ برچنیں مردار چوں ہاشم حریص
پس حیات ما است موقوف خطام ۔۔۔ اندک اندک جہد کن تَمَّ الْكَلَامَ

اور جو دنیا دین کے ساتھ ہے وہ قیمتی بھی ہے اور آخرت کی قیمت بھی مگر آخرت کو دنیا کے عوض نہ بیچو بلکہ دنیا کے ذریعہ آخرت خریدو جو کوئی اپنے متعلق بِمَا أَنْزَلَ اللهُ کے خلاف کرے۔ حکم الٰہی کو چھوڑ کر نفس کے حکم پر چلے وہ ہماری اصطلاح میں کافر ہے۔ رب سے غفلت کفر ہے۔ بیداری ایمان

اہل دنیا کافران مطلق اند! ۔۔۔ روز و شب در زق زق و در بک بک اند
چیست دنیا از خدا غافل بدن! ۔۔۔ نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ

اور لکھا ہم نے او پر ان کے اس توریت میں کہ بیشک جان بدلہ جان کے ہے اور آنکھ بدلے آنکھ کے

اور ہم نے توریت میں ان پر واجب کیا کہ جان کے بدلہ جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ

وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ

اور ناک عوض ناک کے اور کان بدلہ کان کے اور دانت بدلے دانت کے

اور ناک کے بدلہ ناک اور کان کے بدلہ کان اور دانت کے بدلہ دانت

وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ

اصطلاحی معنی میں ہے تب تو اس کے معنی ظاہر ہیں کہ فرض فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اگر لغوی معنی میں ہے یعنی بمعنی لکھنا تو اگر چہ تختیوں میں توریت لکھنے والے فرشتے تھے مگر چونکہ وہ تحریر اللہ تعالیٰ کے اس حکم اس کے فرمان سے تھی لہٰذا حقیقۃً فاعل رب تعالیٰ ہی تھا یا چونکہ اللہ کے مقبول بندوں کا کام گویا رب تعالیٰ کا ہی کام ہے لہٰذا كَتَبْنَا ارشاد ہوا جب بندے کو رب تعالیٰ سے قرب بہت ہوتا ہے تو بندہ کا کام رب تعالیٰ کا کام ہوتا ہے اور رب تعالیٰ کا کام بندہ کا کام بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو رب کی بیعت قرار دیا گیا اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (فتح: ۱۰) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بہ حکم پروردگار میں مردے زندہ کرتا ہوں، میں بیماروں کو شفا دیتا ہوں۔ اسی قاعدے سے یہاں ارشاد ہوا کہ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ۔ عَلَيْهِمْ کی ضمیر یہود کی طرف راجع ہے جن پر توریت کے احکام ماننا فرض تھا۔ فِيْهَآ کا مرجع توریت شریف ہے۔ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ یہ پورا جملہ كَتَبْنَا کا مفعول بہ ہے۔ قرآن مجید میں نفس کئی معنی میں ارشاد ہوا ہے۔ ذات لَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ (مائدہ: ۱۱۶) جان مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ (مائدہ: ۳۲) دل جیسے فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ (مائدہ: ۳۰) نفس امارہ، نفس مطمئنہ، نفس لوامہ یہاں بمعنی جان ہے بمعنی ذات ہو تو مذکر ہے اور بمعنی جان و روح ہو تو مؤنث اس کی ہ تصغیر بہرحال نفیسہ آتی ہے (روح المعانی) یہاں دونوں معنی کا احتمال ہے بِالنَّفْسِ سے پہلے مقتولہ یا مقتول پوشیدہ ہے اور نفس سے مراد مطلق نفس و ذات انسانی ہے مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، بالغ ہو یا نابالغ، مومن ہو یا کافر البتہ اگر مومن کسی کافر حربی کو مار دے تو قصاص نہیں جہاد میں کفار مسلمانوں کے ہاتھوں مارے ہی جاتے ہیں۔ **خیال رہے:** کہ یہ عبارت مجمل ہے اس کی تفصیل حدیث شریف نے کی، جان کا قصاص جب لیا جاتا ہے جب کہ چار شرطیں پائی جاویں انسانی جان کو قتل کرے، ناحق قتل کرے، ظلماً قتل کرے، عمداً قتل کرے۔ لہٰذا بھیڑ بکری وغیرہ جانوروں یوں ہی جنات کے قتل میں قصاص نہیں کہ یہ انسانی جان نہیں اور کافر حربی یا ڈاکو کے قتل میں قصاص نہیں کہ یہ قتل ناحق نہیں حملہ آور یا چور کو مار دینے میں قصاص نہیں کہ یہ قتل ظلماً نہیں بلکہ دفع ظلم کے لئے ہے۔ خطاء یا شبہ سے قتل کرنے میں قصاص نہیں کہ یہ قتل عمداً نہیں۔ بہرحال قرآن کی کسی آیت پر بغیر حدیث شریف کی مدد کے عمل ناممکن ہے۔ النفوس، النَّفْسَ بِالنَّفْسِ دونوں کو واحد فرمانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایک جان کے عوض ایک جان یعنی صرف قاتل ہی کو قتل کیا جاوے گا۔ بنی نضیر بنی قریظہ سے اپنے مقتول کا بدلہ ڈبل لیتے تھے کہ اپنے ایک مقتول کے عوض ان کے دو کو قتل کرتے تھے۔ اس فرمان عالی میں ان کے اس عمل کی تردید ہے (تفسیر احمدی) نیز اگر ایک شخص چند آدمیوں کو مار دے تو ان سب مقتولوں کے عوض صرف اس ایک قاتل ہی کو قتل کیا جاوے۔ یہ بھی اشارہ ہے کہ قاتل کو مقتول کے عوض قتل ہی کیا جاوے گا خواہ وہ کسی طرح مقتول کو مارے، نوعیت قتل میں برابری شرط نہیں یہاں تک تو جان کے قصاص کا ذکر ہوا وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ یہ اعضاء کے قصاص کا ذکر ہے چار اعضاء کے قصاص کا ذکر ہو رہا ہے پہلا عضو آنکھ ہے اگر کوئی ظالم کسی کی آنکھ پر ایسی چوٹ مارے کہ آنکھ تو قائم رہے مگر اس کی روشنی جاتی رہے تو اس ظالم کی آنکھ کی روشنی زائل کر دی جائے گی کہ اس کی آنکھ پر بھیگی روئی رکھ کر اس پر گرم شیشہ پھیر دیا جاوے گا۔ حضرات صحابہ کرام نے یہ ہی عمل کیا ہے، وہ وہ

حکم دینے والوں کی سزا کا ذکر ہے مَنْ سے مراد وہ حکام یا علماء ہیں جو ان احکام قصاص کو غلط سمجھیں اور مروجہ قوانین کو درست سمجھ کر انہیں جاری کریں یعنی جو بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ ظالم ہے کافر ہے یہاں ظلم بمعنی کفر ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (بقرہ: ۲۵۴) اور فرماتا ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان: ۱۳)۔

خلاصہ تفسیر

توریت وغیرہ آسمانی کتابوں میں عبادات، معاملات، سیاسیات تمام چیزوں کے احکام تھے مگر سیاسیات بہت اہم تھے کہ ان سے عالم کا نظام ملک کا انتظام قائم ہے اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوا کہ یہود نے توریت کے سیاسی احکام بھی بدل ڈالے تو معاملات وعبادات کا کیا پوچھنا چنانچہ فرمایا گیا کہ اے محبوب ﷺ ہم نے ان اسرائیلیوں پر توریت میں یہ لازم فرمایا تھا کہ ایک جان کی عوض ایک جان کو قتل کرو یعنی ظالم قاتل کو اور آنکھ کے عوض آنکھ پھوڑو ناک کے عوض ناک کاٹو، کان کے عوض کان کاٹو اور دانت کے عوض دانت نکالو ان کے علاوہ تمام قابل قصاص زخموں کا قصاص ہے مگر چونکہ یہ حق العبد ہے اس لئے قانون یہ ہے کہ اگر مقتول کے ورثا یا مقطوع خود اپنے ظالم کو قصاص معاف کردیں تو یہ معافی قاتل وقاطع کا کفارہ بن جاوے گی کہ اس معافی سے نہ اس ظالم پر قصاص رہے گا نہ گناہ حکم توریت تو یہ تھا۔ ان اسرائیلیوں نے اس قصاص میں ایسی گڑبڑ کی کہ معاذ اللہ عورت ومرد کے درمیان قصاص ختم کردیا۔ ایک شریف مقتول کے عوض دو دو آدمی مارنے لگے اور غریب ذلیل مقتول کا قصاص ہی اڑا دیا جیسے ان لوگوں نے رجم وغیرہ سزاؤں میں بہت ترمیم وتبدیلی کردی۔ اس سے بڑھ کر قصاص کے احکام میں ہیر پھیر کر ڈالا جو حاکم جو پوپ پادری جو شخص بھی اللہ کے اتارے ہوئے احکام نافذ نہ کرے اسے غلط سمجھے وہ پکا ظالم وکافر ہے۔ خواہ حاکم ہو یا شیخ یا عالم یا پوپ وپادری یا نبی زادہ غرضکہ کوئی ہو وہ اس انکار سے کافر ہوگا۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** گزشتہ کتابوں کے جو احکام قرآن پاک میں بغیر تردید اور بغیر اظہار ناراضگی نقل ہوں وہ ہمارے لئے بھی قابل عمل ہیں۔ یہ فائدہ وَكَتَبْنَا عَلَیْهِمْ الخ سے حاصل ہوا دیکھو جان اور اعضاء کے قصاص کے احکام توریت شریف میں تھے جو اس آیت کریمہ میں رب تعالیٰ نے نقل فرمائے اس آیت کی بنا پر ہمارے اسلام میں بھی قصاص کے یہ ہی احکام ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** شریعت میں جان کا بدلہ جان ہے قاتل جان بھی مطلق ہے اور مقتول جان بھی مطلق لہٰذا عورت مرد کو قتل کرے یا بالعکس یوں ہی مسلمان ذمی کافر کو قتل کرے یا بالعکس بہرحال قصاص واجب ہے۔ یہ فائدہ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ میں دونوں جگہ نفس کے مطلق فرمانے سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** جان کے قصاص میں قاتل کو صرف قتل کیا جاوے گا نوعیت قتل میں یکساں ہونا ضروری نہیں لہٰذا اگر کوئی کسی کو سر کچل کر ماردے یا چھوٹی بچی سے زنا کرکے ماردے کہ وہ زنا کی تاب نہ لائے اور مرجاوے یا کسی کو پانی میں غرق کرکے یا کسی اور ذریعہ سے ماردے بہرحال قاتل کو تلوار سے ہی قتل کیا جاوے یہ نہ ہوگا کہ جس طرح اس نے مارا ہے اسی طرح اسے مارا جاوے۔ یہ فائدہ بھی النَّفْسَ بِالنَّفْسِ کے اطلاق سے حاصل ہوا۔

کیا جا سکتا، مرتد اور قاتل کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر گزشتہ شریعتوں کے احکام جو قرآن مجید میں آ جاویں ان پر عمل کرنا ہم کو بھی ضروری ہو تو چاہیے کہ ہم پر حلال جانوروں کی چربی حرام ہو کیونکہ رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہود کے متعلق فرمایا: حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ (انعام: ۱۴۶) جب ہم پر وہ چربی حرام نہ ہوئی تو قصاص کیوں واجب ہو گا یہ قصاص بھی تو حکم توریت ہے۔ **جواب:** چربی کی حرمت والی آیت میں ارشاد فرما دیا گیا ہے کہ یہ حکم ان بنی اسرائیل کو بطور سزا دیا گیا تھا کہ فرمایا: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ الخ (النساء: ۱۶۰) تو اس امت مرحومہ پر وہ عذاب کے احکام جاری نہیں ہو سکتے۔ قصاص کے متعلق یہ نہیں فرمایا گیا لہٰذا یہ حکم ہمارے لئے واجب العمل ہے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت کریمہ میں مطلقاً فرمایا گیا کہ نفس کے بدلہ نفس ہے پھر تم نے ظلم، عمد، ناحق کی قیدیں کہاں سے لگائیں، ہر قتل میں قصاص ہونا چاہیے۔ **جواب:** یہ آیت کریمہ ان امور میں مطلق نہیں بلکہ مجمل ہے اسے احادیث شریفہ میں واضح فرمایا ورنہ پھر تو چاہیے کہ گائے بکری ذبح کرنے والے پر اور مجاہد غازی پر جو جنگ میں کفار کو ماریں قصاص واجب ہو جاوے کہ جانور اور کفار سب ہی نفس ہیں۔

تیسرا اعتراض: حدیث شریف میں ہے کہ مومن کافر کے عوض قتل نہ کیا جاوے تم نے یہ کیوں کہا کہ مسلمان قاتل کو کافر مقتول کے عوض قتل کیا جاوے گا (حضرات شافعی) **جواب:** آپ کی پیش کردہ حدیث میں کافر سے مراد کافر حربی کافر ہے رہے کافر ذمی یا مستامن ان کے مسلم قاتل کو ضرور قتل کیا جاوے گا۔ حضور ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا ہے دِمَاءُ هُمْ كَدِمَائِنَا وَاَمْوَالُهُمْ كَاَمْوَالِنَا ان کے خون ان کے مال ہمارے مسلمانوں کے خون و مال کی طرح ہیں اسی لئے اگر کوئی مسلمان ذمی کا مال چورائے تو اس کا ہاتھ کٹے۔ حربی کافر کا مال چھپ کر چھین کر لے لے کوئی سزا نہیں بلکہ انعام ملتا ہے، دن رات سرحدوں باڈروں پر یہ وارادات ہوتی رہتی ہیں۔

چوتھا اعتراض: تم نے کہا کہ نبی امتی کو قتل کر دے یا مارے تو قصاص نہیں مگر حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے دوبار اپنے کو صحابی کے سامنے قصاص کے لئے پیش کر دیا۔ جب کہ حضور انور نے انہیں چھڑی لگائی تھی۔ **جواب:** حضور انور کا یہ عمل شریف تعلیم امت کے لئے تھا، حضور پر واجب نہ تھا جیسے کہ بیویوں میں عدل و انصاف، باری مقرر فرمانا، قرعہ ڈال کر بیویوں کو سفر میں ساتھ لے جانا کچھ بھی حضور انور ﷺ پر واجب نہ تھا مگر حضور ﷺ عمل فرماتے تھے، کیوں ہماری تعلیم کے لئے۔

پانچواں اعتراض: تم نے کہا کہ قصاص میں صرف قتل ہے نوعیت قتل میں برابری ضروری نہیں مگر حدیث شریف میں ہے کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر کچل کر مار دیا تو حضور انور نے اس کا سر ہی کچلا، تلوار سے قتل نہ فرمایا۔ معلوم ہوا کہ جیسے قاتل قتل کرے گا ویسے ہی اسے بھی قتل کیا جاوے گا (شافعی) **جواب:** وہ حدیث منسوخ ہے جیسے کہ حضور نے عرینہ والوں

اور ہم نے ان نبیوں کے پیچھے ان کے نشان قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو لائے تصدیق کرتا ہوا

بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى

جو ان کے سامنے ہے توریت اور دی ہم نے ان کو انجیل جس میں ہے ہدایت

توریت کی جو اس سے پہلے تھی اور ہم نے اسے انجیل عطا کی جس میں ہدایت

وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى

اور روشنی اور سچا کرنے والی اس کو جو اس کے سامنے ہے توریت اور ہدایت

اور نور ہے اور تصدیق فرماتی ہے توریت کی کہ اس سے پہلے تھی اور ہدایت

وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۶ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ

اور نصیحت واسطے پرہیز گاروں کے اور چاہیے کہ انجیل والے فیصلہ کریں اس پر جو اتارا

اور نصیحت پرہیز گاروں کو اور چاہیے کہ انجیل والے حکم کریں اس پر جو اللہ نے

اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴۷

اللہ نے اس میں اور جو نہ فیصلہ کرے اس پر جو اتارا اللہ نے پس یہ ہی لوگ وہ بے راہ ہیں

اس میں اتارا اور جو اللہ کے اتارے پر حکم نہ کریں تو وہ ہی لوگ فاسق ہیں

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: پچھلی آیت کریمہ میں یہود کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ توریت شریف کے احکام قصاص و رجم وغیرہ جاری کریں اب عیسائیوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی کتاب انجیل شریف پر عمل کر کے قصاص و رجم جاری کریں یا انجیل کا یہ حکم مانیں کہ نبی آخر الزمان حضور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں چونکہ یہودی عیسائیوں سے پہلے ہیں اس لئے یہود کو پہلے خطاب فرمایا گیا عیسائیوں کو بعد میں۔ **دوسرا تعلق**: پچھلی آیات میں توریت شریف کی عظمتوں کا ذکر فرمایا گیا کہ اس پر حضرات انبیاء کرام عمل کرتے رہے اس میں نور و ہدایت ہے اب اور طرح اس توریت شریف کی عظمت کا اظہار ہے کہ جناب عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام جیسی شان دار ہستی نے توریت کی تصدیق فرمائی۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیات میں قصاص نفس اور قصاص اعضاء کا حکم دیا گیا اور فرمایا گیا کہ یہ حکم توریت ہے۔ اب اس قصاص کی اہمیت بیان فرمائی جا رہی ہے کہ یہ حکم جناب عیسیٰ ابن مریم صلوٰت اللہ وسلامہ علیہ کا تصدیق فرمودہ ہے، اس پر عمل نہایت ہی ضروری ہے۔ **چوتھا تعلق**: پچھلی آیت کریمہ میں قرآن مجید کی عظمت یوں بیان کی گئی کہ وہ توریت کے بعض احکام کو دنیا میں شائع فرمانے والا ہے جیسے حکم قصاص یا حکم رجم وغیرہ اب اسی

صرف فلسطین کے بنی اسرائیل سے توریت کو سچا کہلایا کہ آپ صرف ان کے ہی نبی تھے مگر ہمارے حضور ﷺ نے تمام جہان سے تمام آسمانی کتب کو سچا کہلوایا کہ حضور ﷺ سارے جہان کے نبی ہیں اور حضور کی وجہ سے ہر مسلمان تمام کتب مانتا ہے۔ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ یہ عبارت معطوف ہے قَفَّیْنَا الخ پر اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوسری شان کا ذکر ہے کہ وہ صاحب کتاب صاحب شریعت رسول ہیں ہم نے انہیں انجیل شریف عطا فرمائی۔ چونکہ انجیل ایک جگہ اور ایک وقت میں ساری کی ساری عطا ہوگئی تھی اس لئے اس کے متعلق اٰتَیْنَا ارشاد ہوا اَنْزَلْنَا نہ فرمایا بخلاف قرآن مجید کے کہ وہ ۲۳ سال میں آیا۔ فِیْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ یہ عبارت انجیل کا حال مؤکدہ ہے جس میں فِیْهِ خبر مقدم ہے اور هُدًى وَّنُوْرٌ مبتدا مؤخر ہے هُدًى سے مراد ہے عقائد صحیحہ اور نُوْرٌ سے مراد ہے اعمال صالحہ یا هُدًى سے مراد ہے شریعت کے احکام اور نور سے مراد ہے طریقت کا بیان غرضکہ جتنے احتمال توریت کے متعلق فِیْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ میں عرض کیے گئے وہ ہی یہاں مراد ہیں۔ یعنی ہم نے انہیں وہ انجیل دی جس میں ہدایت و نور تھا یہ ہدایت و نور ہونا عطاء انجیل کے وقت کے لحاظ سے ہے وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ یہ عبارت معطوف ہے۔ فِیْهِ هُدًى الخ پر اور انجیل پر دوسرا حال ہے۔ مفرد حال جملہ حال پر معطوف ہوسکتا ہے یہ عطف جائز ہے (روح المعانی) یہاں بھی مُصَدِّقًا میں وہ ہی تین احتمال ہیں جو پہلے مُصَدِّقًا میں تھے اور اس کی وہ ہی تحقیق ہے جو ابھی عرض کی گئی یعنی وہ انجیل بھی اپنے سے پہلی کتاب توریت کو سچا کہتی تھی یا سچا کرتی تھی یا سچا کہلواتی تھی نہ تو جناب عیسیٰ علیہ السلام توریت کے متبع تھے نہ انجیل۔ تصدیق اور چیز ہے اتباع دوسری چیز وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ یہ عبارت مصدقا پر معطوف ہے اور انجیل کا حال واؤ عاطفہ اور ہوسکتا ہے کہ هُدًى الخ مفعول له ہو۔ یہاں ہدایت سے مراد حضور سید عالم ﷺ کی بشارت ہے جو ذریعہ ہے اس ہدایت خاصہ کا لہٰذا یہ مکرر نہیں پہلے هُدًى سے اور ہدایت مراد تھی اس هُدًى سے یہ بشارت مراد ہے (تفسیر خازن و روح وغیرہ) انجیل شریف کی پہلی ہدایت تو ختم ہو چکی یہ ہدایت یعنی حضور کی بشارت تا قیامت باقی ہے۔ خیال رہے کہ انجیل شریف میں حضور کا نام شریف، حضور کا حلیہ مبارکہ، حضور کے اوصاف، حضور کی ہجرت حتی کہ حضور کے خاص صحابہ کے حالات و صفات مذکور تھے یہاں تک کہ بعض یہودیوں عیسائیوں نے ان ہی صفات میں حضور کو دیکھا تو مومن ہو گئے جیسے عبداللہ ابن سلام اور حضرت سلیمان فارسی وغیرہم اس لئے یہاں هُدًى ارشاد ہوا یعنی حضور کی طرف پوری پوری رہبری کرنے والی، آپ کی پہچان کرانے والی اب تک یوحنا انجیل اور برنباس انجیل وغیرہ میں حضور کی بہت صفات مذکور ہیں اگرچہ ان میں بہت ردوبدل ہو چکا ہے یہ ہے۔ هُدًى کا ظہور، مَوْعِظَةً کے معنی ہیں شاندار بلیغ وعظ لِّلْمُتَّقِیْنَ کا تعلق مَوْعِظَةً سے ہے چونکہ انجیل شریف میں وعظ و نصیحتیں، مثالیں، بشارتیں، نذارتیں بہت ہیں اس لئے اسے مَوْعِظَةً فرمایا اور چونکہ ان چیزوں سے وہ ہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو پہلے ایمان لا کر متقی بن جاویں یا جن کے نصیب میں متقی ہونا لکھا ہوا اس لئے لِّلْمُتَّقِیْنَ فرمایا غرضکہ انجیل ہدایت سب کے لئے ہے سب کو حضور ﷺ کی بشارت دیتی ہے مگر نصیحت پرہیزگاروں کے لئے وَلْیَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ یہ علیحدہ جملہ ہے جس میں گزشتہ انجیل کا بیان ہے۔ اہل انجیل سے مراد

خلاف فیصلہ کرے وہ فاسق وکافر ہے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے خاتم الانبیاء ہیں آپ تمام بنی اسرائیل کے نبیوں کے بعد تشریف لائے۔ یہ فائدہ **وَقَفَّيْنَا** اور **عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ** سے حاصل ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں آپ کے سوا کوئی نبی موجود نہ تھے یعنی کوئی نبی آپ کا ہم زمانہ نہ ہوا۔ یہ فائدہ بھی **وَقَفَّيْنَا** اور **اٰثَارِهِمْ** سے حاصل ہوا اگر کوئی نبی آپ کے زمانہ میں ہوتا تو آپ اس کے پیچھے نہ ہوتے یہ خلاف ہے **اٰثَارِهِمْ** کے۔ **تیسرا فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے صرف ماں سے پیدا ہوئے۔ یہ فائدہ **بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ** فرمانے سے حاصل ہوا قرآن کریم نے کسی نبی کو نسبت نسبی سے بیان نہ فرمایا اور کسی بی بی کا نام نہ لیا سوا عیسیٰ علیہ السلام کے اور سوا حضرت مریم کے۔ **چوتھا فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توریت کو جھٹلایا نہیں بلکہ اس کی تصدیق وتائید کی۔ یہ فائدہ **مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ** سے حاصل ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** حضرت عیسیٰ علیہ السلام صاحب کتاب اور صاحب شریعت پیغمبر ہیں بہت ہی عظمت والے ہیں۔ یہ فائدہ **وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ** سے حاصل ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** انجیل شریف میں ہدایت، نور، تصدیق، نصیحت، احکام شرعیہ سب کچھ ہی ہے جو کہے کہ انجیل میں صرف وعظ ومثالیں ہیں احکام شرعیہ نہیں وہ اس آیت کریمہ کے خلاف کہتا ہے۔ **ساتواں فائدہ:** توریت وانجیل نے حضور کی صرف بشارت نہ دی بلکہ مخلوق کو حضور کی طرف رہبری بھی کی اگر وہ کتب صرف حضور کا نام بتادیتیں تو نشان دہی مکمل نہ کرتیں تو کوئی اور بھی اپنا نام محمد یا احمد رکھ کر کہہ دیتا کہ وہ میں ہی ہوں جس کی بشارت توریت وانجیل نے دیں بلکہ ان کتب نے حضور انور کی ایسی نشاندہی کردی کہ لوگ بغیر تامل حضور کو پہچان گئے۔ یہ فائدہ دوسرے **هُدًى** سے حاصل ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** توریت وانجیل کی غیر منسوخ آیات یا وہ آیات جن کی قرآن کریم نے تائید فرمائی تا قیامت واجب العمل ہیں۔ چنانچہ ان کتب کی آیات توحید آیات قصص، آیات بشارت محمد مصطفے ﷺ لازم العمل ہیں۔ یوں ہی قاتل کے قصاص زانی کے رجم کے احکام جو قرآن کریم میں منقول ہوئے ان پر عمل واجب ہے۔ یہ فائدہ **وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ** کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔ **نواں فائدہ:** اب توریت وانجیل کے اصل غیر تبدیل شدہ احکام کسی کے لئے لائق عمل نہیں۔ عیسائی، یہودی بھی ان پر عمل کرکے ہدایت نہیں پاسکتے اپنے اپنے وقت میں وہ کتابیں ہدایت تھیں، اب ان پر عمل گمراہی ہے۔ یہ فائدہ **وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ** کی دوسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ **دسواں فائدہ:** موجودہ کچہریوں کو عدالت کہنا انہیں عدالت کا گھر جاننا اور موجودہ حکام کو عادل ومنصف سمجھنا ناجائز ہے۔ یہ فائدہ **فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ** سے حاصل ہوا کیونکہ ان کچہریوں میں اسلامی قوانین جاری نہیں۔ مروجہ قوانین پر فیصلے ہوتے ہیں وہ فیصلے شرعاً عدل نہیں۔ مثلاً آج چور کو سزائے قید دی جاتی ہے یہ عدل نہیں۔ عدل یہ ہے کہ اس کے ہاتھ کاٹے جائیں یوں ہی نوشیرواں کو عادل کہنا جائز نہیں کہ وہ کسی نبی کے دین کے قوانین پر فیصلے نہیں کرتا تھا۔

کرو یہ گزشتہ زمانہ کا ذکر ہے۔ دوسرے یہ کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ سے مراد انجیل شریف کی وہ آیات ہیں۔ جن میں حضور ﷺ کی بشارتیں ہیں اور آپ پر ایمان لانے کا حکم مقصد یہ ہے کہ انجیل والوں کو چاہیے کہ انجیل کے ان احکام پر عمل کریں اور نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں تیسرے یہ کہ یہاں مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ سے مراد قصاص اور رجم کی آیات ہیں جن کی تائید و تاکید قرآن کریم نے کر دی یعنی عیسائیوں کو چاہیے کہ ان احکام پر عمل کریں۔ ہر مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ پر عمل تو ناممکن ہے قرآن کریم کی منسوخ آیات مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ تو ہیں مگر ان پر عمل نہیں تو انجیل کے تمام مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ پر عمل کیونکر ہو سکتا ہے۔

چھٹا اعتراض: یہاں تین آیات میں ایک ہی جرم کی تین سزائیں بیان ہوئیں۔ چنانچہ پہلے ارشاد ہوا کہ جو مَآ اَنْزَلَ پر حکم نہ دے وہ کافر ہے دوسری آیت میں ارشاد ہوا کہ وہ ظالم ہے یہاں تیسری آیت میں فرمایا گیا کہ وہ فاسق ہے۔ آیات میں تعارض ہے۔ **جواب:** کوئی تعارض نہیں ظالم سے مراد بھی کافر ہے اور فاسق سے مراد بھی۔ فاسق، اعتقادی یعنی کافر ہی ہے تعبیریں مختلف ہیں مگر مطلب ایک ہے یا یہ مطلب ہے کہ ایسا مجرم کافر بھی ہے، ظالم بھی، بدکار فاسق بھی۔ اس مجرم کے تین جرموں کا تین جگہ ذکر ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

کتاب اللہ گویا دیوار ہے اور نبوت اس کا پشتہ یا کتاب اللہ گویا جہاز ہے نبی اس کے چلانے والے کپتان پشتہ جس قدر مضبوط ہو گا اسی قدر دیوار قوی ہو گی۔ کپتان جیسا لائق و فائق ہو گا اسی قدر جہاز محفوظ ہو گا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے توریت کے متعلق فرمایا کہ اس کے حاکم، حافظ حضرات انبیاء کرام تھے اور آخر میں جناب مسیح علیہ السلام بھی اس توریت کی تصدیق فرماتے آئے گویا توریت کے پشتے یہ حضرات انبیاء تھے اور توریت والے جہاز کے ناخدا وہ حضرات تھے چونکہ وہ نبوتیں منسوخ ہو گئیں پشتے گر گئے تو دیوار بھی قائم نہ رہ سکی چنانچہ توریت بھی فنا ہو گئی۔ قرآن کے پشتی بان حضور ﷺ ہیں۔ اسلام کے جہاز کے کھیون ہار وہ آقا نامدار ہیں جن کی نبوت ابدالآباد تک باقی اس کے لئے نسخ نہیں۔ پشتہ مضبوط لہٰذا دیوار مضبوط دیکھ لو قرآن ویسے ہی محفوظ چلا آ رہا ہے، اسلام اسی طرح پھل پھول رہا ہے

چہ غم دیوار امت راکہ دارد چوں تو پشتی بان ۔۔۔ چہ غم از موج بحر آں راکہ دارد نوح کشتی بان

بیت المقدس کے پشتی بان سارے نبی تھے اور کعبہ کے پشتی بان حضور محمد مصطفےٰ ﷺ دیکھ لو بیت المقدس اور کعبہ میں کیا کھلا ہوا فرق نظر آ رہا ہے۔ دوسرے کلموں کے پشتی بان اور نبی تھے اور کلمہ طیبہ کے پشتی بان حضور ﷺ ہیں دیکھ لو وہ تمام کلمے ختم ہو گئے یہ کلمۂ اسلام ویسے ہی پائندہ و زندہ ہے یوں ہی جس کے دین و ایمان کی پشتی حضور فرمادیں وہ دین و ایمان قائم ہے اور جسے ان کی پشتی نصیب نہ ہو وہ فانی ہے۔ یوں ہی نیک اعمال یوں ہی دولت و عزت و عظمت کہ اگر ان چیزوں کو حضور کی پشتی نصیب ہو جائے تو یہ سب باقی ہیں انہیں فنا نہیں اگر حضور کی پشتی سے محروم ہیں تو فانی ہیں۔ دنیاوی بادشاہوں کی عزتیں خاک میں مل جاتی ہیں کہ ان کی پشتی فوج پامال سے ہے۔ اللہ والوں کی عزتیں تا قیامت باقی ہیں کہ ان کی پشتی حضور سے ہے ﷺ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور کی پشتی نصیب کرے۔ اقبال نے کیا خوب کہا

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں توریت و انجیل کے ہدایت و نور و نصیحت ہونے کا ذکر تھا اب قرآن مجید کا نہایت شاندار طریقہ سے ذکر ہے کہ وہ پچھلی کتابوں کی تصدیق بھی کرتا ہے ان کی حفاظت بھی چونکہ قرآن کریم ان دونوں سے پیچھے ہے اس لئے اس کا ذکر بھی پیچھے ہی فرمایا گیا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات کریمہ میں فرمایا گیا تھا کہ انجیل شریف توریت مقدس کی تصدیق کرتی تھی یعنی توریت کو انجیل کی حمایت حاصل تھی اب ارشاد ہو رہا ہے کہ توریت و انجیل بلکہ تمام آسمانی کتب کو قرآن کریم کی تصدیق و حمایت حاصل ہے اس کی حفاظت بھی گویا ایک حمایت کے بعد دوسری اعلیٰ حمایت و حفاظت کا ذکر اب ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیات میں بیان ہوا کہ گزشتہ انبیاء کرام توریت سے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام انجیل سے حکم دیتے رہے۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ اے محبوب! آپ قرآن سے احکام نافذ فرمادیں کہ یہ تمام احکام کا جامع ہے گویا آپ کے احکام ان تمام احکام سے اعلیٰ ہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیات میں فرمایا گیا تھا کہ اہل کتاب کو چاہیے کہ وہ انجیل کے احکام قصاص و رجم وغیرہ احکام کو جاری کریں اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے محبوب! آپ اللہ کے ان احکام کو جاری کریں جو اس نے آپ پر اتارے کیونکہ آپ توریت و انجیل کے تابع نہیں۔

تفسیر

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔ چونکہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین حضور ﷺ کی نبوت، قرآن کریم کے نزول کے سخت منکر تھے اس لئے اس مضمون کو ان تحقیقیہ سے شروع فرمایا۔ حضور ﷺ پر نزول قرآن یکبارگی بھی ہوا اور آہستہ بھی ہر ماہ رمضان میں جبرئیل امین حضور ﷺ پر قرآن لاتے بلکہ حضور کے ساتھ دور فرماتے تھے اور تیئیس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا آیت آیت بھی اترا پہلے نزول کے لحاظ سے اَنْزَلْنَا فرمایا جاتا ہے اور دوسرے نزول کے لحاظ سے نَزَّلْنَا ارشاد ہوتا ہے بلکہ قرآن کریم کی بعض آیات بلاواسطہ جبرئیل امین بھی حضور کو عطا ہوئیں جیسے سورۃ بقرہ کی آخری آیات شب معراج بلاواسطہ عطا ہوئیں۔ یہاں یا تو وہ ہی ماہ رمضان والا یکدم نزول مراد ہے یا تیئیس سال والا آہستگی کا نزول دوسری صورت یہاں انزال سے مراد صرف اتارنا ہے یکدم اتارنا نہیں یعنی تحریری معنی مراد ہیں چونکہ نزول قرآن کی انتہا حضور کی ذات والا صفات پر ہے اس لئے اِلَیْكَ فرمایا گیا۔ چونکہ نزول قرآن حضور پر ہے ہم پر نہیں اس لئے اِلَیْکَ یا عَلَیْکَ فرمایا جاتا ہے اور چونکہ نزول قرآن حضور کی ہدایت کے لئے نہیں ہماری ہدایت کے لئے ہے حضور تو پہلے ہی سے ہدایت یافتہ ہیں اس لئے کہیں اِلَیْکُمْ فرمایا جاتا ہے اس لئے قرآن کریم نے کہیں فرمایا: هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ (بقرہ:۲) اور کہیں فرمایا: هُدًى لِّلنَّاسِ (بقرہ:۱۸۵) کہیں هُدًى لَّکَ یا هُدًى لِلرَّسُوْلِ نہ فرمایا جیسے سارا عالم رب تعالیٰ کا مخلوق و مملوک ہے اس لئے فرمایا لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ اور عالم ہمارے لئے ہے، اللہ کے لئے نہیں اس کا فائدہ ہم کو ہے رب کو نہیں اس لئے فرمایا: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (بقرہ:۲۹) لہٰذا اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ بھی درست ہے اور اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ بھی صحیح۔ اَلْكِتٰبَ میں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد یہ کتاب یعنی قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں رسول یا

بنک کا چپڑ اسی بھی وہاں کی دولت کا محافظ ہے اور وہاں کا خزانچی اور مینجر بھی محافظ ہے مگر چوکیدار صرف قفل کا محافظ ہے اور مینجر دولت کا نگران بھی ہے نیز ہم گھر کے سامان کے محافظ ہیں جو معمولی چیزیں باہر پڑی ہیں ان کے محافظ ہیں مگر جیب کا روپیہ، گھر کے قیمتی زیور ان کے ہم محافظ بھی ہیں نگران بھی ہیں اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا محافظ نہیں بلکہ مہیمن ہے۔ ہر وقت ہر ایک کی ہر ضرورت سے خبردار اور ان کی ضروریات پوری کرنے والا ہے۔ قرآن مجید اور حضور ﷺ ساری کتابوں سارے نبیوں کی عزت کے مہیمن ہیں۔ ان کی اصل تعلیمات کے مہیمن ہیں کہ حضور کی اور قرآن کریم کی وجہ سے ان کی عظمتیں ان کی اصل تعلیم آج تک باقی ہے فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یہ عبارت ایک پوشیدہ عبارت کی جزا ہے لہٰذا ف جزائیہ ہے بَيْنَهُمْ کا مرجع اہل کتاب ہیں یا مؤمنین ہیں یا تمام انسان خواہ مومن ہوں یا اہل کتاب وغیرہ مقصد یہ ہے کہ جس کا مقدمہ آپ کے پاس آئے اس کا فیصلہ مطابق بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے ہو کسی فریق کی رعایت مروت نہ ہو۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ هُمْ کا مرجع ساری مخلوق الٰہی ہے جن وانس فرشتے، چاند، سورج، تارے، ذرے، جانور وغیرہ حضور کا حکم ان سب پر جاری ہے۔ حضور باذن الٰہی ان سب پر حاکم ہیں اس لئے حضور نے جانوروں کے متعلق بھی احکام نافذ فرمائے۔ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے مراد قرآن کریم اور حدیث شریف دونوں ہی ہیں اس لئے بالکتاب یابہ یابالقرآن نہ فرمایا بلکہ اتنی دراز عبارت ارشاد ہوئی۔ حضور کا ہر قول، ہر فعل، ہر ادا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ہے سب رب تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ آپ کا ہر فیصلہ مطابق بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ہے یعنی جب آپ یا یہ کتاب ان کتابوں کی مصدق اور محافظ ہیں یا جب اہل کتاب آپ کے پاس اپنے فیصلے لائیں تو آپ وحی الٰہی کے مطابق ان میں فیصلہ کریں۔ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ یہ دوسرا حکم ہے فَاحْكُمْ الخ پر معطوف ہے اَهْوَآءَ جمع ہے ھوی کی بمعنی گرنا، نفسانی خواہش کو ہوا اس لئے کہتے ہیں کہ دوزخ میں گرنے کا ذریعہ ہے ھم کا مرجع وہ ہی یہود و نصاریٰ ہیں اس میں خطاب ہر مسلمان سے ہے۔ حضور ﷺ کے متعلق یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ حضور سرکار وحی چھوڑ کر ان کی خواہش کی پیروی کریں نعوذ باللہ۔ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ یہ عبارت لَا تَتَّبِعْ کے فاعل کا حال ہے عَمَّا سے پہلے عادلا یا منحرفا پوشیدہ ہے اس میں بھی خطاب حکام اسلام سے ہے یعنی اپنے پاس آئے ہوئے پہنچے ہوئے حق کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ فیصلے مطابق وحی الٰہی کے کرو لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا یہ نیا جملہ ہے اس میں خطاب یا تو اول تا روز قیامت سارے ہی انسانوں سے ہے یا یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں سے پہلے ذکر ہوا توریت کا پھر انجیل کا پھر قرآن مجید کا اب اس جملہ میں ان تینوں کتب والوں کا یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کا شِرْعَةً یا تو بنا ہے شرع سے بمعنی وضاحت و بیان یا بنا ہے شروع سے بمعنی دخول۔ لغت میں شرعہ اس نالی کو کہتے ہیں جو دریا سے کاٹ کر لائی جاوے، اس سے لوگ کھیت سیراب کریں شریعت بروزن فعیلۃ بمعنی اسم مفعول ہے اصطلاح میں کھلے راستہ کو شرعہ کہا جاتا ہے۔ جس پر بہ آسانی چل سکیں اس سے ہی شارع عام ہے یعنی جرنیلی سڑک دین کے واضح و کھلے احکام کو شریعت کہتے ہیں کیونکہ ہر شخص اس پر بہ آسانی چل کر اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے یہ ہی آخری معنی یہاں مراد ہیں یعنی خدارسی کا کھلا راستہ منہاج بنا ہے نہج سے بمعنی فراخی و چوڑائی اصطلاح میں چوڑے

اے موجودہ لوگو! اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک جماعت بنا دیتا۔ اس طرح کہ تم سب کو اسلام قبول کرنے کی توفیق دے دیتا اور اس سورج کے چمک جانے پر کوئی بے نور، بے ہدایت نہ رہتا سب مسلمان ہو جاتے یہودیت، نصرانیت، شرک سب ختم فرما دیتا وہ بڑا قدرت والا ہے وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ اس جملہ میں اختلاف ادیان اختلاف رائے کی حکمت کا ذکر ہے۔ لٰكِنْ کے بعد لم یشاء پوشیدہ ہے اور لِّيَبْلُوَكُمْ اس کے متعلق ہے اٰتٰىكُمْ سے مراد یا تو وہ ہی مختلف دین اور شریعتیں ہیں جو پہلے آتی اور منسوخ ہوتی رہیں یا اس سے مراد قلب ونفس، ہدایت وگمراہی ہے اور اختلاف رائے اور اختلاف خیالات ہے یعنی اگر چہ رب تعالیٰ اس پر قادر تھا کہ تم کو ایک ہی دین پر رکھتا مگر اس نے ایسا کیا نہیں بلکہ الگ الگ شریعتیں بھیجیں تا کہ تمہاری آزمائش ہو کہ تم حکم الٰہی پر سر جھکاتے ہو یا اپنی رائے پر عمل کرتے ہو اور یہ کہتے ہو کہ رب تعالیٰ نے الگ الگ دین کیوں بھیجے یا رب نے اب تم سب کو اسلام کی توفیق نہ دی کچھ مسلمان ہوئے کچھ کافر رہے تا کہ تمہاری آزمائش ہو جاوے اختلاف دین سے تم کو جہاد و ہجرت کرنا پڑے اور تم مجاہد، غازی، شہید بنو۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اس عبارت میں گزشتہ مذکورہ اختلاف کے نتیجہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ جملہ ایک پوشیدہ شرط کی جزا ہے استباق سے مراد یا تو ایک دوسرے پر آگے بڑھنا ہے یا ایمان میں جلدی کرنا ہے کیونکہ موت کی خبر نہیں۔ خیرات سے مراد اچھے عقیدے اور اچھے اعمال ہیں یعنی جب تم جان چکے کہ سب ایک دین پر نہ ہوں گے کچھ مومن کچھ کافر رہیں گے لہٰذا تم کوشش کرو کہ تم کافروں میں نہ ہو خوش عقیدہ، خوش اعمال مومنین ہو۔ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا۔ اس عبارت میں بھلائیوں کی طرف سبقت کرنے کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے۔ اس میں خطاب سارے انسانوں سے ہے مرجع مصدر میمی ہے بمعنی لوٹنا لوٹنے سے مراد مر کر یا قیامت میں رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے جب کہ دنیا کے تمام ساتھ چھوٹ جائیں گے چونکہ ہم سب دنیا میں رب تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے آئے ہیں اس لئے وہاں جانے کو لوٹنا فرمایا گیا یعنی اے انسانو! تم سب کا آخر کار لوٹنا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے اس پیشی کا انتظام ابھی سے کرو اگر چہ جانور بھی اٹھائے جائیں گے مگر ان کے لئے دوزخ و جنت کی سزا و جزاء نہیں نیز وہ دنیا میں کسی شریعت کے مکلف نہیں اس لئے صرف انسانوں سے فرمایا گیا کہ تمہارا اسی کی طرف رجوع ہے اس لئے ارشاد ہوا کہ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ یہ عبارت اِلَى اللّٰهِ الخ پر معطوف ہے خبر دینے سے مراد سزا و جزاء دینا ہے یعنی عملی فیصلہ فرمانا ورنہ قولی فیصلہ تو یہاں دنیا میں بذریعہ انبیاء کرام فرما دیا گیا ہے یعنی اس دن تم کو رب تعالیٰ تمہارے اختلافات کے فیصلے کی خبر دے گا کہ حق پر کون ہے، باطل پر کون؟ حق والوں کو جنت میں اور باطل والوں کو دوزخ میں داخل کرے گا۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب! ﷺ ان نبیوں اور کتابوں کے بعد ہم نے آپ پر یہ کتاب قرآن مجید نازل فرمائی جو بالکل حق ہے یا ہم حق ہیں یا تم حق ہو یا ہمارا اتارنا حق ہے یہ کتاب یا ہم یا اے محبوب! تم اس قرآن مجید سے پہلے والی تمام کتابوں کی تصدیق کرتے ہو کہ وہ سچی ہیں اور ان کتب کی محافظ ہے کہ اس قرآن کی یا تمہاری وجہ سے ان تمام کتابوں کے نام بلکہ ان کے بعض احکام، عقائد، عزت عظمت محفوظ ہیں لہٰذا آپ یہود و نصاریٰ بلکہ تمام کفار کے درمیان

اسلامی سزا دے گا۔ چنانچہ ان کے چور کے ہاتھ کاٹے گا ان کے قاتل کو قتل کرے گا۔ یہ فائدہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے حاصل ہوا

(ضروری نوٹ) اس قاعدے سے ان کفار کے نکاح، میراث، غذائیں علیحدہ ہیں کہ اس قسم کے مقدمات میں حاکم اسلام ان کے دین کے احکام ان پر جاری کرے گا جیسا کہ حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ ان کے لئے سؤر ایسا ہے جیسے ہمارے لئے بکری اور ان کے لئے شراب ایسی ہے جیسے ہمارے لئے سرکہ او کما قال۔ **پانچواں فائدہ:** قانون اسلام صرف قرآن نہیں بلکہ قرآن وحدیث دونوں ہیں بلکہ اجماع قیاس بھی۔ یہ فائدہ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے حاصل ہوا اگر صرف قرآن ہی قانون ہوتا تو بالقرآن فرمایا جاتا اتنی دراز عبارت ارشاد نہ ہوتی۔ **چھٹا فائدہ:** قرآن کریم حاکم نہیں حاکم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، قرآن حکم وقانون ہے۔ یہ فائدہ بھی اس فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے حاصل ہوا کہ حکم کا فاعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا گیا اور اَنْزَلَ اللّٰهُ کو ذریعہ حکم فرمایا گیا۔ **ساتواں فائدہ:** رشوت لے کر یا مروت یا رعایت یا نفسانی خواہش سے غلط فتویٰ دینا یا حاکم کا غلط فیصلہ کرنا بدترین جرم ہے یہ فائدہ وَلَا تَتَّبِعْ الخ سے حاصل ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** اسلامی احکام وقوانین ہی حق اور انصاف ہیں ان کے سوا دوسرے احکام قوانین نرے ظلم ہیں چور کا ہاتھ کاٹنا حق اور انصاف ہے اسے سزاء قید دینا محض ظلم۔ یہ فائدہ جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ سے حاصل ہوا۔ **نواں فائدہ:** وَلَا تَتَّبِعْ میں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ حکام اسلام سے ہے یہ فائدہ لِجَعَلَكُمْ میں ضمیر کو جمع لانے سے حاصل ہوا کہ جن سے خطاب لِجَعَلَكُمْ میں ہے انہی سے خطاب وَلَا تَتَّبِعْ میں ہے۔ **دسواں فائدہ:** تمام انبیاء اور ساری آسمانی کتب عقائد میں متفق ہیں احکام فرعی میں مختلف ہر نبی نے توحید، نبوت، قیامت، فرشتوں، تقدیر وغیرہ عقائد کی یکساں تعلیم دی ہاں نماز کی ترکیب زکوٰۃ کی مقدار وغیرہ میں اختلاف رہا۔ یہ فائدہ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا سے حاصل ہوا کہ یہاں دین نہ فرمایا۔ **گیارھواں فائدہ:** دنیا میں مختلف شریعتیں مختلف انبیاء کرام کے تشریف لانے میں صدہا حکمتیں ہیں کہ ہر زمانہ میں اس وقت کے لحاظ سے احکام آئے اور اس سے مقبولین و مردودین میں چھانٹ ہوگئی کہ مقبول بندوں نے سر جھکا دیئے۔ مردودوں نے نسخ و اختلاف نہ مانے کج بحثی ہی کرتے رہے۔ مشرکین ہند کا یہ عقیدہ باطل ہے کہ شروع دنیا سے ہی وید آ گیا تھا اور تمام دنیا کو ہر زمانہ میں اس پر عمل کرنے کا حکم ہے اور وید کی حالت یہ ہے کہ اتنی مدت میں ہندوستان کی چند بستیوں سے باہر نہ گیا خود اپنے ماننے والے ہندوؤں میں سے بھی ہر ایک کے پاس نہ پہنچا۔ صرف چند پنڈت ہی اس کے کچھ منتر جانتے ہیں یہ تو ہمارے قرآن کی شان ہے کہ تھوڑی سی مدت میں دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچا، ہر شخص کے پاس پہنچا۔ میں نے بیت المقدس کے پاس بیت اللحم کے عیسائیوں کو دیکھا کہ انہیں سورۂ مریم کے رکوع کے رکوع حفظ ہیں وہ رکوع پڑھتے جاتے ہیں اور حضرت مسیح کی پیدائش گاہ وغیرہ کی زیارت کراتے ہیں۔ ہندوستانی آریے راجپند ردہلوی اور کالی چرن آگرہ والے کو سپارے کے سپارے حفظ تھے یہ ہے قرآن کریم کا معجزہ کہ دشمنوں کے سینہ میں بھی گھر کر لیتا ہے۔

ہدایت صرف اسلام میں ہے اس کے لئے وہ آیت کریمہ پڑھو وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ الخ (آل عمران:۱۵)۔

پانچواں اعتراض: اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ تم سب کو اس کی طرف لوٹنے کے بعد تمہارے اختلافات کی خبر دے گا حالانکہ اس رب کریم نے تو اس کی خبر دنیا میں دے دی ہے کہ اسلام کے سوا تمام دینوں کو باطل قرار دیا پھر یہ فرمان کیونکر درست ہوا؟ **جواب:** دنیا میں اس نے قولی فیصلہ فرما دیا عملی فیصلہ قیامت میں ہوگا یہاں کافر و مومن سب ہی اس کی نعمتیں برت رہے ہیں۔ بظاہر پتہ نہیں چلتا کہ وہ راضی کس سے ہے ناراض کس سے قیامت میں عملی فیصلہ عملی خبر دی جاوے گی کہ کفار کو جہنم میں ٹھونس دیا جائے گا۔

چھٹا اعتراض: تم نے مہیمن کی جو تفسیر کی اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ تا قیامت ہر چیز سے مطلع ہر ایک کے ایمان، اعتقاد، اعمال سے خبردار ہیں مگر قرآن کریم فرماتا ہے کہ قیامت میں باطل معبود اپنے عابدوں سے کہیں گے۔ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ (یونس:۲۹) ہم تمہاری عبادات سے بے خبر تھے۔ جھوٹے معبود چاند سورج پتھر درخت دریا انبیاء واولیاء سب ہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ سب ہی ہمارے حالات سے غافل اور بے خبر ہیں۔ بتوں ولیوں کی لوگ عبادت کرتے رہے ہیں۔ **جواب** نعوذ باللہ حضرات انبیاء کرام معبودان باطلہ میں داخل نہیں معبود باطل وہ ہے جس کی عبادت کی جاوے۔ رب کے سوا کسی قوم نے اپنے نبی کی عبادت نہ کی اگر وہ لوگ نبی کو سجدے کرتے نبی دیکھتے رہتے منع نہ کرتے تو وہ معبود باطل کہلاتے ان بدنصیبوں نے نبیوں کے نام کے بت بنا کر ان کی عبادت کی یہ ان بتوں کی عبادت ہے نہ کہ نبیوں کی جیسے کوئی اللہ کے نام کا بت بنا کر اسے سجدے کرے تو وہ خدا کا عابد نہیں مشرک ہے یا کوئی کعبہ کا مجسمہ یا نقشہ بنا کر اس کی طرف نماز پڑھے۔ وہ کعبہ کی طرف نماز نہیں پڑھ رہا ہے نہ اس کی نماز درست ہو بلکہ یہ دونوں مشرک ہیں۔ حضرات اولیاء نہ معبود ہیں نہ بے خبر وہ حضرات رب کے گواہ شفیع ہیں۔ شفاعت، شکایت، گواہی بغیر علم نہیں ہو سکتی۔ رب فرماتا ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا (احزاب:۴۵) اور فرماتا ہے: وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (فرقان:۳۰) اگر وہ بے علم ہیں تو یہ شہادت اور شکایت کیسی۔

تفسیر صوفیانہ

قرآن کریم کی دو شانیں ہیں۔ نزول کی شان اور تبلیغ کی شان۔ اس کے نزول کی ابتداء رب تعالیٰ سے ہے واسطہ نزول حضرت جبرئیل علیہ السلام منتہاء نزول حضور محمد مصطفیٰ ﷺ۔ اس لئے یہاں الی ارشاد ہوا جو انتہا کے لئے آتا ہے کہ فرمایا اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ۔ اس کی تبلیغ کی ابتدا حضور ﷺ سے ہے اور واسطہ تبلیغ حضرات صحابہ کرام منتہاء تبلیغ سارے انسان تو حضور ﷺ کے منتہی بھی ہیں اور مبتداء بھی۔ اور جیسے نزول قرآن کے لئے حضرت جبریل کو ماننا ضروری ہے یوں ہی تبلیغ قرآن کے لئے حضرات صحابہ پر ایمان لانا اشد ضروری ہے کہ حضرت جبریل واسطہ نزول اور یہ حضرات واسطہ تبلیغ اور جیسے قرآن اور حضور محمد مصطفیٰ ﷺ تمام کتب اور تمام نبیوں کی شان، حقانیت، نام کے

گر بسوزد باغت انگورت دھد — درمیان ماتمے سورت دہد
لانسلم و اعتراض از ما برفت — چو عوض می آید از مفقود رفت

انگور کا پودا جل کر پھل زیادہ دیتا ہے مومن کا دل عشق کی آگ میں جل کر بہار دکھا دیتا ہے۔

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ

اور یہ کہ حکم کرو درمیان ان کے ساتھ اس کے جو اتارا اللہ نے اور نہ پیروی کرو خواہشات کی ان کے

اور یہ کہ اے مسلمان اللہ کے اتارے پر حکم کرا اور ان کی خواہشوں پر نہ چل

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ

اور ان سے احتیاط کرو کہ پھسلا دیں تم کو بعض اس سے جو اتارا اللہ نے تمہاری طرف

اور ان سے بچتا رہ کہ کہیں تجھے لغزش نہ دے دیں کسی حکم میں جو تیری طرف اترا

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ

پس اگر منہ پھیریں وہ تو جان لو کہ اللہ یہ ہی ارادہ کرتا ہے کہ پہنچائے ان کو بوجہ بعض گناہوں

پھر اگر وہ منہ پھیریں تو جان لو کہ اللہ ان کے بعض گناہوں کی سزا ان کو

ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ

ان کے اور تحقیق بہت سے لوگ بدکار ہیں کیا پس جاہلیت کا حکم

پہنچایا چاہتا ہے اور بے شک بہت آدمی بے حکم ہیں تو کیا جاہلیت کا حکم

يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

تلاش کرتے ہیں اور کون ہے زیادہ اچھا اللہ سے حکم میں واسطے اس قوم کے جو یقین رکھے

چاہتے ہیں اور اللہ سے بہتر کس کا حکم یقین والوں کے لئے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں حضور ﷺ پر قرآن مجید نازل فرمانے کا ذکر فرمایا گیا تھا اب اس قرآن سے فیصلہ فرمانے کا حکم دیا جا رہا ہے گویا نزول قرآن کا ذکر پہلے ہوا اور مقصد نزول اور حکمت نزول کا ذکر اب فرمایا جا رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں فرمایا گیا تھا کہ نزول قرآن آپ پر حق کے ساتھ ہوا ہے اب فرمایا جا رہا ہے کہ اس حق سے پھسلانے والے بہت ہیں مگر ان کی پرواہ نہ کرو۔ حق پر ثابت قدم رہو گویا قرآن کریم کی حقانیت کا ذکر پہلے ہوا اس پر استقامت کا حکم اب دیا جا رہا

فیصلے حاکم اسلام پر کرنا ضروری نہیں مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ سے مراد قرآن مجید اور حدیث نبویہ بلکہ قیاس مجتہد اور اجماع سب ہی داخل ہیں۔ **خیال رہے:** کہ پچھلی آیت میں حکم سے مراد زنا کی سزا کا حکم تھا اور یہاں حکم سے مراد قتل کی سزا کا فیصلہ ہے لہٰذا آیات میں تکرار نہیں (تفسیر خازن) وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ یہ عبارت یا تو اَنِ احْكُمْ کی تفسیر ہے یا دوسرا حکم یہاں بھی یہ ظاہر خطاب حضور ﷺ سے ہے اور مراد امت ہے اَهْوَآءَ جمع ہے هوی کی بمعنی خواہش نفسانی هُمْ کا مرجع وہ ہی اہل کتاب ہیں یعنی ان اہل کتاب کی نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرو بلکہ ان پر اسلامی حکم جاری کرو اور ان کے خاص مذہبی معاملات میں ان کی کتاب کے مطابق حکم جاری کرو بہر حال ان کی مرضی کی پیروی نہ کرو وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ۔ اس جملہ میں وہ بات بتائی گئی ہے جو عدل و انصاف کا مدار ہے یعنی ان مقدمہ والوں کی باتوں میں نہ آنا ان کی لالچ یا ڈرانے کی پرواہ نہ کرنا حذر سے مراد ہے احتیاط کرنا یعنی وہ خوف جو فریبی مکار دشمن سے ہوتا ہے جس کا نتیجہ احتیاط کرنا اور چوکنا رہنا ہوتا ہے۔ حق سے باطل کی طرف پھرنا فتنہ ہے۔ بعض سے مراد ہے وہ خاص فیصلہ قتل جو ان پوپ پادریوں نے بارگاہِ نبوت میں پیش کیا تھا یعنی ان لوگوں کا یہ عرض کرنا کہ اگر آپ نے فیصلہ ہمارے حق میں کر دیا تو ہم مع اپنی جماعت کے مسلمان ہو جائیں گے یہ وعدہ اسلام نہیں بلکہ آپ کو اس بارے میں حق فیصلہ سے روکنے سے باطل فیصلہ کرانے کی ایک چال ہے لہٰذا یہ فتنہ ہے یہاں فتنہ بمعنی آزمائش نہیں فَاِنْ تَوَلَّوْا۔ تَوَلَّوْا بنا ہے تولی سے بمعنی منہ پھیرنا اس کا فاعل وہ ہی کتابی ہیں جو حضور کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تھے یعنی اگر یہ لوگ آپ کے حق فیصلے سے منہ پھیریں اسے قبول نہ کریں باطل فیصلہ کرانا چاہیں تو فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ۔ یہ جملہ اِن کی جزاء ہے يُصِيْبُ مضارع ہے اصابتٌ کا بمعنی پہنچانا یہ دو مفعول چاہتا ہے اس کا پہلا مفعول تو هم ہے اور دوسرا مفعول پوشیدہ ہے۔ دنیاوی سزا یعنی ان کا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونا۔ ان پر جزیہ مقرر ہونا اور جلاوطن ہونا جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا کہ یہ تینوں سزائیں انہیں ملیں بعض ذُنُوْبِهِمْ سے مراد ان کی یہ ہی ہیرا پھیری کرنا ظلم کرانے کی کوشش کرنا ہے۔ ان کو بقیہ گناہوں کی سزا آخرت میں دی جاوے گی یعنی ان کی یہ سرکشی دنیاوی سزا پانے کی علامت ہے یہ پچھن مار کھانے کے ہیں یہ لوگ ان حرکتوں سے خود قہر الٰہی کو دعوت دے رہے ہیں وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ۔ یہاں كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ سے مراد یہ سرکش یہود ہیں یا ان کی مثل اور سرکش فاسقون سے مراد ہے کفر پر مضبوط اور پورے ڈھیٹ حدود الہیہ سے خارج اگرچہ سارے اہل کتاب کافر ہیں مگر ان میں سے بعض لوگ نرم پالیسی والے ہیں۔ بعض بہت سرکش اس لئے کثیر فرمایا گیا۔ اس صورت میں ناس سے مراد اہل کتاب ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ناس سے مراد سارے انسان ہوں اور کثیر سے مراد سارے کافر۔ مگر پہلی توجیہ زیادہ قوی ہے۔ یعنی بہت سے اہل کتاب بڑے ڈھیٹ ہٹ دھرم ہیں کہ اپنی قوم کے غریبوں کو دبانا چاہتے ہیں یا مومن لوگ تو اللہ سے خوف رکھتے ہیں مگر کفار بڑے سرکش اور نا ہنجار ہیں اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ اس عبارت میں ف عاطفہ ہے اور یہ عبارت ایک پوشیدہ جملہ پر معطوف ہے یعنی تَتْرُكُوْنَ حُكْمَ اللّٰهِ یا حُكْمَكَ ہمزہ استفہامیہ ہے استفہام یعنی سوال کے بہت مقصد ہوتے ہیں پوچھنا، اقرار کرانا،

خلاصہ تفسیر

اے محبوب! ﷺ ہم نے آپ پر قرآن مجید بھی اتارا اور ہم نے آپ کو یہ تین حکم بھی دیئے۔ ایک یہ کہ آپ (یعنی آپ کے نائبین حکام اسلام) اہل کتاب کفار کے درمیان اللہ تعالیٰ کے اتارے احکام جاری کریں اور ان کے مطابق ان کے فیصلے کریں وہ اتارے ہوئے احکام خواہ قرآن مجید میں ہوں یا آپ کے فرمان ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ (یعنی آپ کے نائبین) ان کفار کی خواہشات کی پیروی نہ کریں، ان کی مرضی کے مطابق فیصلے نہ فرماویں۔ تیسرے یہ کہ وہ کفار کوشش کریں گے کہ کسی طرح آپ کو (یعنی آپ کے حکام کو) حق سے لغزش دے دیں، پھسلا دیں تو ان سے محتاط رہیں ان کی چکنی چپڑی باتوں، ان کی لالچ بھری گفتگو کی طرف توجہ نہ کریں وہ ان ترکیبوں سے یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو (یعنی آپ کے حکام کو) بعض احکام اسلامیہ سے لغزش دے دیں اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرالیں۔ اگر یہ لوگ آپ کے حق فیصلے سے راضی نہ ہوں تو یقین فرمایئے کہ اس کا خمیازہ انہیں ہی بھگتنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں یعنی غلط فیصلہ کرانے کی کوشش اور حق فیصلہ پر راضی نہ ہونے کی سزا انہیں دنیا میں ہی دے آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے وہاں تو انہیں کفر اور سارے گناہوں کی سزا ملے گی۔ مگر اس جرم کی سزا دنیا میں بھی ملے گی کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوں گے بہت سے لوگ بدکار نفس نا ہنجار کے پنجہ میں گرفتار ہیں اب تک تو یہ لوگ اپنی من مانی کرتے رہے کہ سزاؤں میں بھی ذاتی اونچ نیچ کا فرق کرتے رہے کیا اب بھی وہ ہی جاہلیت کے دور کے فیصلے کرانا چاہتے ہیں بے وقوف یہ نہیں جانتے کہ رات گزر چکی، سویرا ہوگیا، نبوت کا سورج افق عالم پر چمک گیا اب ایسی اندھیر گردی کیسے ہوسکتی ہے آپ کا حکم اللہ کا حکم ہے اور اللہ سے بہتر کس کا حکم ہوسکتا ہے مگر یہ عقیدہ تو ایمان والوں کا ہے یہ بے دین تو اللہ کے مقابل اپنے نفس کے حکم کو ترجیح دیتے ہیں۔ خیال رہے کہ اللہ کے حکم دو قسم کے ہیں تکوینی حکم اور تشریعی حکم تکوینی حکم میں بندوں کو کچھ اختیار نہیں ہے جیسے انسانی جسم کے اعضاء کا اپنے مقامات پر ہونا، کالا گورا ہونا، سعید وشقی ہونا، جینا مرنا، ان پر ثواب عذاب بھی نہیں ملتا تشریعی حکم میں بندوں کو اختیار دیا جاتا ہے اور اس پر ثواب وعذاب ہوتا ہے جیسے نماز وروزے وغیرہ کا حکم تکوینی حکام کے متعلق سب کو یقین ہے کہ بالکل برحق ہیں اگر آنکھیں پاؤں میں کان پیٹھ میں ہوتے تو مصیبت پڑ جاتی۔ جب اللہ تعالیٰ کے تکوینی احکام کو برحق مانتے ہو تو اس کے تشریعی احکام کو بھی برحق مانو اس سے بہتر کس کا حکم ہوسکتا ہے؟

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اسلامی حاکم کافر رعایا کو سزائیں وغیرہ اسلامی دے گا نہ کہ ان کی مروجہ سزائیں لہٰذا کافر چور کے ہاتھ کاٹے گا، کافر قاتل کو قتل کرے گا۔ یہ فائدہ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے حاصل ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** کوئی شخص اپنے کو کفار وفساق کے فریب ومکر سے محفوظ نہ جانے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو ان سے محتاط رہنے کا حکم دیا تو ہم کس شمار میں ہیں۔ یہ فائدہ وَاحْذَرْهُمْ الخ سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** حکام کو فیصلہ میں بہت ہی احتیاط کرنی چاہیے مقدمہ والے بہت ہی دھوکہ دیتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے۔ یہ فائدہ بھی وَاحْذَرْهُمْ الخ سے حاصل ہوا۔

چیزوں پر استقامت یعنی اے محبوب! یونہی عمل کیے جایئے، جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے: یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ (الاحزاب:۱) مطلب یہ ہی ہے کہ اے محبوب! اسی طرح تقویٰ پر قائم رہیے ورنہ یہ حکم تو بعد میں آیا حضور ﷺ پہلے ہی ان یہود کی عرض و معروض کو ٹھکرا چکے تھے جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوا نیز یہ آیت مدنیہ ہے حضور ﷺ کو کفار مکہ نے بڑی بڑی لالچ دیں ہر طرح ڈرایا مگر حضور ﷺ کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی

وہ آفت جب فضاء آسمان بھی تھرتھراتی تھی محمد تھے کہ ان کے پاؤں میں لغزش نہ آتی تھی

حضور ﷺ کی استقامت کی مثال نہ ملے گی۔ اس بے مثال محبوب کی ہر ادا بے مثال ہے۔

تیسرا اعتراض: اس آیت کریمہ میں یہ کیوں فرمایا گیا کہ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کفار تو حضور ﷺ کو ہر حکم الٰہی سے ہٹانے کی خواہش رکھتے تھے۔ **جواب:** اس موقعہ پر انہوں نے قتل کے فیصلہ میں حضور سرکار کو ہٹانا چاہا تھا اپنے اور اپنی قوم کے اسلام کی لالچ دے کر۔ اس واقعہ کے لحاظ سے یہ ارشاد ہوا۔

چوتھا اعتراض: یہاں بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ کیوں فرمایا گیا کیا کفار کو سارے جرموں کی سزا نہ ملے گی انہیں تو ہر جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ **جواب:** یہاں دنیاوی سزا مراد ہے۔ قتل، قید، جلاوطنی، مسلمانوں کا رعایا بن جانا وغیرہ اور واقعی کفار کو دنیا میں تو بعض جرموں کی ہی سزا ملتی ہے وہ سزا بھی بعض ہی ہوتی ہے تمام جرموں کی پوری سزا تو بعد قیامت ہی ملے گی۔

پانچواں اعتراض: یہاں یہ کیوں ارشاد ہوا کہ بہت سے لوگ فاسق ہیں كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ۔ کفار تو سارے ہی فاسق ہیں کیا ان میں بعض نیک کار بھی ہیں۔ **جواب:** یہاں النَّاسِ سے مراد سارے انسان ہیں جن میں مومن کفار سب ہی داخل ہیں۔ مومن تھوڑے ہیں کافر زیادہ لہٰذا یہ فرمانا بالکل حق ہے کہ بہت لوگ فاسق ہیں یعنی تھوڑے لوگ متقی اور اگر النَّاسِ سے مراد کفار ہی ہوں تب بھی کفار دو قسم کے تھے ایک سرداران کفر دوسرے ان کے مطیع و فرمانبردار بڑے پاجی فاسق یہ ہی سردار تھے دوسرے لوگ تو ان کی پیروی میں کافر ہوئے تھے۔ اس صورت میں کثیر سے مراد کثرت اضافی نہیں بلکہ کثرت حقیقی ہے۔

چھٹا اعتراض: اللہ تعالیٰ کا حکم بہرحال ہر شخص کے لئے اچھا ہے۔ پھر یہاں لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ کیوں فرمایا گیا یقین والوں کے سوا دوسروں کے لئے رب تعالیٰ کا حکم اچھا نہیں (آریہ) **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ یہاں لام بمعنی عند ہے یعنی یقین والے مؤمنوں کے عقیدہ میں رب کا حکم سب سے اچھا ہے کفار تو اپنے خواہش نفسانی کے فیصلے کو ہی اچھا سمجھتے ہیں۔ یہاں واقعیت کا ذکر نہیں ان کے خیالات کا ذکر ہے۔

تفسیر صوفیانہ

صورت میں ہر انسان یکساں ہے مگر سیرت اور سعادت و شقاوت میں مختلف کوئی روح سعید ہے کوئی شقی سعادت و شقاوت۔ چہرے سے معلوم نہیں ہوتی بلکہ دلی رجحان سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ دل کا رجحان شریعت مطہرہ کے خلاف احکام کی طرف ہونا علامت شقاوت ہے اور شریعت پاک سنت مصطفوی کی طرف

ان میں کے بعض دوست ہیں بعض کے اور جو دوستی کرے گا ان سے تم میں سے پس تحقیق وہ ان سے ہوگا

وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی رکھے تو وہ انہیں میں سے ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۱﴾

بیشک اللہ نہیں ہدایت دیتا ظالم قوم کو

بیشک اللہ بے انصافوں کو راہ نہیں دیتا

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں یہود ونصاریٰ اور سارے کفار سے محتاط رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اب ان سے محبت و دوستی رکھنے سے سخت ممانعت فرمائی جارہی ہے گویا معمولی خطرہ کے بعد بڑے خطرہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ مسلمان اپنی زبان اپنے قلب کو یہود و نصاریٰ کے وسوسے اور شرارتوں سے محفوظ رکھیں اب ارشاد ہو رہا ہے کہ اپنے خیالات اور دلوں کو ان کے خطرات ان کی محبت و میلان سے محفوظ رکھو گویا قالب کے اخلاص کے بعد قلب کے اخلاص کی تاکید فرمائی جارہی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کفار کو دنیا میں بھی عذاب دینا چاہتا ہے اس لئے ان کے دماغ اوندھے ہیں۔ اب مسلمانوں سے فرمایا جارہا ہے کہ تم اپنے کو اس عذاب سے بچائے رہنا اگر تم نے ان کفار سے محبت کی تو تم بھی عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ وہ تباہ ہوں گے اپنی حرکتوں کی وجہ سے تم تباہ ہو گے ان مجرموں کی محبت کی وجہ سے۔ گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔

شان نزول

ایک بار حضرت عبادہ ابن صامت جو بنی حارث ابن خزرج قبیلہ سے تھے یعنی انصاری خزرجی تھے انہوں نے بارگاہِ نبوت میں عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہود کی بہت بڑی جماعت جو بڑی دولت منداور جاہ جلال والی ہے ان سے میری گہری دوستی تھی، میں نے اسلام قبول کر کے ان سب سے علیحدگی اختیار کر لی، میں نے اللہ رسول کی محبت پر ان سب کی محبتوں کو قربان کر دیا وہاں ہی عبداللہ ابن ابی ابن سلول بھی اتفاقاً موجود تھا وہ بولا کہ مگر میں نے یہود سے اپنے تعلقات نہیں توڑے کیونکہ مجھے ان کے تعلقات کی ضرورت ہے حالات زمانہ کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے تعلقات رکھے جاویں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ یہود سے محبت تو ہی کر سکتا ہے عبادہ نہیں کر سکتے وہ بولا ہاں مجھے ان سے محبت منظور ہے اس موقعہ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خازن، روح المعانی، تفسیر کبیر وغیرہ)۔

(۲) غزوہ خندق کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کا محاصرہ فرمایا تو ان کے محلہ میں کسی کام کے لئے حضرت ابولبابہ ابن عبدالمنذر کو بھیجا بنی قریظہ نے ان سے پوچھا کہ اگر ہم اپنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کر دیں تو حضور ہمارے ساتھ کیا معاملہ فرمائیں گے۔ ابولبابہ نے اپنے حلق پر انگلی پھیر کر اشارۃً بتایا کہ تم سب قتل کیے جاؤ گے۔ پھر شرمندہ ہوئے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راز دشمنوں پر فاش کر دیا۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خازن)۔

خدا بھی ایک نہیں مگر مسلمان قوم جس کا خدا، رسول، کلمہ، قرآن، کعبہ ہر چیز ایک ہے وہ متفق نہ ہو کتنی شرم کی بات ہے اس آیت میں رب تعالیٰ نے مسلمانوں کی غیرت کو جھنجوڑا ہے۔ دوسرے یہ کہ دوسرے بعض سے مراد دونوں یہود و نصاریٰ ہیں یعنی تمہارے مقابلہ میں عیسائی یہودیوں کے اور یہودی عیسائیوں کے دوست ہیں اگرچہ ان کے آپس میں کتنے ہی اختلاف ہوں مگر تمہاری دشمنی میں سب ایک ہیں لہٰذا تم کو ان سے مل کر نفع نہ ہوگا، نقصان ہی ہوگا۔ بہت تعجب ہے کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کو گالیاں دیتے ہیں۔ یہود نے ہی جناب مسیح کو سولی دینے کی کوشش کی مسلمان حضرت مسیح ان کی والدہ کے دل سے معتقد مگر عیسائی مسلمانوں کے مقابلہ میں یہود کے دوست ہیں لہٰذا اے مسلمانو! دنیا میں کوئی کافر تمہارا دوست نہیں تم آپس میں متفق ہو کر رہو۔ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اس عبارت میں اس جرم کی سزا کا ذکر ہے۔ مَنْ سے مراد ہر مسلمان ہے خواہ عالم ہو یا جاہل پیر ہو یا فقیر، متقی ہو یا فاسق جیسے ہر پیر فقیر عالم جاہل کو سانپ کا زہر یکساں مضر ہے یوں ہی محبت کفار سب ہی کو نقصان دہ ہے کوئی نہ کہے کہ میں ولی ہوں مجھے مضر نہیں۔ ھم کا مرجع وہ ہی یہود و نصاریٰ ہیں اور اس جملہ کی بھی چند تفسیریں ہیں۔ ایک یہ کہ جو ان یہود و نصاریٰ سے دینی محبت رکھے کہ ان کے دین کو اچھا سمجھے وہ انہی میں سے ہوگا یعنی کافر ہوگا مومن نہ رہے گا۔ دوسرے یہ کہ جو ان سے قوی محبت رکھے یا مسلمانوں کے مقابل ان سے محبت کرے، ان کی مدد کرے تو حکم شرعی میں اس قوم سے شمار ہوگا کہ ان ہی کے ساتھ اس سے ہی مسلمان جہاد کریں گے مثلاً کوئی مسلمان یہود و نصاریٰ کے ساتھ مسلمانوں کے مقابل لشکر میں آوے تو مجاہدین کے ہاتھوں وہ بھی مارا جائے گا اور یہ غازی مسلمان اس قتل میں گناہ گار نہ ہوں گے یا جو ان سے بلاوجہ مدد لے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دو قومی حیثیت سے ان میں شمار ہوگا جو مسلمان ان کے اعمال کو اچھا سمجھے ان کی صورت ان کی سیرت اسے پسند ہو تو وہ قیامت میں ان میں سے ہوگا، اس کا حشر ان کفار ہی کے ساتھ ہوگا یہ بھی بڑا عذاب ہے۔ جیسے کسی مہمان کو بھنگی چماروں کے ساتھ بٹھا دیا جاوے تو یہ اس کی ذلت ہے۔ فقیر کی یہ تفسیر اور قیود خیال میں رہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ یہ اس جرم کی دوسری سزا کا ذکر ہے یہاں ظٰلِمِيْنَ سے مراد وہ مسلمان ہیں جو ان یہود و نصاریٰ سے محبت کریں یعنی اپنی محبت غیر محل میں صرف کریں ایسوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے گا ہی نہیں کہ وہ اسلام پر قائم رہیں یا ان کی مدد نہ فرمائے گا جس سے وہ راہ راست پر رہیں بلکہ ان کو ان کے نفس کے حوالہ کر دے گا۔ محبت کفار سے ان کی دل میں ہدایت کی جگہ رہے گی ہی نہیں لہٰذا یہ گناہ تمام گناہوں سے بدتر ہے کہ دوسرے گناہوں کا اثر قالب پر پڑتا ہے مگر محبت کفار کا اثر دل و دماغ بلکہ روح اور ایمان پر پڑتا ہے محبت کفار کا نتیجہ کفر ہے۔

خلاصہ تفسیر اس آیت کریمہ میں چار باتیں ارشاد ہوئیں۔ یہود و نصاریٰ کی دوستی سے ممانعت۔ اس ممانعت کی حکمت بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ۔ اس محبت کی دو سزائیں ایک دنیاوی فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ۔ دوسری اخروی لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ چنانچہ ارشاد ہوا اے مسلمانو! کبھی یہودیوں عیسائیوں کو ولی دوست نہ بناؤ نہ انہیں دوست سمجھو یہ لوگ اگرچہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں کہ یہود تو عیسائیوں کے دشمن ہیں اور عیسائی یہود کے دشمن مگر

ہے تو حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر یہ عیسائی مر گیا تو کسے رکھو گے جس کو اس کی موت کے بعد رکھو گے اسے ہی اب رکھ لو۔ اللہ نے ان کو مسلمانوں سے دور کیا ہے تم انہیں کیوں قریب کرتے ہو دیکھو (تفسیر خازن وغیرہ) **چھٹا فائدہ:** جس مسلمان کے دل میں کفار سے محبت ہو اس کا ایمان خطرہ میں ہے۔ یہ فائدہ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ سے حاصل ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** کفار سے تجارتی لین دین کرنا ان میں عدل وانصاف کرنا اگر وہ ہمارے پڑوسی ہوں تو ان کے حق پڑوسیت ادا کرنا بوقت ضرورت ان سے مدد لینا یا ان کی دنیاوی مدد کرنا، ان سے بغیر سودی قرض کا لین دین کرنا جائز ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب وفات پائی تو آپ کی ذرہ ایک یہودی کے ہاں گروی تھی اور اس کا آپ پر قرض تھا کیونکہ یہ ولایت و دوستی نہیں یہ تو معاملہ ہے معاملات اور دوستی میں بڑا فرق ہے (از روح البیان) **آٹھواں فائدہ:** یہود و نصاریٰ کی شکل بنانا ان کے سے لباس و وضع قطع رسم و رواج اختیار کرنا حرام ہے کہ اس میں صورۃً ان سے دوستی ہے اگرچہ دل میں ان سے محبت نہ ہو (روح البیان) فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ میں صرف یہود و نصاریٰ سے دوستی کرنے کی ممانعت کیوں فرمائی تمام کفار مسلمانوں کے دشمن ہیں ان سے دوستی خطرناک ہے۔ پھر صرف ان دو قوموں کا خصوصیت سے کیوں ذکر فرمایا؟ **جواب:** چند وجہ سے ایک یہ کہ اس آیت کے نزول کے وقت مدینہ منورہ میں یہ ہی دو قومیں تھیں یہود اور نصاریٰ۔ مشرکین قریباً ختم ہو چکے تھے وہ ایمان لا چکے تھے دوسرے یہ کہ ان دونوں قوموں کا اس ملک میں بہت اثر تھا دولت مند، اہل علم، جتھہ والے یہ ہی لوگ تھے حتیٰ کہ اہل مدینہ اکثر و بیشتر ان کے مقروض تھے ان سے پرانے تعلقات تھے جن کا توڑنا ضروری تھا۔ عہد صحابہ میں اکثر لڑائیاں ان ہی دو قوموں سے ہوئیں تیسرے یہ کہ ان کی عورتوں سے مسلمانوں کا نکاح درست تھا اندیشہ تھا کہ اس رشتہ کی وجہ سے مسلمان ان کی محبت میں گرفتار ہو کر نقصان نہ اٹھائیں چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ مسلمان آئندہ چل کر یہود و نصاریٰ کی محبت، ان سے میل جول، ان کی مشابہت میں بہت گرفتار ہوں گے یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دے دی تھی کہ میری امت اہل کتاب کے نقش قدم پر چلے گی۔ حتیٰ کہ اگر کسی عیسائی نے اپنی ماں سے زنا کیا ہو گا تو میری امت میں بھی ایسا شخص ہو گا جو اپنی ماں سے زنا کرے گا۔ اس کا مشاہدہ آج بھی ہو رہا ہے۔ مسلمان عیسائیوں کی محبت میں فنا ہوئے جا رہے ہیں۔ ان وجوہ سے خصوصیت سے ان کا ذکر فرمایا اس تخصیص میں بہت حکمتیں ہیں۔

دوسرا اعتراض: اسلام نے یہود و عیسائی عورتوں سے نکاح کیوں حلال رکھا۔ جب ان سے نکاح ہو گا تو محبت بھی ہو گی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان سے نکاح کرو اور محبت نہ کرو۔ **جواب:** محبت بہت سی قسم کی ہوتی ہے۔ شہوانی محبت، قومی محبت، ملکی محبت، دینی محبت، دلی محبت، روحانی محبت، ایمانی محبت کفار کے ساتھ دلی محبت حرام ہے۔ جسمانی، شہوانی محبت درست جیسے کہ خاوند کو بیوی سے انس و محبت فطری طور پر ہوتی ہے۔ لہٰذا نکاح کی اجازت اس محبت کی ممانعت کے خلاف نہیں

لطیفہ: کسی کالج کے مسلمان لڑکوں نے اپنے عیسائی پرنسپل سے جو انگریز تھا پوچھا کہ آپ نے اتنا کچھ خرچ کر کے کتنے مسلمان عیسائی بنائے۔ حساب بتاؤ کہ کتنے مسلمان عیسائی بنے وہ ہنس کے بولا یہ نہ پوچھ بلکہ یہ پوچھو کہ کتنے مسلمان، مسلمان رہے ہم مسلمانوں کے دل ودماغ صورت سیرت پر چھا گئے۔ نام تمہارے اسلامی رہ گئے ہیں کام سب عیسائیوں کے سے ہو گئے

تو چہ دانی عہد ما باما چہ کرد   از جمال مصطفےٰ بیگانہ کرد!

ہم کو عیسائیوں نے کھلونے دے کر جمال مصطفوی سے بیگانہ کر دیا۔

چھٹا اعتراض: اگر یہاں اولیاء بمعنی مددگار ہو۔ اور یہود و نصاریٰ کو مددگار بنانا ان سے مدد لینا ہی ممنوع ہو تو آج مسلمان جی نہیں سکتے ہر اسلامی سلطنت فنی، معاشرتی، اقتصادی مدد امریکہ و برطانیہ سے لیتی ہے بلکہ بہت سی اسلامی سلطنتیں امریکہ وغیرہ کی مالی امداد سے قائم ہیں۔ **جواب:** یہاں اولیاء بمعنی دوست ہے تب تو یہ اپنے عموم پر ہے کسی کافر کو مذہبی دوست بنانا کفر ہے انہیں قومی دوست بنانا حرام ہے اور مسلمانوں کی تباہی کا باعث اور اگر بمعنی مددگار ہے تو اس میں کچھ قید لگانا ضروری ہے یعنی بلاضرورت انہیں مددگار نہ بناؤ یا مسلمانوں کے مقابلہ میں انہیں مددگار نہ بناؤ کہ ان کی مدد لے کر مسلمان قوم کو تباہ و برباد کر دو یا ان سے ایسی مدد نہ لو جس سے تم ان کے قبضہ میں آ جاؤ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن جاؤ کہ انہیں کلیدی آسامیاں دے دو جس سے وہ تمہارے ملک و قوم پر قابض ہو جاویں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعہ پر کفار کی امداد قبول نہ فرمائی اور بعض موقعوں پر قبول فرمالی ضرورت نہ تھی قبول نہ کی ضرورت تھی اور اس امداد سے ہمارا کوئی نقصان نہ تھا تو قبول فرمالی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک اس آیت کریمہ کی جیتی جاگتی زندہ جاوید تفسیر ہے بہرحال آیت واضح ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بڑے غیور ہیں ان کی غیرت کا تقاضا ہے کہ ان کا چاہنے والا دوسروں کے دروازوں پر نہ جائے یار اس دل میں رہتا ہے جس میں اغیار نہ ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر یہ مکھی کبھی نہ بیٹھی کیونکہ وہ گندگی پر بھی بیٹھ جاتی ہے۔ شہد کی مکھی حاضر بارگاہ ہوتی تھی کہ وہ صرف پھولوں پر ہی بیٹھتی ہے یہاں ہرجائی کا کام نہیں۔ یہاں وہ چاہیے جو صرف ان کا ہو رہے اس لئے ارشاد ہوا کہ اے وہ لوگو جو ایمان لا کر ہمارے اور ہمارے محبوب کے ہو چکے خبردار یہود و نصاریٰ بلکہ کسی کافر کو اپنے دل میں نہ بساؤ انہیں دوست نہ بناؤ اگر تم نے انہیں دوست بنایا تو پھر تم ان ہی کے ہو رہو گے ادھر کے نہ ہو گے ہمارے ہاں نسب نہیں دیکھا جاتا نسبت دیکھی جاتی ہے۔ جیسے آنکھ کو گرد و غبار سے محفوظ رکھنے کے لئے قدرت نے پلکوں پپوٹوں کے پردے لگا دیئے ہیں۔ دل کو کفر کی گرد و غبار سے بچانے کے لئے ایمان کے غلاف میں رکھو ورنہ ظالم ہو گے اور ظالم کو ہدایت نہیں ملتی۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ

پس دیکھو گے تم ان لوگوں کو جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ جلدی کرتے ہیں ان میں

نہیں کیونکہ کیڑا خوردہ ہے گویا پچھلی آیت کریمہ میں دعویٰ تھا اوران آیات میں اس کا ثبوت ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں مسلمانوں کو یہود ونصاریٰ کی محبت سے ممانعت فرمائی گئی اب اندیشہ کو دور فرمایا جارہا ہے۔شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ان سے محبت نہ رکھنے میں ہم پر دنیاوی مصیبتیں آجائیں گی۔ فرمایا جارہا ہے کہ ایسے خیالات کو دل میں جگہ نہ دو اللہ پر توکل کرو۔ منافقین کے دلوں میں ایسے خدشات پیدا ہوتے ہیں تم رب تعالیٰ پر توکل کرو اللہ تم کو ان کفار سے بے نیاز کردے گا۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں یہود ونصاریٰ کی دوستی ان کی محبت سے منع فرمایا گیا۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ یہ حکم قطعی ہے اس کے متعلق کسی کے عذر لنگ نہ سنے جائیں گے کہ ہم فلاں مجبوری کی وجہ سے ان سے محبت کرتے ہیں۔ غرضکہ پچھلی آیت میں حکم تھا اب اس حکم کی اہمیت کا بیان ہے۔

شان نزول

عبداللہ ابن ابی اور اس کی جماعت کے دوسرے منافقین مدینہ خیبر اور نجران کے یہود سے خفیہ تعلقات، میل ملاپ، آمدورفت، لین دین رکھتے تھے۔ جب مسلمان اس پر مطلع ہوتے اوران سے پوچھتے کہ تم یہ کیا حرکت کررہے ہو تو وہ کہہ دیتے کہ دنیا میں آفتیں، مصیبتیں، گرانی، قحط سالی، بیماریاں آتی رہتی ہے۔ ہمارے ان یہود سے پرانے تعلقات ہیں آفات ومصیبتوں میں یہ لوگ ہمارے کام آتے ہیں، ہماری مدد کرتے ہیں اس لئے ہم ان سے تعلقات قائم رکھنے پر مجبور ہیں مگر ان کے دل میں یہ تھا کہ مسلمانوں کا اعتبار نہیں، اسلام کو فروغ ہو یا نہ ہو یہ تو ایک وقتی چیز ہے کچھ روز بعد اسلام ختم ہوجاوے گا ہم اس عارضی چیز کی وجہ سے اپنے ان پرانے دوستوں سے کیوں بگاڑ لیں۔ اس آیت کریمہ میں ان کی اس حرکت کا ذکر فرمایا گیا اور مسلمانوں کو اسلام کے دائم قائم رہنے اور آئندہ اسلامی فتوحات کی خوش خبری دی گئی ہے (تفسیر خازن)۔

تفسیر

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ، عام مفسرین فرماتے ہیں کہ فَتَرَى کی ف ترتیب کی ہے جس سے یہ بتایا گیا کہ کفار سے محبت کرنے پر یہ انجام مرتب ہوتا ہے۔ امام کرخی فرماتے ہیں کہ ف عاطفہ ہے اور یہ جملہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (مائدہ:۵۱) پر معطوف ہے فتری میں خطاب یا تو حضور ﷺ سے ہے یا ہر مسلمان سے تَرٰی بنا ہے رؤیت سے بمعنی دیکھنا، خواہ آنکھ سے دیکھنا ہو یا دل سے دیکھنا یعنی معلوم کرنا یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں الَّذِيْنَ سے مراد منافقین مدینہ ہیں اور مرض سے مراد دل کی بیماری نفاق ہے مرض کی تنوین تعظیمی ہے یعنی بڑا اور مہلک مرض بد اعتقادی کی بیماری جیسے جسم کے بعض مرض تکلیف دہ ہوتے ہیں مگر مہلک نہیں ہوتے اور بعض مرض مہلک ہوتے ہیں یوں ہی دل میں گناہوں کی طرف میلان دل کی تکلیف دہ بیماری ہے مگر کفار یا کفر کی طرف میلان دل کی مہلک بیماری ہے۔ جسم کی مہلک بیماری جان لیتی ہے لیکن دل کی مہلک بیماری ایمان ختم کردیتی ہے۔ یہاں مرض کا ذکر فرما کر یہ بتایا گیا کہ ان کی جو کچھ حرکتیں ہیں ان کی وجہ منافقت ہے اگر ان میں منافقت نہ ہوتی تو انہیں نہ ایسے اندیشے ہوتے نہ اس جرم کی ہمت کرتے نہ ان کے دل یہودیوں عیسائیوں کی طرف مائل ہوتے اگرچہ حضور ﷺ اور مسلمان ان کے نفاق سے پہلے ہی خبردار تھے مگر ان

فدک و نجران مراکز یہود کو فتح فرمالیں گے ان لوگوں کو حیرت ہو جاوے گی اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ یہ عبارت فتح پر معطوف ہے امر یعنی حکم سے مراد فتح کے علاوہ کوئی اور چیز ہے اس میں گفتگو ہے کہ وہ کیا چیز مراد ہے بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد منافقوں کے سرداروں کی موت ہے، بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد منافقین کی رسوائی ہے، بعض کے نزدیک یہود مدینہ بنی قریظہ کا قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی ہے کہ ان کے دل میں مسلمانوں کا رعب اس قدر بیٹھ جاوے کہ وہ بغیر جنگ و قتال کے جزیہ، قتل، جلاوطنی پر راضی ہو جاویں، اپنے کو مسلمانوں کے حوالہ کر دیں یہ ہی آخری بات قوی ہے یعنی عنقریب وہ وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمان غازیوں کو جہادوں میں فتح و نصرت دے کر شہروں و ملکوں کا انہیں مالک بنادے یا بغیر جہاد ہی یہود کے علاقہ مسلمانوں کو بخش دے رب تعالیٰ نے اپنے یہ دونوں وعدے ایسے پورے فرمائے کہ دنیا نے دیکھ لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات شریف میں ہی خیبر وغیرہ فتح ہو گئے اور بنی قریظہ قتل کیے گئے، بنی نضیر جلاوطن فَیُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ۔ یہ عبارت گزشتہ مضمون کا نتیجہ ہے ف تعقیبیہ ہے فَیُصْبِحُوْا اور اَسَرُّوْا کا فاعل اور اَنْفُسِهِمْ ضمیر کا مرجع یہ ہی بکواس کرنے والے منافقین ہیں ما سے مراد نفاق یا یہود و نصاریٰ کی محبت یا ان کا یہ خیال ہے کہ اسلام ایک عارضی دین ہے، عنقریب فنا ہو جاوے گا۔ ندامت سے مراد شرمندہ ہو کر پچھتانا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ کے ان دونوں وعدوں کا ظہور ہوگا تو یہ منافقین اپنے کیے پر پچھتائیں گے کہ ان کے دوست یہود تو حجاز سے ختم ہو جائیں گے اور مسلمان ان کا اعتبار نہ کریں گے یہ بے یار و مددگار رہ جائیں گے وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا قوی یہ ہے کہ یہ نیا جملہ ہے اور واؤ ابتدائیہ ہے اس میں ان منافقین کی دوسری درگت کا ذکر ہے۔ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا سے مراد وہ ہی حضرات صحابہ ہیں جن سے وہ منافقین مذکورہ چالبازی چاپلوسی کی گفتگو کیا کرتے تھے یعنی اس موقعہ پر یہ مسلمان ان منافقوں کے منہ پر علانیہ یہ کہیں کہ اَهٰۤؤُلَاۤءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ اس عبارت کی بہت تفسیریں ہیں۔ قوی تفسیر یہ ہے کہ یہ پوری عبارت مؤمنین کا کلام ہے اور الَّذِیْنَ سے مراد اور اَقْسَمُوْا کا فاعل اور اَیْمَانِهِمْ یوں ہی اِنَّهُمْ کی ضمیروں کا مرجع یہ ہی منافقین ہیں اور لَمَعَكُمْ میں خطاب ان لٹنے پٹنے نکالے جانے والے یہودیوں سے ہے اور معنی یہ ہیں کہ جب یہود کی درگت بنے گی اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مصیبت پر مصیبت پائیں گے اور منافقین جو یہود سے کہا کرتے تھے کہ اے یہودیو! اگر تم سے مسلمانوں کی جنگ ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اگر تم کو مسلمانوں نے نکالا تو ہم تمہارے ساتھ نکل چلیں گے مگر اس وقت یہ باتیں بنانے والے منافقین خاموش رہیں گے بلکہ مسلمانوں کی خوشامدیں کرنے لگیں گے۔ تب مسلمان ان یہود سے خطاب کر کے کہیں گے کہ دیکھو یہ ہیں وہ منافقین جو تم سے ایسے وعدے کرتے تھے اور آج تم سے الگ ہو گئے لہٰذا ساتھ ہونے سے مراد دین یا مدد و تعاون میں ساتھ ہونا ہے اس جملہ کی اور کئی تفسیریں ہیں۔ جو تفسیر خازن، روح المعانی، تفسیر کبیر وغیرہ نے فرمائیں۔ مگر یہ تفسیر بہت واضح بھی ہے اور قوی بھی۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِیْنَ۔ اس جملہ کی بھی بہت تفسیریں ہیں۔ قوی یہ ہے کہ یہ بھی مسلمانوں کا ہی کلام ہے اور خطاب یہود سے ہے لہٰذا حَبِطَتْ سے مراد ہے بیکار اور برباد ہو جانا، اعمال سے مراد ہے، منافقوں کا یہود کی مدد کرنا، انہیں

مَّرَضٌ سے حاصل ہوا۔ پختہ ایمان کی علامت ہے ہر بے دین سے نفرت، مسلمانوں سے محبت۔ **دوسرا فائدہ:** عذر گناہ بدتر از گناہ ہے یعنی اپنے گناہ کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرنا منافقون کا طریقہ ہے۔ یہ فائدہ **یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰی** الخ سے حاصل ہوا مومن گناہ سے توبہ کرتا ہے، بہانے یا معذرت نہیں کرتا۔ **تیسرا فائدہ:** محبت تین قسم کی ہے۔ محبت نفسانی، محبت ایمانی، محبت شیطانی جو دنیاوی غرض کے لئے محبت ہو وہ محبت نفسانی ہے یہ فانی ہے غرض گئی محبت گئی۔ جو گناہوں جرموں کے لئے محبت ہو وہ شیطانی ہے جیسے جواریوں، شرابیوں کی جوئے و شراب کے لئے محبت یہ محبت بہت جلد عداوت میں تبدیل ہو جاتی ہے جو محبت اللہ رسول کے لئے ہو وہ محبت ایمانی ہے یہ غیر فانی ہے کیونکہ اس محبت کی بنیاد مضبوط ہے چونکہ منافقوں اور یہودیوں کی محبت نفسانی تھی لہٰذا فنا ہو گئی صحابہ کی آپس کی محبتیں اور حضور انور سے محبت ایمانی تھی وہ باقی رہی۔ **چوتھا فائدہ:** خوشامدی لوگ جو کسی غرض کی بنا پر محبت و الفت کا دم بھرتے ہیں وہ وقت پر دھوکا دے جاتے ہیں۔ دیکھو منافقین مدینہ یہود مدینہ سے نفسانی محبت رکھتے تھے مگر جب ان پر وقت پڑا تو سارے منافق دھوکہ دے کر گھروں میں بیٹھ رہے۔ شیخ سعدی کہتے ہیں

دوست مشمار آنکہ در نعمت زند   لاف یاری و برادر خواندگی

پانچواں فائدہ: دنیاوی خطرات کی بنا پر دین کو خطرہ میں ڈالنا طریقہ منافقین ہے۔ یہ فائدہ **اَنْ تُصِیْبَنَا دَآىِٕرَةٌ** سے حاصل ہوا۔ منافقین مصیبت دنیاوی کے خطرہ سے یہوذ سے محبت و میل جول رکھتے تھے حالانکہ ان سے میل جول دین کے لئے خطرناک تھا۔ مومن دنیا کو دین پر قربان کرتا ہے۔ **چھٹا فائدہ:** اللہ تعالیٰ کے سارے وعدے سچے ہیں، اس کے خلاف محال بالذات اور یقینی ناممکن ہے اگرچہ وہ وعدے ممکن وغیرہ الفاظ سے کیے جاویں دیکھو رب تعالیٰ نے مسلمان سے فتوحات اور کفار سے ذلت جلا وطنی کے وعدے عسی فرما کر کیے مگر یہ سب وعدے پورے ہوئے۔ یہ فائدہ **فَعَسَى اللّٰهُ** الخ سے حاصل ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** دو گھر کا مہمان بھوکا رہتا ہے ہر دل عزیز بننے والا دو طرفہ ذلیل ہوتا ہے، صلح کل کا انجام شرمندگی ہے۔ یہ فائدہ **فَیُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا** الخ سے حاصل ہوا منافق دو طرفہ ذلیل ہوئے انہیں نہ مسلمانوں میں عزت ملی نہ یہود میں۔ **آٹھواں فائدہ:** تقیہ یعنی منافقت اور دورخا پن نیکیاں برباد ہو جانے کا ذریعہ ہے۔ یہ فائدہ **حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** سے حاصل ہوا۔ **نواں فائدہ:** تقیہ باز یعنی منافق آدمی کسی کے کام نہیں آتا وہ مسلمانوں کے لئے مفید تو کیا ہوتا کفار کے لئے بھی بیکار ثابت ہوتا ہے اس لئے اس پر کفار بھی اعتبار نہیں کرتے۔ یہ فائدہ **اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ** الخ کی اس تفسیر سے حاصل ہوا جو ہم نے عرض کی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ منافقین فتح مکہ یا یہود مدینہ کے جلا وطن و قتل کے بعد نادم ہوں گے حالانکہ وہ تو اول سے ہی نادم رہتے تھے مسلمانوں سے چھپتے پھرتے تھے پھر یہ آیت کریمہ کیونکر درست ہوئی؟ **جواب:** ان فتوحات سے پہلے وہ ڈھیٹ تھے بے شرمی سے مسلمانوں

بہت ڈرتے تھے، ایمان لاتے ہی بولے فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ (طٰہٰ:٧٢) جو تجھ سے ہو سکے کر لے منافقین کے دل میں ایمان نہ تھا تو انہیں قحط، بھوک دیگر دنیاوی آفات کا ہر وقت دھڑکہ لگا رہتا تھا۔ اس دھڑکے سے وہ یہود و نصاریٰ کی بھی خوشامدیں کرتے تھے اور مسلمانوں کی بھی مخلص مؤمنوں کے دل قوی تھے وہ ہر مصیبت سے لاپرواہ تھے ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ جیسے بعض غذائیں بعض دوائیں جسم کو قوت دیتی ہیں ایسے ہی اخلاص، ایمان، دل کو قوت بخشتے ہیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی دلی کمزوری کا ذکر فرمایا جو نفاق کی وجہ سے تھی۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ نفس امارہ اور شیطان ہمارے اندرونی یہود و نصاریٰ ہیں جو شخص دل کو بھی چاہے، نفس کو بھی وہ منافق ہے ان کی محبت انسان کو دوزخ کی طرف لے جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

آنچہ در فرعون بود اندر توہست — لیک از درہات محبوس چہ است
چہ خرابت می کند نفس لعین — دور می اندازدت سخت ایں قریں
آتشت در ہیزم فرعون نیست — زانکہ چوں فرعون اوراعون نیست

یعنی تیرے نفس میں بھی فرعون جیسی سرکشی ہے مگر چونکہ تیرے پاس فرعون جیسے اسباب نہیں ہیں اس لئے نفس اس کی سی حرکتیں نہیں کر سکتا اگر اس کے پاس اسباب ہوں تو یہ بھی فرعون بن کر دکھادے غرضکہ سب کچھ تیرے اندر ہی ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کلمہ گو کافر کھلے کافروں سے بدتر ہوتے ہیں۔ کھلے کافر مانتے تھے کہ جو حضور کی زبان سے نکلتا ہے وہ برحق ہوتا ہے۔ حضور انور ﷺ نے حضرت سراقہ کو کسریٰ کے کنگن پہننے کی اس وقت خبر دی جب کہ حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ جا رہے ہیں۔ راہ میں سراقہ ایک غار میں حضور کے پاس پہنچے۔ اور امیہ ابن خلف کے قتل کی، عتبہ کی ہلاکت کی خبریں دیں تو امیہ اور ابولہب گھبرا گئے کہ اب ان کی خیر نہیں حضور کی بات کبھی غلط نہیں ہوتی۔ خبر دی کہ کفار مکہ نے مسلمانوں کے بائیکاٹ کے لئے جو مختصر نامہ لکھ کر کعبہ کی دیوار میں رکھ کر دیوار پتھر سے بند کر دی تھی۔ حضور نے خبر دی کہ وہ کاغذ کیڑا کھا گیا، صرف اللہ کا اور میرا نام چھوڑا ہے۔ سب کو اس پر یقین آ گیا مگر منافقین کو حضور ﷺ پر اعتماد نہ تھا۔ آپ کی غیبی خبروں پر یقین نہ رکھتے تھے وہ یہ ہی کہتے تھے کہ یہ غیب کی خبریں ہیں۔ حضور ﷺ کو ان کی کیا خبر یہ ہی حال آج کلمہ گو کفار کا ہے جو برابر دیکھا جا رہا ہے۔ ایمان علم و عقل سے نہیں ملتا بلکہ رب تعالیٰ کے کرم و فضل سے ملتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ
اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے جو کوئی مرتد ہو جاوے گا تم میں سے اپنے دین اسلام سے پس قریب
اے ایمان والو تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو عنقریب
يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

کذاب کی قوم (۳) بنو اسد یعنی طلیحہ ابن خویلد کی قوم۔ اور سات فرقے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت میں مرتد ہوئے۔ (۱) خزارہ یعنی عیینہ ابن حصن خزاری کی قوم (۲) غطفان یعنی قرہ ابن سلمہ قشیری کی قوم (۳) بنو سلیم یعنی فجاءہ ابن عبد یالیل کی قوم (۴) بنو یربوع یعنی مالک ابن نویرہ کی قوم (۵) بعض بنی تمیم یعنی سجاع بنت منذر کی قوم (یہ سجاع وہ عورت ہے جس نے دعویٰ نبوت کیا اور پھر مسیلمہ کذاب سے نکاح کرلیا) (۶) کندہ یعنی اشعث ابن قیس کی قوم (۷) بنو بکر ابن وائل یعنی حطم ابن زید کی قوم اور ایک فرقہ عہد فاروقی میں مرتد ہوا۔ (۱) غسان یعنی جبلہ ابن کی قوم حضور ﷺ کے زمانہ پاک کے مرتدین ان میں کا پہلا فرقہ بنی مدلج ان کا سردار اسود ابہم تھا۔ کاہن تھا پھر دعویٰ نبوت کر بیٹھا، یمنی تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت معاذ ابن جبل کی سرکردگی میں ایک دستہ اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ اسود عنی فیروز دیلمی کے ہاتھوں اپنے گھر میں مارا گیا یہ رات وہی تھی جو حضور ﷺ کی حیات پاک کی آخری رات تھی۔ حضور انور نے اسی رات مسلمانوں کو اسود کے قتل کی خبر دے دی اور اگلے روز حضور کی وفات ہوگئی پھر اس کے قتل کی باقاعدہ خبر اواخر ربیع الاول میں خلافت صدیقی میں مدینہ منورہ پہنچی۔ حضرت صدیق کی خلافت میں یہ پہلی فتح کی خبر تھی۔ بنو حنیفہ قوم تھی مسیلمہ کذاب کی۔ مسیلمہ نے دعویٰ نبوت کیا، عہد صدیقی میں اس سے بہت بڑا معرکہ جہاد ہوا جسے جنگ یمامہ کہتے ہیں، اس جنگ میں حضرت وحشی کے ہاتھوں مسیلمہ دوزخ رسید ہوا اور بنو اسد اطلیحہ ابن خویلد کی قوم تھی۔ طلیحہ نے دعویٰ نبوت کیا، حضور ﷺ نے اس کی سرکوبی کے لئے حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک جماعت بھیجی مگر وہ معمولی جھڑپ کے بعد شام کی طرف بھاگ گیا پھر مسلمان ہوگیا اور صحیح طور پر مسلمان ہوا۔ یہ وہ مرتدین تھے جو عہد نبوی میں ہی مرتد ہوگئے تھے۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد سواء اہل مدینہ، اہل مکہ، اہل بحرین کے عام عرب لوگ زکوٰۃ کے منکر ہوگئے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے ان پر چڑھائی کرنے کے لئے صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا سب نے مخالفت کی اور فرمایا کہ یہ لوگ کلمہ گو اور اہل قبلہ ہیں۔ صرف زکوٰۃ کے انکار کی وجہ سے ان پر جہاد نہیں ہونا چاہیے حضرت ابوبکر صدیق سن کر اکیلے تلوار باندھ کر گھوڑے پر سوار ہوکر مقابلہ کے لئے چل دیئے فرمایا کہ جو نماز و زکوٰۃ میں فرق کرے گا کہ ایک کو مانے گا دوسرے کا انکار کرے گا میں اس پر جہاد کروں گا پھر تمام صحابہ آپ کے ساتھ چلے منکرین زکوٰۃ کو جب پتہ لگا کہ لشکر اسلام آ گیا تو ارتداد سے توبہ کر گئے۔ حضرت ابوحسن فرماتے ہیں کہ نبیوں کے بعد افضل خلق ابوبکر صدیق ہیں جنہوں نے اسلام کی ایسے نازک حالت میں دستگیری فرمائی جو حالات ابوبکر صدیق کو خلافت سنبھالتے ہی پیش آئے اگر پہاڑ کو وہ حالات پیش آتے تو ٹکڑے ہوجاتا۔ ابوبکر صدیق ہی تھے جنہوں نے ایسے نازک حالات میں مسلمانوں کو سنبھالا کہ آئندہ کسی کو دعویٰ انکار احکام اسلام کی ہمت نہ ہوئی۔ خلافت فاروقی کی فتوحات کا سنگ بنیاد حضرت صدیق اکبر نے رکھا ان کی تمام فتوحات جناب صدیق کی رہین کرم ہیں۔ اس آیت کریمہ میں خلافت صدیقی کے ان ہی حالات کی خبر دی گئی ہے۔ یہ آیت کریمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اعلیٰ مناقب بیان کر رہی ہے اور خلافت صدیقی کی حقانیت کی کھلی دلیل ہے (تفسیر خازن و عامتہ تفاسیر)۔

خدا تعالیٰ ان سب سے دائمی محبت فرماتا ہے۔ **خیال رهے** کہ یہاں محبت سے خصوصی محبت مراد ہے۔ یوں تو رب تعالیٰ ہر مسلمان سے محبت فرماتا ہے مگر حضرات انبیاء کرام سے اور قسم کی خصوصی محبت کرتا ہے اور حضور سے اور قسم کی محبت حضرات صحابہ سے اور قسم کی محبت ہے اولیاء اللہ سے اور قسم کی محبت۔ ہم اپنے دوستوں، اولاد، ماں، باپ، بیوی بچے، نوکروں، غلاموں، جانوروں، سب سے محبت کرتے ہیں مگر دوستوں سے محبت اور قسم کی کرتے ہیں ماں باپ سے سے اور قسم کی اولاد سے اور طرح کی اللہ تعالیٰ حضور سے ایسی محبت فرماتا ہے کہ آپ کا نام ہوا حبیب اللہ اور حضرت ابراہیم سے ایسی محبت فرماتا ہے کہ ان کا لقب ہوا خلیل اللہ یعنی خلیل اللہ وہ جو رب کی ہر بات مانے۔ حبیب اللہ وہ کہ رب تعالیٰ اس کی ہر بات مانے یوں ہی جیسی محبت اللہ تعالیٰ جناب ابوبکر اور ان کے اس لشکر سے فرماتا ہے ویسی محبت دوسروں سے نہیں۔ پھر یہ بھی لحاظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا ذکر پہلے کیا پھر ان کی محبت کا یعنی اللہ ان سب سے محبت کرتا ہے اور وہ سب اللہ سے کیونکہ ہر چیز کی ابتدا رب تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ پہلے وہ ہم کو توفیق دیتا ہے پھر ہم نیکی کرتے ہیں پہلے وہ ہمارا ذکر کرتا ہے پھر ہم اس کا ذکر کرتے ہیں یوں ہی پہلے وہ بندے سے محبت کرتا ہے پھر بندہ رب سے محبت کرتا ہے لہٰذا تمام صدیقی لوگوں سے پہلے رب تعالیٰ محبت کرتا ہے بعد میں یہ لوگ۔ یہ بھی خیال رہے کہ صحیح محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محبوب کے غلاموں، نوکروں، متعلقین حتیٰ کہ اس کی چیزوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ حضرت ہاجرہ خدا کو پیاری ہیں تو صفا مروہ پہاڑ جن پر آپ کے قدم پڑے وہ بھی رب کو پیارے کہ انہیں شعائر اللہ فرمایا۔ حضور خدا کو پیارے تو حضور کا شہر مکہ بھی خدا کو پیارا کہ اس کی قسم فرمائی۔ جب حضرت صدیق خدا کو پیارے تو حضرت صدیق کے غلام ان سرکار کے نوکر چاکر ہم جیسے کمینے بھی خدا کو پیارے کہ یہ سب حضرت صدیق کے متعلقین ہیں **اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ**۔ اس عبارت میں اس مقدس جماعت کی تیسری اور چوتھی صفت کا ذکر ہوا۔ **اَذِلَّةٍ** جمع ہے ذلیل کی جس کا مادہ ذلٌّ ہے بمعنی مغلوبیت یا پستی اسی سے ہے ذلول یہاں انتہائی نرمی مراد ہے۔ جیسے مغلوب آدمی غالب کے سامنے نرمی کرتا ہے۔ رب تعالیٰ اولاد کو ماں باپ کے متعلق حکم دیتا ہے **وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ** (اسراء: ۲۴) **اَعِزَّةٍ** جمع ہے۔ عزیز کی جس کا مادہ عزّ ہے بمعنی غلبہ، عزیز وہ جو غالب ہو مغلوب نہ ہو اس لئے سخت زمین کو ارض عزاز کہتے ہیں۔ یہاں عزت سے مراد سختی و شدت ہے اس کی تفسیر وہ آیت کریمہ ہے۔ **اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ** (فتح: ۲۹) **الْكٰفِرِيْنَ** سے مراد سارے کافر ہیں اصلی ہوں یا مرتدین پھر مشرکین ہوں یا اہل کتاب یعنی ان کی تیسری و چوتھی صفت یہ ہے کہ مسلمانوں پر نہایت نرم اور تمام کفار پر نہایت سخت کہ مسلمانوں کو کبھی تکلیف نہیں پہنچاتے، انہیں ایذا نہیں دیتے اگر کبھی مسلمان سے انہیں تکلیف پہنچ جاوے تو اسے معاف فرما دیتے ہیں مگر کفار کے آگے کبھی نہیں جھکتے۔ دین میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے بخلاف منافقوں کے کہ وہ کفار کی ملامت وغیرہ سے بہت ڈرتے ہیں۔ ان کی پانچویں صفت یہ ہے **يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** اگر چہ جہاد ہر کافر سے جنگ کرنے کو کہتے ہیں مگر یہاں مرتدین سے جنگ مراد ہے کیونکہ ذکر انہی کا ہو رہا ہے خیال رہے کہ مرتد اگر ایک دو ہوں تو انہیں فہمائش کی جاوے سمجھانے پر بھی باز نہ آئے تو اسے قتل کیا جاوے گا۔ اگر مرتدین کی باقاعدہ

بزرگی وفضیلت ہے اور مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ میں جو حضرت صدیق کو فضیلت دی ہے اللہ جسے چاہے فضیلت دے وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ اس میں گزشتہ تمام چیزوں کی وجہ یا حکمت بیان ہوئی یعنی اللہ تعالیٰ کا فضل، اس کی رحمت بہت ہی وسیع ہے وہاں تنگی نہیں مگر رب تعالیٰ علیم وخبیر ہے۔ جانتا ہے کہ کس رحمت کس فضل کے لائق کون ہے۔ اس کو عطا فرماتا ہے یہ انتخاب حضرت صدیق اکبر کے ظرف عالی کو جان کر کیا گیا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! ایمان پر قائم رہو۔ پھسل نہ جانا اگر تم اسلام سے پھر کر مرتد ہو گئے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ اللہ تعالیٰ جماعت مرتدین کی سرکوبی کے لئے ایسی قوم کو برسر اقتدار لائے گا تم پر انہیں مسلط کرے گا جن میں حسب ذیل چھ صفات ہوں گی۔ (۱) اللہ تعالیٰ ان سے خصوصی محبت کرتا ہے، دائمی کرتا ہے، وہ سب خدا کے محبوب بندے ہیں (۲) وہ بھی اللہ تعالیٰ سے دل و جان سے دائمی محبت کرتے ہیں کہ اپنے نفس کے لئے کچھ نہیں کرتے جو کرتے ہیں رضا الٰہی کے لئے کرتے ہیں (۳) مسلمانوں پر بہت نرم کہ کسی مسلمان کا دل نہیں دکھنے دیتے (۴) کافروں پر نہایت سخت کہ ان کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کے دل میں کسی کافر کی ہیبت نہیں آتی (۵) یہ محبوب لوگ مرتدین پر فی سبیل اللہ جہاد کریں گے ان کی شوکت کو ختم کر دیں گے اور اس جہاد کے متعلق کسی مخالف کی مخالفت اپنے پرایوں کی ملامت سے نہ ڈریں گے یہ چناؤ اور حفاظت دین سرکوبی مرتدین کے لئے ان کا چناؤ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے وہ جسے چاہے اپنے فضل سے نوازے اللہ تعالیٰ بڑے فضل وکرم والا ہے، بڑی وسعتوں والا ہے مگر ہے علیم وخبیر کہ جسے جو دیتا ہے اپنے علم کے موافق دیتا ہے۔ اس عظیم الشان کام کے لئے جناب صدیق اور ان کے ساتھیوں کا چناؤ رب تعالیٰ کے علم سے ہے۔ **خیال رہے کہ** جیسے جسمانی نعمتیں بعض عام ہیں بعض خاص دھوپ، ہوا، پانی وغیرہ عام نعمتیں ہیں سلطنت، وزارت، دولت خاص نعمتیں یوں ہی روحانی نعمتیں بعض عام ہیں جیسے کلمہ، قرآن، نماز وغیرہ جو سب مسلمانوں کو ملیں اور ولایت، غوثیت، قطبیت، صحابیت وغیرہ خاص نعمتیں ہیں جو کسی کسی کو ملیں بلکہ صحابیت عام نعمت تھی جو تمام صحابہ کو ملی مگر صدیقیت خاص نعمت جو حضرت ابو بکر کو عطا ہوئی اللہ کے ہاں کسی نعمت کی کمی نہیں وہ لاکھوں صدیق فاروق پیدا کر سکتا تھا مگر وہ علیم ہے جانتا ہے کہ عالم کی مصلحت کس چیز میں ہے۔ رب تعالیٰ لاکھوں سورج کروڑوں چاند پیدا فرما سکتا ہے لیکن اگر دو سورج بھی ہوتے تو دنیا گرمی سے ہلاک ہو جاتی۔ پھل، دانہ، پھول جل جاتے۔ ہم کو سینکڑوں بال دیئے، دو دو ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، کان دیئے مگر دل ایک ہی دیا ورنہ نظام جسم خراب ہو جاتا نبوت کے آسمان پر خاتم الانبیاء سورج ایک ہی بنایا۔ صدیق چاند ایک ہی پیدا کیا وہ واسع ہے مگر علیم بھی ہے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** قرآن کریم جو غیبی خبریں دیتا ہے۔ جو بالکل درست وسچی ہوتی ہیں اس کی پیش گوئیاں ہو بہو درست نکلتی ہیں۔ علم غیب قرآن مجید اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے یہ فائدہ مَنْ يَّرْتَدَّ اور فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ سے حاصل ہوا۔ اس فرمان میں تین پیش گوئیاں کی گئیں جو بالکل درست ہوئیں۔ اس میں غیبی خبر دی گئی کہ آئندہ کچھ لوگ مرتد ہوں گے (۲) وہ مرتدین بڑے طاقت ور ہوں

خلیفہ برحق ہونا، آپ کا اللہ کا محبوب ہونا، آپ کا غازی اسلام ہونا وغیرہ قطعی یقینی ہے۔ ان میں سے ایک کا انکار کفر ہے۔ یہ فائدہ پوری اس آیت سے حاصل ہوا۔ اس کی تائید دوسری آیات سے ہے۔ **خیال رہے** کہ حضرت ابوبکر صدیق کی صحابیت قطعی یقینی ہے جس کا انکار کفر ہے فرماتا ہے: اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ (التوبہ: ۴۰) آپ کا خلیفہ اول ہونا قطعی یقینی ہے جس کا انکار کفر ہے۔ فرماتا ہے: ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ (توبہ: ۴۰) خلیفۃ اللہ الاول۔ حضور ﷺ ہیں ان کے ثانی ابوبکر صدیق، خدا انہیں ثانی یعنی دوسرا کہے انہیں تیسرا کرنے والا کون ہے

ثانی اثنین ہیں بوبکر خدا میرا گواہ حق مقدم کرے پھر کیوں ہو مؤخر صدیق

بعد الرسل تمام خلق سے حضرت صدیق اکبر کا افضل ہونا قطعی ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ (نور: ۲۲) حضرت صدیق کا بعد انبیاء ساری خلق سے بڑھ کر متقی ہونا قطعی یقینی ہے۔ فرماتا ہے: وَ سَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۷﴾ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ (الیل: ۱۸) الاتقی اسم تفضیل ہے جیسے گروہ انبیاء میں یوسف علیہ السلام چار پشت کے نبی ہیں۔ یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہم السلام یوں ہی صرف صدیق اکبر ہی وہ خوش نصیب صحابی ہیں کہ آپ میں چار پشت تک صحابیت ہے۔ ماں، باپ صحابی، خود صحابی، بیٹے بیٹی صحابی۔ پوتے نواسے صحابی عبداللہ ابن زبیر نواسے ہیں اور صحابی ہیں بعد انبیاء اس شان کا نہ پیدا ہوا نہ پیدا ہو۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام سیدوں کے دادا حضرت علی شیر خدا ہیں اور نانا حضرت ابوبکر صدیق۔ فروہ بنت قاسم ابن محمد ابن ابوبکر صدیق حضرت امام باقر کے نکاح میں آئیں جن سے امام جعفر صادق پیدا ہوئے ان سے ہی حسینی سادات کی نسل چلی۔ دیکھو ہماری کتاب "امیر معاویہ"۔

گیارھواں فائدہ: دین اسلام کے ایک بھی قطعی شرعی مسئلہ کا انکار کفر ہے۔ جو مسلمان ساری اسلامی باتیں مانے صرف ایک مسئلہ کا انکار کرے وہ مرتد ہے اسے قتل کیا جاوے گا اگر طاقت ور جماعت ہے تو اس پر جہاد ہوگا۔ یہ فائدہ مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ سے حاصل ہوا کیونکہ اس آیت کریمہ میں جس جہاد کی پیش گوئی کی گئی ہے وہ حضرت ابوبکر صدیق کا وہ جہاد ہے جو آپ نے منکرین زکوٰۃ پر کیا۔ رب نے ان منکرین کو مرتدین فرمایا اور اس جنگ صدیقی کو جہاد۔ **بارھواں فائدہ:** حضور ﷺ کو آخری نبی نہ ماننا حضور کے زمانہ میں یا بعد کسی کو نبی مان لینا کفر و ارتداد ہے۔ ایسے لوگوں پر جہاد اسلامی جہاد ہے۔ یہ فائدہ بھی مَنْ یَّرْتَدَّ سے حاصل ہوا کیونکہ حضرت صدیق اکبر نے یمامہ والے مرتدین پر بھی جہاد کیا جنہوں نے مسیلمہ کذاب کو حضور انور کے زمانہ میں ہی نبی مان لیا تھا اس جنگ کو قرآن کریم نے جہاد فرمایا اور ان بے دینوں کو مرتد قرار دیا ختم نبوت قطعی یقینی مسئلہ ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے بعد صحابہ مرتد ہو گئے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ اگر ان کا ارتداد واقع نہ ہوتا تو مَنْ یَّرْتَدَّ کیوں فرمایا جاتا، نعوذ باللہ۔ **جواب:** اس کے چند جوابات ہیں ایک الزامی باقی تحقیقی۔ جواب الزامی تو یہ ہے کہ

عائشہ سے اس آیت میں ان جہادوں کی خبر دی گئی ہے (نعوذ باللہ) **نوٹ:** یہ اعتراض شیعہ فرقے کا ہے۔ اسے تفسیر کبیر نے مع جواب نقل کیا۔ **جواب:** اس اعتراض کا تفصیلی جواب ہماری کتاب ''امیر معاویہ'' میں ملاحظہ کرو۔ یہاں بطور اختصار یہ سمجھو کہ اگر یہ آیت کریمہ حضرت علی کے حق میں ہوتی اور ان کی خلافت نہ ماننا ان کی موجودگی میں اور کو خلیفہ ماننا ارتداد ہوتا تو حضرت علی حضور کے پردہ فرماتے ہی اور حضرت ابوبکر صدیق کے خلیفہ بنتے ہی ان پر بلکہ سارے اہل مدینہ پر جہاد کرتے اور جیسے حضرت ابوبکر منکرین زکوٰۃ کے لئے اکیلے ہی چل پڑے تھے، حضرت علی اکیلے ہی تلوار لے کر ان پر جہاد کرتے تین خلفاء یعنی حضرت صدیق و فاروق و عثمان غنی کی بیعت خود نہ کر لیتے۔ تعجب ہے کہ قرآن کریم تو آپ کے جہاد کی خبر دے اور آپ نے بجائے جہاد کے ان کی بیعت فرما کر انہیں خلیفۃ المسلمین امیر المومنین مان لیا۔ نیز جنگ جمل و صفین میں خود حضرت علی نے اپنے مقابل حضرات کو مرتد نہ فرمایا بلکہ باغی فرمایا کہ ارشاد کیا اخواننا بغو علینا یہ سب ہمارے بھائی ہیں جنہوں نے ہم سے بغاوت کر لی ان کے قیدیوں کو قتل نہ کیا، ان کے مال کو غنیمت نہ بنایا۔ امیر معاویہ سے صلح کی کوشش کی مرتدین سے صلح کیسی ان کے متعلق تو قرآن کریم فرماتا ہے: تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ (فتح: ١٦) یا ان سے لڑو یا وہ مسلمان ہو جاویں، تیسری چیز ہی نہیں لہٰذا تم آیت کریمہ کی تفسیر نہیں بلکہ تحریف کر رہے ہو نیز خود حضرت علی، حسن، قتادہ، ضحاک ابن جریج نے فرمایا کہ یہ آیت کریمہ حضرت ابوبکر صدیق کے متعلق ہے۔ جس کے حوالے ابھی ہم عرض کر چکے۔

چوتھا اعتراض: یہاں ان مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا گیا اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ دوسری جگہ ارشاد ہوا اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (فتح: ١٩) تو کیا مسلمانوں کو چاہیے کہ کافروں پر خوب سختی کیا کریں۔ انہیں قتل و غارت ہی کریں یہ تو سفاکی خونریزی ہے۔ اسلام نے خونریزی سکھائی ہے (آریہ) **جواب:** یہاں حق تعالیٰ نے اسے اَعِزَّةٍ فرمایا وہاں اس آیت میں اَشِدَّآءُ فرمایا ظَالِمِیْن نہ فرمایا۔ کفار پر سختی کے معنی یہ ہیں کہ ان کے مقابلہ میں دین پر سختی سے قائم ان کی ہیبت مسلمانوں کے دل میں نہ آئے اگر حربی کفار سے جنگ کرنی پڑ جائے تو ڈٹ کر مقابلہ کریں ان کے مقابلہ میں نرمی یا پلپلا پن نہ دکھائیں۔ ذمی رعایا کفار پر جیسا رحم و کرم مسلمانوں بادشاہوں نے کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اب بھی دیکھ لو کہ بھارت میں مسلمانوں کے نہ مال محفوظ ہیں نہ جانیں۔ پاکستان میں ہندو کیسے آرام سے زندگی گزار رہے ہیں۔

پانچواں اعتراض: اگر رب تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ مرتدین پر جہاد کرنے کے لئے ایسے مسلمان قائم فرمایا کرے گا جو ان پر جہاد کریں تو آج مسلمانوں میں ختم نبوت کے انکاری ضروریات دین کے انکاری بڑی بڑی جماعتیں ہیں۔ ان پر جہاد کرنے کے لئے رب نے کوئی مسلم جماعت قائم نہ کی یہ وعدہ کیسے پورا ہوا؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر سے معلوم ہو گیا کہ یہ پیشگوئی حضرت ابوبکر صدیق کے جہادوں کے متعلق ہے جو پوری ہو چکی۔ مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ میں خطاب اس زمانہ کے مؤمنوں سے ہے۔ آئندہ کے لئے حضور ﷺ نے یہ پیش گوئی فرمائی کہ میری امت ساری گمراہ نہ ہو گی ان میں ایک فرقہ ضرور ہدایت پر رہے گا اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے۔ سب دوزخی ایک جنتی وہ بھی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ بفضلہ تعالیٰ

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ

اس کے سوا نہیں کہ تمہارے دوست اللہ اور رسول ہیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے جو کہ قائم رکھتے ہیں

تمہارے دوست نہیں مگر اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے کہ نماز قائم کرتے

الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ

نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ کو اور وہ رکوع والے ہیں اور جو دوستی کرے گا اللہ سے

ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں اور جو اللہ

وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ ع

اور اس کے رسول اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے پس تحقیق اللہ کا ٹولہ وہ ہی غالب ہیں

اور اس کے رسول اور مسلمانوں کو اپنا دوست بنائے تو بیشک اللہ ہی کا گروہ غالب ہے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مرتدین کی سزا کا ذکر فرمایا تھا۔ اب اس دوا کا ذکر ہے جس سے انسان ارتداد کی بیماری سے بچا رہے یعنی اللہ رسول اور مؤمنین کی محبت گویا ارتداد کی بیماری کے انجام اس کی سزا کے بعد اس سے بچاؤ کی تدبیر، اس کی دوا بتائی جارہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ ہم مرتدین کی سرکوبی کے لئے صدیقی جماعت کو لائیں گے جو خدا کی پیاری جماعت ہے۔ اب ارشاد ہے کہ اگر تمہیں رب تعالیٰ کی محبوبیت چاہیے تو تم صدیقی جماعت کو اپنا ولی اور والی بناؤ تم بھی پیارے بن جاؤ گے۔ پھول کے کے ساتھ گھاس باندھ دی جاوے تو وہ بھی بادشاہ کے دربار میں پہنچ جاتی ہے۔ حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

گو نیست جمال و رنگ و بویم! آخر نہ گیاہ باغ اویم

تیسرا تعلق: پچھلی گزشتہ آیات میں یہود و نصاریٰ وغیرہ کفار سے دوستی کرنے کی سخت ممانعت کی گئی تھی۔ اب اللہ رسول اور مومنین سے دوستی و محبت کرنے کا تاکیدی حکم دیا جارہا ہے گویا توڑنے والے رشتوں کا ذکر فرمانے کے بعد جوڑنے والے رشتوں کا ذکر ہے زہر کے ذکر کے بعد تریاق کا تذکرہ ہے تاکہ مسلمان زہر سے بچیں تریاق اختیار کریں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں ان تین چیزوں کا ذکر تھا جن کے اختیار کرنے سے اللہ کی جماعت میں شامل ہونا ہوتا ہے یعنی اللہ کی محبت اس کے محبوب کی اطاعت، مسلمانوں سے تعلق۔ اب اس چیز کا ذکر ہے جس سے بچنے سے اللہ کی جماعت میں شامل ہونا ہوتا ہے یعنی کفار سے محبت۔ ہر کام کے لئے شرائط اختیار کرنا پڑتے ہیں، منافی چیز سے بچنا پڑتا ہے۔ نماز کے لئے طہارت وغیرہ کرو، دنیاوی بات و دنیاوی کام نہ کرو یہی ایمان کا حال ہے۔ **پانچواں تعلق:** ابھی پچھلی آیت کے آخر میں ارشاد ہوا

ان کا ذکر رسول کے بعد ہوا اس عبارت میں تین قول ہیں ایک یہ کہ اس سے مراد حضرت ابو بکر صدیق اور ان کی جماعت ہے یعنی صدیقی ٹولہ کیونکہ ابھی پچھلی آیت میں قوم اور اَعِزَّةٍ یوں ہی اَذِلَّةٍ اور یُجَاهِدُوْنَ میں وہ ہی حضرات مراد تھے یہ قول ہے حضرت عکرمہ اور بہت مفسرین کا (روح المعانی و تفسیر کبیر) دوسرے یہ کہ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں کیونکہ ایک بار انہوں نے رکوع کرتے ہوئے ایک سائل کو انگوٹھی خیرات کی ان کی تعریف میں یہ ارشاد فرمایا گیا۔ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (مائدہ: ۵۵) یہ قول ہے۔ حضرت عطاء کا بروایت ابن عباس (تفسیر کبیر و معانی) تیسرا یہ کہ اس سے مراد ہیں عام مومنین جن میں حضرت صدیق و علی بھی داخل ہیں۔ خصوصاً انصار و مہاجرین۔ یہ قول ہے حضرت امام محمد باقر کا چنانچہ امام محمد باقر سے عرض کیا گیا کہ ہم نے سنا ہے کہ اس سے مراد حضرت علی ہیں تو فرمایا کہ وہ بھی ان میں داخل ہیں (معانی و کبیر وغیرہ) یہ تیسرا قول نہایت قوی ہے کہ دوسری آیات اس کی تائید کرتی ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ (توبہ: ۷۱) نیز ابھی اگلی آیت میں آ رہا ہے وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وہاں سب کے نزدیک اٰمَنُوْا سے مراد سارے مومنین ہیں نیز حضرت عبداللہ ابن سلام یا عبادہ ابن صامت نے یہ ہی کہا تھا کہ ایمان کی وجہ سے کوئی یہودی ہمارا دوست نہ رہا تو جواب دیا گیا کہ تمہارے دوست سارے مومن ہو گئے (کبیر و معانی) اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ یہ عبارت یا تو اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے بدل ہے یا اس کی صفت (معانی وغیرہ) نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کے معنی بارہا عرض کیے جا چکے ہیں چونکہ نماز دن رات میں پانچ دفعہ پڑھی جاتی ہے اور زکوٰۃ سال میں ایک بار نماز سارے مسلمان پڑھتے ہیں زکوٰۃ صرف مالداروں پر ہے نماز کی ادا کے لئے طہارت، قبلہ منہ ہونا، ستر، وقت، وغیرہ بہت سی شرطیں ہیں زکوٰۃ کے لئے ان میں سے کچھ نہیں اس لئے نماز کے لئے يُقِيْمُوْنَ ارشاد ہوا اور زکوٰۃ کے لئے صرف يُؤْتُوْنَ فرمایا چونکہ اسلام میں نماز و زکوٰۃ بڑے اہم فریضے ہیں جو ان کا پابند ہو گا وہ انشاء اللہ باقی فرائض کا بھی پابند ہو گا اس لئے صرف ان دو کا ذکر ہوا باقی اسلامی ارکان حج و جہاد وغیرہ کا ذکر نہ ہوا وَهُمْ رٰكِعُوْنَ میں واؤ عاطفہ ہے اور جملہ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ پر معطوف ہو کر اَلَّذِيْنَ کا صلہ ہے۔ جملہ اسمیہ معطوف ہو سکتا ہے جملہ فعلیہ پر یا واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ يُقِيْمُوْنَ اور يُؤْتُوْنَ دونوں فعلوں کے فاعل ھم کا حال ہے یا صرف يُؤْتُوْنَ کے فاعل سے رٰكِعُوْنَ بنا ہے۔ رکوع سے ظاہر یہ ہے کہ یہاں رکوع بمعنی عجز و نیاز اور دلی خشوع و خضوع ہے۔ جیسے رب تعالیٰ نے جناب مریم سے فرمایا: وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ (آل عمران: ۴۳) حالانکہ بنی اسرائیل کی نماز میں رکوع نہ تھا رکوع صرف اسلامی نمازوں میں ہے نیز حضرت مریم مردوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتی تھیں پھر معیت کے کیا معنی لہٰذا وہاں بھی رکوع بمعنی خشوع ہے یعنی تمہارے دوست وہ مسلمان بھی ہیں جو نمازیں قائم رکھتے، زکوٰۃ دیتے ہیں اس حالت میں کہ ان کے دلوں میں عجز و نیاز خشوع و خضوع ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد ہو رکوع والی نماز پڑھتے ہیں۔ اسلامی نماز کے سوا کسی دین کی نماز میں رکوع نہ تھا وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ جملہ نیا ہے جس میں اللہ رسول اور مومنین سے محبت کرنے کے خاص فائدے کا ذکر فرمایا جو دنیا و آخرت

ایمانی اور امداد ایمانی قرب ایمان غیر فانی ہے۔

ضروری تنبیہ اس آیت کریمہ سے بعض لوگوں نے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل یعنی ان کا پہلا خلیفہ ہونا اور تینوں خلافتوں کا ناجائز ہونا ثابت کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اِنَّمَا حقیقی حصر کا لفظ ہے اور ولی کے معنی ہیں والی متولی یعنی امیر و خلیفہ اور وَھُمْ رٰکِعُوْنَ۔ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ کے فاعل کا حال ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اے مسلمانو! تمہارے والی امام متولی صرف اور صرف اللہ رسول ہیں اور وہ مومن ہیں جو رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں اس آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ ایک بار حضرت علی نماز کے رکوع میں تھے کہ کسی سائل نے سوال کیا آپ کے ہاتھ شریف میں ایک چاندی کی انگوٹھی تھی، آپ نے اسی رکوع کی حالت میں وہ انگوٹھی والی انگلی فقیر کی طرف کر دی اس نے یہ انگوٹھی اتار لی اللہ تعالیٰ نے جناب امیر المؤمنین کی یہ ادا ایسی پسند فرمائی کہ آپ کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل فرمائی جس میں مسلمانوں کو خطاب کیا گیا کہ تمہارا خلیفہ تمہارا والی امام صرف یہ ہی ہے جو رکوع کرتے کرتے زکوٰۃ بھی دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کے سوا اور کوئی خلیفہ نہیں ہوسکتا وہی خلیفہ برحق ہیں۔ چنانچہ حاکم اور ابن مردویہ نے بروایت حضرت ابن عباس یہ واقعہ نقل فرمایا اور حضرت حسان نے جناب علی کے اس واقعہ کو اپنے کلام میں یوں نظم فرمایا

ابا حسن نفدیک نفسی وحجتی — وکل بطی فی الھدی ومسارع!
ایذھب مدحیک المحبر ضائعاً — وما المدح فی جنب الامه بصناع!
فانت الذی اعطیت اذکنت راکعاً — زکوٰۃ قدتک النفس باخیر راکع!
فانزل فیک اللہ خیر ولایۃ — واثبتھا اثنا کتاب الشرائع!

یعنی اے علی ابوالحسن! آپ پر ہماری جانیں اور ہر ہدایت یافتہ قربان ہوں آپ کا مدح گو کبھی برباد نہ ہوگا۔ آپ ہی وہ ہیں جنہوں نے رکوع کرتے کرتے زکوٰۃ ادا کی۔ اے بہترین رکوع والے! تم پر میری جان فدا اللہ تعالیٰ نے تمہارے بارے میں بہترین ولایت کی آیت اتاری اور اسے قرآن جیسی شریعت کی کتاب میں محفوظ فرما دیا (از روح المعانی) لہٰذا حضرت علی کے سوا کوئی امام و خلیفہ نہیں۔ یہ ان حضرات کی انتہائی دلیل ہے جسے ہم نے ان کی طرف سے اس طرح بیان کر دیا کہ شاید وہ بھی اس طرح بیان نہ کر سکیں۔

جواب: اس کے جوابات حسب ذیل ہیں۔ اولاً یہ کہ اگر یہ واقعہ درست ہو اور واقعی یہ اشعار حضرت حسان ہی کے ہوں کسی کے بناوٹی نہ ہوں تب بھی اس موقعہ پر یہ آیت کریمہ نازل نہیں ہوئی۔ ہم نے اس کا شان نزول ابھی عرض کر دیا جو تمام معتبر تفاسیر میں مذکور ہے اور حضرت امام محمد باقر کا فرمان بحوالہ نقل کر دیا کہ یہ آیت کریمہ مہاجرین و انصار کے متعلق نازل ہوئی۔ بعض نے کہا کہ ابوبکر صدیق کے متعلق بعض نے فرمایا کہ عام مسلمانوں کے متعلق۔ دوسرے یہ کہ یہاں ولی بمعنی دوست و محبوب و مددگار ہے نہ کہ بمعنی امیر و خلیفہ کیونکہ اگر یہاں ولی بمعنی خلیفہ اور امام ہو تو لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ بھی خلیفہ ہو اور

ابھی عرض کی گئی۔ اس کی مکمل بحث تفسیر کبیر اور تفسیر روح المعانی وغیرہ میں ملاحظہ فرماؤ۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے اور حضور ﷺ ہمارے مددگار، والی، وارث، ناصر ہیں جو کہے کہ خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں وہ اس آیت کریمہ کا انکار کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ رسول اور متقی مسلمانوں کو مددگار ماننا حکم قرآنی ہے۔ **دوسرا فائدہ:** ہمیشہ مسلمانوں کو اپنی قوم سے ہی عزت ملے گی۔ اس قوم میں رہ کر غلبہ حاصل ہوگا۔ مسلم قوم سے کٹ کر کفار سے مل کر ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ **تیسرا فائدہ:** ایمان کے ساتھ تقویٰ ضروری ہے اور تقویٰ کے لئے نماز زکوٰۃ ضروری ارکان ہیں۔ **چوتھا فائدہ:** سارے متقی مسلمان اللہ کی جماعت ہیں اور ان شاء اللہ تمام کفار پر غالب رہیں گے خواہ غلبہ جسمانی قوت کا ہو یا روحانی قوت کا دیکھو انہیں اللہ کی جماعت فرمایا گیا اور ان کے لئے غلبہ کا وعدہ فرمالیا گیا۔ **پانچواں فائدہ:** اللہ کے مقبول بندے اللہ کی طرف سے اللہ کے ملک پر راج کرتے ہیں۔ ان کی حکومت بحر و بر شجر و حجر سب پر نافذ ہے ان کے منہ سے جو نکلتا ہے وہ ہی ہوتا ہے۔ اس پر قرآنی آیات، احادیث صحیحہ شاہد ہیں یہ سب کچھ اس لئے نہیں کہ وہ اللہ ہو گئے بلکہ اس لئے کہ وہ اللہ کے ٹولہ میں آگئے۔ وزیر اعظم سارے ملک پر حاکم ہے ڈپٹی کمشنر سارے ضلع کا کمشنر پوری کمشنری کا فرمانروا ہے یہ حکام بادشاہ نہیں بلکہ بادشاہ کے ٹولہ کے ہیں۔ اسی طرح حضرات انبیاء اولیاء ملک الٰہی کے حاکم ہیں۔ یہ فائدہ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ سے حاصل ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ میں ولی واحد کیوں ارشاد ہوا اولیاء کیوں نہ فرمایا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ اور تمام مسلمانوں کو دوست بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے اولیاء جمع لانا چاہیے تھا۔ **جواب:** اس لئے کہ ان سب کی ولایت یکساں نہیں اللہ تعالیٰ کی محبت اصل مقصود ہے اور حضور ﷺ کی محبت اس محبت الٰہیہ کا وسیلہ ہے اور مسلمانوں سے محبت حضور کی محبت کا ذریعہ اصل مقصود ایک ہی محبت تھا اس لئے ولی واحد ارشاد ہوا (دیکھو تفسیر کبیر)

دوسرا اعتراض: محبت تو سارے رسولوں سے چاہیے پھر رَسُوْلُهٗ واحد کیوں ارشاد ہوا؟ **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر میں گزر گیا کہ ان تمام رسولوں کی محبت حضور ﷺ کے ضمن میں ہے، ہم ان حضرات کو اس لئے اپنا محبوب وولی مانتے ہیں کہ حضور نے ان کی محبت کا حکم دیا آج جو کوئی حضور کو چھوڑ کر سارے نبیوں سے محبت کرے وہ کافر ہی ہے۔ دیکھو، یہودی، عیسائی اپنے نبیوں سے محبت کرتے ہیں مگر ہیں کافر جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (تغابن: ٨) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لاؤ۔ حالانکہ تمام نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے مگر چونکہ ان پر ایمان حضور پر ایمان کے ضمن میں ہے اس لئے وہاں رسول واحد ارشاد ہوا۔

تیسرا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے مددگار اور محبوب اللہ تعالیٰ، رسول اور سارے متقی

پچھلی امتوں کی نمازوں میں رکوع نہ تھا اور اگر بمعنی خشوع وخضوع ہے تب معنی ظاہر ہیں کہ نماز سے بدنی عبادت کی طرف اشارہ کیا گیا اور زکوٰۃ سے مالی عبادت کی طرف اور رکوع سے دلی عبادت یعنی خشوع وخضوع کی طرف۔ مقصد یہ ہے کہ یہود ان عبادات سے خالی ہیں مسلمان ان عبادات سے موصوف ہیں۔ یہود کی دوستی کے مقابل ان کی دوستی بے حد مفید ہے۔

آٹھواں اعتراض: اس آیت میں ارشاد ہوا کہ اللہ کا ٹولہ غالب ہے امام حسین اللہ کے ٹولہ میں تھے پھر یزید سے مغلوب کیوں ہو گئے؟ **جواب:** حضرت امام حسین ہرگز مغلوب نہیں ہوئے کربلا میں جیت آپ کی ہی ہوئی ہارا یزید مسلمان ہارے تو بھی جیت اس کی ہے مرے تو بھی وہ ہی جیتا ہے لوٹ لائے تو وہ جیتے لٹ جاوے تو وہ جیتے جیت ہوتی ہے مقصد جنگ حاصل ہونے سے حضرت حسین کی جنگ کا مقصد بادشاہت حاصل کرنا نہ تھا۔ بلکہ یزیدی بدعنوانیوں کے ٹکڑے اڑا دینا وہ آپ نے شہید ہو کر، لٹ کر، بچے کٹوا کر حاصل کر لیا۔

تفسیر صوفیانہ

ہمارا ولی اللہ تعالیٰ بھی ہے حضور ﷺ بھی اور مومن متقی بھی مگر اللہ تعالیٰ کو ولی ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے غافل کرنے والی چیزوں سے نفرت وعداوت ہو اور حضور ﷺ کو ولی ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اپنی نفس و ہوا سے نفرت وعداوت ہو جب تک یہ دونوں صفت رسول کے تابع نہ ہو جاویں اور مؤمنوں کو ولی ماننے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اپنا دینی بھائی مانے اور جو اپنے لئے پسند نہ کرے ان کے لئے بھی پسند نہ کرے۔ خیال رکھو کہ ظاہری وباطنی دشمنوں پر فتح ونصرت اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی مدد کے بغیر ناممکن ہے۔ ظاہری دشمن جن وانس ہیں باطنی دشمنی خود ہمارا اپنا نفس ہے جو ہر دم ہمارے ساتھ ہے۔ شیطان تو لاحول سے بھاگ جاتا ہے یہ موذی لاحول سے بھی نہیں بھاگتا۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: اے بندو! میں تم سے کل کے اعمال آج نہیں مانگتا تم مجھ سے کل کی روزی آج کیوں مانگتے ہو۔ مجھ پر توکل کیوں نہیں کرتے میں تمہارا رزق دوسرے کو نہیں دیتا۔ تم میری عبادت دوسرے کے لئے کیوں کرتے ہو تم میرا رزق کھا کر میرے ناشکرے اور دوسرے کے شکر گزار کیوں بنتے ہو، مجھ سے جنگ اور دوسروں سے صلح کیوں کرتے ہو۔ عزت کا مالک میں ہوں تم دوسروں سے عزت کیوں مانگتے ہو، میں نے دوزخ کافروں کے لئے بنائی تم اس میں چھلانگ کیوں لگاتے ہو۔ جسارت کا انجام خسارت ہے نفس ظلمانی چیز ہے اس سے تم کو ظلمت ہی ملے گی۔ مولانا فرماتے ہیں۔

عکس نورانی ہمہ روشن بود! عکس ظلمانی ہمہ گلخن بود!!
عکس ہر کس راہداں اے دور بیں پہلوئے جنسے کہ خواہی ہم نشین

اللہ رسول تو تمہارے ولی ہیں تم بھی کوشش کرو کہ ان کے ولی بنو اولیاء اللہ کی دوستی سے حضور ﷺ کی محبت وولایت نصیب ہوتی ہے اور حضور کی محبت سے اللہ کی محبت ونصرت میسر آتی ہے تم ان کی محبت سے اللہ کی جماعت میں آ سکتے ہو اور جب اللہ کی جماعت میں آ گئے تو پھر نصرت وغلبہ تمہارا ہی ہے (از روح البیان وعرائس البیان) صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جیسے دنیاوی نعمتیں ساری کی ساری رب کا عطیہ ہے مگر ان میں سے بعض بلاواسطہ ملتی ہیں براہ راست رب کی طرف سے جیسے دھوپ، ہوا،

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود و نصاریٰ کو دوست بنانے سے منع فرمایا گیا اب سارے کفار کی دوستی سے مسلمانوں کو روکا جا رہا ہے کیونکہ کوئی کافر مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور متقی مسلمانوں کی دوستی و محبت کا ذکر ہوا اب ان کے مقابل کفار سے نفرت و عداوت کا ذکر ہے۔ گویا کرنے والی چیز کا ذکر پہلے تھا اور نہ کرنے والی چیز کا ذکر اب ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں اللہ رسول کی ولایت و دوستی کا ذکر تھا اب اس دوستی کی شرط کا ذکر ہے یعنی دشمنان دین سے عداوت کرنا کہ اس کے بغیر اللہ رسول کی محبت ناممکن ہے۔ گویا دوستی کا ذکر پہلے تھا اور اس کی شرط کا ذکر اب ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ان ہستیوں کا ذکر تھا جن کی دوستی و محبت دین و دنیا میں فائدہ مند ہے اب ان لوگوں کا ذکر ہے جن کی دشمنی ان سے نفرت دین و دنیا میں مفید ہے۔ گائے بھینس کا پالنا مفید ہے۔ سانپ بچھو کو مار دینا فائدہ مند۔ کفار زہریلے جانور ہیں جن سے دوری مفید ہے۔

شان نزول

سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ رفاعہ ابن زید ابن تابوت اور سوید ابن حارث یہ دونوں بہت چرب زبان، شیریں گفتار تھے بظاہر مسلمان ہو گئے تھے مگر دل میں کافر تھے یعنی منافق تھے مسلمانوں کو ان کا نفاق معلوم ہو گیا تھا مگر پھر بھی بعض سادہ لوح مسلمان ان سے محبت رکھتے، ان سے تعلقات قائم کیے ہوئے تھے ان کی فہمائش کے لئے پہلی آیت کریمہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الخ نازل ہوئی (خازن، روح المعانی، کبیر وغیرہ)

(۲) بیہقی شریف نے دلائل النبوۃ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ جب مؤذن رسول اللہ ﷺ اذان دیتے اور مسلمان نماز کو مسجد نبوی شریف میں جاتے تو بعض یہودی کہتے قَامُوْا لَاقَامُوْا یعنی یہ لوگ نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، خدا کرے اٹھنے کے لائق نہ رہیں اور جب مسلمان رکوع و سجود کرتے تو یہود مذاق اڑاتے کہ دیکھو ان کی وضع کہ سر نیچا چوتڑ اونچے کیے پڑے ہیں۔ ان کے متعلق یہ دوسری آیت وَاِذَا نَادَیْتُمْ الخ نازل ہوئی

(۳) ابن جریر نے سدی سے روایت کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک عیسائی تھا۔ جب موذن کہتا اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ تو وہ کہتا کہ جھوٹا جل جاوے۔ ایک شب اس کا خادم گھر کی آگ بجھانا بھول گیا اور سب گھر والے سو گئے آگ کی چنگاری اڑی اور گھر میں آگ لگ گئی۔ اس کے سارے گھر والے اور وہ خود جل کر راکھ ہو گئے۔ اس موقعہ پر یہ دوسری آیت نازل ہوئی۔ (خازن، کبیر، روح المعانی وغیرہ)

(۴) مدینہ کے یہود و منافقین جب اذان کی آواز سنتے تو حسد کی آگ میں جل جاتے ایک دن یہ لوگ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر بولے کہ آپ نے یہ اذان ایسی چیز ایجاد کی ہے جو کسی دین میں نہ تھی۔ آپ دعویٰ نبوت کرتے ہیں مگر سارے نبیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ اگر اذان اچھی چیز ہے تو دوسرے نبیوں نے کیوں رائج نہ کی یہ اونٹ کی سی آواز میں مرغ کی سی بانگ بہت بری معلوم ہوتی ہے۔ ان کی تردید میں یہ دوسری آیت وَاِذَا نَادَیْتُمْ نازل ہوئی (تفسیر خازن)۔

سے مراد نماز کے لئے ایک دوسرے کو پکارنا ہے کہ چلو نماز کو چونکہ یہاں نداء میں بلانے کے معنی ملحوظ ہیں اس لئے اس کے بعد اِلَی ارشاد ہوا یعنی جب تم نماز کی طرف بلانے کے لئے اذان دیتے ہو یا ایک دوسرے کو نماز کی طرف بلاتے پکارتے ہو تو اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا، ھا کا مرجع ن نَادَیْتُمْ کا مصدر یعنی ندا و اذان ہے هُزُوًا اور لَعِبًا کے معنی ابھی عرض کیے گئے یعنی یہ لوگ اذان کا مذاق اڑاتے ہیں یا تو اس کی نقل بناتے ہیں یا نمازیوں پر آوازے کستے ہیں ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ۔ ذٰلِكَ سے مراد اذان کا مذاق اڑانا ہے۔ھم کا مرجع وہ ہی یہود و عیسائی اور دوسرے کفار ہیں یعنی ان لوگوں کا یہ مذاق اڑانا اس لئے ہے کہ ان لوگوں میں وہ عقل نہیں جو حق و باطل کے درمیان فرق کردے، یہ دینی معاملہ میں جانوروں سے بدتر ہیں اگرچہ دنیاوی کاروبار میں بڑے دانا و عاقل ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! تم یہود و نصاریٰ وغیرہ اہل کتاب ان کے علاوہ اور کفار کو اپنا دوست نہ بناؤ، انہیں یار نہ سمجھو یہ تو وہ ہیں جو تمہارے دین اسلام کا مذاق اڑاتے، ٹھٹھا کرتے ہیں۔ جو تمہارے دین کے دشمن ہیں وہ تمہارے دوست کیسے ہو سکتے ہیں؟ اگر تم سچے و پکے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو۔ قولاً، اعتقاداً، عملاً ہر طرح متقی رہو، متقی مرو کہ تقویٰ ایمان کا زیور ہے ان لوگوں کی بدباطنی کا یہ عالم ہے کہ جب تم نماز کی اذان دیتے ہو یا ایک دوسرے کو نماز کے لئے بلاتے ہو تو تمہاری اذان تمہارے اس بلاوے کا مذاق اڑاتے ہیں یہ بہت ہی بے عقل لوگ ہیں اتنا نہیں سمجھتے کہ تمام دینوں کے اعلانات سے اسلامی اذان ہر طرح نہایت اعلیٰ و بالا ہے۔ مشرکین کے سنکھ، عیسائیوں کے گھنٹ، یہودیوں کے ناقوس کی بے معنی آوازوں سے اسلامی اذان کی آوازیں کہیں اعلیٰ و افضل ہیں کہ ان میں اللہ کی حمد نبی کی نبوت کا اعلان بھی ہے نماز کا بلاوا بھی۔ نماز کے فوائد کا اعلان بھی ہے جس سے نماز کی ترغیب ہوتی ہے۔ ایسی پیاری چیز کا جو قوم مذاق اڑائے وہ تمہاری دوست کب ہو سکتی ہے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** دلی تصدیق کے بغیر کلمہ پڑھنا درحقیقت اسلام کا مذاق اڑانا ہے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس حرکت کو هُزُوًا اور لَعِبًا فرمایا۔ **دوسرا فائدہ:** ہر کلمہ گو مسلمان نہیں جب تک کہ اس کے عقائد درست نہ ہوں۔ دیکھو کلمہ گو منافقوں کو رب تعالیٰ نے کفار فرمایا۔ **تیسرا فائدہ:** منافقوں بے دینوں سے محبت کرنا مسلمان کے لئے حرام ہے۔ یہ فائدہ لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ الخ سے حاصل ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** انسان کا دل گویا لوہا ہے۔ اچھے اور مقبول بندے پارس ہیں۔ برے لوگ گویا تر زمین ہیں اگر لوہا پارس سے لگ جاوے تو سونا ہو جاتا ہے لیکن اگر تر زمین میں رہے تو زنگ آلود ہو کر بیکار مٹی ہو جاتا ہے جس سے کچھ نہیں بن سکتا۔ اچھوں سے الفت بروں سے نفرت دل کا بہترین علاج ہے۔ **پانچواں فائدہ:** اذان کا ثبوت قرآن مجید سے ہے جیسا کہ نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا۔ جو کہے کہ اس کا ثبوت صرف حدیث سے ہے، غلط ہے۔ دوسرے مقام پر قرآن کریم فرماتا ہے: اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ (جمعہ:۹) وہاں بھی اذان جمعہ

دوسرا اعتراض: اگر کسی کافر سے دوستی جائز نہیں تو آج مسلمان زندہ کیونکر رہیں آج مسلم سلطنتیں امریکہ، روس، چین وغیرہ کے تعاون و مدد سے چل رہی ہیں۔ **جواب:** اس اعتراض کا جواب ابھی پہلے لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ (مائدہ: ۵۱) کی تفسیر میں گزر گیا کہ دوستی اور چیز ہے، تعاون و مدد دوسری چیز، تعلقات بروقسط، تجارتی معاملات اور چیز ہے اداء حقوق کچھ اور اسلام نے کفار سے محبت کرنے کو حرام فرمایا۔ تعاون، تعلقات، اداء حقوق سے منع نہ فرمایا۔ جب اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے تو ظاہر ہے اس کے حقوق ادا کرنے پڑیں گے مگر دلی محبت اس سے بلکہ کافر ماں باپ سے بھی حرام ہے۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے کفار عزیزوں کو کیسا صاف جواب دیا۔ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (شعراء: ۷۷)

تیسرا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اذان صرف نماز کے لئے ہونی چاہیے تو فرمایا گیا: اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ۔ تم لوگ بچہ کے کان میں مردہ کو دفن کر کے قبر پر، وبائی بیماریوں میں اذان کیوں کہتے ہو؟ **جواب:** آیت کریمہ میں حصر کا لفظ کوئی نہیں یہ تم نے اپنی طرف سے لگایا ہے ہر نماز کے لئے اذان نہیں دیکھو نماز عید، نماز استسقاء، نماز کسوف کے لئے اذان نہیں۔ اور صرف نماز سے اذان خاص نہیں اذان آئی ہے نماز کے اعلان کے لئے مگر اس میں اور بہت سے فائدے ہیں۔ آنکھیں دی ہیں رب نے دیکھنے کے لئے مگر اس سے روتے بھی ہیں، اشارے بھی کرتے ہیں، خوشی و غم کا اظہار بھی جب دنیاوی چیزوں میں بہت فائدے ہوتے ہیں۔ اذان تو اللہ کا ذکر ہے اس میں بہت فوائد ہیں اس کی بحث ہماری کتاب "جاء الحق" حصہ اول میں دیکھو۔

چوتھا اعتراض: یہاں اس آیت میں نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فرمایا گیا اور سورۂ جمعہ میں اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ (جمعہ: ۹) فرمایا گیا یعنی یہاں الیٰ ہے اور وہاں لام اس فرق بیان میں حکمت کیا ہے، دونوں جگہ یکساں ذکر کیوں نہیں؟ **جواب:** اس فرق میں صدہا حکمتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ نماز پنجگانہ کی آذانیں نماز کی طرف بلانے کے لئے ہوتی ہیں اس لئے یہاں الیٰ ارشاد ہوا جمعہ کی پہلی اذان جس سے تجارت و کاروبار کرنا حرام ہو جاتے ہیں وہ تیاری نماز کے لئے ہوتی ہے نہ کہ نماز کے لئے نماز میں ابھی دیر ہوتی ہے۔ دوسری اذان نماز کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے وہاں لِلصَّلٰوةِ ارشاد ہوا۔ یہ اذان سن کر مسلمان کاروبار بند کر کے غسل تبدیلی لباس وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں اور بھی بہت حکمتیں ہیں۔ نماز پنجگانہ سب پر فرض ہے۔ نماز جمعہ دیہاتیوں، غلاموں، مسافروں، معذوروں پر فرض نہیں نہ ان لوگوں پر اذان جمعہ سن کر سعی واجب اس لئے وہاں لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (جمعہ: ۹) ارشاد ہوا کہ جس کے حق میں وہ اذان لِلصَّلٰوةِ ہے اس پر سعی واجب ہے دوسروں پر نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

انسان کا دل گویا سیاہی چوس لینے والا کاغذ ہے۔ جیسے وہ کاغذ جس قسم کی سیاہی سے لگایا جاوے وہ رنگ خود لے لیتا ہے دل بھی جس سے الفت رکھے اس کا رنگ لے لیتا ہے۔ دل تین طرح سے کسی کا رنگ لیتا ہے الفت سے، صحبت سے، چرچا نے، اچھوں کی الفت، اچھوں کی صحبت، اچھوں کا چرچا، دل کو اچھا کر دیتا

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا

فرمادو آپ اے کتاب والو نہیں ناراض ہوتے ہو تم ہم سے مگر اس لئے کہ ایمان لائے ہم

تم فرماؤ اے کتابیو تمہیں ہمارا کیا برا لگا یہ ہی نہ کہ ہم ایمان لائے

بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٥٩﴾

اللہ پر اور اس پر جو اتارا گیا طرف ہمارے اور جو اتارا گیا پہلے سے اور بیشک بہت سے تم میں سے بدکار ہیں

اللہ پر اور جو ہماری طرف اترا اور اس پر جو پہلے اترا اور یہ کہ تم میں سے اکثر بے حکم ہیں

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ

فرمادو کہ کیا خبر دوں میں تم کو شر کی اس سے زیادہ لوٹنے کے لحاظ سے پاس اللہ کے

تم فرمادو کیا میں بتادوں جو اللہ کے یہاں اس سے بدتر درجہ ہے

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ

وہ کہ پھٹکار کردی اس پر اللہ نے اور غضب کیا او پر اس کے اور بنادیئے ان میں سے بندر

وہ جس پر اللہ نے لعنت کی اور ان پر غضب فرمایا اور ان میں سے کردیئے بندر

وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا

اور سور اور پوجنے والے شیطان کے یہ لوگ ہیں بہت بری جگہ میں

اور سور اور شیطان کا پجاری ان کا ٹھکانا زیادہ برا ہے

وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾

اور زیادہ گمراہ سیدھے راستہ کے

اور یہ سیدھی راہ سے زیادہ بہکے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ یہودیوں عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ اب حضور ﷺ کو حکم ہے کہ ان سے بیزاری کا اظہار فرمادو اور نفرت کی وجہ بتادو۔ گویا دلی نفرت کے حکم کے بعد زبانی بیزاری کے اظہار کا حکم دیا جارہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں ذکر ہوا کہ یہود و نصاریٰ تمہاری اذانوں کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اب بتایا جارہا ہے کہ وہ

گھر کے مالک کو بھی گھر والا کہا جاتا ہے اور کرایہ دار کو بھی اور گھر کے مہمان کو بھی اور جو گھر میں بیٹھا ہو اس کو بھی۔ اس والا میں بہت گنجائش ہے وہ لوگ تھے تو کتاب والے مگر دور کی نسبت سے لہٰذا یہ فرمان ایک معنی سے حقارت کا بھی ہے۔ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ لفظ هَلْ انکاری سوال کے لئے ہے اس کے معنی ہیں نہیں تَنْقِمُوْنَ بنا ہے نَقْمَةٌ سے بمعنی سخت برا سمجھنا۔ عیب لگانا سزا دینا اس سے ہے انتقام بمعنی بدلہ دینا یا بدلہ لینا۔ یہاں پہلے دو معنی میں ہو سکتا ہے۔ اس کا مفعول بہ پوشیدہ ہے۔ شیئا یعنی تم لوگ ہماری کسی چیز کو برا نہیں سمجھتے۔ عیب نہیں لگاتے اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ یہ عبارت اس پوشیدہ شیئا سے استثناء ہے اور تَنْقِمُوْنَ کا مفعول بہ۔ بعض نے فرمایا کہ یہ عبارت مفعول لہ ہے۔ لہٰذا اس کی دو تفسیریں ہیں ایمان باللہ کے معانی بارہا بیان ہو چکے کہ اس میں فرشتوں، قیامت، تقدیر، وغیرہ تمام پر ایمان لانا داخل ہے اور ایمان باللہ وہ ہی معتبر ہے جو حضرات انبیاء کرام کے ذریعہ سے ہو اور صحیح طور پر ہو جو لوگ اللہ تعالیٰ کو محض عقلی دلائل سے مان لیں یا حضرات انبیاء کرام کی تعلیم کے خلاف اسے مانیں وہ مومن باللہ نہیں۔ یعنی اے کتابیو! تم ہم سے صرف اس بنا پر ناراض ہو کہ ہم صحیح معنی میں اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ تم نے ہمارے کمال کو عیب سمجھ لیا اور ہم سے ناراض ہو گئے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

لا عیب فیھم غیر ان سیوفھم لھن فلول من قراع الکتائب

یعنی اس قوم میں اور تو کوئی عیب نہیں بجز اس کے کہ ان بہادروں کی تلواریں دشمنوں کی سرکوبی کرتے کرتے کندی ہو گئی ہیں اس میں عیب کی نفی بہت مبالغہ سے ہے وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ یہ عبارت لفظ اللہ پر معطوف ہے پہلے مَآ اُنْزِلَ سے مراد قرآن کریم، حدیث شریف اور حضور ﷺ کے تمام معجزات ہیں اس لئے بِالْقُرْاٰنِ نہ فرمایا اور دوسرے مَآ اُنْزِلَ سے مراد تمام انبیاء کرام کی کتابیں، صحیفے ان کے معجزات سب ہی ہیں۔ ان دونوں ایمانوں میں فرق یہ ہے کہ قرآن کریم اور اسلامیات پر ہمارا تفصیلی ایمان ہے اور دیگر کتب وغیرہ پر اجمالی ایمان قرآن مجید و حدیث شریف پر ایمان بھی ہے عمل بھی ان تمام پر ایمان ہے عمل نہیں کہ وہ کتب منسوخ ہو چکیں نیز گزشتہ کتب اور پچھلے نبی تشریف آوری میں پہلے ہیں قرآن حکیم اور نبی کریم ﷺ بعد میں ہیں مگر ہمارے ایمان میں قرآن و نبی ﷺ پہلے ہیں وہ کتابیں اور وہ انبیاء کرام بعد میں کہ ہم نے پہلے قرآن اور اپنے نبی کو مانا پھر ان کتابوں، ان نبیوں کو مانا اور اسلامی عقائد میں حضور پہلے ہیں باقی تمام عقائد بعد میں پہلے حضور کو نبی مانتے ہیں پھر قرآن، روزہ، نماز وغیرہ کو مانتے ہیں بلکہ خدا کی ہستی کو ماننا حضور کے ماننے پر مقدم ہے مگر رب تعالیٰ کی صفات کو ماننا حضور کو ماننے کے بعد ان وجوہ سے پہلے مَآ اُنْزِلَ کو آگے بیان کیا دوسرے مَآ اُنْزِلَ کو پیچھے حالانکہ نزول میں وہ سب پہلے ہیں اور قرآن کریم وغیرہ پیچھے وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ۔ یہ عبارت اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ الخ پر معطوف ہے اور اس کا تتمہ ہے فسق سے مراد فسق اعتقادی یعنی کفر ہے اگرچہ سارے یہودی عیسائی کافر ہیں مگر چونکہ ان میں سے بعض لوگ اللہ کے علم میں آئندہ ایمان لانے والے بھی تھے۔ اس وقت وہ شرعاً کافر تھے عنداللہ مومن کہ ان کے نام مومنوں کی فہرست میں تھے اس لئے اَكْثَرَكُمْ فرمایا یعنی تمہارے ہم سے ناراض ہونے کی دو وجہ ہیں ایک یہ کہ ہم صحیح معنی میں مومن ہیں۔ دوسرے یہ کہ تم

پانچویں عیب کا ذکر ہے ہماری قرأت میں عَبَدَ ماضی ہے اور الطَّاغُوْتَ مفعول بہ ہے عَبَدَ سے پہلے مَن پوشیدہ ہے بعض قرأتوں میں عَبُدَ ب کے پیش سے ہے جمع عابد کی اور طاغوت مجرور ہے عبد کا مضاف الیہ اس کی اور بہت سی قرأتیں ہیں طاغوت کی تحقیق تیسرے پارہ کی تفسیر میں فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ (بقرہ:۲۵۶) کی شرح میں عرض کی جا چکی ہے کہ یہ بروزن فعلوت مبالغہ کا صیغہ ہے۔ طَغْیٌ سے بنا بمعنی سرکشی طاغوت کے معنی ہیں بہت سرکش، بہت گمراہ یا بہت گمراہ کن۔ طاغوت سے مراد یا شیطان ہے یا گائے کا بچھڑا جسے یہود نے پوجا تھا زمانہ موسوی میں یا یہود کے کاہن لوگ یا ان کے پوپ پادری جن کی یہ لوگ اطاعت کر کے کفر و سرکشی کرتے تھے یا وہ یہودی مراد ہیں۔ جنہوں نے ایک بار مکہ معظمہ میں جا کر مشرکین کو خوش کرنے کے لئے کعبۃ اللہ میں رکھتے ہوئے بتوں کو سجدہ کیا جس کا ذکر قرآن مجید ہے۔ اس صورت میں طاغوت سے مراد لات وعزیٰ وغیرہ بت ہیں یا یہود حضرت عزیز علیہ السلام کے نام کے بت بنا کر پوجا کرتے تھے تو طاغوت سے مراد حضرت عزیر علیہ السلام کے نام پر بنائے ہوئے پتھر یا لکڑی کے بنائے ہوئے مجسمہ ہیں یعنی بدترین لوگ وہ ہیں جن میں بندر سور اور شیطان کے پجاری بنا دیے گئے۔ بتاؤ یہ حرکتیں ہم نے کی ہیں یا تم نے اپنے گریبان میں منہ ڈالو اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا یہ نئی عبارت ہے جس میں گزشتہ عبارت کے نتیجہ کا ذکر ہے۔ اُولٰٓئِكَ سے اشارہ ان ہی یہود کی طرف ہے جن کے پانچ عیوب ابھی بیان ہوئے مکان تمیز ہے شر کی اگرچہ شریر تو یہود ہیں مگر ان کے ٹھکانہ اور دوزخی مقام کو شر فرمایا گیا ہے مجازاً جیسے کہا جاتا ہے فلاں برترین درجہ والا ہے یعنی یہ لوگ بدترین ٹھکانہ والے ہیں وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ یہ عبارت شَرٌّ پر معطوف ہے اور اُولٰٓئِكَ کی خبر اَضَلُّ اسم تفضیل ہے۔ سَوَآءِ السَّبِیْلِ سے مراد ہے۔ خدا رسی کا سیدھا راستہ، درست عقیدے، اچھے اعمال یعنی یقیناً یہ ہی لوگ بدترین درجہ والے اور راہ حق سے بہت بھٹکے ہوئے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ اہل کتاب آپ کے دین کے متعلق کہہ رہے ہیں ان کے جواب میں آپ فرما دو کہ تم کو ہمارے اندر اور کوئی عیب نظر نہیں آتا جس سے تم ناراض ہو، تمہاری ناراضی ہم سے صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور تمام ان چیزوں پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر اتریں قرآن مجید، احکام رسول، معجزات وغیرہ نیز ہم تمام ان چیزوں پر ایمان لائے جو اس سے پہلے دوسرے نبیوں پر اتریں ان کی کتابیں، ان کی تعلیم، ان کے معجزات، ان کے فضائل وغیرہ۔ غرضکہ ہم تو سچے پکے صحیح معنی میں مومن ہیں اور تمہارا یہ حال ہے کہ تم میں سے اکثر لوگ کافر و بے دین ہیں۔ نبیوں کے دشمن، ان کی کتابوں میں تحریف کرنے والے، ان کے معجزات کے انکاری پھر تم ہم سے ناراض کیوں نہ ہو بھلا تاریکی نور سے، رات دن سے، بے دینی دین سے بھی کبھی راضی ہو سکتی ہے۔ فرما دو کہ اچھا فرض کر لو کہ ہمارا دین شر ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بدتر شریر وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پھٹکار فرمائی اور آخرت میں غضب کیا اور بدترین لوگ وہ ہیں۔ جنہیں اللہ نے دنیا میں بندر اور سور بنا دیا ان کی صورتیں مسخ فرما دیں اور انہیں ایسا بے عقل بنا دیا کہ وہ باوجود اہل کتاب ہونے کا دعویٰ کرنے کے شیطان بچھڑا وغیرہ پوجنے لگے یہ لوگ بدترین درجے کے ہیں اور خدا رسی

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہود تو سارے ہی فاسق و بے دین ہیں پھر یہاں اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ کیوں فرمایا کیا ان میں کچھ یہود مومن بھی تھے؟ **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر میں گزر گیا کہ انہی میں سے بعض لوگ علم الٰہی میں آگے چل کر مومن ہونے والے تھے اس لئے عند اللہ وہ فاسق نہ تھے بلکہ بعض حضرات ایمان لا بھی چکے تھے جیسے حضرت سیدنا عبداللہ ابن سلام اور ان کے ساتھی وہ مومن تھے۔

دوسرا اعتراض: یہاں ارشاد ہوا بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ اور ذٰلِكَ سے اشارہ ہے اسلام کی طرف تو کیا اسلام شر ہے اور یہودیت اسلام سے بدتر شر ہے تو درست نہیں اسلام تو خیر ہی خیر ہے پھر یہ فرمان کیونکر درست ہوا؟ **جواب:** یہاں شر واقعی مراد نہیں بلکہ ان کے عقیدے کے لحاظ سے شر مراد ہے یعنی جس دین اسلام کو تم شر کہتے ہو اس سے بدرجہا شر اور بدتر تو تم ہو۔ شاعر کہتا ہے

فَكَمْ مِنْ عَآئِبٍ قَوْلًا صَحِيْحًا   وَآفَتُهٗ مِنَ الْفِهْمِ السَّقِيْمِ!

جیسے قرآن کریم نے فرمایا بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ (بقرہ: ۹۳) حالانکہ یہود کے پاس ایمان تھا ہی نہیں مگر جسے وہ ایمان سمجھتے تھے اسے ایمان کہا گیا یا فرماتا ہے اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (قصص: ۶۲) حالانکہ رب تعالیٰ شریک سے پاک ہے۔

تیسرا اعتراض: یہاں ارشاد ہوا مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ۔ مثوبہ بنا ہے ثواب سے جیسے قول سے مقولہ ہے، جواز سے مجوزہ ثواب کہتے ہیں نیکیوں کے اچھے بدلہ کو یہود کے پاس نیکیاں کہاں اور ان کا اچھا بدلہ کیسا پھر یہ کلام کیونکر درست ہوا؟ **جواب:** یہاں اس طعن کرنے کے لئے عذاب کو ثواب فرمایا گیا جیسا رب تعالیٰ دوزخی کفار سے فرمائے گا: ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (دخان: ۴۹) حالانکہ دوزخی نہ کریم ہے نہ عزیز کیوں فرمائے گا اسے شرمندہ کرنے کو ایسے ہی یہاں ہے۔

چوتھا اعتراض: یہود بندر سؤر نہ بنائے گئے تھے بلکہ ان کی خصلتیں بری عادتیں بندروں سؤروں کی سی ہو گئی تھیں وہ انسان نما بندر و سؤر تھے (مرزائی) **نوٹ:** نہ معلوم مرزائی حضرات کو کیا خدا کی مار ہے کہ وہ بلاوجہ معجزات انبیاء کی آیات اور گزشتہ قوموں کے عذاب کی آیات میں تاویلیں بلکہ تحریفیں کرتے رہتے ہیں۔ مولوی محمد علی لاہوری قادیانی نے اپنی تفسیر ''بیان القرآن'' میں یہاں یہ ہی معنی کیے اور بڑی ہیر پھیر کی۔ **جواب:** اگر بندر و سؤر کے ایسے معنی کیے گئے تو خدا خیر کرے اسلام ہی ختم کر ڈالو گے۔ جہاں فرمایا گیا کہ تم پر سؤر کا گوشت حرام ہے وہاں معنی کرلو کہ سؤر جیسے آدمیوں سے ملنا جلنا حرام ہے۔ جہاں حکم ہے کہ شراب کے قریب نہ جاؤ وہاں معنی کرلو کہ دنیا شراب ہے اس کے قریب نہ جاؤ چلو چھٹی ہوئی نہ سؤر حرام رہا نہ شراب اسی طرح صوم صلوٰۃ کے معنی میں ہیر پھیر کر کے مسلمانوں کو ان عبادات سے بھی محروم کر دو بلاوجہ قرآن کریم کی آیات میں ہیر پھیر کرنا اور ظاہری معنی کا انکار کرنا کفر ہے آخر کیا وجہ ہے؟ کیوں بندر و سؤر کے یہ معنی کیے پھر عصاء موسوی کے سانپ بن جانے کی آیات میں سانپ کے کیا معنی کرو گے جو صالح علیہ السلام کی اونٹنی جو پہاڑ سے پیدا ہوئی وہاں اونٹنی کے کیا

بھی کافر اور اللہ خوب جانتا ہے جو چھپا رہے ہیں اور ان میں

كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ

تم بہت سوں کو ان میں سے کہ جلدی کرتے ہیں وہ گناہ اور حد سے بڑھنے اور اپنے حرام

تم بہتوں کو دیکھو گے کہ گناہ اور زیادتی اور حرام خوری

السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝٦٢ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ

کھانے میں البتہ برا ہے وہ جو کرتے تھے کیوں نہیں منع کرتے ان کو ان کے اللہ والے

پر دوڑتے ہیں بیشک بہت ہی برے کام کرتے ہیں انہیں کیوں نہیں منع کرتے ان کے پادری

وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ

اور پوپ ان کے کہنے سے گناہ اور ان کے کھانے سے حرام البتہ برا ہے

اور درویش گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے بیشک بہت ہی

مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝٦٣

وہ جو وہ کرتے تھے

برے کام کرتے ہیں

تعلقات

ان آیات کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں یہود کے لعنتی اور مغضوب علیہم ہونے کا ذکر تھا اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ آپ کی مجلس پاک میں آ کر بھی بے فیض ہی رہتے ہیں کافر آتے ہیں کافر جاتے ہیں گویا بیماری کا ذکر پچھلی آیت میں تھا۔ اس بیماری کے نتیجہ کا ذکر یعنی مجلس پاک مصطفوی سے محروم رہ جانے کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کے کفر باطنی کا ذکر تھا کہ وہ مسلمانوں سے ان کے ایمان کی بنا پر متنفر ہیں اب ان کے دھوکہ بازیوں کا ذکر ہے کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں زبان سے کلمہ پڑھتے دل میں کفر رکھتے ہیں یعنی کفر ظاہر کے بیان کے بعد منافقت کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں فرمایا گیا تھا کہ یہود راہ خدا سے بہت ہی بھٹکے ہوئے ہیں۔ اب اس کا ثبوت دیا جا رہا ہے کہ وہ ہادی مطلق ﷺ کی مجلس پاک میں بیٹھ کر بھی راستہ پر نہیں آتے گویا دعویٰ پہلے ہو دلیل اب بیان ہو رہی ہے۔

شان نزول

امام قتادہ اور امام سدی فرماتے ہیں کہ چند یہودی ایک بار حضور ﷺ کی بارگاہ عالیہ میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ ہم لوگ آپ سے آپ کے دین سے بالکل راضی ہیں ہم آپ پر

کا دوام بتایا جاوے یعنی ان کا کافر ہو کر نکلنا واپس جانا خود ان کے لزوم کفر کی وجہ سے ہے، یہاں آکر کفر نہیں پیدا ہوا (تفسیر کبیر) بِالْكُفْرِ اور بِهٖ دونوں میں ب مصاحبت کی ہے یعنی وہ لوگ کفر ہی لے کر حضور کے آستانہ میں آئے اور کفر ہی لے کر واپس گئے، آپ کی صحبت یا کلام کا اثر ان کے دلوں میں مطلقا نہ ہوا۔ حضور عالی کا دربار وہ ہے جہاں حاضری دینے والوں کے کفر و گناہ بدبختی وغیرہ سب کچھ دھل کر دور ہو جاتے ہیں۔ ایمان، عرفان بلکہ خود رحمان انہیں مل جاتے ہیں وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ یہ نیا جملہ ہے جس سے مقصود ہے پہلے بیان کی تاکید یعنی ہم نے جو کچھ خبر دی ہے بالکل حق ہے کیونکہ اللہ ان کے دلی خفیہ ارادوں، چھپی تدبیروں کو خوب جانتا ہے وہ جو خبر دے رہا ہے بلکہ حق درست ہے اس فرمان عالی میں انتہائی غضب کا اظہار ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ پہلے سے ہی منافق ہیں اور آپ کی بارگاہ میں بری نیت سے ہی آتے ہیں۔ یہاں تک تو ان کے دلی چھپے ہوئے حالات کا ذکر فرمایا۔ اب ان کے ظاہری عیوب کا تذکرہ ہے جو ان کے دلی عیب یعنی نفاق کی دلیل ہیں۔ چنانچہ فرمایا: وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ ظاہر یہ ہے کہ تَرٰى میں خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور رؤیت سے مراد آنکھ سے دیکھنا ہے کیونکہ حضور کی نگاہ کھلی چھپی ہر چیز کو دیکھتی ہے (روح المعانی) اور ہو سکتا ہے کہ خطاب ہر مسلمان سے ہو اور رؤیت سے مراد دل سے دیکھنا یعنی عقلاً معلوم کرنا ہو یا آنکھ سے دیکھنا مگر پہلی تفسیر زیادہ قوی ہے كَثِيْرًا۔ تَرٰى کا مفعول بہ ہے اس سے مراد یہود کے علماء ہیں منافقت میں یہ سارے یہود یکساں تھے مگر یہ گناہ جو یہاں مذکور ہیں وہ صرف علماء یہود کرتے تھے اور ہو سکتا ہے کہ کثیر سے سارے وہ یہود مراد ہوں جن کا کفر پر مرنا علم الٰہی میں آچکا ہے۔ مِّنْهُمْ کا مرجع یہود ہیں جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے يُسَارِعُوْنَ بنا ہے۔ سرعۃ سے سرعت وعجلۃ دونوں کے معنی ہیں جلدی کرنا مگر عموماً اچھے کام میں جلدی کرنے کو سرعت کہا جاتا ہے اور برے کام میں جلدی کرنے کو عجلت مگر یہاں گناہ میں جلدی کرنے کو سرعت فرمایا گیا۔ یہ بتانے کے لئے کہ وہ لوگ گناہ میں ایسی جلدی کرتے ہیں جیسے وہ بڑی نیکی کر رہے ہیں گویا عجلت کے ساتھ رغبت بھی ظاہر فرمانے کے لئے يُسَارِعُوْنَ فرمایا۔ سرعت کے بعد اکثر اِلٰى آتا ہے۔ جیسے سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ (آل عمران: ١٣٣) مگر کبھی کسی حکمت سے فِیْ بھی لایا جاتا ہے جیسے يُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ (آل عمران: ١١٤) یہاں فی فرما کر یہ بتایا گیا کہ وہ گناہوں میں پہلے سے ہی مبتلا ہیں، مراتب گناہ میں ترقی کرنے میں جلدی کرتے ہیں (روح البیان) الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کی بہت تفسیریں کی گئی ہیں (١) چھوٹے گناہ اثم ہیں اور بڑے گناہ عدوان (٢) جسمانی گناہ اثم ہیں قلبی گناہ یعنی کفر و نفاق عدوان (٣) حقوق اللہ مارنے اثم ہیں، حقوق عباد مارنے لوگوں پر ظلم کرنا عدوان ہے (۴) توریت شریف کی آیات مٹا دینی اثم ہے اور اس میں جعلی آیات شامل کر دینی عدوان ہے (۵) مسلمانوں کو ستانا اثم ہے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھ دینا عدوان ہے (روح المعانی و بیان وغیرہ) ان مردودوں میں یہ سارے عیوب موجود تھے۔ غرضکہ الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ سے وہ گناہ مراد ہیں جو ان کے دین میں بھی گناہ تھے۔ صرف وہ گناہ مراد نہیں جو اسلام میں ہی گناہ ہیں کیونکہ وہ لوگ ان کے چھوڑنے کے مکلف نہیں تھے۔ اسلام لا کر مکلف ہوتے وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ یہ عبارت

کمائیوں سے منع کیوں نہیں کرتے حالانکہ یہ چیزیں ان کے دین میں بھی حرام یا کفر ہیں اور وہ ان عوام کے ان جرموں سے خبردار بھی ہیں انہیں منع کرنے پر قادر بھی ہیں۔ فرمایا جارہا ہے حضور اقدس یا مسلمانوں سے اور سنایا جارہا ہے انہیں پوپ پادریوں کو کیونکہ آیات قرآنیہ ان تک پہنچتیں تھیں لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔ لَبِئْسَ اور مَا کی تفسیر ابھی ابھی ہو چکی يَصْنَعُوْنَ کا فاعل وہ ہی پوپ پادری ہیں۔ عوام یہود کی بدعملیوں کے متعلق يَعْمَلُوْنَ فرمایا گیا اور ان کے پوپ پادریوں کے منع نہ کرنے ان کی ان بدکاریوں پر خاموش رہنے کے متعلق يَصْنَعُوْنَ فرمایا کیونکہ عمل سے صنعت سخت تر ہے۔ عمل ہر کام کو کہتے ہیں مگر صنعت وہ کام جو دل میں راسخ ہو جاوے۔ جس کی عادت پڑ جاوے، چونکہ ان علماء اور درویشوں کی یہ خاموشی ان عوام کی بدعملیوں سے زیادہ خطرناک تھی کہ اس خاموشی سے لاقانونیت پھیلتی تھی اس لئے اسے صنعت فرمایا یعنی ان پوپ پادریوں کی یہ خاموشی بدترین بدعملی ہے کہ ان کی ساری قوم کی تمام بدعملیاں ان پادریوں کی شہ پر ہو رہی ہیں ان کی خاموشی سے عوام یہود سمجھتے ہیں کہ یہ کام کوئی خاص برے نہیں ورنہ ہمارے پوپ صاحب ہم کو منع کر دیتے جب ہم اب بھی ان کے پیارے ہیں تو یہ کام بھی اچھے ہی ہوں گے۔

خلاصۂ تفسیر اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم ان یہود کی مردودیت مغضوبیت اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ یہ لوگ آپ کی بارگاہ میں آتے تو ہیں مگر فیض لینے کے لئے نہیں بلکہ دھوکہ دینے کے لئے چنانچہ وہ آپ کے سامنے منہ سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں، ہم مسلمان ہو گئے مگر حالت یہ ہے کہ آپ کے ہاں کافر ہی آتے ہیں اور کافر ہی جاتے ہیں۔ جیسے آئے ویسے ہی گئے ہم ان کے دلی ارادوں نیتوں کو جانتے ہیں، ان کی چھپی ہوئی حالت سے خبردار ہیں۔ چنانچہ آپ انہی لوگوں کو دعویٰ ایمان کرنے کے بعد دیکھتے ہی ہیں کہ وہ گناہوں، ظلم اور حرام خوری میں بہت جلدی کرتے ہیں اگر مومن ہو گئے تھے تو ان کے حال و اعمال کیوں نہ بدلے، ان کے اعمال بڑے ہی برے ہیں۔ اعمال سے دلوں کے احوال کا پتہ لگتا ہے۔ پھل پھول جڑ کا پتہ دیتی ہیں یا اکثر یہود کے اندر یہ عیوب ہیں پھر کس منہ سے اپنے کو اولاد انبیاء اور دوسروں سے اچھا کہتے ہیں یہ تو عوام یہود کا حال ہے ان کے پوپ پادریوں کا یہ حال ہے کہ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر انہیں صراحتاً بلکہ اشارۃً بھی منع نہیں کرتے یہ ان کے پیر پادری جھوٹ بولنے، حرام خوری سے منع کیوں نہیں کرتے یہ پادری لوگ ان سے بڑھ کر بدکار ہیں کہ بدکاروں کی بدکاریاں ان کی پراسرار خاموشی کی وجہ سے ہی ہو رہی ہیں۔

فائدے اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** بدنصیب شقی کو اعلیٰ سے اعلیٰ صحبت سے بھی فیض نہیں ملتا۔ بزرگوں کے پاس وہ جیسا آتا ہے وہاں سے ویسا ہی جاتا ہے۔ پیشاب سے بھرا ہوا برتن اگر سمندر میں بھی غوطہ لگائے پھر بھی کچھ نہ لائے گا۔ یہ فائدہ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ الخ سے حاصل ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت کا مرکز ہیں جب یہ وہاں سے محروم رہے تو کہاں سے ہدایت پائیں گے۔ **دوسرا فائدہ:** بعض مردود انسان قرین شیطان سے بھی زیادہ بدنصیب ہیں۔ دیکھو منافق یہودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے جاتے رہتے تھے مگر

ارادوں، خفیہ نیک و بد اعمال کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما رہے ہیں کوئی آڑ ان کی نگاہ کے لئے حائل نہیں ہو سکتی۔ یہ فائدہ وَ تَرٰی كَثِیْرًا الخ کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔ چنانچہ حضور انور نے دو قبروں کے متعلق خبر دی کہ ان میں عذاب ہو رہا ہے۔ یہ میت چغل خوری کرتا تھا اور یہ میت پیشاب کے چھینٹوں سے پرہیز نہ کرتا تھا۔ حضرت عباس سے جب فدیہ مانگا گیا اور انہوں نے اپنی غریبی و ناداری کی شکایت کی تو فرمایا کہ تم چار سو دینار اپنی زوجہ پاک کو مکہ میں دے کر آئے تھے وہ کہاں ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ (آل عمران: ۴۹) میں تم کو ان تمام کی خبر دے سکتا ہوں جو کچھ تم اپنے گھروں میں کھاتے بچاتے ہو۔ اور کھاؤ بچاؤ گے۔ جیسے ہمارے خیال کے لئے کوئی چیز آڑ نہیں۔ انبیاء کی نگاہ کے لئے کوئی پردہ حائل نہیں

خدا مطلع ساخت بر جملہ غیب علی کل شئی خبیر آمدی

گیارھواں فائدہ: تبلیغ دین صرف علماء پر ہی لازم نہیں بلکہ پیران عظام مشائخ کرام پر بھی ضروری ہے بلکہ ہر اثر والے پر ضروری ہے کہ اپنے ماتحتوں کی اصلاح کرے ورنہ پکڑا جاوے گا۔ یہ فائدہ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ سے حاصل ہوا۔ ربانیون تو یہود کے تارک الدنیا فقیر ہیں اور احبار ان کے پادری علماء اب بھی مشائخ کو چاہیے کہ جو لوگ ان کے پاس فیض حاصل کرنے آئیں انہیں نماز کی پابندی، معاملات کی درستی کی تلقین کریں بلکہ اپنے تعویذ وغیرہ میں نماز کی پابندی کی شرط لگا دیں، بڑا ثواب پائیں گے۔ میں جب کسی کو تعویذ دیتا ہوں تو دو شرطیں لگا دیتا ہوں نماز پنجگانہ کی پابندی، ہر گیارہویں چاند کو حضور غوث پاک کی فاتحہ۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: عدوان اور حرام خوری بھی اثم یعنی گناہ میں داخل ہے پھر اثم کے بعد ان دونوں کا علیحدہ ذکر کیوں فرمایا؟ **جواب:** تاکہ معلوم ہو کہ حقوق العباد ضائع کرنا بدترین گناہ ہے کیونکہ عدوان سے مراد ظلم اور سحت سے مراد رشوت ہے جیسا کہ ہم نے اس کی ایک تفسیر میں عرض کیا۔

دوسرا اعتراض: یہود تو کافر ہیں اور کافر شرعی احکام کے مکلف نہیں ہوتے وہ سؤر کھائیں، شراب پئیں، اسلامی حاکم انہیں نہیں روکے گا تو ان کو گناہوں، رشوت خوریوں سے کیوں روکا گیا۔ سؤر کھانا، رشوت کھانا دونوں ہی حرام ہیں پھر اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ اس آیت کریمہ میں ان کلمہ کو کفار کے کفر کی دلیل دی جا رہی ہے کہ اگر یہ لوگ دل سے مسلمان ہو گئے ہوتے تو یہ حرکتیں کرنے کی ہمت نہ کرتے یہ اعمال ان کے کفر کی دلیل ہیں۔ دوسرے یہ کہ کفار پر بھی حرام خوری حق تلفی کی پکڑ ہے۔ سؤر کھانے میں کسی کی حق تلفی نہیں وہ کھاتے ہیں تو کھائیں مگر چوری، رشوت، جواء وغیرہ سے ضرور روکا جاوے گا کہ اس میں بندے کی حق تلفی ہے۔

تیسرا اعتراض: یہود کے پوپ پادریوں کو ربانی کیوں فرمایا۔ ربانی وہ جو اللہ والا ہو وہ شیطان والے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ سے کیا تعلق؟ **جواب:** یہاں واقعی اللہ والے مراد نہیں بلکہ جنہیں عام یہود اللہ والا کہتے سمجھتے ہیں وہ مراد ہیں۔ یعنی

اور یہودی بولے اللہ کا ہاتھ باندھا ہوا ہے ان کے ہاتھ باندھے جاویں

وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ

اور لعنت کئے جاویں وہ اس وجہ سے جوانہوں نے کہا بلکہ ہاتھ اس کے کھلے ہیں خرچ کرتا ہے جیسے چاہے

اوران پراس کئے سے لعنت ہے بلکہ اس کے ہاتھ کشادہ ہیں عطا فرماتا ہے جسے چاہے اور اے محبوب

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ

اور البتہ ضرور زیادہ کرے گا بہت سوں کو ان میں سے وہ جو اتارا گیا آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے

یہ جو تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اترا اس سے ان بہتوں کو شرارت وکفر میں

طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ؕ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى

سرکشی اور کفر کو ڈال دی ہم نے درمیان ان کے دشمنی اور بغض دن

ترقی ہوگی اور ان میں ہم نے قیامت تک آپس میں دشمنی اور بیر ڈال

يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ

قیامت تک جب کبھی روشن کرتے ہیں وہ آگ لڑائی کے لئے بجھا دیتا ہے اس کو خدا

دیا جب کبھی لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا تا ہے

وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾

اور کوشش کرتے ہیں وہ زمین میں فساد کی اور اللہ نہیں محبت کرتا فساد کرنے والوں سے

اور زمین میں فساد کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں اور اللہ فسادیوں کو نہیں چاہتا

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کا کفر میں پختہ ہونا بیان فرمایا گیا۔ وہ حضور انور کی مجلس شریف میں آ کر بھی کافر رہتے ہیں اب اس کا ثبوت خود ان کے اپنے قول سے دیا جارہا ہے کہ ان کے منہ سے ایسی بکواس نکلتی رہتی ہے جو خود ان کے نزدیک بھی کفر ہے۔ گویا پہلے ان کے کفر کی پختگی کا ذکر تھا اب اس کا ثبوت ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود کی رسول دشمنی کا ذکر تھا جیسا کہ ہم نے اَلْاِثْمُ اور اَلْعُدْوَانِ کی تفسیر میں عرض کیا اب ان کی خدا دشمنی کا ذکر ہے جو رسول دشمنی کا نتیجہ ہے۔ جس کے دل میں حضور کی عظمت نہ ہو اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی عظمت کبھی نہیں ہو سکتی۔ گویا پہلے یہود کی بیماری کا ذکر تھا اب اس کے برے انجام کا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ یہود کے پوپ پادری انہیں گناہ بکنے سے نہیں روکتے اب فرمایا جارہا

دعا یا بدعا دینے سے پاک ہے سب اس سے دعا مانگتے ہیں وہ کس سے دعا مانگے یا ہم کو تعلیم کے لئے ہے کہ تم لوگ انہیں اس طرح بددعائیں دیا کرو یا یہ جملہ خبر یہ ہے یعنی ان یہود کے ہاتھ باندھ دیئے جاویں وہ ہی فقیر ہو جائیں، بخیل ہو جائیں یا ان کے ہاتھ باندھ دیئے جائیں گے دنیا میں بھی آخرت میں بھی دنیا میں اس طرح کہ وہ سخت بخیل مسک ہوں گے۔ کسی کے پاس مال نہ ہونا معمولی فقیری ہے مگر مال ہونا اور اس سے نفع نہ اٹھا سکنا بڑی سخت فقیری ہے۔ یہودی دوسری قسم کے فقیر ہیں کہ ان کے پاس مال بہت مگر بخل کی وجہ سے نہ خود کھا سکتے ہیں نہ کسی کو کھلا سکتے ہیں جمع کیا اور مر گئے ان کی دولت کا خلاصہ یہ ہے۔ محنت سے جوڑنا، حسرت سے چھوڑنا یہ خدا کا عذاب ہے آخرت میں اس طرح کہ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں دوزخ میں پھینکا جاوے گا۔ اس بکواس کی سزا میں وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا یہ جملہ غُلَّتْ الخ پر معطوف ہے اور اس میں بھی وہ تین مذکورہ احتمال ہیں کہ اپنی اس بکواس کی وجہ سے لعنت کیے جاویں یا اے مسلمانو کہو کہ ان پر لعنت کی جاوے دنیا و آخرت میں۔ لعنت کے معنی اور اس کے اقسام بارہا بیان ہو چکے یہاں یا تو بندوں کی لعنت مراد ہے یا رب تعالیٰ کی لعنت و پھٹکار مراد بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ، یہ عبارت یہود کی بکواس کا جواب ہے۔ بَلْ اضراب کے لئے ہے یعنی پہلے قول کی نفی اور آئندہ قول کا ثبوت اس میں غل کی نفی ہے بسط کا ثبوت۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھوں کا ذکر ہے۔ کہیں ایک ہاتھ کا جیسے يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (فتح: ۱۰) کہیں دو ہاتھوں کا جیسے یہاں اور آیت کریمہ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (ص: ۷۵) میں اور کہیں بہت سے ہاتھوں کا جیسے اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ (یٰسٓ: ۷۱) چونکہ یہ گوشت و پوست و ہڈی والا ہاتھ رب تعالیٰ کے لئے ناممکن ہے اس لئے وہاں ہاتھ سے مراد یا قدرت ہوتی ہے یا جود و کرم یا نعمت و احسان یا مملکت و سلطنت یا خاص توجہ اردو میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں کام میں حکومت کا ہاتھ ہے یعنی اس کی مدد ہے۔ بہت زیادہ کرم یا توجہ کے لئے ید کو تثنیہ یا جمع لایا جاتا ہے یہاں بھی ایسا ہی ہے اس ید سے مراد ہے تائید یعنی قوت دینا مبسوط بنا ہے بسط سے بمعنی کشادگی یہ غل کا مقابل ہے یہاں بھی کشادگی سے وہ ہی مراد ہے جو رب تعالیٰ کے لائق ہے اردو میں بھی سخاوت کو اور زیادہ خرچ کرنے کو ہاتھ کھلنا کہا جاتا ہے فلاں کا بڑا کھلا ہاتھ ہے یعنی خوب خرچ کرتا ہے یعنی رب تعالیٰ کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں بڑا کریم ہے معمولی سخی ایک ہاتھ سے ایک آدھ فقیر کو دیتا ہے بڑا سخی و کریم دو ہاتھوں سے بانٹتا ہے۔ اس کی عطا ہر سمت ہوتی ہے وہ ہی محاورہ یہاں استعمال ہوا ہے رب تعالیٰ کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں کہ ہر وقت ہر طرف ہر شخص کو بہت دیتا ہے یا اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں ایک ہاتھ دینے کے لئے دوسرا ہاتھ بندوں کے اعمال لینے کے لئے کہ ان کی نیکیاں قبول فرماوے اور بداعمال سے انہیں معاف فرمائے یا دونوں ہاتھ کھلے ہیں ایک ہاتھ دن میں دینے کے لئے دوسرا ہاتھ رات میں عطا کے لئے یا دونوں ہاتھ کھلے ہیں ایک ہاتھ بندوں کی مانگ سے دینے کے لئے دوسرا ہاتھ انہیں بغیر مانگے دینے کے لئے سبحان اللہ، يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ اس عبارت میں اس کے ہاتھ کشادہ ہونے کا بیان ہے یہ جملہ یا تو يَدٰهُ کی ضمیر مجرور سے حال ہے کیونکہ ذوالحال و حال میں خبر کا فصل جائز ہے۔ جیسے هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا (ہود: ۷۲) یا مستقل علیحدہ جملہ ہے۔ كَيْفَ ظرف ہے۔ يُنْفِقُ کا (روح المعانی)

جب دو قوموں کی آپس میں جنگ ہونے والی ہوتی تو فریقین اپنے اپنے پہاڑوں یا اونچے مقامات پر آگ روشن کرتے تھے اسے نار حرب کہتے تھے یعنی جنگی آگ یہ گویا جنگ کا الٹی میٹم ہوتا تھا وہ رواج تو جاتا رہا مگر یہ مثال قائم رہی کہ فلاں نے جنگ کی آگ بھڑکائی یعنی لڑائی کی کوشش کی وہ ہی محاورہ یہاں استعمال ہوا ہے (تفسیر روح المعانی) آگ بجھانے سے مراد ہے ان یہود کی کوششوں کو بیکار کر دینا۔ حضور ﷺ اور مسلمانوں کو ان کے شر سے بچا لینا یعنی یہ یہود جب بھی مسلمانوں کے خلاف جنگی تدبیریں کرتے ہیں یا کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں ان تدبیروں میں ناکام کر دے گا۔ اسلام اور مسلمان ان کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ اس کا تجربہ پہلے بھی ہو چکا اور اب بھی ہو رہا ہے والحمد للہ ایک قول یہ ہے کہ اس میں ان کے دائمی عمل کا ذکر ہے۔ حضور سے پہلے اور آپ کی موجودگی میں آپ کے بعد ہر زمانہ میں چنانچہ جب یہود نے پہلی بار فساد پھیلایا تو ان پر فطرس رومی کو مسلط کر دیا۔ جس نے انہیں پیس کر رکھ دیا پھر فساد پھیلایا تو ان پر مجوس مسلط ہوئے پھر فساد پھیلایا تو حضور ﷺ کو ان پر مسلط فرما دیا گیا اور انشاء اللہ آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا۔ یہاں تک کہ قریب قیامت جناب عیسیٰ علیہ السلام و امام مہدی کے زمانہ میں فنا کر دیئے جائیں گے انشاء اللہ۔ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا یہ ان کے دوسرے فسادوں کا ذکر ہے یعنی یہود اپنی مسلسل ناکامیوں کے باوجود چین سے نہ بیٹھیں گے، فساد پھیلاتے ہی رہیں گے۔ دوسری قوموں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے رہیں گے لہٰذا ان سے بے فکر نہ رہنا چاہیے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ۔ اللہ تعالیٰ فسادیوں کو پسند نہیں فرماتا بلکہ ان کو سخت ناپسند کرتا ہے لہٰذا تمام یہود بہت مردود ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب! ﷺ آپ یہود کی گستاخیوں پر مغموم و ملول نہ ہوں یہ تو ایسے بے ادب ہیں کہ بارگاہ الوہیت میں بھی گستاخیوں سے باز نہیں آتے۔ چنانچہ یہ میرے متعلق کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں وہ بخیل یا فقیر ہے نعوذ باللہ انہی بدنصیبوں کے ہاتھ بندھ جائیں یہ ہی بخیل و فقیر ہیں یہ لوگ اپنی اس بکواس کی وجہ سے لعنتی ہو گئے دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ اللہ کے دونوں دست کرم کشادہ ہیں ہر طرف ہر ایک کو بہت ہی عطا فرماتا ہے۔ اس کریم کے خزانے بھرے ہوئے ہیں جس طرح چاہے اپنی مخلوق پر خرچ فرماتا ہے، کسی کو فقیر کسی کو امیر بناتا ہے پھر ایک ہی کو کبھی فقیر کبھی امیر کرتا ہے اس میں اس کی لاکھوں مصلحتیں ہیں اور اے محبوب! ﷺ ان کی گستاخیوں پر ناراض نہ ہوں ان میں سے بہتوں کا یہ حال ہے کہ آپ کی کتاب، آپ کے معجزات، آپ کے فرمانوں سے ان بدنصیبوں کے کفر سرکشی میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے جس قدر آیات آتی ہیں اسی قدر یہ انکار و مذاق کرتے ہیں جس سے ان کا کفر پر کفر بڑھتا رہتا ہے۔ ہم نے ان پر دنیا میں یہ عذاب بھیجا کہ ان کو فرقوں میں بانٹ دیا اور ان میں آپس میں عداوتیں بغض قیامت تک ڈال دیئے کہ ان میں سے دو فرقے کبھی متفق ہو کر نہیں بیٹھ سکتے اتفاق و محبت اللہ کی رحمت ہے، جنت کی نعمت ہے، فرماتا ہے: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ (حجر: ۴۷) اور آپس کی دشمنیاں دوزخ کا عذاب ہے فرماتا ہے: كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا (اعراف: ۳۸) اور آپ کے یا مسلمانوں کے مقابل یہ لوگ جب بھی لڑائی کی آگ بھڑکائیں

میرے متعلق کہتے ہیں وہ خود اس سے متصف ہو جاتے ہیں۔ **آٹھواں فائدہ:** مطیع کو ثواب دینا اور مجرم کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ پر بذات خود واجب نہیں وہ مختار ہے اپنے اختیار سے ثواب و عذاب دے گا یہ ہی مذہب اہل سنت ہے۔ یہ فائدہ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ سے حاصل ہوا اس کے ذمہ کسی کو واجب بذاتہ ماننا اس کے دست کرم کو پابند ماننا ہے جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے (تفسیر کبیر) **نواں فائدہ:** قرآن و حدیث سے اس کو ہدایت ملتی ہے جس کے دل میں ایمان کی حرارت ہو جو ازلی شقی ہے وہ اس سے نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ فائدہ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا الخ سے حاصل ہوا۔ سورج سے چمگادڑ کی آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔ سورج کا قصور نہیں اس کی اپنی آنکھ کا قصور ہے۔ **دسواں فائدہ:** قوم میں عداوت و بغض ہونا اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے۔ یہ فائدہ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ الخ سے حاصل ہوا۔ یوں ہی قوم میں اتحاد و اتفاق اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے۔ **گیارھواں فائدہ:** بعض گناہوں کی وجہ سے لوگوں میں نا اتفاقی پیدا ہوتی ہے۔ آپس میں عداوتیں بغض پھیلتے ہیں۔ یہ فائدہ بھی اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ الخ سے حاصل ہوا۔ کہ یہود کو بارگاہ الٰہی میں گستاخی کی وجہ سے عداوت و بغض کی سزا بھی ملی یوں ہی بعض نیکیوں کی وجہ سے اتفاق و محبت پیدا ہوتی ہے جو شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت داہنا پاؤں دروازہ میں پہلے رکھا کرے، بسم اللہ شریف پڑھ کر داخل ہوا کرے اور گھر والوں کو سلام کیا کرے اگر گھر خالی ہو تو اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔ کہہ لیا کرے۔ فجر کی سنتیں گھر پڑھ کر ۷۰ بار استغفار پڑھ لیا کرے تو انشاء اللہ گھر میں اتفاق روزی میں برکت رہے، مجرب ہے۔ **بارھواں فائدہ:** اللہ پر وہ کام واجب نہیں جو بندوں کے لئے مفید ہو یہ ہی اہل سنت کا مذہب ہے۔ دیکھو قرآنی آیات ان یہود کے کفر و طغیان کا باعث تھیں مگر رب تعالیٰ نے نازل فرمائیں (تفسیر کبیر) چمگادڑوں کی رعایت کے لئے سورج کو تاریک نہیں کیا جاتا۔ معتزلہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر وہ کام واجب ہیں جو بندوں کے لئے مفید ہوں۔ دوسرے مقام پر فرماتا ہے: فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (توبہ: ۱۲۵) **تیرھواں فائدہ:** انشاء اللہ یہود و نصاریٰ بلکہ تمام کفار کی اسلام دشمنی میں اسلام کے خلاف کوششیں بیکار رہیں گی۔ اسلام کا سورج چمکتا دمکتا رہے گا۔ یہ فائدہ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ سے حاصل ہوا اب تک یہ ہی دیکھا جا رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ اسلام کے خلاف مسلمانوں کو مٹانے کے لئے صدہا کوششیں کرتے رہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ہمیشہ مسلمانوں کو بچا لیتا ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہود اگرچہ کافر ہیں مگر ہیں تو اہل ایمان ان کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ بخیل یا فقیر ہے پھر وہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ان کی طرف اس کلام کی نسبت کیونکر درست ہے کہ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ **جواب:** تفسیر کبیر میں اس اعتراض کے دو جواب دیئے ہیں ایک یہ کہ وہ مسلمانوں پر طعن و طنز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اسلام کے عقیدے میں مسلمانوں کا خدا فقیر ہے وہ بندوں سے قرض مانگ رہا ہے مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (بقرہ: ۲۴۵) دوسرے یہ کہ جاہل یہودی اپنی غریبی و تنگ دستی دیکھ کر یہ کہہ دیتے تھے اگرچہ یہ ان کا عقیدہ نہ تھا جیسے اب بھی بعض جاہل لوگ خدا تعالیٰ کی شان رفیع میں گالیاں بک دیتے ہیں۔ مصیبت میں بہت گستاخیاں

چھٹا اعتراض: یہاں فرمایا گیا کہ یہود کی آپس میں سخت عداوت تا قیامت رہے گی مگر دوسری جگہ ارشاد ہے بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (مائدہ:۵۱) نیز آج ان کی آپس میں بڑی محبت و میل جول دیکھا جا رہا ہے پھر یہ آیت کیونکر درست ہوئی؟
جواب: اس کا جواب پچھلی آیات کی تفسیر میں گزر گیا کہ ان کا آپس میں بہت ہی ڈھول جوتا ہے۔ کبھی اتفاق ہوتا ہے تو ظاہری سیاسی نہ کہ حقیقی محبت اسے اتفاق نہیں کہتے سیاسی گٹھ جوڑ کہتے ہیں نیز وہ مسلمانوں کے مقابل متحد ہو جاتے ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں اس کی تفسیر وہ آیت کریمہ ہے تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (حشر:۱۴)

ساتواں اعتراض: اگر آپ کی نااتفاقی رب کی لعنت و پھٹکار ہے تو مسلمان بھی اسی زد میں آجاتے ہیں مسلم قوم میں بھی بہت ہی نااتفاقیاں فرقہ بندیاں ہیں۔ **جواب:** اس کا جواب بھی پچھلی آیات کی تفسیر میں گزر گیا کہ مسلمانوں کی یہ نااتفاقیاں ظاہری اور عارضی ہیں یہ لوگ خدا کی ذات و صفات، نبی، کعبہ، قرآن وغیرہ میں متفق ہیں ان میں تو ابھی یہ بھی معین نہیں کہ نبی بندے ہیں یا خدا کتاب ایک ہے یا چند یہ لوگ مرے بعد بھی ایک نہیں ہم نے یہود کو دیکھا نہیں نہ ان کے موجودہ حالات سے خبردار ہیں اور غریب و امیر عیسائیوں کی ڈھول جوتی دن رات دیکھ رہے ہیں کہ ان میں دیسی اور ولایتی عیسائیوں اور غریب و امیر عیسائیوں میں اتحاد نہیں ان سب کے قبرستان اور گرجے تک الگ ہیں اس سے بدتر حال یہود کا ہوگا قرآن سچا ہے جو خبر دے رہا ہے حق دے رہا ہے ہم کو پتہ لگے یا نہ لگے۔ مسلمانوں میں آپس میں کیسی ہی مخالفتیں ہوں مگر ہر مسلمان نماز ختم کرنے پر تمام مسلمانوں کی مغفرت کی دعا کرتا ہے رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَ لِجَمِیْعِ الْمُسْلِمِیْنَ ہر ایصال ثواب کے موقعہ پر سارے مسلمانوں کو ثواب بخشتا ہے قبرستان میں جا کر تمام مسلمانوں کی قبروں کی زیارت سب کو ایصال ثواب کرتا ہے نیز مسلمانوں میں لڑائیاں شیطان ڈلواتا ہے۔ یہود کی یہ لڑائیاں خود رب تعالیٰ نے بطور عذاب ڈالیں نیز مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں انشاء اللہ رحمت بن جائیں گی کہ ان سے جو دلی تکلیف پہنچتی ہے وہ گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ کفار کی لڑائیاں عذاب ہیں جیسے طاعون کی بیماری اہل کتاب کے لئے عذاب تھی مسلمانوں کے لئے رحمت اس لئے رب تعالیٰ نے حضور انور کی دو دعائیں قبول فرمالیں مسخ وغیرہ کا عذاب نہ آنا کسی قوم کا مسلمانوں کو تباہ نہ کرسنا مگر تیسری دعا قبول نہ فرمائی یعنی آپس میں عداوت نہ ہونا۔

آٹھواں اعتراض: اس آیت میں وعدہ ہے کہ رب تعالیٰ یہود و کفار کی بھڑکائی ہوئی جنگی آگ بجھا دے گا مگر اکثر مسلمانوں کی جنگیں کفار سے رہتی ہیں اور کبھی مسلمانوں کو شکست بھی ہو جاتی ہے پھر یہ وعدہ کیونکر پورا ہوا؟ **جواب:** کفار کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا سے اسلام اور مسلمانوں کو مٹا دیں مگر ہمیشہ اس میں ناکام رہتے ہیں آگ بجھا دینے کا یہی مقصد ہے وہ چاہتے ہیں کہ سارے کفار جمع ہو کر مسلمانوں پر حملہ بول دیں مگر اکثر تو اس میں کامیاب نہیں ہوتے اگر کبھی ایسی جنگ ہو بھی جائے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح عظیم عطا فرماتا ہے۔ دیکھو غزوہ احزاب میں کیا ہوا اور اس سال چھ ستمبر ۱۹۶۵ کو بھارت نے غافل پاکستانیوں پر کیسا زبردست اچانک بے خبری میں حملہ کیا اور رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے شر سے کیسا بچایا کہ ان کے

سَیِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۶۵﴾ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا

گناہ ان کے اور البتہ داخل کرتے ہم ان کو نعمت کے باغوں میں اور اگر تحقیق وہ قائم کرتے

گناہ اتار دیتے اور ضرور انہیں چین کے باغوں میں لے جاتے اور اگر وہ قائم رکھتے

التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ

توریت کو اور انجیل کو اور اس کو جو اتارا گیا طرف ان کے رب کی طرف سے ان کے

توریت اور انجیل اور جو کچھ ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے اتارا گیا

لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ

تو البتہ کھاتے وہ اوپر سے اپنے اور نیچے سے پاؤں اپنے کے ان میں سے ایک جماعت ہے

تو انہیں رزق ملتا اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ان میں کوئی گروہ

مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ ع

درمیانی رو اور بہت سے ان میں سے برے ہیں وہ کام جو وہ کرتے ہیں

اعتدال پر ہے اور ان میں اکثر بہت ہی برے کام کر رہے ہیں

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات کریمہ میں یہود کے ان عیوب کا ذکر تھا جو ان پر لعنت و پھٹکار کا باعث بنے یعنی بارگاہِ الوہیت میں گستاخی اب انہیں وہ چیز بتائی جارہی ہے جو ان کے لئے رحمت الٰہی ملنے کے ذریعہ ہو۔ ایمان وتقویٰ، گویا دل کے میل کے بعد اس کے صابن کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں یہود پر لعنت وغضب کا ذکر ہوا اب اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ کا ذکر ہے کہ ان گناہوں کے باوجود اگر اب بھی توبہ کرلیں تو ہم سب کچھ معاف کردیں گے گویا گناہوں کے بعد ان کے کفارہ کا ذکر ہے کہ یعنی یہود اپنی حماقت سے ہم کو فقیر یا بخیل کہتے ہیں ذرا ایمان لا کر ہمارا کرم ہماری بندہ نوازی کی شان دیکھ لیں جھولی پھیلائیں پھر دیکھیں ہم کیا دیتے ہیں کتنا دیتے ہیں کیسے دیتے ہم سے لینے کا ذریعہ یہ نہیں ہے کہ ہم کو بخیل وغیرہ کہو بلکہ ہم سے لینے کا ذریعہ ہے ہمارے دروازے پر بھکاری یعنی مومن بن کر آجانا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا کہ یہود کے لئے قرآن ومعجزات زیادتی کفر کا باعث ہیں کیونکہ ان کے پاس ایمان نہیں ہے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ اگر یہ ایمان قبول کرلیں تو ان کے لئے ان کے سارے گناہ بھی وبال کا ذریعہ نہ بن سکیں گے۔ گویا پہلے ضبطی اعمال کے اسباب کا ذکر ہوا تھا اب معافی سیات کا ذکر ہے۔ ضبط دعفو میں سے ضبط کے بعد عفو کا ذکر ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کے

عبارت میں عطاء رحمت کا اور دنیاوی فائدے کا ذکر اگلی آیت میں ہے کَفَّرْنَا بنا ہے تکفیر سے جس کا مادہ کفر بمعنی چھپانا یا مٹانا سیات سے مراد یہود کے سارے پچھلے گناہ ہیں جو انہوں نے کفر کے زمانہ میں کیے وہ اگرچہ لاکھوں ہیں مگر انہیں جمع قلت فرما کر اس طرح اشارہ فرمایا کہ وہ تمام کے تمام رحمت الٰہی کے مقابل بہت تھوڑے ہیں (روح المعانی)

ما ایم پرگناہ تو دریاء رحمتی آنجا کہ فضل تست چہ باشندہ گناہ ما

گنہ رضا کا حساب کیا وہ اگرچہ لاکھوں سے ہیں سوا مگر اے عفو تیرے عفو کا تو حساب ہے نہ شمار ہے!

اس کی رحمت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہم جیسے کروڑوں گنہگاروں کو پلک جھپکتے پاک فرما دیتا ہے۔ **خیال رھے** کہ یہاں سات گناہ کبیرہ کے مقابل نہیں فرمایا گیا تا کہ اس سے گناہ صغیرہ مراد ہوں بلکہ مطلقاً گناہ کے معنی میں ہے۔ خواہ جسمانی گناہ ہوں یا جنانی چھوٹے یا بڑے ہاں حقوق العباد اس سے خارج ہیں کہ ایمان لانے سے وہ معاف نہیں ہو جاتے۔ مقروض کافر مومن ہونے کے بعد قرض ضرور ادا کرے گا وَ لَاُدْخِلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ اس عبارت میں دوسرے اخروی فائدہ کا ذکر ہے یعنی عطاء رحمت رحمانی جَنّٰتِ جمع ہے جنت کی بمعنی گھنا باغ جس کی زمین سبزہ درختوں سے ڈھکی النَّعِيْمِ بمعنی نعمت الٰہی جو وہاں ہیں علاوہ اس سبزہ وغیرہ کے۔ حضرت مالک ابن دینار فرماتے ہیں کہ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ جنت الفردوس اور جنت عدن کے درمیان ہے، وہاں کی حوریں جنت کے گلاب سے پیدا کی گئی ہیں۔ کسی نے پوچھا وہاں کون جاوے گا فرمایا خصوصاً وہ مومن جو گناہ کرنے لگیں اور ہیبت خداوندی کی وجہ سے باز آ جاویں (تفسیر روح المعانی) وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ اس جملہ میں ایمان کے دیناوی فائدہ کا ذکر ہے ھم کا مرجع وہ ہی اہل کتاب ہیں جن کا ذکر ابھی پچھلی آیت میں ہوا قائم کرنے کے معنی ہوتے ہیں درست کرنا سیدھا رکھنا اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے معنی ہیں نماز درست کرو ہمیشہ پڑھتے رہو۔ یہاں قائم کرنے سے مراد ہے ان کتابوں کے حقوق ادا کرنا۔ صحیح طور پر انہیں ماننا توریت و انجیل قائم کرنے سے مراد ہے اس کے عقائد اور غیر منسوخ احکام پر عمل کرنا جس کی جان ہے حضور محمد مصطفےٰ ﷺ پر ایمان لانا توریت وانجیل میں جس کا تاکیدی حکم تھا کیونکہ منسوخ آیات پر عمل کرنا ممنوع ہے توریت وانجیل میں تو نسخ و مسخ ہو چکا، قرآن کریم کی منسوخ آیات پر عمل نہیں ہوتا جیسے عدت وفات ایک سال ہونا مرتے وقت ماں باپ وغیرہ وارثوں کے لئے وصیت کا واجب ہونا، کفار پر جہاد نہ کرنا ان سے چشم پوشی ہی کرنا کہ ان احکام کی آیات قرآن کریم میں موجود ہیں مگر ان پر عمل نہیں ان کی ناسخ آیات و احادیث پر عمل ہے لہٰذا یہ آیت بالکل واضح ہے وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ یہ عبارت معطوف ہے التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ پر مَاۤ اُنْزِلَ سے مراد قرآن مجید ہے کیونکہ یہ سارے جہان کے لئے آیا ان کی ہدایت کے لئے آیا جس میں یہود بھی داخل ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد کتاب شعیاء، کتاب حزقیل، کتاب حقوق اور کتاب دانیال علیہم السلام ہوں کیونکہ ان تمام کتابوں میں حضور ﷺ کی بشارتیں اور آپ پر ایمان لانے کے احکام تھے اکثر مفسرین نے یہ تفسیر اختیار کی یعنی اگر یہودی عیسائی توریت و انجیل اور دوسری کتب انبیاء کی بتائی ہوئی راہ اختیار کرتے تو لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔ یہ اس دوسرے لَوْ کی جزا ہے جو اس آیت

ان کو جنت نعیم میں داخل فرمائیں گے اور اگر اب بھی یہ لوگ توریت وانجیل اور تمام کتب آسمانیہ کو قائم کرلیں کہ ان کی ہدایت کے موافق آپ پر ایمان لے آویں تو ہم ان کی روزی میں بہت ہی دنیاوی برکتیں دیں گے کہ وہ اوپر کی طرف سے یعنی میوہ دار درختوں کے پھل کھائیں اور نیچے کی طرف سے یعنی کھیتوں سے ہر قسم کے دانے کھائیں ہاں ان میں اب بھی ایک میانہ روی کرنے والی جماعت موجود ہے۔ جیسے عبد اللہ ابن سلام اور ان کے ساتھی یہود سے اور نجاشی بادشاہ حبشہ اور ان کے ساتھی عیسائیوں میں سے مگر ان یہود و نصاریٰ میں اکثر لوگوں کے اعمال بہت ہی برے ہیں جن کی پاداش میں ان پر یہ وبال آرہے ہیں (۲) یہ یہود جو ہمارے جود و کرم پر اعتراضات کرتے رہتے ہیں اپنے اعمال کو نہیں دیکھتے اگر یہ لوگ گزشتہ زمانہ میں صحیح معنی میں ایمان لے آئے ہوتے اور انہوں نے تقویٰ وطہارت اختیار کیا ہوتا تو ان پر یہ وبال کاہے کو آتے ہم ان کو عذاب دینے کے بجائے ان کے سارے گناہ بخش دیتے اور انہیں جنات نعیم میں داخل فرماتے اور اگر یہ گزشتہ زمانہ میں توریت وانجیل وغیرہ کی تعلیمات پر عمل کرتے انہیں قائم رکھتے تو انہیں اتنی برکتیں ملتیں کہ ہر طرف سے انہیں روزی ہی روزی ملتی مگر انہوں نے بدکاریوں کی وجہ سے اپنے رزق خود گھٹائے ہاں یہ سارے ہی خراب نہیں ان میں کچھ لوگ میانہ رو بھی رہے۔ مگر اکثر کے اعمال خراب ہی رہے اسی وجہ سے ان پر عذاب آتے رہے۔

فائدے

ان دونوں آیتوں سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ**: حضور ﷺ پر ایمان ساری کتابوں سارے نبیوں پر ایمان ہے حضور کا انکار ان تمام کا انکار ہے۔ حضور ﷺ کی اطاعت گویا سو کا عدد ہے جس میں ساری اکائیاں، دہائیاں آجاتی ہیں یا حاصل جمع ہے جس میں جمع کے سارے اعداد داخل ہیں۔ یہ فائدہ **وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا** الخ سے حاصل ہوا۔ دیکھو اہل کتاب اپنی کتابوں اپنے نبیوں پر ایمان لانے کے مدعی ہیں مگر رب نے ان کے ایمان کو معدوم قرار دیا۔ **دوسرا فائدہ**: تقویٰ و پرہیز گاری کا درجہ ایمان کے بعد ہے بغیر ایمان اختیار کیے کیسے ہی نیک اعمال اختیار کرو تقویٰ میسر نہیں۔ یہ فائدہ اسی سے حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ نے تقویٰ کا ذکر ایمان کے بعد کیا اب عیسائی یہودی لاکھ نیکیاں کریں۔ تعلیم کے مدرسے شفا کے لئے ہسپتال قائم کریں، یتیموں غریبوں کی مدد کریں مگر متقی نہیں کیونکہ مومن نہیں جب درخت کی جڑ کٹ جاوے تو شاخوں کو پانی دینے سے ہرا بھرا کیسے رہے۔ **تیسرا فائدہ**: اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہم تمام کے گناہوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ فائدہ **لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ** الخ سے حاصل ہوا۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یہود کے بدترین جرم بیان فرما کر انہیں ایمان و تقویٰ کی دعوت دی اوان سے بخشش ہی نہیں بلکہ دخول جنت کا وعدہ فرمایا بڑے سے بڑا مجرم بھی اس کے کرم سے مایوس نہ ہو۔ **چوتھا فائدہ**: منسوخ کتابوں کے عقائد منسوخ نہیں ہوتے صرف احکام منسوخ ہوتے ہیں ان کے بتائے ہوئے عقائد اختیار کرنا ہمیشہ ضروری نہیں۔ بشرطیکہ وہ آیات صحیح ہوں بناوٹی نہ ہوں۔ یہ فائدہ **وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ** الخ سے حاصل ہوا۔ **پانچواں فائدہ**: ایمان و نیک اعمال کی برکت سے رزق میں برکتیں نصیب ہوتی ہیں اس سے بروقت بارشیں آتی ہیں۔ پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔ یہ فائدہ **لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ** الخ سے حاصل ہوا۔

اپنے اپنے زمانوں میں توریت انجیل قائم رکھی ہوتی اسے تبدیل و مسخ نہ کرتے ان پر عمل پیرا رہتے تو ان پر عذاب نہ آتے بلکہ برکتیں نازل ہوتیں۔ دوسرے یہ کہ اس زمانہ کا ذکر ہے اور توریت و انجیل قائم رکھنے سے مراد ان کے پیش فرمودہ عقائد اختیار کرنا ہیں ان میں حضور ﷺ پر ایمان لانے کا حکم بھی ہے کسی کتاب کے منسوخ ہونے سے اس کے صرف احکام منسوخ ہوتے ہیں عقائد جوں کے توں باقی رہتے ہیں۔

چوتھا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب نے کتاب پر عمل نہ کیا اس لئے ان پر کھانے پینے کی برکتیں نازل نہ ہوئیں حالانکہ اہل کتاب اب بھی بڑے عیش و آرام میں ہیں ان کے رزق میں برکتیں بیان سے باہر ہیں آج دنیا بھر کے ملک امریکہ، انگلینڈ کے دست نگر ہیں پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ **جواب:** موجودہ عیسائیوں، یہودیوں پر یہ مال کی کثرت عیش و آرام خدا کی رحمت و برکت نہیں بلکہ اس کی لعنت ہے۔ کفر و عناد کے باوجود دنیا کی فراوانی اللہ کا عذاب ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ (انعام: ۴۴) بلکہ یہ عذاب مصیبت کے عذاب سے زیادہ خطرناک ہے کہ انسان اس میں دھوکہ کھا کر اور زیادہ کفر و عناد بڑھا لیتا ہے اس آیت کریمہ میں لَاَكَلُوْا الخ سے مراد رحمت و برکت کا کھانا پینا ہے نہ کہ لعنت و پھٹکار کا پھانسی کے مجرم کو پھانسی سے دو چار دن پہلے عمدہ اعلیٰ کھانے دیئے جاتے ہیں یہ کھانے رحمت کے نہیں لہٰذا آیت میں نفی اور طرح کی فراوانی کی ہے اور ان کو فراوانی دوسری قسم کی حاصل ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہاں روئے سخن حضور کے زمانہ کے ان یہود سے ہو جنہوں نے غریبی میں پھنس کر کہا يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (مائدہ: ۶۴) لہٰذا پہلی آیت کی جزا یعنی بخشش و مغفرت تاقیامت ہے اور اس آیت کی یہ جزا اسی زمانہ کے عیسائیوں کے لئے یہ جواب تفسیر روح المعانی نے اختیار کیا مگر فقیر کے نزدیک پہلا جواب قوی ہے اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک کی سچی فہم عطا فرمائے۔

تفسیر صوفیانہ

کچی عقل والے بچوں کو لالچ یا خوف سے راہ راست پر لگاتے ہیں انہیں ماں باپ پیسوں کے لالچ یا مار سے ڈرا کر ہی نمازی بناتے ہیں اسکول بھیجتے ہیں جب بچہ پکی عقل کا ہو جاتا ہے تو پھر خود اپنے ذوق و شوق سے ہی محنت کرتا ہے نہ اسے لالچ کی ضرورت پڑتی ہے نہ ڈرانے کی۔ چونکہ وہ اہل کتاب کچی عقل کے مالک تھے اس لئے انہیں رب تعالیٰ نے اس آیت میں دینی و دنیاوی تین چیزوں کا لالچ دے کر ایمان و تقویٰ کی رغبت دی ان کے گناہ مٹانا، جنت دینا، دنیا میں انہیں خوب کھانے پینے کو دینا یعنی اگر اہل کتاب حقیقی ایمان اختیار کریں اور شرک فعلی شرک صفاتی سے بچیں یا علوم ظاہرہ سے ایمان اختیار کریں اور ان لوگوں پر اعتراض کرنے سے بچیں جو علوم باطنی سے ایمان لائے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا

وَاِذَا لَمْ تَرَ الْهِلَالَ فَسَلِّمْ   لِاُنَاسٍ رَاَوْهُ بِالْاَبْصَارِ

اگر تم نے چاند خود نہ دیکھا ہے تو ان کی بات مان لو جنہوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا تو ہم ان کے ایمان کی برکت سے ان کے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** گزشتہ آیات میں یہود و نصاریٰ کے غیظ و غضب اور حسد کا ذکر تھا اور یہ کہ یہ لوگ جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں گے، رب تعالیٰ اسے بجھاتا رہے گا اب اپنے محبوب ﷺ کو بے خوف و خطر ہو کر تبلیغ کا حکم دیا جا رہا ہے یعنی پہلے دشمنوں کی سخت دشمنی کا ذکر تھا اب ان کی ناکامی کی خبر دے کر محبوب کو خوب تبلیغ کا حکم ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں اہل کتاب کو راہ راست پر آنے کی رغبت دی گئی اس کے دنیاوی دینی فائدے بتائے گئے اب حضور ﷺ کو انہیں راہ راست پر لانے کا حکم دیا گیا۔ گویا فیض پانے والوں کو خطاب فرما کر فیض دینے والے سے خطاب ہے۔ اللہ کی مخلوق دو طرح کی ہے ایک دینے والی دوسری لینے والی سورج اور بادل بھی اللہ کی مخلوق ہیں اور زمین بھی اس کی مخلوق ہے مگر سورج و بادل فیض دینے والی مخلوق ہے اور زمین فیض لینے والی یوں ہی حضرات انبیاء کرام فیض دینے والے بندے ہیں باقی لوگ فیض لینے والے۔ پچھلی آیات میں لینے والی مخلوق سے کہا کہ اے اسرائیلیو! ایمان لے لو تقویٰ لے لو اب دینے والے بندہ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اے محبوب! انہیں ہماری ہر نعمت دے دو۔ گویا بھکاریوں کے ذکر کے بعد داتا کی دین کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیات میں اہل کتاب کے ہدایت پانے سے مایوس کیا گیا اب ارشاد ہے کہ اس کے باوجود اے محبوب! آپ تبلیغ کیے جاویں، آپ کو اجر و ثواب ملے گا۔ لا علاج مایوس بیماروں کے علاج پر بھی طبیب کو فیس اور دواؤں کی قیمت ملتی ہے اگرچہ بیمار فائدہ نہ اٹھائے۔ آپ حکیم مطلق ہیں وہ لوگ بیمار لا علاج ہیں۔ **چوتھا تعلق:** ابھی ارشاد ہوا کہ اہل کتاب میں اعتدال پسند میانہ رو یعنی مؤمنین تھوڑے ہیں بدکار کفار بہت زیادہ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ آپ ان کی زیادتی سے بالکل خوف نہ کریں رب تعالیٰ ان کے شر سے آپ کو بچائے گا۔ گویا دشمنوں کی کثرت و زیادتی کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا ان کے شر سے حفاظت کا ذکر اب فرمایا جا رہا ہے ساری خدائی اک طرف فضل الٰہی اک طرف کا ظہور ہے۔

شان نزول

تفسیر کبیر نے اس آیت کریمہ کے شان نزول میں دس قول نقل کیے۔ مگر فقیر کے نزدیک ان میں سے اکثر ضعیف بلکہ باطل ہیں سورۃ مائدہ احکام کی آخری سورۃ ہے اور اس کی کوئی آیت منسوخ نہیں، ساری کی ساری مدنی ہیں لہٰذا اس آیت کا نزول قبل ہجرت مکہ معظمہ میں ماننا درست نہیں فقیر کے نزدیک اس کے شان نزول کی قوی روایت وہ ہے جو تفسیر روح البیان نے نقل فرمائی کہ یہود مدینہ نے جب حضور کی روز افزوں ترقی دیکھی تو بعض ضعفاء مؤمنین یا منافقین کے ذریعہ یہ خبر پہنچائی کہ ہم یہودی بہت بڑے مال دار عظیم جتھے والے ہیں اگر آپ تبلیغ اسلام سے باز نہ رہے تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے یا کرا دیں گے اور اگر آپ اس تبلیغ سے باز رہ جائیں تو ہم آپ کا بہت احترام کریں گے آپ پر اپنا مال خرچ کریں گے اس خبر کے پھیلنے پر قریباً ایک سو صحابہ کرام حضور کی حفاظت کے لئے مقرر ہو گئے جو سفر و حضر اندر باہر ہر وقت آپ کی حفاظت کرتے تھے اس موقعہ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کی حفاظت اپنے ذمہ کرم پر لینے کی خبر دی اس آیت کے نزول پر حضور ﷺ نے ان جاں نثار صحابہ سے فرمایا کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھر

خواص کو پہنچتے رہیں گے۔ تیسرے وہ خاص رازکی باتیں جو رب تعالیٰ اور محبوب کے درمیان خصوصی اسرار ہیں وہ کسی کو نہیں دیئے گئے نہ بتائے گئے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِہٖ مَاۤ اَوْحٰی (نجم:۱۰) دیکھو رب نے قاب قوسین میں بلا کر سب کو ہٹا کر حضرت جبرئیل کو بھی سدرہ پر روک کر ایسے اسرار راز پر مطلع فرمایا جو کسی کو نہ بتائے گئے بلکہ انہیں مَاۤ اَوْحٰی کے پر اسرار لفظ سے تعبیر کر دیا۔

میان طالب و محبوب رمزے است کراماً کاتبین راہم خبر نیست

دیکھو آیات قرآنیہ میں احکام کی آیات تفسیر و تفصیل سے شائع فرمائی گئیں مگر متشابہات کی تفسیر نہ بتائی گئی نہ اس میں غور کرنے کی اجازت دی گئی لہٰذا یہاں مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ میں پہلی قسم کی وحی مراد ہے۔ **خیال رہے** کہ یہاں یہ تو فرمایا کہ کیا پہنچاؤ مگر یہ نہ فرمایا کہ کہاں اور کس کو پہنچاؤ۔ وہ پوشیدہ ہے یعنی اپنی امت کو پہنچاؤ حضور کی امت ساری مخلوق ہے لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (فرقان:۱) حضور نے انس و جن و فرشتے سب کو ان کی حیثیت کے لائق تبلیغ کی یا اپنی امت کے ہاتھوں، زبان، دماغ، دل تک پہنچاؤ کہ انہیں پڑھاؤ، بتاؤ، سکھاؤ، سمجھاؤ یہ سب کچھ حضور کی طرف سے ہے رب نے قرآن حضور کو دیا پھر حضور نے سب کو دیا اس لئے بَلِّغْ ارشاد ہوا وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ اس جملہ میں ناممکن کو ناممکن پر معلق ہے اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ شرط ہے جس میں آئندہ کا ذکر ہے اور فَمَا بَلَّغْتَ الخ میں گزشتہ کا ذکر ہے یا اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ میں ایک حکم کی تبلیغ نہ فرمانا مراد ہے اور فَمَا بَلَّغْتَ میں تمام احکام کی تبلیغ نہ فرمانا مراد یعنی اگر آپ نے آئندہ تبلیغ نہ کی تو گویا گزشتہ زمانہ میں بھی تبلیغ نہ کی کہ وہ کی ہوئی تبلیغ بیکار ہو گئی یا اگر آپ نے ایک تبلیغی حکم نہ پہنچایا تو گویا کوئی حکم نہ پہنچایا جیسے نماز کا ایک رکن یا شرط چھوڑ دینا گویا تمام ارکان کا چھوڑ دینا ہے گزشتہ ادا کیے ہوئے ارکان بھی بیکار ہو جاتے ہیں یا جیسے ایک انسان کا قتل گویا تمام کا قتل ہے یا جیسے ایک نبی یا ایک آیت کا انکار گویا تمام نبیوں آیتوں کا انکار ہے (تفسیر مدارک و بیضاوی) بعض قرأتوں میں رِسَالَاتِهٖ ہے جمع سے (تفسیر کبیر) لہٰذا یہاں شرط و جزا ایک نہیں وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ یہ جملہ حکم تبلیغ کا تتمہ ہے جس میں حضور ﷺ سے وعدہ حفاظت فرمایا گیا۔ یَعْصِمُ بنا ہے عصمۃٌ سے بمعنی حفاظت اسی سے ہے معصوم یعنی محفوظ حفظ اور عصمت دونوں کے معنی ہیں حفاظت مگر حفظ سے عصم زیادہ قوی ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ بعض اولیاء گناہوں سے محفوظ ہوتے ہیں معصوم نہیں معصوم صرف فرشتے یا انبیاء کرام ہیں محفوظ وہ جو گناہ نہ کرے معصوم وہ جو گناہ نہ کر سکے کہ نہ گناہ اس تک پہنچ سکیں نہ وہ گناہ تک پہنچ سکے ایسے ہی دشمنوں سے محفوظ وہ کہ دشمن اس تک نہ پہنچے اور معصوم وہ کہ دشمن اس تک نہ پہنچ سکے۔ ناس سے مراد دشمن انسان ہیں خواہ کفار ہوں یا منافقین۔ خیال رہے کہ حضرات انبیاء سے عداوت صرف کفار جن و انس کو ہی ہے دوسری مخلوق تو ان کی خدام بارگاہ ہے کہ کنکر، پتھر حضور کا کلمہ پڑھتے ہیں، چاند، سورج، ہوا، بادل اطاعت کرتے ہیں مگر کفار جن نبی کو جانی ایذاء نہیں پہنچا سکتے کفار انسان ہی ان کے دشمن بھی ہیں اور ایذا رساں بھی۔ چنانچہ گزشتہ بعض نبیوں کو کفار انسانوں نے قتل کیا زخمی کیا نہ کہ جنات نے نیز اس موقعہ پر انسانوں نے ہی حضور کو دھمکی دی تھی۔ ان وجوہ سے یہاں مِنَ النَّاسِ ارشاد ہوا یہاں حفاظت سے مراد قتل اور

حضرات کا نقل کیا اور اس کے متعلق قریباً آٹھ صفحات رنگین کیے۔ ہم معلومات میں اضافہ اور بے دینوں کی تحریف ظاہر کرنے کے لئے اس کا مختصر خلاصہ نقل کرتے ہیں تا کہ ناظرین معلوم کرلیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی حفاظت نہ فرماتا تو لوگ اسے کیسے فنا کر دیتے یہ لوگ کہتے ہیں کہ حج الوداع سے واپسی پر حضور ﷺ ۱۸ ذی الحجہ اتوار کے دن ایک منزل پر پہنچے جس کا نام غدیر خم ہے جو جحفہ منزل کے قریب ہے مکہ و مدینہ کے درمیان وہاں کچھ لوگوں نے حضرت علی کی شکایت کی جو یمنی تھے۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں حکم دیا گیا کہ اے محبوب! آپ حضرت علی کی خلافت بلا فصل کا اعلان فرما دیں اور جماعت صحابہ کی مخالفت کی پرواہ نہ کریں اور پوری آیت یوں تھی یَاۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ۔ زمانہ نبوی میں یوں ہی تلاوت ہوتی رہی بعد میں صحابہ کو جمع فرما کر حضرت علی کے متعلق فرمایا مَنْ كُنْتُ مَوْلَا فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ جس کا میں مولیٰ ہوں اس کے علی مولیٰ یعنی ولی و خلیفہ ہیں۔ اٹھارہ ذی الحجہ عید غدیر کا دن ہے جو اس تاریخ میں روزہ رکھے اسے ساٹھ ماہ یعنی پانچ سال کے روزوں کا ثواب ہے اور اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ سے مراد صحابہ کی جماعت ہے جنہوں نے حضرت علی کو خلیفہ نہ مانا۔ اس آیت کی اس تفسیر کی بنا پر حضرات شیعہ اٹھارہ ذی الحجہ کو عید مناتے ہیں۔ غور کرو کہ یہ آیت کریمہ کی تفسیر ہے یا تحریف اور اس روایت کی بناء پر حضرت علی رضی اللہ عنہ بلکہ خود حضور ﷺ کی ذات بابرکات پر کیسے کیسے اعتراض پڑیں گے (۱) جب خلافت حیدری کا اعلان اس کی تبلیغ ایسی اہم چیز تھی تو حضور ﷺ نے معمولی اجمالی ذکر کیوں فرمایا کہ فعلی مولاہ صاف صاف آپ کی خلافت کا اعلان بہ ایں الفاظ کیوں نہ فرما دیا کہ میرے بعد علی خلیفہ ہیں جو ان کے ہوتے دوسرے کو خلیفہ مانے گا وہ کافر ہوگا صرف لفظ مولیٰ کیوں فرمایا (۲) مولیٰ کے معنی خلیفہ نہیں اس کے معنی ہیں دوست یا مددگار۔ رب فرماتا ہے اَنْتَ مَوْلٰىنَا (البقرہ:۲۸۶) ہم علماء دین کو مولانا کہتے ہیں۔ حضور انور نے اپنے کو مولیٰ فرمایا کہ مَنْ كُنْتُ مَوْلَا فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ حالانکہ نہ خدا تعالیٰ کسی کا خلیفہ ہے نہ حضور ﷺ نہ علماء دین (۳) حضور کے پردہ فرمانے کے بعد جب مسئلہ خلافت پیش ہوا تو حضرت علی نے اپنے لئے کوشش تو کی مگر اس آیت سے استدلال نہ فرمایا نہ کسی کو یہ واقعہ غدیر خم یاد دلایا کہ تم اتنی جلد وہ واقعہ کیوں بھول گئے۔ حضور کا مقرر کردہ خلیفہ تو میں ہوں (۴) حضرت علی نے بلکہ تمام صحابہ و اہل بیت نے اس آیت کریمہ کے ہوتے ہوئے خلفاء راشدین کے ہاتھ پر بیعت فرمالی اور انہیں خلیفہ تسلیم کر لیا اب صدیوں کے بعد اس آیت کی یہ تفسیر آپ حضرات کو معلوم ہوئی انہیں معلوم نہ تھی (۵) حضرت علی نے اس آیت میں یہ تحریف ہوتے دیکھی کہ اس کا ایک جز نکال دیا گیا اور خاموش رہے پھر اپنے زمانہ خلافت میں جب خلفاء ثلثہ پردہ فرما گئے تھے اسے درست نہ فرمایا بتاؤ یہ کتنا بڑا جرم ہے آج قرآن مجید کے زیر زبر میں فرق کیا جاوے تو مسلمانوں میں خون کی ندیاں بہہ جاویں کوئی اسے گوارا نہ کرے حضرت حسین نے خلافت یزیدی کے مقابلہ میں سر دے دیا اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیا مگر وہ بھی اس موقعہ پر تحریف قرآن دیکھتے رہے اور خاموش رہے (۶) ان سب باتوں سے چشم پوشی کر لی جاوے تب بھی اس حدیث میں خلافت بلا فصل کا ایک لفظ بلکہ اشارہ بھی نہیں اگر مولیٰ کے معنی خلیفہ ہی کر لئے جاویں تو بلا فصل کی قید کہاں سے لگائی

تبلیغی احکام چھپا لئے۔ حضور اس واقعہ کے بعد پانچ دن حیات رہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ تبلیغ میں کوتاہی کرتے تھے۔ تب ہی تو رب تعالیٰ نے بَلِّغْ فرمایا ورنہ اس حکم کی ضرورت کیا تھی (نعوذ باللہ)

جواب: اس کا جواب ابھی تفسیر میں گزر گیا کہ حضور ﷺ کو اس قسم کے خطاب حضور کی تائید کے لئے ہوتے ہیں یعنی یوں ہی تبلیغ فرمائے جاؤ۔ جیسے یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ (احزاب:١) ورنہ غور کرو کہ یہ آیت کریمہ تو حضور انور کی وفات شریف سے کچھ پہلے اتری اور حضور نے ہجرت سے پہلے تبلیغ کے لئے جو مصیبتیں جھیلیں اور بعد ہجرت جو جہاد کیے وہ دنیا جانتی ہے۔ حضور ﷺ تو نزول قرآن سے پہلے بھی عملی مبلغ تھے کہ کفار عرب حضور کو امین اور صادق الوعد کے القاب سے یاد کرتے تھے۔

دوسرا اعتراض: وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ میں شرط و جزا ایک ہی ہے حالانکہ ان دونوں میں فرق چاہیے۔ **جواب:** اس کی تفصیل ابھی عرض کی گئی کہ یا تو اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ اگر آپ نے ایک حکم کی بھی تبلیغ نہ کی تو گویا کسی کام کی تبلیغ نہ کی یا اگر آئندہ تبلیغ نہ کی تو گویا پہلے بھی تبلیغ نہ فرمائی وہ تبلیغ بھی رائیگاں گئی لہٰذا شرط و جزاء میں بڑا فرق ہے۔ تفسیر کبیر نے اس اعتراض کا کچھ اور ہی جواب دیا ہے مگر یہ جواب بہت آسان اور عمدہ ہے۔

تیسرا اعتراض: ایک مسئلہ کی تبلیغ نہ فرمانے کو تمام احکام کی تبلیغ نہ فرمانا کیوں قرار دیا؟ **جواب:** جو عبادت دوسری عبادت کا جزء ہو ان میں سے ایک کا چھوڑ دینا تمام عبادات کو بے کار کر دیتا ہے۔ دیکھو نماز میں تلاوت، قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ عبادت نماز کے اجزاء ہیں۔ اگر کوئی شخص سارے ارکان نماز ادا کر لے مگر ایک رکن چھوڑ دے تو سارے بیکار ہیں۔ یوں ہی حضور انور کے لئے تمام احکام کی تبلیغ مطلق تبلیغ کے ارکان ہیں اس لئے اگر حضور انور ایک حکم کی تبلیغ نہ فرما دیں تو تمام احکام کی تبلیغ بیکار ہو۔ گویا آپ کے لئے تمام عمر کی تبلیغ ایک عبادت قرار دی گئی ساری تبلیغیں اس کے ارکان۔

چوتھا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور ﷺ کے دل میں کفار کا خوف تھا اس لئے فرمایا گیا: وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ حالانکہ مخلوق سے خوف کرنا شان نبوت کے خلاف ہے فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (بقرہ:٣٨) **جواب:** مخلوق سے خوف ایذاء حضرات انبیاء کرام کو ہو سکتا ہے بلکہ ہوا ہے۔ خوف اطاعت ماسوی اللہ سے نہیں ہوتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے بلکہ پہلی بار جب عصا سانپ بنا تو اس سے خوف کیا اس لئے لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ ارشاد ہوا اور لا خوف لهم نہیں فرمایا مگر حضور انور کے دل میں کفار کا خوف نہ تھا۔ اس آیت کے نزول سے پہلے بھی حضور نے بے دھڑک تبلیغ فرمائی کبھی رب سے عرض نہیں کیا کہ مجھے کفار سے خوف ہے نہ صحابہ کو اپنی حفاظت کے لئے مقرر فرمایا۔ خود صحابہ کو حضور پر خوف تھا انہیں سنانے کے لئے یہ آیت آئی۔

پانچواں اعتراض: جب رب تعالیٰ نے حضور انور سے حفاظت کا وعدہ فرما لیا تو جنگ احد میں سرکار کو کفار سے زخم کیوں پہنچے یوں ہی کفار مکہ کی ایذاء سے تنگ آ کر ہجرت کیوں کرنی پڑی؟ **جواب:** تفسیر خازن وغیرہ نے تو اس کا جواب یہ

مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (حشر:۲۱) اور فرماتا ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا (احزاب:۷۲) غرضکہ احکام کی تبلیغ فرض کی نہ کہ عرفان کی عرفان مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ نہیں ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ رسول مقتدیٰ ہوتے ہی نہیں مقتدی ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔ اس طرح کہ آپ کو غیر اللہ کی طرف التفات رب تعالیٰ سے غافل نہ کر سکے گا۔ دنیا کا اشتغال آخرت سے غافل نہ کرے گا۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ یعنی معانی و اسرار قرآن میں تمام علوم ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی نے حضرت عبداللہ بن عباس کا قول نقل فرمایا کہ اگر میرے اونٹ کی رسی گم جاوے تو میں قرآن مجید سے معلوم کر سکتا ہوں کہ کہاں ہے۔ کسی نے ایک عالم سے پوچھا کہ حضور کی عمر شریف قرآن سے نکالو۔ انہوں نے فرمایا حضور انور کی عمر شریف تریسٹھ سال ہے کیونکہ یہ آیت کریمہ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا (منافقون:۱۱) سورۃ منافقون میں ہے اور سورۃ منافقون تریسٹھویں سورت ہے اور اس کے بعد سورہ تغابن ہے۔ تغابن کے معنی ہیں افسوس کرنا۔ اس میں اشارۃً ارشاد ہوا کہ حضور کی وفات ۶۳ سال میں ہوگی اور مسلمان اس پر افسوس و غم کریں گے (روح المعانی) یہ تو مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ کی وسعت علوم کا حال ہے تو وہ فیض ربانی جو ما اعرف میں داخل ہے۔ اس کی وسعت کا کیا پوچھنا ہے (از تفسیر عرائس البیان) رب نے حضور کی ایسی حفاظت فرمائی کہ تا قیامت حضور کا نام شریف مخلوق کی حفاظت کا ذریعہ بن گیا۔ دیکھو حضور کے غلام حضرت سفینہ پر شیر نے حملہ کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا، اے ام السائب (شیر) میں رسول اللہ کا غلام ہوں تو وہ شیر پالتو کتے کی طرح دم ہلا کر آپ کے آگے چلنے لگا۔ دیکھو' مشکوٰۃ شریف باب الکرامات' اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سید المحفوظین کی حفاظت میں ہر جگہ رکھے۔ مولانا فرماتے ہیں

نام احمد چوں شدہ حصن حصین ۔۔۔ پس چہ باشد ذات آں روح الامین

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ

فرمادو اے کتاب والو نہیں ہو تم اوپر کسی چیز کے یہاں تک کہ قائم کرو تم توریت

تم فرمادو اے کتابیو تم کچھ بھی نہیں ہو جب تک نہ قائم کرو توریت

وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ

اور انجیل کو اور اس کو جو اتارا گیا طرف تمہارے تمہارے رب سے اور البتہ ضرور زیادہ کرے گا

اور انجیل اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اترا اور بیشک اے

كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ

ابراہیمی پر ہوئے اور آپ ہم میں سے ہوئے پھر ہماری مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ حضور نے فرمایا ہاں مگر تم لوگ خود اپنی کتب اپنے دین کے انکاری ہو گئے، تم نے خود اپنے لئے نئے دین تراش لئے جن چیزوں کے ظاہر کرنے کا تم کو حکم تھا وہ تم نے چھپا دیں۔ ہم تمہارے اس دین سے بیزار ہیں وہ بولے تو ہم آپ کے دین سے بیزار ہیں ہم حق پر ہیں۔ اس موقعہ پر حضور ﷺ کی تائید اور ان لوگوں کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خازن، روح المعانی، کبیر وغیرہ)۔

تفسیر

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ ، یہاں قل میں خطاب حضور ﷺ سے ہے اور اہل کتاب سے وہ لوگ مراد ہیں جو اس وقت حضور ﷺ سے مذکورہ بالا گفتگو کر رہے تھے جیسا کہ شان نزول میں بیان ہوا اور ہو سکتا ہے کہ تمام دنیا کے اہل کتاب مراد ہوں اگلے پچھلے اور موجودہ کیونکہ حضور کے فرمان عالی جیسے تا قیامت مسلمانوں تک پہنچ رہے ہیں یوں ہی کفار تک پہنچ رہے ہیں مگر مسلمانوں سے رحمت کے خطاب ہیں کفار سے غضب و عتاب کے خطاب۔ ممکن ہے کہ قل میں ہر مسلمان یا ہر قرآن پڑھنے والے سے خطاب ہو اس صورت میں اہل کتاب سے سارے اگلے پچھلے کتابی مراد ہیں۔ اہل کتاب سے مراد یا یہود ہیں یا یہود و عیسائی دونوں مراد شَیْءٍ سے مراد سچا دین ہے جسے شئی کہا جا سکے باطل گویا شَیْءٍ ہی نہیں قابل ذکر قابل اعتبار ہی نہیں یعنی اے اہل کتاب! تم جس خود ساختہ دین پر ہو وہ تو کوئی چیز نہیں لاشئی محض ہے نہ اس کا کوئی فائدہ ہے نہ نتیجہ۔ یا شَیْءٍ سے مراد ان کی وہ فخر کی باتیں ہیں جن پر وہ اکڑتے تھے یعنی اولاد ابراہیمی ہونا، توریت و انجیل کا عالم ہونا، عرب کے جزیرہ میں رہنا وغیرہ تو مطلب یہ ہوگا کہ تم نہ ابراہیمی ہو نہ توریت و انجیل کے ماننے والے نہ ان کتب کے عالم نہ اہل عرب تم کسی خوبی سے موصوف نہیں کہ بے ایمان کی ساری خوبیاں بھی برائیاں ہیں اگر ایمان قبول کر لو تو سب کچھ ہو حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ یہ عبارت لَسْتُمْ الخ کی انتہاء ہے توریت و انجیل قائم کرنے کے معنی ابھی کچھ پہلے وَ لَوْ اَنَّهُمْ الخ (النساء: ۶۴) کی تفسیر میں گزر گئے کہ اس سے مراد توریت و انجیل کی ان ہدایتوں پر عمل کرنا ہے جو نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے کے متعلق کی گئی تھیں یا ان کتابوں کے تمام وہ درست عقیدے جن کی تعلیم گزشتہ انبیاء کرام نے دی تھی کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے اولاد بیوی وغیرہ سے پاک ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان کتب کے منسوخ احکام پر عمل کرنا مراد نہیں کیونکہ اب ان کا چھوڑ دینا ضروری ہے نہ کہ ان کا قائم کرنا مَاۤ اُنْزِلَ سے مراد یا تو قرآن مجید ہے جو تمام لوگوں کی طرف آیا جن میں اہل کتاب بھی داخل ہیں بلکہ ان پر قرآن مجید کا زیادہ احسان ہے کہ اس نے ان کی کتابوں ان کے نبیوں کی تصدیق بھی کی تائید بھی۔ انہیں عزت بھی بخشی یا اس سے مراد دیگر انبیاء کرام کی کتابیں اور صحیفے ہیں کہ ان سب میں حضور ﷺ پر ایمان لانے کا تاکیدی حکم تھا یعنی اس وقت تک تم کسی قابل شمار دین پر نہیں جب تک کہ تم توریت و انجیل کے یہ احکام نہ قائم کر وان پر عمل پیرا نہ ہو وَ لَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔ اس عبارت میں حضور ﷺ اور مسلمانوں کو ان کے ایمان سے مایوس فرمانا مقصود ہے تا کہ ان کے ایمان قبول نہ کرنے پر ان کو صدمہ و رنج نہ ہو كَثِیْرًا مفعول بہ اول ہے فعل لَیَزِیْدَنَّ کا اور مَاۤ اُنْزِلَ الخ فاعل ہے کثیر فرما کر یہ بتایا کہ سارے کتابی بد بخت نہیں ان

دوسرا فائدہ: اب تمام آسمانی کتب پر عمل یہ ہے کہ حضور ﷺ پر ایمان قبول کیا جاوے حضور کی اطاعت کے بغیر کسی آسمانی کتاب پر عمل ناممکن ہے۔ یہ فائدہ حَتّٰی تُقِیْمُوا الخ سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** نبی پر آسمانی کتب اترنا سب انسانوں پر اترنا ہے کیونکہ مقصود ان ہی کی ہدایت ہے۔ یہ فائدہ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** قرآن وحدیث مثل بارش کے ہے۔ بارش بوئے ہوئے بیج کو اگا تو سکتی ہے، اسے بدل نہیں سکتی۔ جن کے دلوں میں بدبختی کا بیج ہے اس کے لئے قرآن وحدیث اس شقاوت کی زیادتی کا باعث ہی ہوگا اور جن کے دل میں سعادت ونیک بختی کا تخم ہے ان کے لئے قرآن وحدیث ایمان وعرفان کی زیادتی کا سبب ہوگا یہ فائدہ وَلَیَزِیْدَنَّ الخ سے حاصل ہوا اس لئے کافر کو کلمہ پڑھا کر مسلمان بناتے ہیں پھر اسے قرآن وحدیث پڑھاتے ہیں کلمہ گویا سعادت کا تخم ہے، قرآن وحدیث اس کے لئے رحمت کا پانی۔ **پانچواں فائدہ:** کسی شخص کے ہدایت قبول نہ کرنے پر رنج وغم نہ کرنا چاہئے۔ مبلغ اپنا کام کیے جاوے لوگ قبول کریں یا نہ کریں۔ یہ فائدہ فَلَا تَاْسَ الخ سے حاصل ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ میں اہل کتاب سے فرمایا گیا کہ تم کسی چیز پر نہیں یا تم کچھ بھی نہیں حالانکہ وہ کافر تھے کفر پر تھے پھر یہ فرمان کیونکر درست ہوا؟ **جواب:** تفسیر میں عرض کیا گیا کہ یہاں شئی سے مراد دین حق ہے جو حقیقۃً شئی ہے کفر وغیرہ تو باطل اور لاشئی چیزیں ہیں لہٰذا وہ لوگ لاشئی ہوئے یہاں شئی بمعنی حق ہے نہ کہ بمعنی موجود یا مفہوم وغیرہ۔ قرآن کریم میں شئی بہت معنی میں استعمال ہوا ہے یہاں بمعنی حق وصحیح ہے۔

دوسرا اعتراض: اگر مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ سے مراد قرآن کریم ہو تو آیات میں تعارض ہوگا۔ کیونکہ قرآن کریم کہیں تو حضور ﷺ سے فرماتا ہے کہ قرآن آپ کی طرف اترا، کہیں مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تمہاری طرف اترا۔ یہاں یہود ونصاریٰ سے فرمایا کہ تمہاری طرف اترا بتاؤ قرآن اترا کس کی طرف ہے حضور کی طرف یا مسلمانوں کی طرف یا کفار کی طرف۔
جواب: حضور ﷺ قرآن کریم کے منتہاء نزول ہیں اور دوسرے لوگ مدعاء نزول یعنی نزول آسمانی کا منتہاء حضور ہیں۔ ہدایت کرنا ہم کو مقصود ہے۔ منتہاء کے لحاظ سے اُنْزِلَ اِلَیْکَ فرمایا جاتا ہے مدعیٰ کے اعتبار سے اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ جیسے ریل سے ڈاک پوسٹ آفس پہنچتی ہے پھر دوسرے ذریعوں سے ہمارے گھروں میں۔ ڈاکخانہ ڈاک کے منتہیٰ ہیں ہم لوگ ڈاک کے مدعیٰ۔ پھر قرآن مجید کافروں کو ایمان کی ہدایت دیتا ہے، مؤمنوں کو تقویٰ کی، متقیوں کو عرفان کی عارفوں کو ایقان کی اس لئے اس کے نزول کی نسبت کبھی حضور کی طرف ہوتی ہے، کبھی مسلمانوں کی طرف، کبھی کفار کی طرف لہٰذا تمام آیات درست ہیں۔ جیسے سورج بارش کے بعض فیض عام ہوتے ہیں۔ بعض فیض خاص عام فیض دھوپ دن، روشنی، موسم یوں ہی زمین کا ڈھل جانا گرد وغبار جم جانا، سورج یا بارش کے عام فیض ہیں مگر بعض جگہ لعل بنا دینا یا پھل پھول اگا دینا، سچے موتی بنا دینا یہ سورج وبارش کے خاص فیوض ہیں۔ یونہی قرآن کریم کے عام فیوض سارے انسانوں کے لئے ہیں کہ اس سے ایمان، اعمال کی رہبری ہوتی ہے۔ عرفان، ایقان، ولایت، قطبیت، غوثیت قرآن کریم کے خاص فیوض ہیں جو کسی کسی کو ملتے ہیں، سب کو نہیں۔

اور جس کی زبان پر تو قرآن ہو مگر اس کا دل فیضان سے خالی ہے وہ قہر ہی پائے گا۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی اصطلاح میں شی وہ ہے جو اپنا مقصد پیدائش پورا کرے جو مقصود پورا نہ کرے وہ لاشئی ہے۔ دیکھو آنکھ، کان، زبان والے کفار کو رب نے بہرا، گونگا، اندھا فرمایا صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ (بقرہ:۱۸) زندہ کافروں کو مردہ قرار دیا اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ (نحل:۲۱) مگر وفات یافتہ شہیدوں کو زندہ کہا۔ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (بقرہ: ۱۵۴) بیکار گھڑی لاشئی ہے جس سکہ کا چلن بند ہو جاوے وہ لاشئی ہے۔ عقائد، اعمال، دولت، عزت، نسب، علم وغیرہ کا مقصد رضاء الٰہی ہے۔ جب رب راضی نہ ہو تو یہ سب چیزیں لاشئی ہیں۔ یہود کے علم، عمل، نسب وغیرہ سے رب راضی نہ تھا کیونکہ ان کا کنکشن حضور سے نہ تھا۔ لہٰذا ان کی یہ تمام چیزیں لاشئی ہوئیں اور فرمایا گیا: لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ۔ آنکھ والے ابوجہل وغیرہ کفار نے حضور کو دیکھا مگر صحابی نہ بنے۔ حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم وغیرہ نابینا حضرات نے حضور کو ظاہری آنکھوں سے نہ دیکھا مگر صحابی بن گئے کہ انہوں نے دیکھنے کا منشاء پورا نہ کیا اور ان حضرات نے دیکھنے کا مقصد پورا کر دیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰی

تحقیق وہ لوگ جو ایمان دار بنے اور وہ جو یہودی ہوئے اور دین سے نکل جانے والے اور عیسائی

بے شک وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اس طرح یہودی اور ستارہ پرست اور نصرانی

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ

جو ایمان لائے اللہ پر اور آخر دن پر اور کام کئے اچھے بس نہیں کوئی ڈر

ان میں جو کوئی سچے دل سے اللہ قیامت پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے تو ان پر نہ کچھ

عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾

ان پر اور نہ وہ لوگ غمگین ہوں گے

اندیشہ ہے اور نہ کچھ غم

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں فرمایا گیا تھا کہ اہل کتاب کسی دین معتبر پر نہیں اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ حالت صرف اہل کتاب کی نہیں ہے بلکہ ہر کافر کی ہے خواہ اہل کتاب ہو یا صابی یا منافقین گویا تخصیص کے بعد حکم کی تعمیم کی گئی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں ارشاد ہوا تھا کہ اہل کتاب توریت و انجیل قائم کریں تو سب کچھ ہیں اب اس آیت کریمہ میں توریت و انجیل قائم کرنے کے معنی بیان ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور آخرت دن پر ایمان لے آویں گویا پچھلی آیت میں اجمال تھا اس آیت میں اس اجمال کی تفصیل ہے تاکہ اہل کتاب یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم توریت و انجیل قائم کرتے ہیں۔ **تیسرا تعلق:** گزشتہ پچھلی

عَمْرٌ و قائمٌ مگر تفسیر روح المعانی نے اسے جائز مانا، دلیل اس شعر سے دی

فَمَنْ یَکُ اَمْسٰی بِالْمَدِیْنَۃِ رِحْلَہٗ فَاِنِّیْ وَقِیَارٌ بِھَا لَغَرِیْبٌ!

اس شعر میں لغریب خبر اِنَّ ہے نہ کہ خبر مبتدا کیونکہ مبتدا کی خبر پر لام تاکید نہیں آتا اور نہ یہ اِنَّ و رقِیَارٌ مبتدا دونوں کی خبر ہے ورنہ غریبان ہوتا لہٰذا لغریبٌ خبر اِنَّ ہے اور قیارٌ معطوف ہے۔ ی متکلم پر خبر غریب ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ اگر اسم ان کا اعراب لفظی نہ ہو بلکہ تقدیری یا محلی ہو تب اس کے اسم پر دوسرا اسم محلاً معطوف ہو سکتا ہے۔ جیسے اِنَّ ھٰذَا وَ زَیْدٌ قَائِمٌ یا اِنَّ مُوْسٰی وَبَکْرٌ قَاعِدٌ یہ تحقیق خیال میں رہے۔ بہت ہی نفیس ہے اس کی اور بہت سی وجوہ تفسیر کبیر و معانی میں دیکھو وَالنَّصٰرٰی یہ کلمہ یا الَّذِیْنَ پر معطوف ہے یا الصّٰبِئُوْنَ پر اگر الصّٰبِئُوْنَ اسم اِنَّ ہو اور ہو سکتا ہے کہ النَّصٰرٰی میں وہ ہی تحقیق ہو جو ابھی الصّٰبِئُوْنَ میں کی گئی۔ غرضکہ اس عبارت میں چار گروہوں کا ذکر ہے منافقین کلمہ گو یعنی قومی مسلمان، یہودی، صابی اور عیسائی ان چاروں فرقوں کے متعلق ارشاد ہوا۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یہ عبارت مبتدا ہے اور فَلَا خَوْفٌ الخ اس کی خبر پھر یہ جملہ اسمیہ اِنَّ کی خبر ہے مَنْ سے مراد ان چاروں جماعتوں کے افراد ہیں۔ اٰمَنَ سے مراد ہے ایمان شرعی اس کے بعد مِنْھُمْ پوشیدہ ہے ایمان باللہ میں حضرات انبیاء کرام پر ایمان لانا داخل ہے کیونکہ ایمان باللہ ہوتا ہی وہ ہے جو نبی کی معرفت سے حاصل ہو۔ خدا تعالیٰ کو عقل یا کسی اور ذریعہ سے مان لینا توحید تو ہے مگر ایمان نہیں۔ چنانچہ شیطان موحد ہے مومن نہیں اللہ کو جاننا اللہ کو ماننا نجات کے لئے کافی نہیں، اللہ پر ایمان لانا نجات کا ذریعہ ہے۔ جس نبی کا زمانہ ہو اس کی معرفت سے اللہ کو قیامت وغیرہ کو ماننا ایمان ہے۔ جن انبیاء کرام کی نبوتیں منسوخ ہو گئیں ان کی معرفت سے خدا کو ماننا بھی ایمان نہیں اسی لئے عیسائی، یہودی وغیرہ مومن نہیں کہ وہ اللہ کو بذریعہ عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام خدا مانتے ہیں حضور کے ذریعہ خدا کو نہیں مانتے۔ یہ ہی حال عبادات کا ہے کہ حضور کے ذریعہ وہ کام عبادت ہیں حضور کے بغیر محض لغو۔ حضور سے منہ موڑ کر نماز پڑھنا نماز نہیں اوٹھک بیٹھک ہے روزہ رکھنا روزہ نہیں فاقہ ہے، جہاد کرنا جہاد نہیں بلکہ فساد ہے، حج کرنا حج نہیں بلکہ محض سیر و تفریح ہے۔ حضور کے ذریعہ یہ سب کام عبادات ہیں۔ دین حضور پر دائر ہے۔ ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں کہ۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

یوم آخر سے مراد قیامت ہے اس میں حساب و کتاب جنت و دوزخ کے فرشتے وغیرہ سب داخل ہیں۔ کیونکہ قیامت میں یہ سب کچھ ہوگا اور بذریعہ فرشتوں کے ہوگا لہٰذا ان دو کلموں میں سارے ایمانیات آ گئے یہ عبارت بہت جامع ہے اور ہو سکتا ہے کہ ان دو کلمات میں ایمانیات کے دونوں کناروں کا ذکر ہو باقی چیزیں ان کے درمیان میں آ جاویں یعنی اللہ سے لے کر قیامت تک کی ہر چیز پر ایمان لائیں۔ اگر چہ یہود و نصاریٰ اللہ تعالیٰ اور قیامت وغیرہ پر ایمان رکھتے تھے مگر چونکہ حضور انور کے انکاری تھے اس لئے ان کو غیر مومن قرار دیا گیا اور فرمایا گیا کہ اب ان محبوب کی معرفت ایمان لائیں اگر چہ منافقین زبان سے ایمان کے مدعی تھے مگر وہ ایمان شرعاً معتبر نہیں لہٰذا ان سے بھی فرمایا گیا کہ دل سے ایمان لائیں وَ عَمِلَ صَالِحًا۔ اس کی تفسیر

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** مسلمان دو قسم کے ہیں۔ ایک دینی مومن دوسرے صرف قومی مومن یہ تقسیم اول سے چلی آ رہی ہے۔ حضرات صحابہ کرام دینی مومن تھے، منافقین قومی مومن جن کا شمار مسلمان قوم سے تھا مگر حقیقۃً تھے کافر۔ یہ فائدہ اٰمَنُوْا الخ سے حاصل ہوا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میری امت تہتر فرقے ہو جاوے گی ایک کے سوا سب دوزخی ان سب کو امتی فرمانا قومی لحاظ سے ہے۔ **دوسرا فائدہ:** یہودی نصرانی اگرچہ توحید اور تمام ایمانیات کو مانیں مگر مومن نہیں جب تک کہ حضور ﷺ پر ایمان نہ لائیں۔ یہ فائدہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ الخ سے حاصل ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** حضور ﷺ کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ اور قیامت وغیرہ کو ماننا ایمان نہیں صرف توحید ہے اور نری توحید دوزخ کا راستہ ہے ایمان جنت کا ذریعہ۔ یہ فائدہ بھی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ الخ سے حاصل ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** مومن خواہ کسی درجہ کا ہو نیک اعمال ضرور کرے کوئی شخص اعمال وتقویٰ سے بے نیاز نہیں۔ یہ فائدہ عَمِلَ صَالِحًا سے حاصل ہوا جسمانی زندگی کے لئے پانی غذا ضروری ہیں ایمانی وروحانی زندگی کے لئے اعمال بدنی و مالی وغیرہ ضروری ہیں۔ **پانچواں فائدہ:** ہر متقی صالح مسلمان ولی اللہ ہے ولایت کے بہت درجے ہیں ایک درجہ یہ بھی ہے۔ یہ فائدہ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ الخ سے حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات اولیاء اللہ کے لئے بھی یہی فرمایا لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ الخ۔ **چھٹا فائدہ:** اللہ کا خوف دنیا سے بے خوفی کا ذریعہ ہے۔ یہ فائدہ بھی لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ الخ سے حاصل ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** اللہ کی بڑی نعمت خوف وغم سے آزادی ہے۔ بے کھٹکے کی زندگی بڑے نصیب ور کو میسر ہوتی ہے۔ یہ فائدہ بھی لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ الخ سے حاصل ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فرمانے کے بعد پھر فرمانا مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ کیونکہ درست ہوا جو پہلے ہی مومن ہو چکا ہو اس کا پھر مسلمان ہونا کیا معنی؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں قومی مومن یعنی منافقین مراد ہیں۔ جنہیں اسلامی فرقہ میں داخل مانا جاتا تھا اس لئے ان پر جہاد وغیرہ نہ ہوتا تھا مگر وہ مذہبی مومن نہ تھے دل میں ان کے کفر تھا۔ اس لئے ان کی نماز جنازہ نہ پڑھی جاتی تھی اور مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ میں دینی وشرعی مومن بن جانا مراد ہے یعنی دل سے مسلمان ہو جانا اور ہو سکتا ہے کہ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں دینی مومن ہی مراد ہوں اور مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ سے مراد ہو ایمان پر خاتمہ ہو جانا کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت کریمہ میں صرف چار جماعتوں کا ہی ذکر کیوں ہوا۔ منافقین، یہود، عیسائی اور صابئی جو بھی ایمان وعمل اختیار کرے وہ جنتی ہے خواہ ان چار جماعتوں میں سے ہو یا کسی اور جماعت سے۔ **جواب:** اس لئے کہ ملک عرب میں خصوصاً مدینہ منورہ میں ان چار جماعتوں کا ہی چرچا تھا نیز یہ لوگ خصوصاً صابئی اور یہود بڑے بھاری مجرم تھے۔ گزشتہ زمانہ میں بہت جرم کر چکے تھے اس لئے خصوصیت سے ان کو دعوت ایمان دی گئی تاکہ دوسروں کو امید بندھ جاوے کہ جب ان ایسے مجرموں کی بھی معافی بلکہ قبولیت کی امید ہے تو ہم بھی اس کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔

دیکھیں آن کی آن میں ان کی کایا پلٹ جاوے گی۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ مومن کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے یہ خوف دوسرے تمام خوفوں کو دل سے نکال دیتا ہے اسے اپنے گناہوں کا غم رہتا ہے یہ غم تمام غموں کو دفع کر دیتا ہے جیسے پانی پیاس کو اور غذا بھوک کو یا نور ظلمت کو۔ مولانا فرماتے ہیں

ھرکہ ترسد مرورا ایمن کنند ۔۔۔ ھردل ترسندہ را ساکن کنند!

لاتخافوا ہست منزل خائفاں ۔۔۔ ہست درخور از برائے خائف آں

آنکہ خوفش نیست چوں گوئی مترس ۔۔۔ درس نہ دہی نیست او محتاج درس

حضرت ابراہیم خواص قدس سرہ فرماتے ہیں کہ بیمار دل میں ہر طرح کا خوف رہتا ہے۔ دل کی پانچ دوائیں ہیں جن سے بیماری دور ہوتی ہے فکر و تدبر کے ساتھ تلاوت قرآن، پیٹ کو کچھ خالی رکھنا رات کو تہجد کے لئے جاگنا، صبح کو توبہ استغفار زاری کرنا، صالحین کی صحبت، شافی تو اللہ تعالیٰ ہے مگر ذریعہ شفاء ذکر اللہ ہے جس سے دل بے چین کو چین، قلب بے قرار کو قرار نصیب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قال کو حال بنادے (از روح البیان مع زیادۃ)۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ
البتہ تحقیق لیا ہم نے وعدہ اولاد یعقوب علیہ السلام سے اور بھیجے ہم نے طرف ان کے بہت
بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف رسول
رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا
رسول جب کبھی لائے ان کے پاس کوئی رسول وہ چیز جو نہیں پسند کرتے دل ان کے تو ایک گروہ
بھیجے جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول وہ بات لے کر آیا جو ان کے نفس کی خواہش نہ تھی ایک گروہ کو
كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ
کو جھٹلا دیا انہوں نے اور ایک گروہ کو قتل کرتے ہیں اور گمان کیا انہوں نے یہ کہ نہ ہوگا کوئی فتنہ
جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے ہیں اور اس گمان میں ہیں کہ کوئی سزا نہ ہوگی
فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا
پس اندھے ہو گئے اور بہرے ہو گئے پھر توبہ ڈالی اللہ نے اوپر ان کے پھر اندھے ہو گئے اور بہرے
تو اندھے اور بہرے ہو گئے پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی پھر ان میں بہتیرے اندھے اور
كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

مراد روز میثاق کا عہد ہو جو عالم ارواح میں بنی اسرائیل سے خصوصی طور پر لیا گیا جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الخ (آل عمران: ۱۸۷) اس دن تین میثاق و عہد لئے گئے تھے ایک عام عہد، رب کی ربوبیت کا دوسرا خاص انبیاء کرام سے حضور پر ایمان لانے ان کی مدد کرنے کا تیسرا اہل کتاب سے کتب الٰہیہ کی حفاظت و تبلیغ کرنے کا **خیال رہے** کہ رب تعالیٰ اہل کتاب کو یا تو ان کے نسبی نام سے پکارتا ہے یا بنی اسرائیل یا یہود فرما کر یا کتاب کی طرف نسبتی نام سے اہل الکتاب مگر ہم مسلمانوں کو ہمیشہ نسبتی نام سے پکارتا ہے اور ہماری نسبت کتاب کی طرف نہیں بلکہ صاحب کتاب یعنی حضور ﷺ کی طرف فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ ایمان میں نسبت حضور کی طرف ہے وَ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ رُسُلًا یہ عبارت پہلے مضمون کی تاکید کے لئے ہے کہ ان میں حضرات انبیاء کرام کا بھیجنا اس عہد کو یاد دلانے اس کی توثیق کے لئے تھا۔ **خیال رہے** کہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان قریباً دو ہزار سال کا فاصلہ ہے اور اس دوران میں ایک ہزار پیغمبر تشریف لائے جو سب بنی اسرائیل سے تھے جن میں سے بعض کے نام قرآن مجید میں ہیں جیسے حضرت داؤد، سلیمان، زکریا، یحییٰ علیہم السلام بعض کے نام حدیث شریف میں آئے جیسے شعیاء، ارمیاء، یوشع علیہم السلام باقی کے نام معلوم نہ ہو سکے رسل سے مراد حضرات انبیاء کرام ہیں۔ خواہ صرف نبی ہوں یا رسول بھی یا مرسل بھی۔ حضرات انبیاء کرام ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں۔ رسول تین سو تیرہ اور مرسلین چار۔ نبی عام ہے، رسول خاص مرسل اس سے بھی خاص جیسے جسم نامی پھر حیوان پھر انسان۔ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ اب تک تو رب تعالیٰ کے کرم و فضل کا ذکر تھا یعنی بنی اسرائیل سے عہد لینا اور اس کے پاس حضرات انبیاء کرام کو بھیجتے رہنا۔ اب ان کی بدعملیوں کا ذکر ہے كُلَّمَا کو بعض مفسرین نے ظرفیہ مانا ہے، بعض نے شرطیہ، ظاہر یہ ہے کہ شرطیہ ہے هُمْ کا مرجع وہ ہی بنی اسرائیل ہیں جن کا ذکر ہو رہا ہے۔ رسول سے مراد جنس رسول ہیں خواہ ایک ہوں یا زیادہ کیونکہ بنی اسرائیل میں بعض وقت بہت سے نبی بہ یک وقت آئے۔ لہٰذا آیت واضح ہے بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ۔ اس عبارت میں ب تعدیہ کی ہے اس لئے جاء کے معنی ہو گئے لائے اور بِمَا لَا تَهْوٰۤى اسی کا مفعول۔ بِمَا سے مراد حق باتیں ہیں خواہ حق عقیدے ہوں یا نیک اعمال پھر خواہ توریت شریف کے ہی احکام ہوں جن کی تجدید کے لئے وہ حضرات آئے یا ان کے علاوہ اور احکام جو ان نبیوں پر وحی ہوئے لہٰذا بِمَا میں بہت وسعت ہے۔ تَهْوٰۤى بنا ہے۔ هویٰ سے بمعنی گرنا گرانا، بری خواہشات کو ھوی کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کو نیچے گراتی ہیں۔ یہاں یہ ہی معنی مراد ہیں۔ یعنی خواہش اور دل کی پسندیدگی۔ انفس جمع ہے نفس کی۔ نفس کے بہت معنی ہیں ذات، نفس امارہ، دل یہاں یا بمعنی نفس امارہ ہے یا بمعنی دل جب کبھی ان کے پاس ایک یا چند نبی وہ عقائد و نیک اعمال لے کر اپنے رب کی طرف سے آتے جو ان کی نفسانی خواہشات کے خلاف ہوتے فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ یہ عبارت كُلَّمَا کی جزا نہیں ہے بلکہ جزاء کا نتیجہ ہے اس کی جزا تو پوشیدہ ہے عادوہ یا عصوا ہ پہلا فَرِيْقًا مفعول ہے كَذَّبُوْا کا اور دوسرا فَرِيْقًا مفعول ہے يَّقْتُلُوْنَ کا ان لوگوں نے جھٹلایا تو سارے نبیوں کو مگر بعض کو صرف جھٹلایا عمل سے عقیدے سے اور قول سے اور بعض کو جھٹلایا بھی اور انہیں قتل بھی کر دیا۔ **خیال رہے**

بہت پھلے پھولے اور پہلے سے بھی زیادہ اور اچھے حال میں ہو گئے۔ **خیال رھے** کہ ان قاتلین انبیاء کو توبہ کی توفیق نہ ملی بلکہ ان کی اولاد در اولاد کو کیونکہ جب توہین نبی کرنے والے کو توفیق بمشکل ملتی ہے تو قاتلین انبیاء کو توبہ کی توفیق کیسی **ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ**۔ یہاں بھی ثم عطف تراخی کے لئے ہے کیونکہ یہ دوسرا جرم توبہ کے بہت عرصہ کے بعد ہوا چنانچہ یہ لوگ بہت عرصہ تک بیت المقدس میں خوب شاد آباد رہے پھر ان میں سرکشی پھیلی تو حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کو شہید کر ڈالا اور بہت سے انبیاء کرام کو جھٹلایا حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی (تفسیر صاوی و روح المعانی وغیرہ) **خیال رھے** کہ **عَمُوْا** اور **صَمُّوْا** کا فاعل **كَثِیْرٌ** نہیں ہے ورنہ یہ دونوں صیغے واحد آتے جمع نہ آتے بلکہ ان کا فاعل ھم ضمیر ہے اور کثیر بدل البعض لہٰذا آیت بے غبار ہے۔ چونکہ اس بار سارے یہودی بے دین و مجرم نہ ہوئے تھے بلکہ ان میں سے اکثر اس لئے یہاں فرمایا گیا۔ **كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ** یہ آیت کریمہ اس آیت کی تفسیر ہے جو سورۂ بنی اسرائیل (الاسراء) میں ہے **لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ** (اسراء: ۴) اس آیت نے ان کے دو بار فساد کی تفصیل کر دی اس تفسیر سے یہ آیت بالکل واضح ہو گئی۔ اس کی چند اور تفسیریں ہیں مگر ضعیف۔ **وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ**۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہاں **یَعْمَلُوْنَ** بمعنی ماضی ہے اور اس سے مراد بنی اسرائیل کے یہ ہی مذکورہ اعمال ہیں ان واقعات کو ظاہر فرمانے کے لئے صیغہ حال سے تعبیر فرمایا گیا۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ حال استمراری ہے یعنی اول سے لے کر اب تک یہ لوگ جو کچھ کرتے رہے اور کر رہے ہیں ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں لہٰذا اس میں اسرائیلیوں کی موجودہ بدکرداریاں بھی داخل ہیں جو وہ حضور ﷺ کے زمانہ پاک میں کر رہے ہیں جیسے حضور کو زہر کھلانا، آپ پر پتھر لڑکانا۔

خلاصۂ تفسیر

یہود کا دستور تھا کہ ہمیشہ اپنے فضائل و کمالات کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے تھے کہ ہم اولا انبیاء، ہم توریت کے عالم اہم مقدس لوگ ہم ویسے اور حضور ﷺ کے شان گھٹانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کا بدلہ لیتے ہوئے ان کے وہ چھپے ہوئے حالات بیان کیے جسے ان لوگوں نے دنیا سے چھپا دیا تھا جس سے وہ ایسے بدنام ہوئے کہ یہ بدنامی کا داغ ان کے دھوئے نہیں دھل سکتا۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ اے محبوب! ﷺ آپ ان یہود کی ایذا رسانیوں اور کفر پر ضد کرنے سے ملول نہ ہوں یہ تو بڑے پرانے پاپی ہیں۔ چنانچہ ہم نے ان سے توریت شریف میں نیز موسیٰ علیہ السلام کی معرفت ایمان تقویٰ احترام انبیاء اطاعت رسول کا بہت پختہ عہد لیا پھر وہ عہد یاد دلانے کے لئے ان میں ایک دو نہیں، متفرق زمانوں میں صدہا رسول بھیجے مگر ان کا وطیرہ یہ رہا کہ جب کبھی ان کے پاس رسول تشریف لاتے اور انہیں وہ احکام الٰہیہ سناتے پہنچاتے جو ان کی خواہشات نفسانیہ کے خلاف ہوتے تو یہ لوگ بجائے اطاعت کرنے کے ان حضرات میں سے کسی جماعت کو تو صرف جھٹلاتے اور کسی جماعت کو جھٹلا کر قتل کر ڈالتے ہم حلیم ہیں، کریم ہیں عرصہ تک ان کا یہ ہی طریقہ رہا ہماری ڈھیل سے یہ لوگ بالکل ہی غافل ہو گئے اور سمجھ گئے انبیاء کو جھٹلانا یا قتل کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس پر کوئی عذاب و سزا نہیں آتی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل اندھے بہرے ہو گئے گناہوں پر دلیر پھر ہم نے ان پر

سخت عذاب آنے والا ہے۔ یہ فائدہ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ الخ سے حاصل ہوا

تو مشو مغرور برحلم خدا دیر گیرد سخت گیرد مرترا

چھٹا فائدہ: مومن کی علامت یہ ہے کہ وہ چھوٹے گناہ کو بہت بڑا سمجھتا ہے اور منافق کی علامت یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے گناہ کو معمولی تصور کرتا ہے۔ یہ فائدہ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ سے حاصل ہوا۔ کوئی گناہ معمولی سمجھ کر مت کرو کبھی چھوٹی چنگاری سے گھر جل جاتا ہے اور کوئی نیکی معمولی سمجھ کر چھوڑ مت دو کہ کبھی ایک گھونٹ پانی جان بچا لیتا ہے یہ آیات مسلمانوں کے لئے درس عبرت ہے۔ **ساتواں فائدہ:** توبہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہے جس کی وجہ سے بڑے سے بڑے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں حتی کہ کفر بھی۔ یہ فائدہ ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ سے حاصل ہوا اس لئے بڑے سے بڑا مجرم بھی مایوس نہ ہو توبہ کرے مگر خیال رہے کہ ہر جرم کی توبہ علیحدہ ہے کفر سے توبہ ایمان قبول کر لینا ہے۔ حقوق العباد سے توبہ ان کا ادا کر دینا پھر معافی مانگنا ہے بعض گناہ وہ ہیں جن کی نحوست ایسی ہوتی ہے کہ مجرم کو توبہ نصیب نہیں ہوتی توبہ کی توفیق نہیں ملتی جیسے نبی کی توہین۔ دیکھو ابلیس کو توبہ کی توفیق نہ ملی ہے نہ ملے کیونکہ وہ توہین پیغمبر کا مجرم ہے۔ یوں ہی قتل نبی ایسا جرم ہے کہ اس کے مجرم کو توبہ نصیب نہیں ہوتی۔ اس لئے یہاں ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ارشاد ہوا تاکہ معلوم ہو کہ قاتلین پیغمبر نے توبہ نہ کی بلکہ عرصہ کے بعد ان کی اولاد اور ہم قوم نے کی۔ **آٹھواں فائدہ:** جس مصیبت سے توبہ کی توفیق مل جاوے وہ مصیبت اللہ کی رحمت ہے اور جس راحت سے انسان رب سے غافل ہو جاوے وہ دولت و راحت اللہ کا عذاب ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل پر جب بخت نصر مسلط ہوا تو انہوں نے توبہ کی کہ ارشاد ہوا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ اور اس کی جزا یعنی فَرِيْقًا كَذَّبُوْا الخ میں مناسبت نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہود کے پاس آئے تو ایک رسول اور وہ لوگ ایک فریق کا انکار ایک فریق کو قتل کریں کیا ایک رسول کے بھی دو فریق ہو سکتے ہیں، فریق تو پوری جماعت ہوتی ہے ایک رسول دو جماعتیں کیسے بن گئے؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ یہاں رسول واحد نہیں۔ بلکہ جنس ہے۔ جس میں ایک اور زیادہ سب شامل ہیں اور كُلَّمَا جَآءَهُمْ کی جزا فَرِيْقًا كَذَّبُوْا الخ نہیں بلکہ اس کی جزا پوشیدہ ہے یہ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا الخ اس جزا کا نتیجہ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جب کبھی ان کے پاس رسول آئے ایک یا زیادہ تو انہوں نے ان کی نافرمانی کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اطاعت کرنے کی بجائے ان میں سے بعض کو قتل کیا بعض کا انکار لہٰذا آیت کا مطلب ظاہر ہے۔

دوسرا اعتراض: حضرات انبیاء کرام کا جھٹلانا اور ان کا قتل نزول قرآن پہلے ہو چکا تھا پھر جھٹلانے کو ماضی اور قتل کو مضارع سے کیوں بیان فرمایا کہ وہاں كَذَّبُوْا کہا اور یہاں يَقْتُلُوْنَ۔ **جواب:** اس لئے کہ ان کا جھٹلانا تو ایک بار ہی ہو گیا۔ ایک نبی کا جھٹلانا تمام کا جھٹلانا ہے تمام مکذبین ایک میں شمار ہیں مگر ہر نبی کا قتل علیحدہ جرم ہے تو گویا قتل بارہا واقع ہوا تکذیب ایک بار حتی کہ انہوں نے حضور ﷺ کے قتل کی دو بار انتہائی کوشش کی کہ خیبر میں حضور کو زہر دیا مدینہ منورہ میں اوپر

تفسیر صوفیانہ

جسمانی بیماریوں کا اثر جسم پر پڑتا ہے کہ اس سے جسم کمزور ہو جاتا ہے مگر نفسانی بیماریوں کا اثر دل اور روح پر پڑتا ہے کہ اس سے روحانی قوتیں کمزور یا ختم ہو جاتی ہیں۔ آنکھ کا موتیا آنکھ کو اندھا کر دیتا ہے مگر کفر و بدعملی کا موتیا دل کو اندھا بنا دیتا ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے حضرات انبیاء کے قتل کا نتیجہ بیان کیا عَمُوْا وَ صَمُّوْا اگر انسان کی دستگیری رحمت الٰہی نہ کرے تو وہ مفید چیزوں سے نقصان ہی اٹھاتا ہے۔ حضرات انبیاء کرام ایمان، عرفان، رحمت رحمان دینے آتے ہیں مگر بدبخت انسان ان کی تکذیب کر کے انہیں ایذائیں دے کر طغیان، کفران، عصیان ہی کماتا ہے۔ فضیل ابن عیاض فرماتے ہیں کہ جو راہ آخرت چلنا چاہے وہ سفید، سرخ، کالی، ہری موت اختیار کرے۔ سفید موت بھوک ہے۔ کالی موت لوگوں کے طعنے ہیں، سرخ موت شیطان و نفس کی مخالفت ہے، ہری موت دنیاوی مصیبتیں اور بیماریاں ہیں جو اس راستہ سے بھکا مارا گیا۔ اندھا بہرا سفر کیسے کرے۔ مولانا فرماتے ہیں

کور را ھرگام باشد ترس چاہ — باھزاراں ترس می آید براہ!!
مرد بینا دیدہ عرض راہ را — پس بداند او مغاک و چاہ را!
ماہیاں را بحر نگذارد بروں — خاکیاں را بحر نگذارد دروں!
اصل ماہی آب وحیواں از گل است — حیلہ و تدبیر آنجا باطل است!
قفل است و کشایندہ خدا! — دست در تسلیم زن اندر رضا!

یعنی اندھے کو ہر قدم پر کنوئیں کا خوف ہوتا ہے وہ ہزار ہا خوفوں کے درمیان سے راہ طے کرتا ہے۔ آنکھ والا غار، خار، کنوئیں وغیرہ سے بے خطر چلتا ہے۔ مومن انکھیارا ہے کافر اندھا مخلوق دو قسم کی ہے۔ آبی و خاکی۔ آبی مخلوق کی سرشت میں پانی کا غلبہ ہے خاکی مخلوق کی سرشت میں خاک غالب ہے۔ دریا آبی مخلوق کو باہر نہیں چھوڑتا، خاکی مخلوق کو اندر نہیں چھوڑتا۔ یہاں تدبیر کام نہیں آتی۔ نبوت کا سمندر مومن کو باہر نہیں رہنے دیتا کافر کو اندر نہیں بسا تا مومن کا نبی کے بغیر گزارہ نہیں کافر کا نبی کے پاس گزارہ نہیں۔ اے گناہ گار مسلمان! اپنے زنگ آلود دل کو رب کے حوالہ کر وہ ہی اس کا کھولنے والا ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ عالم شہادت دیکھنے کے لئے ظاہری اعضاء دیئے گئے ہیں، عالم غیب محسوس کرنے کے لئے دل عطا ہوا کسی کی شکل وشباہت آواز وغیرہ شہادت ہے یہ آنکھ، کان سے محسوس ہوتی ہے مگر اس کی روح یوں ہی اس کی الفت و عداوت رشتہ داری وغیرہ عالم غیب ہے جو دل سے معلوم ہوتی ہیں پھر جیسے آنکھ کے لئے صد ہا بیماریاں ہیں ایسے ہی دل کے لئے صد ہا بیماریاں ہیں۔ جیسے آنکھوں کے بہت علاج ہیں یوں ہی بیمار دل کی بہت دوائیں ہیں دل کا سرمہ بھی ہے جس سے دل کی نظر تیز ہوتی ہے۔ آنکھ کا سرمہ طور سے آتا ہے۔ دل کا سرمہ حضرات اولیاء اللہ کے آستانوں سے۔ عداوت نبی دل کو اندھا کر دیتی ہے اس لئے فرمایا گیا ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا کہ وہ یہود عداوت نبی سے دل کے اندھے بہرے ہو گئے۔ مولانا فرماتے ہیں

سرمہ کن درچشم خاک اولیاء — تا ببینی زابتداء تا انتہا!

خلاف تھی اب ارشاد ہو رہا ہے کہ نفس انسانی ایسا گمراہ کن ہے کہ انسان کو گمراہی کفر کے گہرے کنوئیں میں گرا دیتا ہے۔ چنانچہ اب عیسائیوں کے نفسانی عقیدوں کا ذکر ہے گویا نفس کی اتباع کرنے والوں کا حال بتا کر نفس کا حال بتایا جا رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کے بہرے اندھے ہونے کا ذکر تھا اب اس کا ثبوت دیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ اپنے اندھے پن سے ایسے عقیدے اختیار کر چکے ہیں جو عقل و دانش کے بالکل خلاف ہیں یعنی حضرت مسیح کا اللہ ہونا گویا پچھلی آیت میں ان کے اندھے ہونے کا ذکر تھا اب اس کا ثبوت ہے۔

شان نزول

ایک بار نجران کے عیسائیوں کے سردار سید عاقب اور ان کے متبعین نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود خدا ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود مریم کے پیٹ سے جنا گیا اور رب تعالیٰ نے حضرت مسیح میں حلول فرما لیا ان کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (روح البیان)۔

تفسیر

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا ، عیسائیوں کے بہت فرقے ہیں اور ان کے مختلف عقیدے جن میں سے فرقے یعقوبیہ اور ملکانیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مریم نے الٰہ جنا وہ ہی ذات جو اللہ ہے وہ ہی بشکل مسیح دنیا میں آ گئی۔ اس آیت میں ان کی تردید ہے کچھ فرقوں کا عقیدہ اس کے خلاف ہے ان کا ذکر اگلی آیت میں ہے چونکہ یہ عقیدہ نرا کفر ہے اور جہنمی ہونے کا راستہ مگر انہوں نے اس عقیدے کو عین ایمان سمجھا اور جنتی ہونے کا راستہ تصور کیا اس لئے اس آیت کریمہ کو لام اور قد دو تاکیدوں سے مؤکد فرما کر شروع کیا گیا۔ **خیال رهے** کہ ہر شرک کفر ہے مگر ہر کفر شرک نہیں۔ کفر بہت عام ہے، شرک خاص، کسی عقیدہ اسلامیہ کا انکار کفر ہے مگر کسی بندہ کو خدا کے برابر جاننا یا اس طرح کہ بندہ کو اونچا کر کے رب کے برابر سمجھا جاوے۔ یا رب تعالیٰ کی شان گھٹا کر اسے بندہ کے برابر کر دیا جاوے یہ شرک ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ عیسائی پکے کافر ہیں کہ رب تعالیٰ کی ذات و صفات کے منکر ہیں۔ مگر مشرک نہیں کہ انہوں نے چند خدا نہ مانے۔ خدا ایک ہی مانا جو عیسیٰ علیہ السلام کی شکل میں آ گیا نعوذ باللہ اور ہو سکتا ہے کہ ہر کفر بھی ایک معنی سے شرک ہے، اس لحاظ سے یہ مشرک بھی ہیں۔ انشاء اللہ اس کی بحث سوال و جواب میں آوے گی۔ الَّذِيْنَ سے مراد یعقوبیہ، ملکانیہ فرقے کے عیسائی ہیں۔ قَالُوْٓا سے مراد دل کا قول یعنی عقیدہ باطلہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ زبانی قول مراد ہو جو دل سے یہ عقیدہ رکھے مگر زبان سے خاموش رہے وہ حقیقۃً کافر ہے اور جو زبان سے یہ بکواس کرے دل سے اس کا قائل نہ ہو وہ بھی شرعاً کافر ہے کہ کفر بکنا بھی کفر ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ قَالُوْٓا کو عام مانا جاوے زبانی قول ہو یا جنانی قول یعنی عقیدہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ یہ عبارت قَالُوْٓا کا مقولہ ہے هُوَ حصر کے لئے ہے۔ حصر کی وجہ سے اور یہ کہ یہ حصر دو طرفہ ہے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہ بے وقوف کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ تو خدا کے بیٹے ہیں نہ تیسرے خدا جیسا کہ ان کے دوسرے فرقے کہتے ہیں بلکہ وہ عین خدا ہیں۔ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہیں کہ اللہ مسیح ہی ہیں اور حماقت دیکھو کہ اس حصر کے باوجود وہ لوگ حضرت مسیح کو ابن مریم بھی کہتے ہیں۔ یعنی جناب مسیح ابن مریم ہونے کے باوجود عین اللہ ہیں خود ان کے کلام ہی میں ان کی تردید ہے جو کسی کا بیٹا ہو وہ خدا کیسا مگر وہ یہ نہ سمجھ سکے وَقَالَ الْمَسِيْحُ

ارشاد ہوا اور ہر فرد کی نفی کرنے کے لئے مِنْ استغراقیہ ارشاد ہوا یا یہ مطلب ہے کہ مدد بہت قسم کی ہوتی ہے اور مددگار بہت طرح کے۔ مال سے مددگار، جانی مددگار، قوت و طاقت سے مددگار، شہید و جماعت سے مددگار ان تمام قسم کے مددگاروں کی نفی کے لئے مِنْ اَنْصَارٍ فرمایا گیا۔ **خیال رھے** کہ اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ سے لے کر انصار تک یا تو رب تعالیٰ کا اپنا کلام ہے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہی کلام ہے جسے رب نے نقل فرمایا تھا یعنی ان جناب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میرے اور اپنے رب کی عبادت کرو اور یہ بھی فرمایا تھا کہ مشرک کی یہ تین سزائیں ہیں۔ ظاہر یہ ہی ہے کہ یہ بھی حضرت مسیح کا فرمان عالی ہے۔

خلاصہ تفسیر

عیسائیوں کی الوہیت مسیح کے متعلق مختلف عقیدے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں بعض کہتے ہیں کہ وہ تیسرے خدا ہیں، بعض کہتے ہیں کہ وہ خود خدا ہیں، رب تعالیٰ نے ان کی شکل میں دنیا میں ظہور فرمایا اس آیت کریمہ میں اس تیسرے فرقے کی نہایت شاندار تردید فرمائی گئی کہ ارشاد ہوا وہ عیسائی نرے کافر و مشرک ہیں جو کہتے ہیں کہ جناب مسیح ابن مریم ہی خدا ہیں اور خدا مسیح ابن مریم ہی ہے۔ اول تو ان جناب کا ابن مریم ہونا ہی ان کے اس عقیدے کی تردید کے لئے کافی ہے کہ جو کسی کا بیٹا ہو وہ خدا کیسا جو کسی کے پیٹ میں سما جاوے، جنا جاوے وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خود حضرت مسیح کے ارشادات گرامی بھی ان کی تردید کر رہے ہیں انہوں نے اعلانیہ فرمایا تھا کہ اے اسرائیلیو! تم اس ذات کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے تمہارا بھی رب۔ اس فرمان مسیحی میں چند باتیں خیال میں رہیں ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام شریف عیسیٰ ہے یعنی شرافت والے لقب مسیح ہے یا مسح سے بنا ہے بمعنی چھونے والے یعنی چھو کر مردوں کو زندہ، بیماروں کو اچھا کرنے والے۔ دوسرے یہ کہ آپ چونکہ صرف بنی اسرائیل کے نبی ہیں اس لئے انہی کو خطاب فرمایا ورنہ اللہ کی عبادت ہر شخص پر لازم ہے یا بنی اسرائیل دوسری قوموں کے سردار مانے جاتے تھے ان کے درست ہو جانے سے دوسری قوموں کی درستی کی امید تھی اس لئے ان سے خطاب کیا۔ تیسرے یہ کہ آپ نے ربنا نہ فرمایا جس میں آپ اور بنی اسرائیل سب ہی آجاتے بلکہ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ فرمایا تو اس لئے کہ اللہ سب کا رب ہے نبی کا بھی غیر نبی کا بھی مگر نوعیت ربوبیت میں فرق ہے نبی کا رب اس طرح ہے کہ انہیں امت کا مربی، انہیں دینے والا بنایا۔ امت کا نبی اس طرح کہ انہیں لینے والا بنایا۔ جیسے وہ سورج و بادل کا بھی رب ہے جو دینے والے ہیں زمین کا بھی رب ہے جو سورج و بادل سے لینے والی ہے یا اس لئے کہ اللہ کی معرفت نبی کے ذریعہ سے ہو تو ایمان ہے، بغیر واسطہ نبی ہو تو عین بے دینی۔ نبی کا انکار کر کے خدا کو ماننا کفر ہے لہٰذا حضرات انبیاء نہ خدا ہیں نہ ہم جیسے بشر کہ اگر تم نے کسی کو خدا یا خدا کی طرح مانا تو وہ مشرک ہے اور مشرک کی تین سزائیں ہیں ایک یہ کہ وہ جنت سے دائمی محروم ہے دوسرے یہ کہ اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے جہاں اس نے ابدالاباد تک رہنا ہے تیسرے یہ کہ وہ ظالم ہے اور ظالموں کا مددگار قیامت میں کوئی نہیں تو وہ بے یار و مددگار ہوگا۔ ان جیسے ارشادات کے ہوتے ہوئے جو انہیں خدا مان لے وہ پورا ہی بے وقوف بھی ہے اور بڑا مشرک و ظالم بھی۔

اللہ کے ماسواء جو بھی ہے اس کا بندہ ہے۔ مسئلہ وحدت الوجود بالکل حق ہے مگر اسے وہ ہاتھ لگائے جو صوفیاء کی رمزوں کا واقف ہو بے سمجھے سوچے ہر چیز کو خدا کہہ دینا لاکھوں خدا مان لینا ہے۔ یہ مصرعہ عین کفر ہے

ہم تم ہیں خدا ہر در و دیوار خدا ہے

اور یہ شعر بالکل حق ہے

پناہ بلندی و پستی توئی ہمہ نیست اند آنچہ ہستی توئی

ساری مخلوق کو خدا ماننا کفر ہے اور ساری مخلوق کو فنا ماننا لاشئی ماننا اور کہنا کہ رب ہی رب ہے ایمان ہے۔ **گیارھواں فائدہ:** کفار کی جگہ دوزخ ہے کوئی کافر اعراف میں نہیں رہے گا اعراف کفار کی جگہ نہیں۔ یہ فائدہ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ سے حاصل ہوا۔ اعراف میں کون رکھے جائیں گے انشاء اللہ یہ سورۂ اعراف میں عرض کیا جاوے گا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ عیسائی حضرت مسیح کو ابن مریم بھی کہیں ان کی موت وسولی کے بھی قائل ہوں اور پھر انہیں خدا بھی کہیں خدا تعالیٰ کے لئے پیدائش، وفات ابن مریم ہونا، کیونکر ممکن مان سکتے ہیں۔ **جواب:** ان بیوقوفوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام بشر بھی ہیں خدا بھی آپ کی بشریت پر ابن مریم ہونا، پیدا ہونا، سولی پانا وارد ہوا نہ کہ آپ کی الوہیت پر۔ آپ کی بشریت میں الوہیت ایسے حلول کیے ہے جیسے پھول میں رنگ و بو یا آگ میں گرمی اللہ نے لباس انسانی پہن لیا تو وہ ابن مریم بھی ہو گیا اور اس پر وفات پر طاری ہوئی یعنی اس لباس پر نہ کہ ذات رب العالمین پر۔ یہ عقیدہ بھی کفر ہے کہ رب تعالیٰ سرایت وحلول سے پاک و منزہ ہے اسے کسی چیز میں حال یا کسی چیز کا محل ماننا کفر ہے۔

دوسرا اعتراض: یہ عقیدہ تو مسلمانوں کا بھی ہے کہ حضور ﷺ کو بشر بھی مانتے ہیں اور نور بھی اگر بشر نور ہو سکتا ہے تو الٰہ بھی ہو سکتا ہے۔ **جواب:** نعوذ باللہ نورایت کو الوہیت سے کیا نسبت نورانیت اور نور رب تعالیٰ کی مخلوق چیزیں ہیں سورج، چاند، تارے، علم، فرشتے یہ تمام چیزیں مخلوق ہیں مگر نور ہیں۔ جنتی لوگ نورانی ہوں گے۔ بشریت کا نورانیت کے ساتھ اجتماع ایسا ہے جیسے بشریت کا نبوت و رسالت، محبوبیت کے ساتھ اجتماع عبدیت والوہیت میں اجتماع ناممکن ہے کہ بشر حادث، ممکن، مخلوق، مرزوق، عبد ہے۔ اللہ تعالیٰ واجب، قدیم، خالق، رازق، حی و قیوم ہے لہٰذا مسئلہ نورانیت کو الوہیت سے کوئی نسبت نہیں۔

تیسرا اعتراض: الوہیت مسیح کا عقیدہ رکھنے والے عیسائیوں کو مشرک کیوں کہا گیا انہوں نے دو خدا تو نہیں مانے وہ تو ایک ہی خدا کے قائل رہے یعنی حضرت مسیح کو خدا مان لیا یہ عقیدہ کفر تو ہے، شرک کیسے ہو گیا اور اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ کیونکر درست ہوا؟ **جواب:** ان عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں الوہیت حلول کیے ہوئے ہے۔ جیسے آئینہ میں سورج کی شعاعیں اس لیے وہ الٰہ یعنی محل الوہیت ہیں یعنی وہ حضرت مسیح کو صرف خدا نہیں مانتے، خدا اور ہے۔ حضرت مسیح

نما بندے میں فرق نہ کر سکے۔ پردہ کو پردہ دار آئینہ کو آئینہ دار خدا نما کو خدا کہنے لگے حالانکہ حقیقت یہ ہے

بندہ خدا نما است و لے اونمی شود　　آئینہ رونما است و لے رونمی شود

واقعی جناب مسیح نے مردے زندہ کیے مٹی سے پرندے بنا کر ان میں دم کر کے اصل پرندے بنا دیئے، بیماروں کو شفا بخشی مگر بالا ستقلال نہیں بلکہ رب تعالیٰ کے حاجت مند رہتے ہوئے وہ مستقل اور غیر مستقل میں فرق نہ کر سکے۔ امت محمدیہ نے راہ حق کو جذبات الہیہ کے ذریعے طے کیا اور حضرات انبیاء کو عشق و معرفت کی نظر سے دیکھا وہ مقصد پر پہنچ گئے اور استدلال کی کلفتوں سے بچ گئے۔ حضرت شبلی نے اپنی کتابیں پانی سے دھوڈالیں اور بولے کہ تم یار کی دلیلیں ہو وصول کے بعد دلیلوں کی کیا ضرورت ہے، وصول ذریعہ قبول ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

چوں شدی بر بامہائے آسمان　　سرد باشد جست و جوئے نردبان
آئینہ روشن کہ شد صافی جلی　　جہل باشد برنہادن صیقلی!
پیش سلطاں خوش نشستہ در قبول　　جہل باشد جستن نامۂ رسول!

یعنی جو آسمان پر پہنچ جائے اسے سیڑھی وزینہ کی ضرورت نہیں جب آئینہ صاف ہوا سے صیقل کی ضرورت نہیں۔ جو بادشاہ کے سامنے مقبول بنا بیٹھا ہوا سے نامہ و پیام کی ضرورت نہیں اس فرق کی وجہ سے مسلمان حضرات انبیاء کرام کو صحیح طریقے سے مانتے ہیں کفار غلط طریقہ سے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ظلم چار معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کفر و شرک، گناہ، خطاء، کسی کا حق مارنا۔ اگر انبیاء کرام کے لئے یہ لفظ آوے تو بمعنی خطا ہوگا، اگر ہم جیسے گناہ گاروں کے لئے آوے تو بمعنی گناہ جیسے اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (النساء: ۶۴) اگر کفار کے لئے آئے تو بمعنی کفر و شرک ہوگا جیسے یہاں ہے۔ لِلظّٰلِمِیْنَ کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا یعنی ظالموں کے ہی مددگار کوئی نہیں، مسلمانوں کے ہیں۔ چنانچہ اولیاء انبیاء ان کے مددگار ہیں۔ مدد سے مراد آخرت میں مدد ہے نہ کہ دنیاوی لہٰذا یہ آیت کریمہ دیگر آیات کے خلاف نہیں جو ڈول رسی سے وابستہ نہ ہوا سے کنوئیں سے کون نکالے جو انسان نبی سے وابستہ نہیں اسے کفر و معصیت کے گناہ سے کون نکالے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ

البتہ تحقیق کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ تحقیق اللہ تین میں کا تیسرا ہے حالانکہ نہیں ہے کوئی

بے شک کافر ہیں وہ جو کہتے ہیں اللہ تین خداؤں میں کا تیسرا ہے اور خدا تو نہیں مگر

اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ

معبود سواء معبود ایک کے اور اگر نہ باز رہے یہ لوگ اس سے جو کہتے ہیں تو البتہ ضرور پہنچے گا

ایک خدا اور اگر اپنی بات سے باز نہ آئے تو جو ان میں سے کافر مریں گے

اللہ ایک ہی ہے جو حضرت مسیح کی شکل میں آ گیا دوسرا کوئی خدا نہیں وہ کافر ہیں اگرچہ مشرک نہ ہوں کہ انہوں نے چند خدا نہ مانے بلکہ خدا کو انسان مان لیا اور انسان کو خدا۔ نعوذ باللہ یہاں پہلے دو عیسائیوں کا ذکر ہے جو مشرک ہیں اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ۔ عربی میں کسی عدد کا اسم فاعل بنا لیا جاوے تو اس کے معنی ہوتے ہیں اس عدد میں سے ایک ثلثہ کے معنی تین اور ثالث کے معنی تیسرا پھر اس ثالث کے دو معنی ہوتے ہیں اگر یہ اپنے مثل عدد کی طرف مضاف ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ رابع اربعہ تب اس کے معنی ہوتے ہیں ان میں سے ایک اور اگر اپنے سے نیچے والے عدد کی طرف مضاف ہو تو معنی ہوتے ہیں اس درجہ والا لہٰذا ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ کے معنی ہیں تین میں سے ایک اور ثالث اثنین کے معنی ہیں دو کا تیسرا یعنی دو کو تین بنانے والا۔ تیسرے درجہ والا پہلی صورت میں ثَلٰثَةٍ کو جر ہی ہوگا کہ وہ مضاف الیہ ہے دوسری صورت میں جر بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مضاف الیہ ہے اور نصب بھی کہ وہ معفول بہ بھی ہے۔ لہٰذا رابعہ ثلثہ میں ثلثہ کو جر بھی پڑھ سکتے ہیں اور نصب بھی (تفسیر کبیر و روح المعانی) **خیال رهے** کہ تثلیث کے عقیدے والے عیسائیوں کے پھر چار فرقے ہیں۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ الٰہ مستقل تین ہیں دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ الٰہ ان تین کا مجموعہ ہے یعنی الٰہ ہے تو ایک مگر اس کے جز چار ہیں تیسرا فرقہ کہتا ہے کہ ذات الٰہ ایک ہے دو اس کی صفتیں ہیں، ان کا مجموعہ ایک خدا ہے، چوتھا فرقہ کہتا ہے کہ ذات دو ہیں اور ایک صفت ان کا مجموعہ ایک الٰہ ہے پھر ان کا آپس میں یہ اختلاف ہے کہ وہ تین کون ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ تین اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام اور مریم ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ قیامت میں عیسیٰ علیہ السلام سے سوال ہوگا اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مائدہ:١١٦) اور بعض کہتے ہیں کہ وہ تین اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس (تفسیر صاوی) یعنی باپ بیٹا روح القدس وہ کہتے ہیں کہ جو ہر ایک ہے اور اقنوم تین جیسے سورج ایک ہے مگر اس کی ٹکیہ، شعاعیں، گرمی یہ تین ہیں باپ سے مراد ذات، عیسیٰ کلمہ اور روح حیاۃ۔ کلمہ عیسیٰ میں ایسا مخلوط ہے جیسے پانی دودھ میں اسے کہتے ہیں التوحید فی التثلیث۔ غرضکہ اس کے عجب احمقانہ کلام ہیں۔ خیال رہے کہ یہاں ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ میں ایک لفظ پوشیدہ ہے وہی کفر ہے یعنی ثالث ثلثہ الهة یعنی اللہ تعالیٰ تین معبودوں میں سے ایک معبود ہے کہ معبود تین ہیں ان میں سے ایک اللہ ہے۔ ورنہ یہ کلمہ اللہ تعالیٰ کے لئے قرآن مجید میں بھی ہے اور حدیث شریف میں بھی۔ چنانچہ رب فرماتا ہے: مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَ لَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ (مجادلہ:٧) اور حدیث شریف میں کہ ہجرت کے دن جب غار ثور میں حضرت صدیق نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ﷺ کفار آ گئے تو فرمایا ما ظنک باثنین اللہ ثالثهما دیکھو اس آیت و حدیث میں اللہ تعالیٰ کو چوتھا چھٹا تیسرا اقرار فرمایا گیا یہ بالکل برحق ہے جہاں چند مسلمان جمع ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہوتا ہے علم و قدرت و رحمت سے جس مجمع میں پانچ مسلمان ہیں تو چھٹا اللہ تعالیٰ ہے یہ بالکل درست ہے۔ عیسائیوں کی نیت وہ تھی جو ابھی عرض کی گئی یہ کفر تھی اس لئے ان کی تردید میں ارشاد ہوا وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اس ایک فرمان میں ان عیسائیوں کی تمام بکواس کی مکمل تردید ہے یعنی ہستی میں کوئی معبود نہیں سوا اس اللہ کے جو ذات صفتہ قدرۃ ایک ہے نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ بیوی بچے اولاد نہ اس کی صفات کا

نہیں اور اسلامی توحید اختیار کیوں نہیں کرتے اگر یہ کرلیں تو بخش دیے جائیں گے کیونکہ اللہ غفور رحیم اللہ تعالیٰ بخشنے والا بھی ہے، مہربان بھی۔ مغفرت و رحمت میں بھی کئی طرح فرق کیا گیا ہے۔ گناہوں پر عذاب نہ دینا مغفرت ہے اپنے کرم سے انعام دے دینا رحمت۔ بدعقیدگی بخش دینا مغفرت ہے بدعملی معاف فرمادینا رحمت، بڑے گناہ بخش دینا مغفرت ہے چھوٹے گناہ معاف کردینا رحمت، غرضکہ یہ دونوں کلمے بہت جامع ہیں۔

خلاصہ تفسیر الوہیت مسیح کے متعلق عیسائیوں کے بہت فرقے ہیں اور ان کے مختلف عقیدے پچھلی آیت میں ان عیسائیوں کی تردید کی گئی جو کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی خدا ہیں اب اس عیسائی فرقہ کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ الٰہ تین ہیں چنانچہ ارشاد ہوا کہ ان عیسائیوں کی طرح وہ عیسائی بھی سخت کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین معبودوں میں سے ایک معبود ہے خواہ اس طرح کہ ایک اللہ کے تین جز ہیں یا اس طرح کہ مستقل تین الٰہ ہیں یا اس طرح کہ دو صفات ایک ذات الٰہ ہیں یا اس طرح کہ دو ذات اور ایک صفت الٰہ ہیں پھر خواہ اس طرح کہ حضرت مسیح، مریم، اللہ تعالیٰ الٰہ ہیں یا اس طرح کہ مسیح، مریم روح القدس الٰہ ہیں۔ غرضکہ کسی طرح تثلیث کا عقیدہ رکھیں کافر ہیں۔ معبود صرف ایک ذات واحد صمد و قادر ہے جس میں کسی طرح دوئی ممکن نہیں اگر یہ لوگ اپنے ان مشرکانہ عقیدوں سے توبہ نہ کریں گے اور ان سے باز نہ آئیں گے تو جو مرتے وقت تک کافر ہیں انہیں برزخ و آخرت میں سخت ہی دردناک عذاب پہنچے گا۔ یہ لوگ بارگاہِ الٰہی میں اب بھی توبہ کیوں نہیں کرلیتے، اس سے معافی کیوں نہیں مانگ لیتے۔ اللہ تعالیٰ تو غفور رحیم ہے بڑے سے بڑے مجرم کو توبہ کرنے پر بخش دیتا ہے اگر یہ لوگ توبہ کرکے مسلمان ہو جاویں تو اگرچہ انہوں نے صدہا کفر و بدعملیاں کی ہیں ہم سب بخش دیں گے۔ **خیال رہے** کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات ہیں مگر ہیں دو قسم کی بعض وہ جن کا تعلق خلقت سے نہیں جیسے اس کا زندہ ہونا، موجود ہونا، ازلی ابدی ہونا۔ انہیں صفات حقیقیہ کہتے ہیں۔ بعض وہ جن کا تعلق خلقت سے ہے جیسے رازق ہونا سمیع و بصیر ہونا۔ انہیں صفات اضافیہ کہتے ہیں پھر صفات اضافیہ دو قسم کی ہیں۔ عامہ اور خاصہ۔ عامہ وہ جن کا فیض عام خلقت کو ملتا ہے جیسے خالق ہونا، مالک ہونا۔ خاصہ وہ ہیں جن کا فیض خاص بندوں کو ملتا ہے جیسے غفار ہونا، ستار ہونا کہ ان کا تعلق گناہ گار بندوں سے ہے یا قہار ہونا کہ اس کا تعلق کفار سے ہے۔ پھر یہ صفات اضافیہ اپنے متعلقات سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ہم جیسے گناہ گاروں پر اس کی ستاری غفاری کا ظہور ہے کفار پر اس کی قہاری کی جلوہ گری۔ اس لئے حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ گناہگار مخلوق کو پیدا فرمائے تاکہ اس کی غفاری ستاری ظاہر ہو غفور اس کی صفت اضافیہ خاصہ ہے کہ گناہ گاروں کو بخشنے والا ہے رحیم اس کی صفت اضافیہ عامہ ہے کہ سب کو اس کی رحمت کی ضرورت ہے اس لئے یہاں بندوں کی توبہ و استغفار کا ذکر پہلے ہوا اور رب تعالیٰ کی غفاری و رحمت کا ذکر بعد میں۔

فائدے اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اگرچہ کفر کی بہت قسمیں ہیں مگر کفر ہونے میں وہ سب برابر ہیں الکفر ملة واحدہ دیکھو رب تعالیٰ نے ان عیسائیوں کو بھی کافر

اسے عذاب ہوا تو الیم نہ ہوگا نہ اس کی رسوائی ہوگی نہ اس کے دل دماغ اعضاء سجدہ کو آگ جلا سکے گی کہ دل دماغ یار کا مسکن ہیں اور اعضاء سجدہ ذریعہ ہیں سجدہ کے۔ یہ فائدہ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الخ سے حاصل ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ غافر بھی ہے یعنی بخشنے والا وہ غفار بھی ہے یعنی بہت بخشنے والا اور غفور بھی ہے یعنی ہمیشہ بخشنے والا ہر طرح بخشنے والا ہر بہانے سے بخشنے والا، ہر حیلہ سے بخشنے والا، بخشش کا عادی کیونکہ بعض لوگ گناہ گار ہیں ان کے لئے خدا غافر ہے بعض لوگ بہت بڑے گناہ گار ہیں گناہ کبیرہ کر لینے والے ان کے لئے خدا غفار ہے اور ہم جیسے عادی مجرم ہمیشہ ہر طرح گناہ کرنے والے ہیں تو ہمارے لئے وہ غفور ہے۔ ہم کو گناہ کی عادت ہے اسے بخشنے کی عادت، گناہ سے ہم باز نہیں آتے بخشش وہ نہیں چھوڑتا بھلا غور تو کرو کہ ہزاروں گناہ نماز کے بہانہ بخش دیتا ہے ہزارہا گناہ رمضان کے حیلہ سے ہزارہا گناہ قرآن کے ذریعہ سے غرضکہ جس لائق ہم ہیں وہ ہم کرتے رہتے ہیں جو اس کی شان کریمی کے لائق ہے وہ کرتا ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ثالث ثلثہ کہنا کفر ہے مگر خود رب العالمین نے بھی اپنے لئے یہ کلمات فرمائے ہیں اور حضور ﷺ نے بھی خود فرمایا ہے کہ جہاں پانچ ہوں وہاں ہم چھٹے ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ نے غار ثور میں اپنے یار غار سے فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ان دو کے متعلق جن کا تیسرا اللہ ہے یہ الفاظ اسلام میں کیوں بولے گئے ان دونوں میں مطابقت کیسے ہو؟ **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر میں گزر گیا کہ عیسائیوں کے اس قول کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین معبودوں میں سے ایک معبود ہے، اس کا شرک ہونا ظاہر ہے اور ان آیات واحادیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اپنے علم یا اپنی رحمت سے ان کے ساتھ ہے مقصد بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے۔

دوسرا اعتراض: یہاں ارشاد ہوا کہ اگر عیسائی تثلیث کے عقیدے سے باز نہ آئے تو انہیں دردناک عذاب پہنچے گا تو اگر عیسائی تثلیث سے توبہ کر لیں مگر مسلمان نہ ہوں دہریہ بن جاویں کیا وہ عذاب سے بچ جاویں گے، اگر بچ جاویں گے تو اسلام کی کیا ضرورت رہی؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں لغوی باز رہنا مراد نہیں بلکہ شرعی باز رہنا مراد ہے۔ وہ ہی نجات کا مدار ہے۔ شرعی باز رہنا یہ ہی ہے کہ اسلام قبول کر لیا جاوے جیسے حدیث شریف میں ہے من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة وہاں بھی جنتی ہونے کے لئے شرعی کلمہ پڑھنا معتبر ہے جس کا شریعت میں اعتبار ہے یعنی مسلمان ہو جانا دوسرے یہ کہ ہاں پھر انہیں تثلیث کا عذاب نہ ہوگا اور دوسرے کفر کا عذاب ہوگا اگر مسلمان ہو جاویں تو ان میں سے کوئی عذاب نہ ہوگا اگر متقی بھی بن جاویں تو کسی قسم کا کوئی عذاب نہ ہوگا نہ کفر کا نہ فسق کا اس لئے ارشاد ہے: اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (البقرہ:٢٥)

تیسرا اعتراض: کَفَرُوْا مِنْهُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے تثلیث والے عیسائی کافر نہیں بلکہ بعض کافر ہیں مِنْهُمْ میں من تبعیضیہ ہے تو کیا بعض عیسائی مومن بھی ہیں؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں مِنْهُمْ میں من

تفسیر صوفیانہ

حضرات انبیاء کرام آئینہ جمال الٰہی اور تجلی گاہ ذات رب العالمین ہیں جس آئینہ پر آفتاب تجلی ڈال رہا ہو اس آئینہ کو دماغ کی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے آنکھ خیرہ ہو کر محسوس کرنے میں سخت غلطی کرے گی پھر اس شیشے کو دیکھنے کے لئے کسی ٹھنڈے شیشے والے چشمہ کی ضرورت ہے یونہی اگر حضرات انبیاء کرام کو محض عقل کی آنکھ سے دیکھا گیا تو یا انہیں اپنا جیسا بشر کہہ دیا جاوے گا یا خدا یا خدا کا بیٹا محض عقل ضرور ٹھوکر کھائے گی۔ جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہود نے بھی محض عقل کی آنکھ سے دیکھا تو انہیں بغیر والد پیدا ہوتے دیکھ کر ان پر اور ان کی والدہ ماجدہ طیبہ طاہرہ پر صدہا الزام لگا دیئے۔ عیسائیوں نے بھی محض عقل کی آنکھ سے دیکھا تو انہیں بغیر باپ پیدا ہونے کی بناء پر اللہ یا اللہ کا بیٹا یا تیسرا خدا کہہ دیا۔ عیسائیوں کی آنکھیں ایسی خیرہ ہوئیں کہ وہ خود آپس میں بھی ان جناب کے متعلق فیصلہ نہ کر سکے یہ تھا انجام محض عقل کی آنکھ سے انہیں دیکھنے کا یہاں فرمایا گیا کہ بے وقوفو اپنی چوندھیائی ہوئی آنکھوں میں پہلے تو توبہ و استغفار کا سرمہ لگاؤ پھر اتباع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا ٹھنڈا اور حقیقت نما چشمہ لگاؤ تب تم کو پتہ لگے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ اللہ ہیں نہ ابن اللہ بلکہ عبدہ ورسولہ ہیں کوئی بغیر باپ پیدا ہونے سے اللہ بن نہیں جاتا بلکہ پیدا ہونا مخلوق ہونا اس کی عبدیت کی دلیل ہے مسلمانوں نے ہزارہا معجزات اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھے مگر الحمد للہ انہوں نے حضور کو نہ اللہ کہا نہ ابن اللہ بلکہ بندۂ اللہ اور عالم مکان کا شاہ مانا

حق ہے کہ ہیں عبداللہ اور عالم امکاں کے شاہ — برزخ ہیں وہ سر خدا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

غرضکہ جمال محمدی کو اتباع محمدی کے چشمہ سے دیکھا مومن ہوئے۔ جمال انبیاء ایک ہے مگر دیکھنے والی آنکھیں مختلف۔ صوفیاء کرام توبہ و استغفار کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگر کارخانہ میں مال بننا بند ہو جاوے تو نہ بازار میں فروخت ہو سکتا ہے نہ گھروں میں استعمال لیکن اگر کارخانہ میں مال تیار ہوتا رہے تو فروخت یا استعمال پر لاکھوں پابندیاں لگاؤ مگر وہ کھلے چھپے فروخت و استعمال ضرور ہوگا۔ ہمارا دل گناہوں کا کارخانہ ہے دماغ دوکان اعضاء استعمال کے گھر اگر دل میں گناہوں کی طرف میلان ہی نہ رہے تو کارخانہ سے گناہ بنے ہی نہیں پھر بدن استعمال کیسے کرے۔ حضرت عثمان سے فرمادیا جاؤ جو چاہو کرو جنت تمہاری ہو چکی وجہ یہ ہی تھی کہ ان کے کارخانہ دل میں گناہ بنانا بند کر دیئے گئے پھر استعمال کیسے ہوں توبہ کرو۔ یعنی کارخانہ دل میں گناہ بنانا بند کرو استغفار کرو کہ استعمال شدہ گناہوں کی معافی مانگو۔ اور غفور رحیم کے متعلق صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جس کی رونق عشق سے ہے، سخاوت کی بہار بھکاریوں سے ہے کہ دربار الٰہی بارگاہ نبی پر گناہ گاروں کی بھیڑ لگی ہو ادھر سخی کے ہاتھ بخشش میں چل رہے ہوں یوں ہی ستاری غفاری کے بازار کی بہار گناہ گاروں سیاہ کاروں سے ہے کہ گناہ گار خطا کار مصلوں پر سر رگڑ کر رو رہے ہوں ادھر سے واللہ غفور رحیم کے اعلان ہو رہے ہوں۔ جب برادران یوسف علیہ السلام شرمندہ ہو کر دربار یوسفی میں آئے تب لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (یوسف: ۹۲) فرمانے کی بہار آئی۔ جب ہندہ، عکرمہ، وحشی، ابوسفیان دروازہ محمدی پر آئے تب دامن کرم ان کی طرف اٹھا اور انہیں آغوش میں لیا گیا۔ ایک سخی نے اپنے مکان کے سو دروازے رکھے تاکہ ایک بھکاری

کرنے کا حکم دیا گیا اب دلائل سے سمجھا کر انہیں توبہ کی طرف مائل کیا جا رہا ہے۔ بعض لوگ ڈر سے مانتے ہیں، بعض لالچ سے اور بعض دلائل سے پہلے دو قسم کے لوگوں کے لئے پچھلی آیات میں دعوت تھی۔ تیسرے قسم کے لوگوں کو اب دعوت توبہ دعوت ایمان دی جا رہی ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیات میں حضرت مسیح سے ان بہتانوں کو دور کیا گیا جو عیسائیوں نے انہیں لگائے یعنی ان کا عین اللہ یا ابن رسول یا تیسرا خدا ہونا اب ان کی ان صفات کا ذکر ہے جو رب تعالیٰ نے انہیں اور ان کی والدہ کو عطا فرمائیں یعنی ان کا رسول ہونا ان کی والدہ ماجدہ کا اللہ کی بندی اور صدیقہ ہونا۔ گویا اتہاموں کی نفی کے بعد صفات کا ثبوت ہے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں عیسائیوں کو توبہ کی تلقین فرمائی گئی تھی اب انہیں توبہ کا طریقہ بتایا جا رہا ہے کہ حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق یہ عقیدہ رکھیں کہ رسول ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں۔ گویا توبہ کا حکم پہلے تھا اور توبہ کے طریقہ کی تعلیم اب دی جا رہی ہے۔

تفسیر

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ۔ اس عبارت میں ما نافیہ ہے **اَلْمَسِيْحُ** مبتداء اور **رَسُوْلٌ** اس کی خبر ہے **اِلَّا** سے حصر کا فائدہ ہوا یہ حصر اضافی ہے نہ کہ حقیقی اور حصر الوہیت یا ابن اللہ ہونے کے لحاظ سے ہے یعنی حضرت مسیح نہ اللہ ہیں نہ ابن اللہ نہ تیسرے خدا بلکہ صرف اور محض بندے اور رسول ہیں یہ مطلب نہیں کہ ان میں سواء رسالت کے اور کوئی وصف نہیں وہ کلمۃ اللہ ہیں نہ روح اللہ نہ وہ مردے جلانے والے ہیں نہ اندھوں کوڑھوں کو شفا دینے والے بلکہ وہ رسالت کے ساتھ ان تمام صفات سے موصوف ہیں۔ رسول کی تنوین تعظیم کی ہے یعنی بہت شاندار رسول کہ صاحب کتاب صاحب شریعت رسول ہیں۔ **خیال رھے** کہ قرآن کریم نے حضرت جبرئیل کو بھی رسول فرمایا: **اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ** (مریم: ١٩) دوسرے فرشتوں کو **جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا** (فاطر: ١) دوسرے پیغمبروں کو بھی **اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا** (مزمل: ١٥) اور ہمارے حضور کو بھی یہ سب حضرات رسول ہیں مگر ان کی رسالت کی شانوں میں فرق ہے۔ حضرت جبرئیل خاص رسول ہیں دوسرے فرشتے عام رسول اس لئے حضرات انبیاء پر وحی لانے والے صرف حضرت جبرئیل ہیں مگر یہ دونوں رسالتیں بے اختیار پیغام رساں فیض رساں والی ہیں جیسے ڈاک کا محکمہ جو حکام تک بادشاہ کا پیغام پہنچاتا ہے اس لئے حضرت جبرئیل کا کوئی امتی نہیں ان کا کلمہ نہیں پڑھا گیا۔ حضرات انبیاء کرام کی رسالت با اختیار ہے کہ پیغام و فیضان اپنے اختیار سے مخلوق تک پہنچاتے ہیں جیسے با اختیار حکام مگر دیگر انبیاء کرام کی رسالتیں محدود وقت محدود قوموں کے لئے تھیں اس لئے ان کے متعلق ارشاد ہوا کہ فرعون کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا قوم عاد کی طرف ہود کو قوم ثمود کی طرف صالح کو قوم مدین کی طرف شعیب علیہم السلام کو بھیجا مگر ہمارے حضور کی رسالت نہ وقت سے محدود ہے نہ قوم سے اس لئے ارشاد ہوا: **لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا** یا **رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ** چراغ خاص گھر کا نور ہیں، سورج ساری زمین کا نور اگرچہ نور دونوں ہیں۔ **قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ** یہ جملہ **رَسُوْلٌ** کی صفت ہے یہاں قد تحقیق کے لئے ہے، تقریب کے لئے نہیں۔ **خَلَتْ** بنا ہے خلو سے بمعنی گزر جانا اسی سے ہے خالی جس میں سے کوئی شئی گزر جاوے اب موجود نہ ہو اس کے معنی موت نہیں کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام

ان کی والدہ حنہ نے انہیں بیت المقدس کی خدمت کے لئے اللہ سے مانگا یہ ان کا اخلاص ان کی عظمت کا باعث ہوا (۲) ان کی پرورش بیت المقدس میں ہوئی (۳) ان کی تربیت حضرت زکریا علیہ السلام نے کی (۵) ان کو جنتی میووں سے پرورش کیا گیا جسے اللہ یہ نعمتیں بخشے وہ صدیقہ ہی ہوگی۔ کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ مستقل ہے کانا کا اسم حضرت عیسیٰ و مریم دونوں بزرگ ہیں چونکہ مذکر افضل ہے مؤنث سے نیز عیسیٰ علیہ السلام نبی ہیں جناب مریم نبی نہیں اس لئے تغلیبا کانا تثنیہ مذکر ارشاد ہوا یعنی وہ دونوں حضرات کھانا کھاتے تھے۔ جو کھانا کھائے وہ رب نہیں رب وہ جو کھلاتا ہے کھاتا نہیں نیز کھانا وہ کھاتا ہے جو کھانے کا حاجت مند ہو، جب وہ کھانے کی ضرورت رکھتے تھے تو رب نہیں ہو سکتے نیز کھانے کی وجہ سے بہت سی حاجت مندیاں پیش آتی ہیں، کھانے کی وجہ سے انسان مکان، آٹا پیسنے والے، روٹی پکانے والے، لکڑی چولہا وغیرہ صدہا چیزوں کا حاجت مند ہو جاتا ہے نیز کھانے سے دنیا میں پیشاب، پاخانہ، ہوا، خون، گوشت وغیرہ بنتے ہیں نیز کھانے سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جن کی وجہ سے طبیبوں، معالجوں وغیرہم کی حاجت پڑتی ہے۔ غرضکہ ایک کھانے سے بندگی پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ انسان کھانے کے سوا، زمین، ہوا، دھوپ، لباس وغیرہ بھی استعمال کرتا ہے، ان سب کا حاجت مند ہے مگر کھانا کھانے میں حاجت مندی بہت ہی ظاہر ہوتی ہے، کھانا حاجت مندیوں کا مجموعہ ہے اس لئے خصوصیت سے اس کا ذکر فرمایا۔ اس میں اشارۃً فرمایا گیا کہ اگرچہ وہ مردوں کو زندہ، بیماروں کو صحت یاب کرتے تھے مگر اپنے کو بھوک پیاس سے نہیں بچا سکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ بذات خود کچھ نہیں تھے جو کرتے تھے رب کی دی ہوئی قدرت سے کرتے تھے جہاں قدرت دے دی وہاں قادر ہیں جہاں قدرت نہ دی وہاں مجبور ہیں یہ علامت بندگی ہے۔ غرضکہ ان چند کلمات میں عبدیت مسیح کے بے شمار دلائل بیان فرما دیئے گئے اس لئے فرمایا: اُنْظُرْ کَیْفَ نُبَیِّنُ لَهُمُ الْاٰیٰتِ۔ اُنْظُرْ بنا ہے نظرٌ سے بمعنی دیکھنا یا غور کرنا یہ خطاب یا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے یا ہر قرآن پڑھنے والے سے۔ اگر ہر قرآن پڑھنے والے سے خطاب ہے تو منشا یہ ہے کہ اللہ کی آیتوں میں غور کرو کہ یہ غور عبادت ہے ان کفار کی ہٹ دھرمی میں بھی غور کرو کہ یہ حضور کو دیکھ کر مدینہ کی زمین میں رہ کر قرآن اترتے دیکھ کر بھی کافر ہے تاکہ تم ان کے عیوب سے بچو اور اگر خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے تو مقصد یہ ہوگا کہ جیسے سمندر کے موتی، کان کا سونا ہے تو رب کی مخلوق مگر لوگوں کو جب ملتے ہیں جب کوئی ماہر انہیں نکال کر دے یوں ہی آیات قرآنیہ کے رموز و اسرار بلکہ مطالب بندوں کو جب ملیں گے۔ آپ غور و فکر سے نکال کر انہیں سمجھا دیں۔ نُبَیِّنُ بنا ہے تبیینٌ سے بمعنی خوب بیان کرنا بہت واضح کرتے رہنا آیات جمع ہے آیت کی بمعنی کھلی دلیل یا ظاہری نشانی یعنی اے محبوب! یا اے قرآن پڑھنے والے غور تو کرو کہ ہم کس طرح عبدیت مسیح پر کھلی دلیلیں، مضبوط حجتیں بیان فرماتے ہیں جن سے اس مسئلہ میں کسی قسم کی پوشیدگی نہیں رہتی۔ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ یہ جملہ پہلے جملہ پر معطوف ہے دوبارہ انظر فرمانے میں مبالغہ کا اظہار ہے کہ وہ بات بھی پوری طرح غور سے دیکھو اور یہ چیز بھی چونکہ ان دونوں نظروں میں بڑا فرق مراتب ہے کہ وہ نظر قدرت الٰہی کے لئے اور یہ نظر عیسائیوں کی ضد پر تعجب کے لئے ہے اس لئے ثم عاطفہ ارشاد ہوا۔ اَنّٰی بمعنی کیف بھی آتا ہے اور بمعنی من این بھی یہاں بمعنی کیف ہے چونکہ

وغیرہ ظاہر یہ ہے کہ ہر نقصان و نفع مراد ہے جیسا کہ ضَرًّا اور نَفْعًا کے نکرہ فرمانے سے معلوم ہو رہا ہے۔ **خیال رہے** کہ نفع نقصان دینا اور چیز ہے ان کا مالک ہونا کچھ اور پھر مالک ہونے میں ذاتی مالک ہونا اور ہے عطائی مالک ہونا کچھ اور یہاں نہ تو نفع و نقصان دینے کی نفی ہے نہ ہر ملکیت کی بلکہ ملکیت ذاتی کی نفی ہے لہٰذا آیت کریمہ بالکل واضح ہے وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ یہ عبارت بھی عیسائیت کی تردید کی بڑی دلیل ہے۔ ھو کا مرجع اللہ ہے سمیع و علیم سے مراد دائمی سننے جاننے والا ہے۔ یعنی ازلی ابدی السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ یا ذاتی سمیع و علیم یہ دونوں صفتیں رب تعالیٰ سے خاص ہیں۔ اس کے سوا کوئی بندہ دائمی یا ذاتی طور پر نہ سمیع ہے نہ علیم ہر ایک خود بھی حادث ہے اس کی ہر صفت بھی حادث خود بھی رب کے پیدا کرنے سے پیدا ہوا اس کی صفات بھی رب کی عطا سے۔ مطلب یہ ہے کہ لائق عبادت وہ اللہ ہے جو بندوں کے نفع نقصان کا ذاتی مالک ہے جو ازلی ابدی مستقل سمیع و علیم ہے یہ صفتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں نہیں لہٰذا نہ وہ الٰہ ہیں نہ ان کی عبادت درست ہے۔ اے عیسائیو! اس وحدہ لاشریک کی عبادت کرو جس کے قبضہ میں حضرت مسیح ہیں۔

خلاصہ تفسیر

عیسائیوں کا ہر فرقہ جھوٹا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کے سارے ہی عقیدے باطل ہیں نہ تو عیسیٰ علیہ السلام اللہ ہیں نہ تیسرے الٰہ نہ ابن اللہ وہ تو خالص نرے بندے اور اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت رسول دنیا میں گزرے جنہوں نے حضرت مسیح سے بھی اعلیٰ معجزات دکھائے موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضاء، عصا کا سانپ بننا، دریا کا چیر دینا، بنی اسرائیل پر من وسلویٰ کی بارش کرانا وغیرہ حضرت صالح علیہ السلام کا پتھر سے زندہ اونٹنی نکالنا حضرت آدم کا بغیر ماں باپ پیدا ہونا معجزات مسیح سے اعلیٰ ہیں مگر ان معجزات کے باوجود وہ خدا نہ ہوئے تو عیسیٰ علیہ السلام بھی خدا نہیں خدا کے بندے ہیں یوں ہی ان کی والدہ ماجدہ نہ تو خدا ہیں نہ خدا کی بیوی نہ نبی بلکہ اللہ کی سچی بندی ہیں جن کے اقوال، اعمال، احوال سب سچے ہیں ان دونوں کی بندگی کی کھلی دلیل یہ ہے کہ وہ دوسرے بندوں کی طرح کھانا کھاتے پانی پیتے تھے اپنے سے بھوک و پیاس کو دفع نہ کر سکتے تھے کھانا کھانے میں بندہ صدہا طریقہ سے رب تعالیٰ کا حاجت مند ہوتا ہے۔ غور تو کرو کہ ہم عبدیت مسیح وغیرہ پر عیسائیوں کو کیسی کیسی کھلی نشانیاں ظاہر فرما رہے ہیں جن کا جواب وہ نہیں دے سکتے پھر بھی تعجب سے سوچو کہ ان آیات کے باوجود عیسائی کیسے اوندھے جا رہے ہیں کہ اب بھی حضرت عیسیٰ کو خدا یا خدا کا بیٹا ہی کہے جا رہے ہیں اے محبوب! آپ ان سے اتنا تو فرما دو کہ کیا تم ان مسیح علیہ السلام، مریم، صلیب وغیرہ کو پوجتے ہو جو تمہارے عقیدے میں بھی بذات خود کسی کے نفع نقصان کے حقیقی مالک نہیں ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں رب تعالیٰ کی عطا سے کرتے ہیں۔ جب وہ اپنے ہر وصف میں رب کے حاجت مند ہیں تو لائق عبادت نہیں۔ رب تعالیٰ ہی ازلی، ابدی، ذاتی، حقیقی سننے جاننے والا ہے۔ حضرت مسیح کا سننا جاننا بھی رب تعالیٰ کی عطا سے ہے لہٰذا صرف رب تعالیٰ ہی لائق عبادت ہے اس کے سوا کوئی نہ عبادت کے لائق ہے نہ الٰہ ہے۔ **خیال رہے** کہ مشرکین عرب بلکہ مشرکین ہند بھی۔ نافع اور مضر چیزوں کی یوں ہی عجیب چیزوں کی پوجا کرتے تھے اس لئے کہ ان سے یہ نفع ہے یا یہ نقصان۔ چنانچہ مشرکین ہند سانپ کو پوجتے ہیں کہ یہ زہریلا ہے ہلاک کر دیتا

چاہے جب چاہے سمیع بصیر بنا دے۔ یہ فائدہ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ کے حصر سے حاصل ہوا۔

لطیفہ: عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دے کر ان کی ہڈیاں پسلیاں توڑ ڈالیں۔ جناب مسیح نے سولی چڑھتے وقت پانی مانگا تو یہود نے انہیں بجائے پانی کے شراب ان کے نتھنوں میں ڈال دی جس سے آپ نے بہت تکلیف میں جان دی (تفسیر کبیر) ان باتوں کو مانتے ہوئے پھر انہیں خدا مانتے ہیں یہ ہے اندھاپن۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام صرف رسول ہیں ان میں رسالت کے سوا اور کوئی وصف نہیں تو تم نبیوں ولیوں کو حاجت روا مشکل کشا کیوں مانتے ہو یہ عقیدے اس آیت کے خلاف ہیں۔ پیغمبر صرف رسول یعنی ڈاکیے کی طرح پیغام پہنچا دینے والے ہوتے ہیں اور بس ان میں اور کوئی وصف نہیں ہوتا۔ اِلَّا رَسُوْلٌ نے حصر کا فائدہ دیا۔ **جواب:** تفسیر میں عرض کیا گیا کہ یہاں حصر اضافی ہے یعنی الوہیت کے لحاظ سے یعنی وہ نہ الٰہ ہیں نہ ابن اللہ بلکہ صرف بندے اور رسول ہیں اس کے علاوہ ان میں بہت صفات ہیں آپ کلمۃ اللہ، روح اللہ، مردوں کو زندگی، بیماروں کو شفا بخشنے والے، باذن الٰہی، بہ عطا پروردگار غیوب پر مطلع سب کچھ ہیں ان کے یہ سارے صفات قرآن کریم نے ہی بیان فرمائے لہٰذا ظاہر ہے کہ آپ دافع بلا مشکل کشا ضرور ہیں کیونکہ بیماری بلا ہے جسے جناب مسیح باذن پروردگار دفع فرماتے ہیں۔

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جناب مسیح سے پہلے سارے رسول وفات پا چکے کوئی زندہ نہیں یوں ہی حضور سے پہلے سارے نبی حتی کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی وفات پا چکے کیونکہ سورۃ آل عمران میں یہ ہی قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران: ۱۴۴) حضور ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے کسی نبی کو اب زندہ ماننا اس آیت کریمہ کے خلاف ہے۔ **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر اور فائدوں میں گزر چکا کہ یہ آیت ہی بعض نبیوں کے زندہ ہونے کی دلیل ہے کہ یہاں قَدْ خَلَتْ فرمایا گیا ماتت نہ فرمایا گیا۔ سارے نبی واقعی گزر گئے مگر بعض وفات پا کر بعض صرف اس طرح کہ ان کا زمانہ نبوت ختم ہو گیا حتی کہ عیسیٰ علیہ السلام اب دنیا میں تشریف لائیں گے تو نبی ہونے کی حیثیت سے نہیں آئیں گے بلکہ اب امت مصطفیٰ ہونے کی شان سے لہٰذا آپ اس وقت بھی گزرے ہوئے رسول ہی ہوں گے یعنی خود موجود مگر ان کی رسالت ختم۔ حضرت ادریس علیہ السلام کا زندہ اٹھالیا جانا تو قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہے۔ فرماتا ہے: وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (مریم: ۵۷) حضرت الیاس و خضر کا اب تک زندہ ہونا احادیث سے ثابت ہے۔

تیسرا اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جناب مسیح کھانا کھاتے اور کھانے کے حاجت مند تھے تو اب ان کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ آسمان پر کھانا پانی کے بغیر زندہ ہیں اس آیت کے خلاف ہے۔ جب کھانا ان کی عبدیت کی دلیل ہے تو نہ کھانا ان کی الوہیت کی دلیل ہوئی لہٰذا ان کو اب کھانے پینے سے بے نیاز ماننا گویا اللہ ماننا ہے (**نوٹ**) یہ اعتراض اس زمانہ کے قادیانی عالم مولوی محمد علی صاحب کو سوجا جسے انہوں نے اپنی تفسیر ”بیان القرآن“ میں نقل فرمایا۔ **جواب:** واقعی کھانا

نافع ہیں اور سانپ، جنات کی پوجا بھی جائز ہے کہ یہ چیزیں مضر ہیں لہٰذا ان کی عبادت حق ہے (سناتن دھرمی ہندو)

جواب: نافع مضر ہونا اور چیز ہے اور نفع ونقصان کا مالک ہونا کچھ اور چیز پھر نفع ونقصان کا عارضی عطائی مالک ہونا اور چیز ہے۔ دائمی مستقل بالذات مالک ہونا کچھ اور دنیا میں بعض چیزیں غیر اختیاری ہیں جیسے زہر بعض صورتوں میں آگ، ہوا، پانی بھی اور چیزیں غیر اختیاری مفید جیسے تریاق اور نفع بخش دوائیں بعض چیزیں غیر اختیاری دافع بلا ہیں جیسے دوا دافع زکام دافع نزلہ دافع بخار یا جیسے بزرگوں کے تبرکات بعض لوگ بہ عطاء الٰہی نفع ونقصان کے عارضی مالک ہیں جیسے حاکم بادشاہ یا حضرات اولیاء وانبیاء حضرت سلیمان باذن پروردگار ہواؤں کے مالک، جنات کے مالک بلکہ سارے جہان کے بادشاہ و مالک ہیں حتیٰ کہ ہوا ان کے حکم سے چلتی تھی۔ رب فرماتا ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ (ص: ۳۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام با اختیار نافع اور برکت والے حضرت یوسف علیہ السلام با اختیار فیض رساں جس پر قرآن کریم شاہد ہے۔ شیطان با اختیار نقصان دہ۔ قرآن کریم فرماتا ہے: يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ (بقرہ: ۲۷۵) اور فرماتا ہے أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ (بقرہ: ۲۵۷) یہ بے اختیار یا با اختیار نافع ومضر ہونا مدار الوہیت نہیں الوہیت کا مدار نفع نقصان کا مستقل ذاتی مالک ہونا ہے یہ صرف خدا تعالیٰ ہی کی صفت ہے اور وہ ہی لائق عبادت ہے۔ یہاں وہ ہی مراد ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بے شک نفع ونقصان کے مالک ہیں مگر باذن پروردگار جس نفع نقصان کا اللہ نے انہیں مالک کردیا اس کے مالک ہیں جس کا مالک نہ کیا اس کے مالک نہیں۔ پہلے آپ مردے زندہ کرتے تھے اب قریب قیامت جب آئیں گے تو زندہ کافروں کو مردہ کریں گے کہ ان کے سانس سے کفار ہلاک ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ ان کی یہ صفات اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ جب چاہا جس صفت کا چاہا مالک بنادیا، جب چاہا یہ اختیار واپس لے لیا بلکہ مخلوق کی تمام صفات کا یہ ہی حال ہے کہ رب کے قبضہ میں ہیں، جب چاہا ہم کو زندہ سمیع بصیر کردیا جب چاہا ہم سے یہ صفات لے لیں یہ گھومنے والے بندے ہیں گھمانے والا رب لہٰذا آیت صاف ہے۔

تفسیر صوفیانہ

بعض دل عقل کے تابع ہوتے ہیں اور بعض عقلیں دل کے تابع جو دل عقل کے تابع ہو وہ اللہ کا عذاب ہے اور جو عقل دل کے تابع ہو وہ عقل بھی اللہ کی رحمت ہے اور دل بھی اللہ کا فضل۔ اس کے متعلق ڈاکٹر اقبال نے کہا

صبح ازل مجھ سے یہ جبرئیل نے کہا جو ہو غلام عقل کا وہ دل نہ کر قبول

جب دل بادشاہ ہو اور عقل رعایا ہو تو وہ دنیا کی ہر چیز سے رب تعالیٰ کی معرفت حاصل کرلیتا ہے بلکہ اسے خود اپنی ذات میں دلائل توحید مل جاتے ہیں وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (الذاریات: ۲۱) اور اگر عقل بادشاہ ہو جاوے دل رعایا تو اسے حضرات انبیاء کرام کی ذات سے بھی معرفت نصیب نہیں ہوتی ان کو مان کر جان کر پہچان کر بھی مشرک ہی رہتا ہے بلکہ ان حضرات کو جو دلائل توحید ہیں دلائل شرک بنالیتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سارے انبیاء کرام لوگوں کو شرک وکفر سے

وہ حق تھا یہ باطل چیزیں ان لوگوں کی اپنی ملاوٹ کی وجہ سے ہیں۔ گویا پہلے دین میں ملاوٹ کا ذکر تھا اب ملاوٹ کرنے والوں کا پتہ دیا جارہا ہے۔ جرم کے بعد مجرموں کی نشان دہی ہورہی ہے۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیات میں یہود و نصاریٰ کے غلوفی الدین کا ذکر تھا اب فرمایا جارہا ہے کہ دین میں غلو حق بھی ہوتا ہے ناحق بھی حق غلو اچھا ہے۔ ناحق غلو برا ان لوگوں نے ناحق اور باطل غلو کیا ہے اس لئے یہ مجرم اور معتوب ہوئے ہیں۔ حق غلو کرنے والے ثواب پاتے ہیں گویا پہلے غلو کا ذکر تھا اب غلو کی تفسیر کا تذکرہ ہے۔

تفسیر قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ ، قل میں خطاب حضور نبی کریم ﷺ سے ہے رب تعالیٰ اکثر جگہ لوگوں کو اپنی بات حضور ﷺ کے ذریعہ سناتا ہے یعنی ہم تم سے فرماتے ہیں کہ تم لوگوں سے یہ کہہ دو اس واسطہ میں جو لذت اور لطف ہے وہ دل والوں پر مخفی نہیں رب تعالیٰ جس کو جو دیتا ہے جس سے جو کہتا ہے حضور کی معرفت دیتا اور کہتا ہے

لا و رب البیت جو جس کو ملا ان سے ملا بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی

یوں ہی ہم بھی رب تعالیٰ سے جو کہنا جو لینا چاہیں حضور ﷺ کی معرفت سے کہیں ان کے توسل سے لیں۔ حضور رب تعالیٰ کا دروازہ ہیں دروازہ کے راستہ اندر کی چیز باہر آتی ہے اور باہر کی چیز اندر جاتی ہے، لینا دینا دروازے سے ہی ہوتا ہے جب وہ رب بے نیاز غنی ہو کر حضور کے توسل سے ہم کو دیتا ہے تو ہم نیاز مند فقیر ہو کر حضور کے توسل سے بے نیاز کیسے ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم رب کو سجدہ کرنا چاہیں تو کعبہ کا توسل ضروری ہے کہ بغیر کعبہ کو سامنے لئے سجدہ رب کو نہ ہوگا یوں ہی کوئی عبادت کرنا چاہیں تو حضور کا توسل اختیار کریں در سے لینا چاہیں تو حضور کے واسطہ سے کہیں ورنہ عبادت نہ بنے گی اور رب نہ بنے گا۔ سایۂ دیوار نے دیوار سے کہا کہ تو درمیان سے ہٹ جاتا کہ میں سورج کو دیکھ لوں دیوار بولی کہ تیری ہستی مجھ سے قائم ہے اگر میں نہ رہوں تو تیرا وجود ہی ختم ہو جاوے حضور دیوار ہیں باقی سب حضور کا سایہ ہے کہ حضور سے قائم و باقی ہے بلکہ شریعت و طریقت حقیقت و معرفت حضور کے حالات ہیں جیسے سویرا، دوپہر، تیسرا پہر، شام، سردی، گرمی یہ سب سورج کے حالات ہیں کہ سورج مشرق میں ہے تو اس وقت کا نام سویرا ہے بیچ آسمان میں ہو اس وقت کا نام دوپہر مغرب میں ہو تو وقت کا نام شام ہے، افق سے اوپر ہو تو دن ہے افق سے نیچے ہو تو رات سیدھا گزرے تو گرمی کا موسم ہے کترا کر جاوے تو سردی ان اوقات اور موسموں کا خالق رب تعالیٰ ہے مگر ان کا واسطہ سورج یوں ہی شریعت و طریقت کا خالق رب تعالیٰ ہے مگر ان کا واسطہ حضور ہیں۔ قوی یہ ہے کہ اہل کتاب سے مراد دونوں قومیں ہیں یہودی عیسائی کیونکہ اس سے پہلے دونوں ہی کا ذکر ہو چکا ہے۔ بعض لوگوں نے صرف عیسائی مراد لیے ہیں مگر یہ قوی نہیں یہاں اہل کتاب فرما کر خطاب فرمانا عتاب کے لئے ہے جس میں اشارۃً فرمایا گیا کہ تم لوگوں کا کفر و شرک زیادہ عذاب کا باعث بنے کہ تمہارے پاس کتاب موجود ہے جس میں توحید کی تعلیم ہے پھر تم مشرک ہو تو سخت مجرم ہو مشرکین جاہل ہیں تم عالم ہو عالم کا گناہ جاہل کے گناہ سے زیادہ باعث عذاب ہے نیز تمہاری عرب میں عزت و حرمت ہے اگر تم مسلمان بن جاؤ تو تمہاری پیروی میں اور لوگ بھی مسلمان ہو جاویں گے لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ۔ لَا تَغْلُوْا بنا

کے تابع ہو جاوے تو شیطانی ہے اگر دل کے تابع ہو جاوے تو یزدانی رحمانی ہے۔ نفس کی خواہش کو ہوای کہا جاتا ہے۔ دل کی سچی خواہش ہدیٰ یعنی ہدایت ہے۔ **قَوْمٍ** سے مراد انہی یہود ونصاریٰ کے باپ دادے ہیں جو حضور ﷺ کے زمانہ پاک سے پہلے ہوئے۔ **قَبْلُ** سے مراد زمانہ مصطفوی سے پہلے کا وقت ہے **وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا** یہ عبارت **قَوْمٍ** کی دوسری صفت ہے **قَدْ ضَلُّوْا** اس کی پہلی صفت تھی۔ ضلال کے معنی ہیں خود گمراہ ہونا اضلال کے معنی ہیں دوسرے کو گمراہ کرنا **كَثِيْرًا** یا تو اضلالا پوشیدہ کی صفت ہو کر **اَضَلُّوْا** کا مفعول مطلق ہے یا **اَضَلُّوْا** کا مفعول بہ یعنی وہ قوم جن کی تم پیروی کر رہے ہو یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بہت گمراہ کیا یا بہت کو گمراہ کیا۔ **وَضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ**۔ یہ **قَوْمٍ** کی تیسری صفت ہے اس گمراہی سے مراد ہے حضور ﷺ کے زمانہ پاک میں بھی گمراہ رہنا ہے۔ **سَوَآءِ السَّبِيْلِ** سے مراد یا توحید الٰہی ہے یا دین اسلام صراط، سبیل، طریق کا فرق بارہا بیان ہو چکا ہے بہر حال پہلی گمراہی سے مراد ہے۔ حضور ﷺ سے پہلے زمانوں میں گمراہ ہونا اور اس گمراہی سے مراد ہے۔ اس زمانہ مصطفوی میں گمراہ رہنا جب کہ ہدایت کا سورج چمک رہا ہے یا پہلی گمراہی سے مراد ہے گمراہی کے عقیدے اختیار کرنا اور اس گمراہی سے مراد ہے اپنی اس گمراہی میں گمراہی رہنا یعنی اسے گمراہی نہ جاننا بلکہ ہدایت سمجھنا یا پہلی گمراہی سے مراد ہے دین سے گمراہی اور اس گمراہی سے مراد ہے جنت کی راہ سے گمراہی (تفسیر کبیر) یا پہلی گمراہی سے مراد ہے۔ عقلی گمراہی اور اس گمراہی سے مراد ہے شرعی گمراہی یا یہاں **ضَلُّوْا** کا فاعل **كَثِيْرًا** ہے اور پہلے **ضَلُّوْا** کا فاعل قوم تھی بہر حال آیت میں تکرار نہیں (روح المعانی)

خلاصہ تفسیر

اے محبوب! ﷺ آپ یہود ونصاریٰ کی بدعقیدگیاں سن چکے اب آپ ان دونوں سے فرمادو کہ تم لوگ اپنے دین میں ناحق باطل زیادتیاں نہ کرو تمہیں تمہارے نبیوں نے کیا سکھایا تھا تمہاری کتابوں نے کیا بتایا تھا اور تم نے کیا بنا ڈالا خیال رکھو کہ تم اپنے ان اگلوں کی خواہشات نفسانیہ کی پیروی نہ کرو جو خود بھی بہکے ہوئے تھے اور بہت سوں کو بہکا دیا اور وہ اب بھی سیدھے راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں ایسوں کی پیروی تم کو گمراہ ہی کرے گی۔ **خیال رهے** کہ یہاں قرآن کریم میں کتابیوں کو الزام دیا کہ تمہارے پیشواؤں نے تمہارا یہ دین بنایا، مشرکوں کو دیکھ کر اور تم ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چل پڑے اب بعض حق گو عیسائی دبی زبان سے کبھی کہہ بیٹھتے ہیں کہ مقدس پولوس نے یونانی بت پرستی کی تقلید میں یہ دین بنایا تھا۔ دیکھو کتاب از بلا۔ یہ بھی حضور ﷺ کی حقانیت کی کھلی دلیل ہے کہ حضور نے ان کے وہ خفیہ راز اور سربستہ حقیقت کھول دی جسے دنیا والوں سے چھپایا گیا تھا۔ یہ آیت کریمہ حضور ﷺ اور قرآن کریم کی حقانیت کی کھلی دلیل ہے۔ **خیال رهے** کہ فطرت انسانی یہ ہے کہ انسان جس کی صحبت اختیار کرتا ہے اس سے اسے محبت ہو جاتی ہے۔ یوں ہی جس کا ذکر خیر زیادہ کرتا ہے اس سے بھی اسے الفت ہو جاتی ہے۔ یوں ہی جس کے چال چلن اختیار کرتا ہے اس کی محبت اس کے دل میں آ جاتی ہے اس لئے قرآن کریم نے ہم کو اچھوں کی صحبت میں رہنے اچھوں کا چرچا کرنے ان کا ذکر کرنے اچھوں کے طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اچھوں اور بروں کی صحبت ان کے ذکر خیر ان کی چال چلن اختیار کرنے سے روکا تا کہ

برائی اس کی گفتار یا اس کے نسب یا خاندان سے معلوم نہیں ہوتی بلکہ خود اس کے اپنے کردار اور اس کے ساتھیوں کے طور اطوار سے معلوم ہوتی ہے اسے **ضَلُّوْا وَ اَضَلُّوْا** نے بیان فرمایا۔ یہ فائدہ **وَ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا** الخ سے حاصل ہوا۔ یوں ہی ہادی پیشواؤں کی پہچان یہ ہے کہ ان کے پیرو کار نیک و صالح بندے بن گئے ہوں۔ پھل سے درخت کو پہچانو حضور امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ وہ پیشوا دین ہیں کہ آج نوے فی صدی اولیاء اللہ حنفی ہیں اور حنفی فقہاء، مجتہدین، صالحین کی تو شمار نہیں۔ یوں ہی باقی تینوں امام حضرت امام شافعی، مالکی، حنبلی ان کے متبعین میں بڑے بڑے اولیاء علماء صالحین پائے جاتے ہیں مگر جو ان سب کی تقلید سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ان میں نہ کوئی ولی ہے نہ کوئی صحیح عالم دین۔ ان پھلوں کو دیکھ کر شاخوں کا پتہ لگاؤ اور شاخوں سے جڑ کا۔

لطیفہ: کسی شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ کیا امام ابوحنیفہ جولا ہے تھے (کپڑا بننے والے) انہوں نے جواب دیا کہ آپ کپڑے کے تاجر تھے اور ہاں انہوں نے ایسے معرفت کا تھان بنا جس میں جہان بھر کے علماء، اولیاء اللہ کو لے لیا۔ کون سا محدث، مفسر، مجتہد، ولی ہے جس کو حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کے دروازے سے ٹکڑا نہ ملا ہو۔ **ساتواں فائدہ:** جسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آستانہ سے ہدایت نہ ملی اسے کسی جگہ سے ہدایت نہیں مل سکتی۔ یہ فائدہ دوسرے **ضَلُّوْا** سے حاصل ہوا خلاصہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اس جگہ یہود و نصاریٰ کی بدکاریاں تین طرح بیان فرمائیں ایک ان کے اپنے کردار دکھا کر کہ یہ لوگ بت پرست، شہوت پرست، لالچی، حرام خور ہیں، کتاب اللہ کے بگاڑنے والے ہیں۔ اسے پہلے **ضَلُّوْا** میں بیان کیا۔ دوسرے ان کے ساتھیوں کی بدکاریاں بتا کر **وَ اَضَلُّوْا** تیسرے ان کے حضور کے آستانہ سے محرومی دکھا کر کہ یہ لوگ یہاں رہ کر بھی گمراہ رہے۔ لہٰذا اگر حضور کی عظمت دیکھنا ہو تو حضور کے کردار شریف کو دیکھو ان کے یاروں ساتھیوں کو دیکھو بلکہ اگر خدا تعالیٰ کی شان دیکھنا ہو تو حضور کی شان حضرات انبیاء و اولیاء کی شان دیکھو۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: تم نے کہا کہ غلو حق بھی ہوتا ہے اور ناحق بھی حق غلو اچھا ہے اور ناحق غلو برا یہ کیسے ہو سکتا ہے جو شئی حد سے بڑھے گی وہ ناحق ہی ہو گی یوں ہی درمیانی راہ چھوڑنا افراط و تفریط میں پڑنا کیسے حق ہو سکتا ہے۔ درمیانی راہ حق ہے اس سے ہٹنا کی زیادتی میں پڑنا باطل ہے۔ **جواب:** غلو کی یہ دو قسمیں ہم نے نہیں کیں خود قرآن کریم نے کر دیں کہ فرمایا **لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ** اس کے متعلق تفاسیر کی عبارتیں تفسیر میں پیش کر دی گئیں غلو کے چار معنی عرض کیے ہیں ایک معنی زیادتی بھی ہیں واقعی دین میں زیادتی حق بھی ہوتی ہے ناحق بھی۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کرے اسے اپنا اور اس طریقہ پر چلنے والوں کا ثواب ملے گا۔ ہماری زندگی غلو پر موقوف ہے ہم ماں کے پیٹ سے ننگے بدن، بے ختنہ بڑے بال بڑے ناخن والے پیدا ہوتے ہیں پھر پیدا ہوتے ہی لباس پہنتے ہیں، بال ناخن کٹواتے ہیں یہ ہے غلو جس پر پیدائش سے عمل ہو رہا ہے غلو کی دینی مثالیں ابھی ہم تفسیر میں عرض کر چکے ہیں۔

مسائل گویا اس درخت کے برگ و بار پھل پھول وغیرہ ہیں۔ ان میں زیادتی تا قیامت ہوتی ہی رہے گی۔ اسی زیادتی کا نام ہے غلو برحق کتابیوں نے اصل توحید و نبوت میں غلو کیا کافر ہو گئے۔ مسلمانوں نے فروعی مسائل میں غلو یعنی زیادتی کے حالات زمانہ کے لحاظ سے وہ مومن رہے غرضکہ غلو فی الدین اور ہے غلو للدین کچھ اور انہوں نے غلو فی الدین کیا تھا ہمارے ہاں غلو للدین ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ جو شخص پردیس میں کمانے گیا اس کی کمائی کی جگہ پردیس ہے اور کمائی سے نفع اٹھانے کی جگہ اپنا دیس ہے اس کو چاہیے کہ پردیس میں تین باتوں کا خیال رکھے کمانے سے غافل نہ رہے، کمائی سنبھال کر رکھے برباد نہ کردے، کمائی بخیریت اپنے وطن پہنچائے اگر ان تین چیزوں میں سے ایک میں لاپرواہی کی تو آخر روئے گا۔ دنیا ہماری کمائی کی جگہ ہے یعنی پردیس۔ آخرت ہماری کمائی برتنے کی جگہ ہے یعنی وطن یہاں اعمال کمالو پھر کمائے ہوئے اعمال سنبھالو پھر انہیں خیریت سے اپنے وطن پہنچاؤ۔ وطن پہنچانے والی بیمہ کمپنیاں دو قسم کی ہیں لمیٹڈ (رجسٹرڈ) جن کی ذمہ دار حکومت ہے اور غیر لمیٹڈ دیسی۔ خدا کے لئے اپنی کمائی کسی لمیٹڈ کمپنی کے حوالہ کر وان کی حفاظت میں بھیجو۔ دنیا میں اکیلے نہ رہو ورنہ شکار ہو جاؤ گے۔ مسلمانوں کی جماعت میں رہو، پیشوا اختیار کرو۔ پیشوا دو قسم کے ہیں واصل اور فاصل۔ واصل پیشوا کی پیروی واصل بنادے گی اور فاصل یعنی حق سے دور پیشوا کی پیروی گمراہ کردے گی۔ اہل کتاب نے فاصلین کی پیروی کی گمراہ ہوئے۔ مؤمنین واصلین کی پیروی کرتے ہیں ہدایت یافتہ ہیں واصل اپنے کو نیست کر کے ہست ہو جاتا ہے اور فاصل اپنی انا باقی رکھتا ہے لہٰذا فنا ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

کار گاہ گنج حق در نیستی است   غرۂ ہستی چہ دانی نیست چیست
آب کوزہ چوں در آب جو شود!   محو گردد در وے و جو او شود!

بارگاہِ الٰہی میں نیستی بقا کا راز ہے۔ کوزے کا پانی سمندر میں جا کر سمندر بن جاتا ہے کہ اپنے کو فنا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اہل کتاب مغضوب علیہم بھی ہیں اور ضالین بھی کہ یہ بحر توحید میں فنا نہ ہوئے۔ مومن مرحوم ہیں کہ رحمت کے سمندر میں فنا ہو چکے ہیں۔ اس لئے کتابیوں سے فرمایا گیا کہ غلو ناحق نہ کرو اور فاصلین کی پیروی نہ کرو۔ یہ دنیا وہ جنکشن ہے جہاں سینکڑوں پلیٹ فارم ہیں ہر پلیٹ فارم سے گاڑیاں مختلف مقامات کو جا رہی ہیں۔ دیکھنے میں تمام گاڑیوں کی شکل یکساں ہے مگر ان کے رخ مختلف ہیں تم اس گاڑی میں سوار ہو جس کا رخ مدینہ منورہ کی طرف ہے جو وہاں پہنچائے یہ گاڑی حضرات اولیاء کے آستانوں پر ملتی ہے ان کے آستانے اس گاڑی کے پلیٹ فارم ہیں۔ بنی اسرائیل غلط پلیٹ فارم سے غلط گاڑی میں سوار ہو گئے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ

پھٹکارے گئے وہ لوگ جو کافر ہوئے اولاد یعقوب میں سے اوپر زبان

لعنت کئے گئے وہ جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل میں

تفسیر

لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ لُعِنَ بنا ہے لعنت سے بمعنی رحمت سے دوری اگر اس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں رحمت سے دور کرنا اور اگر اس کا فاعل بندے ہوں تو اس کے معنی ہوتے ہیں رحمت سے دوری کی بددعا کرنا یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں اگر ان پر لعنت فرمانے والا رب تعالیٰ ہے تو پہلے معنی مراد ہیں اور اگر اس کا فاعل حضرت داؤد و عیسیٰ علیہما السلام ہیں تو اس کے معنی دوسرے ہیں۔ **خیال رهے** کہ اجرت، نعمت (انعام) رحمت کے فرق بار ہا بیان ہو چکے ہیں۔ سزا، تادیب اور لعنت میں فرق یہ ہے کہ سزا و تادیب اصلاح کے لئے ہوتی ہے مگر لعنت اس کو تباہ کرنے کے لئے۔ ماں باپ استاذ کسی قصور پر بچہ کو طمانچہ لگائیں جرمانہ کریں یہ تادیب و سزا ہے لیکن ماں باپ کا بچہ کو عاق کر کے نکال دینا استاذ کا مدرسے سے ہمیشہ کے لئے نکال دینا یہ ہے پھٹکار مسلمانوں پر ان کے گناہوں کی وجہ سے تکالیف آ جانا سزا یا تادیب ہے مگر کفار پر رحمت کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دینا یہ ہے لعنت اخروی۔ رحمتیں، ایمان پر خاتمہ، قبر کے امتحان میں کامیابی، حشر میں گناہوں کی بخشش صراط سے آسانی سے گزر جانا ہیں اور دنیا میں رحمت نیک اعمال کی توفیق، دل کی نرمی، اچھوں سے الفت ان کی ہمراہی وغیرہ ہیں ان سے محرومی اللہ کی لعنت ہے۔ رہا زیادہ مال، اولاد، دنیاوی عزت، حکومت وغیرہ یہ اگر یار تک پہنچا دیں رحمت ہیں اگر وہاں سے ہٹا دیں تو لعنت ان چیزوں سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ چونکہ حضرت داؤد و عیسیٰ علیہما السلام کے زمانوں میں سارے بنی اسرائیل کافر نہ تھے ان میں سے بعض حضرات سچے پکے مسلمان بھی تھے اس لئے الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فرمایا اور من تبعیضیہ ارشاد ہوا یعنی بنی اسرائیل میں سے کافر اسرائیلیوں پر اللہ نے یا ان نبیوں نے لعنت فرمائی تھی كَفَرُوْا میں ہر طرح کے کفار مراد ہیں خواہ کسی قسم کا کفر کریں۔ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ علیٰ حرف جار متعلق ہے۔ لُعِنَ کے یعنی اس لعنت کا ظہور ان نبیوں کی زبان پر ہوا لِسَانِ اس خاص عضو کو بھی کہتے ہیں جس سے بولا جاتا ہے یعنی زبان اور لسان لغت کو بھی کہا جاتا ہے کہتے ہیں کہ ہماری زبان عربی ہے یعنی ہماری لغت عربی ہے لِسَانِ اسم جنس ہے جو ایک اور زیادہ پر بولی جاتی ہے اس لئے یہاں دو نبیوں کے لئے لِسَانِ واحد ہی لائی گئی یہاں لِسَانِ سے یا تو پہلے معنی مراد ہیں یعنی منہ کی زبان۔ ان کی بددعائیں یا دوسرے معنی مراد ہیں یعنی ان نبیوں کی بولیوں ان کی کتابوں زبور اور انجیل میں ان پر لعنت کی گئی۔ حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایلہ بستی کے باشندے یہود تھے ان کے دین میں ہفتہ کے دن شکار حرام تھا۔ ان لوگوں نے زمانہ داؤدی میں حیلہ سے ہفتہ کو شکار کر لیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان پر بددعا کی کہ خدایا انہیں بندر بنا دے۔ چنانچہ وہ سب کے سب بندر بنا دیئے گئے یہ ہے زبان داؤدی میں ان پر لعنت۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِىٕیْنَ (بقرہ: ٦٥) ان شاء اللہ یہ واقعہ سورۂ اعراف میں آوے گا یہ لوگ پانچ ہزار تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسرائیلوں نے جناب مسیح سے دعا کرائی کہ ہم پر غیبی دسترخوان آوے آپ کی دعا سے آیا اس میں سے انہوں نے کھایا اور بچایا مگر ایمان نہ لائے۔ تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بددعا کی کہ الٰہی انہیں مسخ کر دے جیسے زمانہ داؤدی میں مسخ کیے گئے چنانچہ یہ تمام سور بنا دیئے گئے یہ واقعہ بھی انشاء اللہ آئندہ بیان ہوگا یہ لوگ یا تو تین سو

کرتے اسے یہ برا نہ کہتے تھے۔ غرضکہ اس جملہ کی بہت سی تفسیریں ہیں۔ بعض مفسرین نے اس آیت کو مشکل ترین فرمایا ہے کیونکہ جرم کر چکنے کے بعد اس سے نہیں منع کیا جاتا بلکہ پہلے ہی منع کیا جاتا ہے اور یہاں فعلوا ماضی ہے فقیر کی ان تفسیروں سے یہ اشکال دور ہو گیا لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ اس جملہ میں ان مذکورہ تینوں جرموں کی قباحت کا ذکر ہے ما سے مراد یہ تینوں جرم ہیں۔ كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ فرما کر بتایا کہ وہ نبی اسرائیل ان جرموں کے عادی ہو چکے تھے۔ ایک آدھ بار یہ جرم ان سے سرزد نہیں ہوئے بلکہ وہ ہمیشہ عمداً یہ سب کچھ کرتے رہتے یعنی ان کی یہ نافرمانیاں، حد سے بڑھتے رہنا، برائیوں سے نہ رکنا یا نہ روکنا بہت ہی برے جرم ہیں جو وہ ہمیشہ کرتے رہتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب! ﷺ یہ اسرائیلی اپنی اولاد انبیاء ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر حالت ان کی یہ ہے کہ ان میں سے کفار اسرائیلیوں پر حضرت داؤد اور حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم کی دو بار بددعا ہوئی اور یہ لوگ ان کی بددعاؤں سے دو بار عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے زمانہ داؤدی میں اپنے دینی قانون کو توڑتے ہوئے ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار کیا تو انہوں نے ان پر لعنت کی جس سے یہ لوگ بندر بنا دیئے گئے پھر انہی مقدس و پاکباز بننے والوں نے زمانہ مسیحی میں خود ہی غیبی قدرتی دستر خوان مانگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے وہ آیا انہوں نے اس میں سے کھایا مگر رہے بے ایمان ان میں سے کوئی ایمان نہ لایا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بددعا فرمائی جس سے یہ لوگ سؤر بن گئے ان کی یہ تمام دلیریاں اس لئے ہیں کہ یہ لوگ حضرات انبیاء کرام کے نافرمان ہیں اور حد سے آگے بڑھتے رہے، حدود توڑتے رہنے کے عادی۔ ان کی حالت یہ تھی کہ یہ جو جرم ایک بار کر لیتے اس کو بار بار کرنے سے باز نہ آتے تھے یعنی بجائے توبہ کرنے کے جرم کے عادی بن جاتے تھے یا جو جرم ان کی قوم میں پھیل جاتا اسے روکتے نہ تھے ان کے یہ تمام مذکورہ گناہ بہت ہی برے ہیں۔ اب اگر یہ لوگ آپ کی نافرمانی کریں تو ان سے کیا بعید ہے۔

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** بزرگوں کی بددعا بڑی ہی خطرناک ہے، اس سے قومیں تباہ ہو گئیں۔ عذاب الٰہی ہمیشہ اللہ والوں کی بددعا سے آئے۔ یہ فائدہ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ سے حاصل ہوا۔ مولانا فرماتے ہیں

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد تا دل صاحبدلے نہ آمد بہ درد

دوسرا فائدہ: حضور ﷺ رحمت عالم ہیں۔ دیکھو اسرائیلیوں پر ایک ایک گناہ سے عذاب آگئے ہم ہزار ہا گناہ کرتے ہیں عذاب نہیں آتا۔ یہ فائدہ بِمَا عَصَوْا الخ سے حاصل ہوا۔ ہم عین جمعہ کی نماز کے وقت تارک نماز بنے بیٹھے رہتے ہیں۔، دوکانداریاں کرتے رہتے ہیں۔ عذاب نہیں آتا بلکہ خود یہ یہودی بھی ہفتہ کے دن شکار کر لیتے ہیں مگر عذاب نہیں آتا کیونکہ اب رحمت والے شہنشاہ کا راج ہے۔ رب فرماتا ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (انفال: ۳۳) **تیسرا فائدہ:** حضور ﷺ کے صحابہ تمام نبیوں کے ساتھیوں سے افضل ہیں۔ دیکھو یہ دونوں فرقے امتحانوں میں فیل ہوئے۔

سے بیان کیا یا عَصَوْا سے مراد نبی کی وہ نافرمانی جس پر ان نبی نے بددعا کی وہ نافرمانی ایک بار ہی ہوتی اور كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ سے ان کی نافرمانیاں مراد ہیں جو وہ رب تعالیٰ کی کرتے تھے۔

دوسرا اعتراض: کافر اسرائیلیوں پر لعنت ہمیشہ سب کی طرف سے ہوتی ہی رہے گی پھر لُعِنَ ماضی مطلق کیوں ارشاد ہوا اور عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ کیوں ارشاد ہوا یعنی عام لعنت کو خاص کیوں کر دیا گیا؟ **جواب:** یہاں لعنت سے مراد صرف زبانی لعنت نہیں بلکہ عذاب الٰہی کا نزول مراد ہے وہ ان پر ایک ہی بار ہوا کہ وہ ایک ہی بار بندر بنے اور ایک ہی بار سور بنے اس لئے ماضی مطلق فرمانا نہایت موزوں ہے نیز ان پر یہ لعنت ان دو نبیوں کی بددعا سے ہوئی نیز یہ لوگ ان نبیوں کو اپنا نبی مانتے ہیں ان کے اولاد ہونے پر فخر کرتے ہیں اس لئے ان دو حضرات کا ذکر خصوصیت سے فرمایا گیا کہ بدنصیبو! تم تو ان کی اولاد ہونے پر فخر کرتے ہو اور وہ تم پر لعنت کر کے تمہارا بیڑا غرق کر گئے، تم تو ان کے پھٹکارے ہوئے ہو۔

تیسرا اعتراض: اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوا کہ لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ یعنی جو گناہ وہ کر چکے تھے اس سے منع نہ کرتے تھے۔ کیے ہوئے گناہ سے کیسے منع کیا جا سکتا ہے۔ ہمیشہ منع کرنا آئندہ گناہ سے ہوتا ہے کیے گناہ سے توبہ ہوتی ہے نہ کہ ممانعت وہ گناہ ہو تو چکا پھر یہ فرمانا کیونکر درست ہوا؟ **جواب:** مفسرین نے اس اعتراض کو بہت مشکل فرمایا اور اس کے بہت جوابات دیئے ہیں ہم نے نہایت آسان جواب ابھی تفسیر میں عرض کر دیئے کہ یا تو عن کے بعد **معاودہ پوشیدہ** ہے یا منع نہ کرنے سے مراد ہے اسے برا نہ کہنا اور آئندہ کو نہ روکنا یا فَعَلُوْهُ میں ہ سے مراد ہے جنسی گناہ افراد گناہ مراد نہیں لہٰذا آیت واضح ہے۔

چوتھا اعتراض: جس بستی پر عذاب الٰہی آیا وہاں سے پہلے نبی اور مومنین نکال دیئے گئے یہ قانون قدرت ہے پھر یہ بندر سور بننے کا عذاب انہی بستیوں میں آ گیا جہاں نبی موجود تھے اس کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** عذاب الٰہی تین قسم کے آئے عذاب خاص یعنی بستی کے کچھ لوگوں پر عذاب عام یعنی عام بستی والوں پر کہ وہاں کے سارے باشندے ہلاک کر دیئے گئے۔ عذاب عام انعام کہ وہاں کے سارے باشندے بھی ہلاک کر دیئے گئے اور بستی بھی اجاڑ دی گئی آخری دو قسم کے عذابوں میں حضرات انبیاء کرام اور مومنین اس جگہ سے نکال دیئے جاتے تھے۔ پہلے خاص عذاب میں یہ نہ ہوتا تھا۔ یہ دونوں عذاب پہلی قسم کے تھے کہ خاص لوگوں پر آئے۔

تفسیر صوفیانہ

اللہ کے مقبول بندے اس کے خلیفہ اور نائب ہیں۔ اس کی صفات مہر و قہر کے مظہر کسی کو ان کا قبول کر لینا رب تعالیٰ کا قبول ہے، ان کا رد کر دینا رب تعالیٰ کا رد فرما دینا ہے۔ ان کی لعنت اللہ کی لعنت ہے اور ان کی رحمت اللہ کی رحمت ہے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب سے فرماتا ہے: اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (توبہ: ۱۰۳) دوسری جگہ فرماتا ہے: هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ (احزاب: ۴۳) معلوم ہوا کہ حضور کی صلوٰۃ (رحمت) اللہ کی صلوٰۃ ہے۔ حضرت داؤد و عیسیٰ علیہما السلام کی زبانیں لعنت الٰہی کا مظہر تھیں حقیقۃً لعنت رب کی تھی اس لئے یہاں ارشاد ہوا عَلٰى لِسَانِ

طرف اترا تو کافروں سے دوستی نہ کرتے مگر ان میں بہتیرے فاسق ہیں

تعلقات اس آیت کریمہ کا گزشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: پچھلی آیتوں میں گزشتہ اسرائیلیوں کی بدکاریوں کا ذکر تھا اب ان آیات میں موجودہ بنی اسرائیل کی بدعملیوں کا تذکرہ ہے تا کہ معلوم ہو کہ یہ سارے کے سارے یکساں ہیں۔ **دوسرا تعلق**: پچھلی آیات میں اشاد ہوا تھا کہ اسرائیل خود اپنے مانے ہوئے نبیوں کے پھٹکارے ہوئے ہیں اب ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ آپ کے اور مسلمانوں کے بھی سخت دشمن ہیں۔ نبی کی دشمنی ان کے خمیر میں پڑی ہوئی ہے۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیات میں اسرائیلیوں کی دشمنی انبیاء کا تذکرہ تھا اب ان آیات میں ان کی دوستی مشرکین کا ذکر ہے یعنی وہ لوگ نبیوں مسلمانوں کے تو دشمن ہیں۔ دوست ہیں تو کس کے مشرکین، بت پرستوں اور کفار کے۔ گویا ان کے ایک عیب کے بعد دوسرے عیب کا ذکر ہے۔ **چوتھا تعلق**: پچھلی آیات میں ارشاد ہوا تھا۔ یہود کے پوپ پادری لوگوں کو برائیوں سے نہیں روکتے یا خود گناہوں سے نہیں بچتے اب اس کی وجہ بتائی جا رہی ہے کہ ان کے دلوں میں کفار مشرکین، بت پرستوں سے محبت ہے پھر یہ برائیوں سے کیسے بچیں گویا پچھلی آیات میں ان کی دلی بیماری عداوت انبیاء کا ذکر بھی تھا اور اس بیماری کی وجہ یعنی گناہوں میں مشغولیت کا ذکر بھی اور اب اس وجہ کا ذکر ہے یعنی محبت کفار۔ جیسے کہا جاوے کہ فلاں کو بخار ہے کیونکہ اسے زکام ہے اور زکام اس لئے کہ اس نے سردی سے احتیاط نہ کی۔

شان نزول مدینہ منورہ کے کھلے یہود کعب ابن اشرف اور اس کے ساتھی اور وہاں کے چھپے یہودی یعنی منافقین جو درحقیقت کافر تھے بظاہر کلمہ پڑھ کر اپنے کو مسلمان کہتے تھے جب ان لوگوں نے اسلام کی ترقی دیکھی تو جل گئے۔ خفیہ طور پر مکہ معظمہ پہنچے مشرکین مکہ خصوصاً ابوسفیان وغیرہ سے ملے اور ان سب کو مسلمان سے سخت جنگ کرنے پر ابھارا کہ سارے کفار مل کر مسلمانوں پر حملہ کرو ہم یہود مدینہ تمہاری پوری پوری مدد کریں گے مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہوئے۔ یہ آیت کریمہ اس کے متعلق نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ اگرچہ یہ لوگ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوئے مگر اس حرکت سے ان کے دلوں کا پتہ تو لگ ہی گیا کہ ان کے دلوں میں حضور آپ کی اور مسلمانوں کی عداوت کی آگ کیسی بھڑک رہی ہے (تفسیر خازن، روح المعانی وغیرہ)۔

تفسیر تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ۔ تَرٰى رویت سے بنا ہے بمعنی دیکھنا یہ دیکھنا آنکھ کا ہو تو ایک مفعول چاہتا ہے اور اگر دیکھنا دل کا ہو تو دو مفعول چاہتا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ آنکھ کا دیکھنا مراد ہے اور اس میں حضور ﷺ سے خطاب ہے اگرچہ یہ اسرائیلی یہودی نہایت خفیہ طور پر مکہ معظمہ میں سازش کرنے گئے تھے اور انہوں نے اس سفارش کے چھپانے کی بہت کوشش کی تھی مگر چونکہ حضور ﷺ کی نگاہ غیب میں ہر کھلی چھپی چیز کو دیکھ لیتی ہے اس لئے ارشاد ہوا نیز حضور کی نگاہ دلوں کے راز، سینوں کے بھیدوں، ارادوں، خطرات سب کو ہی ملاحظہ فرماتی ہے اسی لئے تَرٰى ارشاد ہوا کہ آپ ان کی محبت کفار کو دیکھ رہے ہیں اگرچہ محبت و نفرت آنکھ سے دیکھنے میں نہیں آیا کرتی نیز چونکہ حضور انور کی نگاہ گزشتہ آئندہ چیزوں کو

کے متعلق فرماتا ہے کہ یہ گناہ محض گناہ نہیں بلکہ حکومت الہیہ سے غداری ہے اور کفر کی علامت بھی جو گناہ کفر کی علامت ہو وہ کفر ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَ لَوْ كَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِیِّ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ۔ اس عبارت میں ان یہودیوں یا منافقوں کے دعوی ایمان کی تردید ہے۔ اگر روئے سخن کھلے یہود سے ہے تو النَّبِیِّ سے مراد وہ نبی ہیں۔ جن کے امتی ہونے کا یہ لوگ دعوی کرتے ہیں یعنی موسیٰ علیہ السلام اور مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب توریت شریف، ان کے صحیفے، ان کے معجزات اور ان کے فرمان عالیہ ہیں اور اگر منافقین کی طرف توجہ غضب ہے تو النَّبِیِّ سے مراد حضور ﷺ ہیں اور مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ سے مراد قرآن مجید اور حضور کے معجزات، آپ کے ارشادات عالیہ ہیں چونکہ مسلمانوں کو قرآن مجید، حضور کے فرمان، احکام سب ہی پر ایمان لانا ضروری ہے، صرف قرآن کا مان لینا کافی نہیں نیز قرآن مجید کو بھی اس لئے ماننا ضروری ہے کہ وہ حضور پر اترا حضور نے اس کے ماننے کا حکم دیا۔ اس لئے و القرآن نہ فرمایا بلکہ اتنی دراز عبارت فرمائی وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ منافقین اپنے کو مسلمان کہتے تھے۔ حضور ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان لانے کے دعوے دار تھے اس لئے ان کی تردید اس طرح فرمائی یہ پورا جملہ شرط ہے۔ جزا اس کی یہ ہے کہ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ یہاں بھی اتخذوا کا فاعل یا کھلے یہودی یا منافقین ہیں اور هُمْ کا مرجع مشرکین عرب اور کفار مکہ ہیں اَوْلِیَآءَ ولی کی جمع ہے بمعنی قریب یا دوست یا مددگار ظاہر یہ ہے کہ یہاں بمعنی دوست ہے اس کی پوری تحقیق پہلے بھی کی جا چکی ہے اور انشاء اللہ گیارہویں پارہ میں بھی کی جاوے گی کہ ولایت کتنی قسم کی ہے اور ہر قسم کے احکام کیا ہیں یعنی اگر یہود اللہ تعالیٰ اور اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام اور ان کی کتاب توریت ان کے صحیفے وغیرہ پر ایمان رکھتے ہوتے تو وہ مشرکین کو دوست نہ بناتے کیونکہ توریت میں بھی مشرکین کی دوستی سے ممانعت ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں بھی یا اگر یہ منافقین اللہ تعالیٰ، حضور ﷺ قرآن و فرمان مصطفوی پر ایمان رکھتے ہوتے تو مشرکوں سے یارانہ نہ گانٹھتے کیونکہ اسلام میں کفار کو دوست بنانا سخت جرم ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ (آل عمران: ۲۸) وَ لٰكِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ اس عبارت میں ان کے کفر و فسق کا ثبوت ہے چونکہ پچھلی عبارت میں ارشاد ہوتا تھا کہ وہ مومن نہیں تو شاید کوئی وہم کرتا کہ وہ کافر بھی نہیں ہیں بلکہ مومن و کافر کے درمیان کچھ اور ہی فرقہ ہو اس وہم کو دور فرمانے کے لئے یہ ارشاد ہوا لہٰذا لٰكِنَّ فرمانا بالکل درست ہے مِّنْهُمْ کا مرجع اگر یہ ہی مشرکین سے دوستی کرنے والے یہودی اور منافقین ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے کچھ لوگ تو اس جرم سے توبہ کر کے مخلص مسلمان بن جائیں گے اور اکثر لوگ کافر ہی رہیں گے یا یہ مطلب ہے کہ ان میں سے بعض محض دنیاوی تعلقات آپس کی رشتہ داریوں کی وجہ سے ان سے محبت کرتے ہیں مگر اکثر لوگ آپ کی عداوت میں ان سے محبت کرتے ہیں۔ یہ آخری لوگ فاسق و کافر ہیں اور اگر مِّنْهُمْ کا مرجع سارے یہودی و منافقین ہیں تو معنی بالکل ظاہر ہیں کہ ان یہود و منافقین میں سے کچھ ایمان بھی قبول کر لیں گے مگر اکثر لوگ عند اللہ فاسق و کافر ہیں۔ خیال رھے کہ فسق کے تین درجہ ہیں۔ تغابی، انہماک، جحود مسلمان کا کبھی کبھی گناہ کر لینا فسق تغابی ہے ہمیشہ گناہ میں مشغول رہنا فسق انہماک ہے دل سے گناہوں کو اچھا سمجھ کر کافر ہو جانا فسق جحود یہاں یہ

دوستی رکھنا سخت جرم ہے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی ناراضی کا باعث ہے۔ ان سے قومی دوستی حرام ہے مذہبی دوستی کفر اور اللہ رسول کے مقابلہ میں مسلمانوں کو تباہ کرانے کے لئے ان سے دوستی بدترین کفر ہے اور عذاب الٰہی کا باعث افسوس! مسلمان یہ سبق بھول جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال اسی کو بہت روئے ہیں کہتے ہیں

جعفر از بنگال صادق از دکن   ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن
کے شب ہندوستاں آید بروز   مرد جعفر روح او زندہ ہنوز

ہماری قوم میں ایسے منافقوں کی اب بھی کمی نہیں۔ **تیسرا فائدہ:** انسان کو چاہیے کہ جتنا دنیا میں رہنا ہے اتنی یہاں کی فکر کرے اور جس قدر آخرت میں رہنا ہے، اتنی فکر وہاں کی کرے۔ بدنصیب ہے وہ جو دنیا میں پھنس کر آخرت کو بھول جائے وہاں کا توشہ ساتھ نہ لے۔ یہ فائدہ لَبِئْسَ مَاقَدَّمَتْ الخ سے حاصل ہوا۔

توشۂ اعمال اپنا ساتھ لے جاؤ اجی   کون پیچھے قبر میں بھیجے گا سوچو تو سہی
بعد مرنے کے تمہیں اپنا پرایا بھول جائے   فاتحہ کو قبر پر پھر کوئی آئے یا نہ آئے

چوتھا فائدہ: دوزخ میں ہیشگی صرف کفار کے لئے ہے۔ مسلمان گناہ گار دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ یہ فائدہ هُمْ خٰلِدُوْنَ کے حصر سے حاصل ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** نبی کا منکر خدا تعالیٰ کا مومن کبھی نہیں ہوسکتا اگرچہ خدا پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرے۔ یہ فائدہ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ الخ سے حاصل ہوا دیکھو وہ یہود بھی اللہ تعالیٰ کے انکاری نہ تھے اور منافقین بھی یہ دونوں حضور ﷺ کے منکر تھے مگر رب تعالیٰ نے ان کو اللہ کا انکاری قرار دیا اور فرمایا کہ اگر یہ لوگ اللہ رسول پر ایمان لاتے۔ **چھٹا فائدہ:** حضور ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف سازش کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہے۔ ایسا شخص کتنا ہی بڑا عابد ہو مگر اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہے۔ یہ فائدہ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ الخ سے حاصل ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** کفار سے دوستی خواہ دلی ہو یا عملی منافقوں کی علامت ہے اللہ رسول کی دوستی اور ان کے دشمنوں سے محبت ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتیں روشنی و تاریکی کا ایک جگہ جمع ہونا غیر ممکن ہے۔ یہ فائدہ مَااتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ سے حاصل ہوا اس سے وہ مسلمان عبرت پکڑیں جو کفار کی سی شکل وصورت وضع قطع رکھتے ہیں کہ یہ کفار سے عملی محبت ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (بقرہ: ۲۰۸) اللہ تعالیٰ ہمارا ظاہر باطن قلب قالب یکساں مسلمان کرے

تن اجلا من کالا بگلے کے سے بھیک   اس سے تو کانگا بھلا کہ اوپر نیچے ایک

آٹھواں فائدہ: مسلمان کو چاہیے کہ اچھوں کے ساتھ رہے اچھوں کی ہمراہی بروں کا بیڑا پار لگا دیتی ہے۔ جیسے کفار سے محبت ان کی ہمراہی تباہ کر دیتی ہے ایسے اچھوں سے الفت ان کی ہمراہی رب تک پہنچا دیتی ہے۔ **نواں فائدہ:** جیسے اصلی نقلی سونے کی پہچان کے لئے کسوٹی ہے، خالص اور ملاوٹی دودھ کے جاننے کے لئے آلات ہیں ایسے ہی کھرے کھوٹے مومن کی پہچان کے لئے حضور ﷺ کی ذات بابرکات معیار ہے۔ حضور سے اور ان کی ہر منسوب چیز سے محبت ان کے

دہریہ نہ تھے پھر یہ کیوں فرمایا کہ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ اگر وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہوتے۔ **جواب:** خدا تعالیٰ کو جاننا، پہچاننا اور ماننا ایمان نہیں بلکہ ایمان یہ ہے کہ اس کو پیغمبر کے ذریعہ ان کی معرفت سے مانا جاوے۔ شیطان خدا کو جانتا، پہچانتا، مانتا ہے مگر مومن باللہ نہیں کہ نبی کی معرفت نہیں مانتا بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا تھا کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (بقرہ:۵۵) ہم آپ پر ایمان نہ لائیں گے یا آپ کی نہ مانیں گے حتی کہ خدا تعالیٰ کو ظاہر ظہور دیکھ لیں تو ان پر عذاب آ گیا کیوں اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھ کے ذریعے ماننا چاہتے تھے نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ پھر ایمان یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو ایسے نبی کی معرفت جانو مانو جن کی نبوت منسوخ نہ ہوئی ہو لہٰذا اب جو رب تعالیٰ کو گزشتہ انبیاء کے ذریعہ جانے مومن نہیں کہ ان کی نبوتیں منسوخ ہو چکیں۔ بجلی کے تار میں چراغ یا لالٹین یا گیس لگا دو روشنی نہیں ہو گی اسی طرح عقل کے ذریعے خدا کو مانو نور ایمان نہیں ملے گا۔ پھر اس تار سے بلب بھی وہ لگاؤ جو فیوض نہ ہو چکا ہو۔ گزشتہ منسوخ نبوتیں فیوض شدہ بلب ہیں۔ جواب روشنی دینے سے قاصر ہیں۔ اب رب تعالیٰ کو صرف حضور انور کے ذریعہ جانو مانو تو مومن بنو گے۔ چونکہ یہ یہود یا منافقین حضور کے انکاری ہو کر خدا کو مانتے تھے لہٰذا وہ مومن باللہ نہ تھے۔ یہ آیت بالکل حق ہے بلکہ سارے نبیوں ساری کتابوں بلکہ قرآن کریم کو بھی ان ہی سرکار کے ذریعہ مانو تو مومن بنو گے۔ حضور کی نبوت تمام کی اصل ہے۔ نبوت کی بقا سے کتاب کی بقا ہے، نبوت منسوخ کتاب بھی منسوخ۔

تفسیر صوفیانہ

جیسے انسان اور گائے بھینس وغیرہ جانور منطقی قاعدہ سے ایک نوع نہیں کہ انسان حیوان ناطق ہے اور یہ جانور حیوان غیر ناطق اس فصل نے دونوں کو الگ الگ بنا دیا۔ یوں ہی صوفیاء کی اصطلاح میں مومن و کفار ایک نوع نہیں الگ الگ نوعیں ہیں کہ مومن انسان محبوب ہے اور کافر انسان مردود محبوبیت و مردودیت کی فصلوں نے ان دونوں گروہوں کو الگ الگ نوع کر دیا۔ جو مومن محبت کرے کفار سے وہ اپنی نوع سے کٹ کر دوسری نوع میں ملتا ہے اس لئے عنداللہ مجرم ہے۔ مرد و عورت میں انسان وغیر انسان میں چھانٹ علیحدگی ضروری ہے یوں ہی مومن و کافر میں علیحدگی ضروری ہے اگرچہ شکل و صورت رہن سہن میں دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں کوسوں کا فرق ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

میل مجنوں پیش آں لیلیٰ رواں — میل ناقہ پس پئے طفلش دواں
گفت اے ناقہ چو ہر دو عاشقیم — ما و ضد پس ہمرہ نالائقیم
نیست بروفق من مہر و مہار — کرد باید از تو صحبت اختیار
جاں زہجر عرش اندر فاقۃ — دل ز عشق خار بن چوں ناقۃ
جاں کشاید سوء بالا بالہا — در زدہ تن در زمیں چنگالہا

مجنوں لیلیٰ کے ناقہ کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور لیلیٰ کی ناقہ اپنے بچے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ مجنوں نے ناقہ سے کہا، اے ناقہ!

الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ

کی جو ایمان لائے جنہوں نے کہا کہ بیشک ہم عیسائی ہیں یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں سے علماء

جو کہتے تھے ہم نصاریٰ ہیں یہ اس لئے کہ ان میں عالم

وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور راہب ہیں اور بیشک وہ نہیں غرور کرتے

اور درویش ہیں اور یہ غرور نہیں کرتے

تعلقات

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: پچھلی آیت کریمہ میں یہود کی مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں کا ذکر فرمایا گیا اب ان کی دلی عداوت کا ذکر ہے جو انہیں اسلام اور مسلمانوں سے ہے گویا یہود کی عملی بیرونی عداوت کے بعد ان کی قلبی اور اندرونی عداوت کا ذکر ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق**: پچھلی آیات میں یہود کی ان کوششوں کا ذکر فرمایا گیا جو وہ اسلام کے خلاف کرتے تھے اب ان تمام کوششوں کی وجہ کا ذکر ہے کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کی عداوت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ گویا درخت عداوت کی شاخوں کا ذکر فرمانے کے بعد اس کی جڑ کا تذکرہ ہے۔ کیونکہ مؤمنین کی، اولیاء اللہ کی، حضرات انبیاء کی، خصوصاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت انسان سے وہ حرکتیں کرا لیتی ہے جو خود اس کے ضمیر کے خلاف ہوتے ہیں۔ مشرکین سے دوستی، بتوں کو سجدہ، شرک کی تعریف کرنا یہ وہ حرکتیں ہیں جو خود یہود کے عقیدوں کے بھی خلاف ہیں مگر وہ یہود مسلمانوں اور حضور کی عداوت میں یہ سب کچھ کر گزرے مومن کی دشمنی تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیت کریمہ میں ذکر تھا کہ یہودی مسلمانوں کے مقابلہ میں مشرکین سے محبت کرتے ہیں اب فرمایا جا رہا ہے کہ اس کی محبت کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی سخت عداوت میں یہ دونوں یعنی یہود و مشرکین یکساں ہیں۔ گویا دونوں اس سخت عداوت میں ہم جنس ہیں اور ہر جنس اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ **چوتھا تعلق**: پچھلی آیت میں یہود کی سخت اسلام دشمنی کا ذکر تھا۔ اب ان کے مقابلہ میں عیسائیوں کی نرم پالیسی کا تذکرہ ہے۔ گویا اہل کتاب کی دو جماعتوں میں سے ایک جماعت کی سخت دشمنی کے بعد ان دوسری جماعت کی نرمی کا تذکرہ ہے تاکہ معلوم ہو کہ سارے کافر اگرچہ کافر ہیں مگر ان میں پھر کچھ فرق ہے۔ **پانچواں تعلق**: پچھلی آیت کریمہ میں یہود کی بے دینی اور عداوت مسلمین کا ذکر تھا اب اس آیت میں اس کی ظاہری وجہ بیان ہو رہی ہے کہ یہود میں علماء، عابدین، زاہدین نہیں یہ سب لوگ پکے دنیادار، حریص و حاسد ہیں۔ عیسائیوں میں علماء، صالحین ہیں اس لئے ان کا حال یہ نہیں۔

شان نزول

اعلان نبوت کے پانچویں سال مشرکین مکہ کے ظلم مسلمانوں پر بہت ہی زیادہ ہو گئے اور ابھی تک جہاد کا حکم نہیں آیا تھا۔ مسلمانوں کی حفاظت کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے

آئے۔ عمرو ابن عاص جو وفد قریش کے رئیس تھے وہ نجاشی کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ ایک معمہ پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ وہ کون تابعی ہے جس کے ہاتھ پر صحابی مسلمان ہوئے وہ تابعی نجاشی ہیں جن کے ہاتھ پر عمرو ابن عاص صحابی ایمان لائے (تفسیر صاوی) پھر نجاشی نے مسلمانوں سے کہا کہ تم میرے ملک میں چین و آرام اور امن و امان سے رہو ادھر نبی ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی۔ اتفاقاً مہاجرین حبشہ میں ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہ یعنی رملہ بنت ابوسفیان ابن صخر ابن حرب جن کی والدہ حضرت عثمان غنی کی پھوپھی صفیہ بنت عاص ہیں یہ بھی تھیں۔ نجاشی بادشاہ نے حبشہ میں حضور ﷺ کا نکاح ام حبیبہ سے کر دیا اور اپنے پاس سے چار سو دینار یا چار لاکھ درہم ادا کر دیئے (اکمال) حبشہ کے لوگوں نے بہت کچھ سامان عطر و تیل وغیرہ بطور جہیز جناب ام حبیبہ کی خدمت میں پیش کیے ام حبیبہ کے پہلے خاوند کا حبشہ میں ہی انتقال ہو چکا تھا (تفسیر صاوی) فتح خیبر کے سال یعنی 6 ہجری میں یہ مہاجرین حبشہ زمین حبشہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے اتفاقاً حضرت جعفر خاص فتح خیبر کے دن پہنچے۔ حضور انور نے فرمایا میں نہیں کہہ سکتا کہ آج مجھے فتح خیبر کی خوشی زیادہ ہے یا جعفر کے آنے کی۔ حضرت جعفر کے ساتھ یا ان کے فوراً ہی بعد حبشہ کے عیسائی حضور انور کی خدمت میں حاضر ہوئے جن میں سے باسٹھ حبشی تھے اور آٹھ شامی حضور انور ﷺ نے انہیں سورۃ یٰسین پڑھ کر سنائی یہ لوگ سن کر بہت روئے اور بولے کہ یہ کلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وحی کے بالکل مطابق ہے ان لوگوں کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں۔ یعنی مؤمنین دربار نجاشی اور مؤمنین وفد (تفسیر خازن، خزائن، تفسیر صاوی وغیرہ) تفسیر صاوی و خازن نے بہت طویل واقعہ بیان کیا ہے ہم نے مختصراً نقل کیا۔

تفسیر **لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** یہ نیا جملہ ہے جس میں یہود کی خباثت کا ذکر ہے **لَتَجِدَنَّ** میں خطاب حضور ﷺ سے ہے یہ فعل دو مفعول چاہتا ہے۔ افعال قلوب سے ہے چونکہ یہود کی اسلام دشمنی بالکل ظاہر ہے کسی دلیل کی محتاج نہیں اس لئے **تَجِدَنَّ** ارشاد ہوا اس کا پہلا مفعول **اَشَدَّ النَّاسِ** ہے۔ دوسرا **الْيَهُوْدَ** الخ یا یوں کہو کہ پانا وہاں بولا جاتا ہے جہاں معلوم چیز کی آزمائش ہو۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو میں جیسا جانتا تھا میں نے اسے ویسا ہی پایا۔ حضور ﷺ تمام انسانوں کے ہر حال سے خبردار ہیں آپ کو یہود کی عداوت و دشمنی کی خبر تھی مگر اس کا ظہور خاص موقعوں پر ہوتا ہے لہٰذا فرمایا گیا کہ تم انہیں بدترین دشمن پاؤ گے یعنی آزماؤ گے ان کی یہ آزمائش تا قیامت ہوتی رہے گی، یہود مسلمانوں سے عداوتیں کرتے رہیں گے، حضور پر اس کا ظہور ہوتا رہے گا۔ **عَدَاوَةً** تمیز ہے **اَشَدَّ النَّاسِ** کی چونکہ مومن انسانوں کا دشمن کافر انسانوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ فرشتے مؤمنوں کے دعاگو ہیں (قرآن مجید) خشکی دریا کا ہر جانور مؤمنوں علماء کے لئے دعائیں کرتے ہیں اس لئے یہاں **اَشَدَّ النَّاسِ** فرمایا اشد الخلق نہ کہا۔ **خیال رہے** کہ شیطان یا موذی جانوروں کو مؤمنین سے ہی نفرت نہیں بلکہ انہیں تو انسانوں سے عداوت ہے لہٰذا **اَشَدَّ النَّاسِ** فرمانا بہت ہی موزوں ہے **الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** فرما کر یہ بتایا کہ کوئی کسی درجہ کا مومن کسی وقت ایمان لائے، کسی طرح مسلمان ہو جاوے یہ اس کے دشمن ہیں، انہیں اسلام و ایمان کے نام سے چڑ ہے اس لئے بالمومنین نہ فرمایا تا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ یہود عداوت تو کرتے ہیں مگر کامل

تا قیامت رہے گا اس لئے انہیں صرف نصاریٰ نہ فرمایا اتنی دراز عبارت ارشاد ہوئی۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا اس عبارت میں یہود و نصاریٰ کے فرق کی وجہ اور نصاریٰ کے مسلمانوں سے قریب تر ہونے کی علت بیان ہوئی ذٰلِكَ سے اشارہ پہلے لَتَجِدَنَّ کی طرف ہے یا دوسرے لَتَجِدَنَّ کی جانب۔ عیسائیوں کے قریب تر ہونے کی تین وجہیں بیان ہوئیں ایک یہ کہ ان میں قِسِّيْسِيْنَ ہیں دوسرے یہ کہ ان میں رہبان ہیں۔ قِسِّيْسِيْنَ بنا ہے قس سے بمعنی رات میں کسی چیز کو ڈھونڈھنا عیسائیوں کے علماء و پادریوں کو قِسِّيْسِيْنَ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ رات میں عبادات کے عادی ہیں بہت کم سوتے ہیں اکثر حصہ عبادت میں گزارتے ہیں بعض نے فرمایا کہ رومی زبان میں قیس کے معنی ہیں عالم دین رہبان یا تو راہب کی جمع ہے۔ جیسے راکب کی جمع رکبان اور فارس کی جمع فرسان یا رہبان واحد ہے اس کی جمع ہے۔ رھابین جیسے قربان کی جمع ہے قرابین بہر حال یہ لفظ بنا ہے رہب سے بمعنی ڈر و خوف۔ رب فرماتا ہے: تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ (انفال: ٦٠) لہٰذا راہب کے معنی ہوئے خوف خدا دل میں رکھنے والے اس سے مراد ہیں عیسائیوں کے تارک الدنیا درویش (تفسیر کبیر) روح المعانی نے فرمایا کہ راہب وہ عیسائی ہیں جو گرجوں کے گوشوں میں اپنی زندگی گزارتے ہیں، اپنے کو خصی کر لیتے ہیں، بھوکے پیاسے رہتے ہیں، راتوں کو اپنے گلوں میں رسی ڈال کر لٹکتے ہیں، ترک دنیا میں زندگی گزارتے ہیں اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: لا رهبانية في الاسلام یعنی اسلام میں رہبانیت نہیں وَ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۔ یہ عیسائیوں کے قریب ترین ہونے کی تیسری وجہ ہے کہ ان میں قبول حق سے تکبر نہیں اگر انہیں حق بات سمجھانے کی کوشش کی جاوے تو ان میں سے کچھ لوگ قبول کر لیتے ہیں بخلاف عام یہود کے کہ وہ کسی کی بات ماننے کو اپنی ذلت و توہین جانتے ہیں۔ حق کو حق جانتے ہوئے بھی مانتے نہیں۔ دیکھو شاہ فارس یعنی کسریٰ نے حضور ﷺ کا دعوت نامہ اسلام چاک کر دیا مگر شاہِ روم یعنی ہرقل نے آنکھوں سے لگالیا، اس کا احترام کیا، کسریٰ مشرک تھا ہرقل عیسائی۔ نجران کے عیسائیوں نے حضور سے مباہلہ نہ کیا بلکہ جزیہ قبول کر لیا مگر یہود خیبر نے حضور کو زہر دیا۔ بہت سے عیسائی سلاطین نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں ہدیے تحفے بھیجے۔ چنانچہ مقوقس یعنی شاہ مصر نے حضور کے فرمان عالی کے جواب میں حضور کی خدمت میں تحفے بھیجے بہت عقیدت کا اظہار کیا یہ بادشاہ عیسائی تھا۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے ہم کو دو زندگیاں دی ہیں زندگی جسمانی اور زندگی روحانی، جسمانی زندگی میں ضروری ہے کہ جان جسم میں رہے۔ زندگی ایمانی میں ضروری ہے کہ ایمان جان میں رہے پھر جیسے زندگی جسمانی کے لئے بعض چیزیں مفید ہیں بعض مضر بعض سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ غذا، ہوا، پانی ضروری ہے، زہر قاتل ہے نیز بعض لوگ زندگی جسمانی کے دشمن ہیں بعض دوست ہیں یوں ہی زندگی روحانی کے لئے بعض چیزیں مفید ہیں بعض مضر بعض قاتل بعض لوگ دوست ہیں بعض دشمن ان مفید و مضر جسمانی کی پہچان طب یونانی سے ہوتی ہے تو ایمان کے دوست دشمن کی پہچان طب ایمانی سے ہوتی ہے۔ قرآن کریم طب ایمانی کی اعلیٰ کتاب ہے اس آیت میں ایمانی دشمنوں کا ذکر فرمایا چنانچہ ارشاد ہوا اگرچہ سارے کافر مسلمانوں کے مخالف ہیں مگر اے محبوب! ﷺ یا اے مسلمان قرآن پڑھنے والے! ان تمام کفار

پرست پرانا مشرک ہو یا نیا مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے۔ یہ فائدہ اَلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا فرمانے سے حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ نے انہیں والمشرکین نہ فرمایا بلکہ اتنی دراز عبارت ارشاد کی۔ **آٹھواں فائدہ:** مشرکین کو مسلمانوں کا دوست سمجھنا بڑی غلطی ہے جس کا نہایت تلخ تجربہ ہم اہل پاکستان کو بارہا ہو چکا ہے اگر کبھی وہ دوستی کا اظہار کریں تو اس میں ان کی کوئی چال ہوتی ہے کیونکہ سب کا خالق رب تعالیٰ ہے اپنی مخلوق کو جیسا وہ جانتا ہے دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ جب وہ فرما رہا ہے کہ یہ تمہارے دشمن ہیں تو بالکل حق فرما رہا ہے۔ ہماری عقل ہماری رائے جھوٹی ہے۔ رب تعالیٰ کی خبر سچی۔ **نواں فائدہ:** عیسائی خواہ کسی طبقے کے ہوں مگر یہود و مشرکین سے اسلام دشمنی میں ہلکے ہیں۔ یہ فائدہ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰی کی ایک تفسیر سے حاصل ہوا۔ **دسواں فائدہ:** قوم میں علماء درویشوں کا رہنا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اس سے تمام قوم سنبھلی رہتی ہے۔ یہ فائدہ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ الخ سے حاصل ہوا۔ **گیارھواں فائدہ:** غرور و تکبر اللہ کی لعنتیں ہیں جس سے انسان بہت سی خوبیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ فائدہ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ سے حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ نے عیسائیوں کی تعریف میں ان کی تواضع کا ذکر فرمایا۔ **بارھواں فائدہ:** تکبر کسی قسم کا ہو برا ہے خواہ قوم پر ہو یا علم پر یا دولت پر یا جتھے پر یا زہد و تقویٰ و عبادت پر کوئی تکبر ہو اللہ کی رحمت سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ فائدہ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ کے اطلاق سے حاصل ہوا

عجز کار انبیاء و اولیاء است   عاجزی محبوب درگاہِ خدا است!

تیرھواں فائدہ: عیسائیوں میں عبادت، ترک دنیا کا شوق و ذوق ہے اب بھی ان میں بہت سے راہب اور نتیں دیکھے جاتے ہیں ہم نے فلسطین میں بہت بڑے بڑے گرجے اور گرجوں میں بڑے بڑے راہب دیکھے بخلاف یہود کے کہ یہ لوگ دنیا میں اس قدر مشغول ہیں کہ انہیں عبادات و ریاضات کا خیال بہت کم آتا ہے۔ یہ فائدہ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ الخ سے حاصل ہوا۔ قرآن کریم کی ساری خبریں برحق ہیں۔ **چودھواں فائدہ:** نبی کی عداوت بے ادبی انسان کو تا قیامت برباد کر دیتی ہے اور نبی کی محبت و ادب تا قیامت سربلند کر دیتی ہے۔ یہود کی ابتداء حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گستاخی سے ہوئی تو انہیں تا قیامت حضرات انبیاء، مومنین کا سخت تر دشمن قرار دیا گیا۔ عیسائیوں کی ابتداء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت گزاری و وفاداری سے ہوئی تو انہیں تا قیامت نبیوں اور مومنوں کا قریب قرار دیا گیا۔ گرگٹ دشمن خلیل اللہ ہے کہ نمرودی آگ میں پھونکیں مارتا تھا تا قیامت اس کا مارنا ثواب ہے۔ ہدہد جناب خلیل اللہ کا خدمت گار ہے کہ وہ نمرودی آگ پر پانی ڈالتا تھا تو اسے جناب سلیمان علیہ السلام کا خاص خادم بنایا، پانی کا بادشاہ قرار دیا بلکہ اس کے ذریعے سارے ملک سبا بلقیس وغیرہ کو ایمان ملا اس نے ملکہ بلقیس کی گفتگو سمجھ کر سن کر حضرت سلیمان کو پہچانی۔ یہ نتیجہ ہے محبت نبی، خدمت گزاری نبی کا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: قرآن کریم میں اس جگہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتنی دراز عبارت کیوں ارشاد ہوئی صرف للمومنین فرما دینا کافی تھا یعنی یہود و مشرکین مومنوں کے بدترین دشمن ہیں۔

جواب: اس کا جواب اشارۃ تفسیر میں گزر چکا کہ وہ لوگ مسلمانوں کے دشمن ان کے ایمان کی وجہ سے ہیں۔ اگر کوئی

مشنریاں اسلام کو تباہ کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہیں ان کے کالج، ہسپتال وغیرہ سب مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے ہیں۔ پھر یہ فرمان کیونکر درست ہوا؟ **جواب:** اس اعتراض کے چند جواب ہیں۔ایک یہ کہ اس آیت کریمہ میں عیسائیوں سے مراد نجاشی بادشاہ اور اس کے ساتھی اور وہ ستر عیسائی ہیں جو حبشہ سے حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے یہ لوگ مسلمان ہو گئے تھے انہی کے متعلق آگے ارشاد ہو رہا ہے **وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ** الخ (مائدہ: ۸۳) کہ یہ لوگ قرآن مجید سن کر روتے ہیں اور کہتے ہیں امنا ہم ایمان لے آئے۔عبداللہ ابن عباس وغیرہم مفسرین کا یہ ہی قول ہے رضی اللہ عنہم اجمعین لہٰذا آیت بالکل واضح ہے۔دوسرے یہ کہ یہاں بمقابلہ یہود گفتگو ہے عیسائی بھی مسلمانوں کے بدترین دشمن ہیں مگر یہود مشرکین کے مقابلہ میں بہت کم (تفسیر کبیر) یہ بالکل درست ہے ہندوستان میں قریباً ڈیڑھ سو سال عیسائیوں کی حکومت رہی اس عرصہ میں مسلمانوں پر زندگی دوبھر نہیں ہوئی دس کروڑ مسلمان رہے اور انہیں قدرے مذہبی آزادی رہی اب اٹھارہ سال سے وہاں ہندوؤں کی حکومت ہوگئی وہاں مسلمان چار کروڑ رہ گئے۔لاکھوں قتل کر دیئے گئے اور جو وہاں ہیں وہ زندہ درگور ہیں ایسی مصیبت میں ہیں جیسے اسرائیلی فرعون کے ہاتھوں آفت میں تھے۔چند سال سے فلسطین میں یہودی راج قائم کر دیا گیا ہے دیکھ لو وہاں مسلمانوں کا حال کیا ہے ان کے علاقہ میں مسلمانوں کا رہنا تو کیا وہاں جانا بھی ناممکن ہے بلکہ ان کی وجہ سے سارے فلسطین و شام کے مسلمانوں پر مصیبت پڑ گئی ہے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ فلسطین کے اسلامی علاقہ میں مسلمان و عیسائی ساتھ ساتھ رہتے بستے ہیں مگر یہودی علاقہ میں اگر مسلمان جھانک بھی لے تو اسے گولی ماردی جاتی ہے یہ واقعات اس آیت کریمہ کی جیتی جاگتی تفسیریں ہیں بہر حال اگرچہ سارے سانپ زہریلے ہیں مگر پھن والا سانپ زیادہ خطرناک۔یہاں تفسیر کبیر نے عجیب بات فرمائی وہ یہ کہ عیسائیوں نے انجیل میں ردو بدل کر دیا اپنے دین میں تبدیلیاں کر ڈالیں مگر ان کا ایک پادری جس کا نام قسیس تھا وہ اپنے صحیح مذہب پر قائم رہا صحیح انجیل پر عامل اس کے ہم مذہب علماء کو قسیسین کہتے ہیں یہاں ان ہی عیسائیوں کا ذکر ہے۔تفسیر خازن نے فرمایا کہ مسلمانوں کو ستانا یہود کے ہاں داخل فی الدین ہے عیسائیوں کے ہاں نہیں۔یہود کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا مال چوری جھوٹ فریب سے لے لینا بھی ثواب ہے عیسائیوں کا یہ عقیدہ نہیں۔خلفاء راشدین کی لڑائیاں واقعی یہود سے نہ ہوئیں عیسائیوں سے ہوئیں مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ یہودی کی سلطنت کہیں تھی ہی نہیں۔عیسائیوں کی سلطنتیں بہت تھیں لہٰذا جنگیں بھی انہیں سے ہوئی تھیں۔مگر آئندہ آیت **وَ اِذَا سَمِعُوْا** الخ (مائدہ: ۸۳) سے پہلے جواب کو قوت ہوتی ہے کہ یہ آیات ان خاص عیسائیوں کے متعلق ہے جو بعد میں مسلمان ہو گئے کیونکہ ان آیات میں ان کے ایمان لانے کا صراحۃً ذکر ہے۔

تفسیر صوفیانہ

یہود اپنی حرکات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی سخت ناراضی میں گرفتار ہو گئے۔جسے سخطۃ الکبریٰ کہتے ہیں۔چنانچہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہی بچھڑے کی پرستش کر لی بلکہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں گھر کر گئی **وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ** (بقرہ: ۹۳) یہ لوگ انسانیت سے نکل کر حیوانیت میں آ گئے

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَ نُوْرِ عَرْشِهٖ وَزِيْنَةِ فَرْشِهٖ
سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِهٖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

(الحمد للہ کہ تفسیر نعیمی کا چھٹا پارہ یکم جولائی ۱۹۶۵ء عیسوی کو شروع ہو کر آج ۲۱ مئی ۱۹۶۶ء مطابق ۲۹ محرم الحرام ۱۳۸۲ ہجری بروز شنبہ ختم ہوا۔ رب تعالیٰ قبول فرمائے۔ صدقہ جاریہ بنائے۔ بقیہ جلدی پوری کرنے کی توفیق دے۔ آمین

